عبد الغنی شیخ نمبر

شیرازہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ماہنامہ

شیرازہ

سری نگر، کشمیر

جلد: ۵۶ | عبدالغنی شیخ نمبر | شمارہ: ۱۰-۷

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر: سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ / سرورق: عادل کمپیوٹرس، سرینگر

ISSN نمبر : 2277-9833

اشاعت : جولائی۔اکتوبر 2018ء

قیمت : ۱۰۰ر روپئے

''شیرازہ'' میں جو مضامین اور تخلیقات شائع ہوتی ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی کا کلاً یا جزواً اتفاق ضروری نہیں۔

(ادارہ)

☆......خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اُردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی، سرینگر، کشمیر۔ 190008

ای میل: salimsalik2012@gmail.com

فون نمبرات: 9419072288 - 9419711330

فہرست

عبدالغنی شیخ کی تخلیقی و تحقیقی جہات

عبدالغنی شیخ: مشاہیر کی نظر میں

عبدالغنی شیخ کے منتخب مضامین

حرفِ آغاز

زندہ قوموں کی یہی نشانی ہوتی ہے کہ وہ اپنی علمی اور ادبی شخصیات کے کارناموں پر فخر کرتے ہوئے ان کو منظرِ عام پر لانے کے لئے باضابطہ لائحہ عمل ترتیب دیتی ہیں تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے وہ سرمایہ محفوظ رہ سکے۔اسی مثبت سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کلچرل اکیڈیمی ہم عصر مشاہیر اور ان کے کارناموں کو اجاگر کرنے کے لئے ''شیرازہ'' کی خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کرتی ہے۔زیرِ نظر خصوصی اشاعت اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی کے طور پر آپ کے رُوبرو ہے۔عبدالغنی شیخ کی ہمہ جہت شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تحقیق ہو یا تنقید، افسانہ ہو یا ناول، ترجمہ ہو یا سفرنامہ، غرض جس صنف میں بھی شیخ صاحب نے اپنا ہنر آزمایا وہاں سے وہ سُرخرو ہو کے نکلے ہیں۔

لداخ کی تہذیب وثقافت پر خامہ فرسائی شیخ صاحب کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے اس موضوع پر اپنا تحقیقی کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔لداخی تہذیب وثقافت کے جن گوشوں کو انہوں نے معتبر و مستند تحریروں سے اجاگر کیا ہے، ان کی طرف شاید ہی پہلے کسی محقق کی نظر گئی ہو۔خطہ لداخ کے ساتھ اُن کی محبت کا یہ عالم ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے افسانوں اور ناولوں میں بھی اکثر وبیشتر اسی سرزمینِ رنگ و بو کی عکاسی ہوتی ہے۔حیرت ہے کہ دور دراز خطے میں رہنے کے باوجود ان کی کتب بینی کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں کتابوں کا مطالعہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ کیا ہے اور ان جواہر ریزوں سے اپنا دامن

بھرتے رہے، جن کی متعدد مثالیں ہمیں ان کے مقالات میں ملتی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیخ صاحب جہاں دیدہ شخصیت ہیں۔ انہوں نے بین الاقوامی سطح پر کئی ممالک میں ریاست کا نمائندہ بن کر علمی و ادبی کانفرنسوں میں شرکت کر کے داد و تحسین حاصل کی۔ ہمیں اس بات کا شدّت کے ساتھ احساس ہے کہ شیخ صاحب پر اِس اشاعتِ خصوصی کا اہتمام بہت پہلے ہونا چاہیئے تھا لیکن اُن کی بے نیاز طبیعت اور شہرت سے دور بھاگنے کی عادت اس میں سدّ راہ بنتی رہی۔ بہر حال، دیر آید دُرست آید کے مصداق یہ تحفہ آپ کے سپرد کرتے ہیں۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بے کراں کے لئے

ادارہ اُن تمام مضمون نگاروں کا بے حد ممنون ہے جنہوں نے زیرِ نظر خصوصی شمارہ کے لئے ہمیں اپنے قلمی تعاون سے نوازا۔ ہمیں یقین ہے کہ شیخ صاحب پر مستقبل میں بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ خصوصاً، اِس اعتراف کے ساتھ کہ وہ خطہ لداخ میں اردو کے پہلے اور شاید آخری ادیب ہیں جن کو قدرت نے اتنے اوصاف سے نوازا ہے۔ اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ عزیزی محمد سلیم سالکؔ، سلیم ساغرؔ اور محمد اقبال لون نے حسب روایت بڑی محنت سے اس اشاعت خصوصی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں جس عرق ریزی سے کام کیا اور اِس کی تکمیل کو یقینی بنایا۔ اس کے لئے وہ مبارکبادی کے مستحق ہیں۔

زیرِ نظر اشاعت خصوصی کے بارے میں ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

☆......محمد اشرف ٹاک

☆......محمد اقبال لون

عبدالغنی شیخ۔ سوانحی کوائف

1936ء: پیدائش 5مارچ 1936ءکو لیہہ میں ایک غریب گھرانے میں ہوئی۔

1943ء: سات سال بعد لیہہ کے سرکاری مڈل اسکول میں داخل کئے گئے۔ کم سنی سے ہی مطالعہ کا شوق تھا اور لکھنے کی خواہش تھی۔ طالب علمی کے دوران اُردو میں لکھنے کی شروعات کی اور ماہنامہ 'پیامِ تعلیم' میں اُن کی پہلی تحریر چھپ گئی۔

1951ء: میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

1952ء: محکمہ وٹرنری میں سٹاک اسٹنٹ کی ٹریننگ کے لئے سرینگر روانہ ہوئے۔ ادبی مجالس میں شرکت کرتے رہے۔ رحمان راہی، برج پریمی جیسے سرکردہ ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔

1954ء: لیہہ میں تعینات ہوئے۔ اردو میں دو مضامین شائع ہوئے۔ اداکاری کا شوق تھا۔ تب لیہہ میں نیشنل ڈرامیٹک کلب کے نام سے تھیٹر کو فروغ دیا جارہا تھا۔ انہوں نے اس کلب کے اہتمام سے ایک ڈرامہ میں بطور سائیڈ ہیرو کام کیا۔ کھیل کود میں فٹ بال سے دلچسپی تھی۔ تب کرکٹ نہیں کھیلا جاتا تھا۔

1955ء: میں اصنافِ ادب میں افسانہ نگاری انتخاب کیا اور کئی کہانیاں لکھیں۔

1958ء: تین کہانیاں، 'لوسر اور آنسو'، آرزوئیں اور نوری اردو رسائل پمپوش اور دیش میں شائع ہوئیں۔ ایف اے کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا۔ یکم دسمبر کو لداخ کے ایک گاؤں تسمسگام

کے لوئر ہائی سکول میں بطور ہیڈ ماسٹر جوائن کیا۔

1960ء: بی اے آنرز پاس کیا۔اپنے افکار اور خیالات لکھنے شروع کیے۔ کئی کتابوں پر نوٹ لکھے۔

1961ء: ایک ناول کا مسودہ لکھا۔ دو یا تین مضامین تحریر کیے۔ خیالات اور افکار لکھنے کا کام جاری رکھا۔

1962ء: پالیٹیکل سائنس کا امتحان دے کر بی۔اے کی ڈگری تکمیل کی۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ مرکزی سرکار کے شعبۂ اطلاعات لیہہ میں فیلڈ پبلسٹی افسر تعینات ہوئے۔ سنجیدہ مضامین اور فلسفیانہ کتابوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ خدا نے 16 اپریل کو ایک بیٹے سے نوازا۔

1966ء: ہندی اور بودھی میں اپنی لیاقت بڑھائی۔ اپنی ہدایت کاری سے ایک کامیاب ڈرامہ دکھایا۔ جسے فوج اور عام لوگوں نے پسند کیا۔

1969ء: مہاتما گاندھی کی حیات اور فلسفہ پر ایک کتابچے کا مسودہ کلچرل اکادمی، سرینگر کو پیش کیا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ یونین پبلک سروس کمیشن کی طرف لیا جانے والا تحریری امتحان، انڈین انفارمیشن سروس دیا اور پاس ہوئے۔

1970ء: CIS کا امتحان پاس کرنے کے پیشِ نظر جموں میں پریس انفارمیشن بیورو کے دفتر میں بطور انفارمیشن اسسٹنٹ جوائن کیا۔

1972ء: ہندی کا امتحان 'پراگیہ' پاس کیا۔ 'واقعات' دہلی میں ایک مزاحیہ کہانی 'گنجوں کی کہانی' چھپی۔ 'شیرازہ' سرینگر میں ایک مضمون چھپا۔

1973ء: سرینگر میں ریسرچ لائبریری میں لداخ کے بارے میں مواد جمع کرنے میں جٹا رہا۔ چالیس کتابوں سے نوٹ لکھے۔ ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام دیئے۔

1974ء: 'فلمی ستارے' دہلی میں ایک کہانی 'تصویر' چھپی۔ 'آج کل' دہلی میں لداخ پر ایک مضمون شائع ہوا۔ ٹی وی پر کئی پروگرام دیئے۔ ریڈیو میں پروگرام ایگزیکٹو کے عہدے کے لئے انٹرویو دیا اور منتخب ہوئے۔ لیکن جوائن نہیں کیا۔ پریس انفارمیشن بیورو میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔

1975ء: راجستھان یونیورسٹی سے ایم اے فسٹ ائیر (تاریخ) کا امتحان بذریعہ مراسلت پاس کیا۔

1976ء: ریڈیو میں بطور اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر جوائن کیا۔ پہلا افسانوی مجموعہ زوجی لا کے آر پار' شائع ہوا۔ ایم اے (تاریخ) فائنل پاس کیا۔ بطور ریڈیو نامہ نگار اسمبلی، میٹنگیں اور پریس کانفرنسیں Cover کرنے کا موقع ملا۔

1977ء: ناول 'وہ زمانہ' شائع ہوا۔ڈاوی کے لیےکئی انٹرویو لئے۔ والدہ خدا کو پیاری ہوئیں۔

1978ء: ناول 'دل ہی تو ہے' چھپا جس کو کلچرل اکاڈمی کی طرف سے اردو میں سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا۔ لداخی میں ایک ڈرامہ لکھا، جو لیہہ ریڈیو سٹیشن سے نشر ہوا۔

1979ء: بچوں کے بین الاقوامی سال پر بچوں کی دو کتابیں 'کتابوں کی دنیا' اور 'لداخ کی سیر' کے مسودے ریاستی سرکار کو پیش کیے جن کو ایک سال بعد ایورڈ سے نوازا گیا۔ پالیکا سماچار، دہلی، کھلونا، دہلی، تعمیر، سرینگر وغیرہ میں تخلیقات چھپیں۔

1980ء: 'صنم زربو' کی سوانح حیات پر کام کیا اور یہ کتاب ایک سال بعد شائع ہوئی۔

1982ء: کشمیر یونیورسٹی اور لداخی کانفرنس کے سمیناروں میں مقالے پیش کئے۔ اوّل الذکر میں موضوع 'اردو میں لداخی ادب' اور موخر الذکر میں 'لداخی زندگی، تاریخ اور ثقافت پر اسلام کا اثر' تھا۔

1983ء: ہفت روزہ نوائے صبح (انگریزی) کے لئے ہر ہفتہ فرمائش پر ایک کالم لکھنا شروع کیا۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف بدھسٹ سٹڈیز میں بدھ مت پر دو مقالے اور کلچرل اکادمی لیہہ میں لداخ پر دو مقالے پیش کیے۔ 'لداخ کی کہانی' کے عنوان سے لیہہ ریڈیو سٹیشن سے بات چیت کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

1985ء: اس سال اور اس کے بعد کئی سرکردہ افراد کا ریڈیو کے لئے انٹرویو لئے۔ جن میں فلم اداکار دیوانند، شبانہ اعظمی، سنجے خان، سنیل دت، گیت کار جاوید اختر، گلوکار جگجیت سنگھ، ریاست کے وزیر اعلیٰ، دو مرکزی وزراء اور کئی مرکزی اور ریاستی سرکاروں کے افسروں سے انٹرویو لئے۔

1988ء: لیہہ سے سرینگر تبدیل ہوئے۔ جہاں ریڈیو سٹیشن میں بطور نیوز ایڈیٹر جوائن کیا۔

1989ء: شمع میں کہانی 'قاتل'، شیرازہ میں 'لداخ میں عیسائی مشنری کی علمی اور سماجی خدمات' اور 'لداخ کی دیواری تصاویر'، تعمیر میں 'لداخی لوک گیت' اور 'لداخ کے لوک اور دھارمک ناچ' شائع ہوئے۔ پہلی مرتبہ بیرونِ ملک جانے کا موقع ملا اور انگلینڈ کے شہر برسٹل میں لداخ کے

بارے میں منعقدہ سمینار میں 'لداخ میں اسلام' کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا۔

1990ء: معروف فلم ڈائریکٹر ویدراہی کی فرمائش پر لداخ کے بارے میں چھبیس Episodes کا فکشن پر مبنی سیریل لکھا۔

دہلی میں لگ بھگ پونے تین سال پہلے ریٹائرمنٹ لیا اور اسلامیہ پبلک ہائی اسکول لیہہ میں بطور پرنسپل جوائن کیا۔

1992ء: فروغِ اردو کے لئے لیہہ میں 'بزم ادب' کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی اور انہیں اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ لیہہ میں کئی ادبی مجلسیں منعقد کیں جن میں مقامی اور غیر مقامی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

لداخ مسلم ایسوسیشن کا نائب صدر اور انجمن معین الاسلام کا نائب صدر منتخب ہوئے۔

1993ء: افسانوی مجموعہ 'دوراہا' چھاپا۔

خود مختار لداخ پہاڑی کونسل کی مانگ کے سلسلے میں اور آرغون مسلمانوں کو شیڈولڈ ٹرائب کی منظوری کے ضمن میں دہلی اور جموں مسلمان وفود کی نمائندگی کی۔

ایک غیر سرکاری تنظیم LEHO کی طرف سے برازیل بھیجے گئے۔ جہاں ورک شاپ میں لداخ میں تعلیم کی صورت حال پر مقالہ پیش کیا۔

1995ء: انٹرنیشنل ایسوسیشن فار لداخ سٹڈیز کے سمینار میں شرکت کے لئے بون، جرمنی گئے اور مقالہ پیش کیا۔ اپنے دوست کارل ہوف مین کے ہاں ہیڈل برگ گئے اور ان کے ہمراہ سوئزرلینڈ کی سیاحت کی۔ پاک جرمن پروجیکٹ کی دعوت پر اسلام آباد، پاکستان روانہ ہوا او بلتستان پر مقالہ پڑھا۔

1997ء: انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹڈیز (IALS) کے سمینار میں شرکت کے لئے ڈنمارک گئے اور پیپر پیش کیا جو بعد میں دوسرے مقالوں کی طرح IALS کے جریدہ Recent Research in Ladakh میں چھپا۔

1998ء: سرینگر میں کل ہند اردو کانفرنس میں شرکت کی اور مقالہ پیش کیا۔

دو دستاویزی فلموں کے لئے انگریزی میں The Nomads اور The Dards کے

عنوانات سے سکرپٹس تحریر کیے۔

2000ء: کتاب 'قلم، قلم کار اور کتاب' پر کام کرنا شروع کیا۔ دسمبر میں 'آج کل' میں اس کی پہلی قسط چھپی۔

2001ء: مصنف کی بارہ اردو کہانیوں کا ترجمہ The Forsaking Paradise کے نام سے کتابی صورت میں چھپ کر مارکیٹ میں آیا۔

انگلینڈ کا سفر کیا اور آکسفورڈ میں اپنا مقالہ Ladakh Regional Perspective پیش کیا۔ انگلینڈ سے جرمنی، فرانس، لکسمبرگ گیا۔

2002ء: کتاب 'قلم، قلم کار اور کتاب' شائع ہوئی۔ اسے پہلے ماہنامہ 'آج کل' میں اس کی چار قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ ماہنامہ 'سائنس' میں سائنسی مضامین 'قرآنی آیتیں، احادیث اور جدید سائنس' کے عنوان سے چار قسطیں شائع ہوئیں۔ بیسویں صدی میں دو کہانیاں 'چار دن کی چاندنی' اور 'دل ہی تو ہے' چھپیں۔ ایک انگریزی جریدہ New Hope میں Ladakhi Culture over the centuries اور Heritage of Ladakh چھپے اور لداخ اکالوجی سنٹر کی نئی کتاب میں ان کا مضمون History of Ladakh-A New Perspective شامل کیا گیا۔ فلسفہ وحی پر ایک طویل مقالہ لکھا۔

2003ء: ماہنامہ 'سائنس' میں اسلام اور سائنس کے موضوع پر اِس سال مزید سات قسطیں چھپیں۔ New Hope میں مضمون Islam in Ladakh and Sufi Tradition اور PRITIBHA میں Singey Khababs نکلے۔ لیہہ کلچرل اکادمی کے سمینار میں لیہہ میں 'لداخ کے تیوہار: سماجی اور تاریخی تناظر میں' پڑھ کر سنایا۔ ایک ہفت روزہ انگریزی جریدہ Voice of Kashmir میں مدیر غلام نبی خیال کی فرمائش پر کالم Ladakh Diary کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ اس برس کے دوران سات ڈائریاں لکھیں۔ اکالوجی سنٹر کے ایک پمفلٹ کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔

جموں میں کلچرل اکیڈمی کے اہتمام سے منعقدہ پروگرام 'ملاقات' میں ادیبوں سے تبادلہ خیال ہوا۔

وزیراعلیٰ مفتی محمد سعید اور نہرو کیندرا نے Momento پیش کئے۔ برادر دین محمد کا سکردو میں انتقال ہوا۔

2005ء: 'لداخ تہذیب وثقافت' کتاب شائع ہوئی۔ 'لداخ: غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں' شیرازہ کے خصوصی شمارے میں نکلا جو 110 صفحات کو محیط تھا۔ سبق اردو میں کہانی 'عبرت' چھپی۔ ایک کتاب Ladakh, Culture at the Cross Roads میں ان کا مضمون The Islamic Architecture of Ladakh شامل ہوا۔ پندرہ روزہ کرگل رنگیول کے لئے چار فیچر تحریر کئے۔ لداخی فیچر فلم کے لئے اردو میں کہانی اور مکالمے لکھے۔

2006ء: 'لداخ: ملکی سیاحوں کی نظر میں' شیرازہ میں چھپا۔ کرگل رنگیول نمبر کیلئے کئی فیچر لکھے۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف بدھسٹ سٹڈیز میں 'بدھ مت کا لداخی بودھوں پر اثر' کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا۔ آکاش وانی دہلی سے ان کی کہانی 'جینی' نشر ہوئی۔ امریکی طلباء کے تین گروپوں کو لداخ اور دوسرے موضوعات پر لیکچر دیا اور ان کے سوالات کے جواب دیے۔

2007ء: روم میں IALS کی کانفرنس میں Traditions of Sufism in Ladakh کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کی دعوت پر منعقدہ قومی سطح کے سمینار میں اپنی دو کہانیاں سنائیں۔ اس نشست کی صدارت شمس الرحمن فاروقی نے کی۔ جموں میں 'لداخ کی ثقافتی روایات اور اردو' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ اس دو روزہ سمینار کا اہتمام کلچرل اکیڈمی نے کیا تھا۔ دو نشستوں کی صدارت کی۔ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ کے لیہہ میں انعقاد کردہ ورک شاپ میں شرکاء سے تین مرتبہ خطاب کیا۔ لداخ تعلیمی سیاحت پر آئے ہوئے امریکی طلباء کے پانچ گروپوں کو یکے بعد دیگرے معلومات فراہم کیں اور تبادلہ خیال کیا۔

ریاستی سرکار نے حج کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ ای ٹی وی اردو چنل اور مقامی ٹی وی سنٹر نے انٹرویو لئے۔ رواں سال کے دوران استنبول اور ایمسٹرڈم دیکھنے کا موقع ملا۔

2008ء: سنٹرل ایشین میوزم اور مسلم انجمن کے کام اور ذمہ داریوں کی وجہ سے تخلیقی کام کی طرف

زیادہ توجہ نہیں دے سکے۔ تاہم انگریزی شیرازہ کے لئے مضمون Folk Songs of Ladakh، محکمہ تعلیم کے رسالہ Education News کے لئے ایک تعلیمی مضمون اور کرگل رنگیول کے لئے کالم لکھے، جو شائع ہوئے۔ امریکی اور آسٹریائی سیاحوں کے گروپوں کو لداخ اور اسلام کے بارے میں بتایا۔ ٹی وی چینل، سی این این کو انٹرویو دیا اور ریڈیو سٹیشن سرینگر کے فیچر 'پیامِ صبح' کے لئے تین فیچر تحریر کئے۔ کئی تقریبات میں شرکت کی اور خطاب کیا۔ حج بیت اللہ سے معہ اہلیہ فیض یاب ہوئے۔ ایئر انڈیا کی دعوت پر سنگاپور کی سیاحت کی۔

2009ء: کتاب 'اسلام اور سائنس' چھاپی۔ ان کی یہ واحد کتاب ہے جس کی پانچ سو کاپیاں ایک سال کے عرصے میں فروخت ہوئیں۔ باقی کتابوں کے نکاس اور فروخت ہونے میں زیادہ مدت لگی ہے۔

نفسیات اور ذہنی کوفت سے متعلق ایک درسی کتاب A Mental Health Primer for Ladakh کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ حج کے بارے میں سفر نامہ لکھا، جو سرینگر کے ایک روزنامہ 'اطلاعات' میں سات قسطوں میں شائع ہوا۔ کرگل رنگیول میں کئی کالم شائع ہوئے۔ دو مطبوعہ کہانیوں 'ہوا' اور 'دوسرا خط' کا جرمنی زبان میں ترجمہ ہوا اور قدرے بعد میں ایک جرمن جریدہ میں شائع ہوئے۔ دو مضامین جو کرگل اور صوفی ازم کے بارے میں لکھے تھے، IALS کے جریدہ Recent Research on Ladakh 2009 میں شایع ہوئے ہیں۔

گرینڈ ڈریگون میں امریکی طلباء اور ایشیا ہوٹل میں چند مغربی سامعین کو 'اسلام اور جدیدیت' کے موضوع پر لیکچر دیا۔

2010ء: 'شیرازہ' کے خصوصی شماروں کے لئے مضامین لکھے اور ارسال کئے۔ 'الحیات' سرینگر میں ایک مضمون شایع ہوا جس میں مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں ایک مسلمان کا کردار کتنا اہم رول ادا کرتا ہے۔

انگریزی سے ترجمہ ان کی کہانی 'آوی لے' کو ریاستی بورڈ آف سکول ایجوکیشن نے میٹرک کی انگریزی درسی کتاب کے کورس میں شامل کیا ہے۔ امریکی طلباء کے ایک

گروپ سے خطاب کیا۔

2011ء: Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia اور 'لداخ: محققوں اور سیاحوں کی نظر میں' دونوں کتب شایع ہوئیں۔ موخر الذکر کتاب نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے چھاپی ہے۔

کرگل رنگیول میں 'لیہہ کے شب و روز' کے عنوان سے 16 کالم چھاپے۔ کشمیر یونیورسٹی کے سنٹرل ایشین سٹڈیز کے شعبہ میں آزادی سے پہلے لداخ میں سنٹرل ایشیائی تاجروں کی آمد، ذاتی مشاہدات اور تجربات سے آگاہ کیا۔ Radiant Public School سرینگر میں میٹرک کے طلبا سے اپنی کہانی 'آوی لے' کی نسبت سے تبادلہ خیال کیا۔ Secmol میں کالج کے طلبا کو لداخ کی تاریخ کے بارے میں بتایا۔ IALS کے سمینار میں سنٹرل ایشین میوزیم کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ امریکی طلبا کے ایک گروپ سے تبادلۂ خیال کیا۔

2012ء: ایران کا سفر کیا اور 'آج کل' میں ایران کا سفرنامہ شائع ہوا۔ اکیڈیمی کی ادبی مجلس میں 'حمال' (کہانی) پڑھ کر سنائی۔

جے اینڈ کے اردو اکادمی نے سرینگر میں ایک تقریب میں ادبی اور تحقیقی کام کے لئے انہیں شال اور سند سے نوازا۔

Reflections on Ladakah, Tibet and Central Asia کو ریاست میں 2010ء میں انگریزی کی بہترین کتاب قرار دینے اور ایوارڈ ملنے پر لیہہ میں ہمالین کلچرل فاونڈیشن نے استقبالیہ دیا۔

جموں یونیورسٹی کے طالب علم محمد سجاد رونیال کو اپنی تھیسیس لداخ میں اردو زبان و ادب اور عبدالغنی شیخ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی۔ لاہور، پاکستان کے ایک پبلشر مکتبۂ جمال نے ان کی کتاب 'لداخ: محققوں اور سیاحوں کی نظر میں' شائع کی ہے۔

2015ء: ان کی نئی کتاب 'دو ملک اور ایک کہانی' چھپ کر آگئی۔ شیرازہ میں یادرفتگان، کرشن چندر،

گلگت سکاؤٹس کی بغاوت، گلاب سنگھ کی فوجی مہمات اور Ladakh Studies میں منشی سپلگیس شائع ہوئے۔ Stawa اور کرگل رنگیول کے اکثر شماروں میں باقاعدگی سے لکھا۔ سرینگر میں اردو کانفرنس میں شمولیت کی اور ایک سیشن کے صدارت کی۔ مقامی شاعر کی تصنیف 'دیوان خیال' کا پیشِ لفظ لکھا۔

2016ء: شیرازہ اُردو میں 'گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را' (یادداشت) انگریزی شیرازہ میں Himaliyan Heritage, Tibetian Kashmiri Muslims میں گیال خاتون اور حاجی عبدالرزاق کے کتابچہ 'نوبرا وادی' کا دیباچہ لکھا اور سبھی شائع ہوئے۔ ایک ریسرچ سکالر فیاض احمد شیخ کو ایم فِل کی Dissertation 'عبدالغنی شیخ: بحیثیت فکشن نگار' کو اندور یونیورسٹی نے منظوری دی اور ایم فل کی سند عطا کی۔

2017ء: ان کی کتاب 'لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے' شایع ہوئی۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف بدھسٹ سٹیڈیز لیہہ میں ورلڈ بک ڈے پر صدارتی لکچر دیا۔ ڈگری کالج لیہہ ہائیر سیکنڈری سکول لیہہ، LOTI اور Flowering Dharma کے اجلاس میں طلباء سے خطاب کیا۔ حسبِ معمول ماہنامہ Stawa کے لئے تقریباً باقاعدگی سے لکھا۔

2018ء: ایک کہانی 'جہاندیدہ' کشمیر فکشن رائٹرز گلڈ کی مجلس میں پڑھی۔ Stawa کو اپنا مقالہ بعنوان The Partition of 1947- The Revolt by Gilgit Scouts دیا جو چھ قسطوں میں شایع ہوا۔ ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن سرینگر کے اہتمام کردہ اجلاس میں کتب بینی پر لکچر دیا۔ سیاحت سے وابستہ گائیڈ کی تربیت لینے والوں کو لداخ کی تاریخی مساجد اور امام باڑوں کے بارے میں بتایا۔

بمبئی کے ایک فلم ساز ایم۔ سی۔ ناگر نے ان کی چند مطبوعہ کہانیوں کو منی فلم بنانے کے لئے پسند کیا ہے۔ اس ضمن میں حتمی فیصلے کا انتظار ہے۔

......●●●......

☆......عبدالغنی شیخ

آپ بیتی

میری تاریخِ پیدائش سکول ریکارڈ کے مطابق ۵؍مارچ ۱۹۳۶ء ہے۔ میرے دادا محمد شیخ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کشمیر سے لداخ آئے تھے اور لیہہ میں بس گئے تھے۔ وہ سرینگر کے گُرگڑی محلّہ میں رہتے تھے اور تجارت کے سلسلے میں لداخ آتے تھے۔ انہوں نے لیہہ میں مریم نام کی ایک خاتون سے شادی کی، جن کی والدہ ایک نومسلم بودھ خاتون تھیں۔ دادا لداخ میں خاچے ماما کے نام سے مشہور ہوئے۔ خاچے کشمیری کو کہتے ہیں۔ ماما محمد کا مخفف ہے۔ ان کے متعلق لداخ میں ایک کہاوت ہے۔ جس کے باعث آج بھی ہمارے خاندان کو خاچے ماما کہا جاتا ہے۔

کہاوت یہ ہے۔ تم تم تماشا خاچے ماماشا

ریپ جے پولا مانے زامی شیس، چالقمو مانے تھُونگ مے شیس

اس کا مطلب یہ ہے۔ 'واہ، خاچے ماما کیا خوب آدمی ہے۔ یہ ہمیشہ پلاؤ رام چکور کے گوشت کے ساتھ کھاتا ہے اور سدا بہترین چائے پیتا ہے۔ محمد شیخ مادی طور مرفع الحال تھے۔ وہ یہ دو جملے کسی سے کہلوانا پسند کرتے تھے اور اسے ان کی انا کو تسکین ملتی تھی۔ لداخ سکالر جوزف گیرگن اور موراوین مشن کے پادری والٹر اسبو نے اپنی کتاب میں اسے ایک ہزار لداخی کہاوتوں میں شامل کیا ہے۔ اوّل الذکر نے یہ کہاوتیں جمع کی تھیں اور والٹر اسبو نے اِن کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ان کے مطابق کہاوت ایک ایسے آدمی کی عکاسی کرتی ہے جو فضول خرچ ہے اور اپنی امارت کا اظہار کرتا ہے۔

میرے دادا محمد شیخ نے لمبی عمر نہیں پائی۔ ان کے انتقال کے وقت میرے والد کی عمر چھ سال تھی۔ ان کی تین بہنیں تھیں۔ کوئی سرپرست نہیں تھا۔ اس لئے والد صاحب کو بڑے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی پنجابی تاجر کو قرضہ کی رقم واجب الادا تھی لیکن ادا نہیں کر پایا۔ اس لئے رہائشی مکان کی قرقی ہوئی۔ والد مرحوم زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ غالباً انہوں نے چوتھی یا پانچویں جماعت تک پڑھا تھا۔ وہ اردو پڑھ لکھ لیتے تھے۔ کمسنی میں باپ کا سایہ اٹھ جانے سے گھر کا سارا بوجھ ان کے کندھے پر آن پڑا۔ والدہ بالکل ناخواندہ تھیں۔ وہ شام کو جب چراغ روشن کرتیں تو بلاناغہ یہ دعا پڑھتی تھیں اللہ ربی محمد نبی والاسلام الدین یعنی اللہ میرا رب ہے۔ محمدؐ نبی اور میرا دین اسلام ہے۔ والدہ کو یہ دعا والد نے سکھائی تھی اور بتایا تھا کہ مرنے کے بعد قبر میں نکیر ومنکر پہلا سوال یہیں کریں گے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ اگر غلط جواب دیا تو غضب ہوگا۔

والد صاحب بازار میں ایک چارپائی پر گرمیوں میں خوبانی اور سیب بیچتے تھے۔ سردیوں میں سوکھے پھل جیسے سوکھی خوبانی، گری، اخروٹ وغیرہ فروخت کرتے تھے۔ گرمیوں میں جب چینی ترکستان سے تجارتی کارواں پہنچتے تو نسوار اور ہلاس بھی فروخت کرتے تھے اور آمدن میں قدرے اضافہ ہوتا تھا۔ عموماً ایک مزدور کی طرح روز کی آمدن پر ہماری گزر بسر ہوتی تھی اور دوسرے روز کے گزارے کے لئے دوسرے روز کی کمائی پر انحصار رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ مشکل حالات میں والدہ کے سونے کا زیور چالیس روپے میں گروی رکھنا پڑا۔ گروی کی رقم ادا نہ کر پانے پر زیور واپس حاصل نہیں کر پایا۔ ایک اور مرتبہ میرے وظیفہ کے دس یا پندرہ روپے بہت کام آئے۔ تب یہ بڑی رقم تھی۔ والد مرحوم زندگی کے چند آخری سال لیہہ جامع مسجد کے موذّن رہے۔

میری تعلیم لیہہ کے واحد سرکاری لوور ہائی سکول میں ہوئی۔ پڑھائی میں اچھا تھا۔ امتحان میں اپنی جماعت میں اوّل یا دوم آتا تھا۔ البتہ کھیل میں پیچھے تھا۔ میرے ہم جماعت لڑکے acrobatic اور Somersault یعنی جسمانی کرتب اور قلابازی میں دلچسپی لیتے تھے۔ مجھے گھبراہٹ اور جھجک ہوتی تھی۔ البتہ فٹ بال اور تیراکی کا شائق تھا۔ کئی لحاظ سے میں بزدل تھا۔ لیہہ میں ہر سال ستورلوق نام کا تہوار منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر لیہہ کے مضافات میں بدی کی علامت کے طور انسانی شکل کے

ایک پتلے پر گولیاں چلائی جاتی تھیں۔ آغاز میں توپ کے گولے داغے جاتے تھے۔ جب تک توپ کے گولے نہیں داغے جاتے، میں جائے مقام پر نہیں جاتا تھا۔ میرے سارے ہم جماعت میلہ دیکھنے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ بندوق کی آواز سے بھی میں گھبرا جاتا تھا۔ اب گولیاں چلانے اور توپ کے گولے داغنے کی رسم ختم کی گئی ہے۔ گولیاں چلانے کی شروعات لداخ کے ایک انگریز منتظم اعلیٰ ولیم جانسن نے انیسویں صدی میں کی تھی۔

ان دنوں اکثر گھروں میں غسل خانہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم گھر میں ایک ٹب میں نہاتے تھے۔ گرمیوں میں نالے پر نہانے جاتے تھے۔ تب نالے کا پانی صاف ہوتا تھا۔ صفائی کی مناسب سہولیت نہ ہونے سے ہمیں جوئیں لگتی تھیں۔

لیہہ اسکول میں دوران تعلیم مجھے علم و ادب میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان دنوں بچوں کا ایک رسالہ 'رتن' لیہہ آتا تھا۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ تھا۔ یہ جموں میں چھپتا تھا۔ ہم بے تابی سے اس کا انتظار کرتے تھے۔ بچوں کا ایک اور رسالہ ''پیام تعلیم'' بھی نکلتا تھا۔ اسکول میں غالباً کوئی لائبریری نہیں تھی۔ کم سے کم میں نے کوئی کتاب نہیں دیکھی۔ لیکن چند اخبارات سرینگر سے ضرور آتے تھے، جو کافی دنوں کے بعد لیہہ پہنچتے تھے۔ کبھی کبھار کسی سے اکا دکا کتاب پڑھنے کے لئے مل جاتی تھی۔ لیہہ میں ایک گھرانے میں ایک چھوٹی موٹی لائبریری تھی۔ مالک کا نام شمس الدین خان تھا۔ صادق حسین سردھنوی وغیرہ کے اسلامی ناول وہاں دستیاب تھے۔ میں بلا واسطہ کسی واقف کار کی وساطت سے یہ ناول مستعار لے کر پڑھتا تھا۔ بانگ درا میری مقبول کتاب تھی۔ لیکن بچوں کی نظمیں ہی ٹھیک طرح سمجھ آتی تھیں۔ میں نے عمر میں اپنے سے چند بڑوں کو علامہ اقبال کا نام بڑے احترام سے لیتے اور ان کا کلام پر سر دھنتے دیکھا ہے۔ تب علامہ کو رحلت ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔

سکول کی تعلیم کے دوران پہلی دفعہ ''پیام تعلیم'' میں میرا ایک لطیفہ چھپا۔ ساتویں جماعت میں کئی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں ردیف وقافیہ کا خیال بھی رکھا۔ لغت سے الفاظ کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اشعار کو مقفیٰ بنانے کی کوشش کرتا اور ہم جماعت ساتھیوں کو سناتا۔ اس طرح میری نظموں کا چرچا ہونا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ نظموں کے بارے میں اساتذہ کو بھی معلوم ہوا۔ لیکن چند سال کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ ان

نظموں میں پند ونصائح زیادہ ہیں، جو مجھے اچھا نہیں لگا اور پھر میں نے اس نوٹ بک کو پھاڑ ڈالا۔

ان دنوں ماہنامہ ''آج کل'' میں ''بچوں کا آج کل'' کے نام سے ایک ضمیمہ چھپتا تھا۔ جوش ملیح آبادی رسالہ کے مدیر تھے۔ میں نے اپنے ہم جماعت عبدالحکیم کے ساتھ مل کر ایک کہانی لکھ کر اشاعت کے لئے بھیجی اور خط میں ہم نے جوش صاحب سے درخواست کی کہ کہانی میں تذکیروتانیث یا صرف ونحو کی غلطیاں ہوں تو انہیں درست فرمادیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا اور نہ کہانی چھپی۔

انہی دنوں میں نے غلام محمد نور محمد سرینگر سے چند کتابچے منگائے۔ یہ بچوں کے لئے تھے، جو ہمیں بڑے پسند آئے۔ یہ سستے ہوتے تھے۔ ان سے میں نے دو تین مرتبہ اس قبیل کی سستی کتابیں منگائیں۔

۱۹۵۱ء میں لوئر ہائی سکول لیہہ کو میٹرک کا درجہ دیا گیا۔ تب ہم نے نویں جماعت پاس کی تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی۔ آگے پڑھنے کے لئے سرینگر جانا کم سے کم میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میٹرک میں مجھے ریاضی سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے میں اس مضمون میں کمزور تھا۔ ریاضی کا خوف میرے ذہن پر ہمیشہ مسلط رہا۔ چنانچہ ماضی قریب تک کبھی کبھی خواب میں اپنے آپ کو امتحانی ہال میں ریاضی کا امتحان دیتا ہوا پاتا ہوں۔ پرچہ مشکل ہے اور وقت کم ہے۔ میں پریشان ہوں۔ ایسے میں آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

میں دسویں جماعت میں سیکنڈ ڈویژن سے پاس ہوا۔ میرے کئی ہم جماعت آگے پڑھنے کے لئے سرینگر گئے۔ میں نے عارضی طور پر ڈیڑھ ماہ بطور کلرک کام کیا۔ پھر ویٹرنری سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ کے لئے سرینگر آ گیا۔ دراصل کشمیر دیکھنے کا تجسس تھا۔ تب میٹرک پاس امیدوار لیہہ میں استاد یا کلرک تقرر ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ تب لیہہ سرینگر کے درمیان سڑک نہیں تھی اور سرینگر تک لیہہ سے پیدل یا گھوڑے پر پندرہ سولہ روز کا سفر تھا۔ لیہہ سے کئی پڑاؤ تک میں نے گھوڑے پر سفر کیا اور پھر پیدل چلا۔ سرینگر پہنچا تو جیب میں ڈیڑھ دو روپے بچے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ پلیڈیم میں ایک فلم ''دوپٹہ'' لگی تھی۔ میں نے فلم دیکھی۔ رات ایک مسجد کے حمام میں گزاری۔ صبح ایک ڈھابا میں ناشتہ کے لئے گیا۔ چائے اور روٹی کھانے سے پہلے دام پوچھے کیوں کہ جیب میں کم پیسے تھے۔ پھر وٹرنری دفتر گیا اور ہوسٹل میں داخلہ ملا۔ تقریباً تین ماہ تک وظیفہ نہیں ملا۔ اس دوران کشمیری ساتھیوں نے مالی طور مدد کی۔ وظیفہ ملنے پر میں نے قرضہ ادا کیا۔ ہوسٹل میں ٹھیک طرح سے پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ ہمارا باورچی

چہرہ دیکھ کر پلیٹ میں کھانا اور سبزی ڈالتا تھا اور میرے مقدر میں کم ہی کھانا لکھا تھا۔ انہی دنوں کالج میں زیر تعلیم میرے چند لداخی دوست بھی لگ بھگ ایسے ہی تجربات سے گزر رہے تھے۔ شکم پری کے لئے مٹر جسے کشمیری میں مٹھی کہا جاتا ہے، کھاتا تھا۔ کھانے کیلئے فالتو پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ گھر سے پیسہ آنے کی امید نہیں تھی۔ مٹر کھانے سے میرا معدہ خراب ہوا۔ اسے مجھے لمبی مدت تک معدے کے تیزابیت کی شکایت رہی ہے۔ سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ میں تحریری طور پر اول آیا، تاہم عملی طور پر بڑا پیچھے تھا۔ قوی ہیکل جانوروں کو علاج کے لئے گرانا اور دوائی پلانا میرے لئے مشکل تھا۔

سرینگر میں مجھے اچھا exposure ملا۔ اخبار پڑھنے کے لئے میں اکثر لائبریری جاتا تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کی لیاقت بڑھاتا تھا۔ ان دنوں سرینگر میں ایک سے زیادہ ادبی تنظیمیں تھیں۔ میں ان ادبی مجلسوں میں جانے لگا۔ وہاں میری ملاقات برج پریمی اور حسرت گڈھا سے ہوئی۔ کشمیری زبان وادب کے سرکردہ ادیب پروفیسر رحمان راہی ہم سے سینئر تھے۔ بعد میں برج پریمی نے کشمیر یونیورسٹی میں بطور لیکچرار جوائن کیا اور حسرت گڈھا کی تقرری کلچرل اکاڈمی میں ہوئی۔ ایک ر[illegible] نے رحمان راہی کی صدارت میں ایک کہانی سنائی۔ اس کہانی کو رحمان راہی نے سراہا اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ میں مشاعروں میں بھی جاتا تھا۔ ایک مشاعرے میں سردار جعفری کے طرزِ بیان اور گھن گرج آواز سے بڑا متاثر ہوا۔

سرینگر میں ہی میں نے پرائیویٹ طور آگے پڑھنے اور گریجویشن کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لئے مجھے اردو میں ادیب فاضل کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ادیب فاضل کی کتابوں کی فہرست اپنے ساتھ لیہہ لی۔ ۱۹۵۸ء میں ایک سال بعد لیہہ لوٹا۔ اگرچہ میں نے کرایہ پر ایک گھوڑا لیا تھا لیکن میرے ساتھ ایک ٹرنک (صندوق) تھا۔ اس وجہ سے میں سواری نہیں کر سکا۔ لیہہ میں سامان رکھنے کے لئے صندوق عام دستیاب نہیں تھا۔

لیہہ ویٹرنری ہسپتال میں ڈاکٹر نہیں تھا۔ میں نے بطور انچارج کام کیا۔ کچھ مدت کے بعد مجھے ویٹرنری فارم مُرچے میں بطور منیجر تبدیل کیا۔ یہاں بھی میں زیادہ دیر ٹِک نہیں سکا۔ کیونکہ مویشی معینہ سکیل کے مطابق گھاس اور چارہ نہیں کھاتے تھے۔ اسٹاک جمع ہوتا گیا اور ٹھیکہ دار کی طرف سے

گھاس چارہ کی فراہمی میں کمی آئی۔ میرا افسر چراغ پا ہوا۔ وہ مجھے اکثر سرزنش کرتا تھا۔ مجھے فارم کے لئے نااہل اور نالائق قرار دیا گیا۔ دراصل افسر کو گھاس چارہ سے فاضل آمدنی تھی۔ پھر نیا آفسر آیا۔ اس نے جمع شدہ گھاس فروخت کی۔ مجھے ساٹھ روپے دئے اور خود چار سو روپے لئے۔ یہ ان دنوں بڑی رقم تھی اور مجھے فارم سے تبدیل کیا۔

اس دوران میرا ادبی ذوق برقرار تھا اور میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ لیہہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایلی ایز رجولدن بطور قلم کار میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور کبھی مجھے سکول مدعو کرتے تھے۔ اسکول کی ایک مجلس میں میں نے اپنی دو کہانیاں پڑھ کر سنائیں۔ ۱۹۵۷ء میں اسکول کی لڑکیوں کے لئے ''جھانسی کی رانی'' نام کا ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ سٹیج کیا گیا اور ایلی ایز رجولدن نے سراہا۔ میں نے سکول میں ایک کہانی بھی پڑھی۔

۱۹۵۷ء میں سرینگر جا کر ادیب فاضل کا امتحان دیا اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ مخمور حسین بدخشی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی ادیب فاضل کا امتحان دے رہے تھے۔ مخمور حسین کہانی کار تھے۔ ان کی کہانیاں ''بیسویں صدی'' میں چھپنے لگیں۔ خوشتر گرامی 'بیسویں صدی'' کے مدیر تھے۔ انہی دنوں میری ایک یا دو کہانیاں انہوں نے مسترد کیں۔ مخمور بعد میں پروفیسر بنے۔ سرینگر میں پشکر ناتھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ پشکر ناتھ نے کہانی کار کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا تھا۔

لیہہ میں نیشنل ڈرامٹیک کلب کے نام سے چند شائقین لوگوں کی تفریح کے لئے ڈرامے دکھانے لگے۔ تب لیہہ میں تفریح کا سامان بہت کم تھا۔ میں نے بھی ڈرامے میں حصہ لیا۔ اس سے پہلے میں نے چائلڈ ایکٹر کے طور دو تین ڈراموں میں کام کیا تھا۔ ایک ڈرامہ میں بطور سائیڈ ہیرو کام کیا۔ میں اعلانات بھی کرتا تھا۔ جو آگے جا کر لیہہ میں تقریبات میں خاص کر اردو میں کمینٹری دینا اور مشاعروں میں نظامت کا فریضہ سرانجام دینے کا پیش خیمہ تھا۔

محکمہ ویٹرنری میرے مزاج کو اب راس نہیں آ رہا تھا اور اسے خیر باد کہنا چاہتا تھا۔ لیکن محکمہ کے ساتھ ہوئے اقرارنامے کے مطابق پانچ سال سے پہلے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اسی اثناء میں مجھے اور کمپاؤنڈر احمد خان کو ہند۔ تبت کی سرحد پر واقع سرحدی گاؤں چھوشول تبدیل کیا۔ اس زمانے میں سہولیت کے بغیر

ایک کم تنخواہ ملازم کے لئے دور افتادہ گاؤں جانا آسان نہیں تھا۔ حکومت ہند کا ایک ماہر سرداتار سنگھ پشمینہ بکریوں کی افزائش چاہتا تھا جو اس علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ ہم نے جانے سے معذوری کا اظہار کیا اور ہم دونوں کو معطل کیا۔ ہمیں بنیادی تنخواہ بھی نہیں دی گئی جو معطل شدہ ملازم کو دی جاتی ہے۔ میں نے ٹیوشن کیا اور ایک جانکار آدمی کے ہمراہ موتی اور فیروزہ بیچنے پیادہ علاقہ لائن گیا۔ ڈھائی ماہ بعد ہم بحال ہوئے۔ معیاد پورا ہونے پر میرا استعفیٰ منظور نہیں ہوا۔ چنانچہ سرینگر جا کر ویٹرنری ڈائریکٹر سے دستی استعفیٰ کی منظوری لے کر لوٹا۔ اسی اثناء میں، میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔

۱۹۵۸ء میں سرینگر سے نکلنے والا ماہنامہ ''دیش'' میں میری پہلی کہانی ''لوسرا اور آنسو'' چھپی۔ اسی سال ''دیش'' سرینگر میں ''نوری'' اور ماہنامہ ''پمپوش'' دہلی میں ''آرزوئیں'' کے عنوان سے کہانیاں چھپیں۔ تب میری کہانیوں کا محور صرف لداخ تھا۔ کہانیاں اور مضمون کے علاوہ میں نے نظمیں بھی لکھیں۔ اور تخلص ''کمال لداخی'' رکھا۔ لیکن میری نظمیں تک بندی تک ہی محدود تھیں۔ بعد میں لیہہ میں کئی اردو مشاعروں میں اپنی نظمیں پڑھیں۔ میرے اور دوسرے لداخی اردو شعراء کے بھی اشعار معیاری نہیں تھے اور بیرون لداخ کے مشاعروں میں پیش نہیں کئے جا سکتے تھے اور نہ کسی رسالے میں چھپنے کے قابل تھے۔

۱۹۵۸ء میں لوئر ہائی سکول تینگ موگا نگ میں میرا تقرر بطور ہیڈ ماسٹر ہوا۔ محکمہ تعلیم میرے میلان اور مزاج کے مطابق تھا۔ میں نے اپنی دانست اور محنت سے سکول میں مثبت تبدیلیاں لانے کی کوشش کی۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ کھیل کود اور ڈرامہ جیسی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ تنگ موگا نگ علاقے کا مرکزی گاؤں تھا۔ علاقے کے دیہی پرائمری سکولوں سے بچے چھٹی جماعت داخلہ کے لئے تنگ موگا نگ آتے تھے۔ بچوں کا رول بڑھانے کے لئے ہم نے ان میں کئی گاؤں کا دورہ کیا۔ ڈرامے اور کھیل کود دکھائے۔ جس کا مثبت نتیجہ نکلا۔ ہم نے لیہہ میں بھی ایک ڈرامہ دکھایا۔ جسے لوگوں نے پسند کیا اور کئی ہزار روپے انعامات ملے۔ ان دنوں لداخ کے تمام سکولوں کے طلباء کو آٹھویں جماعت کا امتحان اجتماعی طور دینا پڑتا تھا۔ لیہہ اور کرگل امتحانی مراکز تھے۔ تنگ موگا نگ کا ایک طالب علم اول اور دوسرا سویم آیا۔

مجھے پیدل چلنے کی عادت پہلے بھی تھی۔تنگ موگا نگ میں چلنے کا زیادہ تجربہ ہوا۔ایک دفعہ میں دن کے چار بجے گاؤں سے لیہہ روانہ ہوا اور ساری رات مسلسل چل کر صبح ناشتے پر گھر پہنچا۔تنگ موگا نگ سے لیہہ ۹۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔تیسرے روز میں واپس لوٹا۔مجھے صرف تین دن کی چھٹی کا حق تھا۔تب سڑک نہیں تھی اور گھوڑے کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔

۱۹۶۰ء میں میں انگریزی میں میں نے بی اے آنرز پاس کیا اور ۱۹۶۲ء میں بی اے کی تکمیل کی۔۱۹۶۳ء میں میں مرکزی سرکار کے شعبہ اطلاعات میں لیہہ میں فیلڈ پبلسٹی آفسر تعینات ہوا۔ان ایام میں تخلیقی کام تو بہت کم ہوتا تھا البتہ میں مطالعہ اچھا کرتا تھا۔میری ڈائیری کے مطابق ۱۹۶۶ء میں میں نے ۹۸ کتابوں کا مطالعہ کیا جبکہ ۱۹۶۸ء میں سو سے زائد کتابیں پڑھیں۔اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔کوئی کوئی سال کتابوں کی تعداد اس سے کم ہوتی تھی۔زیادہ تر میں علمی اور ادبی کتابیں پڑھتا تھا۔خاص کر اردو ادب کی تمام اصناف میں دلچسپی لینے لگا اور متعدد کتابیں زیر مطالعہ آئیں۔ان میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، پریم چند، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قراۃ العین حیدر، شعراء میں فیض احمد فیض، مجاز، جذبی، سردار جعفری، غالب، اقبال، نقادوں میں احتشام حسین، آل احمد سرور، ممتاز حسین، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، محمد حسن، مزاحیہ نگاروں میں کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، فرحت کاکوروی، رشید احمد صدیقی پطرس بخاری وغیرہ شامل ہیں۔بعد میں انگریزی کی معرفت دوسری زبانوں کے ادیبوں کی کتابیں پڑھیں۔میں نے ان پر نوٹ اور تاثرات لکھے۔متعدد پسندیدہ افسانوں کے علاوہ ڈیڑھ سو سے زیادہ ناولوں پر نوٹ اور تبصرہ لکھے ہوں گے۔ان میں اردو کے شاہکار ناولوں کے علاوہ دنیا کے پچاس سے زیادہ مشہور ناول ہیں۔ان کے علاوہ سنجیدہ موضوعات جیسے مذہب، تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور مختلف علوم وفنون سے متعلق کتابوں سے نوٹ قلم بند کیے ہیں۔جن کی اساس پر بعد میں مجھے مضامین اور کتابیں لکھنے میں مدد ملی۔مجھے ادب کے علاوہ مذہب، نفسیات، فلسفہ، تاریخ جیسے سنجیدہ موضوعات سے دلچسپی رہی ہے۔ذہن میں کوئی نادر خیال آتا تو میں فوری طور قلم بند کرتا تھا۔کئی دفعہ ایسے میں کہانیوں کے لئے مواد مل جاتا۔میں نے پڑھا تھا کہ گوئٹے کو جب کوئی نادر خیال ذہن میں آتا، ایسے میں اگر وہ گھوڑے پر سوار ہوں تو گھوڑے سے اتر کر اسے

لکھتا تھا۔ میں بہت برسوں سے ایسے خیالات کو نوٹ کرتا آرہا ہوں اور سال کے اختتام پر انہیں ایک کاپی پر درج کرتا ہوں۔ ان کی تعداد دو ہزار سے تجاوز کرگئی ہے۔ اسی طرح میں اخبارات اور رسائل کے تراشے سنبھال کر رکھتا۔ جن میں کچھ میں نے اخبار کے لئے کالم لکھنے میں استعمال کیے ہیں۔

فیلڈ پبلسٹی میرا پسندیدہ محکمہ تھا۔ یہاں مجھے لداخ کا تقریباً سارا علاقہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم گاؤں میں دستاویزی فلمیں دکھاتے تھے۔ ایک دو گاؤں میں جہاں سڑک نہیں تھی ہم نے جنریٹر کی نقل و حمل میں اونٹ کا استعمال کیا ہے۔ تب لداخ کے اکثر لوگوں کے لئے فلم نئی تھی۔

مجھے اداکاری اور ہدایت کاری کا تجربہ تھا۔ ہم Variety Show کے نام سے اپنا پروگرام بناتے تھے۔ جس میں Skit، ناچ اور گیت پیش کرتے تھے۔ میرا دوست عبدالحکیم اداکاروں کو ناچ سکھا۔ تے تھے۔ انہوں نے کوریوگرافی کی کوئی ٹریننگ نہیں لی تھی۔ فلمیں دیکھ کر ناچ کے مختلف گر سیکھے تھے اور فلمی گیتوں کی دھن پر یہ ناچ پیش کئے جاتے تھے۔ جو تماشائیوں میں مقبول تھے۔ Skits کی ہدایت کاری اور کومنٹری میرے ذمہ تھی۔ ہمارا ایک ورائٹی شو مقابلتاً بڑا کامیاب رہا۔ پہلے پہل ہم نے اسے لیہہ کے ایک سنیما ہال میں دکھایا۔ ایک فوجی ڈاکٹر نے اسے دیکھا تھا اور پسند آیا تھا۔ انہوں نے ہم سے استدعا کی کہ اسے آرمی جنرل ہسپتال میں دکھائے۔ وہاں ہم نے تین شو دیئے۔ اس کا شہرہ ہوا ہمیں اس کے کئی شو آرمی آڈیٹوریم ہال میں کرنے پڑے۔ ہزاروں فوجیوں نے اسے دیکھا۔ آخر میں خطے میں فوج کے جرنیل آفیسر کمانڈینگ اسے دیکھنے آئے۔ میں نے فرداً فرداً اداکاروں کا تعارف کیا۔ ایک فوجی افسر نے ہمیں چھپا رستم سمجھا۔ وہ بولے ''آپ لوگ آج تک کہاں چھپے تھے؟'' یہ پروگرام میری ڈیوٹی کا حصہ بنا تھا۔ اس ورائٹی شو کا آخری پروگرام ہمیں ایک لیفٹینٹ جرنیل کی تفریح کے لئے کرنا پڑا، جو لیہہ دورے پر آیا تھا۔

میں فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں لیہہ میں فٹ بال کی دو بڑی ٹیمیں تھیں۔ مجھے ایک ٹیم میں شامل کیا گیا۔ میں فارورڈ میں کھیلتا تھا۔ تب لداخ میں کرکٹ اور آئس ہاکی مروج نہیں تھے۔ جو آج کل بڑے مقبول ہیں۔

میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بڑا بیٹا اقبال احمد اور منجھلی بیٹی فرحانہ یاسمین ڈاکٹر ہیں اور

چھوٹا بیٹا ہوٹل چلاتا ہے۔ میری اہلیہ امینہ بیگم استانی رہی ہیں۔ ہماری شادی ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکادمی نے مہاتما گاندھی کی برسی پر ان کی حیات اور فلسفے پر لکھکوں سے کتاب/مسودہ طلب کیا۔ میں نے موضوع پر اکادمی کو ایک کتابچہ کا مسودہ پیش کیا اور پہلا انعام ملا۔ اسی سال یو پی ایس سی سے انڈین انفارمیشن سروس کا امتحان پاس کیا اور اگلے سال جموں میں پریس انفارمیشن بیورو کے دفتر میں بطور انفارمیشن اسسٹنٹ جوائن کیا۔ جس کا مجھے بڑا پچھتاوا ہوا۔ وہاں سے میرا تبادلہ سرینگر ہوا۔ سرینگر میں مجھے ریسرچ لائبریریوں اور محافظ خانے سے لداخ کے بارے میں مواد جمع کرنے کا موقع ملا۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور کتابوں پر ٹوٹ پڑا جیسے بھوکا کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ ایک ہی سال میں میں نے چالیس کتابوں سے نوٹ لکھے۔ یہ زیادہ تر سفرنامے تھے۔ تاہم ان میں خاص طور پر انیسویں اور بیسویں صدی کے لداخ کی سماجی، معاشی اور ثقافتی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ لداخ میں اس ضمن میں صرف دو کتابوں کے نام سنے تھے۔ ایک کے مصنف وزیر حشمت اللہ تھے اور دوسری موراوین مشن کے پادری ڈاکٹر اے ایچ۔ فرانکی نے لکھی تھی۔ اول الذکر کی تصنیف مجھے مستعار ملی اور دوسری تقریباً نایاب تھی۔ اس لئے لداخ کے ماضی کے بارے میں مجھے بڑی تشنگی رہتی تھی۔ سرینگر میں اس ضمن میں اہم اور دلچسپ معلومات سے فیض یاب ہوا۔ لیکن تب فوٹو کاپی کی سہولیت نہیں تھی اور لکھنا پڑتا تھا۔

سرینگر علمی اور ادبی لحاظ سے میرے لئے سازگار ثابت ہوا۔ میرے مضامین اور کہانیاں یکے بعد دیگرے مختلف رسائل میں چھپنے لگے۔ ان میں آج کل، شاعر، شمع، بانو، ایوانِ اردو، شبستان، پالیکا سماچار، فلمی ستارے، شیرازہ، ہمارا ادب، نرالی دنیا، تعمیر، العطش، بیسویں صدی، واقعات، سبق اردو، آواز، شاندار، جوگی، کھلونا وغیرہ شامل ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی میں پروگرام دئے اور سکرپٹ لکھے۔ ہندی میں پراگیہ کا امتحان پاس کیا۔ ریڈیو کے لئے پروگرام ایکزیکیٹو کا انٹرویو دیا اور منتخب ہوا لیکن جوائن نہیں کیا اور پریس انفارمیشن بیورو میں بطور اسسٹنٹ انفارمیشن افسر کام کرتا رہا جہاں مجھے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا اچھا تجربہ حاصل ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں ریڈیو سٹیشن سرینگر میں بطور اسسٹنٹ نیوز ایڈیٹر جوائن کیا۔ اسی سال میری پہلی کتاب اور افسانوی مجموعہ ''زوجی لا کے آر پار'' شائع ہوا۔ میں نے اسی سال

راجستھان یونیورسٹی سے بذریعہ مراسلت تاریخ میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں بالترتیب میرے ناول ''وہ زمانہ'' اور ''دل ہی تو ہے'' شائع ہوئے۔ موخر الذکر کو کلچرل اکاڈیمی کی طرف سے اردو میں سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۹ء میں ریاستی سرکار نے بچوں کے بین الاقوامی سال پر بچوں کی کتابوں 'کتابوں کی دنیا'' اور ''لداخ کی سیر'' کے مسودوں پر مجھے ایوارڈ سے نوازا۔ مہاراشٹر سٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے ''آج کل'' نئی دہلی میں ۱۹۷۴ء میں لداخ سے متعلق میرے مطبوعہ مضمون کے اقتباسات گیارھویں اور بارھویں جماعتوں کی اردو درسی کتاب میں شامل کئے۔

سرینگر میں مختلف تقریبات میں دانشوروں، ادیبوں اور علماء سے ان کی تقریریں، کلام وغیرہ سننے کا موقع ملا۔ جن میں مولانا وحید الدین خان، مولانا حفیظ الرحمان، مولانا سعید محمد اکبر آبادی، مولانا طیب، کرشن چندر، عصمت چغتائی، آل احمد سرور، قراۃ العین حیدر، فراقؔ گورکھپوری، سردار جعفری، ہمایوں کبیر، شکیل الرحمان، ساغر نظامی، کشمیری لال ذاکر وغیرہ اور کشمیر کے ادبا اور شعراء بھی شامل ہیں۔

انہی ایام میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن دہلی سے صحافت میں تین ماہ اور دو ماہ کی یکے بعد دیگرے ٹریننگ لی۔ نامہ نگار کی حیثیت سے لداخ، دہلی، سرینگر اور جموں میں پریس کانفرنسوں اور میٹنگوں میں جانا پڑا، ان پروگراموں میں کئی وزیر اعظم اور صدر جمہوریہ شامل تھے۔ لیہہ میں کئی مرکزی اور ریاستی وزراء سے ریڈیو کے لئے انٹرویو لئے۔ اس کے علاوہ کئی مشہور فلمی ہستیوں کے انٹرویو لئے، جن میں دیوانند، سنیل دت، سنجے خان، شبانہ اعظمی، جاوید اختر، شیکھر کپور، انوپ جلوٹہ وغیرہ شامل ہیں۔

۸۰ کی دھائی میں میری علمی اور ادبی کاوشوں میں اضافہ ہوا۔ میری تخلیقات مقابلتاً زیادہ چھپنے لگیں۔ سیمناروں میں مقالے پڑھے۔ علمی، ادبی اور مذہبی مجلسوں میں تقاریر کیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر متعدد پروگرام کئے۔ لداخ کی تاریخ پر 'لداخ کی کہانی' کے عنوان سے لیہہ ریڈیو سٹیشن سے ۲۶ پروگرام نشر ہوئے۔ نیز کئی اور فیچر نشر ہوئے۔ جن میں ایک ''میرا ادبی سفر'' تھا۔

۱۹۸۰ء میں میری کتاب ''صنم نربو'' منظر عام پر آئی۔ یہ واحد سوانح حیات ہے جو میں نے لداخ کی ایک مقبول شخصیت صنم نربو کے بارے میں لکھی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں بھارتی کلچر شعبہ کی فرمائش

پر لداخ کے تیوہاروں کے بارے میں سو صفحات سے قدرے زائد روداد لکھی۔

ٹی وی سیریل ''گل، گلشن، گلفام'' دیکھ کر مجھے لداخ کے ماضی اور حال پر مبنی ۲۶ قسطوں پر ایک ٹی وی سیریل لکھنے کی تحریک ملی۔ ''گل، گلشن، گلفام'' کے ہدایت کار وید واہی تھے۔ جو جموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کہانی کار بھی ہیں۔ میں نے ان کو سیریل بھیجا۔ انہیں یہ پسند آیا اور وہ بمبئی سے لیہہ آئے۔ انہوں نے سیریل کے مکالمے اور سکرین پلے لکھے۔ میں نے وید راہی سے کہا کہ مجھے ''گل، گلشن، گلفام'' پسند آیا تو وہ بولے ''یہ سیریل اسے بھی اچھا ہوگا''۔ وید راہی کی کوشش کے باوجود دوردرشن سے منظوری نہیں ملی۔ پرائیویٹ چینل اسے خرید رہے تھے لیکن وید راہی کے بقول وہ ان کو اچھی رقم نہیں دے رہے تھے۔ لداخ جیسی دور افتادہ جگہ بمبئی سے جنریٹر، سامان اور اداکاروں کو لانا کافی مہنگا ہے۔ اس لئے معقول رقم مطلوب ہے۔'' اس طرح یہ سیریل نہیں بن سکا اور ہماری محنت رائیگاں گئی۔ وید راہی نے فلم بندی کے لئے کئی Locations دیکھے۔ چھوٹے رول کے لئے کئی مقامی اداکاروں کو انتخاب کیا۔ اور اس سیریں کے لکھنے کے لئے مجھے کچھ معاوضہ بھی دیا۔

۱۹۸۹ء میں مجھے پہلے پہل بیرون ملک جانے کا موقع ملا۔ انٹرنیشنل ایسوسی سیشن فار لداخ سٹیڈیز (IALS) کی طرف سے مجھے لداخ میں اسلام کی مختصر تاریخ کے عنوان پر ایک مقالہ پیش کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں نے موضوع ہذا پر انگلینڈ کے شہر برسٹل میں منعقدہ ایک سمینار میں روشنی ڈالی۔ اسی دہائی کے دوران میں نے ایک انگریزی ہفت روزہ ''نوائے صبح'' کے لئے لداخ کے بارے میں ایک کالم لکھا، جو تقریباً ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔

میں ۱۹۹۲ء میں پونے تین سال پہلے ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ میں سرینگر میں ریڈیو کے کام سے مطمئن نہیں تھا۔ ادارہ کی طرف سے وقتاً فوقتاً اجرا کردہ Guide Lines رہنما اصول اور محکمہ جاتی ٹریننگ کے مطابق خبروں کی نشریات میں راست گوئی اور غیر جانبداری کی ہدایات دی جاتی ہیں تاکہ سامعین میں ادارے کی Credibility اعتماد قائم رہے لیکن سیاسی مداخلت کی وجہ سے رہنما اصول پر عمل کرنا ممکن نہیں رہتا ہے۔ میں ذاتی طور افسران بالا سے ملا اور وزارت اطلاعات ونشریات کے کسی اور ادارے میں تبدیل کرنے کیلئے استدعا کی۔ میں بذات خود فیلڈ پبلسٹی یا پبلیکیشنز ڈویژن کے

اردو ماہنامہ ''آج کل'' کا مدیر بننے کا خواہش مند تھا۔ لیکن میری درخواست پر شنوائی نہیں ہوئی۔

اسی دوران انجمن معین السلام کی تعلیمی کمیٹی نے مجھے اسلامیہ پبلک ہائی اسکول لیہہ میں پرنسپل کے عہدے کی پیشکش کی۔ جو میں نے قبول کی۔ میں نے دو سال اس عہدے پر کام کیا۔ تینگ موگانگ سکول کے سابق طلباء کی طرح اسلامیہ سکول میں میری سروس کے دوران زیر تعلیم طلبا آج بھی میری قدر اور عزت کرتے ہیں۔ میں اپنی علمی اور تخلیقی مصروفیات کی وجہ سے مستعفی ہوا۔

۱۹۹۳ء میں میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دوراہا'' شائع ہوا۔ لگ بھگ یہ سارے افسانے مختلف رسائل میں چھپے تھے۔ اس میں ماں کے عنوان سے میری ماں کے بارے میں بھی ایک کہانی ہے۔

فروغ اردو کے لئے لیہہ میں ''بزم ادب'' کے نام سے برج پریمی کے فرزند او ویناش ایمہ نے لیہہ میں ایک ادبی تنظیم قائم کی اور مجھے اس کا صدر منتخب کیا۔ لیہہ میں کئی ادبی محفلیں منعقد کیں۔ جن میں مقامی اور غیر مقامی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات پیش کیں۔

اسی دوران مجھے بہ اتفاق رائے لداخ مسلم ایسوسی ایشن کا نائب صدر اور سنی مسلمانوں کی تنظیم انجمن معین السلام کا نائب صدر انتخاب کیا۔ خود مختار پہاڑی کونسل کی مانگ کے سلسلے میں دہلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ وفد میں اور بھی ارکان تھے۔ آرغون مسلمانوں کو شیڈولڈ ٹرائب کا درجہ دلانے کے سلسلے میں ایک سے زیادہ مرتبہ آرغون مسلم وفد کی قیادت کی۔

۱۹۹۳ء میں مجھے لیہہ کی ایک غیر سرکاری تنظیم LEHO نے برازیل بھیجا اور تقریباً ایک ماہ طویل ورک شاپ میں حاضری کے علاوہ ایک سمینار میں لداخ کے حوالے سے تعلیم پر ایک مقالہ پیش کیا۔ ۱۹۹۵ء میں IALS نے بون، جرمنی اور پاک تبت پروجیکٹ نے اسلام آباد، پاکستان مدعو کیا اور مقالے پیش کئے۔ ۱۹۹۸ء میں مجھے IALS کا آنریری سکریٹری اور خزانچی مقرر کیا۔ اس سے پہلے ڈنمارک میں IALS کی کانفرنس ہوئی اور وہاں اپنا پیپر پڑھا۔

نوے کی دہائی میں میری مالی حالت بہتر ہوئی۔ زندگی بھر تنگی ترشی رہی تھی۔ پنشن کی رقم سے دس کمروں پر مشتمل ایک ہوٹل تعمیر کیا۔ دور درشن سرینگر کے لئے متعدد سکرپٹ لکھے۔ جن سے اچھی خاصی آمدنی رہی اور اپنے مکان کو وسعت دی۔ ۲۰۰۱ء کی دہائی تخلیقات کے لحاظ سے اچھا سال تھا۔ اس

دہائی کے دوران ذیل کی کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔ لداخ۔تہذیب وثقافت

۲۔ قلم،قلم کاراور کتاب

۳۔ اسلام اور سائنس

۴۔ The Forsaking Paradise

موخرالذکر کتاب میری بارہ اردو کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ڈاکٹر روینہ اگروال نے ان کہانیوں کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔موصوفہ تب امریکہ میں ایک کالج میں پڑھاتی تھیں۔

اس سے پہلے ''قلم، قلم کار اور کتاب'' کی چار قسطیں ماہنامہ ''آج کل'' میں شائع ہوئی تھیں۔جن کا مجھے اچھا Feed Back ملا۔''دنیا کے مشہور ناول'' کو بھی اچھا Feed Back ملا تھا۔یہ طویل مضمون بھی ''آج کل'' میں چھپا تھا۔

۲۰۰۳ء میں جموں میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے اہتمام سے میری ادبی خدمات کے ضمن میں ایک پروگرام ''ملاقات'' کا اہتمام کیا۔جس میں ریاست کے متعدد ادیبوں نے سوالات پوچھے۔ اسی سال ریاست کے وزیر اعلیٰ مفتی محمد سعید اور ہندو کیندرا نے ادبی خدمات کے لئے Memento پیش کئے۔

۲۰۰۷ء میں مجھے ریاستی سرکار نے حج کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔

اس دوران کئی ٹی وی چینلوں نے میرے انٹرویو لئے۔ان میں NDTV، CNN، E TV، Times (اردو) شامل ہیں۔اسے پہلے اور اسی دوران کشمیر ٹائمنر، Hindu، Excelsior اور کشمیر اعظمیٰ میں میرے انٹرویو چھپے تھے۔

۲۰۰۹ء میں میری اہلیہ اور میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔اس کی روداد سرینگر کے ایک روزنامہ ''اطلاعات'' میں سات قسطوں میں چھپی۔اسے پہلے بھی میں نے آفتاب، سرینگر ٹائمنر اور آئینہ میں کچھ کالم لکھے ہیں۔اب کے ''کرگل رنگیول'' میں میرے مستقل کالم ''لداخ کے شب وروز'' اور ''آج کی بات'' کے عنوانات سے چھپتے رہے ہیں۔جن کی پذیرائی کرگل اور لیہہ میں ہوئی ہے۔کشمیری زبان کے

معروف ادیب غلام نبی خیال کی فرمائش پر ان کے انگریزی ہفت روزہ Voice of Kashmir میں ایک سال سے قدرے زیادہ مدت Ladakh Diary کے نام سے ایک کالم تحریر کیا۔

۲۰۱۰ء میں بورڈ آف سکول ایجوکیشن نے انگریزی میں ترجمہ میری کہانی 'آوی لے' کو میٹرک کی انگریزی درسی کتاب کے نصاب میں شامل کیا۔

۲۰۱۱ء سے تادم تحریر میری ذیل کی کتابیں شائع ہوئیں۔

ا۔ ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' (۲۰۱۱ء)

ب۔ Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia (2011)

ج۔ ''دو ملک ایک کہانی'' افسانوی مجموعہ (۲۰۱۵ء)

د۔ ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے (۲۰۱۷ء)

''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' کو لاہور پاکستان کے ایک پبلشر مکتبۂ جمال نے شائع کیا ہے۔ کتاب ہذا مرکزی وزارت انسانی وسائل کے ادارے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے چھاپی تھی۔ Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے ریاست کی ۲۰۱۱ء کی بہترین انگریزی کتاب قرار دی اور ایوارڈ سے نوازا۔

اس دوران انگریزی اور اردو میں میرے متعدد مضامین اور کہانیاں چھپیں۔ انگریزی مضامین لداخ سے وابستہ ایک نیا ماہنامہ STAWA میں ۲۰۱۴ء سے لگ بھگ باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ نیز Himalayan Heritage اور Ladakh Studies میں بالترتیب دو اور ایک مضمون شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ نوبرا وادی سے متعلق ایک اردو کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

۲۰۱۳ء میں جموں و کشمیر اردو اکیڈیمی نے سرینگر میں ایک تقریب میں ادبی اور تحقیقی کام کے لئے مجھے شال اور سند سے نوازا۔ اس موقع پر مہمان خصوصی ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس بشیر احمد کرمانی اور معروف صحافی مرحوم سید شجاعت بخاری تھے۔

۲۰۱۱ء میں دہلی میں ایرانی کونسل کے اہتمام سے امام خمینی کی برسی پر ایران گیا۔ بعد میں اس

سفر کی روداد ''آج کل'' دہلی میں شائع ہوئی۔ اس سے پہلے بطورِ ایک صحافی اور ادیب ائر انڈیا کی دعوت پر سنگاپور کی سیاحت کی۔ گروپ میں متعدد صحافی، ادیب اور فن کار تھے۔

۲۰۱۴ء میں جموں یونیورسٹی کے طالب علم محمد سجاد رونیال کو اپنے تحقیقی مقالہ ''لداخ میں اردو زبان وادب اور عبدالغنی شیخ'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ پروفیسر اسداللہ وانی کی نگرانی میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔ جبکہ ۲۰۱۵ء میں فیاض حمید کو ان کے مقالہ ''عبدالغنی شیخ بحیثیتِ فکشن نگار'' کے لئے ایم فل کی ڈگری عطا کی گئی۔

راقم الحروف سے پچھلی کئی دہائیوں کے دوران بیسوں ملکی غیر ملکی اور لداخی طلبا اور طالبات نے اپنی پی ایچ ڈی اور ایم فل کے سلسلے میں رابطہ کیا ہے اور امریکی اور یورپی سیاحوں اور طلبا کو لداخ کے بارے میں لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ ان سیاحوں کو اسلام، بودھ، مسلم تعلقات جیسے موضوعات سے بھی بڑی دلچسپی ہوتی ہے۔

مجھے سماجی اور علمی کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں درخواستیں لکھنا، طلبا کے لئے مختلف تحریری کام، معلومات فراہم کرنا، مشورے دینا، انٹرویو دینا اور حسب توفیق مالی معاونت شامل ہیں۔

میں نے انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام کیا ہے۔ چھوٹے موٹے ترجمے کے علاوہ محکمہ صحت کے لئے نفسیات اور صحت پر انگریزی سے اردو میں ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ نیز ایک غیر سرکاری تنظیم کے لئے ماحولیات اور لیہہ میں تبتی پناہ گزینوں کے کتابچہ کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ترجمہ کے لئے گاہے مجھے معاوضہ ملا ہے۔

میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ میری چند کہانیوں کی اچھی پذیرائی ہوئی ہے۔ میری ایک کہانی ''ہوا'' کا انگریزی، جرمنی، ہندی، گجراتی اور بنگالی میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کی انگریزی مترجم ڈاکٹر روینہ اگروال کو یہ کہانی بڑی پسند ہے۔ انہوں نے کل بارہ کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر روینہ نے ''ہوا'' امریکہ اور ڈنمارک میں سیمناروں میں پڑھی۔ ڈنمارک میں، میں بھی موجود تھا اور سامعین نے تالیوں سے کہانی کی پذیرائی کی۔ نام اور جینی عنوانات کی کہانیاں بالترتیب مختلف علاقائی زبانوں سے منتخب تلگو اور کشمیری میں مترجمہ کہانیوں کی مجموعوں میں شائع ہوئی ہیں۔ ''جینی'' آکاش

وانی دہلی کے اردو پروگرام اور ''حمال'' ریڈیو کشمیر سے ادبی پروگرام میں نشر ہوئیں۔ دہلی یونیورسٹی سے وابستہ ذاکر حسین کالج کی طرف سے قومی سطح کے ایک سمینار میں کہانی پڑھنے کے لئے مجھے مدعو کیا۔ میں نے ایک سیشن میں اردو میں 'جینی' اور انگریزی میں Wind یا 'ہوا' پڑھی۔ اس سیشن کی صدارت اردو کے معروف نقاد ڈاکٹر شمس الدین فاروقی نے کی۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے ایک جرمن اردو استاد ریز کیمنگ نے میری دو اردو کہانیوں ''ہوا'' اور ''دوسرا خط'' کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ جو جرمن زبان کے ایک جریدہ میں شائع ہوئی ہیں۔

میں نے متعدد قلم کاروں کو اپنی کتابیں نذر کی ہیں، البتہ کسی سے درخواست نہیں کی ہے کہ وہ ان پر اپنے تاثرات یا تبصرہ لکھیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ کسی سے درخواست کر کے تاثرات مانگیں تو مروت میں آکر مثبت باتیں لکھ سکتا ہے۔ فرمائش کے بغیر بے ساختہ اپنے تاثرات اور آرا دیتا ہے تو بے لوث اور مخلصانہ ہوتا ہے۔ میں کسی ادیب کو زحمت دے کر بار گراں نہیں بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں اپنی اوقات کو جانتا ہوں۔ میں کوئی بلند پایہ قلم کار نہیں ہوں۔ جس کی کتاب کی ہر جگہ مانگ ہو یا جس کا ترجمہ ہو۔ تاہم جن ادیبوں نے مجھے خطوط یا تاثرات لکھے ہیں، وہ بے ساختہ لکھے گئے ہیں اور یہ مجھے پر خلوص اور محبت بھرے لگے ہیں۔

پڑھنے لکھنے کے باوجود کئی چیزوں کے نبھانے میں مجھے جھجک آتی تھی اور میں بزدل تھا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک مرحلے پر میں نے محسوس کیا کہ جن چیزوں اور باتوں کے کرنے میں مجھے خوف ہوتا ہے، مجھے ان پر غالب آنا چاہئے۔ چنانچہ اکیلے میں قلابازی (Somersault) کی۔ بندوق چلائی، گاڑی چلائی، سائیکل چلانا سیکھا۔ گھوڑ سواری میں نے مال مویشی فارم میں کی تھی۔

میرے خلاف شکایات بھی ہوئی ہیں۔ جن میں دو تین، سنگین نوعیت کی تھیں۔ میں میڈیا میں کام کرتا تھا۔ سرکاری ملازم تھا۔ جس کے خلاف شکایتیں کرنا آسان ہوتا ہے۔ میرے اپنے نظریات ہیں۔ اپنی انفرادیت ہے۔ اپنے اصول ہیں۔ میں لکھتا تھا۔ تاہم میرا بال بیکا نہیں ہوا۔ کوئی آنچ نہیں آئی، کیونکہ میں سچائی اور حق پر تھا۔ تاہم مجھے پختہ اعتقاد ہے کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ جسے اللہ بچائے، اسے کون چکھے۔ چاہے یہ معاملات زندگی ہوں یا موت ہو۔ مجھے اس کا عملی تجربہ ہے۔ میں

کئی دفعہ موت کے منہ سے نکل آیا۔

میں لیہہ کے پاس ایک گاؤں ماٹھوو ٹرنری فارم پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو گھوڑے پر سوار اپنے ڈیرے کی طرف لوٹ رہا تھا۔ میں نے کچھ گھاس رات کو گھوڑے کو کھلانے کیلئے اس کی پیٹھ پر رکھی تھی۔ جب گھوڑا اچلا تو گھاس گرنے لگی۔ پیچھے نظر ڈالتا ہوا گھوڑا گھبرا کر بدک گیا۔ ادھر میرا بوٹ رکاب میں پھنس گیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑا۔ میری آنکھوں کے سامنے موت منڈلانے لگی۔ یہ بھیانک موت ہوسکتی تھی اور جسم سے ٹانگیں اور بازو الگ ہوسکتے تھے۔ خوش قسمتی سے اس صورت حال میں میرا ہوش برقرار رہا اور میں نے لگام کو تھامے رکھا۔ ماٹھو لبرانگ کی عمارت کے پاس گھوڑا دوڑ رہا تھا کہ اچانک مکان کی آڑ میں سے ایک آدمی نکلا اور گھوڑے سے ٹکرا کر چاروں شانے چت ہوا۔ گھوڑا رک گیا۔ میں نے اسی لمحہ فی الفور رکاب میں سے پاؤں نکالے اور اتر گیا۔ آج بھی جب اس واردات کو یاد کرتا ہوں تو جسم میں سنسنی سی دوڑتی ہے۔ تب میں انیس سال کا تھا۔ اس واقعہ سے ایک سال پہلے میں سرینگر میں سٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ ایک روز مجھے دریائے جہلم تیر کر پار کرنے کی سوجھی۔ ان دنوں امیرا کدل کے نیچے تیراکی کی جاتی تھی۔ میں نے شاید دریا کا آدھا پاٹ تیرا ہوگا۔ میرے بازو تھک گئے۔ میں مڑا اور بمشکل تیرتا ہوا دریا کے کنارے ایک ڈونگا تک پہنچا۔ دونوں ہاتھ اور بازوں ڈونگے پر لٹکا دیئے۔ ایسے میں تھکے ہوئے بازو کو تھوڑی سی راحت ملی اور جان بچی۔

فیلڈ پبلسٹی محکمہ میں ڈیوٹی کے دوران میں جیپ میں خلسے گاؤں آرہا تھا۔ اچانک موڑ سے نیم فوجی بیکن کی ایک شکتی مان گاڑی تیزی سے اترائی میں ہماری طرف بڑھی۔ بریک لگانا اس کے لئے مشکل تھا اور تنگ سڑک پر دائیں بائیں مڑنا ہمارے لئے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ بڑی گاڑی نے ہماری گاڑی کو زور سے ٹکر ماری اور مجھے سیٹ پر سے اچھال پھینکا۔ میرے رخسار پر ہلکا سا زخم آیا اور معجزاتی طور بچ گیا۔

ایک روز میں اپنے مکان میں ایک کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک کچن سے بیوی کی آواز آئی۔ میں کچن میں گیا۔ گیس کا پائپ چولھے سے نکل آیا تھا اور شفاف پائپ میں سے آگ کا شعلہ تیزی سے گیس سلینڈر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چلا کر بیوی سے بھاگنے کے لئے کہا۔ وہ خطرے سے بے خبر اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اسی لمحہ دماغ نے کام کیا اور میں نے فوراً گیس کا پلگ بند کیا۔ ورنہ چند

لمحوں میں گیس سلینڈرز وردار دھماکے سے پھٹ گیا ہوتا۔

۸/اگست ۱۹۵۳ء کو شیخ محمد عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدے سے معزول کر کے گرفتار کیا گیا۔ اس روز بڑا خون خرابہ ہوا۔ لال چوک لوگوں کے مظاہروں کا مرکز تھا۔ جہاں ہمارا ہوسٹل تھا۔ دوسرے روز ہم لال چوک گئے۔ ماحول پُر تناو تھا۔ پلیڑیم کے پاس چند سپاہی بندوق تانے کھڑے تھے۔ اس کے ارد گرد چند آدمی موجود تھے۔ اچانک ایک آدمی نے شیر کشمیر کا نعرہ لگایا۔ فوجیوں نے بندوق کی شست باندھی۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگنے پر پیچھے سے کسی کی تمسخرانہ آواز آئی اور ساتھ ہی دو گولیاں چلیں۔ بعد میں سنا کہ وہاں دو آدمی مارے گئے۔

میں سرینگر میں اپنی بہن کے مکان میں سکونت پذیر تھا۔ ایک دفعہ آدھی رات کے وقت آگ چٹخنے کی آواز ہوئی اور ساتھ ہی کسی چیز کے جلنے کی بو آئی۔ میں فوراً اٹھا اور اس طرف بڑھا، جہاں سے چٹخنے کی آواز آرہی تھی۔ یہ چھ سات فٹ اونچا ایک خانے میں سے آرہی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دونوں ہاتھوں کے سہارے خانے میں جھانکا۔ بجلی کے تار جل رہے تھے۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں اور ذرا سا آگے گئی ہوتیں تو بجلی کا جھٹکا میرا کام تمام کرتا۔

میں کیوں لکھتا ہوں؟ ادیبوں سے اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے۔ اکثر ادیبوں کا جواب لگ بھگ یکساں ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو سے جب یہ سوال کیا گیا تو منٹو نے جواب دیا۔ ''میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں؟ میں کیوں پیتا ہوں؟''

اس سوال کا جواب مجید امجد نے قدرے دوسرے انداز میں یوں دیا ہے۔ ''آپ تو پوچھتے ہیں میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی دریا سے پوچھے ''تم کیوں سفر میں ہو؟ باغوں کے کوئلوں سے کوئی کہے، تم کیوں کوکتی ہو؟ مستانے جھونکوں سے کوئی سوال کرے، تم ان اوس بھری ہریالیوں میں کیوں لڑکھڑاتے پھرتے ہو؟ میں نے منٹو اور مجید امجد کے یہ جوابات پڑھے نہیں ہوتے تو شاید میں نے بھی اسی طرز کا جواب دیا ہوتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر پڑھنا لکھنا نہیں ہوتا، تو زندگی اجیرن ہوتی، جینا حرام ہوتا۔ میرے لئے لکھنا پڑھنا زندگی کا بڑا مصرف ہے۔

ممتاز حسین نے ایسی ہی ذہنی کیفیت کا جواب یوں دیا ہے۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میں لکھنے پر

اندر سے مجبور ہوں۔ کبھی جلدی جلدی اور کبھی طویل خاموشی کے بعد۔

ناول نگار گراہم گرین نے لکھا ہے۔ ''لکھنا ایک قسم کا علاج معالجہ ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو نہیں لکھتے، مصوری نہیں کرتے یا دھنیں نہیں بناتے۔ وہ کیسے دیوانگی، مالیخولیا اور خوف سے محفوظ رہ سکتے ہیں، جو انسانی فطرت میں دخل ہیں۔''

کبھی کبھار زیادہ لکھنے سے میری انگلیاں دکھتی ہیں اور میں پریشان ہو جاتا ہوں کہ درد کب ختم ہوگا؟ اگر ختم نہ ہو تو کیا ہوگا؟''

میرے ساتھ قلم، کوئی کتاب یا جریدہ اکثر رہتا ہے۔ اگر کوئی نادر خیال ذہن میں آجائے تو میں اسے قلمبند کرتا ہوں۔ چوک ہوتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے کہ میں نادر خیال کو تحریر نہیں کر سکا۔ اس خیال پر ایک کہانی تخلیق ہو سکتی تھی۔

میں کیوں لکھتا ہوں؟ میں نے اوپر جو جواب دیا ہے۔ وہ ادھورا ہے۔ میں اس لئے لکھتا ہوں کہ جس بات سے میں متاثر ہوتا ہوں، اس میں قارئین کو بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ میں کسی جگہ، کسی کتاب، کسی انسان اور کسی واقعہ سے متاثر ہوتا ہوں۔ تاثرات سرور بخش اور امید افزا بھی ہوتے ہیں اور مایوس کن اور کربناک بھی ہوتے ہیں۔

میں ایک خوبصورت جگہ دیکھتا ہوں اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا گن گاتا ہوں۔ پھر قارئین کو اپنے مشاہدے میں شریک کرتا ہوں تاکہ وہ میری آنکھوں سے اس جگہ کو دیکھیں اور داد دیں۔ کوئی کتاب اچھی لگے تو میں دوسروں کو اس کتاب سے روشناس کرتا ہوں اور اسے پڑھنے کی تحریک دیتا ہوں۔ اسی طرح کسی انسان میں کوئی خاص بات دیکھے، تو میں اس سے متعلق لکھتا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ جو چیز مجھے اچھی یا بری لگے تو دوسروں کو بھی اچھی یا بری لگ سکتی ہے۔ کیونکہ انسان کی نفسیات ایک جیسی ہوتی ہے۔

ہم جب کسی پر ظلم اور زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں تو ہمارا دل کڑھتا ہے۔ اگر میں صاف صاف لکھ نہ سکوں تو ایسے واقعات کو لکھنے کے لئے فکشن کا سہارا لیتا ہوں۔

میں نے دس سال پہلے اپنی کتاب ''قلم، قلم کار اور کتاب'' میں لکھا ہے۔ ''انسان اپنے

نظریات، اعتقادات، تجربات اور مشاہدات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ورثہ میں دینا چاہتا ہے۔''

سپین کے فلسفی مائیکل ڈی ادنا مونو نے لکھا ہے:

''انسان لافانیت کے تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ موت کے بعد وہ ایک ایسا خلا اپنے پیچھے چھوڑ دے، جس کو کوشش کے بعد پُر کرنا ممکن نہ ہو۔''

کسی نے بڑی سادگی سے کہا ہے۔''کسی کو ادب کا ذوق ہو تو سوائے خامہ فرسائی کوئی علاج نہیں۔''

میں نے فکشن (کہانیاں اور ناول) ادبی مضامین، تاریخ، سوانح عمری، خاکے اور سفر نامے لکھے ہیں۔ اخبارات کے لئے کالم اور مذہب، فلسفہ، تعلیم وغیرہ کے بارے میں مضامین قلم بند کئے ہیں۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا کام کیا ہے۔ ریڈیائی بات چیت، فیچر اور ٹی وی کے لئے سیریل اور سکرپٹ لکھے ہیں۔ جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ میں ادب برائے ادب پر نہیں بلکہ ادب میں مقصدیت پر یقین رکھتا ہوں لیکن ادبی نعرہ بازی پر نہیں۔ میں حقیقت نگاری پر یقین رکھتا ہوں۔ حقائق کو دیانت داری سے پیش کیا جائے تو اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مارکسی دانشور اینجلز نے کہا ہے کہ مصنف کے سیاسی اور سماجی خیالات جتنے چھپے ہوئے ہوں گے، فن اتنا ہی لطیف ہوگا۔ میں اپنی انا کی تسکین کیلئے نہیں لکھتا جیسا کہ چند ادیبوں کا دعویٰ ہے۔ ادیب اور قاری میں اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔

میرا عقیدہ ہے کہ ایک ادیب کی نظر مختلف علوم، تاریخ اور مذہب پر ہونی چاہئے۔ علم کے ایک شعبہ میں غیر معمولی مہارت حاصل کرنا ایک زندگی میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم مختلف علوم کی مبادیات کی جانکاری ضروری ہے۔ چیخوف کے الفاظ میں ''ادیب کا فرض ہے کہ سب کچھ جانے، ہر بات سیکھے اور معلوم کرے کہ کہیں دھوکا نہ کھائے۔'' بقول ایمرسن، ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ جو میں اس سے سیکھ سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں اس کا شاگرد ہوں۔''

......●●●......

انٹرویو

☆......سلیم سالک

گفتگو بند نہ ہو!

سوال: آپ نے ادبی زندگی کی شروعات کب اور کیسے کی؟

جواب: میں شروع ہی سے کتابوں کا شائق تھا۔ جب مجھے درسی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب ملتی تو میں اس کو بڑے شوق سے پڑھتا۔ اُن دنوں لیہہ میں کوئی لائبریری نہیں تھی، لیکن ایک دو گھرانے ایسے تھے جن کے پاس کتابیں ہوتی تھیں۔ میں اکثر کتابیں مستعار لے کر پڑھا کرتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان دنوں لیہہ میں بچوں کا ایک معروف رسالہ ''رتن'' آیا کرتا تھا جو ریاست کے معروف صحافی لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں نکلتا تھا۔ میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا، میں نے مکتبہ جامعہ دہلی کے رسالہ ''پیام تعلیم'' میں ایک لطیفہ شائع کرنے کی غرض سے ارسال کیا، جس کے شائع ہونے سے میری کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پھر میں نے اپنے ہم جماعتی عبدالحکیم کے ساتھ مل کر ایک کہانی لکھی، جو ہم نے ماہنامہ ''آج کل'' کو روانہ کی۔ اُن دنوں آج کل کے مدیر جوش ملیح آبادی ہوا کرتے تھے، ہم نے خط میں درخواست کی تھی کہ کہانی میں اصلاح کرنے کے بعد ضرور شائع کریں، لیکن وہ کہانی شائع نہ ہوسکی۔ پھر میں نے سنجیدگی کے ساتھ افسانوں کا مطالعہ شروع کیا۔ 1951ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد مجھے سرینگر آنا پڑا۔ یہاں ان دنوں ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں، جن میں برج پریمی اور حسرت گڈھا کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔ ایک نشست میں مجھے افسانہ سنانے کا موقع ملا، تو میں نے ''آرزوئیں'' کے عنوان سے کہانی پڑھی۔ جس کو کافی سراہا گیا، بعد میں وہ کہانی ''پمپوش'' میں شائع ہوئی۔

سوال: ریاست کے باہر کس رسالے میں آپ کی کہانیاں شائع ہوئیں؟

جواب: ریاست کے باہر میری ابتدائی کہانیاں ''بانو'' اور ''شمع'' میں شائع ہوئیں۔ ان دنوں ''شمع'' میں چھپنا آسان نہیں تھا، اس رسالے کی سرکولیشن قریباً ایک لاکھ ہوا کرتی تھیں۔ ''شمع'' میں اکثر بلاعنوان کہانیاں شائع ہوتیں اور قارئین ہی کہانی کا عنوان طے کرتے۔ جب میری پہلی کہانی بلاعنون شائع ہوئی تو رسالے کے مدیر یونس دہلوی نے مجھے خط لکھا کہ آپ کی کہانی کو بہت پسند کیا گیا ہے اور قریباً چھ ہزار قارئین نے عنوان ارسال کئے ہیں، جس سے مجھے بہت حوصلہ افزائی ملی، پھر میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

سوال: افسانہ لکھتے وقت آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟

جواب: جب کوئی خیال strike کرتا ہے تو افسانے کا وجود عمل میں آتا ہے یا کسی خاص واقعہ سے متاثر ہو کر اس کو قلم بند کرتا ہوں، پھر اس پر غور خوض کر کے کہانی کو بننے کی کوشش کرتا ہوں۔ کرداروں کی تجسیم کاری سے لے کر کہانی کی تکمیل تک میرے ذہن میں کہانی کا پورا پلاٹ روبہ عمل رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں:

> ''ایک دن سرینگر میں پنڈتوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات چل رہے تھے، شہر میں تناؤ کا ماحول تھا۔ میں تانگے پر سوار تھا تو میرے دائیں بائیں کچھ پنڈت حضرات اور ایک دو خواتین بھی بیٹھی تھیں۔ باتوں باتوں میں کسی نے پوچھا، بھائی آپ کہاں سے ہیں؟ انہوں نے جب لداخ کا نام سنا تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ لداخ میں تو بودھ رہتے ہیں، تو انہوں نے مجھے Buddhist بنا دیا۔ انہوں نے میرا نام نہیں پوچھا اور میری پہچان نہ ہو سکی۔ اس واقعے نے مجھے اتنا strike کیا کہ میں نے ''نام'' کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو بعد میں ''شمع'' میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی مشہور ہوئی اور اس کا تلگو زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس سال تلگو میں بہترین کہانیوں کا انتخاب شائع ہوا، جس میں یہ کہانی بھی شامل ہوئی اور مجھے باضابطہ اس کا معاوضہ بھی ملا۔''

سوال: آپ کی کہانی ''ہوا'' پر بہت کنٹروورسی ہوئی ہے یہاں تک کہ اس کو سرقہ تصور کیا گیا۔ ایسا کیوں؟

جواب: حیدر آباد کے ایک پروفیسر صاحب نے مجھے پر یہ الزام لگایا کہ میں نے اُن کی کسی کہانی کا سرقہ کرتے ہوئے ''ہوا'' کو تحریر کیا ہے۔ میں نے ماہنامہ شمع کے وساطت سے انہیں چلینج کیا کہ وہ اپنی کہانی پیش کرے لیکن ثبوت میں کہانی پیش نہیں کی۔ اصل معاملہ یہ کہ امریکہ میں ایک خاتون ڈاکٹر روینہ اگروال انگریزی کی پروفیسر تھیں، ان کو میری کہانی ''ہوا'' پسند آئی اور انہوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔ پھر انہوں نے یہ ترجمہ ڈنمارک میں لداخ پر ہونے والے ایک سیمینار میں پڑھا اور سامعین نے پسند کی پروفیسر صاحب کو راس نہیں آئی۔ روینہ نے بعد میں مجھے بتایا کہ امریکہ میں ایک اور تقریب میں یہ کہانی پڑھی تھی، وہاں جنرل پرویز مشرف کے بیٹے اور بہو بھی شامل تھیں، انہوں نے کہانی کے پس منظر کے بارے میں سوال کیا۔ اصل میں کہانی لداخ میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر تھی جو ایک حقیقت تھی۔

میں نے ''شمع'' میں تفصیل سے ایک مراسلہ لکھا، جس میں، میں نے ڈنمارک والی بات بھی لکھ دی۔ میں نے یونس دہلوی صاحب کو لکھا کہ میں پروفیسر موصوف کے خلاف عدالت میں جا رہا ہوں، تو انہوں نے لکھا کہ موصوف کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور یوں یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

سوال: آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ کب شائع ہوا؟

جواب: میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' شائع کرنے کے لئے مجھے سرکار سے اجازت لینا پڑی۔ ان دنوں PIB کے آفیسر معروف شاعر جگن ناتھ آزاد تھے۔ انہوں نے مجھے اپنا مسودہ بھیجنے کے لئے کہا، پھر میرا مسودہ دہلی کے ایک پروفیسر کو ریویو کے لئے گیا۔ اجازت ملنے کے بعد کتاب شائع کی تو بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد میرے دو ناول ''وہ زمانہ'' (1975) اور ''دل ہی تو ہے'' (1978) شائع ہوئیں۔ ''دل ہی تو ہے'' پر مجھے ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے ایوارڈ ملا۔

سوال: آپ کی مشہور کتاب ''قلم، قلم کار اور کتاب'' لکھنے کے کیا محرکات رہے ہیں؟

جواب: میں نے ''قلم، قلم کار اور کتاب'' کے دیباچہ میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ میں ہمیشہ ادیبوں

سے متاثر رہا ہوں، یہاں تک کہ ادیبوں کو Super man سمجھتا تھا۔ مجھے ادیبوں کے تئیں ہمیشہ تجسس رہتا تھا اور خاص کر جو بڑے ادیب گزرے ہیں۔ کرشن چندر کا بڑا مداح تھا۔ ان کی کہانیاں مجھے بہت پسند تھیں۔ ان کی لگ بھگ ساری کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ اردو ادب سے ہوتے ہوئے میں نے انگریزی ادب کا خوب مطالعہ کیا۔ کہانیاں اور ناول جم کر پڑھے۔ ساتھ ہی دلچسپ واقعات کو جمع کرنا شروع کیا۔ وہ کس طرح لکھتے تھے، لکھنے والوں کے محرکات کیا تھے اور اس طرح مجھے مواد ملتا تھا۔

1979ء کو ریاستی سرکار نے Children's Year کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اس سال کو بین الاقوامی طور بچوں کا سال قرار دیا گیا تھا۔ شیخ صاحب ان دنوں وزیر اعلیٰ تھے، انہوں نے بچوں کے حوالے سے مسودے طلب کئے تھے اور بہترین مسودہ پر انعام بھی رکھا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں دو مسودے بچوں کے حوالے سے تحریر کئے، جن میں ''کتابوں کی دنیا'' اور ''لداخ کی سیر'' تھا۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے دونوں مسودوں پر انعام ملا۔ ریاستی سرکار کو وہ مسودے شائع کرنے تھے لیکن بعد میں وہ شائع نہیں ہوئے۔ اس کے بعد میں نے مطالعہ کے دوران جو مواد اور تراشے جمع کئے تھے ان کو ایک مضمون کی شکل دے کر ماہنامہ ''آج کل'' میں شائع کرنے کی غرض سے بھیج دیا۔ ان دنوں ''آج کل'' کے مدیر محبوب الرحمان فاروقی تھے۔ انہوں نے مضمون کو چار قسطوں میں شائع کیا۔ مضمون کی پذیرائی ہوئی، پھر فاروقی صاحب نے مجھے خط لکھا کہ ہم اس مقالے کو کتابی صورت میں چھاپنا چاہتے ہیں، اگر آپ اس مواد میں مزید اضافے کرتے تو بہتر رہتا، کیونکہ پبلیکیشنز ڈویژن میں ایک کتاب کے لئے کم سے کم ڈیڑھ سو صفحات ہونے چاہئیے۔ اس کے لئے میرے پاس مواد تھا۔ اس طرح ''قلم، قلمکار اور کتاب'' منظر عام پر آگئی۔

سوال: لداخ کے متعلق آپ نے کون کون سی تصانیف تحریر کیں ہیں؟

جواب: میں شروع ہی سے لداخ کے متعلق جانکاری حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بد قسمتی سے لداخ کی تاریخ سے متعلق بہت کم مواد ملتا تھا، یہاں تک کہ صرف دو کتابیں مشکل سے دستیاب تھیں جن میں ایک وزیر حشمت اللہ کی تاریخ لداخ اور دوسری ڈاکٹر اے ایچ فرانکی کی A History of Western Tibet تھی۔ جب میں بحیثیت استاد تعینات ہوا تو میں بچوں کو لداخ کے متعلق بتایا

کرتا تھا۔لداخ کا ماضی، لداخ کا کلچر، لداخ کی تہذیب وغیرہ میرے پسندیدہ موضوعات تھے لیکن میری معلومات محدود تھیں۔ بعد میں میری پوسٹنگ سرینگر میں PIB میں ہوئی، تو میں نے ریسرچ لائبریری جانا شروع کیا اور ماضی کے لداخ کے بارے میں وافر اور دلچسپ مواد ملا۔ان دنوں زیراکس کی سہولیت میسر نہیں تھی اور لکھنا پڑتا تھا۔میں اکثر روزانہ دو گھنٹے مطالعہ کرتا رہتا اور ساتھ ہی لداخ کے متعلق نوٹس بھی بناتا رہتا، جو بعد میں میرے مضامین کی شکل میں شیرازہ، تعمیر، آج کل اور ہمارا ادب میں شائع ہوتے رہے۔اس دوران مجھے غیر ملکی سیاحوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، جنہوں نے مجھے لداخ کے متعلق کچھ انگریزی کتابیں ارسال کیں، جن سے میں نے بہت استفادہ کیا۔ 1989ء میں مجھے فرانس میں لداخ کے حوالے سے مدعو کیا گیا لیکن پاسپورٹ تیار نہیں تھا اور میں نہیں جا سکا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بعد میں مجھے لداخ کے حوالے سے قریباً بارہ ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا۔لداخ کے موضوع پر میری چار کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔(۱) لداخ: تہذیب وثقافت، (۲) لداخ: محققوں اور غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں، (۳) Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia، (۴) اور لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے۔

سوال: آپ کا ایک مضمون ''کشمیری نژاد کا تبتّی شاعر فضل اللہ'' کے موضوع پر ہے؟

جواب: تبت کے معروف شاعر فضل اللہ کشمیری نژاد ہیں۔ان کے آباواجداد کشمیر سے ہجرت کر کے تبت میں آباد ہوئے۔فضل اللہ فارسی کے بڑے عالم تھے۔انہوں نے تبتّی زبان میں ایک کتاب لکھی، جس کو بہت شہرت ملی۔ یہ کتاب اخلاقیات اور مذہب پر مبنی ہے۔اس میں تشبیہات وتلمیحات میں تبتّی لوک روایات اور پند ونصائح کو خوب صورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تبت اور اس کے نواح میں اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا متن زبان زد عام وخاص ہوا۔ایک تبتّی بودھ سکالر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ساتھ ہی فضل اللہ کی شخصیت اور فن پر بھرپور مقالہ لکھا ہے۔ میں نے اس کتاب کا انگریزی کے توسط سے مطالعہ کیا۔

سوال: آپ کے افسانوں کا ترجمہ کس کس زبان میں ہوا ہے؟

جواب: امریکہ میں مقیم ایک خاتون ڈاکٹر روبینہ اگروال نے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، میری ایک درجن

کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور دہلی کے ایک پبلشر نے انہیں کتابی صورت میں شائع کی۔ ڈاکٹر روینہ اگروال تب امریکہ کے ایک کالج میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ موصوفہ نے لداخ کی معاشرتی زندگی اور ثقافت پر اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ ہم دونوں ''انٹرنیشنل ایسوسیشن فار لداخ سٹڈیز'' کے ممبر تھے۔ اس لئے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انگریزی کے علاوہ میری لگ بھگ دس کہانیوں کا ہندی میں ترجمہ ہوا۔ نیز میری دو کہانیوں کا جرمنی اور ایک ایک کا تلیگو، کشمیری، بنگالی اور گجراتی میں ترجمہ ہوا ہے۔ انگریزی میں ترجمہ کہانیوں کے مجموعہ The Forsaking Paradise کی وجہ سے میرا کئی لوگوں سے رابطہ ہوا اور دہلی یونیورسٹی کے affiliated ڈاکٹر ذاکر حسین کالج نے ایک بین الریاستی سمینار میں اپنی کہانی سنانے کے لئے مجھے دعوت دی۔

سوال: لداخ میں اردو زبان و ادب کی کیا صورتِ حال ہے؟

جواب: لداخ میں اردو زبان کی صورتِ حال کو تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ریاست جموں و کشمیر کی ایک اکائی ہونے کے پیش نظر اردو یہاں کی سرکاری زبان ہے۔ تاہم اس کا پڑھنا اور نہ پڑھنا طالب علم کی مرضی ہے۔ خطے کے ضلع کرگل میں سرکاری اور پرائیویٹ سکولوں میں اردو شوق سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن ضلع لیہہ میں اردو کی درس و تدریس جزوی طور ہے۔ خاص کر ماسوائے چند پرائیویٹ سکول، اکثر پرائیوٹ سکولوں میں اردو پڑھائی نہیں جاتی ہے۔ خطے کے طلباء کی اکثریت انہی سکولوں میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ تاہم لداخ میں اردو کی اپنی تاریخ ہے۔ صدیوں پہلے خود مختار لداخ میں اردو رابطے کی ایک زبان تھی۔ کشمیر اور پنجاب سے لداخ کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات تھے۔ اور باہمی بات چیت کا ذریعہ اردو تھی۔ انیسویں صدی کے پہلے ربع کے دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر ولیم مور کرافٹ نے دو سال لداخ میں گزارے۔ انہوں نے خطے میں فارسی اور اردو دان دیکھے۔ ویسے بھی اردو زبان میں اپنی دلکشی اور جاذبیت ہے۔ فلم، ریڈیو، ٹی وی اور اردو شاعری نے اپنے اور پرائے دونوں پر اپنی گرفت قائم رکھی ہے اور اپنے اور پرائے سبھی اردو کی ستائش کرتے ہیں۔

سوال: اردو زبان و ادب میں تخلیق کی رفتار کیا ہے؟ لداخ نے بھی اردو میں کیا اچھے قلم کار پیدا کئے ہیں۔

جواب: مرحوم اکبر لداخی تخلیقی فکر و ذہن رکھتے تھے۔ اردو ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ لیکن انہوں

نے بہت کم لکھا۔ کاچو سکندر خان مرحوم خطۂ لداخ کے قد آور ادیب اور شاعر ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے کئی تصنیفات ورثہ میں چھوڑی ہیں۔ ان کے فرزند کاچو اسفند یار خان اچھے ادیب اور شاعر ہیں۔ دو شعری مجموعوں کے علاوہ انہوں نے کئی تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ بابو عبدالقیوم نے اب تک چھ کتابیں لکھی ہیں۔ جو زیادہ تر لداخ کی تاریخ اور تمدن سے متعلق ہیں۔ وہ لیہہ میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کے علاوہ عبدالحمید تنویر، عبدالرشید رہگیر، خیال لداخی، رقیہ بانو، زین العابدین (مرحوم) اور منیر احمد (مرحوم) نے اردو زبان وادب اور شعر و شاعری میں اچھا کام کیا ہے۔ سنزین آنگچک اور چھرنگ نربو (واکا) کی اردو ادب پر اچھی نظر ہے اور اردو میں خوب لکھتے ہیں۔

سوال: لداخ ہل ڈیولپمنٹ کونسل اردو کے لئے کوئی رول ادا کر رہا ہے؟

جواب: کونسل اردو کے تیئں سنجیدہ نہیں ہے البتہ لداخی مادری زبان کی ترقی و ترویج کے لئے کوشاں ہے۔

سوال: آج کل آپ کس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔

جواب: ۲۰۱۶ء اور ۲۰۱۷ء میں میں نے ایک ایک کتاب لکھی۔ فوری طور پر میں Stawa وغیرہ میں گزشتہ تین سال کے دوران لکھے انگریزی مضامین کو کتابی صورت دینا چاہتا ہوں۔ اگر حیات رہی اور صحت نے اجازت دی تو میں مذہب پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں اور ایک ناول لکھنے کا ارادہ ہے جن کے لئے میں نے مواد جمع کیا ہے۔ اردو کے مختلف رسائل میں مطبوعہ ادبی، علمی مضامین اور خاکوں کو کتابی صورت میں کمپائل کرنے کی بھی خواہش ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

...... ●●● ......

☆......انور حسین

(انگریزی سے ترجمہ: رؤف راتھر)

ایک ملاقات عبدالغنی شیخ کے ساتھ[1]

چند سال قبل، جب میں ایک ٹیوشن مرکز میں پڑھا رہا تھا تو میری نظر جموں و کشمیر سٹیٹ بورڈ آف سکول ایجوکیشن کی مرتب کردہ دسویں جماعت کی انگریزی کی نصابی کتاب میں شامل ایک کہانی ''ابیلے'' پر پڑی۔ کہانی ترجمہ شُدہ تھی اور لیہہ کی ایک دادی اماں کے بارے میں تھی۔ مجھے یہ کہانی حقیقت لگی۔ کہانی رواں دواں تھی اور اس کے کردار اتنے جانے پہچانے معلوم ہوتے تھے کہ جیسے لگ رہا تھا کہ کوئی اپنی دادی اماں کے متعلق بات کر رہا ہے۔ حالانکہ میرا اس کہانی میں کوئی اشتراک نہیں تھا، تاہم مجھے ''اَبیلے'' کے کردار کچھ اپنے سے لگے۔

چند مہینے بعد، میں نے اپنے ایک دوست کے گھر پر ایک کتاب دیکھی۔ یہ کتاب لداخ کی تاریخ کے متعلق تھی، جس میں ماضی کے لداخیوں کے رہن سہن کی بھی عکاسی کی گئی تھی۔ کتاب میں موراوین مشنری کی طرف سے لداخ میں قائم کردہ پہلے سکول کے متعلق مفصل جانکاری دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں متعدد لداخی روایتوں اور تہواروں کے متعلق معلومات ہیں۔ مذکورہ کہانی اور کتاب میں ایک چیز مشترک ہے، وہ یہ کہ دونوں ایک ہی شخص نے لکھی ہیں اور وہ شخص ہیں عبدالغنی شیخ۔

شیخ صاحب ایک ایسے قلمکار ہیں جنہوں نے ہمیشہ اعلیٰ ادبی اقدار کا احترام کیا ہے اور اپنے قارئین کو اپنا تحریر کیا ہوا ہر ایک لفظ جینا اور محسوس کرنا سکھایا ہے۔ وہ ہر چیز کی تفصیل میں جانے کے حامی

---

[1] مصنف کا یہ مضمون ''ستاوا'' میگزین کے اکتوبر 2017ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

ہیں۔ وہ لداخ کی تاریخ، ورثے اور کلچر کے حوالے سے ایک مستند آواز ہیں۔ وہ موجودہ دور کی اُن چند باا ثر شخصیات میں سے ہیں، جنہوں نے متعدد اہم تاریخی واقعات کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے۔

(بحوالہ: جب میں فوت ہوا، ستاوا جولائی 2016ء (The day I was passed away, Stawa, July-2016)

بحیثیتِ ایک آزمودہ کار قلمکار، جناب عبدالغنی شیخ 17 کتابوں کے خالق ہیں اور انہوں نے متعدد ایوارڈ حاصل کئے ہیں۔

اگست (2017) میں اتفاق سے میں لیہہ میں تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس تاریخی شخصیت سے ملاقات کروں۔ آسمان بادلوں سے پاک تھا اور سورج مغرب کی جانب آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ لیہہ کا بازار سیاحوں اور پھڑ پھڑاتے ہوئے مذہبی جھنڈوں کے بیچ بودھ عقیدت مندوں سے بھرا ہوا تھا۔ جو ایک 'مانے' کے گرد طواف کر رہے تھے۔ شیخ صاحب نے فون پر مجھ سے ملنے کی حامی بھرلی۔ میں نے لیہہ کی بھول بھلیوں والی سڑکوں اور گلیوں میں سے اپنے ایک دوست کے ساتھ جناب شیخ صاحب کا مسکن تلاشنا شروع کیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور ہر کوئی تپتی دوپہر کے فرصت کے لمحات سے محظوظ ہو رہا تھا۔ یہ صرف میں اور میرا دوست تھا، جن کو جلدی تھی۔ میں شیخ صاحب کو منتظر نہیں رکھنا چاہتا تھا، اس لئے راہگیروں کے بتائے ہوئے راستے کے عین مطابق منزل تک پہنچنے کے چکر میں تھا۔ بھلا ہو میرے پُر جوش عزم کا، مجھے راہگیروں کی دی گئی ہدایات پر چلنے کا جو بھرم تھا، وہ جلد ہی ٹوٹ گیا اور ہم منزل پانے کی تگ ودو میں کھو گئے اور یوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو گیسٹ ہاؤسوں اور ہوٹلوں کے آرائشی سائن بورڈوں سے لبالب بھری تھی۔

آخر کار میں نے شیخ صاحب ہی سے فون پر بات کرنا مناسب سمجھا تاکہ وہ مجھے اپنے گھر کا پتہ بتا سکیں۔ شیخ صاحب نے صبر وسکون کے ساتھ ہمیں اپنے گھر کا صحیح پتہ ڈھونڈنے کے لئے راستے کی نشاندہی کروائی اور یوں ہم انہیں کی دی گئی ہدایات کے مطابق اُن کا مسکن ڈھونڈنے چل پڑے۔ راستے میں ہمیں ایک شاندار لداخی فنِ تعمیر دیکھنے کو ملا۔ یہ لیہہ محل تھا جس کی دلکشی اور جاذبیت سیاحوں اور فن کے دلدادوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بالآخر سائن بورڈوں سے بھری مزید کچھ گلیاں چل کر میں

نے تقریباً اُسی سال کے ایک بزرگ کو ایک ایسی عمارت کی سیڑھی پر بیٹھے دیکھا، جو ایک طرف سے کھِسک گئی تھی۔ انہوں نے ہاتھ سے ہمیں اشارہ کیا۔ شاید ہماری تیز تیز چال ڈھال سے انہوں نے ہمیں پہچان لیا تھا۔

ہمارے تعارف کرانے پر انہوں نے گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں اپنے کمرے میں لے گئے۔ نیچے بیٹھتے ہی ہم نے مختلف چیزوں پر گفتگو کرنا شروع کی۔ میں نے گھر پر ہی یہ تیاری کر رکھی تھی کہ میں کیا پوچھوں گا اور کس طرح سے پیش آؤں گا۔ لیکن یہاں تو کچھ اور ہی ہوا۔ میں بیٹھا سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ مجھے لگنے لگا جیسے ایک عمر گزر گئی۔ جب میں نے ہمت جُٹائی اور یہ سوال پوچھا کہ آپ نے لکھنا کب سے شروع کیا۔ انہوں نے نہایت بردباری سے اس کا جواب دیا اور یہ بتایا کہ کس طرح اپنے دور کے موقر رسالوں نے پہلے پہل اُن کی لکھی ہوئی کہانیاں مسترد کیں اور کس طرح انہوں نے اس صورت حال سے نمٹ لیا۔ اُن کے اپنے تجربات اور مشاہدات کے متعلق روداد مجھے اُن کی کہانیوں کی طرح مسحور کُن لگی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے لوگ رسالوں کے مدیران کو خط لکھتے تھے اور پھر بے تابی سے ڈاک کا انتظار کرتے تھے تاکہ یہ دیکھ سکیں کہ خط رسالے میں شائع ہوا ہے کہ نہیں۔ اُن کی اس بات سے مجھے اپنا بچپن یاد آیا۔ جب میں نہایت بے صبری سے 'چاچا چودھری' کے تازہ شمارے کا انتظار کرتا تھا۔

اُردو جریدوں کا بے بہا ادبی خزانہ موجودہ دور میں آہستہ آہستہ دَم توڑ رہا ہے۔ تاہم یہی خزانہ میں نے شیخ صاحب کے کمرے کی الماریوں میں نہایت قرینے سے سجا ہوا دیکھا۔ انہوں نے چند جریدوں کے صفحات الٹتے ہوئے بتایا کہ مدیروں نے متعدد باران کی نگارشات کو رد کیا جو اپنی ٹانگوں پر کھڑا ایک ادیب کی مشکلات تھیں۔ تاہم لکھنے کا جنون تھا کہ انہوں نے ہار نہیں مانی۔ بعد میں جب ہم نکلنے لگے تو انہوں نے اپنی تازہ تصنیف پر اپنا دستخط کر کے ہمیں تحفتاً دے دی۔ ہم نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا، باہر سیڑھیوں پر ایک سیلفی بھی لی اور آخر پر اُنہیں الوداع کیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ لیہہ کی سڑکوں اور گلیوں سے نکل رہے تھے۔ شیخ صاحب کی حلیمانہ اور شُستہ انداز میں کی ہوئی نصیحت میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ''ناکامیوں سے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے۔ یہ آپ کی سب سے بڑی اُستاد ہیں۔''

☆☆☆

☆......محمد یوسف ٹینگ

عبدالغنی شیخ لداخی

اک شہرِ طلسمات ہے گویا میرے آگے

لداخ کو بہت سے ادیب اور مورخ چاند نگر لکھتے ہیں اور راقم اِس کو طلسمات کا زمینی عکس کہنے کی جسارت رکھتا ہے۔ راقم ۱۹۷۴ء میں پہلی بار لداخ گیا۔ میرے ذہن میں لیہہ سے ذرا دور ایک ریگزار کی وہ تصویر بسی ہوئی ہے جب میں نے جنگلی ہرنوں کے ایک خیل کو دوڑ بھاگتے دیکھا۔ اُس انداز سے کہ مرزا غالبؔ کا یہ فارسی شعر یاد آتا ہے۔ حالانکہ دلی کی گھنی بھری بستیوں میں اُن کو کہاں یہ نظارہ دیکھنے کو ملا ہوگا۔ یہ اُن کے خیال کی اختراع ہے اور اِسی لیے زندگی کی چھلوں سے دور ہے

نظم غالبؔ نگر کہ پنداری

کز کمین گاہ جستہ خیلِ غزال

(ذرا غالبؔ کی نظم کا ماجرا تو دیکھو۔ جیسے چھپے چھپائے بیابان سے ہرنوں کے جھنڈ کلیلیں کر رہے ہوں۔)

اِسی طرح میرے ورقِ یادداشت پر ایک ننگے پہاڑ سے 'ککو' یعنی کبکِ دری کا وہ جھرمٹ نقش بند ہے جو اپنے ننھے ننھے پر پھیلاتے نیچے آ رہے تھے۔ یاد رہے کہ ۱۹۷۴ء ہی وہ برس ہے جب لداخ کے اِس طلسم کو عام سیاحوں کی آمد ورفت کے لیے کھول دیا گیا اور رفتہ رفتہ یہ عالم عجائب نئی دُنیا کی گاڑیوں، موٹر کاروں اور پھر ہوائی جہازوں کے لئے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ جنہوں نے اس کی معاشی خوشحالی میں زبردست بہتری لائی لیکن اس کے اسرار اور عجائبات کو ایک کھلے اور شہرداری کی چہل پہل سے پُر بازار اور اشتہار میں تبدیل کر دیا۔ خیر یہ تو ایک ابتدائی تاثر تھا۔ جس شخصیت کے لئے مجھے اس

وقت کہنا سُنانا ہے اُس کی کیفیت بھی اُس کے اُسی کے زاد و بوم سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ عبدالغنی شیخ صاحب لیہہ لداخ کے ایسے موصوف ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ارغون نہیں لکھتے کہ یہ عُرف اُن کشمیریوں کے لئے مخصوص ہے جو لداخ جا کر وہیں پناہ گزین ہو گئے اور جن کو لداخ کی آشتی، امن اور اخوت کا گہوارہ برداشت تو کرتا تھا لیکن جن کے بارے میں برس ہا برس اُن کے دل میں کھٹک رہی اور بیس پچیس سال پہلے اُن کے خلاف ناراضگی کی ایک لہر بھی اٹھی۔ عبدالغنی شیخ صاحب لداخ کی مٹی کے پروردہ ہی نہیں بلکہ اُس کی اپج بھی ہیں۔ لداخ کی رنگارنگ مٹی کی مہک اُن کے روئیں روئیں میں رچی بسی ہے۔ لداخی اُن کی مادری پدری زبان ہے اور وہ اِس کی نزاکتوں، نفاستوں اور مزاج کے رمز آشنا ہیں۔ وہ شاید اس وقت لیہہ میں اُردو کے اکلوتے سکالر اور مورخ ہیں جو اُردو رسم خط میں لکھتے ہیں اور ایسا عمدہ کہ لداخ کا کوئی بڑے سے بڑا اسکالر قد و قامت میں اُن سے اونچا نہیں۔ بقول میر حسن دہلوی۔

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام

قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

لداخی منگول نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ منگولوں نے ماؤزے تنگ، چنگیز خان اور فو کریا جیسے بلند قد و قامت تاریخ سازوں کو جنم دیا ہے لیکن وہ اُن کی ذہنی اور عملی کارکردگی کی اونچائی ہے۔ عام طور نوے فی صد کے قریب منگول ناٹے قد کے ہی ہوتے ہیں۔ خود شیخ صاحب ماشااللہ اپنی قلمی قامت کے علاوہ اپنی ظاہری صورت میں اچھے خاصے قد کے ہیں اور اِن سطور کے راقم کی طرح وہ بھی صرف نثر لکھتے ہیں اور شاعری کی شہنائی اُن کے بھی ہاتھ میں کبھی نہیں رہی۔ اُن کی تحریر صاف، سادہ، شُستہ اور رواں ہوتی ہے۔ اُردو، جو کبھی یعنی ڈوگرہ مہاراجوں کے زمانے (۱۸۵۰ـ۱۹۴۷ء) تک جموں اور کشمیر کی صحیح معنوں میں سرکاری زبان تھی وہ اب گھٹتے گھٹتے عبدالغنی شیخ صاحب کے قلمدان میں ہی اپنا سوز و ساز بجا رہی ہے۔ یہ کوئی الگ تھلک سانحہ نہیں ہے بلکہ اُردو ہندوستان سے لے کر جموں، کسی حد تک سرینگر اور لیہہ میں پوری طرح اپنی کشمکش حیات کی آخری ہچکیوں میں مُبتلا ہے لیکن یہ تو اریخ کے ایسے گرداب ہیں جو ہم جیسے بے چاروں کی دسترس سے آگے ہیں لیکن جب تک عبدالغنی شیخ کا قلم اُردو کا امرت اُچھالتا رہے گا، ہم لداخ کے چاندنگر میں اُردو کے اِس روشن مینار سے بصیرتیں حاصل کرتے رہیں گے۔

تمھیں سے سُنتِ منصور وقیس باقی ہے

عبدالغنی شیخ کو میں ذاتی طور برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ بہت متین طبع اور بہت کم گو ہیں اور عام طور دوست بنانے میں بھی بہت محتاط اور پرے پرے رہنے والے۔

گلشن میں آتشِ گل سے لگی تھی آگ

بُلبل پُکاری دیکھ کے صاحب! پرے پرے

جب راقم ۱۹۸۴ء میں اکیڈیمی کے سیکریٹری کی حیثیت سے لیہہ پہنچا تو وہاں اُس وقت ہمارے صدر شعبہ مرحوم محمد یعقوب شیخ تھے۔ وہاں لداخی ادیب، ادب نواز وغیرہ بھی جوق در جوق ملنے اور اپنی سی سُنانے کے لئے میرے پاس آتے رہے۔ بلکہ لداخ کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے گھر میری دعوت بھی کرتے رہے۔ اُس وقت بھی عبدالغنی شیخ صاحب کو کدوکاوش کرکے ملاقات کے لئے راضی کرنا پڑا۔ لیکن اُن کا اصلی دسترخوان تو اُن کی بہت خوبصورت اور علم و ادراک سے پُر اُن کی کتابوں میں آراستہ ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے لداخی زبان میں کوئی کتاب لکھی ہے یا نہیں۔ لیکن اُردو میں اُن کی بہت ہی گراں بہا اور علم و اعداد سے بھرپور کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں اُن کی خودنوشت بھی شامل ہے۔ میری اطلاع کے مطابق اِن کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں اور میں کسی قدر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اِن کے بطن میں آنے والے کئی اور ایڈیشنوں کی خوش خبری بھی موجود ہے۔

میرے سامنے اِس وقت اُن کی شاہکار Magnum opus۔ اُردو کتاب ''لداخ۔۔۔ تہذیب ثقافت'' موجود ہے۔ شیخ صاحب کو یہ کتاب قلم بند کرنے کے لیے کتنی عرق ریزی اور دوڑ دھوپ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اُس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اُنھوں نے لداخ اور کرگل کی تگ و دو کے بعد سرینگر اور جموں کے سٹیٹ آرکائیوز اور پھر نئی دہلی کے نیشنل آرکائیوز کی خاک بھی چھاننا پڑی ہے اور جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں کہ

''یہ اُردو میں لداخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو میرے پنتالیس سال کی تحقیق اور ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس میں لداخ کی تاریخ، ثقافت، تمدن،

یادگاروں، اہم مقامات، مذاہب، شخصیات، لوک ادب، زبان، جنگلی جانوروں
کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔''

اور واقعی یہ اُردو میں لداخ پر ایک چھوٹا موٹا Wikipedia یا قاموس ہے۔ اُردو ادب میں واقعی یہ ایک اچھوتا موضوع ہے جس سے اُردو کا دامن اِس صحرا کے تمدنی موتیوں اور لعل و جواہر سے سجتا ہے اور ساری اُردو کو اِس کے عجیب و غریب مقامات اور معاملات سے خبردار کرتا ہے۔ لداخ کے بارے میں کتاب اِس امر سے، جس سے ہم پہلے سے ہی واقف تھے، پردہ اٹھاتی ہے کہ کبھی یہ سمندر کی تہہ میں تھا اور پھر قدرت کے کرشموں نے اس کو وہاں سے اوپر اُٹھا کر خشکی کا ایک ریگزار بنا کر پیش کیا۔ اِس کی شہادت تو یہاں کی مقابلتاً کنواری زمین کے وہ آثارِ پارینہ Fossils ہیں جو سمندر میں رہنے والے آبی جانوروں کی باقیات ہیں۔ اِس کے علاوہ چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر واقع اِس کی پنگونگ جھیل ہے جو سمندر ہی کی طرح کھارے پانی کی ہے۔ جو سینکڑوں میل لمبی ہے۔ لیکن اُس کا کم ہی حصہ اس وقت ہمارے ملک میں ہے اور باقی چین کے تبت میں، جو کبھی ایک الگ اور خود مختار ملک تھا۔

کتاب کا جو حصہ ہم سب کے خاص دلچسپی کا حامل ہے، وہ ہے کشمیر کے ساتھ لداخ کا تعلق۔ تمدنی، اقتصادی، تہذیبی اور مذہبی۔ اِس کے علاوہ جغرافیہ و تواریخ وغیرہ کا بھی سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لداخ کے بغیر کشمیر کی تہذیبی زندگی کا تصور کرنا ہی محال ہے جو کچھ ہمارے پاس نہیں بھی رہا۔ وہ لداخ میں موجود ہے۔ الچی کے گاؤں اور دوگنپاؤں کو ہی لیجیے۔ وہ بالکل کشمیر کا ایک گاؤں جیسا لگتا ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ بہتا ہے جس کے کنارے پر اخروٹ اور بید کے درخت اُسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح کشمیر کے کسی گاؤں اور پھر وہاں کی دوگنپائیں جن کی دو دیواری تصاویر ہمارے ہی نہیں سارے ہندوستان میں بے مثال ہیں۔ اجنتا کے غاروں کے بعد یہاں دیواری تصاویر ہزار در ہزار موجود ہیں جو گیارہویں صدی میں لداخ کے مارکوپولو یعنی رینچن زانگپو نے بنوائیں اور وہ بھی کشمیر سے خاص طور پر منگوائے گئے کوئی دو درجن کے قریب فنکاروں کے ہاتھوں۔ اِن میں قدیم کشمیریوں کے چہرے بُشرے۔ اُن کے پہناوے، اُن کے Cusine، اُن کے سامان آرایش وغیرہ کے علاوہ ایک ایسے بادشاہ کا مُرقع ہے جو منگولوں کے برعکس آریائی خدوخال رکھتا ہے اور جس کی دستار

ایران کے ہخامنشی شہنشاہوں کے تاج اور تختِ جمشید کی شناخت اُبھارتا ہے۔ یہ تصاویر کا ایسا نادر Collage ہے کہ اِس کی نظیر کشمیر کیا ساری دُنیا میں مُشکل سے ملے گی۔ میں نے اکیڈیمی کی کار پردازی کے زمانے میں اِس کی عکس بندی کے علاوہ اِن کی Transparencies بھی بنوائی تھیں۔ جو ہماری ریاست کے ایک بڑے فوٹو گرافر اور اب کالم نگار جناب محمد اشرف بطخو صاحب نے تیار کی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ اب اکیڈیمی کے نایاب ذخائیر میں اِس کا وجود ہے اور اگر ہے تو کِس قدر؟ بہر حال، ان گُنپاؤں کی ثقافتی عظمت کے حساب سے UNESCO نے ہیمس گُنپا (Hemis Monastery) کو اپنی تحویل میں لے کر اِن کی مرمت بھی کروائی ہے۔

یہ بات برسبیلِ تذکرہ آئی لیکن لداخ کے ساتھ کشمیر کے رنگا رنگ اور تہہ بہ تہہ تعلقات اور تاثرات کا شیخ صاحب نے بڑی عرق ریزی اور بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لداخ کی چرو بکری کے تہہ دامن سے جو باریک اور نفیس بال (Yarn) نکلتے ہیں، اُنہیں کشمیری خواتین اپنے چرخے کی مدد سے اِتنا عمدہ کاتتی ہیں کہ وہ دُنیا کا سب سے شاندار ملبوس اور شاہی ملبوس شاہ توس بنتا ہے جس کی ایک ایک شال لاکھوں اور اب شاید کروڑوں میں بکتی ہے۔ دُنیا کے تین چار سب سے زبردست فاتحوں میں سے ایک نپولین بونا پارٹ نے اِسی کا ملبوس اپنی سب سے محبوب ملکہ جوز فائین Josephine کو عطا کیا تھا اور فرانس، جو یورپ کے فیشن کا سب سے بڑا بازار ہے، اب بھی ایسی شالوں کے لئے جانا پہچانا جاتا ہے۔ لداخ میں ہی پلنے والی پشمینہ بکری تو کثیر تعداد میں ہوتی ہے اور اِسی پشم سے کشمیری عورتیں شاندار سوت تیار کر کے یہاں کی پشمینہ انڈسٹری کو صحت اور طاقت بخشتی ہیں۔ کشمیر کے شاعرِ رومان رسول میر کے اس شعر میں اِنہی اشیاء کی طرف اِشارہ ہے۔

بالہِ ساءنز توسہٖ پن کٔتیے
لوسہٖ ناوان چھُم مدن وار
بالہِ یارس بیہِ کَس کِتھیے

(مجھ کم سِن نے ہزار دھاگوں والے توش کے انبار تیار کئے مگر میرا محبوب مجھ سے اب بھی دور ہے۔ حالانکہ یہ سب تو اُسی کی خوشنودی کا سامان ہے)

عبدالغنی شیخ صاحب نے اِن حالات پر خوب طبع آزمائی کی ہے لیکن شاید جلدی میں وہ یہ لکھنا بھول گئے کہ ایسی شالیں لداخ کے سب سے بڑی گُنپا یعنی ہیمِس (Hemis) میں اب بھی موجود ہیں اور اِس کے علاوہ کشمیر کی پُرانی پیپر میشی کے نایاب نمونے بھی ہیں جو نباتات اور قیمتی پتھروں وغیرہ کے رنگ سے سجائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں اخروٹ کی لکڑی پر چوب کاری (Walnut Work) کے نادر نمونے بھی موجود ہیں جو آج اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

شیخ صاحب نے یہ بھی تفصیل سے لکھا ہے کہ عیسوی سن کی ابتدائی صدیوں میں وہاں کے اکثریتی دھرم یعنی بُدھ مت کی عنبریں سوغات کشمیر سے ہی لداخ کو گئی اور یہیں سے بہت سے بودھ پرچارک وہاں گئے۔ کشمیر کے بادشاہ زین العابدین بڈشاہ نے لداخ میں خانقاہیں اور مساجد تعمیر کروائیں اور اپنے مسلک کے مطابق وہاں کی صنعت وحرفت کو بڑھاوا دینے کے لئے بھی کافی کام کروایا۔ لداخ کے راستے سے ہی کشمیر کے بانی مُسلمانی حضرت امیر کبیر میر سید ہمدانیؒ بھی کشمیر تشریف لائے اور یہاں اذانوں کے نعرۂ تکبیر کی روشنی عام ہوئی۔ وہ لداخ میں بھی ٹھہرے چنانچہ شئے کے گاؤں میں اُن کی یادگار اور لیہہ میں اُن کی مسجد اب بھی مشہور ہے اور لیہہ جانے والا کوئی مُسلمان وہاں ربُ العالمین کے آگے سربسجود ہونے کے بغیر اپنا سفر مکمل نہیں سمجھتا۔

شیخ صاحب کی یہ کتاب لداخ کی زندگی کے کسی پہلو سے آنکھ نہیں چُراتی مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ لداخ میں ایسی نادر تتلیاں ملتی ہیں، جو کچھ صورتوں میں بہت نایاب ہیں۔ وہ وہاں بتالیس (۴۲) قسم کی تتلیوں کا ذکر کرتے ہیں اور اُن کے بیان کے مطابق اِن نادر تتلیوں کی اتنی مانگ ہے کہ ایسی ایک تتلی کا دام ہزاروں روپے تک جاتا ہے۔

لداخ اب نئی روشنی سے سیراب ہوگیا ہے اور وہاں کے لڑکے لڑکیوں نے عالمی سطح پر نام کمایا ہے اور وہاں کے سکالروں کے لئے دُنیا کے سمیناروں میں بولنا عام سی بات ہے۔ میرے دوست نوانگ چھرنگ آئے دن امریکہ، برطانیہ، فرانس، ترکی، جاپان، چین جاتے آتے رہتے ہیں اور کبھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ۔ چونکہ لداخ میں ہمارے ملک کی سرحدیں چین جیسی عالمی طاقت سے ملتی ہیں بلکہ وہاں وہ ایک علاقے پر اپنا حق تک جتاتا ہے۔ اسی لئے وہاں ہماری سیکورٹی فوج بھی بھاری تعداد میں موجود

ہے جس کی موجودگی سے وہاں خرچہ بھی بہت ہوتا ہے۔ جس سے لداخیوں کو بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں اور اس کی خوشحالی کی ایک وجہ وہاں اُن کی موجودگی کی وجہ سے روپے پیسے کی فراوانی بھی ہے۔

لداخ اب ایک خود اختیار (Autonoumous) علاقہ ہے اور شاید ملک کا سب سے بڑا ضلع۔ وہاں کی ہِل کونسل (Hill Council) کا اپنا بجٹ ہے اور نئی دہلی سے اُن کے بلاواسطہ تعلق کی وجہ سے سرینگر کے ساتھ اُن کے تعلق کی ڈور پتلی ہوتی جارہی ہے لیکن جیسا کہ عبدالغنی شیخ صاحب نے بجا طور لکھا ہے کہ لداخ اب غیر ملکی سیاحوں کا ریاست میں سب سے بڑا مرکز بن گیا ہے جس کی وجہ لداخ کا انوکھا Landscape وہاں کا شاندار تمدنی ورثہ اور وہاں کی ناقابلِ خلل امن وشانتی بھی ہیں۔ غیر ملکی سیاح دیسی سیاحوں کے مقابلے میں زیادہ امیر ہوتے ہیں اور بہت زیادہ خرچ بھی کرتے ہیں۔ اِس لئے ان کی تعداد سالانہ پچیس (۲۵) ہزار سے زیادہ تک پہنچ گئی ہے۔ لداخ کی فارغ البالی میں اِن کے حصے کی جسامت ظاہر ہے۔

عبدالغنی شیخ صاحب نے لداخی زبان کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ کو دیکھ کر لداخیوں کے اس مطالبے کی تائید کی ہے کہ ملک کے آئین کی آٹھویں شیڈول میں کلاسیکی تبّتی یا کلاسیکل لداخی کو ملک کی ایک علاقائی زبان قرار دیا جائے اور کشمیر یونیورسٹی میں اِس کے درس وتدریس کے لئے ایک شعبہ کھولا جائے کیونکہ ملک اور بیرون ملک کی متعدد یونیورسٹیوں میں کلاسیکل تبّتی پڑھانے کا انتظام ہے۔

کتاب اتنی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے کہ اِس پر تفصیلی تجزیہ کے لئے بھی اتنی ہی بڑی کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ البتہ کتاب میں شامل فوٹوگراف آنکھوں میں کھٹک پیدا کرتے ہیں۔ یہ فوٹوگراف بجائے خود بڑی اہم جگہوں، شخصیات اور عمارتوں کے ہیں۔ مگر انہیں بہت ہی بُری صورت میں چھاپا گیا ہے۔ میرے خیال میں ان تصاویر کو آج کے زمانے کی رنگین صورت میں چھاپنے سے اس بہت اچھی کتاب کی وقعت میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا۔ مجھے اُمید ہے کہ ایسا دوسرے ایڈیشن میں ضرور ہوگا۔ میں نے لداخ کے دوسرے حصے کرگل کے بارے میں جان بوجھ کر لکھنے سے احتراز کیا۔ کیونکہ اُردو میں کرگل کے بارے میں کاچو سکندر خان، کاچو اسفندیار خان اور کئی دیگر مصنفین کی بہت عمدہ کتابیں سامنے آچکی ہیں۔

......●●●......

☆......کاچو اسفندیار خان

شیخ صاحب سے میری شناسائی

لداخ کے مشہور ادیب، افسانہ نگار ناول نگار اور مورخ جناب عبدالغنی شیخ صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۷۵ میں شایع ہوا تھا جبکہ اُن سے میری پہلی ملاقات ۱۹۷۸ میں سری نگر میں ہوئی۔ اس وقت میں کشمیر کمبائنڈ سروس جوائن کر کے ریونیو ٹریننگ سکول میں زیر تربیت تھا۔ جبکہ شیخ صاحب آل انڈیا ریڈیو میں کام کر رہے تھے۔۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ راج باغ میں خواجہ نورالدین زرگر صاحب کے کمپلکس میں بحیثیت کرایہ دار سکونت پذیر تھے۔

میں اس وقت ایک برہمچاری تھا اور ڈیرے کی تلاش میں بادیہ نوردی کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ اس وقت کشمیری سوسائٹی بہت ہی انٹروارڈ تھی اور کسی غیر شادی شدہ شخص کو کرایہ پر کمرہ ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ حُسن اتفاق سے کسی دن میں بھی اس کمپلکس میں پہنچا تو خواجہ صاحب نے از راہِ کرم ایک کمرہ کرائے پر دیا اور میں بھی وہاں رہنے لگا۔ اس وقت نامور ادیب اور براڈ کاسٹر فیاض رفعت بھی وہاں رہتے تھے۔ اس طرح شیخ صاحب سے بالمشافہ ملنے کا موقع فراہم ہوا۔ جبکہ ایک افسانہ نگار کے طور پر اُن کا نام پہلے سے سنا تھا۔ چونکہ میرے مرحوم والد کاچو سکندر خان سکندؔر صاحب کہا کرتے تھے کہ انہوں نے کچھ عرصہ بحیثیت ٹیچر لیہہ لداخ میں کام کیا تھا۔ اپنے شاگردوں کے بارے میں بولتے ہوئے جناب عبدالغنی شیخ اور لداخی سکالر جناب ٹشی ربگیس صاحب کا خاص ذکر کرتے تھے۔ بعد میں جب اُن دونوں ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بھی بڑے فخر اور احترام کے ساتھ

کاچو صاحب کا نام لیتے تھے۔ سری نگر کے بعد جب میری پوسٹنگ لیہہ میں ہوئی تو شیخ صاحب کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور ایک سینئر اور کہنہ مشق ادیب کے طور پر شیخ صاحب کا احترام میرے دل میں فزوں تر ہونے لگا۔ اپنے والد اور شیخ صاحب کے زیر اثر میں شاعری کے ساتھ ساتھ اردو نثر نگاری کی طرف بھی بھر پور توجہ دینے لگا۔ شیخ صاحب جب ملازمت سے سبکدوش ہو کر لیہہ میں مستقل طور پر سکونت رکھنے لگے تو میں جب بھی لیہہ پہنچتا تھا اُن سے ضرور ملاقات کرتا تھا۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ لداخ میں اردو ادب کی داغ بیل ڈالنے والوں میں میرے مرحوم والد کاچو سکندر خان صاحب اور جناب عبدالغنی شیخ صاحب کو اس کاروانِ ادب کے ہراول دستے کے دو اہم رکن اور میر کارواں کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا بلکہ اُن دونوں کے بغیر لداخ میں اردو نثری ادب کے آغاز کا تصور کرنا ناممکن ہوگا۔ میں ایک معمولی قلمکار اور ایک لداخی کی حیثیت سے شیخ صاحب کی بسیار نویسی سے بہت مرعوب ہوں۔ انہوں نے شاعری کو چھوڑ کر اردو ادب کی باقی اصناف پر بہت لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ اللہ نے ان کو ایک طویل زندگی سے نوازا ہے جس کا بھر پور فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہوں نے درجنوں کتابیں لکھ کر اردو ادب کی دنیا میں اپنے لئے ایک منفرد جگہ بنائی ہے۔ اُن کی ذات پر ہر لداخی کو فخر ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ جس سرزمین پر ہریالی کے نام پر گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں اُگتا ہے اُس سرزمین پر عبدالغنی شیخ صاحب نے اردو ادب کے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں اور افسانہ اور ناول نگاری کے باغ لگائے ہیں جس سے ہر کوئی مستفید ہو رہا ہے۔

میری اپنی رائے یہ ہے کہ شیخ صاحب بہت ہی سہل اور عام فہم زبان میں لکھتے ہیں اور زندگی کے گوناگوں تجربوں سے اپنی کہانیوں کے موضوع چن لیتے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں سماج کے ہر فرد کی الجھنوں، ان کے مسائل اور ان کی خوشی و غمی کے پہلوؤں کو نہایت صفائی، اختصار اور ہمدردی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں اور کبھی کبھی انسان کی خود غرضی، سرد مہری اور نفسا نفسی پر ایک لطیف طنز کے ساتھ زیر لب مسکراتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک معمولی چیز یا واقعہ سے شہ پا کر اس کے ارد گرد اپنی کہانی کے تانے بانے بنتے ہیں اور پھر اپنے تخلیقی سفر کے دوران انسانی زندگی کی کوئی نہ کوئی اچھائی یا تلخ حقیقت کی موشگافی کرتے ہیں جس سے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اگر چہ شیخ صاحب نئے زمانے کی

معاشی ترقی، آسائش اور آرام و راحت کو نئے زمانے کی دین سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں کی تہہ میں سماجی قدروں کی شکست و ریخت، انسانی رشتوں میں سرد مہری، بھائی چارے میں کمی اور زمانے میں امن اور آشتی کے فقدان کا بھی احساس بار بار ملتا ہے۔ عبدالغنی شیخ صاحب کو صرف ایک کہانی کار یا ناول نگار کے طور پر نہیں جانا جاسکتا ہے۔ اپنے طویل ادبی سفر کے دوران انہوں نے کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ دیگر کئی اہم موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے اور خصوصاً لداخ کی ثقافت اور تاریخ کے مختلف پوشیدہ پہلوؤں پر نئی روشنی ڈالی ہے جو یقیناً ایک گراں قدر خدمت کے طور پر یاد کی جائے گی اور بالخصوص لداخیوں کو اُن کی ذات پر ہمیشہ فخر ہوگا۔

شیخ صاحب کہا کرتے ہیں کہ علمی لحاظ سے ان کے بچپن کا زمانہ سازگار نہیں تھا۔ بہت محنت کرنا پڑتی تھی۔ کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ اگر کوئی کتاب مل بھی جائے تو اس کی نقل ہاتھ سے لکھنا پڑتا تھا۔ فوٹو کاپی کی سہولیت بھی میسر نہیں تھی۔ لیکن آج سب کچھ میسر ہے۔ اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کو بہت محنت کرنا پڑے گی۔ ریاضت کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ بچوں سے کہتے ہیں کہ دل سے پڑھیں اور اچھی کتابیں پڑھیں۔ ایک چھوٹی نوٹ بک ساتھ رکھا کریں۔ اچھے الفاظ اور جملوں کو نوٹ کیا کریں۔ اس طرح اپنے زبان کو خوب صورت بنایا جاسکتا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ شیخ صاحب کو تندرست اور سلامت رکھے اور مجھے پوری امید ہے کہ اُن کے صریر خامہ کی گونج آگے بھی ہمارے کانوں میں رس گھولتی رہے گی۔

......●●●......

☆......بابو عبدالقیوم لداخی

مطالعہ ومشاہدہ کا غوّاص- عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ صاحب اخلاقی طور پر ایک شریف النفس اور بڑے ملنسار انسان ہیں۔ اردو اور انگریزی زبانوں میں کافی عبور حاصل ہے۔ علاوہ ازیں ہندی اور لداخی زبان سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ آپ ایک محقق اور عملی انسان ہیں۔ آپ نے زندگی میں کٹھن سے کٹھن مراحل کو محنت، لگن، جدوجہد اور جستجو سے حاصل کیا ہے۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے میں سچی لگن، سعی جستجو، ایماندارانہ اور غیر جانبداری سے اپنا جائزہ لینا انکی زندگی کا اصول رہا ہے۔ محنت، لگن، جستجو، ان تین چیزوں پر آپ ایمان کی حد تک یقین رکھتے ہیں۔ آپ اکثر کہا کرتے ہیں کہ زندگی وہ ہے جو محنت اور مشقت سے بھرپور ہو۔

وقت ضائع کرنا تو آپ نے سیکھا ہی نہیں۔ اس لئے محفلوں میں بہت کم اپنا وقت گزارتے ہیں۔ حتی الامکان محفلوں سے دور بھاگتے ہیں۔ اپنا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزارتے ہیں۔ مگر کسی حاجت مند کی حاجت پورا کرنے میں البتہ اپنا قیمتی وقت دیکر اس کی ضرورت کو پورا کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک اچھا ادیب اگر اچھا انسان بھی ہو تو اس کے فکر وفن کی کیفیت دوآتشہ ہو جاتی ہے۔ شیخ صاحب میں یہ دونوں خوبیاں ہیں، متواضع مسکراہٹ سے وہ سب کا استقبال کرتے ہیں۔ چھوٹا ہو یا بڑا، امیر ہو یا غریب، کسی رتبہ اور عہدہ سے مرعوب نہیں ہوتے ہیں۔ شرافت، سادگی اور خلوص ان کا ایمان ہے۔ اس دولت کو انہوں نے ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کر رکھا۔ کبھی بھی نام ونمود کے پیچھے نہیں

بھاگے۔ بات کے دھنی، کام کے پکے اور سب سے بڑھ کر وہ ایک بے لوث انسان ہیں۔ شیخ صاحب نے عمر بھر جد و جہد کی اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ چاہے وہ فن افسانہ نگاری کا معاملہ ہو یا صحافت اور تاریخ نگاری کا۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر اور سچائی کی جستجو میں لگے رہتے۔ ان معاملوں میں وہ مصلحت سے کام نہیں لیتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی خوبی ہے۔ اپنی صحت کا بے حد خیال رکھنے والوں میں سے ہیں۔ غذا میں احتیاط کے علاوہ روزانہ کی سیر ان کا معمول ہے۔ وقت کی پابندی کوئی ان سے سیکھے۔

عبدالغنی شیخ جس کو میں لڑکپن سے جانتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں کہ شیخ صاحب کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ ان کو مطالعہ کا شوق جنوں کی حد تک ہے۔ وہ ہر موضوع پر کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں اپنے ارد گرد کے واقعات اور ماحول سے ایک خوبصورت انداز سے جوڑ لیتے ہیں اور ان سے متاثر ہو کر کہانی کے روپ میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں محبت کی بصیرت اور نفرت کی آندھی کے ساتھ ساتھ ایک سبق آموز اور دل نشیں پیغام بھی ہوتا ہے۔ وہ اکثر اپنی کہانیوں میں سماج کی تلخیوں کا شکوہ کرنے، دلکش پیرائیوں میں منظر کشی کرنے کے ساتھ ان پر طنز بھی کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کے نزدیک رواداری اور ایک دوسرے کے لیے محبت کا جذبہ ان کا قیمتی اثاثہ ہے جس کو وہ بہت عزیز رکھتے ہیں۔ لداخ کی سماجی زندگی میں نئی تہذیب کی بے جا مداخلت سے وہ اکثر پریشان نظر آتے ہیں۔ اس بے جا مداخلت سے لداخی سماج کی سادگی، محبت و خلوص اور عقیدے میں ایک بھیانک شگاف سا پڑتا نظر آتا ہے جو انہیں کسی حال میں منظور نہیں اور جس کے خلاف وہ اپنے افسانوں میں بار بار ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔

ان افسانوں میں لداخی سماج کے مختلف پہلوؤں پر ایک منفرد انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس کا ذکر ان کے اردو افسانے کو انگریزی میں ترجمہ کر کے 'فارساکنگ پاراڈائیز' (Forsaking Paradise) کے نام سے کتھا (Katha) والوں نے شایع کیا۔ انگریزی میں ترجمہ کا کام ڈاکٹر روینا اگروال (Ravina Agarwal) نے کیا ہے۔ ان کے افسانوں پر معروف انگریزی روزنامہ 'دی اشین ایج' (The Asian Age) نے یوں تبصرہ کیا ہے:

"Forsaking Paradise", "Situated in the high reaches of the Himalayan and K2 ranges, the unique culture of India nothern most district has been radically effected by war, tourism and development. These Stories provide a rare Glimpse of Ladakhi society today. The lead story illustrates the clash between tradition and modernity. The author of several analytical articles in Urdu and English. Ab Ghani Sheikh is recognised as one of Ladakhi's foremost scholars and fiction writers. Ravina Aggarwal who teaches anthropology in Smith College Massachu- setts, has over the last 12 years explored the Connection between Social Space and nationalism in Ladakh.

In this collaborative anthology with author, she shows how local writing reflects the dilemmas of development and how literature can be mobilised to effect policy & practise.

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کا مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ انہوں نے محض شوق یا نام ونمود کی خاطر نہیں لکھا بلکہ وہ زندگی اور معاشرے کے مسائل و مصائب سے دوچار رہے ہیں اور انہوں نے زندگی اور سماج کے مطالعے میں جب زبردست دباؤ محسوس کیا تو اس کے اظہار کے لئے افسانہ ایک ذریعہ کے طور پر ستعمال کیا ہے۔ اس لئے ان کے افسانے سیدھے سادھے اور سبق آموز ہیں۔ افسانوں میں پلاٹ، کردار، مکالمے ہیں، انجام ہے پیغام ہے۔ یعنی افسانے کا بنیادی ڈھانچہ پوری طرح موجود ہے۔ ان کے افسانے کے مجموعہ ''فارساکنگ پاراڈایز'' (Forsaking Paradise) پر ''دی ٹیلیگراف'' (The Telegraph) کلکتہ نے اس طرح تبصرہ شائع کیا ہے:

"Forsaking Paradise: short stories from Ladakh by Abdul Ghani Sheikh is absorbing collections of tales, translated and introduction

by Ravina Aggarwal. Aggarwal's introduction is a lucid presentation of scrupulous research. She worked closely with the Urdu short fiction of Ghani Sheikh, recognised as one Ladakhi's foremost scholars and fiction writer in a land which borders Pakistan, occupied Tibet and the Kashmir Valley, where Buddhism, Islam and even Chiristianity have found homes, where the expanding international tourist industry is rivalled only by the economic presence of the armed forces, where the Ladakhi Urdu, Tibetan and English languages compete to represent the culture, literature too takes on forms that are political and even paradoxical."

۱۹۸۹ء میں جب عبدالغنی شیخ ایک سمینار کے سلسلے میں انگلینڈ گئے تھے۔ انہوں نے ۴؍اپریل ۱۹۸۹ء کو راقم کے نام برمنگھم (انگلستان) سے اپنے ایک مکتوب میں انگلینڈ اور وہاں کے شہروں کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ ذیل میں اس مکتوب کی نقل پیش ہے:

"برمنگھم

۴؍اپریل ۸۹ء

برادرم السلام علیکم

نیک خیریت مطلوب ہے۔ میں ۳۰؍مارچ کے دوپہر بخیریت لندن پہنچا اور ایک دوست کی دعوت پر دو روز کے لئے برمنگھم آیا ہوں۔ کل صبح لندن جانے کا پروگرام ہے۔ برمنگھم لندن سے ۲۰۰ کلومیٹر دور ہے۔ کل دوپہر کو سمینار ختم ہوا۔ چار روزہ سمینار کے دوران مختلف موضوعات پر متعدد پیپر پڑھے گئے، تقریریں ہوئیں۔ مجھے "لداخ میں اسلام کی تاریخ" پر تقریر کرنا پڑی۔ پیپر تیار نہیں تھا۔ تاہم تقریر کامیاب رہی۔ سمینار میں سوال جواب کا Session بھی دلچسپ

رہا۔ سیمنار میں حصہ لینے کے لئے یورپ کے کئی ملکوں سے افراد آئے تھے۔ یہ سارے لداخ میں کم سے کم ایک مرتبہ آچکے تھے۔ ان کی تعداد ۸۰ کے قریب تھی۔ ۹/اپریل کو واپس جانے کا پروگرام ہے۔ اس لئے اگلے چار روز میں لندن کے تاریخی مقامات اور میوزیم دیکھنے کا ارداہ ہے۔

اسی اثناء میں برسٹل، ویلز، Bath شہروں کے کئی تاریخی مقامات دیکھنے کا موقع ملا۔ برسٹل میں ہی سیمنار کی دوسری نشست ہوئی۔ میں انگلینڈ میں دو چیزوں سے متاثر ہوا۔ شادابی اور صفائی اور ہر چیز میں کمپیوٹر اور مشین کی کارکردگی۔ برمنگھم میں مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ کل مسجد دیکھی۔ بڑی عالیشان ہے۔ ہمارے لیے زندگی بڑی مہنگی ہے۔ ایک پیالی چائے اپنے دام سے پینا مشکل ہے۔ میں نے سنا برمنگھم میں مسلمانوں اور سکھوں کے اپنے اخبارات نکلتے ہیں۔ اردو کا کوئی اخبار نظر سے نہیں گزرا۔ آج معلوم کروں گا میرے ساتھ جمیا نگ گیالچن، Secmol، صنم وانگچوگ، نوانگ چھرنگ شکسپو وغیرہ بھی آئے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا۔ بتانے اور لکھنے کے لئے بہت ساری باتیں ہیں۔ انشاء اللہ ملاقات پر بتاؤں گا۔ ابھی میں نے .N.E کی حیثیت سے Join کرنا ہے۔ اسی Tour کی وجہ سے نہ کرسکا۔ غالباً ۱۵/اپریل تک سرینگر پہنچ چکا ہوں گا۔ آمینہ لیہ پہنچی ہوگی۔ اس کے نام بھی آپ کی معرفت اس لفافے میں ایک خط ہے، دینے کی زحمت کریں۔ میں غالباً اگست میں مختصر چھٹی پر لیہ آؤں گا۔

لداخ کے متعلق یہاں کچھ مواد ملا۔ مزید مواد کے لئے بات کی ہے۔ Neil Howard نے جو برمنگھم میں میرا میزبان ہے۔ ڈاکٹر فلیپو فلیسپی کی لداخ سے متعلق پوری تصنیف کا فوٹو اسٹیٹ بنا کر برسٹل لایا تھا۔ اپنے ساتھ لے کر آرہا ہوں، انہیں مزید کچھ اور نگارشات کا بھی فوٹو اسٹیٹ کرنا تھا۔ ابھی کر

نہیں پایا ہے۔ ان میں ایک Hume کا کام ہے جو لداخ آیا تھا اور ہندوستان میں کانگریس پارٹی کا بانی تھا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہونگے۔ والسلام

آپکا خیر اندیش
عبدالغنی شیخ

پس نوشت:۔ ابھی ابھی صبح کے اخبار میں پڑھا کہ آج برمنگھم میں ہزاروں مسلمان سلمان رشدی کے Satanic Verses کے خلاف مظاہرہ کر رہے ہیں جو وکٹوریہ Squre پر ختم ہوگا۔ اخبار کے مطابق تشدد کا اندیشہ ہے۔ برمنگھم کے ایک حلقہ انتخاب سے ایک لیبر ایم۔ پی مسٹر Heltenley مسلمانوں کے ووٹ سے منتخب ہوا ہے۔ ان ووٹوں کی تعداد پینتیس ہزار ہے۔ ایم۔ پی نے کتاب کو ممنوع قرار دینے کے حق میں بیان نہیں دیا ہے۔ اس لیے مسلم ایکشن کمیٹی کے مقامی صدر خالد علوی کے مطابق مقامی مسلمانوں میں غم و غصہ ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ آج میں اس مظاہرے کو دیکھوں۔ آپ کو یہ بتاؤں کہ میں نے برسٹل میں مذکورہ کتاب کا مطالعہ کیا۔ تاثرات بعد میں۔

......●●●......

☆......ڈاکٹر راشد عزیز

اردو کی دھنک رنگ شخصیت

شیخ عبدالغنی کی ذات میں قوسِ قزح کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ ہمہ وقت، ہمہ جہت فنکار کے طور پر سامنے آتے رہے ہیں اور ان کی ہمہ جہتی کے اوصاف کے محرکات میں اردو، انگریزی اور تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جناب شیخ نے اردو میں ادیب فاضل کی منزل طے کی تو انگریزی میں بی اے آنرز کیا۔ جبکہ تاریخ میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔ اس طرح لداخی اور بلتی پر پیدائشی گرفت رکھنے والے فرد عبدالغنی شیخ کو بڑھتی عمر اور گزرتے وقت کے مشاہدات اور اکتسابات نے دھنک رنگ شخصیت بنا دیا۔

شیخ کی شخصیت کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ جس درجہ حصولِ علم کے زینے طے کرتے گئے اسی تناسب سے ادبی، سماجی اور سیاحی میلانات سے قریب ہوتے رہے۔ تاریخ کے مطالعے نے انہیں لداخ کی تہذیب وثقافت کے تحفظ وتعارف کی ترغیب دی۔ اس طرح عبدالغنی شیخ ایک ادیب، ایک مورخ اور ایک ذمہ دار صحافی کی خدمت انجام دینے کا کردار نبھاتے رہے اور روز افزوں ان کی شخصیت میں نکھار آتا رہا اور ان کے قد میں ہر اعتبار سے اضافہ ہوتا رہا۔

عبدالغنی شیخ کی تقریباً اسی 80 برس کی عمر اور ساٹھ پنسٹھ برس کی ادبی مسافت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب کا طبعی میلان لوک روایات سے بہت قریب اور زیادہ متاثر رہا ہے۔ انہیں بچپن اور لڑکپن میں جو لوریاں اور قصے کہانیاں سننے کو ملیں اور شیخ کے تجسس کا سبب بنیں، حضرتِ شیخ

انہیں کے دھندلے خاکوں میں حقیقی رنگ آمیزی کی راہ پر گامزن رہے۔ ایک طرف انہیں ان کے گرد و نواح کے آثارِ قدیمہ اپنی کہانیاں سنا کر ساری دنیا کو ان سے روشناس کرانے کا اصرار کرتے رہے تو دوسری جانب گزرتے وقت کے بدلتے مناظر اور ڈھلتی تہذیب و ثقافت اپنی دیرینہ روایات میں نئی گل کاریوں کے دامن سجانے کا فرض ادا کرتے رہے۔ شیخ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''لداخ اور اس کے ہمسائے گلگت بلتستان اور چیلاس میں سنگ تراشی کے خزینے ہیں اور پورا خطہ نگار خانہ کہلاتا ہے۔ تصویروں، کندہ کاری کے علاوہ چٹانوں پر عربی، برہمی، کھروشتی، شاردا، چینی، عبرانی، سریانی، تبّتی، سنسکرت اور سوغدانی لپیوں میں تحریریں پائی جاتی ہیں۔''

اس اقتباس کی زیریں لہروں کو ملحوظ رکھا جائے تو راست طور پر منکشف ہوتا ہے کہ جناب شیخ ہر تصویر اور تحریر کی دید سے اپنے ذہن و دل میں اُبھرنے والے سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کے لئے کبھی تاریخ کے نشیب میں اُتر جاتے ہیں اور کبھی ان کی ثقافیانہ رنگا رنگیوں کا حصہ بن جاتے ہیں تو کبھی عرفان و آگہی کے مراقبوں میں محو ہو جاتے ہیں اور اس محویت، مجذوبیت اور جنون کے دوش پر سوار ہو کر آنے والی نسلوں کے لئے نت نئے جواہراتِ آبدار تلاشتے اور تراشتے رہتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کی طبیعت پر حرص و آز کا ساز سحر نہ کر سکا لہٰذا ان کے ادبی اور سماجی سفر میں بلا کا توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شمعِ اردو کی روشنی میں جس قدر صفحاتِ قرطاس کی تزئین کی ہے، وہ وقت کی ضرورت اور تاریخ سے واقفیت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ مثلاً بچوں کو مطالعۂ کتب اور مطالعۂ کائنات کی ترغیب دینے کے لئے جناب شیخ نے اپنی علمی و عمری بلوغت اور بلندی و برتری کی مسند سے نیچے اُتر کر دو مقبول ترین مختصر کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں ایک کتابوں کی دنیا ہے اور دوسری لداخ کی سیر۔ ان دونوں کتابوں میں مصنف نے بچوں کی فطری اور نفسیاتی کیفیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا انداز اور معلومات کا ایسا ذخیرہ پیش کیا ہے کہ دونوں کتابیں مقناطیسی صفت اختیار کر گئی ہیں اور بچوں کی دلچسپی کا سبب بن کر ہر دلعزیزی کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔

بحیثیت ناول نگار عبدالغنی شیخ نے اردو ناولوں کے ذخیرے میں دو ناولوں کا اضافہ کیا ہے۔ یہ

دونوں ناول دُل ہی تو ہے' اور' وہ زمانہ' جداگانہ کیفیتوں کی ثقافیانہ اور تاریخی حالتوں سے واقفیت فراہم کرتے ہیں۔ یہ ناول ایک طرف علاقائی ترجمانی پر نازاں نظر آتے ہیں تو دوسری جانب مصنف کے بالغ نظر اور سبق آموز ادراک وشعور کے مشاہدات اور مشاہدوں کی نفسیاتی فضا سے ایسی آگاہی فراہم کرتے ہیں کہ قاری اور سامع کا تجسس التفاتِ محویت کے طلسم سے سرشار اور شرابور ہوجاتے ہیں۔ ان ناولوں کے مطالعے سے انسانی فطرت میں سماجانے والے جغرافیائی اثرات کی جلوہ سامانیوں کی عقدہ کشائیاں بھی سامنے آتی ہیں اور عہدِ جدید میں گلوبلائیزیشن کے اثر سے بدلتی تہذیبوں کی پُر فریب ودلکش رعنائیاں بھی جھلکتی ہیں۔ محل وقوع اور کرداروں کی چلتی پھرتی تصویروں کا تصور بنتا چلا جاتا ہے جو مصنف کے کمالِ اسلوب کا کرشمہ ہے اور مصنف کو بیانیہ کا یہ انداز محتاط رہنے کی صورت میں حاصل ہوا ہے۔

عبدالغنی شیخ کی افسانوی کائنات گواہ ہے کہ ان کی شخصیت کا اہم پہلو ایک کامیاب افسانہ نگار کا ہے۔ ان کی کہانیاں ملکی اور بین الاقوامی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں لیکن ان کی کہانیوں کا جو لطف اور ان میں جو کشش بہ زبانِ اردو اثر انگیزی رکھتی ہے، کیفیت کا ایسا جادو ترجمہ شدہ متون کے حصے میں نہیں آتا۔ ان کہانیوں میں علاقائی، صوبائی، ملکی اور بین الاقوامی سطحوں کے سماجوں اور ان کے نسلی، سماجی، تہذیبی اور فکری نظریات کے زاویوں کی ترجمانی اس سلیقے سے پیش کرتی ہیں کہ علیت کی وحدت اور اس کی کثرت اور کثرت کی انفرادیت کی کشمکش اور اس کشمکش میں مبتلا رہنے کا حالتوں کی نتیجہ خیزیاں سبک روی سے رفافت کی معراج پا جاتی ہیں۔ خواہ کہانیاں سب میں زندگی کی حرارت، زندگی کے مول کی رمق اور تہذیبی چمک پوری آب وتاب سے اُبھرتی ہے۔ ہر کہانی اپنے پلاٹ، کردار، بیانیہ اور مکالموں سے منصفانہ ادب وآداب کی قدروں کی رواداری کا ثبوت دیتی ہے۔

عبدالغنی شیخ نے بحیثیت مورخ جو خدمات انجام دی ہیں انہیں دو زمروں میں منقسم کر کے سمجھنا آسان ہے۔ پہلے زمرے میں 'قلم، قلم کار اور کتاب' کو پیش کرنا اس لئے مناسب ہے کہ مورخ اور مصنف دونوں کا مرکزی محور قلم ہوتا ہے۔ جناب شیخ کی اس کتاب میں قلم کی تحریک پانے، قلم کار کے تحریک یافتہ ہوجانے اور کتاب کی تکمیل کی راہیں نکل آنے کے عوامل ومحرکات کی تاریخ متعدد فنکاروں اور فن پاروں کے توسط سے قلم بند ہوئی ہے۔ اس کتاب میں جناب شیخ کے ان مضامین کو شرف شمولیت

نصیب ہوا ہے جو انہوں نے قلم، قلم کار اور کتاب کے عنوان کے کالم تحت مختلف اوقات میں تحریر کیے تھے۔ ان مضامین میں کمالِ انشاپردازی کا جوہر یہ ہے کہ یہ بیک وقت تحقیق و تنقید، تاریخ و تہذیب اور خاکے کی کیفیتوں کے عناصر سے مزیّن ہیں۔ یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے۔ جبکہ دوسرے زمرے میں دو کتابیں ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' اور ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' لائق افتخار و طمانیت ہیں۔

''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' عبدالغنی شیخ کا ایسا گرانقدر کارنامہ ہے جس میں تاریخی جھروکے، اعلاقائی خصوصیات، آبادیوں اور کھیت کھلیانوں کی منظر کشی۔ آثارِ قدیمہ کے خاکے، تہذیبی و تمدنی تفصیلات، عبادت و ریاضت کے طریقے، یہاں کے باشندگان کی دلچسپیاں، حکومتوں اور رعایا کے رشتوں کی وضاحت، صوفی سنتوں کی منفرد شان اور سو سے زیادہ سیاحوں کے سفرناموں سے ماخوذ تحریری دستاویز وغیرہ نے مل کر وہ گلشنِ تاریخ سجایا ہے جس کی مہک اور چمک انتہائی بلکہ سحر انگیز کیفیت اختیار کر گئی ہے۔ یہ کتاب اپنے قاری کی ارضی بلندی پر واقع لداخ اور ایسی بلندیوں کی دیگر آبادیوں میں بلندی کی آب و ہوا کی فضا سے ہونے والی بیماریوں اور ان کے علاج کی تدابیر سے بھی واقف کراتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ''لداخ آنے والے بہت سارے مغربی سیاح یہاں کی بودھ خانقاہوں، مورتیوں، مصوری کے اعلیٰ نمونوں، ناچ اور نغموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ لداخ کی ثقافت، لباس اور رسم و رواج سے بھی سیاحوں کو بڑا لگاؤ رہا ہے۔ لداخ میں دستیاب چینی پیالیاں، اژدہے اور مور وغیرہ کے بیل بوٹوں والے چینی کپڑے، تبّتی برتن، تانبے کی چائے دانیاں، قالین، چینی و ترکستانی ریشم اور دوسری مصنوعات سیاحوں کو لداخ کھینچتی تھیں۔''

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اونچے درّوں سے اٹھنے والی بھاپ کی زہریلی ہوا اور گل بوٹے جن بیماریوں کا سبب بنتے ہیں۔ ان سے بچنے اور علاج کے لئے لہسن، کالی چائے اور خوبانی کے سفوف وغیرہ کے مرکبات ادویات کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک اور اہم بات روشنی میں آتی ہے کہ لداخ میں زمانہ قدیم میں ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہوتے تھے۔

بودھوں نے ان روش روایات کے خلاف مہم چلا کر سماج میں معیوب سمجھی جانے والی اس روایت سے تقریباً نجات حاصل کر لی ہے۔

یہ کتاب جہاں سائنسی، علمی، تاریخی، تہذیبی اور روحانی تجربات و مشاہدات سے واقفیت کا ذریعہ ہے وہاں شیخ عبدالغنی نے یہاں کی صنعت و حرفت اور فنونِ لطیفہ کی قدر و منزلت کی روداد تحقیقی زاویوں سے پیش کی ہے۔ مثلاً چودھری خوشی محمد ناظر کا یہ شعر۔

شورِ ناقوس اور آوازِ اذاں کوئی نہیں
تفرقہ شیخ و برہمن کا یہاں کوئی نہیں

''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' شیخ عبدالغنی کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ اور تاریخی و جغرافیائی کیفیتوں کی ایسی روداد ہے کہ اس کتاب کی عبارتوں کو دورِ جدید کے ویڈیو کیمرے کی ریلوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مختصر ترین لفظوں میں اس کتاب کو لداخ کا قاموس سمجھنا زیادہ حق بجانب ہے۔ کیونکہ مصنف نے اس کتاب میں لداخ کی تاریخ کو نئے تناظر میں پیش کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ جس طرح یہ کتاب گزشتہ کتابوں کے مقابلے میں بہتر اور معتبر معلومات فراہم کرتی ہے اسی طرح مستقبل میں اس کتاب سے بہتر کتاب سامنے آئے گی اور یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔

اس کتاب سے موصول ہونے والے جغرافیائی محل وقوع کی معلومات ہند و چین کے سرحدی تنازعے پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اس روشنی میں سیاست اور صنعت کی علاقائی اور عالمی تحریکات کے عوامل و محرکات واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں جن کے مطابق چین آج فکر و نظر کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ جو دنیا میں اپنے اثر و نفوذ کو مستقل مستحکم بنا رہا ہے۔ لداخ میں بھی یہ اثر محسوس کیا جا رہا ہے۔ اب یہاں کا کلاسیکی رہن سہن جدید طرزِ زندگی اختیار کر گیا ہے۔ یہاں کے لوگ مسلسل حرکت میں رہنے میں اپنی زندگی اور عمر درازی کی سبب جانتے اور مانتے ہیں۔

شیخ صاحب کی اس کتاب کی عبارتوں سے سیاسی اور جغرافیائی تاریخ کی نئی تحقیق سامنے آتی ہے۔ اس تفصیل سے لداخ کی توہم پرستانہ زندگی کے طور طریقے اس انداز میں ظاہر ہوتے ہیں کہ آج کا لداخی فرد بھی ان پر عمل پیرا ہونے سے پرہیز کرتا ہے البتہ یہاں کے فیوض و برکات پر نازاں نظر آتا

ہے۔اس میں پشمینے اور کشمیری شال کی کہانی کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے جس نے جدید آلہ جات کی مدد سے شال کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے اور روزگار کے نئے وسائل فراہم کیے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ نسل کو ترجیح دیتے ہیں مسلک کو نہیں اور اس کی زندہ مثال بودھ اور مسلم کا ایک چھت کے نیچے زندگی بسر کرنا ہے جو بے مثال ہے۔

المختصر مجموعی طور پر پوری ذمہ داری کے ساتھ دیانتداری کو پیش نظر رکھتے ہوئے ببانگ دُہل کہا جا سکتا ہے کہ عبدالغنی شیخ اُردو کی دھنک رنگ شخصیت کے مالک ہیں۔لداخ اور لداخ میں اُردو کے تئیں ان کی خدمات بیش بہا ہیں۔وہ یقیناً ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا کا وصف رکھتے ہیں۔البتہ ان کی تحریروں میں فصاحت کی کمی کچھ ادائے مفہوم ومطلب کے لئے برتے گئے الفاظ کبھی نہیں بننے دیتے۔ میں جناب شیخ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آنے والا وقت اور اس کے ذمہ داران شیخ اور شیخ کی خدمت پر ناز کرتے رہیں گے۔

......●●●......

جموں کشمیر۔لداخ سے متعلق اہم معلومات کا خزانہ

(۱۱رجلدوں پر مشتمل)

شیرازہ کا

"جموں۔کشمیر۔لداخ

قدیم تذکروں اور سفرناموں کے آئینے میں"

کتاب گھر، لال منڈی، سرینگر سے دستیاب ہے

☆☆☆

محمد یوسف مشہور

عبدالغنی شیخ - ایک زندہ اسطور

عبدالغنی شیخ کی شخصیت میرے لیے کئی برس تک پُر اسرار رہی۔ اُن کی تحریریں پڑھ کر مسحور ہو جانا میری طرح نہ جانے کتنے قارئین کا تجربہ رہا ہوگا۔ ہندوپاک کے موقر جراید میں ان کے بکثرت مگر معیاری افسانے، انشایئے اور مضامین شایع ہوئے۔ ہم لوگ اُن کا مطالعہ کر کے وفور علمیّت و معلومات سے مرعوب ہو جاتے۔ عش عش کرتے۔ کاش! ہم بھی اتنی معلومات رکھتے، اتنی دانشوری بہم پہنچاتے، اتنی کثرت سے چھپتے۔ خیر یہ تو آرزؤں کا معاملہ رہا جواب بھی جوں کا توں ہے۔ ایک خواہش اُن کے وطن، پیشہ، عہدہ کے بارے میں جاننے کی بھی سر اُبھارتی رہتی تھی۔ گویا اُن کی جادوئی تخلیقی شخصیت ہمارے لیے ایک اسطور سے کم نہ تھی۔ برسوں بعد معلوم ہوا کہ شیخ صاحب کا مولد و منشا دنیا سے الگ تھلگ فلک بوس پہاڑوں کی گود میں برف اور چاندنی کی آماجگاہ لداخ ہے۔ سوچا ہو نہ ہو کوئی پروفیسر یا بیوروکریٹ ہوں گے۔ طمطراق، دبدبہ اور رُعب وداب کا مظاہرہ کرتے ہوں گے۔ اُن سے روبرو گفتگو کا اشتیاق بڑھتا رہا۔ خیر وہ دن آ ہی گیا جب سری نگر میں ایک ادبی نشست میں شرکت کرنے کے موقع پر اُن سے بالمشافہ بات کرنے کا موقعہ مل گیا۔ دیکھا کہ عبدالغنی شیخ واقعی پُر اسرار شخصیت ہیں۔ یعنی عملاً شیخِ خدا مست۔ ایک نام ایسا کہ نہ ڈاکٹر اور نہ پروفیسر کا سابقہ اور نہ آخر میں کسی طرح کا لاحقہ۔ میانہ قد، سڈول جسم، گندمی رنگ، سادہ لباس، متین چہرہ، متبسم ہونٹ، چمکدار آنکھیں اور پست آواز۔ غرور نہ گھمنڈ۔ چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتے مگر طویل مسافتیں طے کرتے۔

اللہ ان کی عمر میں برکت فرمائے۔ اب تک قریب تر اسی بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ ماشاءاللہ ابھی ضعیف العمری کوسوں دور ہے۔ دراصل تعصب، بغض وحسد، حب جاہ وحشم، کینہ وملال، شکوہ و شکایت اور خوشامد وچاپلوسی سے پاک زندگی گزارنے کو کامیابی کی کنجی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے خوش وخرم اور مطمئن ہیں۔ بقول مرزا داغ دہلوی ؎

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دلِ بے مدّعا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

اللہ نے اُنہیں قناعت، تواضع، توکل اور سادگی جیسی دولت دے کر سب کچھ دیا ہے۔ کبھی نام ونمود اور انعامات واعزازات کے لیے اپنی ادبی حیثیت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔ بس مطالعہ، فکر ونظر، تجربہ وتجسس اور استقلال سے کام لیتے ہیں اور پھر اپنے قلم گوہر بار سے علم وفن کے خزانے لٹاتے ہیں۔ مجھے اُنہیں چلتی پھرتی لائبریری کہنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

مادری زبان لداخی ماں کے دودھ کے ساتھ نوش کی ہے۔ پاس ہی میں بولی جانے والی بلتی بھی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ فارسی ابتداً درساً پڑھی پھر از خود استعداد بہم پہنچائی۔ والد صاحب لداخ میں پرچون کی چھوٹی سی دکان چلاتے تھے۔ مقامی گاہکوں کے علاوہ وسط ایشیا خاص کر یارقند سے سوداگر لداخ کے راستے کشمیر آتے اور یہاں کی مصنوعات خرید کر دوسرے علاقوں میں فروخت کرتے۔ یہی قافلے ان کی دکان سے سودا سلف خاص طور سے نسوار خریدنے آتے اور ڈھیرے جماتے۔ والد بزرگوار آنہ، چونی کما کر روزی روٹی کی فکر میں رہتے تو ننھا مُنا عبدالغنی شیخ گاہکوں کی باتوں میں دلچسپی لیتا۔ وہ بھی اتنی کہ اُن سے فارسی بول چال کے علاوہ تُرکی زبان بولنا بھی سیکھ لیا۔ اس موقع پر میں اُنہیں اپنا دوست کہنے کی جسارت نہ کرتے ہوئے بھی محض محاورہ نبھانے کے لئے کہوں کہ:

زبانِ یارِ من ترکی ومن ترکی نمی دانم

حضرات یہ وہ زمانہ تھا جب راستے مسدود نہیں ہوئے تھے۔ بٹوارے کا قہر نہیں ٹوٹا تھا۔

سرحدیں متعین نہیں ہوئیں تھیں۔ خطے کے لوگ آزاد ماحول میں سانس لیتے تھے۔ میل جول کا اچھا موقع تھا۔ عام آدمی بھی کئی کئی زبانوں کی سدھ بدھ ماحول کے ذریعے پیدا کرلیتا تھا۔

حالات میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی۔ نہ وہ گاہک اور نہ وہ سیکھنے سکھانے کے مواقع رہے۔ ان کی فارسی دانی تو اردو دانی کی بدولت ہنوز محفوظ ہے۔ مگر افسوس! ترکی کی، کی کی، ذہن کے پردے سے محو ہوگئی۔ الفاظ تو شاید اب بھی اِکا دُکا یاد ہوں مگر جملہ بولنا محال۔

اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کا کام آسانی سے انجام دیتے ہیں۔ تاہم اردو اور عبدالغنی شیخ کا رشتہ اتنا مضبوط و مستحکم ہوگیا ہے کہ اسے ناقابل تنسیخ کہا جاسکتا ہے۔ جس اردو کا ان علاقوں سے دیس نکالا ہوگیا جہاں اِس کے اصلی وطن کا دعویٰ ماہرین لسانیات کرتے تھے وہ اُردو برصغیر کے دور افتادہ علاقہ لداخ میں عبدالغنی شیخ کے قابل ستائش مہمان خانے میں مزے لے لے کر ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ ان کے افسانے اور ناول ساری اردو دنیا میں ذوق وشوق سے پڑھے اور سراہے جاتے ہیں۔ غیر افسانوی مضامین، انشائیے اور تاریخ نویسی میں بھی اردو ہی برتتے ہیں۔ انگریزی میں بھی تالیف و تصنیف کا کام کرتے ہیں جو پسند بھی کیا جاتا ہے اور انعام و اعزاز سے بھی نوازا جاتا ہے۔ مگر اردو کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اردو نے ان کے لئے خونی لکیر کی دونوں جانب قارئین کا بڑا حلقہ پیدا کیا ہے۔ اِدھر بھی چھپے ہیں اُدھر بھی۔ اردو زبان کی طرح شیخ صاحب کو بھی نفرت اور ہٹ دھرمی، جنگ و جدل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ آشتی اور صُلح کے خوگر ہیں۔ اُن کی اردو دوستی اور انسان دوستی کے ثبوت کے لیے ان کی کتاب ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' کا انتساب ملاحظہ فرمائیے:

> ''مدن پال ورما اور ستنزین وانگبو کے نام جن کو اردو سے گہری محبت تھی۔
> اوّل الذکر فصیح اور بلیغ اردو میں مجھے لمبے لمبے خطوط لکھا کرتے تھے اور کبھی ملاقات ہوئے بغیر اس جہاں چلے گئے۔
> ستنزین وانگبو سے گاہے گاہے لیہہ میں ملاقات ہوتی تھی اور کتابوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔''

خلوص وایثار اور رواداری کی ایسی مثال موجودہ دور میں ملنا مشکل ہے۔ ان سطور کے ہر لفظ سے سادگی، دوستی، بے نیازی، شائستگی، انسانیت، شرافت اور وسعت قلبی ٹپکتی ہے۔

عبدالغنی شیخ کی تصنیف کردہ افسانوی و غیر افسانوی کتابوں کی زبان غیر مرصع، غیر مسجع، بے تکلف، عام فہم، واضح اور دل و دماغ میں گھر کرتی ہوئی ہے۔ تصنع اور تزئین کاری کا فن اُن کو آتا ہی نہیں۔ اُن کا متن ہیئت کے بل پر نہیں، نفسِ مضمون کی اہمیت اور زبان کی سلاست کی وجہ سے اثر آفرین ہے۔ 'قلم، قلم کار اور کتاب' اس قبیل کی کتب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

☆☆☆
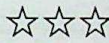
پسِ نوشت:

عبدالغنی شیخ کی شخصیت اور فن سے متاثر ہو کر لکھی گئی راقم کی نظم۔

ہم کو جب سے شیخ صاحب سے شناسائی ہوئی
ڈھیر سی کوتاہیوں کی بھی بھرپائی ہوئی

کیا سلاست، کیا روانی، کیا بیان
صفحۂ قرطاس پر چاندنی چھائی ہوئی

صاف اور سادہ زبان جادو اثر
گویا ماؤں کی وہ لوریاں گائی ہوئی

لطف دیتی ہے ہمیشہ دوستو
پڑھ کے ساری بات سلجھائی ہوئی

سہل گوئی ان کے فن کا امتیاز
بیٹھتی ہے دل میں سمجھائی ہوئی

آگہی کا اِک خزینہ شیخ کی تصنیف ہے
پاس کی دِکھتی ہے ہم کو دور کی لائی ہوئی

ان کی اردو صاف، شستہ، بے گماں
میر و غالبؔ اور اکبرؔ کی پذیرائی ہوئی

اس طرح اشعار ہیں مشہورؔ کے
جیسے نقد و نظر کی برسات ہے چھائی ہوئی

......●●●......

☆......ڈاکٹر پریمی رومانی

بسیار نویس منفرد قلمکار - عبدالغنی شیخ

ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ تاہم جن افسانہ نگاروں نے اپنے ذہنِ رسا سے اس فن کو آگے بڑھایا۔ اُن میں پریم ناتھ پردیسی، رامانند ساگر، قدرت اللہ شہابؔ، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، گنگادھر دیہاتی، ٹھاکر پونچھی، موہن یاورؔ، بنسی نردوشؔ، دیپک کنول، تیج بہادر بھانؔ، حامدی کاشمیریؔ، برج پریمیؔ، پشکر ناتھ، ہری کرشن کول، نور شاہ وغیرہ پیش پیش ہیں۔ اس فہرست میں عبدالغنی شیخ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، جنہوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کی تہذیب اوراس کے کلچر کا رنگ بھردیا اور موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔

عبدالغنی شیخ دُنیا کے بُلند ترین مقام لیہ لداخ میں ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے حاصل کی۔ گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے ابتداء سے ہی منڈلا رہے تھے لیکن ہمت اور حوصلے سے اُنہوں نے ان تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ آخر ذریعہ معاش کی تلاش میں سرینگر پہنچ گئے اور وہ ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کی۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ اپنے مضمون ''یادوں کے لمس'' میں اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے خود رقمطراز ہیں:

> ''۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ میں سرینگر میں ویٹرنری اسٹاک اسسٹنٹ کی ٹریننگ حاصل کر رہا تھا۔ میٹرک پاس کیا تھا۔ آگے بڑھنے کا شوق تھا لیکن

غربت کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہیں لے سکا۔‘‘

(برج پریمی۔ایک مطالعہ مرتب پریمی رومانی ص:۱۷)

عبدالغنی شیخ نے زندگی میں بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔انہوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا اوراس طرح سے کئی امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کئے۔اسی دوران وہ وزارتِ اطلاعات ونشریات کے ساتھ وابستہ ہوئے اور یہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔مطالعہ اور کتب بینی کا چسکا بچپن سے ہی اُن کی گُھٹی میں پڑا ہوا ہے۔چنانچہ ابتدا سے انہوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری وساری ہے۔اُن کے متعدد افسانے ڈرامے،خاکے اور مضامین ملک کے معیاری رسائل میں چھپ چکے ہیں اور مقبول عام ہوئے ہیں۔شیخ ترقی پسند نظریات کے حامی ہیں اور کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں۔اُن کے بارے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

> ’’کرشن چندر کا نام جب لیا جاتا ہے تو ذہن باغ و بہار ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے سامنے جلوہ حُسن ہزار رنگ کی طرح ایک رنگین چمن کا سماں کھینچ جاتا ہے جس میں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں اور شوخ وشنگ تتلیاں فضا میں جھوم رہی ہیں۔یہ جان دار تاثرات کرشن چندر کے خوبصورت الفاظ عطا کرتے ہیں جو کہانیوں اور ناولوں کے روپ میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔‘‘

(ماہنامہ شاعر بمبئی،کرشن چندر نمبر،ص:۲۳۹)

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عبدالغنی شیخ شروع میں کمال لداخی کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ اُن کے کئی ابتدائی افسانے اسی نام سے شائع ہو چکے ہیں۔اُن کا ایک افسانہ ’’لوسر اور آنسو‘‘ ۱۹۵۸ء میں ماہنامہ ’’دلیش‘‘ سرینگر میں شائع ہوا جس کے ادارتی فرائض میرے والد آنجہانی ڈاکٹر برج پریمی انجام دیتے تھے۔اُس زمانے میں ملک میں اُردو ادبی رسائل کا کال تھا۔گِنے چُنے رسائل نکلتے تھے جو گروہ بندی کا شکار ہو چکے تھے۔نئے لکھنے والوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی۔ایسے میں سرینگر سے ایک ادبی رسالہ نکلنا ایک نیک فال ثابت ہوا۔عبدالغنی شیخ (کمال لداخی) ایک نیا ادبی رسالہ دیکھ کر خوش ہوئے۔اس خوشی کا اظہار وہ والد کے نام اپنے ۱۲؍اپریل ۱۹۵۸ء کے خط میں یوں کرتے ہیں:

''گرامی نامہ ملا اور بڑی مسرت کے درمیان یہ پڑھا کہ اخبار سہ روزہ ''دیش'' سرینگر نے ایک رسالہ اجرا کیا ہے۔ ایسے ہی ایک رسالے کی بڑی ضرورت تھی۔ وطن کے ادیبوں کے پاس ہمیشہ تخلیقات رہتی ہیں لیکن کوئی ایسا ادبی ماہنامہ نہیں جو مستقل طور پر ان تخلیقات سے وطن اور بیرون وطن کے لوگوں کو روشناس کرائے اور یہ کتنی المناک حقیقت ہے۔ خدا کرے ہمارے یہ ماہنامہ ہمارے سابقہ دوسرے رسائل کی طرح پہلی ہی منزل پر دم نہ توڑ دے اور سابقہ خامیوں کی تلافی کرے۔''

(ماہنامہ دیش سرینگر، مارچ ۱۹۵۸ء، ص:۴۰)

عبدالغنی شیخ بہ یکِ وقت ایک افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، سوانح نویس بھی اور محقق بھی۔ لیکن افسانہ اُن کا پہلا عشق ہے۔ وہ اس وقت تک متعدد افسانے لکھ چکے ہیں جو ملک کے مختلف اخبارات اور جراید کی زینت بن چکے ہیں۔ لکھنے کا شوق اُنہیں بچپن سے تھا۔ اپنے ادبی سفر کے آغاز کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

''سری نگر میں اُن دنوں گاہے گاہے کسی ہوٹل یا کسی ادیب کے گھر ادبی مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جلد ہی مجھے اُن کی بُو باس مل گئی اور میرا ادبی ذوق مجھے اُن مجلسوں میں کھینچ لے گیا۔ ادب کا چسکا میں لیہہ سے اپنے ساتھ لایا تھا اور لکھنے کی چھوُت بھی لگی تھی لیکن یہ چھوت بڑی خوبصورت اور نفع بخش تھی۔ اس نے مجھے حوادثِ زمانے کا مقابلہ کرنے، جینے اور زندگی میں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔''

(برج پریمی۔ ایک مطالعہ مرتبہ پریمی رومانی، ص:۱۷)

''زوجی لا کے آر پار'' عبدالغنی شیخ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کی ابتدائی کہانیاں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں شیخ نے طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، رشوت خوری اور ظلم وتشدد کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں پیار ومحبت کی جھلکیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں میں شیخ کا فن اپنے جوبن پر نظر نہیں آتا لیکن پھر بھی فکر کی جلوہ سامانیاں جابجا

نظر آتی ہیں۔

عبدالغنی شیخ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دوراہا'' ہے۔ یہ ۲۳ افسانوں پر مشتمل ایک خوبصورت گلدستہ ہے اس میں وہ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شیخ منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ بظاہر یہ مختلف اوقات میں لکھی گئی کہانیاں ہیں لیکن ان میں پلاٹ سازی، کردار نگاری، واقع نگاری، منظر نگاری کے ساتھ ساتھ فکر وفن کی تازگی بھی ملتی ہے۔ یہ اُس سرزمین کی کہانیاں ہیں جہاں کے لوگ سیدھے سادھے، محنتی اور حسن واخلاص کے پیکر ہیں۔ یہ خطہ ریاست کے دوسرے خطوں سے مختلف ہے۔ یہاں کا رہن سہن، لباس کلچر اور تہذیب اسلامی اور بودھی روایات کا سنگم ہے۔ چنانچہ ان تمام چیزوں کی عکاسی عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ عبدالغنی شیخ اپنے مادرِ وطن لداخ سے بے پناہ عشق رکھتے ہیں۔ انہیں اس کا کلچر، تہذیب اور تمدن بڑا عزیز ہے۔ اپنے ایک خط میں میرے والد مرحوم کو لکھتے ہیں:

> ''لداخ میرا وطن ہے۔ یہاں کے تمدن و معاشرت کی نیرنگیاں میرے ذہن میں رچ بس گئی ہیں۔ ہر گھر کے کُنج اور ہر کوچے کی نکڑ پر مجھے یہاں کی معاشرت سے متعلق کہانیاں بکھری ملتی ہیں اور میں اُن کی عکاسی کرنا اپنا پہلا فرض جانتا ہوں۔ آپ مجھ سے اور کہانیاں ڈرامے وغیرہ طلب کر سکتے ہیں جو یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اُٹھاتی ہیں۔''

(ماہنامہ 'دیش' سرینگر ۱۹۵۸ء، ص:۴۰)

عبدالغنی شیخ کو افسانوی تکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ لداخ میں بیٹھ کر کبھی دلی یا کسی اور شہر کی بات نہیں کرتے بلکہ اردگرد کے ماحول کو پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُن کے کردار جانے پہچانے کردار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فرسودہ اور غیر متحرک کرداروں کو پیش نہیں کرتے ہیں بلکہ اُن کے کردار افسانے کے پلاٹ کے گرد کچھ اس طرح گھومتے ہیں کہ ایک جانی پہچانی دُنیا آنکھوں

کے سامنے آجاتی ہے۔ علی باقر اُن کی کردار سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت منداور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بُلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ حقیقت نگاری کے قایل ہیں اور اپنے کرداروں کے احساسات نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں۔''

(دوراہا، از عبدالغنی شیخ)

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ اس میں پیار و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور سماجی نابرابری کا احساس بھی، ظلم و تشدد کے واقعات بھی ہیں اور انقلابی نوجوان بھی۔ بعض کہانیوں میں بھرپور طنز ملتا ہے۔ وہ سماج، سوسایٹی اور فرد پر کبھی کبھی طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ شیخ کے افسانوں اور ناولوں میں ڈرامائیت بھی ملتی ہے۔ اس ضمن میں رشتے ناطے، قاتل، نہتے ہاتھ، بانجھ، دوراہا اور ہوا جیسے افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ ایک اچھے ناول نگار بھی ہیں۔ ''وہ زمانہ'' اُن کا لداخ کے ماحول اور اس کے تہذیب اور کلچر پر ایک تاریخی ناول ہے۔ اُن کا دوسرا ناول ''دِل ہی تو ہے'' ہے جو ۱۹۷۸ء میں چھپ کر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو لداخ کی ایک دوشیزہ کے زلف رَہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ لیکن پھر جب اُن کی محبت کے درمیان میں ایک اور کردار آتا ہے تو یہ کہانی نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ شیخ کا ناول ''دل ہی تو ہے'' سونم اور پدماں کی محبت کی داستان ہے۔ انہوں نے اس محبت کو خالص لداخ کے پسِ منظر میں پیش کیا ہے اور کامیابی سے زینہ بہ زینہ طے کر کے اس داستان کو ایک ایسے موڑ پر لایا جہاں خود بہ خود تضاد پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ دراصل سماج کا ٹکراؤ ہے اس میں نیماں کا کردار داخل ہونے سے کشمکش پیدا ہوجاتی ہے۔ لیہہ کے ماحول اور یورپی سیاحوں کے پسِ منظر میں لکھا ہوا یہ دلچسپ رومانی ناول ہے۔

عبدالغنی شیخ نے نہ صرف افسانہ نگاری اور ناول نگاری میں ہی اپنی طبیعت آزمائی ہے بلکہ

اُنہوں نے بحیثیت ایک سوانح نویس کے بھی قابلِ قدر نام پیدا کیا ہے۔ اُن کی کتاب ''صنم زربو'' بھی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ملک کے سرکردہ انجینئر، سفیر اور سیاست دان مرحوم صنم زربو کے کارناموں کو لوگوں کے سامنے رکھا ہے جنہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے سرینگر سے لیہہ جانے والی قومی شاہراہ تعمیر کر کے ایک شاندار کارنامہ انجام دیا ہے۔ عبدالغنی شیخ کے ادب، ثقافت اور لداخی کلچر اور تاریخ پر متعدد مضامین شائع ہو چکے ہیں جو اپنی جگہ مسلم ہیں۔

...... ●●● ......

☆......حمید اللہ حمید

عبدالغنی شیخ لداخی
یادوں کے جھروکوں سے

ستمبر ۲۰۱۸ء لداخ فیسٹول میں شرکت کے واسطے لیہہ جانا ہوا۔ جس روز عبدالغنی شیخ کے دولت خانہ پر ملاقات کا وقت تھا تو اُسی روز امریکی طلبا کے گروپ کے ساتھ اُن کی مصروفیت تھی۔ اس لئے ہماری ملاقات نہ ہوسکی۔ اگلی صبح 10 بجے برابر فون کرتے رہے بڑی گرم جوشی کے ساتھ بولے آج دن بھر کھل کر ملاقات رہے گی۔ چونکہ کئی سال بعد لیہہ آیا تھا اس لئے شمال مغربی شہر کے حصے کو آنکھوں میں سمانہ سکا اس لئے انہوں نے مین بازار میں ڈاک خانہ آنے کو کہا۔ پولوگراونڈ ضلعی انفارمیشن دفتر سے دوپہر بارہ بجے نکل پڑا۔ کوٹ پتلون پہنے سر پر کیپ لگائے آنکھوں پر چشمہ چڑھائے دراز قد کی پُرکشش شخصیت منتظر پائی۔ دونوں گلے ملے۔ ایسے لگا مجھ چھوٹے قد کا آدمی ان کے کندھوں تک پہنچتا ہے۔ شکل اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے مجھ سے جوان ہیں مگر فوراً اندازہ کر گیا کہ عمر میں 20 سال کا تفاوت۔

چلتے چلتے باتیں کرتے ہوئے ایک ریستوران کی جانب قدم بڑھائے تو میں پوچھ بیٹھا ”کہاں لے جارہے ہیں۔“ ”کیوں رُک گئے حمید اللہ صاحب! چلئے تو سہی اس ہوٹل میں بڑھیا کھانا ملتا ہے۔“ میرے بازو کو کھینچتے لے گئے ”یہاں خوب کشمیری وازوان ملتا ہے۔“

”نہیں نہیں شیخ صاحب۔ جب میں گھر سے دور سفر پر ہوتا ہوں تو دوپہر کو ہلکی غذا لیتا ہوں شام کو چاول اور گوشت لیتا ہوں۔“ میں بولا۔

عبدالغنی شیخ کافی اصرار کرتے رہے مگر میں ریستوران کے اندر نہیں گیا۔ سُو میں آگے ہولیا۔

''چلیئے اب گھر پر ہی آپ کا من پسند کا کھانا ملے گا۔''

وہ پوچھ بیٹھے ''دوپہر کا کھانا ترک کیئے کتنا عرصہ ہوا اور اس کے پیچھے وجہ۔''

''سالہا سال پہلے میری ڈیوٹی نیوما میں تھی تو اکثر دوروں پر نکلنا پڑتا تھا۔ کسی فنکشن میں شرکت کے واسطے سب ڈیژن چنگ تھنگ چین سرحد پر جانا پڑتا تھا۔ لہٰذا ناشتہ کے بعد ہی کوارٹر سے ہلکی غذا تیار کر کے تھرماس میں چائے ڈال کر ڈرائیور کو حوالہ کرتا''۔ یہ کہتے ہوئے نیوما وادی آنکھوں میں سمائی اور نیلے گگن کے تلے اس کے رنگ برنگ بلند و بالا کوہسار نگاہوں میں لہرانے لگے۔ سرکل روڈ سے ہوکر نیوما وادی سے آگے جانا پڑتا تھا۔

''آپ کہیں کھو گئے ہیں۔'' وہ پوچھ بیٹھے۔

''جس روز نیوما سے ادھر لیہہ آتا تو کچھ یوم یہاں قیام کے دوران بھی میرا یہی طریقہ رہا کہ دن کو Lunch میں ہلکی غذا لیتا۔ لداخ سے واپسی کے بعد کشمیر میں میری یہ عادت برقرار رہی۔''

''ارے حمید صاحب، آپ کی یہ عادت صحت کے لئے بھی اچھی ہے اور میزبان کے لئے بھی آسان ہے۔''

اتنے میں ہم گرینڈ یاسمین ہوٹل کے اندر داخل ہوگئے۔ کھلے ہال میں گلاس روم میں دھوپ چھن چھن کر آتی تھی۔ میز کے گرد دو کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے۔ میری فرمائش پر کافی ٹوسٹ اور آملیٹ لائے۔ عبدالغنی شیخ نے بھی اپنے لئے بھی یہی منگوایا۔

باتوں باتوں میں اُن کی حیات اور کارناموں سے باخبر ہوگیا جن کا برسوں سے بے خبر تھا۔

عبدالغنی شیخ مزاج کے نرم اور حلیم ہیں۔ دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ عبدالغنی صاحب کی شگفتہ مزاجی سے تب سے Impress ہوں جب ان کے ساتھ میرا پہلا تعارف مولانا محمد عمر ندوی (موجودہ زونل ایجوکیشن آفیسر، چاڈورہ ضلع بڈگام) نے کرایا۔

کبھی کبھار نیوما سے لیہہ آ کر کئی روز ٹھہرنا پڑتا تھا۔ یا تو ندوی صاحب کے اصرار پر ان کے دولت خانہ پر رات کو قیام کرتا یا اسسٹنٹ ڈائریکٹر ژھرنگ نربو کے کوارٹر پر ٹھہرتا تھا۔ اپنے

ہم منصب حسن علی چھچھوت کے ہاں تو زیادہ قیام رہا ہے۔ مگر کوشش رہتی کہ گیسٹ ہاوس میں راتیں گزریں۔ عبدالغنی شیخ کے ہاں دن کو ملاقاتیں رہتیں۔

جولائی 2003ء میں لداخ میں انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹڈیز (آئی اے ایل ایس) کی گیارہویں کانفرنس منعقد ہوئی جو پانچ روز رہی۔ اس میں مختلف ممالک کے 120 مندوبین شریک رہے۔ شیخ صاحب اس کے دیرینہ ممبر تھے، اس لئے یورپی ممبران اور ملک کے کئی اصحاب ان کو جانتے تھے وہ IALS کے سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ عبدالغنی شیخ لداخ میں خاصے جانے پہنچانے ہیں۔ انہوں نے کانفرنس میں Transformation in Kukshso Village کے عنوان سے مقالہ پڑھا جو کافی دلچسپ تھا۔ پھر انہوں نے پوچھے گئے سوالات کا برجستہ جواب دیا۔ ژھرنگ نربو نے Walkha Mulbek Conflunce of two Families کے عنوان پر مقالہ پڑھا۔ یہ بھی دلچسپی سے سنا گیا۔ نئے ممبر اور چنگ تھنگ کے آفیسر ہونے کے ناطے IALS کے John Bray کی صلاح پر میں نے آخری روز Changes and Development in Changthang پر مقالہ پڑھا۔ ان ایام میں گروپ فوٹو بھی لئے گئے۔

لداخ میں تین سال قیام کے دوران شیخ صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ نیوما چنگ تھنگ کے بارے میں سرینگر کے اخبارات میں میرے تیس مضامین پر مبنی فائل دیکھ کر میری سراہنا کی۔ آپ پہلے آفیسر ہیں جس نے اقتصادی اور ترقیاتی مضامین شائع کئے ہیں۔

لداخ سے واپسی کے ایک سال بعد میری تصنیف 'آئینہ لداخ' چھاپنے سے پہلے میں نے لیہہ جا کر شیخ صاحب کو مسودہ دکھایا۔ کچھ تصحیح کے بعد چھاپنے کا مشورہ دیا اور اپنی رائے بھی لکھ دی۔ وہیں ستیش نہرو ڈپٹی کمشنر اور علی رضا ایس ڈی ایم نیوما کے علاوہ حکیم منظور نے بھی رائے اور تبصرے لکھے۔

انٹرنیشنل لداخ سٹڈیز کے بنیادی اور سینئر ممبر کے طور عبدالغنی شیخ نے انگلینڈ، روم (اٹلی)، ڈنمارک اور جرمنی میں منعقدہ IALS کی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔

لیہہ لداخ میں جہاں بودھ دھرم کا بول بالا ہے، وہاں مسلمان، عیسائی اور سکھ مذہب کے پیروکار بھی آباد ہیں۔ ان میں آپس میں اتحاد ہے۔ عبدالغنی شیخ کے لداخ کے مسلمانوں کی تاریخ،

ثقافت وغیرہ کے بارے میں لکھے گئے ایک معلوماتی مضمون کو انجمن معین الاسلام لیہہ نے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے تقسیم کیا۔ ان کے آرٹیکل کو راقم نے 'آئینہ لداخ' میں شامل کیا۔ لداخ سے متعلق جتنا مواد عبدالغنی شیخ نے منظر عام پر لایا ہے اتنا کسی نے کام نہیں کیا ہے۔ جہاں لداخ کے مسلمانوں میں ان کی عزت ہے وہاں ایک قلم کار کی حیثیت سے بودھ دھرم ماننے والے بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ مصنف کو لداخ سے گہرا لگاؤ ہے۔

چنگ تھنگ کے دور افتادہ مقامات کے بارے میں عبدالغنی شیخ نے بتایا کہ بطورِ فیلڈ پبلسٹی آفیسر لیہہ ڈیوٹی کے دوران وہ نیوما صدر مقام سے آگے چھشول اور پنگونگ جھیل کے گرد دیہات دیکھ چکے ہیں۔ جہاں چنگیا قبائل کو فیچر اور ڈاکومنٹری فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

کلچرل اکیڈیمی کے شاہ ہمدان نمبر برائے شیرازہ میں حضرت امیر کبیرؒ اور لداخ کے عنوان سے ان کا تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ تحریر کرتے ہیں ''شاہ ہمدانؒ سے متعلق لداخی مسلمانوں میں یہ روایت ہے کہ وہ لداخ اور تبت کی سرحد پر واقع ایک مقام مردے ناغا گئے تھے جہاں خطے کی امن وسلامتی کے لئے انہوں نے دُعا مانگی تھی۔ یہ اُن کی دُعا کا اثر تھا کہ ہند چین جنگ میں اس علاقے کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔

اس علاقے کے نیوما گاؤں میں جو سرحدی علاقہ چنگ تھنگ سب ڈویژن کا صدر مقام ہے ایک گھنپے میں کسی مسلم بزرگ سے وابستہ ایک مورتی ہے۔ جو ''خاچے لہا'' یا ''مسلم دیوتا'' کے نام سے مشہور ہے۔ لیہہ کے جانکار مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ مورتی حضرت میر سید علی ہمدانی سے گہری عقیدت کے طور پر علاقے کے لوگوں نے نصب کی تھی۔

عبدالغنی شیخ کی کہانیوں کا نیا مجموعہ چھپ چکا ہے۔ سرینگر اور دہلی کے جریدوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اردو اور انگریزی زبان میں ان کی سترہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان میں 'قلم، قلمکار اور کتاب'، Forsaking Paradise اور لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے شامل ہیں۔

......●●●......

عبدالغنی شیخ۔ چند یادگار ملاقاتیں

ماضی بعید میں اگرچہ لداخی زبان میں لداخ کی تہذیب، تمدن اور ثقافت پر خامہ فرسائی کر کے کئی مقامی قلمکار مصنفین کی صف میں شامل ہوئے ہیں، تاہم بیسویں صدی کے ابتدائی چند عشرے تک اردو قلمکاروں اور قارئین کی تعداد صفر تھی۔ اس خطے میں پہلے اردو قلمکار بننے کا سہرا منشی عبدالستار کے سر جاتا ہے جس نے 1930ء میں لداخ کی تاریخ اردو زبان میں لکھ کر پہلا اردو قلمکار بننے کا شرف پایا ہے۔ اُن کے بعد اکبر لداخی اور عبدالغنی شیخ اردو ادب کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ اکبر لداخی تو لداخی طرز زندگی پر کچھ کہانیاں، کچھ مضامین لکھ کر پسِ پردہ جا بیٹھے، جبکہ عبدالغنی شیخ کا ادبی سفر جاری رہا اور دلچسپ کہانیوں کی تخلیق شدومد کے ساتھ کرتے ہوئے اخباروں اور کلچرل اکیڈیمی کے موقر جریدہ ''شیرازہ'' کے علاوہ اپنے اولین افسانوی مجموعہ ''زوجیلہ کے آر پار'' کے ذریعے دنیائے ادب پر چھانے میں کامیاب ہو گئے۔ اُن کا مجموعہ خطے میں اردو پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنا تو قارئین کی ایک بڑی جماعت وجود میں آ گئی۔ خوب پذیرائی ملی، یوں لداخ کے اردو ادب کی تاریخ میں افسانہ نگاری کی حیثیت سے اُن کا یہ فخریہ کارنامہ تھا۔

اُن دنوں میری ان سے شناسائی نہ تھی اور ایک ناآشنا سے تعلقات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے اُن کی شخصیت، مزاج، عادات و اطوار سے بھی نابلد رہا ہوں گا۔

میں لڑکپن سے ہی بیسویں صدی، ماہنامہ شمع جیسے ادبی رسائل کی ورق گردانی کرتا رہا ہوں۔

پردیس میں ملازمت کے دوران وقت گزاری کے لئے سرکاری لائبریریوں سے ہاتھ لگے افسانوی مجموعے، رومانی، ادبی، سماجی اور جاسوسی ناول پڑھتے رہنا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی افسانے کہانیاں لکھنے کے جنون میں جانے کتنے اوراق خامہ فرسائی کے بعد ردی کی ٹوکری کی نذر بھی کئے ہیں۔ ایسے میں اپنے ہی خطے کے ایک کامیاب قلمکار سے شناسائی نہ ہونا اور اُن کے اولین افسانوی مجموعے سے بے بہرہ رہنا میری بدقسمتی تھی اور یہ بدقسمتی لیہہ شہر سے دور کھردونگ لا پہاڑ کی دوسری طرف نوبرا وادی کے ہُندر ہائی اسکول میں تقرری کی وجہ سے تھی۔

دوسال کی مدت پورا کرنے کے بعد واپس لیہہ شہر تبادلہ ہوا تو سب سے اپنے مقامی ٹیچنگ اسٹاف سے عبدالغنی شیخ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ مگر وہ شاید ابھی اتنے مشہور نہ تھے اس لئے کوئی جانکاری نہ ملی۔

عبدالغنی شیخ کے کچھ قریبی دوست نثار راہی اور جی ایم شیخ جو میری طرح لداخ اردو ڈراما کلب لیہہ سے ممبران اور کلاکار کی حیثیت سے جڑے تھے۔ انہوں نے میرے لکھنے کے جنون کو بھانپتے ہوئے شیخ صاحب سے ملنے میں میری رہنمائی کی۔ دورانِ گفتگو معلوم ہوا کہ اُن کا ایک اور ناول ''دل ہی تو ہے'' بھی منظرِ عام پر آچکا ہے اور اروڑہ اسٹیشنری جنرل اسٹور لیہہ میں دستیاب ہے۔ حُسنِ اتفاق سے ایک آخری کتاب بچی تھی۔ گھر آکر ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اور محظوظ ہو کر اُن کی قابلیت کا معترف ہو گیا۔ اس ناول سے پہلے اپنے جانکاروں میں مرحوم عبدالرحمان مخلص کا ناول ''سنگدل باپ'' پڑھ چکا تھا۔ دیگر مصنفین کے ناول بھی ادبی، سماجی اور رومانی لحاظ سے دلچسپی کا باعث بنے تھے مگر عبدالغنی شیخ صاحب کا ''دل ہی تو ہے'' ان ساری خصوصیات کے علاوہ بدلتے لداخ کی عکاسی کے ساتھ ساتھ تاریخی مقامات کے معلومات کا خزانہ ثابت ہوا کہ پڑھنے والا لداخ کی تہذیب وتمدن کے ساتھ اطراف سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔ نپے تلے انداز میں لکھا یہ ناول کافی دلچسپی کا حامل تھا۔

ان ہی دوستوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دنوں شیخ صاحب لداخ سے متعلق یورپی مصنفوں کی تصنیفات پڑھنے اور تالیفات کے عمل میں جٹے ہوئے ہیں۔ نثار راہی کہنے لگے: ''اُن سے ملنا ہے تو ڈسٹرکٹ لائبریری کے چکر لگانے پڑیں گے۔ وہاں اکثر جاتے رہتے ہیں۔''

ڈسٹرکٹ لائبریری تو میں بھی کبھی کبھار جاتا رہتا ہوں مگر اتفاق سے بھی کبھی ان سے سامنا نہ ہوا۔ یہ جانکاری ملنے کے بعد تو مسلسل ایک ماہ تک بنا ناغہ لائبریری پر جانا جاری رکھا۔ اس لئے بھی ڈٹا رہا کہ کچھ لکھے ہوئے نسخوں کی طباعت واشاعت کے ممکنہ طریقوں کی واقفیت سے مستفید ہوسکوں۔

آخر ایک دن قسمت نے یاوری کی اور لائبریری پارک کے بیچوں بیچ آتے جاتے ہماری ملاقات ہو ہی گئی۔ ایک دراز قد شخص بہ نفس نفیس لائبریری سے نکلے چلے آرہے تھے۔ وہ قریب سے گزرنے لگے تو میں نے اندھیرے میں تیر داغا۔

''اسلام علیکم۔ آپ عبدالغنی شیخ تو نہیں۔۔۔؟''

وہ ٹھٹھک گئے۔ میری جانب کالے چشمے کی آڑ میں سے دیکھا اور بہت حلیمی سے مخاطب ہوئے۔

''وعلیکم سلام۔ جی جی۔ آپ نے صحیح پہچانا۔ اور۔۔ آپ۔۔۔؟''

میں نے اپنا تعارف دیا۔ پھر اشاعت کے بارے میں مدعا ومقصد بیان کیا تو آنکھوں پر سے چشمہ اُتارا، تہہ کر کے کوٹ کی اوپری جیب میں رکھا اور وہیں فرش خاکی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے بولے۔

''آیئے بیٹھیے رشید صاحب۔ آپ سے مل کر اچھا لگا۔''

''جی شکریہ۔ نثار راہی اور جی ایم شیخ سے آپ کی مصروفیات کا علم ہوا تو سوچا اب کافی مُدت تک ملاقات نصیب نہ ہو گی مگر دیکھئے قسمت نے یاوری کی۔''

اس پر اُن کی فراخ دلی دیکھئے، بہت ہی اپنے پن سے جیسے کہ نہ جانے کتنے زمانے کی پہچان رہی ہو بولے۔

''رشید صاحب، دونوں میں سے ایک کے ساتھ پیغام رکھ دیتے تو آپ سے کہیں بھی مل لیتا۔ آپ نے ادب کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ معلومات اور تجربات بانٹنا تو ہمارا حق بنتا ہے۔ ایسا کرنے سے اڑچنوں میں کمی آتی ہے۔''

''جی۔ یہی سوچ کر آپ سے ملنے کا متمنی ہوا ہوں۔ دراصل ایک ناول ''الجھن'' اور چند کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن کی اشاعت کے بارے میں جانکاری چاہتے تھی۔''

ایسا کہتے ہی اُن کے چہرے پر چمک آگئی اور اِن کا بڑاپن دیکھئے کہ اپنے قیمتی وقت کی پرواہ کیئے بغیر ایک دیرینہ دوست کی طرح بہت ہی اطمینان کے ساتھ مقامی اخبارات ''آفتاب'' اور ''نوائے صبح'' تک رسائی کے بارے میں باریکی سے سمجھاتے رہے۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی کے ادبی جریدہ ''شیرازہ'' کے بارے میں جانکاری دی۔ ناول ''الجھن'' کی اشاعت کے لئے حصولِ امداد کی تاکید کی۔ اس سلسلے میں کلچرل اکیڈیمی ''شیرازہ'' کے مُدیر محمد احمد اندرابی اور معاون مُدیر اسد اللہ وانی سے ملنے کا مشورہ دیا۔ سچ مچ دونوں ہستیاں مجھ نو وارد پر کافی مہربان رہیں۔

اس کے علاوہ بہتر سے بہتر لکھنے کے لئے روسی مصنف چیخوف اور چند یورپی مصنفین کے ناول پڑھنے کی تاکید کی۔ ادب سے متعلق کئی اچھی باتیں ہوئیں۔ یہ ملاقات لداخ میں شاید دو مقامی ادیبوں کی پہلی بیٹھک رہی ہوگی، میرے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی اور ان کی فراخدلانہ رہبری سے میری تخلیقات اخبارات اور شیرازہ میں شایع ہوسکیں۔

اِس دوران اُن سے اور بھی ایک آدھ ملاقاتیں ہوئیں۔ ''دل ہی تو ہے'' کے بعد وہ کئی کتابوں کے خالق بنے، تواریخی کتابوں کے محقق، کالم نگار اور نہ جانے کیا کیا۔ جبکہ میں دل کے روگ کا شکار ہوکر معذور ہوگیا۔ پڑھائی لکھائی چھوٹ گئی اور میڈیکل گراونڈ پہ سرینگر ٹرانسفر ہونا پڑا۔ یہاں ڈیڑھ دہائیوں تک میرا تخلیقی عمل تعطل کا شکار رہا۔

ایک دن کشمیر میں حُسنِ اتفاق سے قرآن خوانی کی ایک مقدس مجلس میں ہماری ملاقات ہو گئی۔ اختتام پر انہوں نے رسمی باتوں کے بعد میری ادبی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے سارا حال گوش گزار کر دیا۔ میری صحت کے بارے میں سُن کر کافی دل ملول ہوئے، میری ڈھارس بندھائی۔ حوصلہ دیا۔ پھر سے لکھنے کی تاکید کی۔ کبھی کبھی ٹوٹے ہوئے دل کے لئے تسلی کا ایک بول ہی کافی ہوتا ہے۔ میری بھی ہمت بندھی۔ بس پھر کیا تھا، افاقہ تو ہوا ہی تھا۔ میرے اندر کا قلمکار جاگ اٹھا اور گھر لوٹتے ہی میں نے بھی قلم کا گھوڑا دوڑانا شروع کیا۔ مسلسل کوششوں کے بعد ایک ناول ''احساس'' اور ایک ناولٹ ''مہربان'' کی تخلیق ہوئی اور اشاعت کے لئے دلی کا رُخ کیا۔ اُن دنوں عبدالغنی شیخ صاحب جموں میں ٹھہرے تھے۔ اُن سے دونوں ناولوں کی نظر ثانی مقصود تھی۔ اتفاقاً

ٹورسٹ سنٹر جموں کی بیرونی سڑک پر ملاقات ہوگئی۔ وہ پھر پہلے جیسی گرم جوشی سے ملے۔ میں نے دونوں ناولوں کا تذکرہ کیا تو بے حد خوش ہوئے اور کچھ نئی پرانی گفتگو کے بعد مجھے عارضی رہائش گاہ کا پتہ بتا کر دونوں مسودے لے لئے۔

تیسرے دن فون کر کے رہائش گاہ پر مدعو کیا۔ میں خدشات کا جھاڑ لئے جو میرے دماغ میں اُگ آیا تھا کہ جانے کتنی خامیاں نکل آئی ہونگی، اُن کے ہاں پہنچا۔ وہاں چائے اور رائس پلاؤ سے خاطر تواضع ہوئی۔۔۔ چائے کی چسکیاں لینے سے زیادہ مجھے اُن کے تاثرات جاننے کی طلب تھی۔

وہ کچھ پل ٹھہر کر بولے "میں نے ایک ہی نشست میں دونوں پڑھ لی ہیں۔ الگ الگ موضوعات پر ہیں۔ آپ نے لداخ کے پسِ منظر میں لکھ کر اچھا کیا۔ کافی محنت کی ہے آپ نے۔ مجھے دونوں اچھے لگے۔" پھر کچھ سوچ کر ناصحانہ انداز میں بولے "میری تاکید ہے کہ آپ کسی اچھے بُرد بار کمپوزر سے ان کی کمپوزنگ کروالیں۔ اکثر کمپوزروں کی وجہ سے لکھاریوں کی محنت ضائع ہو جاتی ہے۔ کئی الفاظ گڈ مُڈ ہو چکے ہوتے ہیں۔ کہیں کی، کا، تھا تھی میں امتیاز نہیں رکھتے۔ یوں مسودے کا حُلیہ بگڑ جاتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ خامیوں کے لئے بے چارے قلمکار ہی موردالزام ٹھہرائے جاتے ہیں۔ پروف ریڈنگ خود کریں تو بہتر ہے۔ ایک بار نہیں، کئی بار کریں۔ اُس کے بعد ہی کسی عمدہ پریس میں چھپوادیں۔

اُن کا مشورہ بہ سروچشم قبول کر کے شکریہ ادا کر کے میں وہاں سے چل دیا اور دلی جانے کی بجائے کمپوزنگ کے لئے وادی لوٹ آیا۔ یہ اُن کا بڑا پن تھا کہ اپنی مصروفیات کے باوجود مجھ جیسے نو آموز قلمکار کے لئے اپنا قیمتی وقت نکالتے رہے۔

یہ دونوں ناول جو سال 2000ء کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف تحریری مرحلوں سے گزر کر پایۂ تکمیل کو پہنچے تھے۔

اس کے بعد ایک کہانیوں کا مجموعہ "اندھیرا سویرا" ترتیب دے کر شیخ صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے تبصرہ لکھنے کے علاوہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ کئی کہانیاں باہر کے رسالوں کو بھیجنے کے قابل ہیں۔ اِس حوصلہ افزا بات کو سُن کر میرا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا۔ ایک بلند پایہ نامور ادیب اور محقق کی مثبت اور بے ریا سوچ سیدھے میرے دل میں اُتر گئی۔ کیسے نیک نیتی سے میری

سراہنا کی اور اشارے میں خول سے باہر نکل کر بلند پرواز کرنے کے لئے اکسادیا۔ ورنہ اکثر ادیب ایک دوسرے کو پنچا دِکھانے کے چکر میں معمولی سی خامی کا پہاڑ بنانے پر تلے رہتے ہیں۔ اس عظیم شخصیت کو میں خلوصِ دل سے سلام کرتا ہوں۔

میں ابتداء سے ہی عبدالغنی شیخ صاحب کی دریا دلی اور شرافت کا قائل ہوں۔ میں نے اُن کے مزاج میں نہ کبھی فتور دیکھا ہے نہ شعبدہ بازی محسوس کی ہے۔ ہمیشہ اُن میں سادگی اور حلیمی پائی ہے۔ ''کاش! میری صحت نے بے وفائی نہ کی ہوتی تو زندگی کی درمیانی ڈیڑھ دہائی بھی شیخ صاحب جیسے محسن کی صحبت میں بنا دشواریوں کے ادب کی خدمت میں گزار دیتا۔

1970ء کی دہائی کے بعد اردو ادب کے میدان میں کئی قلمکار ابھرے ہیں۔ جن میں مرحوم کاچو سکندر خان سکندر نے تواریخ ''نور بوز انگپو کی اِت توق لہا مو''، ''قدیم لداخ''، اور افکارِ پریشان تخلیق کر کے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ بابو عبدالقیوم ''داستانِ لداخ''، صادق ہرداسی ''بلتی مہاجرین کی مختصر تاریخ تقسیم ہند کے تناظر میں'' اور رقیہ بانو ''لداخ میں اردو زبان و ادب'' جیسی تصنیفات قلمبند کر کے مصنفین کی صف میں شامل ہوئے۔ کاچو اسفندیار خان نے شاعری اور انشائیہ نگاری کے ذریعے مصنف ہونے کا شرف پایا۔ عبدالحمید تنویر کا شعری مجموعہ چھپا۔ خاکسار بھی صاحب کتاب ہوگیا۔ مختصر یہ کہ اب لداخ میں اردو ادب کی دنیا کنگال نہیں مالا مال ہونے لگی ہے۔ بیشتر نئے شاعر اور نثر نگار طبع آزمائی کرنے لگے ہیں جو سراہنے کے قابل ہے۔

ان سب کے باوجود عبدالغنی شیخ، ادب کے ہر میدان میں قدم جما کر اپنا ایک منفرد مقام بنا چکے ہیں۔ ایسے میں ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے قلمکاروں کے پس منظر میں چلے جانے کے بعد گوشے اور مضامین لکھوانے کی روایت کو توڑتے ہوئے جیتے جی منتخب کر کے ان کے قابلِ رشک ادبی کارنامے پر ادبی دستاویز تیار کرنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ لایق صد تحسین ہے۔ یہ قدم کسی بھی منتخب قلمکار کے لئے کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں۔ میں عبدالغنی شیخ کے انتخاب پر سارے لداخی ادیبوں کی جانب سے موصوف کو مبارکباد دیتا ہوں اور کلچرل اکیڈیمی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

......●●●......

☆......گلشن آرا

عبدالغنی شیخ: ایک شخص۔ایک انجمن

عبدالغنی شیخ، اُن ادیبوں میں شامل ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان وادب اور علم وفن کی آبیاری میں گزاری ہے۔ انکی زندگی ریاضت، عبادت، صحافت اور ادب سے موسوم ہے۔ ان کا ایک ایک قیمتی لمحہ زندگی کو حسین سے حسین تر اور خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو سے عبارت ہے۔ لکھنا، پڑھنا شیخ صاحب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ آدھی صدی سے زیادہ مدّت کا علمی وادبی سفر انہوں نے لدّاخ میں اُردو زبان وادب کی شمع کو نہ صرف روشن رکھا بلکہ کئی اور بھی چراغ جلائے۔ یہ (لدّاخ) وہ مقام ہے جہاں ہر کسی کے لئے جانا اور پہنچنا بھی دشوار وصبر آزما مرحلہ ہے۔ وہاں رہ کر برسوں تصنیف وتالیف تعلیم وترجمہ کے میدان میں تاریخ ساز علمی وادبی کارنامہ انجام دینے والے عبدالغنی شیخ اپنی ذات اور علمی کائنات میں ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک یونیورسیٹی کا مقام ومرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی اب تک سترہ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ جن میں افسانے، ناول، تنقید وتحقیق، خاکے، تاریخ وثقافت اور ترجمہ وعلمی وادبی مضامین کا ایک اعلیٰ و ارفع خزانہ پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی تخلیقات اُردو کے مشہور ومعتبر رسالوں ''شاعر''، ''آج کل''، ''ایوانِ اردو''، ''شیرازہ'' جدید فکر وفن تعمیر وغیرہ میں کثرت سے شائع ہوتے رہے ہیں اور آج بھی پوری تازگی، توانائی اور جوش وجنون کے ساتھ علمی وادبی کاموں میں مصروف ومنہمک ہیں۔ عبدالغنی شیخ جیسے لوگوں پر ہم جتنا فخر وناز کریں کم ہے۔ انہوں نے علم وادب کے میدان میں جتنے کارنامے انجام دئے ہیں اسکے لئے ایک دفتر اور شعبہ درکار ہے۔

عبدالغنی شیخ جیسے ادیب اپنی پرانی تہذیب اور دیرینہ روایت کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس دور کشاکش میں کم اہم اور بڑی بات نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے جینے کا ایک مقصد اور مشن ہوتا ہے۔ زندگی کو ضائع و رائیگاں نہیں کرتے۔ ایک ایک پل زندگی اور زمانے کے نام کرتے ہیں۔ علم و ادب کو اپنے لہو سے سینچتے اور سنوارتے اور نکھارتے ہیں۔ معاشرے کو علم و آگہی کی روشنی اور بصیرت سے روشناس کرانا ان کا شیوہ اور سماجی فریضہ ہوتا ہے۔ شیخ صاحب کی تحریروں سے طالب علم کے زمانے ہی سے سیراب اور فیضاب ہوتی رہی ہوں۔ ان کی تحریروں سے کچھ نہ کچھ سیکھنے اور کچھ نیا کرنے کا ذوق و شوق بڑھتا اور پھیلتا ہے۔ ایسے ادیبوں اور فنکاروں سے ایک دنیا استفادہ کرتی رہی ہے۔ آج جبکہ ان پر کچھ لکھنے کا موقع ملا ہے تو تحریروں کی خوشبوؤں کا ایک امڈتا ہوا سیلاب میری نگاہوں کے سامنے ہے، انہوں نے اتنا علمی و ادبی کام کیا ہے کہ دفتر درکار ہے۔ ان کی متعدد مختلف اصناف سے متعلق ان کی کتابیں آنے والی نسلوں کے لئے ایک مشعلِ راہ ہیں، ان کے افسانے، ناول، تحقیق و تنقید، خاکے، مضامین، تاریخ و ترجمے وغیرہ علمی و ادبی مضامین اور انگریزی و اُردو میں ان کے لکھے ہوئے کالم اعلیٰ ادبی صحافت کے خوبصورت و دلکش نمونے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے علاوہ عبدالغنی شیخ نے لدّاخ کی علمی، ادبی، تاریخی و ثقافتی اہمیت و عظمت کے حوالے سے جو کام انگریزی اور اردو میں کیئے وہ ایک خاص مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ ان کے ناول ''دل ہی تو ہے'' کو ۱۹۸۰ء اور انگریزی زبان میں ان کی شاہکار کتاب Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia کو ۲۰۱۰ء میں حکومت جموں و کشمیر نے بچوں کے عالمی صد سالہ سال پر انعام دئے۔ شیخ کو ریاستی کلچرل اکادمی نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی حیات اور فلسفہ کے مضمون پر کتابوں کے انعامی مقابلے میں اوّل انعام دیا۔

عبدالغنی شیخ کی مشہور و معروف کتاب ''قلم، قلم کار اور کتاب'' کو مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کے شعبۂ پبلی کیشنز ڈویژن اور ''لدّاخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' کو نیشنل بک ٹرسٹ، حکومت ہند نے شائع کیا۔ اور ''لدّاخ: تہذیب و ثقافت'' کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مالی تعاون فراہم کیا۔

اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد سجّاد نے اپنا گرانقدر تحقیقی مقالہ ''لدّاخ

میں اُردو زبان وادب اور عبدالغنی شیخ'' پر پی ایچ۔ ڈی۔ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور ایک ریسرچ اسکالر شیخ اقبال احمد ''عبدالغنی شیخ: حیات اور ادبی خدمات'' کے موضوع پر ایم فل کرنے میں مصروف ہیں۔

لدّاخ ان کا محبوب موضوع اور مرکز ومحور رہا ہے۔ اگر کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ عبدالغنی شیخ نے زندگی لدّاخ کے ارد گرد مرکوز کر دی ہے، جس نے انہیں عالمی شہرت یافتہ ادیب ودانشور کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ لدّاخ کی تاریخی، جغرافیائی، علمی وادبی اور ثقافتی عظمت اور اہمیت کو ساری دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا عبدالغنی شیخ کے سر جاتا ہے۔ کشمیر اور لدّاخ کے حوالے سے ان کے کارنامے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لدّاخ کی تاریخ پر اس سے قبل اتنا بڑا علمی کارنامہ اب تک سامنے نہیں آیا۔ انہوں نے کلچرل اکادمی کے رسالہ ''شیرازہ'' کے حالیہ خصوصی شماروں میں لدّاخ کی مکمل تاریخ اور جغرافیہ کے اہم گوشوں کو منظرِ عام پر لا کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہند، چین کے معاملات ومسائل اک تاریخی و جغرافیائی پس منظر' جنرل زور آور سنگھ کا حملہ لداخ، نئی تحقیق کی روشنی میں' ۱۹۴۸ء میں گلگت اسکاؤٹس کی بغاوت اور بلتستان اور لدّاخ پر حملے، ہندوستان اور تبت میں حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے سلسلے میں ہمیں گنبہ میں صحیفہ کی موجودگی کا تذکرہ، لدّاخ کی سیاست اور تجارت میں پشمینہ کا کردار وکارنامہ اور سیاچن میدانِ جنگ میں کیسے تبدیل ہوا؟ جیسے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

عبدالغنی شیخ کئی انجمنوں اور اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ کئی نو آموز مصنفین کی رہبری و رہنمائی بھی کر رہے ہیں۔ وادی اور اس کے گرد ونواح میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور ترقی وفروغ کے لئے مصروفِ عمل ہیں اور پرورشِ لوح وقلم میں منہمک ومصروف ہیں۔ انسانی اقدار، محبت، اخوت انسان دوستی اور امن آشتی کے جذبات واحساسات سے ان کا دل ودماغ لبریز ہے۔ بقول علی باقر:

> ''عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ تمام کردار زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے، صحت منداور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند مرتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ حقیقت نگاری کے قائل اور اپنے کرداروں کے احساسات، نفسیات اور ماحول سے خوب

واقف ہیں۔

عبدالغنی شیخ کو انسان کے خوش گوار مستقبل پر یقین ہے۔ مایوسی، تلخی اور جارحانہ ذہنیت کی دلخراش جھلکیاں ان کی تحریروں میں نہیں ہیں۔ وہ بدنظمی، بے ضابطگی اور خلفشار سے گریز کرتے ہیں اور جہالت، گمراہی اور رسمی باتوں کے خلاف ہیں۔ اردو اور انگریزی کے کئی عالمی شہرت یافتہ ادیب و دانشوروں نے عبدالغنی شیخ کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے، جن میں پروفیسر شکیل الرحمٰن، ڈاکٹر روینہ اگروال، جتندر بلو، رؤف خیر، ڈاکٹر سینو گتا کوشل وغیرہ جیسے معروف و مشہور لوگ شامل ہیں۔

ایک مستند مورّخ، معتبر محقق، محبوب افسانہ نگار، مشہور خاکہ نگار ہونے کے علاوہ متعدد موضوعات پر ان کے علمی مضامین کی دلکشی دیر اور دور تک سنی و دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت عبدالغنی شیخ کی شخصیت مسلم ہے۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان میں ایک مجموعہ ''دو ملک، ایک کہانی'' کی ادبیت، جاذبیت، معنویت اور تہہ داری نے کئی معتبر ناقدوں کو ان کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں کل ۴۵ پینتالیس کہانیاں شامل ہیں، جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اس افسانوی مجموعہ میں کچھ مزاحیہ کہانیاں جیسے ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا'' ایک انار سو بیمار، اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد وغیرہ خاص قابلِ توجہ ہیں۔ کشمیر کی سرسبز و شاداب، دلکش و حسین وادیوں کے اردگرد ان مزاحیہ و طنزیہ کہانیوں کی خوشبو ہم آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ان مضامین میں طنزیہ و مزاحیہ انداز و اسلوب کے ساتھ ساتھ انشائیہ کا رنگ و روپ بھی موجود و موجزن ہے۔

ان کے افسانوں کی تازگی، تنوع اور زندگی اور زمانے کی رنگ و رامش پڑھنے کو ایک خاص دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ ان کہانیوں کی رنگارنگی اور شگفتگی و شائستگی، انسانی نفسیات کا کرب و کیف، زندگی کی حقیقت پسندی اور ہمارے معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات و مسائل، حادثات و سانحات تمام پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ افسانہ ''غیر یقینیت'' ایک عام مزدور کی زندگی، بے بسی و بے کسی، اس کے درد و داغ کو نہایت ہی فنکارانہ دانشورانہ انداز میں انہوں نے پیش کی ہے تو ''سوئمنگ پول'' میں انسانی قدروں کی نفسانفسی ''دھوپ چھاؤں'' کہانی میں زندگی سے پنپنے والی اونچ نیچ کی

ذلت آمیز روایت کو مسافر میں انسانی زندگی کی بے ثباتی کی بھرپور عکاسی و نمائندگی کی گئی ہے۔ افسانہ ''مجرب نسخہ'' میں افسانہ نگار نے ہمارے معاشرے کو کرپشن نے کس قدر مفلوج اور ناکارہ بنادیا ہے اور اس کرپٹ سماج کی جڑیں کتنی گہری اور مضبوط بن چکی ہیں کو اجاگر کیا ہے۔ ''مظلوم'' میں عورت بھی اس سماج کی فرد ہے اور مرد بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ 'یادیں'، 'مسکراہٹ'، 'ایک دل ہی تو ہے'، 'ایک فوٹو'، 'رازِ دل'، 'پہلا خط'، 'انسانی زندگی کے نشیب و فراز' ان کے دکھ درد، ڈوبتی ابھرتی زندگی کا عکس اور انسانی جذبات و احساسات اور نفسیات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ کی کئی کہانیوں کا انگریزی اور ھندی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ''پہلا خط'' اور ''ہوا'' کا جرمنی زبان اور چینی کو، تیلگو اور کشمیری زبانوں میں مرتب کہانیوں کے خصوصی شماروں میں اہمیت و عظمت بخشی گئی۔

عبدالغنی شیخ کی کہانی ''دادی اماں'' کا انگریزی ترجمہ جموں و کشمیر اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن میں شامل نصاب ہے۔ انہیں سیمیناروں کا سفرنسوں اور علمی و ادبی پروگراموں بھی مدعو کیا گیا۔ ان کی ایک مشہور و معروف کہانی ''ہوا'' کا ڈاکٹر روینا اگروال نے نہ صرف انگریزی میں ترجمہ کیا بلکہ ڈنمارک کے ایک عالمی سیمینار میں یہ کہانی بھی پڑھی جس کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

''دو ملک ایک کہانی'' نہ صرف عبدالغنی شیخ اور اردو زبان کا ایک شاہکار افسانوی مجموعہ ہے بلکہ دنیائے افسانوی ادب میں اس کا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے جس نے انہیں ایک عالمی افسانہ نگار کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت دی۔ موضوع وہی ہجرت کے مسائل و معاملات ہیں، مگر جس طرح عبد الغنی شیخ نے اپنے اس افسانہ میں زندگی اور زمانے کے پُر پیچ نشیب و فراز، ان کے غم و آنسو، کرب و اضطراب، خوشی و انبساط اور ابھرتے ڈوبتے انسانی اقدار کی پامالی کی عکاسی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی کہانی میں زبان و بیان، اسلوب و طرز نگارش، منظر نگاری اور کردار نگاری اپنی پوری شان و شوکت، آب و تاب کے ساتھ تمام مرحلوں و منزلوں میں موجود و موجزن ہے۔

...... ●●● ......

☆......رالین کور*

انگریزی سے ترجمہ: سلیم ساغر

ثقافتی خزینہ کا محافظ: عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ نے لیہہ میں ایک میوزیم کے قیام کا تصور پیش کیا، جو لداخ کے بین الملکی ورثہ کو اُجاگر کرتا ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ لداخ ایک دورافتادہ خطہ ہے جو باقی دنیا سے چھ ماہ کے لئے منقطع رہتا ہے اور جہاں کا معاشرہ قبائیلی ہے۔ جسے سیاحوں نے رومانیت بخشی ہے۔ بقول عبدالغنی شیخ، جو لیہہ میں مقیم ایک سرکردہ مورخ اور لیکھک ہیں:

> ''زیادہ مدت نہیں ہوئی ہے، جب لداخ ثقافتی لین دین کا ایک مرکز تھا۔ لداخ میں تعینات ایک برطانوی جوائنٹ کمشنر آر۔ ایل۔ کینون نے انیسویں صدی کے اختتام پر کہا تھا، 'سوئیز نہر کے لئے پورٹ سعید جتنا اہم ہے، وسط ایشیا کے تجارتی راستے کے لئے لیہہ اتنا ہی اہم ہے۔''

ثقافتی تبادلہ کے لئے گرانقدر ورثہ کو نمایاں طور دکھانے کے لئے شیخ نے سنٹرل ایشیا میوزیم کا تصور دیا۔ میوزیم کو اگست 2013ء میں عوام کے لئے جزوی طور کھولا گیا۔ (2016ء سے میوزیم پورے طور کھولا گیا ہے۔)

عبدالغنی شیخ کہتے ہیں:

''یہ زیادہ دور کی بات نہیں ہے، جب ساری دنیا لداخ کے لئے کھلی تھی۔
ہم تجارتی راستوں کے ذریعے وسط ایشیا کے شہر یارقند سے جڑے تھے۔ مشرق
کی طرف تبت سے رابطہ تھا۔ اسی طرح بلتستان سے میل ملاپ تھا، جو لداخ کا
حصہ تھا۔ اب بلتستان پاکستان کے زیر حکومت ہے۔''

شیخ جواردو کے ایک معروف ادیب بھی ہیں، کہتے ہیں:

''لیہہ کا تجارتی راستہ شاہراہِ ابریشم (Silk Route) سے ملا ہوا تھا۔''

لداخ کی مصوری، خوراک، پوشاک اور زبان پر جزوی طور وسط ایشیا کا اثر ہے۔ لداخ کی موجودہ سب سے مقبول غذا 'موموٗ' کا لفظ یارقند کی دین ہے۔ (لداخی شین جیانگ یا چینی ترکستان کو یارقند کہتے ہیں۔ یارقند چینی ترکستان کا ایک شہر ہے۔) 1947ء میں ہمسایہ قوموں کے مابین سرحدی حد بندی ہوئی جس کی وجہ سے لداخ جغرافیائی اور ثقافتی طور الگ تھلگ رہ گیا۔ تجارتی قافلے پنجاب، یارقند، افغانستان، روس حتیٰ کہ سائبریا سے آتے تھے اور لیہہ کے بازار میں اپنا مال فروخت کرتے تھے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے شیخ نے کہا:

''انیسویں صدی میں انگریز لیہہ بازار کو خبروں کا مرکز (Listening post) مانتے تھے۔ لیہہ بازار میں گھوڑ دوڑ، پولو اور فٹ بال میچ ہوتے تھے اور لوسر (لداخی سال نو) پر تبت اور ہماچل پردیش سے آئی ہوئی منڈلیاں تمدنی پروگرام دکھاتی تھیں۔ برطانوی ہند کو روس پر یہ شک تھا کہ وہ لداخ پر قابض ہوگا۔ اس لئے تجارتی امور کی دیکھ ریکھ کرنے کی آڑ میں ایک جوائنٹ کمشنر تعینات کیا۔ اس کا اہم فریضہ جاسوسوں پر نظر رکھنا تھا۔ لیہہ بازار میں آج بھی چند دکانیں ان پنجابی تاجروں کی اولاد کی ملکیت ہیں جو ان دونوں لداخ میں بس گئے تھے۔''

سنٹرل ایشین میوزیم لیہہ قصبہ کے مرکز میں ہے۔ اسے ژھاسومانام کی جگہ پر تعمیر کیا گیا ہے، جہاں کبھی کارواں اپنا کیمپ لگاتے تھے۔ اس جگہ سولہویں صدی میں لداخی راجا سینگے نمگیل نے لیہہ کی پہلی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دی۔

عبدالغنی شیخ نے کہا کہ لداخ اور بلتستان ایک خاندان کے افراد کی طرح ہیں، جن کو حوادثِ زمانہ نے ایک دوسرے سے جدا کیا ہے۔ اب لداخ آنے جانے کے لئے سرینگر اور منالی کے راستے کھلے ہیں۔ ماضی میں بلتستان اور گلگت کے راستے مسافر راولپنڈی جاتے تھے۔ ایک اور راستہ لہاسہ جاتا تھا جہاں سے سکم اور کلکتہ جاتے تھے۔ یہ راستہ 1959ء میں دلائی لاما کی ہندوستان آمد تک آمدورفت کے لئے کھلا تھا۔

شیخ نے وسطِ ایشیا اور لداخ سے متعلق اپنی ذاتی کتابیں میوزیم کی لائبریری کو نذر کی ہیں، وہ کہتے ہیں:

> ''سرحدیں بند ہو جانے سے سب سے زیادہ اثر سطح مرتفع چانگ تھنگ پر پڑا ہے، جو سطح سمندر سے پانچ کلومیٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ تبت کا راستہ چانگ تھنگ سے پڑتا ہے۔ خانہ بدوش چنگپا عمومی طور چراگاہوں میں مویشی پالتے ہیں۔ ماضی میں یہ برتنوں، مصالحوں وغیرہ کا اپنی پیداوار پشمینہ، اون، مکھن اور نمک سے تبالہ کرتے تھے۔ چین کے زیر قبضہ مغربی تبت کی گرمائی راج دھانی گرتوق اور سرمائی راج دھانی رُودوق میں تجارتی میلے لگتے تھے۔ لداخ کے سرحدی گاؤں ٹانگچے میں جہاں تاجر تبت روانگی سے پہلے آرام کرتے تھے، چند بڑی چٹانوں پر آج بھی دس زبانوں کی لپیوں میں تراشی گئی تحریریں نظر آتی ہیں۔''

شیخ نے کہا: ''تجارت کے علاوہ لداخ سے لوگ حصولِ علم (مذہبی تعلیم) کے لئے تبت جاتے تھے۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق 727 بعد مسیح تک تبت میں بودھ دھرم نہیں پہنچا تھا۔ اُس سال ایک چینی یاتری ہوئی چاؤلیہہ کے راستے وسط ایشیا روانہ ہوا تھا۔ اس نے لکھا ہے لداخ میں لوگ بودھ مت کے پیروکار تھے۔ جبکہ تبت میں بودھ دھرم نہیں پہنچا تھا۔ مہاراجہ اشوک نے پہلے پہل اپنے پرچارکوں کی وساطت سے لداخ میں ہین یان بدھ مت کا پیغام پہنچایا۔ مغربی تبت کے حکمران ایشے اود نے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کشمیر شاگرد بھیجے۔ الچی وہار جیسے پرانے وہاروں میں کشمیر کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ تاہم جب کشمیر میں اسلام آیا، تو لداخی بودھ بدھ مت کی تعلیم کے لئے تبت کی طرف رجوع ہوئے اور مذہبی تعلیم کے خصول کے لئے بھکشو لہاسہ بھیجنے لگے اور تیرہویں صدی کے بعد لداخ میں تبت سے

مہایان اور دجرانا بدھ دھرم آئے اور تا حال ان کی اشاعت جاری ہے۔

لداخ میں اسلام تاجروں نے لایا۔ بودھوں اور مسلمانوں میں تعلقات ہمیشہ دوستانہ رہے۔ البتہ بیسویں صدی کے اختتام پر ان میں رخنہ پڑا۔ ماضی میں بین الامذہبی شادی عام تھی۔ سترہویں صدی میں لداخی راجا جمیا نگ نمگیل کی شادی بلتی شاہزادی گیال خاتون سے ہوئی جو تادمِ حیات مسلمان رہی۔ ماضی میں عید اور لوسر پر دونوں فرقوں کے درمیان میل ملاپ کا منظر زیادہ نظر آتا تھا۔" شیخ بولے، جو ایک آرغون ہیں۔ آرغون مسلمانوں کا ایک طبقہ ہے، جس کے آبا واجداد نے مقامی عورتوں سے شادی کر کے خطے میں مستقل طور رہائش اختیار کی۔ عبدالغنی شیخ نے کہا:

"دوسری قوموں سے تجارتی تعلقات کے باوجود لداخیت مستحکم رہی ہے۔ لداخی ہمیشہ امن پسند رہے ہیں اور اپنی تہذیبی قدروں کے پابند ہیں جبکہ عمومی طور منگول نسل کے لوگ جنگجو ہوتے ہیں۔

تجارتی رابطے لداخی ثقافت کے رابطوں کو ہلا جُلا نہیں سکے ہیں۔ لیکن مغربی تعلیم اور سیاحت لداخی ثقافت پر اثر انداز ہوئی ہے۔ صدیوں تک ایسا تغیر اور تبدل دیکھنے میں نہیں آیا ہے۔ ریکارڈ بتاتا ہے 1947ء سے پہلے ایک سال صرف چار سیاح لداخ آئے تھے۔ اس سال (2014ء) لداخ کی آبادی سے زیادہ سیاح یہاں وارد ہوئے ہیں۔"

شیخ نے کہا:

"میں پُر امید ہوں کہ تبدیلی میں ایک میانہ اور مناسب معیار قائم رہے گا۔ ماضی میں ہم توہمات کے شکار تھے مثلاً بچہ جننے کے بعد زچہ (ماں) ایک ماہ گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ ہمیں توہم پرستی سے بالاتر زندگی بسر کرنی ہوگی۔"

......●●●......

---

* رالین کورنیشنل فاؤنڈیشن آف انڈیا سے وابستہ میڈیا فیلو ہیں اور لداخ میں کام کرتی ہیں اور انہوں نے یہ سنڈے فیچر اخبار 'ہندو'، 2014ء میں شائع کیا ہے۔

☆......پروفیسر قدوس جاوید

عبدالغنی شیخ: لداخ کا پرامیتھوس

عبدالغنی شیخ؛ لیہہ لداخ کے 'پرامیتھوس' ہیں۔

یونانی اساطیر کے مطابق انسان دوست دیوتا، پرامیتھوس نے عالمِ انسانیت کی فلاح کے لئے 'دیوتاؤں کے پاس سے ''گیان'' کی آگ چُرالی تھی۔ اس آگ کو 'گیتا' میں 'گیان کی اگنی' اور اسلا ئد میں 'نور' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آگ چُرانے کی پاداش میں، سزا کے طور پر پرامیتھوس کو چٹان سے باندھ دیا گیا تھا اور 'گدھ' اس کے جسم کو نوچتے رہتے تھے۔ عبدالغنی شیخ بھی ایک پرامیتھوس ہے جس نے دنیا سے کٹے پچھڑے لیہہ لداخ کی برفیلی چوٹیوں کے بیچ علم وادب کی آگ روشن کی اور بے آب وگیاہ دھرتی پر تخلیقیت اور دانشوری کا 'نور' پھیلایا۔ سیاسی شعبدہ بازیوں کے سبب ملک کی تقسیم کے ساتھ ساتھ رشتوں اور قربتوں کے درمیان پیدا ہونے والی دوریوں نے لیہہ لداخ میں جو حوصلہ شکن حالات پیدا کئے، ان روح فرسا حالات کے گدھ، عبدالغنی شیخ کے حساس وجود کو نوچتے رہے ہیں اور عبدالغنی شیخ اپنے سارے دُکھ، تمام درد کو لیہہ لداخ ہی نہیں پورے برِصغیر کے تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی تناظرات کے ساتھ اپنی مختلف النوع تحریروں میں بیان کرتے رہے ہیں۔ ''کم وبیش ۴۵ کہانیوں کا مجموعہ دو ملک ایک کہانی'' ان ساری محرومیوں اور نارسائیوں کا تازہ ترین بیانیہ ہے۔ ان کہانیوں میں تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں عوامی سطح پر 'عدم اطمینان' کی ایک ہی کہانی جس طرح الگ الگ عنوان اور الگ الگ پہلوؤں سے پیش کی گئی ہے اس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ عبدالغنی شیخ ان ادیبوں میں سے ایک ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ دنیا کی تمام تر سچائیوں میں، نفسیاتی، ثقافتی اور جمالیاتی در و بست کے حوالے سے ادب سب سے بڑی سچائی ہے اور عصری حالات و مسائل کے لحاظ سے سچا ادیب بھی وہی ہے جن کا ادب ایک ''وژن'' کے ساتھ سیاست اور معاشرت کے پیچھے نہیں آگے چلتا ہے انھیں مشعل دکھاتا ہوا۔ تاکہ ماحول اور معاشرہ منفی اور غیر تعمیری سوچ اور فکر کے حصار سے باہر نکل سکے۔ مغربی ادیبوں اور دانشوروں میں ایف. آر لیوس، جانسن، کالرج اور میتھیو آرنلڈ سے لے کر چامسکی، اِحب حسن اور ایڈورڈ سعید وغیرہ نے اردو میں پریم چند، احتشام حسین، وزیر آغا، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال اور پروین کمار اشک وغیرہ کے علاوہ ہندی میں بھی آچاریہ رام پرشاد شُکل، نامور سنگھ وغیرہ بھی، عوامی زندگی کو سیاسی، سماجی اور ثقافتی بحران سے نکالنے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ آج کی تاریخ میں یہ فریضہ عبدالغنی شیخ انجام دے رہے ہیں۔

اس زاوئے سے عبدالغنی شیخ کا ایک انفراد و امتیاز یہ بھی سامنے آتا ہے کہ انہوں نے تاریخ، تنقید، فکشن اور مضامین کی صورت میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ دراصل انتشار، بحران، بیماری اور بے روزگاری سے دوچار ماحول اور معاشرہ میں، طرز فکر اور اسلوب حیات کے لئے ایک رجائی، تعمیری اور مثبت ڈسکورس قائم کرنے کی کوشش بھی ہے،

> ''نئے ریسرچ کی روشنی میں یہ بات دریافت ہوئی ہے کہ 'کینسر' کا جو مریض یاسیت کا شکار ہوتا ہے، وہ جلدی مر جاتا ہے۔ جو تفکرات کو بھول جائے اور زندگی سے مایوس نہ ہو، وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ امنگیں جوان رکھیں اور ہمت سے کام لیں۔ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔''

(افسانہ: زندگی۔ مشمولہ دو ملک ایک کہانی۔ ص۔ ۱۴)

> ''ان کا اکلوتا بچہ لگ بھگ ایک سال پہلے اچانک غائب ہوا تھا۔ سارا قصبہ چھان مارا، پولس کو رپورٹ دی لیکن بچے کا کوئی اتہ پتہ نہیں چلا .... اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شوکت میاں نے کانپتے ہاتھ سے فون اُٹھایا اور لرزتی آواز میں ہیلو کہا، ایک اجنبی آواز کہہ رہی تھی کہ اخبار

''جہاں نما'' کے دفتر میں ان کا بچہ صحیح سلامت موجود ہے۔''

(افسانہ۔ آزمائش)

یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی ادیب خواہ جتنی بھی کوشش کیوں نہ کرلے وہ اپنے اس ماحول اور ثقافت سے ماورا ہوکر ادب تخلیق نہیں کرسکتا جس ماحول اور ثقافت میں وہ ادیب پروان چڑھا ہے۔ چنانچہ عبدالغنی شیخ کے افسانوی مجموعے ''دوملک ایک کہانی میں بھی ایسے کئی افسانے ہیں جن میں شعوری یالاشعوری طور پر لیہہ لداخ کی سماجی اور ثقافتی روایات واقدار کی ترجمانی ملتی ہے،

''کل یہاں رُک جائیے''.. ماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ دوبارہ ہمارے گاؤں میں پھر کب آئیں گے؟

''پہاڑ اور پہاڑ مل نہیں سکتے، لیکن انسان اور انسان تو مل سکتے ہیں۔''

....کبھی ہمارے گاؤں آئے تو ضرور ہمارے پاس آنا''

اس کی نظر غیر ارادی طور پر نقرئی گلیشئر پر پڑی جو گویا سچ مُچ اعتراف کررہا ہو کہ میں نے بستیوں کو الگ کیا ہے،

لیکن انسان کے دلوں کو میں تقسیم نہیں کرسکا ہوں۔''

سبھوں سے رُخصت لے کر جب وہ پُل کے ناکے پر پہنچا تو اس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا

سُرخ لباس میں ملبوس لڑکی (آنگموں) دروازے پر کھڑی تھی........

گھر پہنچ کر صنم نے آنگموں کے گھر شادی کا پیام دیا اور آنگموں کا ہاتھ مانگنے کے لئے، رسم کے مطابق 'جو' کی شراب کے دو مٹکے بھی بھیجے۔''

(افسانہ۔ ایک رات)

''تمام لداخی استادوں نے لمبے چوغے پہنے تھے۔ صنم گیالچن، چھوانگ نمگیل اور ٹشی پلجور نے کنٹوپ پہنے تھے اکبر علی، عبدالغنی آخون اور نورالدین کے سروں پر مراکشی سُرخ ٹوپی تھی جس پر سیاہ جھالروں کا پھندنا جھولتا تھا۔ یہ رومی ٹوپی کے نام سے جانی جاتی تھی۔''

(افسانہ: ایک فوٹو)

''انگریز افسر کپتان کمپارٹنر نے....ایک سفر نامہ MAGIC LADAKH کے نام سے لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''لداخی عورتیں 'تکلی' پر اون کاتتی اور مرد رسی باٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ بہت سارے لوگ چقماق سے آگ بناتے ہیں، لداخی ہمیشہ اپنے ساتھ چائے پینے کے لئے پیالی رکھتے ہیں۔ عورتیں کمر بند سے چمچی، سوئی دان، چابیوں کا گچھا اور ایک چمٹی باندھتیں اور مرد قلم دان، چقماق، بنسری، چاقو، گوپھن اور رسی کی گانٹھ کھولنے کے لئے ایک جنگلی بکرے 'مرگ' کا چھوٹا سا سینگ باندھتے۔ تماشے میں جب لداخی عورتوں کو آئینہ، ماچس وغیرہ دکھائے جاتے تو وہ حیران ہو جاتی تھیں۔''

(افسانہ: ایک فوٹو)

مذکورہ بالا اقتباسات میں لیہہ لداخ کے ماحول کی عکاسی ہے لیکن بعض افسانے ایسے ہیں جو پورے طور پر ''تاریخ مرکز'' افسانے ہیں۔ ایسے افسانوں میں لیہ لداخ کی تاریخ کے گمشدہ اوراق کی بازیافت کی فنکارانہ کوشش ملتی ہے وہ بھی اس مہارت کے ساتھ کہ کہیں بھی کہانی کا کہانی پن مجروح نہیں ہوتا مثلاً افسانہ ''ایک فوٹو'' میں جستہ جستہ لیہ لداخ کی کہانی ایک پرانے 'گروپ فوٹو' کی بنیاد پر بنی گئی ہے۔ اس فوٹو کی ایک تاریخی حیثیت ہے اور کہانی اس گروپ فوٹو کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور اس فوٹو پر ہی اس کا اختتام ہوتا ہے:

''یہ فوٹو، ڈوگرہ حکمراں مہاراجہ ہری سنگھ کے جنم دن پر کھینچا گیا تھا اور اس میں لیہہ گورنمنٹ مڈل اسکول کے اساتذہ، عملہ کے ارکان اور طلبا تھے۔ ......سلام بٹ نے جو اسکول کا چپراسی تھا، اپنے بیٹے کو فوٹو حوالے کرتے ہوئے کہا،

''جمال یہ فوٹو سنبھال کر رکھو۔ ہیڈ ماسٹر نے ایک کاپی مجھے دی ہے اس میں تمہاری بھی تصویر ہے۔''

’اس فوٹو میں ایک بھی لڑکی نہیں ہے؟

ہاں، ان دنوں کوئی اپنی لڑکی کو تعلیم نہیں دیتا تھا۔ لڑکے بھی باقاعدگی سے اسکول نہیں آتے تھے... آج بھی تو اِکادُکا لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں۔‘‘

ریاست جموں و کشمیر کے تینوں صوبوں، جموں، کشمیر اور لیہہ لداخ میں، جموں تقریباً میدانی علاقہ ہے کشمیر پہاڑوں، جھیلوں، دریاؤں اور سبزہ زاروں سے گھری ایک حسین ترین وادی ہے۔ لیکن لیہہ اور کارگل اس ریاست کا سب سے بلند حصہ ہے گلیشیئر اور برفیلی پہاڑیوں سے گھرا لیہہ لداخ کا یہ علاقہ برف باری اور درجہ حرارت، نقطہ انجماد سے بیس سے چالیس ڈگری تک کم ہو جانے کے سبب کم و بیش چھ ماہ تک دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے لیہہ لداخ کارگل، بلتستان اور اسکردو، وغیرہ ایک تھے۔ اور پسماندہ تھے اس لئے اس بلند و بالا برف زدہ علاقے میں سماجی، تعلیمی اور سیاسی بیداری بھی بِرصغیر کے دوسرے علاقوں کے برعکس دیر سے آئی۔ عبدالغنی شیخ نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے،

’’.....۱۹۲۹ء میں لاہور میں دریائے راوی کے کنارے کانگریس نے ایک قرارداد کے ذریعے، ’’مکمل آزادی کا اعلان کیا تھا، جس کے ایک سال بعد ’سِول نافرمانی‘ کی تحریک چلی تھی۔ تب کشمیر میں بھی آزادی کی ایک لہر سی دوڑی۔ ان دنوں لداخ کے لوگ لمبی نیند کے بعد جاگ رہے تھے۔‘‘

تین سال بعد ۱۹۳۳ء میں لداخ میں تعلیمی جاگرتی لانے کے لئے ’’لداخ بدھسٹ ایجوکیشنل سوسائٹی‘‘ کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی اس روز ہندی کے لیکھک راہل سنکرواتسیائن بھی لیہہ میں تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کو ایک خط میں سوسائٹی کے قیام سے آگاہ کیا۔

(افسانہ۔ ایک فوٹو)

’’ہندوستان آزاد ہونے سے ایک روز پہلے ایک امریکی نِکل اِسمتھ اور اس کا ایک ساتھی لیہہ پہنچا... دراس سے آگے انہوں نے دیکھا کہ ایک بیمار لڑکے کو چار آدمی ایک چارپائی پر ایک

ٹھردرے کمبل میں لپیٹے علاج کے لئے سرینگر لے جارہے تھے۔ یہ لوگ کئی روز سے سفر کررہے تھے۔ انہوں نے امریکیوں سے دوائی مانگی۔ ان دنوں زندگی بڑی سخت تھی علاج معالجہ اور حفظانِ صحت کی سہولیات برائے نام تھیں۔"

(افسانہ: ایک فوٹو)

اگر دیکھا جائے تو "ایک فوٹو" عبدالغنی شیخ کے افسانوی مجموعہ "دو ملک ایک کہانی" کا ہی نہیں اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبدالغنی کے اس افسانے کی بُنت میں لیہہ لداخ کی کٹی پھٹی، قابل رحم اور عبرت ناک زندگی کے سماجی، سیاسی اور ثقافتی انسلاکات کو کہیں ماضی قریب کی تاریخ تو کہیں زمانۂ حال کے آئینے میں رکھ کر تمام ترفنی و جمالیاتی مہارت کے ساتھ دیکھنے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ "ایک فوٹو" میں کوئی ایک مرکزی کردار نہیں اور نہ کوئی ایک ٹھوس واقعہ ہے بلکہ پانچ پشتوں کے بعد اتفاقاً سامنے آنے والا 'ایک پوسٹ کارڈ سائز کا بلیک اینڈ وائٹ گروپ فوٹو' ہی اس افسانے کا مرکزی کردار اور روشن استعارہ ہے جو گروپ میں شامل ۱۹ افراد میں سے چند ایک کے حوالے سے لیہہ لداخ کی تاریخ اور تہذیب کے اوراق کو واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن ایک روز راوی کے فرزند مسعود کی بیوی نے جو نئی نسل کی نمائندہ ہے اور جسے لیہہ لداخ کے ماضی کا نہ تو علم ہے اور نہ دلچسپی اس فوٹو کو کوڑے دان میں پھینک دیتی ہے۔

"یہ اتفاق تھا کہ جس روز وہ فوٹو کوڑے دان میں پھینکا گیا اسی روز تاریخ کے استاد، ایلی ایزر جولدنؔ نے آخری سانس لی تب وہ چھیاسی سال کے تھے۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ وہ گروپ فوٹو کے آخری فرد تھے۔" (افسانہ: ایک فوٹو)

فکشن نگار، مورخ اور دانشور عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری کی نمایاں خوبی "ارضیت" ہے ان کے افسانوی اور غیر افسانوی تمام تر کارناموں کا تعلق، کسی نہ کسی پہلو سے لیہہ لداخ سے ہی ہوتا ہے۔ یہ بات اس لئے اہم ہو جاتی ہے کہ عام طور پر جموں کشمیر کے اس الف لیلوی خطے کے بارے میں خلق خدا کی معلومات محدود ہی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو شیخ عبدالغنی نے اپنے ناولوں، افسانوں اور تاریخی تحریروں کے ذریعے ایک عالم کو لیہہ لداخ کی باز دریافت کی آسانیاں فراہم کی ہیں۔ فکشن نگار

عبدالغنی شیخ کے اندر بیٹھا ہوا ایک بالغ نظر مورخ، اکثر وبیشتر ان کے افسانوں میں بھی، کبھی سامنے سے تو کبھی کسی چور دروازے سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے چلا آتا ہے لیکن فکشن نگار عبدالغنی شیخ اپنے اس مورخ ہمزاد کو اپنی کہانیوں کے فنی اور جمالیاتی امتیازات پر اثر انداز، کا موقع نہیں دیتا۔ عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشاد کے تاریخی ناولوں کا قصہ تو بہت پُرانا ہو چکا۔ جدید دور کے فکشن میں تاریخ کو ایک با اثر حربہ (TOOL) کے طور برتنے کی عمدہ مثالیں قاضی عبدالستار اور قرۃ العین حیدر کے یہاں بھری پڑی ہیں۔ انہیں آپ ''نو تاریخیت'' (Neo Historicism) کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ کے افسانوی مجموعہ ''دو ملک ایک کہانی'' کے کئی افسانوں میں اس ''نو تاریخیت کی زریات' ملتی ہیں۔ لیکن اسی 'دو ملک ایک کہانی' نام کے افسانے میں عبدالغنی شیخ نے تقسیم ملک اور خصوصاً تقسیم کشمیر کے حوالے سے جس تاریخی کرب کو بیان کیا ہے وہ پوری ریاست جموں وکشمیر کے عام لوگوں کا کرب ہے۔ تقسیم ملک کی بنیاد پر جس طرح برصغیر کی دو بڑی ریاستوں پنجاب اور جموں کشمیر کا ''جھٹکا'' کیا گیا اس کا درد آج بھی کروڑوں لوگ محسوس کرتے ہیں۔ عام لوگ/ قارئین کشمیر کے آر پار کی سیاست، ہلاکت، ملی ٹینسی اور کشمیر نام پر ہند پاک تنازعہ سے تو واقف ہوں گے لیکن وادئ کشمیر سے تقریباً ۲۸۰ کلومیٹر دور، ہندوستانی حصے کے لیہہ لداخ اور پاکستانی مقبوضہ 'بلتستان'، اسکردو کے سماجی اور تہذیبی رشتوں کے بارے میں تقریباً کچھ نہیں جانتے۔ عبدالغنی شیخ اپنی کتاب ''دو ملک ایک کہانی'' میں اس حقیقت کو قارئین کے سامنے بے نقاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۷ء سے پہلے 'بلتستان' متحدہ کشمیر میں لداخ کا ایک تحصیل تھا۔ ڈوگرہ منتظم اعلی جس کو وزیر کہا جاتا تھا، گرمیوں کے چھ ماہ لیہہ اور چھ ماہ سکردو میں گزارتا تھا۔ وزیر کے ہمراہ اس کا سارا عملہ ارکان سکردو جاتا تھا۔ میرا بھائی کلرک تھا۔۔۔ ایک سال کے اندر بلتستان پاکستان کے زیرنگیں آیا اور بھائی جان ہمیشہ کے لئے وہاں کے ہو کر رہ گئے۔ پہلے پہل دونوں ملکوں کے مابین خط وکتابت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔۔۔ ایک معاہدہ کے تحت رسل ورسائل اور خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔''

ملک کے بٹوارے نے کہاں کہاں کیا کیا بانٹ دیا اسکی نشاندہی کرتے ہوئے عبدالغنی شیخ نے لداخ کے حوالے سے لکھا ہے،

''بٹوارہ ایک ملک کا نہیں ہوا تھا، بٹوارہ ایک شہر کا، ایک قصبہ کا ایک گاؤں کا اور ایک خاندان اور گھر کا ہوا تھا لائن آف کنٹرول کے آر پار سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو کھیتوں میں ہل جوتتے، پانی دیتے، فصل کاٹتے اور کھلیان جمع کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن جب ایک بھائی دوسرے بھائی سے ملنا چاہتا ہے تو لیہہ یا کرگل آنا پڑتا ہے۔ لیہہ سے دہلی ہوائی جہاز سے پرواز کرتا ہے۔ مہینوں کی تگ و دو اور انتظار کے بعد، اگر ویزا ملے تو وہ کراچی، اسلام آباد یا لاہور جا کر اپنے بھائی سے ملاقات کر سکتا ہے۔ وہ بھی بھائی کے گاؤں میں نہیں۔ اپنے بھائی کے گاؤں سے اتنا قریب ہو کر بھی وہ اس گاؤں سے بہت دور ہے۔ آسمان کے ایک تارے کی طرح ''جسے وہ دیکھ سکتا ہے، چھو نہیں سکتا۔''

(افسانہ؛ دو ملک، ایک کہانی۔ ص۔۱۶۲)

اسے سیاست کا جبر کہا جائے یا لداخ بلتستان کے لوگوں کی بدنصیبی کہ ایک نسل، زمین، ایک تاریخ اور تہذیب و تمدن کے حامل ہونے کے باوجود ان کے وجود کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔

'بلتستان اور لداخ کے لوگ نسلی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے ایک ہیں۔ دونوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں گہری یکسانیت ہے۔ اور تو اور لوگوں کا مزاج اور افتادِ طبیعت بھی ایک جیسی ہے۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک دونوں خود مختار تھے۔ بلتستان نے لداخ کو 'پولو'، موسیقی کے آلات اور غزل سے متعارف کرایا۔ لداخ نے بلتستان کو داستانیں اور گیت دئے ۔ بلتستان لداخ کو مکھن، سوکھی خوبانیاں، گری، سلاجیت، مٹی کے نادر برتن اور زہر مہرہ کی پیالیاں فراہم کرتا تھا اور ہم (لداخی) بلتستان کو پشمینہ، اون اور نمک مہیا کرتے تھے۔''

(افسانہ؛ دو ملک ایک کہانی۔ ص۔۱۶۴)

اس اقتباس میں عبدالغنی شیخ نے اگرچہ ہندوستان کے لیہہ لداخ اور پاکستان کے بلتستان اور سکردو کے تاریخی، تہذیبی، معاشی اور سماجی رشتوں کی شکستگی کے کرب کو تمام تر افسانوی لوازمات کے ساتھ کہانی کی صورت بیان کیا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو یہ کہانی نہیں سرحد کے دونوں طرف کے عام اور خاص لوگوں کے آنسو ہیں جو لفظ لفظ کہانی کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ دراصل ہندوستان اور پاکستان کی ۷۰، ۶۵ ستر سالہ مشترکہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں، کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے اور عبدالغنی شیخ ہی نہیں دونوں ملکوں کے تمام امن پسند لوگ اس انتظار میں ہیں کہ

''کبھی تو وہ کہانی ضرور لکھی جائے گی جو بچھڑے دلوں کو ملادے گی۔''

بہرحال لداخ کے فکشن نگار عبدالغنی شیخ اپنی مختلف اور متنوع ادبی و علمی خدمات کی بنا پر ایک بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت کے مالک بن چکے ہیں۔ اردو فکشن کے حوالے سے ان کا شمار ریاست میں ہی نہیں پورے برِصغیر میں منفرد اور معتبر معاصر فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے افسانوی مجموعہ ''دو ملک ایک کہانی'' میں شامل اشاعت دنیا کی مختلف اردو بستیوں کے مشاہیر کی آرا سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ حالانکہ میری رائے میں اتنے سارے لوگوں کے تاثرات شائع کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عبدالغنی شیخ کی کہانیاں خود گواہی دیتی ہیں کہ وہ ایک بالغ نظر اور پختہ کار فکشن نگار کی کئی دہائیوں پر محیط فنی و فکری، تخلیقی و جمالیاتی ہنرمندیوں کی زائیدہ ہیں۔ عبدالغنی شیخ کے امتیازات کئی ہیں لیکن، ریاست جموں و کشمیر کے ''بابائے افسانہ'' جناب نور شاہ کی یہ بات بے حد اہم ہے کہ

''عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی سے وابستہ انگنت واقعات اور حالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا۔''

......●●●......

☆......نورشاہ

عبدالغنی شیخ ...... تحقیق سے افسانہ تک

اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں کہ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) کی تحقیق ''کشمیر میں اُردو'' یہاں کے اردو زبان وادب کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور معلوماتی منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے قلم کاروں کے لئے یہ ایک انمول تحفہ ہے۔ اس تحقیقی پروجیکٹ کی ہر جلد اہم ہے لیکن حصّہ سوئم اس لحاظ سے بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، انشائیہ اور صحافت کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ قلم کاروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے بارے میں کھل کر بات کی گئی ہے حالانکہ جناب محمد یوسف ٹینگ نے پیش گفتار میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ سروری صاحب جیسے صاحب نظر اُستاد نے ایسے بہت سارے قلم کاروں کو نظر انداز کیا ہے جو ریاست میں اردو کی روایت کو رعنائی بخشنے میں مصروف رہے ہیں۔ ان قلم کاروں میں عبدالغنی شیخ کا نام بھی شامل ہے۔

عبدالغنی شیخ کی پہلی کہانی ایک مقامی اخبار ''دیش'' میں 1958 میں شائع ہوئی تھی اور آج بھی حسبِ سابقہ اُن کی کہانیاں ملک کے مصروف ومقبول جرائد میں شائع ہوتی ہیں اور پسند کی جاتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کے 4 مجموعے اور 2 ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان تخلیقات میں ''دل ہی تو ہے'' (ناول) اور ''دوراہا'' (افسانوی مجموعہ) بھی شامل ہیں۔ حال ہی میں اُن کے پرانے نئے افسانوں کا انتخاب ''دو ملک ایک کہانی'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے

میں 45 کہانیاں شامل ہیں۔ 2015 میں شائع ہونے والے اس افسانوی مجموعہ کو کافی مقبولیت حاصل ہورہی ہے۔ شیخ صاحب کی کہانیوں کے تعلق سے اپنی رائے دہرانا چاہوں گا۔ میری یہ رائے اِس افسانوی مجموعے میں شامل ہے۔

"عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اُردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ اَن گنت واقعات و حالات کو ایک منفرد انداز میں سمیٹا اور پیش کیا۔"

عبدالغنی شیخ بحیثیت افسانہ نگار اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ اُن کی ادبی زندگی کا ایک اور اہم پہلو تحقیق ہے۔ اُن کی تحقیقی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی تحقیقی صلاحیتیں اُس وقت سامنے آگئیں جب اُن کی کتاب "قلم، قلم کار اور کتاب" پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند کی وساطت سے منظر عام پر آگئی۔ اُن کی دوسری تحقیقی کتاب "لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں" نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔

میں اس مختصر سے مضمون میں شیخ صاحب کی تحقیقی صلاحیتوں کو اُبھارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ عبدالغنی شیخ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، کا تعلق لداخ (لیہہ اور کرگل) سے ہے اور لداخ اپنے جغرافیائی پس منظر میں ایک مخصوص تہذیب وتمدن کا مرکز رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں ادب وعلوم کا ذخیرہ اس قدر وسیع ہے کہ زندگی میں ایک بار اِن پر عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے کئی بار جینا پڑے گا۔ زندگی کی تلاش میں یہاں اتنے ادبی اور علمی خزانے ملتے ہیں کہ اُنہیں اپنے ذہن میں سمیٹنا مشکل نظر آتا ہے۔ اپنے ایک مضمون "لداخ کا جغرافیائی محل ووقوع" میں وہ لکھتے ہیں:

"لداخ نے اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ میں چند جنگجو اور توسیع پسند حکمران پیدا کیے۔ اِن میں لاچھین اوت پال (1080-1110ء) کا نام سرِ فہرست ہے۔ اُس کی سلطنت میں موجودہ لداخ کے علاوہ مغربی تبت بلتستان، گلگت،

نیپال کے علاقہ ماستانگ اور کلوسمیت کا بڑا علاقہ شامل ہے۔ تب لداخ مغربی ہمالیہ میں سب سے طاقت ور ملک تھا۔''

لداخ میں بعض عقائد اور اوہام کے تعلق سے عبدالغنی شیخ نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اُن کی تحقیق بڑی معلوماتی ہوتی ہے۔ انہوں نے لداخ کے پسِ منظر میں بھوت پریت کے تعلق سے بہت سی چھوٹی دلچسپ کہانیوں کا ذکر کیا ہے لیکن وہ خود ہی کہتے ہیں کہ لداخ کی نئی نسل اِن کہانیوں یا حالات و واقعات سے ناواقف ہے اور اِن پر یقین نہیں کرتی۔ وہ خود کہتے ہیں کہ بودھ مت سے تعلق رکھنے والے لداخ کے اکثر لوگ ایسے مسائل حل کرنے کے لئے کاہن (Oracle) کے پاس جاتے ہیں۔

شیخ صاحب کا ایک اور مضمون ''لداخ۔۔۔ ملکی سیاحوں کی نظر میں'' پڑھ کر تصدیق ہو جاتی ہے کہ لداخ کے تعلق سے سب سے پہلا سفر نامہ 1812ء میں لکھا گیا اور یہ سفر نامہ میر عزت اللہ نے ضبط تحریر میں لایا۔ میر عزت اللہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک ملازم تھا اور وہ ولیم مُورکرافٹ کے سفر کی راہ ہموار کرنے کے لئے لداخ کے راستے بخارا بھیجا گیا تھا۔ میر عزت اللہ نے سونہ مرگ سے اپنا سفر شروع کیا اور سونہ مرگ تا لہہ اور لہہ سے مشرقی ترکستان تک ہر پڑاؤ اور بستی کا تذکرہ کیا ہے۔ میر صاحب مزید لکھتے ہیں کہ لہہ میں قیام کے دوران ایک بھی آدمی کو مسلح نہیں دیکھا۔ قتل، ڈاکہ زنی، تشدد اور خونریزی بالکل نہیں ہوتی۔ لوگ مذہبی تعصب سے بالاتر ہیں۔ بودھ اپنی بیٹیوں کی شادی مسلمانوں سے کراتے ہیں اور اپنے شوہر کا مذہب اختیار کرنے پر اعتراض نہیں کرتے۔ اگر عورتیں چاہیں تو کسی بھی وقت اپنا آبائی مذہب دوبارہ اختیار کر سکتی ہیں۔

ولیم مور کرافٹ کے بارے میں عبدالغنی شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ پہلا یورپی تاجر ہیں جنہوں نے انیسویں صدی کے پہلے ربع کے دوران لداخ میں دو سال گزارے۔ اُن پر شیخ صاحب کا تحقیقی مقالہ افادیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں لداخی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں اور مختلف حالات و واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں جب مُور کرافٹ لہہ پہنچے تو لہہ کی ساری آبادی اُنہیں دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑی۔ اس زمانے میں لہہ میں

پندرہ سو مکانات تھے۔ قصبے کی آبادی بودھ اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

لداخ میں فن سنگ تراشی کے تعلق سے شیخ صاحب نے مختلف سفر ناموں کی روشنی میں تحقیق کی ہے۔ اُن کے مطابق سنگ تراشی کا بہت بڑا خزانہ مختلف مذاہب سے وابستہ ہے۔ عام تصویروں میں روزمرہ کی زندگی کی سرگرمیوں، ثقافت اور رسومات کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ پالتو اور گھریلو جانوروں کی تصویریں تراشی گئی ہیں اور بھی بہت ساری مصنوعات ہیں جن کے تعلق سے عبدالغنی شیخ نے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور تحقیق کی ہے۔ انہیں منظر عام پر لاکر ایک علمی اور ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ صاحب نہ صرف ایک معتبر افسانہ نگار یا ناول نگار ہیں بلکہ تحقیق کے ساتھ اُن کی دلچسپی اُن کی ادبی زندگی کا ایک روشن پہلو ہے۔ اس تعلق سے معروف محقق اور ناقد جناب محمود شیخ لکھتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ نے لداخ جیسے دور دراز علاقہ میں رہ کر بھی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔''

اُن کے افسانوی مجموعے ''دو ملک ایک کہانی'' کے تعلق سے بات کئے بغیر میرا یہ مضمون ادھورا رہے گا۔ مجموعہ میں شامل کہانی ''ہوا'' بہت پہلے ماہنامہ شمع (دلی) میں شائع ہوئی تھی۔ تب ماہنامہ شمع اپنے پورے جوبن پر تھا۔ یہ کہانی انگریزی زبان میں بھی شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کہانی کے تعلق سے مدیر شمع کو اَن گنت خط ملے تھے اور مدیر شمع کے کہنے پر شیخ صاحب کو ایک مفصل خط لکھنا پڑا تھا۔ اس افسانوی مجموعہ میں شامل کہانی ''دادی اماں'' ریاست کے میٹرک نصاب میں شامل کی گئی ہے۔ عبدالغنی شیخ کی کہانیاں پڑھ کر اکثر احساس ہوتا ہے کہ اِن کے کردار عام زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اپنے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہیں:

''کوئی خاص کام نہیں سر۔ کبھی پہاڑ کے راستے زانسکار جانے والے کچھ منچلے لوگ آتے ہیں۔ اُن کے ساتھ جاتا ہوں۔ کبھی کسی کا کھانا پکانے جانا پڑتا ہے۔ اکثر چار پائے پر پُرانے کپڑے فروخت کرتا ہوں۔ ایک آدمی پُرانے کپڑے لاتا ہے۔ وہ بیچنے کے لئے دیتا ہے۔ اس طرح ...... کمائی ہوتی

ہے۔۔۔ایک وطن چھوڑے ہوئے آدمی کے لئے کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔''
تحقیقی مقالہ ہو یا کوئی افسانہ یا کسی ناول کا باب۔۔۔(افسانہ برتھ ڈے)۔اُن میں عبدالغنی شیخ کے مشاہدات، تجربات اور کیفیات کا دخل صاف صاف نظر آتا ہے۔وہ اپنے کردار عام زندگی سے لیتے ہیں اور شاید اسی میں اُن کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

......●●●......

☆......دیپک بدکی

ہمالیائی بلندیوں کی منفرد آواز-عبدالغنی شیخ
(دو ملک، ایک کہانی کے آئینے میں)

ہمالیہ کی گود میں واقع شمالی ہندوستان کا علاقہ، لداخ، نہ صرف تبّتی اور آریائی تہذیبوں کا سنگم رہا ہے بلکہ بین الاقوامی تجارتی شاہراہ 'سلک روٹ' سے جڑا ایک اہم مقام بھی رہا ہے۔ موسمِ سرما میں یہاں کا درجۂ حرارت صفر سے بیس ڈگری نیچے چلا جاتا ہے۔ ماضی میں یہ علاقہ کبھی بلتستان کا حصہ رہا جو تقسیمِ وطن کے بعد پاکستان میں چلا گیا اور نتیجے میں کئی زخم چھوڑ گیا۔ گو آبادی زیادہ نہیں ہے مگر جتنی بھی ہے اس میں یا تو بودھ ہیں یا پھر مسلمان اور دونوں مشترکہ تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اردو کے ایک بے لوث خادم، عبدالغنی شیخ، جنھوں نے اپنی زندگی اردو کی بقا اور لداخی تہذیب کی بازیافت کے لیے وقف کی ہے۔

عبدالغنی شیخ بہ یک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، سوانح نگار اور تاریخ نویس ہیں مگر ان کی دلچسپی خاص طور سے افسانہ نگاری پر مرتکز رہی ہے۔ وہ اردو کے علاوہ انگریزی، لداخی اور ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ ۷۰ سے زاید افسانے لکھ چکے ہیں جو اردو کے معتبر رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی افسانوں کے ترجمے ہندی، انگریزی، کشمیری، تیلگو، گجراتی اور جرمن زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔ افسانہ نگار کے مطابق انھیں بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق رہا، اردو اور انگریزی کی کتابیں پڑھ کر وہ نوٹس بناتے تھے اور سب سے پہلے ان کا ایک لطیفہ 'پیامِ تعلیم' میں چھپ گیا۔

لداخ کی تاریخ، فوک لور، کلچر، نباتات اور حیوانات کے بارے میں ان کی دلچسپیاں ایک

ریسرچ سکالر کی مانند رہی ہیں۔ وہ اس میدان میں نئے نئے گوشے دریافت کرتے رہے۔ اس بارے میں خود عبدالغنی شیخ 'قلم، قلم کار اور کتاب' میں رقم طراز ہیں کہ ''میں نے سنجیدہ موضوعات جیسے مذہب، فلسفہ، نفسیات وغیرہ پر بھی کتابوں سے اہم نوٹ لکھے ہیں۔ لداخ کی تاریخ اور ثقافت میرا اہم موضوع رہا ہے۔''

'دو ملک ایک کہانی' عبدالغنی شیخ کا تیسرا اردو افسانوں کا مجموعہ ہے جو اگست ۲۰۱۵ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ مجموعے میں ۴۵ / افسانے شامل ہیں۔ بیشتر تحریریں صنفِ افسانہ کے لوازمات کو پورا کرتی ہیں جبکہ چند ایک انشائیہ اور مزاحیہ مضامین کے زمرے میں رکھی جاسکتی ہیں۔ موصوف زمینی حقیقتوں سے گریز نہیں کرتے، وہ لداخ کی مٹی میں پیدا ہوئے ہیں، پلے بڑھے ہیں، اس لیے اس دھرتی سے جڑے مختلف کرداروں کو کامیابی کے ساتھ پیش کرنے اور یہاں آنے والے سیاحوں کے رویے کو سپردِ قلم کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتتے۔ ان کے پاس ایک حساس اور ہمدرد دل ہے، ایک فکر مند ذہن ہے اور ایک فرض شناس ادیب کا دماغ ہے۔ ان کے یہاں انفرادی غم بھی ہے اور اجتماعی کرب بھی۔ وہ موجودہ دور کو آئینہ دکھانے کی ہر دم کوشش کرتے ہیں اور اپنے افسانوں کی وساطت سے سماج میں پل رہی بدعنوانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ براہ راست قاری سے مخاطب ہوتے ہیں، علامتوں اور استعاروں سے گریز کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات اور کرداروں کی گوناگونیت ملتی ہے اور وہ کہیں بھی خود کو نہیں دہراتے۔

افسانوی مجموعے 'دو ملک، ایک کہانی' کی کئی کہانیاں قاری کے ذہن پر مستقل نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ ٹائٹل افسانہ 'دو ملک، ایک کہانی' اس کرب کی داستاں ہے جس سے ہندوستان اور پاکستان کے لوگ بٹوارے سے لے کر آج تک بوجھ رہے ہیں۔ زمینیں بٹ گئیں، گھر بٹ گئے، رشتے بٹ گئے، اجنبی اپنے ہوگئے اور اپنے اجنبی ہو گئے۔ شومئ قسمت یہ کہ دونوں طرف حکومتوں کی کارستانیوں کے بموجب فوجیں ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اسی نکتے کی بازگشت افسانے کے اس فقرے میں سنائی دیتی ہے:

''ہندوستان اور پاکستان کی ۶۵ / سالہ مشترکہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں،

کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔''

ایک اور افسانہ 'یادیں' ان امانتوں کا نوحہ ہے جو سرحد کے اس پار رہ گئیں اور اب صرف یادوں کی صورت میں باقی ہیں۔ اسی کرب کو افسانہ نگار نے افسانہ 'ایک خط' میں بھی بیان کیا ہے۔ جس میں کرگل کی لڑائی اور اس کی وجہ سے مقامی باشندوں کی تباہی اور شہادت کا ذکر ہے۔ ملاحظہ کیجیے ایک اقتباس:

''۱۹۴۸ء میں کارگل اور اس کے نواح میں دونوں ملکوں میں لڑائیاں ہوئیں۔ جب پہلی جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی ہوئی تو کارگل کے پاس لائن آف کنٹرول کے نام سے ایک ایسی لکیر کھینچ دی گئی جس نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اولڈ ینگ (آبائی گھر) سے الگ کر دیا۔ میرے سارے سپنے بکھر گئے۔ کبھی انسان کی کھینچی ہوئی مصنوعی لکیر کے سامنے خود انسان بے بس ہو جاتا ہے۔''

دیکھا جائے تو انسان اپنی دھرتی صرف جنگ و جدل اور فسادات کے باعث ہی نہیں چھوڑتا بلکہ اقتصادی حالات کے باعث بھی وہ ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے یا پھر نئے امکانات کی تلاش میں دربدری اختیار کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان کو شکست و ریخت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پھر بھی اس کی انسانیت اور مروّت برقرار رہتی ہے۔ افسانہ 'دوسری رات' میں اسے معاشی وجوہات کے سبب گاؤں چھوڑ کر شہر کا رخ کرنا پڑتا ہے جہاں اس کا بھرم آہستہ آہستہ زائل ہو جاتا ہے۔ 'ایک فوٹو' بہت ہی خوبصورت اور اثر انگیز افسانہ ہے جس میں ایک پرانا گروپ فوٹو لداخ کی کئی نسلوں کی ناسٹلجیائی تاریخ بن کر سامنے آتا ہے اور انسانی جذبات کو کھنگالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ مجموعے کی پہلی کہانی 'یہ زندگی' سرئیلی کیفیت سے دوچار ایک آدمی کی کہانی ہے جو آخر کار اپنے خوف پر قابو پالیتا ہے۔ ایک اور درد انگیز کہانی 'صرف ایک کلومیٹر دور ہے' میں موجودہ معاشرے کے سلگتے موضوع 'اولڈ ایج کیئر' کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں بوڑھے والدین اپنے بچوں کے دیدار کے لیے ترستے ہیں حالانکہ وہ کہیں امریکا یا یورپ میں رہائش پذیر نہیں ہیں بلکہ صرف ایک کلومیٹر کی دوری پر رہتے ہیں۔ اس کہانی کی ایک اور کڑی ہے افسانہ 'اپنی موت سے پہلے اولاد کو ورثہ نہیں دو' جس میں ایک بوڑھا اپنی ساری جائیداد قبل از مرگ بچوں کو بانٹ دیتا ہے جس کے بعد کوئی بھی اس کی دیکھ

بھال کرنے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ افسانہ 'دھوپ چھاؤں' میں عبدالغنی شیخ اس شماریاتی معاشرے پر فوکس کرتا ہے جس میں انسان محض ایک نمبر بن کر رہ گیا ہے۔ افسانے میں متوازن غذا نہ ملنے کے باعث بچوں میں بینائی کی کمی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ ہمارے دیش میں لاکھوں بچے ناقص تغذیہ کے شکار ہو رہے ہیں۔ ایک اور موثر افسانہ 'رشتے ناطے' ہے جس میں ایک دولتمند جرمن خاتون لداخ سے ایک بیوہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور اس کی بے لوث خدمت کے عوض مرنے کے بعد اس کے لیے اپنی آدھی جائیداد چھوڑ جاتی ہے۔ وہ تفریحاً کچھ دنوں کے لیے گھر آتی ہے جہاں لوگ اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہیں مگر جونہی انھیں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ساری جائیداد فلاحی کاموں کے لیے ٹرسٹ کو سونپ دی ہے تو خفا ہو جاتے ہیں اور جانے کے وقت کوئی بھی آدمی اس کو الوداع کہنے نہیں جاتا۔ افسانہ 'جینی' میں مشرقی اور مغربی ہر دو سوسائٹوں کا موازنہ کیا گیا ہے۔ دو اقتباس:

☆ ...... (مغرب) ''میری ماں کہتی ہے کہ میرا باپ ایک فرانسیسی ہے۔ پیرس میں ان سے ملا تھا۔ وہ وہاں گھومنے گئی تھے۔ دونوں صرف ایک ماہ اکٹھے رہے تھے۔ اس کا نام پیٹرک کپلانی ین تھا۔''

☆ ...... (مشرق) ''ہمارے ہاں عورت چراغ خانہ ہے جینی، شمع محفل نہیں۔ عورت کی عصمت اور عفت اس کا سب سے بڑا زیور ہے ہماری تہذیب میں عریانی اور جنسی بے راہ روی کو دخل نہیں۔''

ظاہر ہے کہ مشرق کے نرینہ عصبی سماج میں مردوں کی سوچ کچھ اسی طرح کی ہوتی ہے اور عورتیں اس کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیتی ہیں مگر بعد میں کہنے والا خود ہی نادم ہو جاتا ہے اور اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔ ''میں نے مشرقی تہذیب کی پاکیزگی اور روحانی تقدس کے نام پر اس لڑکی کو گمراہ کیا ہے۔'' 'غیر یقینیت' ایک دلسوز افسانہ ہے جس میں ایک لاچار غریب مزدور اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنے کے لیے ٹھیکیدار کے ساتھ کام کرنے کے لیے ہر سال سیزن میں لداخ چلا جاتا ہے مگر ایک مرتبہ بلندیوں کی آب و ہوا راس نہ آنے کی وجہ سے (Acclimatization) بہت سخت بیمار ہو جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ ایک اور افسانے 'حمال' میں کشمیری مزدور کی زندگی کی کشمکش اور وہ

اپنی لڑکی کی شادی کے لیے کیا کیا مصیبتیں جھیلتا ہے، کو منعکس کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں افسانہ نگار لداخ کے کسانوں کی کسمپرسی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''لداخ میں ایک کسان مقروض پیدا ہوتا ہے، مقروض جیتا ہے اور مقروض مرتا ہے۔'' ....(ص: ۴۰)

مجموعے میں کئی افسانے سماجی، اقتصادی اور سیاسی موضوعات پر لکھے گئے ہیں جیسے 'آزمائش' میں اغوا شدہ بچے کے باعث والدین کی المناک تصویر، 'جھنڈا والا' میں بے روزگاری سے نپٹنے کی خاطر سیاسی پارٹی کا جھنڈا تھامنا، افسر شاہی اور لال فیتہ شاہی پر لکھی گئی کہانیاں 'راشن کارڈ' اور 'مجرب نسخہ'، فرقہ وارانہ فسادات پر مبنی کہانیاں 'ہوا' اور 'نام'، افسانہ 'انجام' میں بودھوں کی عبادت گاہ گمپا سے نادر مورتیوں کی چوری، 'مجھے یہ آدمی نہیں چاہیے' میں سوسائٹی میں دیانت دار آدمی کی نایابی، 'اداکار' میں ایک معمولی آدمی کا شہرت پانے کے بعد تکبر اور نخوت کی نمائش کرنا، 'ہیرو' میں بدلتے زمانے کے ساتھ ہیروؤں کا بدل جانا، 'معجزہ' میں میڈیکل سہولیات کی مہنگائی اور عدمِ دستیابی اور 'دادا جان' میں بڑھتے ہوئے کنبے کی جدوجہد۔ سماجی مسائل پر افسانہ 'جھنڈا والا' کا ایک اقتباس یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت اپنی جگہ۔ باپ اپنی نو عمر بیٹی کا منہ کالا کرتا ہے۔ پھر چچا اور بیٹا اس میں شامل ہوتے ہیں اور آبروریزی جاری رہتی ہے۔ ماں اپنے نوزائیدہ بچے کو کوڑے دان میں پھینکتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک چھ سالہ بچی کی عصمت دری کرتا ہے اور پھر گلا گھونٹ کر مارتا ہے۔ قدیم روما اور یونان میں ایسی باتیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ آج ہم آئے دن ایسی خبریں پڑھتے ہیں۔ عینیت پسند لوگ کہتے ہیں کہ انسان سے مایوس نہ ہو۔ انسان سے مایوس کیوں نہ ہو؟'' (ص ۵۱)

ایک اور سماجی مسئلے ناخواندگی خصوصاً نسوانی ناخواندگی کے بارے میں افسانہ 'ایک فوٹو' میں لکھتے ہیں:

''ہاں ان دنوں کوئی اپنی لڑکی کو تعلیم نہیں دیتا تھا۔ لڑکے بھی باقاعدگی سے

اسکول نہیں آتے تھے۔ گرمیوں میں بہت سارے لڑکے بھیڑ بکریاں چرانے جاتے تھے۔آج بھی اکّا دُکا لڑکیاں ہی پڑھتی ہیں۔'' (ص ۳۶)

افسانہ نگار کی نظر صرف لداخی سوسائٹی کی کمیوں اور خامیوں کی طرف نہیں اٹھتی ہے بلکہ وہ اپنے معاشرے کی مثبت روایتوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔لداخی سماج میں جہیز کی عدمِ موجودگی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اچھی بات تو یہ ہے کہ لداخ میں جہیز نہیں لیا جاتا ہے۔''

(منظر نامہ:۲۷۳)

افسانہ نگار نے نفسیاتی موضوعات کو بھی چھوا ہے جیسے 'رازِ دل' میں تزویج محرمات کا اندیشہ، 'سوئمنگ پول' میں اپنی ملازمہ کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے ظاہری فضول خرچی، 'گمشدہ' میں ماں اور معشوقہ کی محبتوں کے بیچ لٹکا ہوا آدمی، 'برتھ ڈے' میں لالچ کی عکاسی، 'مظلوم' میں نسوانی جبریت کا پوشیدہ رخ اور 'کرید' میں عورت کی بے وفائی۔کچھ افسانے رومانی ہیں جن میں عشق کے نشیب وفراز درشائے گئے ہیں مثلاً 'ایک رات' اور 'مسکراہٹ' میں پہلی نظر میں عشق ہونا، 'بدلاؤ' میں مرتبہ کے ساتھ معشوقہ بدل لینا، 'دل ہی تو ہے' میں چھوٹی موٹی باتوں پر ناراضی اور پھر تجدید تعلقات اور 'یادیں' میں ایک شادی شدہ جوڑے کا اپنی ازدواجی کدورتوں کو بھول کر پھر سے تجدید محبت کا عزم کرنا۔افسانہ 'مرنا تیری گلی میں' میں ایک لینڈی کتا ایک پالتو کتیا کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے مگر پالتو کتیا کی مالکہ، جو نسلی کتوں کا کاروبار کرتی ہے، نسلی امتیاز کو برقرار رکھنا چاہتی ہے، اس لیے اپنی کتیا پر ناراض ہوتی ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ مارکیٹ میں اس کے پلّوں کو خریدنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔دیکھا جائے تو کہانی علامتی بھی ہے کیونکہ انسان خود نسلی اور طبقاتی آگاہی رکھتا ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے جتن کرتا ہے۔افسانہ 'مسافر' ہنگری کے ادیب لاجوس زیلاہی کی کہانی کا ترجمہ ہے۔

یہاں پر عبدالغنی شیخ کی انشائیہ، ظریفانہ اور طنزیہ تحریروں کا ذکر کرنا ناگزیر بنتا ہے۔'اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد' میں مغلیہ اور ہم عصر سماج کے انتظامیہ، عدلیہ اور قانون سازیہ کا موازنہ ملتا ہے۔ترقی سے محروم لداخ کی عکاسی 'کھودا پہاڑ نکلا چوہا' میں کی گئی ہے کہ نسلیں اس آس میں مرکھپ

جاتی ہیں کہ اب کے لیہہ میں ریل گاڑی آئے گی، بجلی آئے گی اور دیگر موڈرن سہولیات میسر ہوں گی۔ 'اپنے سیل فون کو ذرا آرام دو' میں موڈرن لائف سٹائل پر طنز کیا گیا ہے کہ انسان اب رشتوں ناتوں کو بھول کر موبائل کا غلام ہو گیا ہے۔ 'منظر نامہ' افسانہ کم اور مضمون زیادہ لگتا ہے جس میں لڑکی کی شادی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ افسانہ 'حل' ایک طرح کا رپورتاژ ہے جس میں گھر میں ہر کوئی اپنی پسند کا چینل دیکھنے کا متمنی ہے۔ ایک اور انشائیہ نما افسانہ 'نیّت' ہے جس میں ایک جرمن اپنی بیٹی کے ہمراہ ریل میں سفر کرتا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان مسافر یہ سوچ کر ان پر پھبتیاں کستے ہیں اور ریمارکس پاس کرتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئے گا۔ سفر کے اختتام پر جرمن انہی کی زبان میں ان سے مخاطب ہوتا ہے اور انھیں شرمسار ہونا پڑتا ہے۔ 'ایک انار سو بیمار' میں ایم ایل سی کی سیٹ کے لیے امیدواروں کی دوڑ دھوپ کا ذکر ہے کہ وہ وزیر اعلیٰ پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کے نائی، دھوبی اور درزی کو بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں لداخی کلچر کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ افسانہ 'دو ملک ایک کہانی' میں وہ اس علاقے کی تاریخ سے استفادہ کرتے ہیں اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو منعکس کرتے ہیں:

> ''بلتستان اور لداخ کے لوگ نسلی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے ایک ہیں۔ دونوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں گہری یکسانیت ہے اور تو اور لوگوں کا مزاج اور افتادِ طبیعت بھی ایک جیسی ہے۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک دونوں خود مختار تھے۔ بلتستان نے لداخ کو پولو، موسیقی کے آلات اور غزل سے متعارف کرایا۔ لداخ نے بلتستان کو داستانیں اور گیت دیئے۔ بلتستان لداخ کو مکھن، سوکھی خوبانیاں، گری، سلاجیت، مٹی کے نادر برتن اور زہر مہرہ کی پیالیاں فراہم کرتا تھا اور ہم بلتستان کو پشمینہ، اون اور نمک مہیا کرتے تھے۔ (ص:۱۶۴)

اسی طرح 'ایک فوٹو' میں انھوں نے کپتان کمپارٹنر کے سفرنامے Magic Ladakh سے مندرجہ ذیل عبارت مستعار لی ہے۔

''لداخی عورتیں تکلی پر اون کاتتی اور مرد رسی باٹتے ہوئے چلتے ہیں۔ بہت سارے لوگ چقماق سے آگ بناتے ہیں۔ لداخی ہمیشہ اپنے ساتھ چائے پینے کی پیالی رکھتے ہیں۔ عورتیں کمر بند سے چمچی، سوئی دان، چابیوں کا گچھا اور ایک چمٹی باندھتیں اور مردِ قلم دان، چقماق، بنسری، چاقو، گوپھن اور رسی کی گانٹھ کھولنے کے لیے ایک جنگلی بکرے، مرگ کا چھوٹا سا سینگ باندھتے۔'' (ص ۱۴۱)

عبدالغنی شیخ نے بہت سے افسانوں میں لداخی کرداروں کو پیش کیا ہے جیسے صنم چھرنگ، آنگموں، سونم، دورجے اور 'ایک فوٹو' کے کئی کردار۔ لداخ چنانچہ ایک سیاحتی مرکز ہے اور غیر ممالک سے بہت سارے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس لیے فطری بات ہے کہ افسانہ نگار کو ان سے واسطہ پڑا ہوگا اور ان کی زندگیوں میں جھانکنے کا موقع ملا ہوگا۔ ان کے کئی افسانوں میں غیر ملکی کردار بھی ملتے ہیں۔ مثلاً برتھ ڈے، چینی وغیرہ۔

زیرِ نظر مجموعے کے افسانے پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا نہ صرف مطالعہ وسیع ہے بلکہ ان کا مشاہدہ بھی کافی گہرا ہے۔ وہ کردار کو سمجھنے کے لیے اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانوں میں منظر نگاری کا تجزیہ کرنے سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ منظر نگاری کے چند اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

☆ ''فضا خودرو جنگلی پھولوں، جھاڑیوں اور چگلی کے پودوں کی خوشبوؤں سے رچی رہتی۔ پہاڑی ندیاں گیت سناتی تھیں۔ یہاں سے سیاچن گلیشئر تک وادی وادی پہاڑ پہاڑ میں سیاچن کے پھول کھلے ہوتے تھے۔ اسی لیے گلیشئر کا نام سیاچن پڑا ہے۔'' (پہلا خط ص ۲۰۷)

☆ دوسری مرتبہ ہم بلتستان کے اہم مقامات سکردو، شگر اور خپلو گئے اور چھوربت درّہ پار کر کے بٹالیک کے راستے کارگل لوٹے۔ چھوربت درّے اور بٹالیک کی بلندیوں پر ۱۹۹۹ء کی گرمیوں میں پاکستانی اور ہندوستانی فوجیوں کے درمیان گھمسان لڑائی ہوئی تھی۔'' (پہلا خط ص ۲۰۷)

جہاں تک عبدالغنی شیخ کے اسلوب کا تعلق ہے، وہ بیانیہ کو اپنی تحریر کا وسیلہ بناتے ہیں۔ ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہے۔ گنجلک اور مبہم علامتوں اور استعاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں، اس لیے ان کے افسانوں کو سمجھنے کے لیے قاری کو کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ قاری افسانہ شروع کرتا ہے تو پڑھ کر ہی دم لیتا ہے کہ اس میں انجام تک تجسس برقرار رہتا ہے۔ یہی خوبی ان کے افسانوں کو بلند پایہ بناتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار زمانی طور پر اپنے کینوس کو بہت پھیلا دیتا ہے اور افسانے میں کرداروں کی بہتات ہوتی ہے۔ ان کی افسانوی تکنیک کے بارے میں تنقید نگار پریمی رومانی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''عبدالغنی شیخ کو افسانوی تکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔''

(پریمی رومانی، جموں)

زیر نظر مجموعہ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عبدالغنی شیخ جہاں موجودہ معاشرے کی کوتاہیوں اور ہنگامہ آرائیوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور ان کو بیان کرنے میں کوئی گریز نہیں کرتے وہیں ان کا رویہ قنوطیت کے بدلے رجائیت کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس امید کے ساتھ لکھتے ہیں کہ آنے والا کل روشن اور تابناک ہوگا۔ ان کے فکر و خیال پر علی باقر کے تاثرات یہاں پر نقل کرتا ہوں۔

> ''عبدالغنی شیخ کو انسان کے خوش گوار مستقبل پر یقین ہے۔ مایوسی، تلخی اور جارحانہ ذہنیت کی دل خراش جھلکیاں ان کی تحریروں میں نہیں ہیں۔ وہ بدنظمی، بے ضابطگی اور خلفشار سے گریز کرتے ہیں اور جہالت، گمراہی اور رسمی باتوں کے خلاف ہیں۔''

(علی باقر، لکھنؤ)

مجموعی طور پر اگر عبدالغنی شیخ کی افسانوی کائنات پر نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے سینے میں ایک درد مند دل ہے جو غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور پسماندہ لوگوں کے لیے بے قرار

رہتا ہے۔انھیں اپنے تاریخی ورثے پر فخر ہے اور وہ لداخ کی عظمتوں کا بکھان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔موصوف انسان کی کھینچی ہوئی اس مصنوعی سرحد سے بے زار ہیں جس نے ایک ہی خاندان کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور سیاسی کارستانیوں کے باعث وہ ایک دوسرے سے مل بھی نہیں پاتے۔ان کے افسانے مقصدی ہوتے ہیں اور اپنی جلو میں کوئی نہ کوئی سیکھ چھپائے رہتے ہیں۔ایسے دور دراز علاقے میں گزشتہ ساٹھ برسوں سے اردو کا پرچم اٹھائے عبدالغنی شیخ کے کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔وہ لداخ کی اکلوتی آواز ہی سہی مگر توانا آواز ہیں۔مجھے امید ہے کہ آگے بھی وہ اردو ادب کی آبیاری کرتے رہیں گے۔

......●●●......

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔

(ادارہ)

☆......ڈاکٹر آفاق عزیز

عبدالغنی شیخ بحیثیت محقق

عبدالغنی شیخ لداخی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی سطح کے جانے مانے قلمکار ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر تاریخی، تنقیدی اور دیگر ادبی و علمی مضامین کے ساتھ ساتھ زاید از ڈیڑھ درجن کتابیں لکھی ہیں جن کا تعلق بلواسطہ یا بلا واسطہ طور لداخی ثقافت اور وسط ایشیاء اور لداخ کے تمدنی رشتوں سے ہے۔ اس اعتبار سے عبدالغنی شیخ ایک ہمہ جہت تاریخی شخصیت ہے۔ شیخ صاحب کے متعلق واقفیت حاصل کرنا ہو تو لداخ جاننا لازمی ہے۔ اسی طرح لداخ جاننے کے لئے شیخ صاحب کو جاننا ضروری ہے۔ گو کہ عبدالغنی شیخ اور لداخ دو لازمِ ملزوم پہلو ہیں۔ اسی لحظ سے اگر انہیں لداخ کا میوزیم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ عبدالغنی شیخ کے ادبی کارناموں پر سراپا بحث کرنا کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ اس لئے راقم نے ان کے بعض تحقیقی مضامین کا سرسری جائزہ لینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ زیرِ بحث مضامین کے تین حصے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق خطہ لداخ کی ثقافت سے ہے۔ دوسرا وہ جن میں لداخ اور وسط ایشیاء کے تاریخی اور تمدنی رشتے قلمبند ہوئے ہیں۔ تیسرے حصے میں اُن مضامین کا تذکرہ کیا گیا جو مقامی سطح کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اہمیت کے حامل ہیں۔ سب سے پہلے لداخ پر لکھے گئے مضامین پر بات ہوگی۔

لداخ پر لکھے گئے مضامین:

عبدالغنی شیخ نے لداخ کے حوالے سے جو مضامین تحریر کئے ہیں اُن میں 'تاریخِ لداخ: نئے تناظر میں'، 'لداخ میں بھوت پریت کی واردات' اور 'میرے بچپن کا لداخ: گاہے گاہے باز خواں ایں

قصہ پارینہ' بھی شامل ہیں۔'تاریخ لداخ: نئے تناظر میں' نامی مضمون میں عبدالغنی شیخ نے اُن تاریخوں کا سرسری جائزہ پیش کیا ہے جو ملکی اور غیر ملکی محققوں نے لداخ کے متعلق تحریر کیے ہیں۔ جس میں ڈاکٹر اے ایچ فرانکی کی A History of Western Tibet[1]، الیگزنیڈر کننینگھم کی Ladakh: Physical Statistical and Historical، حشمت اللہ خان کی 'تاریخِ جموں، کشمیر، لداخ، گلگت اور بلتستان'، منشی عبدالستار کی 'تاریخ مغربی تبت'، گیرگن صنم کی ''لداقسی لورگیوس نستن رولمے داینگس'، 'لداقسی لورگیوس نانے دُستی'، ایس ایس گیرگن کی 'لداقس گیالربس چی میدستیر'، 'لوسیانو پیٹک کی 'دی کنگڈم آف لداخ' اور کاچو سکندر خان کی 'قدیم لداخ' وغیرہ نامی تاریخی کتابیں شامل ہیں۔ عبدالغنی شیخ نے ان سبھی تواریخ کا اگرچہ مختصر جائزہ ہی پیش کیا ہے لیکن اس کے باوجود عاقل را اشارہ کافی است کے چلتے قاری کو لداخ کی قدیم و جدید تاریخ کی آشنائی ہوتی ہے۔ اگرچہ بیشتر مورخین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ لداخ کی قدیم تاریخ پُر اسرار ہے لیکن دورِ جدید کے مورخوں اور محققوں نے اس پُر اسراریت کو بے نقاب کیا ہے جس کی پردہ کشائی عبدالغنی شیخ نے یوں کی ہے:

> ''نئی شہادتیں ملی ہیں کہ لداخ نے پتھر کا زمانہ دیکھا ہے۔۔۔ سائنس دانوں نے سپسول، الچی، ریزونگ، لیکیر، نورلا، خلسے اور پشکیوم میں پتھر کے آلات جیسے تیشے، کُلہاڑیا، چھیلن اور کھرچن پائی ہیں۔۔۔ سائنس دانوں نے ۱۹۷۹ء میں لیہہ سے 100 کلومیٹر دور ایک قدیم چولہا دیکھا جو زمانہ پتھر کے کلچر کی موجودگی کی گواہی دیتا ہے۔ اس چولہے کی لکڑی کے کوئلے کے تجزیہ سے ثابت ہوا ہے کہ یہ 2700 قبل مسیح کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔''[2]

---

[1] یہ تاریخ بنیادی طور لداخی زبان میں لکھی گئی تھی۔ ایک جرمن عالم شے لے گین ویٹ نے ۱۸۶۶ء میں اس کا انگریزی ترجمہ کیا جس میں بہت سی خامیاں تھیں۔ اس کے بعد اس کا انگریزی ترجمہ فرانکی کے بہنوئی ڈاکٹر کارل مارکس نے کیا جو قسط وار جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں چھپا۔ لداخی تواریخ میں اس کی بنیادی حیثیت ہے۔

[2] عبدالغنی شیخ، تاریخ لداخ، نئے تناظر میں، شیرازہ (جموں۔ کشمیر۔ لداخ۔ ۷)، جلد: ۵۰، شمارہ: ۱۔۳، جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، لنگویجز، سرینگر، ص: ۴۸۔

جو قاری لداخ کی تاریخ سے بالکل نابلد ہو اُس کے لئے عبدالغنی شیخ کا مذکورہ مضمون مشعل راہ ہے۔ انہوں نے جن مورخین اور تاریخوں کا تذکرہ کیا ہے اُسے ان کی گہری اور مفصل تاریخ شناسی کا پتہ چلتا ہے۔

اسی طرح عبدالغنی شیخ نے ''لداخ میں بھوت پریت کی واردات' نامی مضمون میں ایسے کئی واقعات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تعلق دیومالائی قصہ کہانیوں اور اساطیر سے ہے۔ بھوت پریت جیسے واقعے کو عبدالغنی شیخ صاحب نے یوں زبان دی ہے:

''لیہہ میں سُنسنی پھیلی تھی۔ گھر گھر میں ایک ہی چرچا تھا۔ بات یہ تھی کہ ایک آدمی پُراسرار طور غائب ہوا تھا۔ چار روز بعد وہ شکستہ اور خستہ حال گھر لوٹا۔ اس چار روز میں وہ بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ گال چپک گئے تھے اور چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے اہل خانہ کا کہنا تھا کہ رات کے آخری پہر وہ اپنے بستر میں نہیں تھا۔ سرہانے کے پاس اس کے جوتے جوں کے توں پڑے تھے۔ وہ نہایت ہی سراسیمہ نظر آتا تھا۔ گھبرایا گھبرایا اُس نے بیان دیا کہ رات کے اندھیرے میں ایک غیر مرئی طاقت اس کو اس کے بستر میں سے لے گئی اور لیہہ سے چار کلومیٹر دور پیتک کی کھریا مٹی کے ٹیلے کی ایک کھائی میں رکھا اور کھانے کو کھریا مٹی دی۔''[۳]

لداخ کے حوالے سے اس مضمون میں اور بھی کئی دیومالائی واقعات کا تذکرہ ملتا ہے جن کو لداخی زبان میں ''ڈیپ ٹیت'' کہا جاتا ہے۔ جس کا معنی ''شیطان یا بھوت پریت کا کسی کو بھگا کر لے جانا ہے''۔ بقول شیخ صاحب اس قسم کی وارداتیں لداخ میں اکثر ہوا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ آج بھی کم و بیش جاری ہے۔ بھوت پریت کے قصے کہانیوں کا پٹارا کھولتے ہوئے شیخ صاحب نے بعض ممالک خاص کر یورپ کے بہت سے قصے کہانیاں بیان کی ہیں جس سے ثابت ہے کہ بھوت پریت کا وجود کسی مخصوص علاقے سے منسلک نہیں بلکہ یہ بین الاقوامی تمدن کا دائمی عنصر رہا ہے۔ مثال کے طور شیخ صاحب

۳۔ عبدالغنی شیخ، 2017، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، نئی دہلی، ص: ۳۰۰۔

نے ایک امریکی صدر ابراہم لنکن، جین سیمور کی بھتنیاں، سر والٹر ریلے، چارلس اول وغیرہ کی مثالیں دی ہیں جو بھوت پریت کے دائرہ ماحول میں آتے ہیں۔ ثبوت کے طور شیخ صاحب کے مضمون سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ مثلاً

''کم از کم دو امریکی صدور کی خاتون اوّل کی بھتنیاں بھی وائٹ ہاوس میں دیکھی گئی ہیں۔ اہم شخصیتوں میں برطانوی وزیر اعظم بنجمن ڈزرائیلے (۱۸۰۹۔۱۸۸۱) کو مرنے کے بعد اپنے مکان میں دیکھا گیا۔ عام طور پر وہ مکان کی بالائے منزل پر چلتا ہوا نظر آتا تھا۔''[۴]

اپنے مضمون میں عبدالغنی شیخ نے دیومالائی واقعات کو مرئی یا غیر مرئی صورت سے منسلک کیا ہے جو زندوں کو ہراساں کرتا ہے۔ شیخ کے بقول کوئی روح اچھی ہوتی ہے جو زندوں کو مدد کرتی ہے اور زیادہ تر روحیں مہلوکین یا مقتولین کی ہوتی ہیں۔ جو اکثر و بیشتر بے چین رہتی ہیں۔ بدروح مکان پر ڈیرہ جماتی ہے اور مکینوں کو مکان سے نکالنے کے لئے سرگردان اور کوشاں ہوتی ہے۔ اس مضمون کا بغور جائزہ لینے سے عبدالغنی شیخ کی دیومالائی تحقیق پر محنت و مشقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کو لکھنے کے لئے شیخ صاحب نے بہت وسیع مطالعہ کیا ہے۔ خاص کر یورپی نوشتوں کا۔ مضمون کی ساخت اس قدر چست ہے کہ بار بار پڑھنے کو من کرتا ہے۔ کہانی پن نے مضمون کو انتہائی دلچسپ بنایا ہے۔ واقعات پڑھتے پڑھتے اندازہ ہوتا ہے کہ قاری ٹیلی ویژن ڈرامہ ''بریم راکھش''، ''آہٹ'' یا ''فیر فائیلز'' دیکھ رہا ہے۔

''میرے بچپن کا لداخ؛ گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را'' اس مضمون کے عنوان سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں عبدالغنی شیخ کے بچپن کا لداخ زیر بحث رہا ہوگا۔ وہ اپنے بچپن اور آج کے لیہہ لداخ کے متعلق یوں خامہ فرسا ہے:

''1997ء میں لیہہ میں دو نائی تھے۔ اب نائی کے 50 سے زیادہ دُکانیں ہیں۔ میری یادداشت کے مطابق تب درزی کی دو دُکانیں تھیں اب درزی کے چالیس سے زائد دُکانیں ہیں۔''[۵]

---

۴ عبدالغنی شیخ، 2017، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، نئی دہلی، ص ۳۰۳۔

۵ عبدالغنی شیخ، 2017، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، نئی دہلی، ص ۳۶۷۔

مضمون میں درج ہے کہ عبدالغنی شیخ کے بچپن میں جہاں کھیت کھلیان تھے آج وہاں عالی شان عمارتیں، نئی نئی بستیاں، سرکاری دفاتر، بازار اور بس اڈے دکھائی دیتے ہیں۔ بھوت پریت اور جنیات کے کارن جن جگہوں اور زمینوں سے گزرنا کارے دارد والا معاملہ تھا آج وہاں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے یا ہسپتال قایم ہے۔ جہاں سے صاف و شفاف پانی کی ندیاں بہتی تھیں، وہاں سڑکیں تعمیر ہوئی ہیں۔ سڑک کی خستہ حالی، پہاڑی دروں کی مُشکل پسندی، موسم کی بے رخی وغیرہ کے باعث لداخ پہنچنا انتہائی مشکل تھا۔ دور دراز علاقوں خاص کر کشمیر کے ملازم لداخ جانے کے لئے بالکل ہی تیار نہیں ہوتے تھے۔ وہ زبردست خوفزدہ تھے۔ کسی ملازم کو لداخ تبدیل کرنا سخت سزا مانی جاتی تھی۔ ملازم کے گھر والے جانتے تھے کہ دشوار گزار پہاڑی راستوں کو عبور کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لداخ جانے والے ملازم وصیت نامہ لکھ کر ہی روانہ ہوتے تھے۔ اگر ملازم کشمیر سے تعلق رکھتا ہو تو عبدالغنی شیخ کے بقول گھر والے اور یار دوست لداخ جانے والے ملازم کو رخصت کرنے کے لئے وائل گاندربل تک جا کر اُسے روتے روتے خدا کے حوالے کرتے تھے۔ اسی صورت حال کا سامنا کشمیریوں کو اُس وقت بھی کرنا پڑتا تھا جب بیگار کا بگل بجتا تھا۔ اس نوعیت کے ایک واقعے کو ڈاکٹر آرتھر نیولے بیان کرتے ہیں:

> ''میں نے ایک ایسی جگہ دیکھی ہے جہاں ایک سرسبز میدان میں بیگار پر جانے والوں کو رخصت کیا جا رہا تھا جو بلند آواز میں آہ و بکا کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب اُن کے حق میں دعائیں کر رہا تھا۔ بیگار پر جانے والے اور ان کے رشتہ دار پُر درد لہجے میں گیت گا رہے تھے، ہمارے کھیت اب کون دیکھے گا۔ ہماری اس لمبی جدائی میں ہمارے بیوی بچوں پہ کیا کچھ نہ گزرے گی۔ گلگت کے پہاڑی علاقوں میں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی راستوں پر ہم غریبوں کو کن آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' [٦]

٦۔ Arther Nevay, P. 21, C.F. Dr. Afaq Aziz, Tarekh-E-Siyasati Kashmir, Vol. I, Srinagar, P: 55.

علاوہ ازیں عبدالغنی شیخ نے لداخ کے پرندوں، جنگلی جانوروں، زمین وزراعت، پیداوار، موسم، موسمی مشکلات، سردیوں میں داستانوں اور کہانیوں کا ماحول، سماج، سماجی و مذہبی رسوم، عقائد، مسجد، خانقاہ، گُمپا، تیوہار، آمدورفت، وسائلِ روزگار، ذریعہ معاش، سیاست، کھیل کود، تعلیم، پیشہ، سڑکیں اور آفاتِ سماوی جیسے درجنوں موضوعات پر اس طرح قلم آزمائی کی ہے کہ قاری کو لداخ کے بارے میں بنیادی معلومات ہر صورت میں مِل ہی جاتی ہے جو شیخ صاحب کی تحریر کی اہم کامیابی ہے۔

ان مضامین میں عبدالغنی شیخ نے ایسے کئی الفاظ استعمال میں لائے ہیں جن کا ماخذ تبّتی، چینی یا وسطِ ایشیائی زبانوں سے ملتا ہے۔ مثلاً امبان، لوپچق، چابا، چہار شہر، ڈیپ ٹیت وغیرہ، امبان چینی لفظ ہے جس کے معنی افسرِ اعلیٰ ہے جو لہاسہ اور کاشغر میں ملکِ چین کا سب سے اہم اور طاقتور حاکم تھا۔ وہ آمدورفت، رسل ورسائل بلکہ سبھی قسم کی نقل وحرکت پر نظر رکھتا تھا۔ لوپچق کی بات ہو تو یہ ایک خیر سگالی مشن کا نام تھا جس کو لوگ ''سالانہ سلام'' کے نام سے بھی جانتے تھے۔ یہ مشن ہر سال لداخی حکمران کے تحفے تحائف لے کر تبّتی لاما کو پیش کرتا تھا۔ لوپچق کی سربراہی برسوں تک ایک مسلم خاندان کے سپُرد تھی۔ ''چابا'' بھی ایک مشن تھا جو تبت سے لداخ آتا تھا۔ چابا کا معنیٰ ''چائے والا'' ہے جو تبت سے چائے کی ٹکیا لاتا تھا۔ چابا دلائی لاما کا تجارتی ممبر ہوتا تھا۔ اس ممبر کو تبّتی زبان میں ''زوم ژونگ'' کہتے تھے۔ جبکہ چہار شہر کے زمرے میں کاشغر، ختن، یارقند اور کارغالیک کے نام آتے ہیں۔ اسی طرح شیخ صاحب نے کئی شہروں اور علاقوں کے قدیم نام بھی درج کئے ہیں۔ مثلاً تبّتی اور لداخی میں گلگت اور ہونزہ کو دُروش اور ختن کو لی کہا گیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دُروش گلگت کا پُرانا نام تھا۔ اس کے بعد اس کا نام چھوٹا بلور پڑا۔ اسی طرح بلستان کو بڑا بلور کہا گیا ہے۔ یہ پُرانے نام وسط ایشیائی تحریروں میں بھی درج ہے جس سے ثابت ہے کہ عبدالغنی شیخ کا کافی وسیع مطالعہ ہے۔ اسی راہ کے چلتے لیہہ شہر کے نزدیک نوشہر نام کی ایک گلی تھی جس کا نام تبدیل کر کے چھنگ گلی رکھا گیا ہے۔ [ے]

لداخ اور وسط ایشیا کے تعلقات:

وسطِ ایشیا سے برصغیر بشمول کشمیر آنے جانے کے لئے لداخ کو کلیدی حیثیت حاصل رہی

ے چھنگ ایک مقامی جَو کی شراب ہے جو عورتیں مٹکوں میں لاکر اس گلی میں بیچتی تھیں۔

ہے۔لداخ سے تبت، پھر چین اور اُس کے بعد وسط ایشیا، لداخ سے گلگت، پھر افغانستان سے ہوتے ہوئے ایران یا لداخ سے کشمیر جانے اور واپس آنے کے لئے جو اہمیت لداخ کو حاصل تھی، اُس کا تذکرہ بیشتر مورخوں، واقعات نگاروں، سفرنامے لکھنے والوں اور مُہم بازوں نے ہر زمانے میں کیا ہے۔ ایسے نوشتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد عبدالغنی شیخ نے یوں خامہ فرسائی کی ہے:

> ''لیہہ وسطِ ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ وسط ایشیا کے ملکوں تبت، پنجاب، کشمیر، ہماچل پردیش اور بلتستان سے تاجر لیہہ آتے تھے اور اشیاء کی خرید و فروخت اور تبادلہ کرتے تھے۔ لداخیوں کی اپنی ضرورت بھی ان سے پوری ہوتی تھی۔''[8]

''لداخ کا جغرافیائی محلِ وقوع'' نام کے مضمون سے اشارہ ملتا ہے کہ لداخ اور ملک چین کے درمیان عہدِ پارینہ سے دوستانہ تعلقات رہے ہیں جس سے تجارتی اور سیاسی رشتوں کے شانہ بشانہ سراغ رسانی جیسے معاملات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ لداخ کی سیاسی، تجارتی اور جغرافیائی اہمیت کے کارکن چین اور وسط ایشیائی ممالک کے ساتھ ساتھ منگول حکمران بھی لیہہ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کر چکے تھے۔ بقول شیخ صاحب تاریخ سے ایسے بعض معاہدوں کی نشاندہی ہوتی ہے جس کا ثبوت لداخ کے کئی گاؤں میں منگول نسل کے لوگوں کی آبادی سے ملتا ہے۔ ان باتوں کا انکشاف عبدالغنی شیخ نے اُس وقت بھی کیا جب ۲۰۱۰ء میں کشمیر یونیورسٹی میں قائم وسط ایشیائی مرکز کی ایک ٹیم سِلک روٹ کی گم گشتہ راہوں کی کھوج میں لداخ پہنچی تھی۔ عبدالغنی شیخ ایسی راہوں کی نشاندہی جو چین، تبت، گلگت اور وسط ایشیائی ممالک کو ملاتی ہیں، زنسکار، اکسائی چین اور خردونگ لا کے ناموں سے کرتا ہے۔ اُن کے بقول کشمیری تاجر لداخ، تبت اور سنٹرل ایشیا کے علاوہ نیپال اور چین بھی کاروبار کرنے کے لیے جاتے تھے۔ کشمیری لوگ تبتیوں اور یورپیوں کے درمیان ثالثی اور درمیانہ داری کا کام بھی سرانجام دیتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ کشمیری لوگ تبتّی اور فارسی زبان کے زبردست ماہر مانے جاتے تھے جس کے کارن وہ سیلانیوں، مہم بازوں اور تاجروں کو اُن کے من موافق مدد کرتے تھے۔ تبت جو وسط ایشیا کا ایک

۸۔ عبدالغنی شیخ، ۲۰۱۷، لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے، نئی دہلی، ص، ۲۳۔

اہم علاقہ تصور کیا جاتا ہے کے متعلق ''تبت میں آباد کشمیری مسلم'' عنوان سے لکھے گئے مضمون میں عبدالغنی شیخ نے ایسی باتوں کا تذکرہ کیا ہے جو تحقیقی اور تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایسی تحقیقی باتیں ڈھونڈ نکالنے کے لئے قلمکار نے درجنوں کتابیں چھان ماری ہوں گی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دورِ وسط میں جنگ وجدل، مظالم اور قحط سالی کی وجہ سے بہت سے مسلمان کشمیر چھوڑ کر تبت میں جا بسے ہیں۔ ان کے تئیں حاکمانہ وسماجی رویہ، تعلیم، اقتصادی صورتحال اور ان کے سیاسی رول وغیرہ کو محقق نے زمینی صورتحال مدنظر رکھ کر پیش کیا ہے۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ تبت، کشمیر اور لداخ میں رہنے والے مسلمانوں کو خاچے اور کشمیر کو خاچول کہا جاتا ہے۔ کشمیری تبت پہنچ کر وہاں کی زبان وثقافت میں گھل مل گئے۔[9] اسی طرح لداخ وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز رہا ہے جہاں بقول عبدالغنی شیخ سینکڑوں برسوں سے ہر سال گرمیوں میں ایک تجارتی میلہ لگتا تھا جس میں وسط ایشیائی ملکوں کے ساتھ ساتھ تبت، ہندوستان، افغانستان اور بعض اوقات سائبیریا کے تاجر اپنا مال خرید و فروخت کے لیے لاتے تھے۔ کشمیر یونیورسٹی میں قائم شعبۂ سنٹرل ایشین سٹڈیز کی ایک سروے ٹیم کے ساتھ عبدالغنی شیخ نے غیر رسمی ملاقات کے دوران اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ وسطِ ایشیا کے مختلف علاقوں سے لوگ ہجرت کر کے لداخ میں بس گئے تھے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ لداخ میں کوئی گھر نہیں ہے جہاں وسط ایشیا کی کوئی نہ کوئی چیز موجود نہ ہو۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ صدیق واحد کے ایک رشتہ دار خواجہ غلام رسول نے ایک اَنگریز مہم جو مورخ سیون ہیڈن کو ۲۵ ہزار روپیہ اُدھار دیے تھے جو مناسب وقت پر واپس بھی ملے اور اس بنا پر انگریزوں نے موصوف کو ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا۔ باتوں باتوں میں وہ یہ بھی کہہ گئے کہ لداخ کے ہند چین سرحد پر ۲۰۱۴ء تک غیر قانونی تجارت جاری تھی جہاں سے ضروریات زندگی کی بیشتر چیزیں آتی جاتی تھیں۔ ۱۹۵۹ء تک تبت کے ساتھ لداخ کی تجارت چلتی تھی لیکن دلائی لامہ کے ہندوستان آنے کے بعد کاروبار کی سبھی راہیں مسدود ہوگئیں۔ شیخ صاحب نے ایک اور اہم بات کہی کہ ''میں ایک وسیع اور عالی شان میوزیم بنانے کے درپے ہوں جس میں لداخ،

9۔ عبدالغنی شیخ، 2016، تبت میں آباد کشمیری مسلم، شیرازہ (جموں۔ کشمیر۔ لداخ۔ ۱۱)، جلد: ۵۳، نمبر: ۱۱۔۱۲، کلچرل اکیڈیمی سرینگر، ص: ۱۴۰۔

کشمیر اور سنٹرل ایشیا کے نوادرات ہوں گے جس سے کشمیر، لداخ، تبت، گلگت، افغانستان، ایران، یارقند، کاشغر، ختن اور ترکستان کے باقی شہروں کے ساتھ تجارتی اور باہم رشتوں کو مزید تقویت ملنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔'' اُن کی رائے میں اگر کرگل بلتستان سمیت شاہراہِ ابریشم کی تمام قدیم شاخوں کو بحال کیا جائے تو مختلف ملکوں کے باہمی رشتوں میں نئی جان آسکتی ہے۔''[10]

بین الاقوامی اہمیت کے مضامین:

عبدالغنی شیخ نے درجنوں سیاسی، سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور باہمی رشتوں جیسے پہلوؤں پر قلم آزمائی کی ہے۔ ان نوشتوں میں بعض مضامین ایسے ہیں جو بین الاقوامی دلچسپی کے حامل ہیں۔ ''سیاچن گلیشئر۔گلِ گلاب کا گلستان یا بُلند ترین محاذ جنگ''، ''برصغیر ہند میں حضرت عیسیٰؑ کی آمد''، ''لداخ کے ہمس گنپہ کا پُراسرار صحیفہ''، ''کوکشو۔ جہاں بودھ اور مسلمان ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے'' وغیرہ مضامین خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ ''سیاچن گلیشر۔گلِ گلاب کا گُلستان یا بُلند ترین محاذِ جنگ'' نام کے مضمون کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے لداخی متوطن عبدالغنی شیخ نے کافی محنت کی ہے۔ اس مضمون میں بہت اور تحقیقی معلومات فراہم کی ہیں۔ سیاچن دو لفظی اکائیوں کا مرکب ہے۔ ''سیا+چن'' سیا کا معنی جنگلی پھول جو خودرو ہے۔ یہ پھول سیاچن اور اس کے گردونواح میں بکثرت اُگتا ہے۔ رہی بات ''چن'' لفظ کی، لداخ اور بلتی میں اس کا مطلب اُگنے کی جگہ ہے۔ یہ پھول گلابی، پیلے اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ سیاچن گلیشر کی شروعات قدیم تُرکستان سے ہوتی ہے جو ہندوستان، پاکستان اور چین کی سرحد پر ۱۸۵۲۰ رفٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس مضمون کی سب سے اہم بات یہ کہ سیاچن کا دشوار گزار بالائی خطہ قدیم زمانے میں انسانی بودوباش کا مرکز رہا۔ عبدالغنی شیخ رقمطراز ہیں:

> ''سیاچن گلیشر کے پڑوس صحرائے گوبی میں لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے تک بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ اُن کی تعداد ڈھائی سو سے تین سو تک بتائی جاتی ہے۔ ان بستیوں کے لوگ اسلام اور بُدھ مت کے پیروکار تھے۔ جغرافیائی

---

[10] اقتباس از صدا بند انٹرویو، ملکیت سنٹر آف سنٹرل ایشین سٹڈیز، یونیورسٹی آف کشمیر، حضرت بل سرینگر، ۲۰۱۰ء۔

محرکات جیسے آب و ہوا میں تبدیلی، دریاؤں کا رخ بدلنے، پانی کم ہونے
اور چشمے سوکھنے سے نخلستان، ریگستان میں جذب ہوئے، پھر ریت کے بگولے
اُٹھے اور بستیاں زیر زمین دب گئیں۔''[۱]

اسی بات کی تصدیق صحرائے گوبی میں میں کھدائی کے دوران نکلے بے شمار انسانی ڈھانچوں، موسیقی کے آلات اور سونے کے زیورات سے ہوتی ہے جس کا حوالہ خود شیخ صاحب نے بھی دیا ہے۔ تاریخ سے معلوم پڑتا ہے کہ زمانہ قدیم میں سیاچن سے بلتستان اور چینی ترکستان کے درمیان لوگوں کی آمد و رفت تھی جو سترہویں صدی کے آس پاس تک جاری تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ سیاچن آج کل دُنیا کا سب سے بلند محاذ جنگ ہے، جہاں برصغیر کے دو ہمسایہ ملکوں کی فوجیں آمنے سامنے ہیں۔ گلیشر کی حفاظت پر روزانہ کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور ہر سال زبردست برف باری اور شدت کی سردی سے متعدد انسانی جانیں ضایع ہو رہی ہیں۔ گرمیوں میں یہاں درجہ حرارت نقطِ انجماد سے ۱۰ سے ۱۵/ ڈگری سینٹی گریڈ نیچے رہتا ہے اور یہ چوٹی پورے سال برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ یہاں سردیوں میں نہ صرف منفی ۲۰ سے ۷۵/ ڈگری درجہ حرارت گرتا ہے بلکہ آکسیجن کی کمی، سانس لینے میں تکلیف، پھیپھڑوں میں پانی بھر آنا، برف سے ہاتھ، پیر اور جسم پر پھوڑے نکلنا اور چہرے پھٹنے جیسی بیماریوں کی شکایت اکثر و بیشتر رہتی ہے۔ یہاں برفانی ہوائیں فی گھنٹہ ۱۰۰ سے ۱۵۰/ میل کی رفتار سے چلتی ہیں۔ جن کے سامنے جو بھی آتا ہے، جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ گلیشر کے ساتھ منسلک فوجی اور جنگی واقعات کا مفصل تذکرہ بھی عبدالغنی شیخ کے مضمون میں ملتا ہے۔ اس مضمون میں تاریخ کے بہت سے اہم گوشے کا ایک نمایاں رخ پیش کیا گیا ہے جو عام قاری کے لئے کسی دلچسپی سے کم نہیں۔ اسی طرح 'حضرت عیسیٰؑ' سے متعلق ایک مضمون لکھا گیا ہے جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ برصغیر خاص کر تبت تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس مضمون میں اُن تمام باتوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن کے بل بوتے پر لداخ یا اس کے گرد و نواح میں حضرت عیسیٰؑ کی موجودگی کا چرچا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق یہ روایات کشمیر اور افغانستان کی نوشتوں میں بھی ملتی ہیں۔ اس پر درجنوں مضامین اور کتابیں چھپ چکی

---

[۱] عبدالغنی شیخ، ۲۰۱۷، ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے''، نئی دہلی، ص، ۱۰۳۔۱۰۵۔

ہیں جو ہزاروں میں بکی ہیں۔ اور لداخ کا چرچا برصغیر کے ساتھ ساتھ یورپی ملکوں میں بھی ہونے لگا۔ 'کوکشو، جہاں بودھ اور مسلمان ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے' بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ کوکشو نامی گاؤں میں بودھ اور مسلمان مخلوط تعلیمات اور روایات پر عمل پیرا تھے۔ بودھ مذہب کے لوگ ماضی قریب تک اپنے مردوں کو مسلمانوں کی طرح دفناتے تھے۔ مسلمان خاندانوں کا طرز رہائش بودھوں جیسا تھا۔ اس گاؤں میں اکثر مردوں کے نام بھی مخلوط ہوتے تھے جیسے رحیم چھرنگ، علی ٹشی، نمگیل موسیٰ وغیرہ۔ علالت کی صورت میں ملّا یا پجاری کی ہدایت پر والدین بچے کا نام بدل کر بودھ یا مسلم نام رکھتے تھے۔ ایک ہی چھت کے نیچے مذہبی صحیفے ورد کرتے تھے۔ لداخ میں سنگ تراشی کے مضمون میں بعض تصویروں کا تذکرہ ملتا ہے جو ماہرین کے بقول پانچویں صدی ق م سے آٹھویں صدی ق م کے بتائے جاتے ہیں۔ سنگ تراشی کے یہ نمونے زمانہ قدیم بلکہ قبل از تاریخ کے دور کے آرٹ کی عکاسی کرتے ہیں۔ (یہ سنگ تراشی ایک قدیم بلکہ اولین انسانی مونومنٹ کا پتہ دیتی ہے۔) مختصر یہ کہ عبدالغنی شیخ ایک ایسے سکالر ہیں جنہوں نے تاریخ، سماجیات، آثارِ قدیمہ، اقتصادیات جیسے پہلوؤں پر مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف اصنافِ ادب پر بھی قلم آزمائی کی ہے۔ اگر قاری صرف عبدالغنی کے مضامین ہی پڑھیں تو انہیں لداخ کے متعلق ہر قسم کی انفارمیشن مل سکتی ہے اور اُسے دوسری کوئی کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اُن کی نوشتوں میں حوالہ جات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

......●●●......

☆ ...... ولی محمد اسیر کشتواڑی

عبدالغنی شیخ: لداخی تہذیب وثقافت کا عکاس

"لداخ۔تہذیب وثقافت" اُردوزبان کے سرکردہ محقق، ناول نگار' افسانہ نویس اور انشاء پرداز عبدالغنی شیخ کی تازہ ترین تصنیف ہے جس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ موقر کتاب "بامِ عالم" لداخ کے تہذیبی اور ثقافتی منظرنامے کی رُونمائی کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر روینا اگروال عبدالغنی شیخ لداخ کے اہم ترین قلمکار ہیں جو بیکِ وقت ادب، تاریخ، فلاسفی اور مذہبیات پر لکھتے ہیں۔

زیرنظر کتاب ۵۱۲ صفحات پر مشتمل یہ دیدہ زیب کتاب لداخ کے بارے میں خطرخواہ معلومات فراہم کرتی ہے۔کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں نے اس کی کمپوٹر کمپوزنگ کی ہے اور اس کا خوشنما سرورق مختار گرافکس نے بڑی محنت اور مہارت کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کتاب کا انتساب شیخ صاحب نے اپنی والدہ مرحومہ اور والد مرحوم کے نام کیا ہے۔فاضل مصنف نے پیش لفظ میں اپنی اس موقر تصنیف کی اہمیت پر ان لفظوں میں روشنی ڈالی ہے۔"لداخ۔تہذیب وثقافت" اُردو میں لداخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو میرے پینتالیس سال کی تحقیق اور دریافت کا ثمرہ ہے۔" اس میں لداخ کی تاریخ' ثقافت، تمدن، یادگاروں اہم، مقامات، مذاہب، شخصیات، لوک ادب، زبان، جنگلی جانوروں وغیرہ پر مختلف معلوماتی مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ پیشِ لفظ کے علاوہ زیرِ بحث کتاب میں تاریخ، تمدن وثقافت، مقامات، مذاہب، علم وادب، شخصیات، مہم جوئی اور جنگلی جانوروں اور پرندوں کا تذکرہ عمیق مطالعہ کے بعد کیا گیا ہے۔اس لئے قاری کو مصنف کی بات پڑھنے اور سمجھنے میں ذرا بھر بھی

دقت نہیں آتی ۔ شیخ صاحب کو اُردو زبان پر اچھا عبور حاصل ہے جس کی بدولت انھیں اپنے من پسند الفاظ بروئے استعمال لانے میں کوئی دقت نہیں آتی اور اُن کی نثر میں بھی نظم کا رسیلا پن موجود ہے زبان صاف وشستہ، سادہ اور عام فہم ہے۔ اس لیے یہ تحریر عام انسان کے لیے باعث دلکشی بن گئی ہے۔ اسی خصوصیت کے پیشِ نظر اس کتاب کو اوّل تا آخر پڑھنے میں کسی بھی قسم کی ذہنی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی ۔ الغرض شیخ صاحب نے پوری فنی چابکدستی سے لداخ کے بارے میں معلومات کا ایک ایسا بیش بہا خزانہ قارئین کے سامنے رکھا ہے جس کی جتنی بھی تعریف وتوصیف کی جائے کم ہے۔ اس تصنیف کی بدولت خود مصنف کے قد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جس سے کوئی انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کتاب سچ مچ ہمیشہ زندہ رہنے والی کتابوں کے زمرے میں آتی ہے۔ اسے جتنی بار پڑھا جائے معلومات کا ایک بحرِ بے کراں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اپنے مواد کے طفیل یہ کتاب لداخ پر کام کرنے والے محققین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اسے بنیاد بنا کر چھوٹ گئے پہلوؤں کو بھی قلم کی گرفت میں لایا جاسکتا ہے۔

لداخ کے جغرافیائی خدوخال واضح کرتے ہوئے عبدالغنی شیخ نے میجر گمپارٹنر کی تصنیف "Magic Ladakh" کا یوں حوالہ دیا ہے۔ ''لداخ بلوچستان سے جاملتا ہے بلوچی کہتے ہیں جب خدا نے دُنیا بنائی تو بچے کچھے پتھر، مٹی گارا وغیرہ ایک ڈھیر کی صورت میں نیچے پھینک دیا۔ یہ ڈھیر بلوچستان ہے لیکن خُدا نے لداخ کے معاملے میں روزانہ اپنے برش اور رنگوں کی گوناگوں سے اس میں تبدیلیاں لائی ہیں تا کہ صبح وشام پہاڑوں میں بدلتے رنگ دیکھ کر لوگ خُدا کو یاد کریں۔ ان پہاڑوں میں تتلی کے پر جنگلی پھولوں، سمندر کے کہرے اور قوسِ قزح کی رنگت ہے۔'' شیخ صاحب نے لداخ کو مرکزی لداخ، نوبراہ وادی، چنگ تھنگ کرگل اور زانسکار کے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لداخ کی سردی تو سبھوں پر عیاں ہے۔ کبھی کبھی سخت سردی کی وجہ سے ڈربے میں مرغ مرغیاں اور گاؤخانے میں گائے مری ہیں۔ گرمیوں میں خاص گرمی ہوتی ہے اور درجہ حرارت تیس ڈگری سینٹی گریڈ کو چھوتا ہے تاہم رات ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ریتلی زمین ہے۔ لداخ میں دھوپ کی بڑی اہمیت ہے۔ سورج چند لمحوں کے لیے بادلوں کی اوٹ میں چلا جائے تو گرمیوں میں بھی سردی کی ایک

ہلکی سی لہر اُٹھتی ہے اور اوٹ سے نکلے تو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ دُنیا کا سب سے اونچا اور بلند سلسلہ ہائے کوہ ہمالیہ زوجیلا سے ہوتا ہوا زانسکار کے جنوب میں چلا گیا ہے۔ دو مشہور چوٹیاں نن ۲۳۲۱۹ فٹ اور کُن ۲۳۴۱۰ فٹ بلند اسی سلسلے میں آتی ہیں۔ لداخ کے دریاؤں میں سندھ شایوگ، نوبراہ، سورو، زالنکار اور دراس کے نام آتے ہیں۔ دریائے سندھ سب سے بڑا دریا ہے اور باقی دریا اس کے معاون ہیں۔ چھورول لداخ کی ایک پرانی جھیل ہے اس کا مطلب گلی سڑی جھیل ہے۔ اس طرح شیخ صاحب نے اس موضوع پر انمول مواد پیش کر کے ایک ٹھوس کام کیا ہے۔

مصنف نے انتہائی اختصار کے ساتھ لداخ کی طویل تاریخ کا ایک خوبصورت خاکہ مرتب کیا ہے جس میں پتھر کے زمانے سے لے کر دور جدید تک کے اہم تواریخی واقعات اور ادوار بیان ہوئے ہیں۔ مختلف تاریخ نویسوں اور دستاویزات پر انحصار کرتے ہوئے شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ لداخ خطے نے پتھر کے پُرانے اور نئے دونوں زمانوں کو دیکھا ہے اور یہاں تاریخ سے قبل دور میں بھی انسان بستے تھے۔ چولہے کے پاس دریائی ڈھلوان دیوار پر غار بنے ہوئے ہیں جن میں قبل از تاریخ زمانے میں انسان بستے تھے۔ تبت اور لداخ کے قدیم باشندوں کے متعلق لکھا گیا ہے۔ کہ یہاں آدم خور قسم کے وحشی لوگ رہتے تھے۔ ابتداء میں نقل مکانی کر کے لداخ آنے والے مون بتائے جاتے ہیں۔ مون ہماچل پردیش سے لداخ آئے جن کے قدیم آثار مون کھر، مون کی چھورتن اور مون جینگ کی صورت میں موجود ہیں۔ لداخ میں کھر قلعے اور جنگ کھیت کو کہتے ہیں۔ بعد میں گلگت اور اس کے اطراف و جوانب سے درد قوم کے لوگ آئے اور لداخ کے مختلف علاقوں میں بس گئے۔ دردوں نے لداخ پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد مون نسل کے لوگوں سے بیگار کا کام لیا یا غلام بنایا۔ جو کام وہ خود ہی کرتے تھے وہ کام مون سے لیا۔ لداخ کے موجودہ لوگ مون، درد اور منگول نسلوں کی اولادیں ہیں۔ منگول زمانہ قدیم سے ہی تبت سے لداخ آتے جاتے تھے۔ لداخ کا قدیم ترین مذہب بون تھا۔ تبت اور بلتستان میں بھی یہ مذہب مروج تھا۔ بون کافی دیو دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ تاہم وہ ایک خدا کو بھی مانتے ہیں۔ اس مذہب کے پیروکار تبت میں آج بھی موجود ہیں۔ مون مت کے بعد ہندو دھرم کچھ عرصہ لداخ میں مقبول رہا۔ ۲۲۴ قبل مسیح میں مہاراجہ اشوک کے ایک مشنری نے لداخ کو بدھ مت سے روشناس کیا بعد میں کشن

خاندان کے پرچار سے لداخ میں بدھ دھرم کی اشاعت ہوتی رہی۔ نویں صدی عیسوی میں سارے وسطی ایشیاء میں لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے اثرات لداخ پر بھی ظاہر ہوئے۔ چنانچہ راجہ چھیتن نمکیل (۱۸۰۸ء سالِ انتقال) فارسی اور کشمیری زبانیں جانتا تھا۔ لداخ کا آخری راجہ چھپل تنڈوپ نمکیل تھا جس کے زمانے میں ۱۸۳۴ میں ڈوگرہ جرنیل ذورآور سنگھ نے کشتواڑ کے راستے لداخ پر حملہ کیا اور لداخ کی خودمختاری قصہ پارینہ بن کر رہ گئی۔ ۱۸۳۴ء سے ۱۹۴۸ء تک لداخ پر ڈوگروں کی حکومت رہی۔ اس کے بعد لداخ ریاست جموں و کشمیر کے ساتھ جمہوریہ ہند میں شامل ہو گیا۔ سکیت دے نیماں گون کے خاندان کی ایک ہزار سالہ لمبی حکومت کے دوران لداخ میں بدھ مت کو زبردست فروغ ملا اور متعدد گنپے تعمیر ہوئے۔ اسی دور میں خطہ میں اسلام بھی کچھ مذہبی رہنماؤں اور خدادوستوں کی تبت اور کشمیر سے آمد کے نتیجے میں پروان چڑھا اور اس وقت لداخ میں مساجد امام باڑے اور دیگر مقدس مقامات موجود ہیں۔ عبدالغنی شیخ کے مطابق لداخ کا قدیم ترین نام ''جنگ جونگ'' تھا۔ جنگ جونگ لداخ میں پائی جانے والی نادر بکری ''نیان'' کا اصلی نام تھا۔ یہ عظیم لداخ کا نام تھا جو کیلاش مانسرور سے سوات (دردستان) تک پھیلا ہوا تھا۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے لداخ کا نام ''مریول'' تھا جس کا مطلب سُرخ دیش تھا۔ یہ نام اکثر مقامات پر پہاڑ اور مٹی کا رنگ سُرخ مائل ہونے کی بناء پر رکھا گیا تھا۔ ایک زمانے میں لداخ نارِس کورسوم'' بھی کہلاتا تھا۔ چونکہ سکیت دے نیما گون کے عہد میں لداخ تین صوبوں میں منقسم تھا۔ اس لئے اسے ''نارس کورسوم'' یعنی تین صوبوں والا ملک کہا جاتا تھا۔ کشمیر کی تاریخی کتاب ''سری ور'' میں لداخ کو ''بڑا اور چھوٹا بھوٹا'' کہا گیا ہے۔ چونکہ کشمیر میں لداخیوں کو ''بھوٹہ'' کہتے تھے اس لئے لداخ کو بھوٹا یا بودھوں کا ملک کہتے تھے۔ فارسی تاریخ نویسوں نے اسے تبت خورد اور تبت کلاں کے نام دئے ہیں۔ بہر حال جو نام اب مدتوں سے مشہور ہے وہ نام ''لداخ'' ہے۔ بقولِ مصنف لداخ تبتّی اور لداخی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد ''درے پر بود و باش کرنے والے'' ہے۔ ''لا'' لداخی میں درے کو کہتے ہیں اور ''داقس'' ساکنان یا رہنے والے ہیں۔ کثرت استعمال سے لداقس بعد میں لداخ بن گیا۔ اپنی خداداد خوبصورتی کے پیش نظر لداخ کو ''مُون لینڈ''، ''میجک لینڈ'' کے ناموں سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء کے دہے میں

ایک غیر ملکی سیاح ''ایوا اورمے'' لداخ آیا تو وہ بے ساختہ کہہ اُٹھا۔ ''ہم ایک ایسے دیش میں آئے ہیں جو کسی اور سیارے کا لگتا ہے۔'' چند غیر ملکی سیاحوں اور تذکرہ نگاروں نے لداخ کو 'لاموں کا دیش'، ''پُر اسرار دیش''، "Land of Polyandri" شکاریوں کی جنت'' ''لینڈ آف اوویس آمون'' ''ستو پاؤں کی سرزمین'' ''بامِ عالم یا دُنیا کی چھت'' اور ''دُنیا کی ناف اور شنگریلا' وغیرہ کے نت نئے نام دیے ہیں۔ لداخ کی ثقافت پر بقول مصنف تبت کشمیر چینی ترکستان اور بلتستان کے اثرات ہیں۔ چنانچہ لداخ اور بھوٹان کی بنائی ہوئی چیزوں میں حیرت انگیز یکسانیت ہے۔ اسلام کشمیر سے لداخ آیا اور حضرت شاہ ہمدانؒ صاحب''۔ حضرت شیخ زین الدین ولیؒ اور دوسرے برگزیدہ اولیاء اور صوفیا کرام کے ہاتھوں لداخ کی ثقافت پر کشمیری اثرات پڑے۔ چنانچہ کشمیری زبان کے کئی الفاظ اصل صورت میں یا معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ لداخ میں استعمال ہوتے ہیں۔ گوشتابہ، روغن جوش، یخنی، کباب وغیرہ وسطِ اشیاء کے پکوان بھی اُردو اور فارسی زبانوں کی طرح کشمیر ہی سے لداخ آئے۔ کشمیر میں بنائے گئے برتن جیسے طبق، کٹورے اور دیگچیاں لداخی باورچی خانوں میں عام استعمال ہوتی ہیں۔ لداخ کے بہت سارے لوگ ترکوں کے زیر اثر نسوار کا نشہ کرتے تھے۔ چینی ترکستان کا کھانا ''مومو' لداخیوں کی مرغوب خوراک ہے۔ موق موق آٹے کے پیڑے میں کوٹا ہوا گوشت ڈالا ہوا ایک مقوی غذا ہے جو ایک مخصوص برتن میں بھاپ سے تیار کی جاتی ہے۔ چینی ترکستان کا سموسہ اور ترکی پلاؤ بھی لداخ میں بہت سارے لوگوں کی من پسند خوراک ہیں۔ لداخ کی ثقافت کے بارے میں شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ بہت سارے یورپیوں نے یہاں کے بدھ مت کی شوکت اور رومی کلیسا میں حیرت انگیز یکسانیت اور مماثلت کا مشاہدہ کیا ہے۔ تمام غیر ملکی سیاحوں نے لکھا ہے کہ لداخی بڑے دیانتدار خوش طبع، محنت کش، اور امن پسند ہیں۔ ایک لداخی کے لباس میں تبت کی گہری چھاپ ہے لیکن تبتی لباس کا گریبان چاک ہوتا ہے اور لداخی کا گلا بند اور دیدہ زیب ہوتا ہے۔ لداخ کا درد قبیلہ اپنے منفرد رسم و رواج، اعتقادات، شکل وصورت، معاشرت اور نسلی اعتبار سے دوسرے لداخیوں سے جُدا ہے۔ لداخ میں درد وادیٔ سندھ میں داہ ہنو، گرکون، سلیموں، بٹالیک اور درچیکس دیہات میں آباد ہیں جو کرگل، لیہہ اور بلتستان کے سنگم پر واقع ہیں۔ درد، دراس اور شغر شنگھو میں بھی بستے ہیں تاہم اُن کی معاشرت

دوسرے دردوں سے مختلف ہے سکندر اعظم کی فوجی مہمات اور قدیم ہندوستان کے قلمکار دراہ مہر کی تصنیفات اور راج ترنگنی میں اس قدیم قوم کا تذکرہ موجود ہے۔ درد عموماً بڑے روادار نیک اور صاف گو ہوتے ہیں۔ لداخ کی مشہور سلک روٹ سے متعلق بھرپور معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ سلک روٹ یا شاہراہ ابریشم قدیم دُنیا کی سب سے مشہور لمبی اور پُر اسرار شاہراہ تھی جو روئے زمین پر انتہائی دشوار گذار خطوں سے گذرتی تھی۔ یہ چین سے ہوتی ہوئی یورپ میں قدیم سلطنت روما تک جاتی تھی۔ چین کے شہر گوانگ زہو سے بحر روم کی بندرگاہ تک اس کی لمبائی تقریباً پندرہ ہزار کلومیٹر تھی۔ اس شاہراہ اور اس سے منسلک دوسری شاخوں کی شاہراہوں میں مختلف اقسام کے مال واسباب سے لدے ہوئے گلے میں ٹنٹناتی ہوئی گھنٹیاں باندھے اونٹوں، گھوڑوں اور دوسرے باربردار جانوروں کی لمبی قطاریں گذرتی تھیں۔ یہ روٹ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی ولادت سے کم از کم دوسو سال پُرانی تھی اور یہ چین اور رومن حکومتوں کے مابین تجارت کے لیے بنائی گئی تھی۔

لداخ کی تجارتی افادیت کا خلاصہ کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ پرانے زمانے ہی سے لداخ اور اُس کے ہمسایہ ملکوں کے مابین دوررس تجارتی تعلقات تھے اور لیہہ وسطِ اشیاء کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ ہمسایہ ملکوں کے ساتھ لداخ کے تجارتی تعلقات تھے، جن میں تبت، سنٹرل اشیاء چین، افغانستان، کشمیر، پنجاب، کشتواڑ اور ہماچل پردیش شامل تھے۔ ۱۸۴۸ میں لداخ میں ۱۵۰ تاجر تھے۔ اُن میں ۳۰ مقامی پرچون فروش تھے۔ ۲۵ لداخیوں کو تجارتی لائسنس تھے۔ نور پور کے ۲۰ سوداگر اور کلو کے ۱۳ سوداگر تھے۔ ڈوگرہ دور حکومت میں انتظامیہ کے ملازمین تاجروں کو لوٹتے تھے اور نت نئے ٹیکس لگا کر بڑے چٹورپن سے پیسہ بٹورتے تھے۔ مہاراجہ کو تجارت پر اجارہ داری حاصل تھی اور ہر سال ہزاروں روپے کمانے لگا تھا۔ لیہہ کا ناظم مہتہ بستی رام تجارت سے سالانہ دس سے بارہ ہزار روپے کماتا تھا۔ لداخ کی صدیوں پرانی تجارتی شاہراہیں اب بند پڑی ہیں لیکن جغرافیائی افادیت ابھی تک قائم ودائم ہے۔

لداخ کے نظامِ حکومت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ دسویں صدی سے پہلے لداخ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ یہ جمہورتیں آپس میں اکثر لڑتی رہتی تھیں۔ سیکت دے نیما گون نے دسویں صدی میں ان جمہورتوں کو یکے بعد دیگرے فتح کیا اور سارا لداخ اپنے قصبہ میں لیا۔ اُس نے

مرکزی ایک جمہوری نظام حکومت قائم کیا اور دیہات کے نمائندے راج دھانی میں طلب کیے۔ راجا کے اختیارات بہت زیادہ تھے۔ وزیروں اور گورنروں کی من مانیاں بھی بہت چلتی تھیں۔ ان میں کئی بڑے مغرور اور مفاد پرست تھے۔ لداخ میں کل ساٹھ کونسلیں تھیں ہر کونسل کی طرف سے جنرل کونسل کے لیے ایک نمائندہ نامزد کیا جاتا تھا یہ غنمی یا غنپو کہلاتے تھے۔ وزیر اعظم کے علاوہ کابینہ درجہ کے چار وزیر بھی تھے۔ وزیر اعظم کلون چھنپو کہلاتا تھا۔ جس سے منتخب کیا جاتا تھا یا وہ موروثی بھی ہوتا تھا۔ وزیر خزانہ کا عہدہ وزیر اعظم کے برابر مانا جاتا تھا۔ لداخ کے آخری خود مختار راجہ چھیپل تنڈوپ کے وزیر اعظم کلون چھوانگ تنڈوپ نے وزارت خزانہ کا قلمدان بھی خود ہی سنبھالا تھا۔ ان کے علاوہ اہم مفید داروں میں شقسپون (چیف جسٹس) مقسپون (فوج کا سربراہ) اور سوگم یا چھغزوت (چیف کسٹم آفیسر) تھے۔ کئی جرائم کے لیے موت کی سزا تھی۔ پوریگ میں قاتل مجرم کو مقتول کی لاش کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا اور چوبیس گھنٹے تنہا رکھ کر لاش سمیت دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ کئی جرائم میں ہاتھ کاٹے جاتے تھے بار بار جرم کرنے والے کو دریا میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ تبت میں ملزم کو گرم تیل کے برتن سے ہاتھ سے کسی آنچ کے بغیر سفید اور کالے پتھروں میں سے سفید پتھر نکالنا پڑتا تھا۔

لداخ اور مغل دربار کے مابین تعلقات کے بارے میں شیخ صاحب موصوف نے تحریر کیا ہے کہ لداخ پر مغلوں کی عمل داری تقریباً ایک صدی تک رہی تاہم عمل داری Physical تھی۔ مغلوں کا کوئی حاکم یا نمائندہ لداخ میں نہیں رہتا تھا۔ البتہ لداخی راجے مغلوں کے باج گزار تھے اور مغل حکومت کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے تھے۔ مغلوں کی عملی مداخلت کی شروعات جہانگیر بادشاہ (۱۶۰۵-۲۷) کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ شاہجہاں کے زمانے میں مغلوں کا اثر ونفوذ بڑھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں اس کی گرفت مضبوط ہوئی جب لداخ نے مغلوں کے اقتدار اعلیٰ کو من وعن قبول کیا۔ محمد شاہ کے بعد مغلیہ حکومت کو زوال آیا اور اس کے ساتھ ہی لداخ میں مغلوں کا اثر بھی ختم ہو گیا۔ کئی مورخوں نے مغلوں اور لداخیوں کے آپسی رابطوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں عبدالحمید لاہوری کا ''بادشاہ نامہ'' محمد اعظم کی ''تاریخِ کشمیر'' ذکاؤاللہ کی ''تاریخِ ہند''، حشمت اللہ خان لکھنوی کی ''تاریخ جموں وکشمیر اور لداخ اور بلتستان''، فرانکی کی ''دِی ہسٹری آف ویسٹرن تبت'' ''عالمگیر نامہ'' اور ''ماثر عالمگیری''

شامل ہیں۔ اگر مغل حکمران لداخ کی علاقائی سلامتی سے دلچسپی نہ رکھتے تو غالباً لداخ کی تاریخ آج مختلف ہوتی۔ مصنف نے بطریقِ احسن بتایا ہے کہ لداخ بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش کا گہوارہ رہا ہے۔ ساتویں صدی کے وسط سے نویں صدی کے آغاز تک لداخ سے گلگت تک کا پورا خطہ سمیت سینٹرل ایشیا چار قوموں چین کشمیر، تبت اور عربوں کی فوجیوں کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ ۱۹۴۷ء میں آزاد ہند سرکار نے سارے مسائل کا از سرِ نو جائزہ لیا اور ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ چین نے بھی اقتدار میں آنے کے بعد سرحدی معاہدے کانٹے سرے سے جائزہ لیا اور لداخ کی طرف سے یکطرفہ طور پیش قدمی کرکے اکسائی چین کے ایک بڑے حصے پر قابض ہوگیا۔ ۱۹۶۲ء میں ہند اور چین کے درمیانی سرحدی مسئلے پر لڑائی ہوئی۔ اس خطے میں تناؤ اور کھچاؤ ختم نہیں ہوا ہے۔"

لداخ کے لباس لداخی عورتیں نیلے، سُرخ، دھاری دار پیشواز پہنتی تھیں اور زیوارت میں لدی پھندی رہتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر انگریز مہم جو مور کرافٹ نے لکھا تھا۔ لداخی عورت اپنے پورے لباس میں یورپ کی کسی راجدھانی کی تمام فیشن پرست خواتین میں تہلکہ مچا سکتی ہے۔

لداخ کی دیواری تصاویر بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ مدن جیت سنگھ نے اپنی کتاب "ہمالین آرٹ" میں لکھا ہے۔ ہمالیائی آرٹ مجموعی طور مذہبی آرٹ ہے جو صدیوں پرانے تصورات لاموں کے عقائد اُن کے سرپرستوں اور مقامی لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ بودھ خانقاہیں، مورتیاں، تھنکے اور دیواری مصوری "Mural" کے لیے مشہور ہیں۔ گنپوں کے علاوہ ہر بودھ گھر کی عبادت گاہ کی دیواریں دھارمک تصویروں سے مزّین ہوتی ہیں۔ یہ رنگین تصاویر مذہبی نوعیت کی حامل ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے لیہہ کرگل اور دراس جیسے لداخ کے اہم مقامات سے متعلق بھی اچھی واقفیت فراہم کی ہے۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ "لیہہ اصل میں "لے" ہے اس کا لفظی مطلب نخلستان ہے۔ دلدلی زمین کے معنی میں بھی "لے" کا استعمال ہوتا ہے۔ لداخ جیسے اوسر اور چٹیل علاقے میں زمین کا ایک شاداب ٹکڑا ریگستان میں نخلستان ہے۔ اسی طرح کرگل کی وجہ تسمیہ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں گلگت سے تین بھائی بے سروسامانی کے عالم میں پوریگ ((علاقہ کرگل) آئے اُن کے نام تھے سمیان کرگی، برور اور پوئی، سمیان کرگی موجودہ کرگل کے مقام پر بس گئے اور اس کا نام کرگی رکھا۔

بعد میں کثرت استعمال سے یہ کرگل بن گیا۔ دراس کے ۷ ادیہات میں آٹھ ہزار کے قریب لوگ رہتے ہیں۔ ان موضعات میں دراس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ دراس کا ابتدائی نام ہیم بس تھا۔ یہ شینا لفظ ہینوبس ہے جس کا مطلب ''برف کا گھر'' ہے۔ یہاں کسی کسی سال پچیس تیس فٹ اونچی برف گرتی ہے۔ اور برف مکانوں کی چھتوں سے بلند ہوتی ہے۔'' لیہہ کرگل اور دراس کے علاوہ شیخ صاحب نے لداخ کے دیہات بھی اچھی طرح زیر بحث لاکر قارئین کی معلومات میں نمایاں اضافہ فرمایا ہے۔ لداخ میں مسلمانوں کی تاریخ قلمبند کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ''لیہہ ضلع میں بودھوں اور کرگل ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور دونوں مذاہب کے لوگوں کی آبادی لگ بھگ برابر ہے۔ لداخی مسلمان شعیہ، سُنی، نور بخشی اور اہل حدیث فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نسلی اور سماجی لحاظ سے لداخ میں مسلمان بلتی، پوریگیا، دردی اور آرغون قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیہہ ضلع میں لیہہ قصبہ کے علاوہ مسلمان ضلع کے ۲۵ گاؤں میں آباد ہیں۔ کرگل ضلع میں متعدد عالیشان امام باڑے ہیں جن کے سبز گنبد اور اونچے مینار اسلامی فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ بروخانقاہ یہاں کی مشہور خانقاہ اور مُرجع خاص وعام ہے۔ کاچو سکندر خان کے اندازے کے مطابق یہ سید محمد نور بخشی یا میر شمس الدین اعراقی کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔

لداخ کے سنتوں اور لاماؤں کے بارے میں بھی حتی المقدور جانکاری فراہم کی گئی ہے۔ مصنف کے مطابق لداخ یا لاماؤں کے دیش میں پانچ ہزار لاما موجود ہیں۔ یہ لداخ کے متعدد گنپوں میں اقامت کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ لامے ہمیں گنپہ سے وابستہ ہیں۔ لاما کا لفظی مطلب برتر یا اعلیٰ ہے۔ گنپہ کا لفظی مطلب مصنف نے ''تنہائی کی جگہ'' بتایا ہے۔ لداخ پر اکثر تبت کا اثر ہے۔ گنپہ مذہبی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور یاترا کے لیے متبرک تیرتھ ہے۔ لداخ میں سولہ بڑے گنپے ہیں جن میں سے لامایورو گنپہ، لیکر گنپہ ریزونگ گنپہ۔ ٹھسکے گنپہ، ہمیں گنپہ شے گنپہ ماٹھو گنپہ وغیرہ وغیرہ مشہور ہیں۔ عبدالغنی شیخ نے لکھا ہے کہ ۱۸۸۵ء میں لیہہ میں موراوین مشن کی شاخ قائم ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۸۸۶ء میں ایک خوبصورت گرجا گھر تعمیر ہوا۔ چند سال بعد لداخ کے دو دیہات شے اور خلسے میں بھی گرجے تعمیر کیے گئے۔ تبلیغی میدان میں اس مشنری کو لداخ میں معمولی کامیابی حاصل ہوئی تاہم علمی سائنسی اور تحقیقی میدانوں میں اس کے کارناموں اور خدمات کی صدائے بازگشت

آج بھی سُنائی دیتی ہے۔

لداخ میں تعلیم کی کہانی کو راجگان لداخ ڈوگرہ حکومت اور آزادی کے بعد کے تین ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور میں ہوئی تعلیمی پیش رفت کا حال ظاہر کیا گیا ہے۔ شیخ صاحب کے مطابق لداخ آج تعلیمی لحاظ سے ایک اہم دوراہے پر ہے۔ ایک طرف سکولوں کا جال بچھا ہے لیکن تعلیمی معیار کا مسئلہ ایک بڑا سوالیہ نشان بنا ہے۔ لداخ کے لوک گیتوں کی افادیت بیان کرتے ہوئے فاصل مصنف نے لکھا ہے کہ نثری ادب کے مقابلے میں لوک گیتوں کا سرمایہ بڑا زرخیز ہے۔ یہ گیت یہاں کے سماجی، سیاسی، تاریخی مذہبی اور تمدنی عوامل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک لداخی ادیب ٹشی رگبیس نے لداخ کے لوک گیتوں کی گیارہ قسمیں بیان کی ہیں تاہم بقول مصنف گیتوں کی قسمیں اِن سے کہیں زیادہ ہیں۔ کئی ملکی اور غیر ملکی قلمکاروں نے لداخی گیتوں اور نظموں کے انگریزی اور اُردو ترجمے کیے ہیں۔ شیخ صاحب کے مطابق ناچنا لداخ میں سماجی آداب اور لوازمات میں شمار ہوتا ہے اور اسے اپنانا باعث احترام تصور کیا جاتا ہے۔ لداخ میں تین قسموں کے ناچ ہیں۔ لوک ناچ دھارمک ناچ اور متفرق ناچ۔

عبدالغنی صاحب نے "لداخ میں اُردو" کے زیرِ عنوان بھی قابلِ قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُردو لداخ کی تہذیبی اور رابطے کی زبان ہے۔ یہاں مادری زبان کے بعد اُردو پڑھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ڈوگرہ حکومت نے ریاست میں اُردو کو سرکاری زبان بنانے سے دوسال پہلے لداخ کو فارسی زبان سے روشناس کیا۔ ۱۸۸۵ء میں عیسائی مشنری موراوین مشن نے لیہہ میں ایک سکول کھولا اور اُردو کی مقبولیت کے پیشِ نظر اُردو کو نصاب میں رکھا۔ آزادی کے بعد لداخ میں اُردو نے نمایاں ترقی کی۔ اُردو میں کتابیں لکھی گئیں اور اُردو قارئین کی تعداد ہزاروں تک پہنچی۔ آج لداخ میں ادبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی پر اُردو کا اثر ہے۔ لداخ میں اُردو قارئین ہزاروں ہیں لیکن لکھنے والے بہت کم ہیں۔ لیہہ اور کرگل کے ریڈیو اسٹیشنوں نے اُردو کے فروغ کیلئے اچھا کردار ادا کیا ہے۔ ان اسٹیشنوں سے اُردو میں وقتاً فوقتاً پروگرام نشر ہوتے ہیں ۱۹۳۰ء کی دہائی میں منشی عبدالستار نے اُردو میں لداخ کی تاریخ لکھی۔ یہ ریاست میں لکھی جانے والی اُردو کی پہلی تصنیفات میں سے ایک ہے۔ آزادی کے بعد کا چوسکندر خان کی "قدیم لداخ" لداخ اور بلتستان پر ایک مبسوط تصنیف ہے۔

بابو عبدالحمید نے اُردو اور انگریزی لغت مرتب کی ہے۔ عبدالغنی شیخ نے بذاتِ خود اُردو میں دو ناول، دو افسانوی مجموعے، ایک سوانح حیات اور دو تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔

شخصیات کے حصے میں لوڑا وار ینچن زنگپو، میر سید علی ہمدانیؒ فضل اللہ کشمیری، رسول گلوان، گیشے تنڈوپ، منشی عبدالستار، ایلی ایزر جولدن اور کاچو سکندر خان کا تعارف کتاب میں ۳۴۰ سے ۴۲۷ صفحات پر درج ہے۔ نامور مہم جو آرغون اور چین اور تبت میں برطانوی ہند کی ایک غیر معمولی مہم دو اچھے مضامین مہم جوئی کے ذیل میں شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری اور اہم حصے میں جنگلی جانوروں اور پرندوں سے متعلق دو معلومات سے پُر مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ لداخ کے پالتو جانور جہاں مقابلتاً کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جنگلی جانور بڑے جسیم اور قوی ہیکل ہیں۔ اب تک لداخ میں ۳۶۳ اقسام کے پرندوں کی شناخت ہوئی ہے۔ مقیم پرندے اور مہاجر پرندے لداخ میں پرندوں کے دوزمرے ہیں۔ لداخ کے دریاؤں میں کئی اقسام کی روپہلی اور سُنہری مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ کہیں کہیں اُود بلاؤ بھی پایا جاتا ہے شیخ عبدالغنی کی کتاب میں کچھ نادر تصویریں بھی شامل ہیں جن سے لداخ کی تہذیب وثقافت کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے۔ اس کتاب کو تصنیف کرنے کے لیے مصنف نے دردر کی خاک چھانی ہے اور سینکڑوں کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شیخ صاحب کا طرزِ تحریر بہت دلکش و مرغوب ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب لداخ پر لکھی گئی تمام اُردو کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس کو پڑھنے کے لیے قارئین کو اپنا تھوڑا وقت نکالنا چاہئے اور اس کوہستانی محقق کے بلند حوصلوں کی داد دینا ہوگی۔ ''لداخ۔ تہذیب وثقافت'' بلاشبہ ایک اہم معلوماتی کارنامہ ہے۔

......●●●......

☆......بلراج بخشی

عبدالغنی شیخ کا افسانوی انفراد

ترقی پسندی کے دور میں شعروادب کا ایک ہی ہدف رہ گیا تھا: روٹی۔ 1917 کے انقلاب روس نے ہندوستانی دانشوران و مفکرین کو نیند سے جگانے کا کام کیا تو معاشرتی پسماندگی وطبقہ بندی، زیردستوں پر زبردستوں کا جبر، خواتین، محروم روابط اور نارسا طبقے کے سروکاروں کو کم ازکم اردو ادب میں پہلی بار مخاطب کیا گیا۔ یہ ایک ارفع مقصد تھا۔ حالانکہ ان موضوعات پر اچھا ادب بھی تخلیق کیا گیا مگر زیادہ تر اسی حقیقت کا اعادہ ہوا کہ اچھا مقصد یا ارفع معاشرتی سروکار صحافیانہ رپورتاژ تو لکھوا سکتا ہے پر اچھا ادب نہیں۔ اخبار کی سرخیوں سے متاثر ہوکر صارفی سطحوں پر کسی نہ کسی نظریے کی حمایت یا مخالفت میں مغلوب الغضب اشتہاری ادب تو مینوفیکچر کیا جاسکتا ہے پر ادب کی تخلیق نہیں کی جاسکتی۔

ایک مساوات آگیں معاشرے کا قیام ہی ترقی پسندوں کا نصب العین تھا اور یہ ارفع تر مقصد بھی ان سے بڑا ادب اگر نہیں لکھوا سکا تو بھی یہ اعتراف ناگزیر ہے کہ اس دور میں اگر بہترین افسانے لکھے گئے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ افسانے کے فن سے واقف تھے اور زبان و بیان کی گلکاری اور سحرانگیز انداز بیان کے ساتھ وہ لوگ واقعات کی بُنت اس طرح کرتے کہ قاری ان کی انگلی پکڑ کر بلا مزاحمت چل پڑتا تھا۔

بعد میں کافکا، سارتر، جیمس جوائس وغیرہ نے جن معاشی، صنعتی اور صارفی ناگزیریات کے تحت جدیدیت کی جانب اشارہ کیا تھا، برصغیر میں تو ان حالات وواقعات کا عشرِ عشیر بھی موجود نہیں تھا۔

لہٰذا آج اس تلخ صداقت کو تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ ہونا چاہیے کہ ساٹھ کی دہائی میں اگر چھٹ بھیوں نے جدیدیت کا غوغا بلند کیا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ ترقی پسندوں کی دیوقد صلاحیتوں سے خوفزدہ تھے اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ جدیدیت کی لایعنیت کا تاج محل کھڑا کر کے ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھوکیں۔ اس طرح جدیدیت کی تیرہ بختی نے تقریباً نصف صدی کا ادب نگل لیا اور آج حالت یہ ہے کہ معاصر سیاسی اور معاشرتی محاذ آرائیوں کی صحافیانہ ترجمانی شعروادب کی معراج قرار پاگئی ہے اور اخباروں کی سرخیوں کو موضوع ادب بنایا جارہا ہے۔

لیکن اچھا افسانہ وہی ہوتا ہے کہ جس کا کوئی طے شدہ ایجنڈا نہ ہو۔ مگر عصرِ حاضر میں قبیلیائی، گروہی، علاقائی، لسانی اور کئی قسم کے سروکار اس شدت کے ساتھ سامنے آکر افسانہ نگار کو اس جانب یا اس جانب ہو کر کسی نہ کسی نظریے کی حمایت میں قلم کو لٹھ کی طرح لے کر کھڑا ہونے کے لئے مجبور کررہے ہیں اور ادیب کو اصلاح کار کا کردار اپنانے کی انگیخت کر رہے ہیں۔

عبدالغنی شیخ اردو افسانے کا ایک معروف نام ہیں اور ان کے افسانوں سے صاف عیاں ہے کہ وہ کوئی اِزم یا کسی خاص برانڈ کا چُورن نہیں بیچ رہے ہیں۔ نہ ہی وہ تختۂ اشتہار بنے ہوئے ہیں بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہانی اور صرف کہانی سنا رہے ہیں۔

'ایک فوٹو' میں پوسٹ کارڈ سائز کا ایک فوٹو اس خاندان میں پانچ پشتوں سے موجود ہے۔ جیسے جیسے بیانیہ آگے بڑھتا ہے تو رفتہ رفتہ سب کی کہانیاں آشکار ہونے لگتی ہیں۔ لداخ کا کلچر اور تاریخ بھی سامنے آنے لگتی ہے۔ اس زمانے میں ایک tripod پر بڑا سا کیمرہ رکھ کر فوٹوگرافر کیمرے کی پشت پر جاکر کیمرے سے جڑا ہوا، ایک بڑا سا سیاہ کپڑا اپنے اوپر کھینچ کر فوکس ایڈجسٹ کرتے ہوئے بڑا پراسرار لگتا تھا اور بڑی دیر کے بعد اس کی آواز آتی تھی 'ریڈی'۔ آج کی نسل نے تو اس کیمرے کو دیکھنا کیا اس کے بارے میں سنا بھی نہ ہوگا۔ کہانی میں اس دور کی عوامی، گھریلو، معاشرتی زندگی کی بہت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ سارے واقعات اور تفصیلات آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگتی ہیں۔ لہجہ انتہائی بے تکلفانہ ہے۔ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ کسی نے اپنے ہی خاندان کی کہانی نہایت دلچسپ پیرائے میں لکھ دی ہے۔ کہانی کے آخر میں چھیاسی سالہ ایلی ایزر کی موت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ

اچھا، یہ تو کہانی تھی۔ واہ واہ۔ 'ایک فوٹو' یقیناً کامیاب کہانی ہے۔

عبدالغنی قاری کا نباض ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قاری کی دکھتی رگ کہاں ہے۔ 'گمشدہ' میں ندیم کی گمشدگی کی وضاحت نہیں کی گئی مگر کہانی آخر میں رلا دیتی ہے۔ 'برتھ ڈے' پڑھ کر او ہنری کا طرزِ تحریر یاد آگیا۔ 'اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد' نہایت دلچسپ پیرائے میں طنز ہے۔ مکالمے معیاری طنز کے حامل اور برجستہ ہیں۔ آخری جملہ اسے کہانی بنا دیتا ہے۔ واہ۔

لیکن 'ہوا' ان کی بہترین کہانیوں میں شمار ہوگی۔ یہ کہانی انہیں افسانہ نگار کے طور پر اسٹیبلش کرتی ہے۔ آخری پیراگراف میں انجام اتنا غیر متوقع ہے کہ حیرت سے منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے اور قاری کو بھی واقعتاً وہ 'ہوا کا دلکش جھونکا' محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ کہانی ثابت کرتی ہے کہ عبدالغنی شیخ پراپیگنڈسٹ نہیں بلکہ افسانہ نگار ہیں۔

'مسکراہٹ' میں قاری بھی جیپ کے ساتھ ساتھ سفر کرنے لگتا ہے۔ منظر کشی اتنی فوٹوگرافک ہے کہ کمزور پُل، اوبڑ کھابڑ راستہ اور کولتار کی سڑک آنکھوں کو نہ صرف اصالتاً دکھائی دینے لگتے ہیں بلکہ قاری کو ہچکولے بھی لگتے محسوس ہوتے ہیں۔ بیان میں اتنی چابکدستی ہے کہ کسی بھی لفظ کو قلم زد کرنے کی لگژری نہیں لی جاسکتی۔ 'مسکراہٹ' اس مجموعے کی انتہائی معصوم کہانی ہے، بالکل صنم کی معصوم خواہش کی طرح۔

عبدالغنی شیخ کے موضوعات بڑے نہیں ہیں لیکن ان کی کہانیاں بڑی اور مکمل ہوتی ہیں۔ وہ معاشرے کے مسائل حل نہیں کرتے بلکہ ان کئی کہانیوں کا کینوس عام آدمی کے فطری mileu میں اس کی سرگرمیوں پر محیط ہے۔ اسی لئے ان کے افسانوں کے کردار و واقعات ہماری اردگرد کی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ وہ ایک keen observer ہیں۔ 'دل ہی تو ہے' میں معمولی کہاسنی پر بیوی میکے چلی جاتی ہے۔ گھروں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر عموماً جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مہینہ گزر جاتا ہے پر دونوں اپنی اپنی جگہوں پر اڑے ہیں۔ پھر شیخ صاحب sequence of events اس طرح بُنتے ہیں کہ بیوی غیر محسوس طریقے پر واپس آجاتی ہے اور کسی کو بھی ہزیمت نہیں اٹھانا پڑتی۔ اسی طرح 'رشتے ناطے' ایک عام سی بات تھی۔ جب تک چچی نیماں سے لوگوں کو امیدیں وابستہ تھیں سب اس کے آس پاس منڈلاتے رہے اور جب یقین ہوگیا کہ اب اس سے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں تو زمانے کی نیرنگی

دیکھیے کہ جاتے وقت کوئی اسے الوداع کہنے بھی نہیں آتا۔ اس میں کچھ بھی نئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دیکھی بھالی سچویشن ہے۔ لیکن عبدالغنی کے جادوگرانہ لمس نے اس معمولی سچویشن کو اچھی کہانی بنا دیا۔ یہ کمال کی مشاقی ہے۔

شیخ صاحب بہت معمولی باتوں کو کہانی بنا دیتے ہیں۔ 'آزمائش' اچھی کہانی ہے۔ ایک بے اولاد جوڑے کی بچے کو اغوا اور پھر اسے واپس کرنے کے لئے واقعات کی دروبست ٹچنگ ہے۔ اس معمولی سی بات کو کہانی وہی بنا سکتا ہے جو فن کی ریاضت کے مراحل سے کامیابی کے ساتھ گزر گیا ہو اور شیخ صاحب ایسا ہی افسانہ نگار ہے۔ وہ ایک سنجیدہ کہانی کار ہیں لیکن روزمرہ کی عصری سیاسی بدعنوانیوں اور شعبدہ بازیوں سے وہ جھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً 'کھودا پہاڑ نکلا چوہا' اور 'ایک انار'۔

اصل میں ادب اپنی جانب سے قلمکار پر اصلاح معاشرہ کی کوئی ذمے داری عاید نہیں کرتا بلکہ قلم کار اپنے ہی زعم میں از خود یہ ذمے داری قبول کر لیتا ہے۔ لیکن شیخ خواہ مخواہ مصلح قوم نہیں بن جاتے اور نہ ہی وہ رضاکارانہ طور پر معاشرے کو بدلنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی کچھ کہانیوں میں وہ مقام بھی آیا جب میں خوفزدہ ہو گیا کہ اب شیخ صاحب مصلح قوم بن جائیں گے مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے کسی بھی مسئلے، کشاکش یا طبقاتی اور قبیلیائی آویزش کا بے محابہ اور یقینی حل پیش کرنے کا دعویٰ یا کوشش نہیں کی اور اس طرح ادبی کثافت سے صاف بچتے بچاتے نکل گئے۔ انہوں نے کئی مقامات پر ثابت کیا کہ بہ حیثیت افسانہ نگار وہ اپنی ذمے داریوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ دراصل افسانے کے حوالے سے شیخ صاحب کی ترجیحات بالکل واضح ہیں اور ان کی یہی روش ان کی روشن فکری اور صحتمند ادبی رجحان انہیں افسانہ نگاروں کی فہرست میں منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ اپنے افسانوں میں شیخ صاحب کوئی ماورائے ارضی دنیا خلق نہیں کرتے بلکہ ان کے افسانوں کی فضا قرب وجوار کا منظر نامہ انتہائی نظر آشنا اور مانوس ہے مگر وہ کہیں بھی افسانے اور قاری کے درمیان کھڑے ہو کر تقریر کرتے نظر نہیں آتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا افسانہ ژولیدہ فکری اور معاشراتی جبر کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ذہن و دل پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً 'جینی' میں تو انہوں نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا کہ اب اپنی مشرقی اقدار کو اعلیٰ ترین ثابت کرنے کے لئے وہ جینی کو ضرور کسی سچویشن میں پھنسا کر اس کی

مغربیت کی تذلیل و تضحیک کریں گے اور قاری کو خواہ مخواہ ان کی تقریر ہضم کرنا پڑے گی، مگر شیخ صاحب افسانے کی مبادیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ان کی وسیع القلبی کے پیشِ نظر ان کی فنی ترجیحات کی ترتیب ہی ایسی ہے کہ وہ مشرقیت کو سرسری انداز میں اعلیٰ ثابت کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور بڑے منصفانہ طور پر مشرقی اقدار کے وارثان، چاہے وہ مالا پھیرتے ہوئے زیادہ دام وصول کرنے والا دکاندار تھا یا مشرقی اقدار میں ڈوبی ہوئی لیکن لالچ سے بھری ہوئی راحیلہ، کو قدم قدم پر موردِ الزام ٹھہرانے سے نہیں ہچکچاتے۔

زندگی، ہیرو، راشن کارڈ، راز دل، مجھے یہ آدمی نہیں چاہیے، یادیں، مظلوم، نام اچھی کہانیاں ہیں۔ان افسانوں میں تقسیمِ وطن کی دردناک بازگشت نظر آتی ہے۔ خاندان، افراد، حادثاتی طور پر تقسیم ہو کر حد متارکہ کے اس پار یا اس پار رہ جاتے ہیں اور رشتوں میں تلخیاں، حسرتیں، جدائیاں بیان کرتے ہوئے شیخ صاحب بے ساختہ ہی ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ صاف لگتا ہے کہ یہ مناظر نہ صرف شیخ صاحب نے خود دیکھے ہیں بلکہ قلبی سطح پر شدت سے محسوس بھی کیے ہیں۔

اس سطح اور معیار کی کہانیاں لکھی ہی نہیں جاسکتیں اگر مصنف کو زبان پر عبور حاصل نہ ہو۔وہ لفظوں کے استعمال میں انتہائی محتاط ہیں اور کفایتِ شعاری برتتے ہیں۔ان کے تحریر کردہ کسی لفظ یا جملے کو نکالا نہیں جاسکتا کیوں کہ تحریر میں کوئی لفظ زاید نہیں ہوتا اور تمام الفاظ کی دروبست مناسب ہوتی ہے۔ ان کے طرزِ تحریر میں سہل انگاری ہے اور الفاظ کا انتخاب قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ الفاظ کا خلاقانہ استعمال نہایت سلجھے ہوئے انداز میں کرتے ہیں۔ مثلاً صفحہ 77 پر ’...... پہاڑی کے دامن میں دو سیاہ نقطے نمودار ہوئے۔ نقطے بڑے ہوتے گئے......‘۔

لیکن کہیں کہیں وہ مشکل زبان برت جاتے ہیں۔ مثلاً ’آزمائش‘ میں ریلوے کمپارٹمنٹ میں مفت اخبار پڑھنے والا ایک مسافر کہتا ہے ’......تب سے بچے کی ماں اپنا توازن کھو بیٹھی ہے......‘۔ یقین نہیں ہوتا کہ مفت اخبار پڑھنے والا لفظ ’توازن‘ کو برتنے کے اہل ہو سکتا ہے۔

اسی طرح ’رازِ دل‘ (صفحہ 25) پر چودھری کہتا ہے ’......ولدیت کا ذکر کر کے اس کو آزردہ نہ کردے......‘۔ عام انسان لفظ ’آزردہ‘ استعمال نہیں کرتا۔

کہانیوں کی زبان میں جگہ جگہ کشمیری ٹچ آ گیا ہے، جو بھلا نہیں لگتا۔

صفحہ 12 پر '......غریب کو چھ جوان لڑکیاں تھیں......'۔ 'غریب کو' کی جگہ غریب کی یا غریب کے ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ 23 پر '......ونود نے اڑتی سی خبر سنی تھی کہ پونیت نے ریتا کے ساتھ بالادستی کی تھی......'۔ میرے خیال سے 'بالادستی' کے بجائے 'زبردستی' زیادہ مناسب رہتا۔ صفحہ 47 پر '......مجھے ٹائمز آف انڈیا اور ایک مقامی اخبار چھوڑا کرے......'۔ 'چھوڑا کرنے کے بجائے دیا کرے یا دے جایا کرے درست ہے۔ صفحہ 50: '......وہ ہمیں سیب لایا تھا......' کے بجائے '......وہ ہمارے لئے سیب لایا تھا......' درست ہے۔ کہانی گمشدہ میں (صفحہ 67) '......پچھلی عید پر اس کو مارکیٹ لیا تھا......'، کی جگہ '......مارکیٹ لے گئے تھے......' یا '......مارکیٹ میں لے گئے تھے......' درست ہوتا۔ صفحہ 87 '......جہاں میں نے پانچویں جماعت تک پڑھی تھی......' کی جگہ '......پڑھائی کی تھی......' ٹھیک ہوتا۔ صفحہ 156 پر '......میں کچھ کپڑے دُھلوانے چاہتی ہوں......' میں دھلوانے کی جگہ دھلوانا ہونا چاہیے۔ اسی صفحہ پر '......ایک روز جینی قالین خرید کر لایا......' میں لایا کی جگہ لائی ہونا چاہیے۔ اسی طرح صفحات 116,121,172,219, 309, 312 وغیرہ وغیرہ کشمیری ٹچ دکھائی دیتا ہے۔ مگر ہوسکتا ہے یہ کمپوزر کی عنایات ہوں۔

کہانی سننا اور سنانا انسان کا قدیم ترین مشغلہ ہے۔ عہدِ قدیم کی قصہ گوئی اور آج کے افسانے میں کوئی فرق نہیں۔ پہلے قصہ بیان کیا جاتا تھا مگر چھاپہ خانہ وجود میں آجانے سے پڑھنے کی روایت بن گئی۔ جدید افسانہ اسی روایت کی توسیع ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کا ہر شخص کہانی کہتا ہے اور کہانی سنتا ہے۔ ہر صبح جب ہر شخص تلاش معاش میں دہلیز سے باہر جاتا ہے تو دن بھر مختلف معاشرتی اور جذباتی تغیرات، واقعات اور تجربات سے دوچار ہوتا ہے اور گھر واپس آکر اپنے اقربا سے اپنے تجربات شیئر کرتا ہے۔ یہ تجربہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کوئی واقعہ، کوئی کردار، کوئی خیال، کوئی ڈر، کوئی جذباتی کیفیت، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ افسانے کے موضوعات کی فہرست بندی نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے ایک اچھا افسانہ نگار ہونے کے ناطے عبدالغنی شیخ بھی قاری سے اپنے تجربات صرف شیئر کرتے ہیں، کوئی پیغام نہیں دیتے اور اسی لئے ان کا انداز والہانہ اور تصنع سے عاری ہے۔

دراصل بڑا موضوع بڑا ادب نہیں بناتا۔ عالمگیر مسائل کے تذکرہ سے بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جاسکتا۔ شیخ صاحب کے موضوعات بھی بڑے نہیں ہیں بلکہ عام زندگی سے ماخوذ ہیں۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ عالمی کشاکش، تہذیبی پنجہ کشی اور عصری معاشرتی صف بندیاں انسانی زندگی کی بوقلمونی کی حیثیت سے تو افسانوں کا موضوع بن سکتی ہیں لیکن کسی بھی قسم کے نظریے کی حمایت یا مخالفت ادب کا موضوع نہیں بن سکتی۔ دراصل لاتعداد چھوٹی چھوٹی متنوع جزئیات جن سے زندگی مملو ہے اگر ادب میں نظر آجائیں جو قاری کا مانوس منظر نامہ ہیں اور قاری خود کو ان سے ہم آہنگ کر کے اگر ان کے ہمراہ ہولے تو وہ یکسر الگ پہلو ہے۔ عبدالغنی شیخ کا نظریۂ ادب عالمی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی افسانوں کے واقعات کا منظر نامہ مانوس لگتا ہے لیکن فن کسی تھانے کا روزنامچہ نہیں ہے اور فن پارہ حقیقی واقعات کا محض رپورتاژ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان حقیقی واقعات میں جب نہ صرف امکانات بلکہ ناامکانات اور غیر ممکن ممکنات بھی در آتے ہیں تو قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور راست اندازی، عشقیہ واردات، جنسی کشش، نیکی بدی، جذباتی پاکیزگی، ہمدردی، خلوص، عقیدت وغیرہ کی اعلیٰ صداقتوں کی تجدید از خود ہوتی رہتی اور اس کے لئے فن کار کو شعوری تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ دراصل افسانہ فروعیات کی آلائشوں سے مبرا ہونا چاہیے۔ افسانے کی کامیابی اسی میں مضمر ہوتی ہے کہ افسانہ ختم ہونے کے مقام پر آجائے اور قاری کے دل میں تجسس اور تحیر برقرار رہے کہ بھائی جو بھی ہونا ہے آخر کب ہوگا۔ عبدالغنی شیخ بڑی مشاقی سے یہ تجسس برقرار رکھتے ہیں، اختتام تک انجام آشکار نہیں ہوتا اور آخری سطروں میں قاری حیرت و استعجاب کا شکار ہو کر غیر متوقع طور پر چونک جاتا ہے۔ ان کے افسانوں سے عیاں ہے کہ غنی شیخ کا زندگی اور ادب کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کی فنی بصیرت کا قائل ہوئے بنا نہیں رہا جاسکتا۔

وہ غیر شعوری طور پر عصری سیاسی و معاشرتی مسائل کے صحافیانہ سدباب اور اپنے ایقان کی قربان گاہ پر شعوری اور ارادی طور پر کہانی کے فن کو قربان نہیں کرتے۔ بطور فنکار عبدالغنی شیخ اپنے عصر سے بے خبر نہیں ہیں۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اپنے معاشرے کے سروکاروں اور ان کے انسلاکات سے متاثر ہوتے ہیں اور دوسروں کے مقابلتاً زیادہ حساسیت کے ساتھ۔ لیکن وہ بھیڑ کی طرح فوری طور پر مشتعل ہو کر خشت باری نہیں کرتے اور نہ ہی دیوانہ وار رقص کر کے اظہار مسرت کرتے ہیں۔ بلکہ وہ

غیر شعوری طور پر کسی حادثے یا واقعے کو چک و ترمیم کے طویل عمل سے گزار کر اس کی قلب ماہیت کرتے ہیں اور تب جا کر ان کا کوئی تجربہ تخلیق کی صورت میں ڈھلتا ہے۔ فن اور طباخی میں یہی فرق ہے اور عبد الغنی شیخ اس فرق سے کما حقہ طور پر واقف ہیں۔

کہانی کو طوائف کی طرح سجانے سنوارنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ وہ اپنی تمام تر عریاں کراہتوں کے ساتھ مزید خوبصورت نظر آتی ہے۔ زندگی کو کرشن چندر کی طرح سنوارنے کی ضرورت نہیں بلکہ منٹو اور بیدی کی طرح زندگی کی مسخ شدہ شکل میں زیادہ پرکشش نظر آتی ہے۔ معاشرے کی اصلاح کا کام حالی، سرسید احمد خان اور اکبر الہ آبادی پر چھوڑ دیا جائے تو کہانی کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

'دو ملک ایک کہانی' کے افسانوں کو میں نے فنی سطح پر انجوائے کیا ہے۔

☆......شبیر احمد شبیر

اسلام اور سائنس
عبدالغنی شیخ کا تالیفی کارنامہ

عبدالغنی شیخ کی تصنیفی اور تالیفی صلاحیتوں کا ذکر کرتے وقت لازم ہے کہ تصنیف اور تالیف میں فرق کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ تصنیف اور تالیف علمِ ادب کی دو مستقل اور معروف اصطلاحیں ہیں۔ بادیٔ النظر اور عام مفہوم میں اِن دو اَدبی اصطلاحات میں ترادُف اور معنوی ہم آہنگی کا گُماں گزرتا ہے۔ لیکن تفکرانہ سوچ سے ان کی جُداگانہ معنویت نمایاں ہو جاتی ہے۔ تصنیف و تالیف کی اِس جُداگانہ معنویت کا اظہار کرتے ہوئے لغت شِناس علماء لکھتے ہیں:

"اَنّ التّصنیفَ هُوَ مِنَّ العَمَلِیاتِ الذّهنیةِ الّتی تساعدُ الانسان عَلَی التّعرف علیٰ صُوَرِ الاَشیاء اَوِ المفاهیم العقلیة. وَ امّا التّالّیف. هُوَ تجمیع الکلام مِن هُنا وَ هُنا."

ترجمہ: تصنیف ذہن سے اُبھرنے والے اُن خیالات کی تحریری صورت کا نام ہے جن کے عرفان کے تئیں عقل و فہم کی معاونت بھی شامل ہو۔ جبکہ تالیف سے مراد یہاں وہاں سے اِکھٹے کی جانے والی معلومات کا قرطاسی مجموعہ ہے۔

فارسی ادب اور لغت شناسوں نے تصنیف و تالیف کا اِخفائی معنوی فرق قدرے تفصیل سے یوں عبارت کیا ہے:

''فرق بین تصنیف وتالیف ایں است کہ تالیف کتابی است کہ فقط مولف

آں مُطالبی از مواضعِ متفرقہ در آں جمع کند واز خود تحقیقات و مطالبِ علمی نداشتہ

باشد، وتصنیف آن است کہِ فراہم کُنندہ از خود مطالِب علمی وتحقیقات وَ نتیج افکار و

معلوماتِ خود در ادر آں بیاورد۔ ازیں جہت گویند ''مَن اَلَّفَ فَقَدِ استُھدَف.''

ترجمہ: تصنیف وتالیف میں واضح فرق یہ ہے کہ تالیف اُس تحریر (کتاب) کو کہا جاتا ہے جس میں درج موضوعاتِ علمی مولف نے مختلف ماخذوں سے اکھٹے کئے ہوں اور خود اِس جمع کردہ مطالب وتحقیقات کے بارے میں اُس کی کوئی شناسائی نہ ہو۔ جبکہ تصنیف اُس کتاب کا نام ہے جس میں تحریر شدہ علمی اور تحقیقی مواد اور اُن سے پیوستہ نتائج وافکار مصنف کے ذاتی خیالات کی سوغات ہو۔ اِسی تناظر میں کہا گیا ہے کہ جس نے تالیف کی اُس کی کاوشیں مُراد پا گئیں۔''

ادب اور لغت شناسوں نے تصنیف کی نسبت تالیف کو عمومی درجے کا حامل گردانا ہے۔ چنانچہ ادبی تحریرات میں مرقوم ہے: ''اِنَّ التَالیفَ اَعَمُّ مِنَ التّصنیف۔'' یعنی تالیف تصنیف سے معموم ہے۔ تالیف کی یہ عمومیت شاید اس عِلّت سے عبارت ہو کہ تالیف کی وساطت سے علم اور اِس سے پیوستہ کارآمد تحقیق کا وافر ذخیرہ اُن عام لوگوں تک بھی پہنچتا ہے جن کو اس ذخیرے تک پہنچنے میں کئی ناپدید وجوہات کی آڑ سے سابقہ پڑتا ہے۔

تصنیفی اور تالیفی تفاوت کے تعلق سے یہ اجمالی اور مختصر سی تمہید باندھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ عبدالغنی شیخ کی ادیبانہ صلاحیت جانچنے اور اُجاگر کرنے کے لئے میرے سامنے اُن کا ایک تالیفی نسخہ ہے۔ شیخ صاحب کے اِس تالیفی نسخے کا نام ہے ''اسلام اور سائنس''۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ عبدالغنی شیخ صاحب نے اس تالیفی نسخے میں سائنسی دریافتوں اور انکشافات کا تذکرہ کرکے اُن کی اساسیت کی تفصیل اور اِس تفصیل کے بارے میں فکر وعمل کے ترغیبی اِشارے قرآنی آیات اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے متون ومضامین میں پہلے ہی سے موجود ہونے کے اسرار عیاں کئے ہیں۔ اِس ضمن میں شیخ صاحب نے مختلف ماخذ اور منابع سے سُودمند معلومات جمع کرکے اُن کی توضیح و تشریح کرکے اپنے مخصوص اور امتیازی ادیبانہ طرزِ نگارشی طرز سے کی ہے۔ اس تالیفی اجتماع کے ماخذ

اور منابع کا تذکرہ کرتے ہوئے تالیف کے پیش لفظ میں مولّف عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:

''کتابی صورت دینے سے پہلے سائنس اور اسلام اور اس سے وابستہ موضوعات پر مزید کتابیں میرے مطالعہ میں آئیں۔ ان کی تلخیص کتابِ ہذا میں پیش کی گئی ہے۔ اِن کتابوں میں 'سنت نبویؐ اور جدید سائنس' مطبوعہ پاکستان اور تُرکی کے عالم ہارون یحیٰ کی تصنیف Tell Me About the Creator اور میرے دو مطبوعہ مضامین ''اسلام اور ماحولیات'' اور ''اسلام اور علم'' شامل ہیں۔''

مذہبی موضوعات اور سائنس کی مماثلت اور مصالحت کے بارے میں سوچ اور خیالاتی اختلاف کی صورت میں مدّتِ مدید سے بحث جاری ہے۔ اس طویل بحث و تمحیص کی بنیاد سائنس کا دریافتی اور انکشافی عمل شروع ہونے کے ساتھ ہی پڑی۔ وقتی ارتقا کے ساتھ اِس بحث و تمحیص نے نت نئی وضعیں بدلیں۔ ایسی ہر بدلنے والی وضع سے نئی نئی معلومات نے اظہار پایا۔ چنانچہ ان معلومات کا احاطہ کرنے کے تئیں تصانیف و تالیفات کا انبار لگ گیا۔ بے شمار رسائل و جراید منظرِ عام پر آ گئے جن میں سائنسی دریافتوں اور آئے دِن کے انکشافات کو مذہبی کتابوں کے متون اور مضامین کے سیاق و سباق سے اخذ ہونے والے ترغیبی اشاروں کی مماثلت میں جانچا جانے لگا۔ سائنسی دریافتوں اور محیر العقول انکشافات کے تئیں غور و فکر سے متعلق مذہبی کتابوں میں مُضمر ترغیبی اشاروں کی اہمیت و افادیت اِس حد تک عیاں ہوگئی کہ مشہور سائنس دان البرٹ آئین سٹائین (Albert Einstein) کو بھی کہنا پڑا کہ:

"Science without religion is lame, religion without science is blind."

مذہبی کتب میں سائنسی دریافتوں اور حیران کُن انکشافات کے تئیں غور و فکر کے ترغیبی اشاروں کے تناظر میں مذہب اور سائنس میں مماثلت کے تعلق سے لوگ دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقے نے سائنس کو جُزوی تحقیق کا وسیلہ مانتے ہوئے بھی مجموعی سطح پر ظنّی علم قرار دیا۔ اپنے اس خیال کی بنا پر اس طبقے نے سائنسی قیاسات اور مفروضات کو غیر واضح اور غیر حتمی مانتے ہوئے مذہب سے مُتصادِم قرار دیا۔ اس تعلق سے رُوس کیتھولک اور اُس دور کے سائنس دانوں کا اختلاف واضح دلیل ہے۔ اس اختلاف کی پاداش میں گلیلو نامی اِٹلی نژاد سائنس دان کو بھی سائنسی خیالات کی پاداش میں برسوں بلکہ زندگی کے آخری مرحلے تک عتاب سہنا پڑا۔ سائنس کے مفروضات و قیاسات کو غیر یقینی ماننے والے

طبقے کا یہ خیال بھی بحث وتمحیص کا حصہ رہا کہ وقت یا گردش کے استقبالی تحقیقی عمل میں یہ مفروضات اور قیاسات یا تو تبدیل ہوتے ہیں سرے ہی سے غلط ثابت ہو کر سائنسی مشاہدات وانکشافات کا نیا پہلو آشکار کرتا ہے۔

سائنسی اور مذہبی مماثلت کے بارے میں لوگوں کا ایک اور طبقہ اعتدالی روش کا حامل رہا۔ اس طبقے نے قیاسات ومفروضات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے تجربات کی صورت میں ثابت ہونے والے سائنسی انکشافات اور دریافتوں کو یقینی اور حتمی گردانتے ہوئے ان دریافتوں اور انکشافات کو مذہبی کتابوں کے اُن لطیف اشاروں پر غور وخوض کیا جن میں رُموزِ کائنات کے تیئں تحقیق کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس طرح مذہبی علوم میں سائنسی دریافتوں اور انکشافات کے ترغیبی اِشارے بھانپنے کے تعلق سے ایک لمبا سلسلہ چل پڑا۔

''اِسلام اور سائنس'' نامی زیرِ تبصرہ تالیف کے مولف عبدالغنی شیخ صاحب اعتدال کی روش اپنانے والے لوگوں کے اِسی دوسرے طبقے کے ہم خیال ہیں۔ خیالات کے اس ہم آہنگی کا تذکرہ اپنی تالیف کے پیش لفظ میں شیخ صاحب کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

> ''قرآنِ مجید کے ارشادات اور سائنس کے دریافتوں میں مماثلت کا جب حوالہ دیا جاتا ہے تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ قرآن کو سائنس کا پابند اور تابع نہیں ہونا چاہئیے کیونکہ قرآن کی تعلیمات ابدی ہیں، جبکہ سائنس کی تحقیق وقتی ہوتی ہے اور اس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ بات صحیح ہے قرآن وسنت سائنس کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ سائنسی تحقیق کے بہت سارے نتائج حرفِ آخر نہیں ہوتے۔ لیکن اِس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سائنسی تحقیق کے مُسلمہ دریافتیں بھی ہیں جن کو دُنیا میں صدیوں یا برسوں سے قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔ جیسے ستاروں اور سیاروں کا گردش کرنا، سیاروں کی بیضوی یا گول شکل کا ہونا وغیرہ۔''

قرآن نے سوا چودہ سو سال پہلے کہا تھا: ''ثُم استویٰ اِلَی السَّماءِ وِ ھِیَ دُخان'' یعنی

پھر وہ (اللہ) آسمان کی طرف متوجہ ہوا، جو اُس وقت محض دھواں تھا۔

آسمان کو بنیاد بنا کر اس آیت مبارکہ سے استدلال کرتے ہوئے شیخ صاحب نے لامحدود اور وسیع کائنات کی نشاۃِ اوّل (پہلی پیدائش) کا تذکرہ کر کے جس مفکرانہ انداز سے سائنس کے بگ بینگ (Big Bang) یا عظیم دھماکے سے ربط دیا ہے۔ اُس میں اُن کی فہم و فراست کی جوت جھلملاتی ہے۔ اس مبارک آیت کے متن سے بگ بینگ کے حوالے سے شیخ صاحب سورۂ انبیاء کی آیت کا مقدس متن جوڑ کر سائنس کی اس دریافت کو قرآنی پیش گوئی سے مماثل کرتے ہوئے اِسلام کی حقانیت آشکار کرتے ہیں۔ سورۂ انبیاء کی وہ مبارک آیت ہے: "اَوَلَمْ یَرَ الَّذِین کَفَرُوْا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتقاً فَفَتَقْنٰھُما" یعنی کیا منکر لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان کو جُدا کیا۔ اِن آیات کے تفہیمی خلاصے کو سائنسی دریافت بگ بینگ (Big Bang) کے تئیں قرآنِ کریم کی معجزانہ پیش گوئی ثابت کرتے ہوئے عبدالغنی شیخ لکھتے ہیں:

> "سائنس نے اِس علاحدگی کو بگ بینگ یا عظیم دھماکے سے تعبیر کیا ہے۔ سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق عظیم دھماکہ کی ابتدائی تشکیل چھ سیکنڈ کے اندر ہو گئی تھی اور پھر کیمیاوی عناصر پیدا ہوئے اور اِس مادے سے بے شمار اجرامِ فلکی معرضِ وجود میں آئے۔"

شیخ صاحب کا لکھا ہوا یہ اقتباس اُن کی مہارت کا آئینہ دار ہے۔ یعنی شیخ صاحب نے بگ بینگ سے متعلق طویل بحث کو مختصر لفظوں کے کوزے میں سمو دیا ہے۔

بگ بینگ کے عظیم دھماکے کے نتیجے میں وجود پانے والی کائنات کے وسیع خلا میں رقص کرنے والی کہکشانوں کے تعلق سے سائنس دانوں کی متواتر تحقیق سائنسی دریافتوں کا خاص حصہ رہی ہے۔ برسوں کی اس تحقیقات کے نتیجے میں ثابت ہونے والے مشاہدے کی رو سے کائناتی خلا میں کئی کہکشانیں محوِ گردش ہیں۔ عبدالغنی شیخ صاحب نے گردش کرنے والی اِن کہکشانوں کے سائنسی دریافت اور انکشاف کے تئیں قرآنی تذکرہ اِن آیاتِ مُبارکہ سے ثابت کیا ہے۔

"وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ" (سُورہ زاریات، آیت ۴۷)

یعنی ہم نے اپنی خاص قدرت اور حکمت سے آسمان کو بنایا اور یقیناً ہم اس کو پھیلاتے جا رہے ہیں۔ اس تعلق سے شیخ صاحب سورہ طارق کی گیارہویں آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

یہ آیت ہے:

''وَالسَّمآءِ ذَاتِ الرَّجعِ...'' یعنی قسم ہے ہٹتے بڑھتے چلنے والے آسمان کی (عمل در عمل آسمان کی)

اِن مبارک آیات سے استدلال کرتے ہوئے عبدالغنی شیخ صاحب کہکشانوں کے خلائی سفر اور گردش کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صدیوں تک اِن آیات کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ بیسویں صدی میں سائنسی تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ کہکشانیں (Glaxies) تیزی سے ایک سمت چلی جا رہی ہیں۔ پہلے پہل یہ انکشاف 1912 میں امریکی عالمِ فلکیات ویسٹومیلوین سلیپھر نے کیا تھا کہ کچھ کہکشانیں تیزی سے بیرونی سمت رواں دواں ہیں۔ 1929 میں ایڈوین ہُبل نے اِس کی توثیق کرتے ہوئے بتایا کہ کہکشانیں نہایت ہی تیزی سے ایک دوسرے سے دور بھاگ رہی ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسٹیفن ہاکنگ رقم طراز ہیں:
>
> ''کائنات پھیلنے کی دریافت بیسویں صدی کا ایک بڑا دانشورانہ انکشاف ہے۔ ایک ساکت کائنات کششِ ثقل کے زیرِ اثر سکڑنا شروع ہوگی۔''

قرآن کریم کی درج بالا آیات کے متن میں مُضمر کہکشانوں کے گردش کا لطیف اِشارے کو شیخ صاحب نے جس انداز سے سائنسی دریافت کی اساس ہونے کا رمز آشکارا کیا ہے وہ یقیناً شیخ صاحب کے ذہن کی فکری وسعت کا غماز ہے۔ شیخ صاحب نے سائنسی دریافت کے اِس تحقیقی پہلو میں کائنات کے جس تخلیقی ارتقا کو آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اُجاگر کیا ہے اُس کا تلمیحانہ تذکرہ کرتے ہوئے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کہتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

جانداروں کی تخلیقی ساخت میں پانی بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے۔ حتیٰ کہ انسانی وجود میں پانی کی یہ اہمیت حدِ انتہا تک مُسلم ہے۔ پانی کی اس اہمیت کے تعلق سے (Chemical Composition of the body) کے عنوان سے طبّی ماہرین اور میڈیکل سائنس سے وابستہ افراد کا تجزیہ یہ ہے:

"Chemicaly, the human body consists mainly water and organic compounds-water is found in the extra-cellular fluids of the body and within the cells themselves. It serves as a solvent without which the chemistry of life could not take place. The human body is about 60 percent water by weight."

یعنی کیمیائی لحاظ سے انسانی جسم میں پانی اور کاربن کے اجزاء کی وافر مقدار شامل ہے۔ پانی سیلز (Cells) کی خلیجی دراڑوں میں رطوبت کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سیلز (خلیوں) سے ملحق بھی۔ یہ چکنائی برقرار رکھتا ہے جبکہ بغیر زندگی کے مادہ وجود پا ہی نہیں سکتا۔ انسانی جسم میں پانی وزن کے لحاظ سے ساٹھ فیصد ہے۔

سائنس نے جانداروں کی جسمانی ساخت میں ایک ضروری اور اہم عنصر کی حیثیت سے شمولیت کا یہ علم تحقیق کے اَن گنت مراحل سے گزر کر گیا۔ ''اسلام اور سائنس'' نامی تالیف میں عبدالغنی شیخ صاحب سائنس کے اس سارے تحقیقی عمل کا اساسی نکتہ قرآنِ کریم کی اس آیت کا حوالہ دیکر پیش کرتے ہیں:

''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ'' (سورۂ انبیا آیت ۳۰)

اپنی تفکرانہ سعی کی وساطت سے شیخ صاحب جاندار اشیاء میں پانی کے لازمی عنصر کی حیثیت سے شمولیت کے تئیں وہ سائنسی حوالہ بھی درج کرتے ہیں جس میں زندگی کا آغازی وسیلہ سمندر کو گردانا گیا ہے۔ یہ سائنسی حوالہ شیخ صاحب اسلام اور سائنس نامی تالیف کے پندرھویں صفحہ پر یوں لکھتے ہیں:

''سائنسی تحقیق بھی یہی ثابت کرتی ہے کہ زندگی سمندر سے شروع ہوئی اور اس کا آغاز ایک خلیے والے جاندار جیسے ایبا سے ہوا۔ ایک سائنس دان ڈاسن

نے لکھا ہے کہ ''ارضی زندگی میں جتنے کیمیائی عمل ہوتے ہیں پانی ہر حال، ہر جگہ جزوِ لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔''

زمین کی گردش اور شمسی نظام کی کارگزاری کی سائنسی دریافت کو بھی عبدالغنی شیخ صاحب نے اپنی تالیف کے موضوعات میں شامل رکھا ہے۔ اس دریافت کے تئیں شیخ صاحب تاریخی دریچے سے جھانکتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چودہ سو برس قبل مسیح (B.C.) فیثا غورث نے دعویٰ کیا تھا کہ زمین کے گرد سورج، چاند اور سیارے گھومتے ہیں۔ اس کے برعکس 250 قبل مسیح ارسطائیس نے کہا تھا کہ ہماری کائنات کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے۔ بطلیموس نے فیثا غورث کے نظریے کو دہرایا اور کہا کہ سورج زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ دورِ تاریک اور زمانہ وُسطیٰ میں عام لوگوں کے لئے ایسے نظریات کی اہمیت نہیں تھی۔ میتھو آرنلڈ نے Culture and Anarchy میں لکھا ہے: ''اِس قسم کی تحقیق اُس مخصوص دور کے اِنسانی اِرتقا کی ناپختگی کے پیشِ نظر غیر مانوس تھی۔''

مختلف ماخذوں سے اقتباس شیخ صاحب کی اِس عبارت سے عندیہ ملتا ہے کہ اپنی تالیف کو سائنسی دریافتوں کا معلوماتی ذخیرہ بنانے کے ساتھ ساتھ اِن دریافتی معلومات کو قرآن واحادیث کے متن سے مماثل کرنے کے تئیں شیخ صاحب نے کافی محنت ومطالعہ کیا ہے۔ شیخ صاحب نے ارسطائیس اور بطلیموس کے نظریات میں جس تضاد کو آشکار کیا ہے اُس کی بنا دراصل اِس بات پر ہے کہ بطلیموس اور فیثا غورث کے ارسطو کے خیالات سے ہم آہنگ خیالات کلیسائی خیالات کے موافق تھے۔ اس لئے کہ فلکیاتی علوم سے متعلق فیثا غورث اور ارسطو کے یہی اندازے عام لوگوں پر کلیسائی پیشواؤں کی اقتداری گرفت برقرار رکھنے میں معاون و مددگار بنے ہوئے تھے۔ اِس تناظر میں فیثا غورث اور ارسطو کے فلکیاتی اندازوں کا کلیسائی سرپرستی کے سایہ میں عام افراد کے قلب وذہن میں یقین کی حد تک گھر کرنا بدیہی امر تھا۔ اِس حالت میں فلکیات یا نظامِ شمسی اور زمین کی گردش کے بارے میں کوئی بھی نیا خیال

قابلِ رد تھا اور ایسا خیال پیش کرنے والا کلیسائی پیشواؤں کے عتاب کا شکار بنتا تھا۔ گلیلیو پر ہونے والا عتاب اسی عتابی سلسلے کی ایک کڑی تھی جو اُس کے وجود پر عمر کی آخری سانس تک حاوی رہا۔ عبدالغنی شیخ صاحب کا میتھو آرنلڈ کی Culture and Anarchy سے ماخوذ حوالہ بھی اسی حقیقت کا عکاسی ہے کہ عام لوگوں کے ذہن میں اِنسانی ارتقا کی ناپختگی کے پیش نظر فلکیاتی صورتوں اور کیفیات کا جو اندازہ نقش ہو چکا تھا اُس کے خلاف ہونے والا کوئی بھی نیا نویلا سائنسی انکشاف اُن کے لئے غیر مانوس تھا۔ نئے سائنسی انکشافات کے عام لوگوں کے اذہان سے بالاتر ہونے کی دلیل عبدالغنی شیخ صاحب کا اخذ کردہ وہ حوالہ بھی ہے جو اُنہوں نے سید قطب کی کتاب ''سائنس اور اسلام'' سے نقل کیا ہے۔ اِس حوالے کی عبارت یوں ہے:

> ''قرآن نے کائنات سے متعلق ارشادات میں نزولِ قرآن کے زمانہ میں اِنسانوں کی عقل وفہم اور اُن کی سائنٹفک معلومات کی رعایت ملحوظ رکھی ہے اور ایسے حقائق کے انکشاف سے گریز کیا ہے جس کو وہ اُس وقت تک کی معلومات کی بنیاد پر نہیں سمجھ سکتے تھے۔''

اس تعلق سے ایک حدیث شریف کا متن بھی توجہ طلب ہے جس میں ارشاد ہے کہ لوگوں کے ساتھ اُن کی عقول کے مطابق گفتگو کرو۔ درج بالا حوالہ جات درج کرنے کے بعد مولف عبدالغنی شیخ توجہ طلبی کے اسی آئینے میں لکھتے ہیں:

> ''قبل مسیح کے انسان کے ذہن سیاروں کی گردش اور اس کے نتیجے میں ہونے والے عوامل کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ پہلی تاریخ کا چاند کس لئے بنایا گیا ہے اور اس کے گھٹنے بڑھنے کا راز کیا ہے تو آپ نے فرمایا (بوساطتِ قرآن)
>
> ''قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ (سورۂ بقرۃ، آیت ۱۸۹)
>
> یعنی کہہ دیجئے یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کے تعین اور حج کی علامتیں ہیں۔
>
> ظاہر ہے اللہ نے اس کے سائنسی اسباب نہیں بتائے۔ اسی طرح حضورؐ نے سورج اور چاند

گرہن سے متعلق فرمایا ''سورج اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ گرہن کسی کی پیدائش اور موت سے نہیں ہوتا ہے۔''

عبدالغنی شیخ صاحب عام عقل وفہم اور سائنسی انکشافات کے انطباق کے تئیں مزید کہتے ہیں:

''سورۂ نحل میں اللہ نے فرمایا'' آگے دِکھائیں گے تم کو اپنے مرنے کی نشانیاں''

''سَنُرِیهِمۡ آیاتِنا فِی الآ فاقِ وَفِیٓ أَنفُسِهِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمۡ أَنَّهُ الۡحَقُّ''

عنقریب ہم اُنہیں اپنی نشانیاں آفاقِ عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود اُن کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ اُن پر واضح ہو جائے گا کہ یہی حق ہے۔''

آفاقِ عالم اور ذات میں اِن خدائی نشانیوں کے اظہار سے متعلق فاضل مولف عبدالغنی شیخ ایک صاحبِ علم کا قول یوں نقل کرتے ہیں:

''حضورؐ نے جزئیات اور تشریحات اِس لئے نہیں فرمائیں کہ زمانے کی علمی سطح اس کا تقاضہ نہیں کرتی تھی، لوگ اُلجھنوں میں پڑ جاتے اور دعوت الی اللہ کا اصلی مقصد اور مُدّعا فوت ہو جاتا۔''

بطلیموس اور فیثا غورث کا یہ نظریہ کہ سورج زمیں کے گرد گردش کرتا ہے گلیلیو کے دور بینی مشاہدے نے غلط ثابت کیا اور یہ عیاں ہوا کہ شمسی نظام مرکزیت کا حامل ہے اور نہ صرف زمین بلکہ کئی اور سیارے بھی سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ تاہم ماضی قریب تک سائنس دان مرکزی حیثیت کے حامل سورج کو ساکن تصوّر کرتے تھے۔ ایسے میں قرآنِ کریم کی اُس مقدس آیت کا متن توجہ طلب تھا جس میں ارشادِ باری ہے:

''کُلٌّ فِی فَلَکٍ یَسۡبَحُونَ'' (سورۂ انبیاء آیت ۳۳)

یعنی آسمان میں موجود سارے سیارے محوِ گردش ہیں۔

یا سورۂ یاسین کی وہ مبارک آیت جن میں ارشاد ہے:

''وَالشَّمۡسُ تَجۡرِی لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا'' یعنی سورج اپنے قرارگاہ کی طرف سفر کرتا ہے۔ عبدالغنی

شیخ صاحب نے اِن آیات کی روشنی میں سائنس دانوں کو بعد میں سورج کی گردش کا مشاہدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اور رمز کو بھی عیاں کیا کہ سورج اور چاند کی روشنی میں تفاوت ہے۔اس تعلق سے شیخ صاحب نے اُس قرآنی آیت کا حوالہ دیا ہے۔جس میں سورج کو چراغ اور چاند کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فلکیاتی کوائف سے اخذ ہونے والے نتائج کی رُو سے سائنس دان بھی اس امر کو حقیقت مانتے ہیں کہ جس طرح اس کائنات کی ابتدا ہوئی اسی طرح ایک دِن یہ اپنی انتہا اور انجام کو پہنچے گی۔ سائنس دانوں کا یہ انکشاف قرآنِ کریم کی جن مبارک آیات کے متن سے مماثل ہے اُن کا حوالہ عبدالغنی شیخ صاحب نے اپنی تالیف میں دیا ہے۔اس متن کی دو آیات ہیں:

''یَوْمَ نَطْوِیْ السَّمَاءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُب'' سورۂ انبیاء آیت ۱۰۴

''اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ. وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ. وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ. وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ. وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ. وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ''

پہلی آیت کا ترجمہ ہے، جس دِن لپیٹ دیں گے آسمانوں کو طومار میں لپیٹے جانے والے کاغذ کی طرح۔ دوسری آیت کا ترجمہ ہے''جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور تارے میلے ہو جائیں گے اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے اور جب بیالی اونٹیاں چھٹی پھریں اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے۔اور جب دریا جھونکے جائیں۔

یہ اور اس متن کی کئی آیات کے سیاق وسباق کو عبدالغنی شیخ صاحب ''اسلام اور سائنس'' نامی اپنی تالیف میں سائنس کی کائنات انجامی دریافت کی مماثلت میں پیش کرتے ہیں۔اِن آیات کی روشنی میں شیخ صاحب سائنسی انکشافات کے سلسلے میں پروفیسر فرینک ایلن کا یہ قول درج کرتے ہیں:

> ''یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات بتدریج انحطاط پذیر ہے اور ایک وقت آنے والا ہے جب تمام موجودات اپنی حرارت کھو بیٹھیں گے، توانائی اور قوت فنا ہو جائے گی اور زندگی ناممکن ہو جائے گی۔''

اسی عبارت کا ایک اور تائیدی مضمون عبدالغنی شیخ صاحب اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب A Brief History of Time سے یوں نقل کرتے ہیں:

''ہمارے سورج میں غالباً پانچ ارب سال یا اس کے آس پاس عرصے کے لئے ایندھن موجود ہے۔ جب ایک ستارے میں ایندھن ختم ہو جاتا ہے، یہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوتا ہے اور سکڑ جاتا ہے۔''

شیخ صاحب نے ''سنتِ نبوی اور سائنس'' کے عنوان سے اسلامی عبادات کے تئیں کئی فکر انگیز پہلو عیاں کئے ہیں۔ اِس ضمن میں نماز کے جملہ فوائد میں جسمانی قاعدوں کے حوالے سے شیخ صاحب ایک مِصری سرجن کا وہ قول نقل کرتے ہیں جس کی رو سے چالیس مریضوں کی تحقیق سے اخذ ہوئے نتیجے کی رو سے مشاہدہ ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کی بیماری میں مبتلا افراد کے لئے نماز کی حرکات بہت مفید ہیں۔ اس مشاہدے کی ایک امریکی دانشور کی تائید کا تذکرہ بھی شیخ صاحب کی تالیف میں درج ہے۔ اسی طرح روزے کے فوائد کو سائنس اور اِسلام کی مماثلت میں کافی مواد فراہم کرنے کی سعیٔ بلیغ کی ہے۔

شیخ صاحب نے ''اسلام اور سائنس'' نامی اپنی جامع معلومات پر مشتمل تالیف میں ''سائنس اور قرونِ اولیٰ کے مسلمان'' سے ایک عنوان باندھا ہے۔ اس عنوان کے تحت شیخ صاحب نے مسلمانوں کے درخشاں عہد کا سائنسی فکر و عمل کے تعلق سے جو نقشہ اُبھارا ہے اُس کو سائنس کے موجودہ جدید دور کی تمہید کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا۔ اس عنوان کے تحت شیخ صاحب نے کئی مسلم مفکروں اور سائنس دانوں کا تذکرہ ان کی تحقیقی کارکردگی کو اُجاگر کرتے ہوئے کیا ہے۔ تالیف میں نظر آنے والے اس شخصیاتی تذکرے میں بُو علی سینا، ابن عربی، ابو ناصر فارابی، ابن حزم، ابن البیطار، ابو طیب سند بن علی، علی بن عیسیٰ اسطرابی، ابو یوسف بن اسحاق کندی، ابو عبید اللہ بن جابر البنانی، ابو القاسم موصلی، ابو القاسم مسلمہ بن مجریطی، ابو القاسم بن عباس زہراوی، عمر خیام، لِسان الدّین ابن الخطیب جیسے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ اِسلامی مفکّروں اور دانشوروں کا وہ حساس طبقہ ہے جن کے تاریخی کارناموں سے عصرِ حاضر کے لوگ نا آشنا ہیں۔ ''اسلام اور سائنس'' نامی اپنی تعلیم میں ان مفکروں اور ان کی خاص کارکردگی کا تذکرہ کر کے شیخ صاحب نے اِس نا آشنائی کا ازالہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اپنی جامع حیثیت کی مختصر تالیف میں عبدالغنی شیخ صاحب نے ''اسلام اور مختلف سائنسی علوم'' کے عنوان سے ایک اور مستقل اور معلوماتی باب باندھا ہے۔ اس باب میں سائنسی امورات سے ماورا مُسلمان

مفکروں کے اُن کارہائے نمایاں کو اُجاگر کیا گیا ہے جو انہوں نے جغرافیہ، ریاضی، علمِ ہئیت، طبعیات، علمِ معدنیات، علمِ کیمیا، نیچرل ہسٹری اور علمِ طب کی ترسیل اور تشریح میں انجام دیئے ہیں۔ اس باب کو شیخ صاحب نے جزوی موضوعات میں تقسیم کر کے ایک تاریخی کتابچہ کی مانند بنایا ہے۔ ایک ایک سطر کی تلمیحی صورت قارئین کو مضامین کی غایت درجہ وُسعتوں کی جانب توجہ مبذول کرنے کی تحریک بخشتی ہے۔

طبعیات اور علمِ معدنیات کی پیش رفت میں مسلمانوں کے نمایاں کردار کا بڑی خوبی اور ہُنر مندانہ انداز سے کیا ہے۔ اس تعلق سے ابنِ سینا کے اُس گہرے مطالعہ اور تجربے کا تذکرہ قابلِ دید ہے جس کی رو سے ابن سینا نے توانائی، خلائی امور، روشنی اور گرمی سے پیوستہ عناصر کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اس موضوع میں طبیب الرّازی کی کیمیا دانی اور البیرونی کی روشنی اور اس کی رفتار سے وابستہ رازہائے سربستہ کے انکشافات کی رُوداد شامل ہے۔ جہاز رانی میں مسلمانوں کے پہلے مقناطیسی عمل کا تذکرہ معتبر دستاویزوں کے حوالے سے رقم ہوا ہے۔ علمِ کیمیا کی اسکندریہ سے شروعات کی تاریخ اور اس کیمیاوی تاریخ کا سلسلہ وار ارتقا بھی علمِ کیمیا کے تحت درج کردہ باب میں شامل کر کے شیخ صاحب نے اسلامی علوم کے سنہری ماضی کی نقاب کُشائی کی ہے۔ علمِ کیمیا کے اس عنوان کے تحت شیخ صاحب نے جابر بن حیان نامی اُس مسلمان کیمیا دان کا تذکرہ اور تعارف دیا ہے جس کو کمسٹری کا باپ کہا گیا ہے اور جس کی کیمیا دانی کے اعتراف میں عبدالغنی شیخ صاحب نے ای۔ جے۔ ہیولم یارڈ (E.J.Holmyard) کا یہ قول نقل کیا ہے:

''جابر بنِ حیان کو جائز طور پر پہلا کیمیا داں کا خطاب دیئے جانے کے بہت سارے جواز ہیں۔''

ریاضی اور علمِ ہئیت کے عنوان سے عبدالغنی شیخ صاحب کا تحقیقی باب ''اسلام اور سائنس'' نامی تالیف کی ایک اور حسین سوغات ہے۔ اِس مختصر باب میں عربوں کی حساب دانی کا جامع تعارُف عبدالغنی شیخ کی ادیبانہ ذہانت اور اُن کے مطالعہ کی وسعت کا واضح ثبوت ہے۔

دوحرفی عنوان ''طب'' کے تحت اَن گنت حروف سے مرکّب جملوں اور سطور میں شیخ صاحب نے جس تواتر اور تنوع سے اِسلامی تاریخ میں صحت عامہ کے تئیں دوا سازی اور دیگر ضروریات کی رُوداد

بیان کی ہے وہ اِس تالیفی صدف کے ایک اور گوہر کی عکاسی کرتی ہے۔ تالیف کے آخری مضمون کا عنوان ہے ''اسلام اور علم''۔ اِس مضمون میں عبدالغنی شیخ صاحب نے اسلامی تعلیمات میں علم وحکمت کی اہمیت کو اُجاگر کر کے اِن ہی دو جواہر کو سائنسی معلومات کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ مواد اور متن کے لحاظ سے اِس آخری مضمون کو ''اسلام اور سائنس'' نامی عبدالغنی شیخ صاحب کی بیش بہا معلوماتی تالیف کا ماحصل اور اس تالیف میں شامل جملہ مضامین کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔

''اسلام اور سائنس'' نامی عبدالغنی شیخ صاحب کی تالیف کی فنی خوبی کا سب سے حسین انداز اس کی عبارتی سلاست اور لفظی سادگی میں مضمر ہے۔ ادیبانہ ہُنر کی غایت اور نہایت یہ ہے کہ عبارت اور الفاظ کے اِس سادہ پن میں بھی معیاری سطح پر توازُن اور اعتدال جھلکتا ہے۔ اس معیاری توازن اور اعتدال کی رو سے نہ تو شیخ صاحب کا ادیبانہ اُسلوب قارئین کی ذہنی استعداد سے تجاوز کرتا ہے اور نہ ہی اس قدر عامیانہ ہو جاتا ہے کہ کسی مرحلے پر تیسرے درجے کے ادب کا احساس اُبھرے۔ فصاحت کے پردے میں بلاغت کے جلوے کئی مقامات پر قابلِ توجہ ہیں۔ اِن بلاغتی محاسن میں پوشیدہ شیخ صاحب کی باریک خیالی اور فکری برتری احساس کی گہرائیوں میں جا گُزیں ہو کر اُن کی ادیبانہ شخصیت میں پنہاں محققانہ اوصاف کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا کرتی ہے۔

...... ●●● ......

☆...... ڈاکٹر مشتاق احمد وانی

تجھ کو تیرے بعد زمانہ ڈھونڈے گا

عبدالغنی شیخ لداخی کے علمی وادبی سرمائے پہ جب نظر پڑتی ہے تو حیرت واستعجاب کے کئی دریچے کھلنے لگتے ہیں ۔علمی وادبی دنیا میں ان کی حیثیت ایک تاریخ نویس، خاکہ نگار، مترجم، انشاپرداز، کالم نویس، محقق، ناول نگار اور افسانہ نگار کی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ وہ قول سے زیادہ فعل پہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ عمر کا بیشتر حصہ علمی وادبی خدمات میں گزار چکے ہیں۔ اب اگر چہ بڑھاپا ان پہ غالب آچکا ہے، مگر اس کے باوجود ان کا دل علمی وادبی کائنات سے رخصت ہونے کو تیار نہیں ہے۔ وہ سترہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں اکثر مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ایک عمدہ ادب پارہ یا فن پارہ بغیر کثیر مطالعے، گہرے مشاہدے، محنتِ شاقہ، پاکیزہ خیالات اور مسلسل ریاضت کے وجود میں نہیں آتا ہے۔ اس اعتبار سے جب ہم عبدالغنی شیخ کی افسانوی کتاب ''دو ملک، ایک کہانی'' میں شامل افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تمام متذکرہ ادبی تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ''یہ زندگی ہے'' اور آخری افسانہ ''ایک انار'' ہے۔ ان افسانوں کی قرات کے دوران قصے پن میں دلچسپی کا عنصر، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات کی پیشکش، ادبی زبان کے برتاو اور اسلوب بیان میں کہیں ڈرامائی، کہیں بیانیہ، کہیں منظریہ اور کہیں پُر اسرار کیفیت نظر آتی ہے۔ مذکورہ کتاب میں عبدالغنی شیخ کے زیادہ تر افسانے طوالت میں ادبی لطافت کا احساس کراتے ہیں۔ مانا کہ اب طویل

افسانے کم ہی پڑھے جاتے ہیں کیونکہ سوشل میڈیا نے ہم سے بہت حد تک کتاب چھین لی ہے لیکن اس کے باوجود یہ افسانے اپنے آپ کو پڑھوا لیتے ہیں۔ مزید برآں زیادہ تر افسانے لداخ کے کلچر اور وہاں کی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یہاں ان کے کچھ نمائندہ افسانوں کے حوالے سے گفتگو کرنے کا خواہش مند ہوں مثلاً ''ایک رات'' ''سوئمنگ پول'' ''بدلاؤ'' ''مجرب نسخہ'' ''اپنے سیل فون کو ذرا آرام دو'' ''دو ملک، ایک کہانی'' اور ''یادیں''۔ عبدالغنی شیخ کا ہر افسانہ توجہ طلب ہے۔ میں مضمون کی طوالت کے خوف سے بچنے کے لیے یہاں ان کے مذکورہ افسانوں کو ہی زیر بحث لانا مناسب سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ عبدالغنی شیخ نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر لداخ کی تہذیب و ثقافت اور وہاں کے فطری ماحول کی موثر عکاسی کی ہے۔ حسن و عشق اگر چہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے اور اس کا تعلق انسانی زندگی سے اٹوٹ رشتے کی طرح ہوتا ہے لیکن عبدالغنی شیخ نے اسے ایک نیا لب و لہجہ اور تازہ کاری عطا کی ہے۔ افسانہ ''ایک رات'' میں انھوں نے آنگموں نام کی ایک حسینہ اور صنم چھرنگ جیسے گبرو جوان کی داستان عشق کو بڑے پُر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔ بظاہر یہ موضوع روایتی ہے لیکن اس کے ذریعے انھوں نے لداخی کلچر کو سامنے لانے کی بہتر کوشش کی ہے۔ ''ایک رات'' اپنے عنوان کے لحاظ سے ایک علامت معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ وہ رات ہے جس میں صنم چھرنگ ایک مسافرانہ انداز میں آنگموں کے گھر پر آتا ہے اور اس کی حسین شکل و صورت دیکھ کے اس پہ فریفتہ ہو جاتا ہے۔ آنگموں اور صنم چھرنگ دونوں کرداروں کے نام بڑے عجیب سے معلوم ہوتے ہیں اور واقعی ایسے نام لداخیوں کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ زیرِ نظر افسانے کی فضا، ماحول اور اس میں پیش کیے گئے کرداروں کی بات چیت، ان کی تعلیم و تربیت، آنگموں کی ماں کی معنی خیز باتیں کافی جذباتی ہیں۔ افسانے کا موضوع لداخ کے کلچر کو واضح کرنا ہے اور یہ ''ایک رات'' عام راتوں کی طرح نہیں ہے بلکہ اسے دو افراد کی ایک نئی زندگی کی شروعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کے ابتدائی حصے میں دیکھیے عبدالغنی شیخ رات کا منظر کس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''سردی سے بھیگی ہوئی برف آلود رات۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ سامنے دیو پیکر بلند برفانی پہاڑ تاریکی میں گم صم کھڑا تھا

اور پاس ہی کہیں سے دبیز یخ کے نیچے سے پانی کراہ کراہ بہہ رہا تھا۔ اچانک اس سناٹے میں دستک کی آواز سنائی دی اور سامنے زنجیر سے بندھا ہوا نیم خوابیدہ کتّا جاگ اٹھا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ دور دور کے کتّوں نے اس کا ساتھ دیا۔ دستک اونچی ہوتی گئی اور تاریکی میں لپٹے ہوئے مکان کے دریچے سے جہاں سے ہلکی سی روشنی آرہی تھی، ایک نسوانی آواز آئی۔''

افسانہ ''سوئمنگ پول'' کا موضوع والدین اور اولاد کے درمیان پیدا ہو رہی دوریاں ہے۔ روہت، میری، راموچچا، جمنا اور جیوتی جیسے کرداروں کی مکالمہ نگاری سے کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔ اولاد کے لیے والدین کیا کچھ نہیں کرتے لیکن بعد میں اولاد والدین کو تنہا چھوڑ کر اپنی ایک الگ دنیا بسانے میں لگ جاتے ہیں یہ لمحہ فکریہ ہے۔ روہت امریکہ جا کر وہاں کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور اس کے والدین اس بات پہ ناراض رہتے ہیں۔ ٹوٹتے بکھرتے رشتوں میں افسانہ نگار ہمیں بہت سے سماجی مسائل اور خانگی زندگی میں پیدا ہو رہی دراڑوں سے واقفیت کراتا ہے۔ روہت کے حوالے سے افسانہ نگار ہمیں مشرقی و مغربی ادبا و شعرا کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ان ادبا کی ادبی نگارشات کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ مثلاً افسانہ ''سوئمنگ پول'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''وہ جانتا تھا کہ ادب پڑھنے اور پڑھانے میں اس کو کتنا سکون ملتا ہے۔ کتاب پڑھانے کا مطلب ہے دنیا کے ذہین ترین انسانوں کے بلند تخیل کی اڑان کے ساتھ خود بھی اڑان بھرنا ہے۔ ان کے فکر و نظر کی وسعتوں میں کھو کر موتی چننا اور پرونا ہے۔ چاہے شکسپیئر کے معنی خیز مکالمے ہوں، رومی کا صوفیانہ پیغام ہو، ٹی ایس ایلیٹ کے دانشورانہ نقد و نظر، عمر خیام کی شراب و شباب سے بھری رُباعیاں ہوں، کیٹس اور شیلے کا رومانی کلام ہو، جیمز جوئس اور سومرسٹ مام کی منظر نگاری ہو، یا کافکا اور کامیو کے منفرد تصورات ہوں۔ ان کے ہر لفظ میں زندگی کی ہمک ہے، ہر جملہ میں علم و دانش مستور ہیں۔''

ایک عام قاری کے لیے یہ تمام باتیں بڑی معلوماتی ہیں۔ مغربی اور مشرقی اہل علم وادب کی یہ کہکشاں واجب الاحترام ہے۔ جدید تہذیب نے جہاں بہت سی کارآمد اور مفید چیزوں کو جنم دیا ہے تو وہیں کچھ ایسے پیچیدہ مسائل پیدا کیے ہیں جن سے آج کا آدمی دوچار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی مثبت سوچ وفکر کے ساتھ اچھی چیزوں کو اختیار کرے اور بری چیزوں سے دور رہے۔

عبدالغنی شیخ اپنے افسانوں میں مباحث چھیڑنے اور کرداروں کی گفت وشنید سے کسی مسلے کا حل تلاشنے اور معلوماتی پہلوؤں کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ افسانہ ''بدلاؤ'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں وہ انگریزی کے پروفیسر سریڈرناتھ اوران کے شاگردوں جن میں سنیتا شرما، سلیم، راشد، حمیرہ، شہناز، ماجد اور منیرہ کی باہمی گفتگو سے کئی اہم علمی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو دلچسپ بھی ہیں اور حیران کن بھی۔ مثلاً بقول پروفیسر سریندرناتھ:

> ''افلاطون نے اپنی مشہور کتاب "The Republic" کے پہلے جملے کو دلکش اور دلنشیں بنانے کے لیے پچاس مرتبہ لکھا۔ ہمینگوے نے اپنے مقبول ناول "A Farewell to Arms" کا آخری صفحہ 39 مرتبہ لکھا۔ گولڈاسمتھ چار مصرعہ لکھنا دن بھر کا کام سمجھتا تھا۔ ذین گیرے ایک کہانی لکھنے کے لیے مہینوں بلکہ ایک سال سے بھی زیادہ مدت محنت کرتا تھا۔ وہ اسے بار بار دیکھتا، کرداروں کو بدلتا، پلاٹ میں تبدیلی لاتا اور پھر اسے پڑھتا تھا۔ کارل مارکس نے "Das Capital" کی تصنیف کے سلسلے میں پندرہ سو سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس پر چالیس سال کام کیا۔''

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ لکھنا اگرچہ ایک فطری عمل ہے لیکن کوئی ادبی شاہکار سامنے لانا ہزار گنا مشکل ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں لفظوں کی مالا پرونا۔ ہر لفظ لکھنے والے سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ مجھے مناسب اور موزوں مقام پہ رکھا جائے اور جب تک لکھنے والے کو یہ شعور وادراک نہ ہو کہ اسے کس لفظ سے کیا کام لینا ہے تب تک اسے کسی موضوع پہ قلم نہیں اٹھانا چاہیے۔

ہمارے ملک میں رشوت ستانی ایک ناسور کی مانند ہے جس کے انسداد کے لیے بہت سے

قوانین بنائے گئے ہیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آ رہا ہے۔ رشوت دینے اور لینے کا سلسلہ کئی طریقوں سے جاری ہے۔ افسانہ ''مجرب نسخہ'' میں عبدالغنی شیخ نے بڑے طنزیہ انداز میں اس مایوس کر دینے والے مسلے کو موضوع بنایا ہے۔ زیرِ نظر افسانے میں انھوں نے متعدد سرکاری محکموں میں رشوت کے لین دین پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ ایک کانفرنس میں مختلف مقررین کی تقاریر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ کرپشن ایک طرح کی وبائی صورت اختیار کر چکی ہے لیکن رجب نام کا شخص بالآخر اپنا کام کروانے کے لئے رشوت کا سہارا لیتا ہے۔ اس افسانے میں رجب شروع سے آخر تک ہمیں ایک مجبور و بے بس کردار کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مقررین میں سے ایک مقرر کے اس بیان پہ غور کیجیے:

> ''ایک مقرر بولا: ڈاکٹر ہسپتال میں مریضوں کو نہیں دیکھتے اور کلینکوں میں اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ استاد اسکول میں ایمانداری سے نہیں پڑھاتے ہیں اور طلبہ ٹیوشن لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ٹریجری بدعنوانی کا گڑھ بنا ہے۔ جہاں پنشن اور جی پی فنڈ کی ذاتی رقم کی ادائیگی پر روپیہ بٹورا جاتا ہے۔ اس نے محکمہ تعمیرات کے دفتر کے سامنے آویزاں اس بڑے بورڈ کو وہاں سے ہٹوانے کے لیے مطالبہ کیا جس پر لکھا ہے کہ رشوت دینا اور لینا دونوں جرم ہے۔ اس ضمن میں اس نے یہ جواز دیا کہ اس بورڈ کی آڑ میں رشوت دینے اور لینے میں آسانی رہتی ہے اور کسی کی نظر نہیں پڑتی''[۴]

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ موبائل فون نے ہم سے مکتوب نگاری چھین لی ہے۔ گویا ادب کی ایک اہم اور دلچسپ صنف پہ موبائل فون نے شب خون مارا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری برسوں میں سماج و معاشرے میں موبائل فون کی آمد نے جہاں دوریوں کو قربتوں میں بدل دیا وہیں موبائل فون اور انٹرنیٹ نے کئی ایسے تشویشناک مسائل پیدا کیے جن کا حل نہ حکومت کے پاس ہے اور نہ معاشرے کے پاس۔ عبدالغنی شیخ کا افسانہ ''اپنے سیل فون کو ذرا آرام دو'' کو پڑھنے کے دوران موبائل فون کے مسائل کھل کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس افسانے کا کردار جمن خان ایک طرح کا مزاحیہ کردار ہے جو افسانے

میں شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے اور قاری کے ذہن پہ یہ تاثر چھوڑ جاتا ہے کہ موبائل کے آنے سے ہر آدمی سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہا ہے کیونکہ موبائل کی زبان اسے کبھی غصہ دلاتی ہے اور کبھی ذہنی کوفت میں مبتلا کرتی ہے ۔ زیر نظر افسانے میں Not Reachable, SMS اور All Routes are busy جیسے انگریزی الفاظ کے استعمال سے ایک نیا لب ولہجہ در آیا ہے۔ مذکورہ افسانے کی شروعات جمن خان کے حوالے سے اس طرح کی گئی ہے:

''جب سے جمن خان کو نیا نیا سیل فون ملا ، وہ پھولے نہیں سمارہا تھا۔ بار بار فون کرنا اس کا مشغلہ بنا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اپنے لنگوٹیا یار مسکین سلیمانی کا نمبر ملایا۔ Not Reachable فون میں ایک خاتون کی مانوس آواز آئی۔ ''کم بخت ایسی کون سی جگہ گیا جہاں آواز نہیں جاتی'' جمن خان نے دل ہی دل میں سوچا۔ دوبارہ نمبر ملایا ، وہی آواز آئی۔ جمن خان بڑبڑایا'' آوارہ بنجارہ خانہ بدوش بنا ہے'' پھر اپنی بیوی کا نمبر ملایا جواب میں خاتون نے Not Reachable کا جملہ دہرایا۔ جمن خان نے فون پر اپنا منہ لگا کر کہا'' میڈم ! میری بیوی میری پہنچ سے باہر نہیں ہے۔ آپ کو غلطی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت ہمارے لیے کھانا بنا رہی ہوگی۔ آپ ٹھیک طرح معلوم کریں'' جمن خان نے دوبارہ بٹن دبایا جواب میں خاتون نے وہی جملہ دہرایا۔ جمن خان گھبرایا۔ ایک آٹو والے کو پکارا اور گھر کی راہ لی۔''

افسانہ'' دو ملک ، ایک کہانی'' کا موضوع ہندوستان کا بٹوارہ اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والے مسائل ہے۔ اس افسانے میں بھی افسانہ نگار نے کچھ ایسے تاریخی ، لسانی ، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن کا تعلق لداخ کی سرزمین سے ہے ۔ ۱۹۴۷ میں ہندوستان کا ایک حصہ پاکستان کی صورت میں سامنے آیا جس کی وجہ سے سینکڑوں مسائل اور الجھنیں پیدا ہوئیں۔ عبدالغنی شیخ نے تقسیم ہند کی شدید مذمت کی ہے اور اسے سیاسی اقتدار کی ہوس سے تعبیر کیا ہے۔ مذکورہ افسانے میں عہدِ ماضی میں لداخ اور بلتستان کے تجارتی تعلقات کا بھی ذکر آیا ہے۔ کس طرح پاکستان کے وجود

میں آنے کے بعد رشتے داروں میں دوریاں پیدا ہوئیں، سرحدوں پہ تعینات سیکورٹی فورسز کی آپسی دشمنی اور آئے دن گولہ باری کی وجہ سے عام اور معصوم لوگوں کی جانیں چلی جاتی ہیں۔ اسی طرح کے کئی تشویشناک مسائل زیرِ نظر افسانے کا حصہ بنے ہیں۔ تقسیم ہند کے المیے کو افسانہ نگار نے ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"بٹوارہ ایک ملک کا نہیں ہوا تھا، بٹوارہ ایک شہر کا، ایک قصبہ کا، ایک گاوں کا، ایک خاندان اور گھر کا ہوا تھا۔ لائن آف کنٹرول کے آر پار سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو کھیتوں میں ہل جوتتے، پانی دیتے، فصل کاٹتے اور کھلیان جمع کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے لیکن جب ایک بھائی دوسرے بھائی سے ملنا چاہتا ہے تو لہیہ یا کرگل آنا پڑتا ہے۔ لہیہ سے دہلی ہوائی جہاز سے پرواز کرتا ہے۔ مہینوں کی تگ ودو اور انتظار کے بعد اگر ویزا ملے تو وہ کراچی، اسلام آباد یا لاہور جاکر اپنے بھائی سے ملاقات کرسکتا ہے۔ وہ بھی بھائی کے گاوں میں نہیں۔ اپنے بھائی کے گاوں سے اتنا قریب ہوکر بھی وہ اس گاوں سے بہت دور ہے۔ آسمان کے ایک تارے کی طرح جسے وہ دیکھ سکتا ہے چھو نہیں سکتا"

میرے خیال میں تقسیمِ ہند ایک ملک کی تقسیم نہیں بلکہ دو تہذیبوں، انسانی قدروں اور جذبات کی بھی تقسیم تھی۔ عبدالغنی شیخ کے اس افسانے میں جہاں مسائل ہیں وہیں لمحوں کی خطا صدیوں پہ بھاری معلوم ہوتی ہے۔ اس افسانے کی طوالت نے ان تمام مسائل ومعاملات کو بڑے احسن طریقے سے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔

آج کے سماج ومعاشرے میں پیار ومحبت کی حدوں کو پھلانگتی ہوئی جو شادیاں ہوتی ہیں وہ بعد میں تقریباً ستّر فیصدی مایوسی کا ایک بھیانک رخ اختیار کرلیتی ہیں۔ کنوارپن میں جب لڑکا، لڑکی والدین اور خاندان کے بزرگوں سے صلاح ومشورے کے بغیر پیار ومحبت کی ڈوری میں بندھ جانے کے بعد شادی کرلیتے ہیں تو سال چھ مہینے کے بعد ان میں نوک جھونک شروع ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ نوک جھونک اتنا طول پکڑتی ہے کہ طلاق پہ نوبت آجاتی ہے۔ عبدالغنی شیخ کے افسانہ "یادیں"، میں اگرچہ

طلاق کا کوئی معاملہ سامنے نہیں آتا ہے لیکن میاں، بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کڑواہٹ کچھ اس طرح سامنے آتی ہے۔ ویسے یہ افسانہ آج کل کے دور کے ہر مرد و زن پہ صادق آتا ہے۔ مثلاً مذکورہ افسانے کے اس اقتباس پہ توجہ مبذول کیجیے:

"ریحانہ کہتی ہے: آپ نے مجھے ڈھیروں خط لکھے ہیں اور ہر خط میں طرح طرح کے وعدے کیے ہیں۔ یہ رہے آپ کے خط، یہ رہے آپ کے سارے وعدے" میں کچھ حیرت، کچھ غصے سے خطوں کے ڈھیر کو دیکھتا ہوں اور ایک خط اچک لیتا ہوں۔ دس سال پہلے کا لکھا ہوا ایک خط ہے:

پیاری ریحانہ!

میرا نامہ محبت قبول ہو۔ نہ جانے کتنے ماہ و سال سے دل ہی دل میں تمہاری پرستش کر رہا ہوں۔ کس نے میرے دل کا زخم دیکھا ہے۔۔۔ آج میں بے کم و کاست اپنے جذبات کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ریحانہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تمہاری زندگی میں خوشیوں کے پھول ڈھیر کر دوں گا۔ میں تمہارے لیے آسمان سے تارے توڑ لاوں گا۔۔۔ صرف ایک بار مجھ سے ہاں کہہ دو۔ پھر میں اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان تصور کروں گا۔

تمہارا شیدائی

امجد"

عبدالغنی شیخ کے تازہ افسانوی مجموعے "دو ملک، ایک کہانی" میں شامل افسانے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں یعنی رشوت ستانی، موبائل فون کا غلط استعمال، ظلم و استحصال، ملکی تقسیم سے پیدا شدہ مسائل، معاشی بدحالی اور نفسیاتی الجھنوں کا ذکر، ٹوٹتے بکھرتے انسانی رشتوں کا درد و کرب کے علاوہ فلمی اداکاروں کا ذکر غرضیکہ ان کا موضوعاتی تنوّع ہمیں بہت ساری معلومات فراہم کرتا ہے۔ کرداروں اور واقعات کی پیشکش میں سپاٹ بیانیہ تقریباً ان کے ہر افسانے میں نظر آتا

ہے۔زبان شستہ ہے اور بیان دلچسپ بیانیہ کے ساتھ کہانی کو اختتامی مرحلے میں داخل کرتا ہے۔علاوہ ازیں کئی افسانوں میں ڈرامائی اندازِ بیاں موجود ہے۔جموں وکشمیر کے افسانوی ادب کی جب بھی جدید تاریخ لکھی جائے گی عبدالغنی شیخ اپنے ادبی قد سے معتبر اور معزز کہلائے جاتے رہیں گے۔افسانہ نگاری میں ان کا کردار نہایت جاندار اور سدا بہار معلوم ہو رہا ہے۔خدا کرے وہ علمی وادبی مورچے پہ اسی طرح ڈٹے رہیں۔آمین!

......●●●......

☆......ڈاکٹر معروف شاہ
انگریزی سے ترجمہ: سید مبشر رفاعی

لداخی ثقافت کا ترجمان: عبدالغنی شیخ

(Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia کا روایتی جائزہ)

ادب ایک ایسی شے ہے جو ایک ایسی دنیا مہیا کرتی ہے جو ہم نے کھوئی ہو یا جسے ہم دوبارہ طلب کرسکیں۔ یہ ایک ایسی دنیا کا نقشہ کھینچتا ہے جس کا ہم تصور کرسکیں۔ ادب نے اکثر وبیشتر خیالی جنت پیش کی ہے یا پھر دور یا غیر ملکی زمین کی کامل ہم آہنگی کا تصور پیدا کیا ہے۔ تصوری کہانیوں کی یہی کشش ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا پیش کرتی ہیں جس کا یا تو ہم خیال کرسکیں یا جس کی وجہ سے ہم یادِ ماضی میں کھو جائیں۔ کیا ہوگا اگر ہمیں کسی معاملے کے بارے میں بتایا گیا ہو جو کسی حد تک ایک مسئلہ ہو اور جس تک کسی طرح سے رسائی حاصل کی جاسکے۔ لداخ ایسا ہی ایک معاملہ ہے۔ یہ بے شک روحانیت کی سرزمین اور استھاپن ہے۔ جنت نظیر، ایک ایسا اخلاقی آئیڈیل جو مادی ترقی کے تمام آئیڈیلز کو شرمندہ کرتا ہے۔ روایت کا آخری گڑھ، جو دنیا کو جلا بخش سکتا ہے، یا کم سے کم یہ یاد دلا سکتا ہے کہ اس نے کیا بھلایا ہے یا کس کا دوبارہ دعویٰ کرسکتا ہے۔ عبدالغنی شیخ نے اس جنت نظیر جگہ کے معمہ، حسن اور تقدس کو سمجھنے میں اپنی پوری زندگی لگادی ہے۔ اگرچہ لداخ کی منفرد ثقافت کی مابعد طبیعاتی، فلسفی اور مذہبی بنیادوں میں ربط پیدا کرنے کیلئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ روایت پرست ماہر نظریات اور تقابلِ مذہب کے سکالروں سے وسائل تلاش کئے جائیں تاکہ ایک مضبوط دعویٰ قائم کیا جاسکے جس کی رو سے لداخ کو بذاتِ خود ایک ایسی روایت کا مجسمہ مانا جائے جو دنیا کو انکارِ کُل کی

جنگ میں ایک امید فراہم کرسکے۔ لداخ کے بارے میں لکھنے سے روایت پرست ماہر نظریات اسکالروں کو کافی تکلیف ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نقصان کی یاددہانی ہوتی ہے جس سے ہم دوچار ہوئے ہیں۔ ہمیں شاید کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ کیونکہ غیر شعوری طور پر بے تحاشا جدت کاری ہم نے کبھی مناسب احتجاج بھی نہیں کیا۔ ہم نے روایتی ثقافت کے آخری گڑھ کو ختم ہوتے دیکھا ہے یہاں تک کہ ہم نے اپنایا ہے۔ ہم نے لداخ کے خاتمے کی سازشیں کی ہیں اور اب واپسی کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ اس طرح عبدالغنی شیخ کے کام کا جائزہ زخموں کو کریدنے کے مترادف ہے۔ لیکن ہمیں چاہئے کہ ہم عظمت اور روحانیت کے اس جاہ وجلال کو یاد کریں جس نے کبھی ہمیں اور دنیا کو محظوظ کیا ہے۔ ہم نے حیات بخش پاکیزگی سے منہ موڑا ہے۔ لداخ نے روحانیت کے ان دریاوں کو جلا بخشی ہے جو زخموں کو مندمل کرسکتے ہیں۔ اب یہ دریا کم وبیش خشک ہوئے ہیں اور ہم ان دریاوں کی اہمیت سے بے پرواہ ہوگئے ہیں۔ لداخ کے تئیں اپنے خراج میں شیخ نے جو چند نکتے ابھارے ہیں ان سے لداخ کی عظمتِ رفتہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس تباہی کا بھی جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہورہی ہے۔ لداخی ثقافت کی پیشکش کے دوران شیخ کے پس منظر مارکوپیلس کے کام کا فریم ورک ہوگا۔ گمشدہ جنت اور اس کی غیر یقینی بازیابی کے درمیان فاصلے کے بارے میں شیخ کی کوشش کے مدنظر ہیلن ناربرگ ہاج کے قدیم لداخ کے نقشوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

یہ تبت، لداخ اور روایتی دنیا کی خوش بختی ہے کہ ایک معروف دانشور نے اس کے بارے میں ایسے لکھا جو باقی رہے گا اور جس کی گونج سنائی دے گی۔ تبت۔ لداخ کے بارے میں اگرچہ کئی سفر نامے لکھے گئے ہیں تاہم اس میں مارکو پیلس کے کام کا کوئی مقابلہ نہیں ہے جس نے دکھایا ہے کہ آخر تبت (اور اس کی وسعت میں لداخ) نے کیونکر اپنی ثقافتی جڑوں کو برقرار رکھا ہے۔ اس طرح تبت پوری دنیا کیلئے ایک ایسی چھت بن سکتا ہے جو ثقافتوں کو اکھاڑنے والی آندھی سے بچا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عرب دنیا کے اہم ممالک نے بھی روایات کو بھول کر جدیدیت کو اپنایا ہے جس کی وجہ سے روایات کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا ہے۔ اگرچہ مسلم دنیا کے کچھ حصے، قبائلی ثقافتیں اور کچھ نخلستان آج بھی پاکیزگی کے ساتھ عہد بندی کے شاہد ہیں، تاہم تبتی ثقافت بے حرمتی کی طاقتوں کے خلاف دائمی دلالت پیش کرتی

ہے۔ باوجود اس کے کہ چینی اثرات نے ناقابل تلافی نقصان کیا ہے اور چند ایک پہلو پژمردگی کے ذمہ دار ہیں۔ پیلس نے ''دی وے اینڈ دی ماونٹین'' میں شاندار انداز میں مابعد طبعیاتی بنیادوں پر مبنی لداخی ثقافت کے بارے میں بات کی ہے۔ اس کی کتاب ''پیکس اینڈ لاماز'' میں اس نے کشمیر اور لداخ کی سیر وسیاحت کی بات کی ہے۔ ترقی کے دور کے بعد لداخ کا جو نقصان ہوا ہے اس جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔ تباہ کن منصوبہ سازی کے نتائج پر کسی نے ماتم نہیں کیا۔ لوگوں کو جدید کاری کے نقصانات او رفوائد کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں دی گئی۔ جدید کاری کے بارے میں شیخ کی دوگرفتگی اور اس کو غیر ناقدانہ طور قبول کرنا جدت پسند عالم کی عکاسی کرتا ہے۔ غریبی، جو کچھ انتظامی ادوار خصوصاً ڈوگرہ دور میں موجود تھی، کے خلاف اس کی نوحہ خوانی آگہی کے ان معاملات کو متضمن نہیں کرتی ہے، جو کہ پیلس نے ابھارے ہیں۔

شیخ لداخ کی پائیدار میراث کے تعلق سے کچھ اہم شواہد کا حوالہ دیتا ہے۔

''میں نے اپنے پورے قیام کے دوران ایک بھی ہتھیار بند شخص نہیں دیکھا، اگرچہ وہ اپنے گھروں میں بندوقیں اور دیگر ہتھیار رکھتے ہیں۔ (میر عزت اللہ، (1812)1843) اور وہ ایک نرم طبیعت قوم ہے۔ وہ کسی کو کوئی تکلیف نہیں دیتے ہیں اور مذہبی عدم رواداری ان میں ہے ہی نہیں۔'' میر مزید کہتا ہے'' قتل، ڈاکہ زنی اور خون خرابے کا کوئی نام ونشان بھی نہیں تھا۔'' اشبروک کرمپ (1919) نے کہا ہے کہ لیہہ میں اگائی جانی والی سبزیاں بہترین قسم کی ہوا کرتی تھیں جو انہوں نے پورے مشرق میں نہیں دیکھی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا ہے، ''ہوا کی شگفتگی کیا ہوتی ہے، یہ لیہہ میں دیکھنا چاہیئے۔'' ولیم ڈگلس (1951)، '' لیہہ کے لوگوں کو ان پریشانیوں کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں ہے، جن کے بارے میں، میں بات کر رہا ہوں۔ ان کے پاس تھوڑا ہے اور وہ زیادہ کی امید نہیں کرتے۔ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے مطمئن ہیں۔ وہ محبّ وزندہ دل اور سادہ طبیعت لوگ ہیں۔ میں نے اس جنت میں سات دن

گزارے۔' لیہہ کے بارے میں لیفٹننٹ کرنل ہینری ٹارینس نے لکھا ہے، ''
یہاں پولیس والے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ہے۔لیہہ۔۔۔آریاؤں اور
منگولوں کے ملنے کی جگہ۔۔۔ایک طلسماتی دنیا۔۔۔۔قدیم لباس میں ملبوس،
اندر سے خوشنما۔''

عبدالغنی شیخ کا کام لداخ کے تمام بامعنیٰ معاملات کا احاطہ کرتا ہے۔معاندانہ ناقدین سے اس کا دفاع کرتا ہے۔اس کی ہمہ رخی، گونا گونیت اور اس کی یکسانیت کی کا جشن مناتا ہے۔وہ مابعد طبیعاتی اصولوں پر ثقافتی اصولوں کو ترجیح دے کر ان کا دفاع کرتا ہے۔وہ پیلس کا حوالہ دیتا ہے،لیکن اس انداز میں نہیں کہ تبت۔لداخ معاملے میں اس کی فریمنگ کو فراموش کیا جاسکے۔شیخ زور دے کر کہتا ہے کہ لداخ حیاتیاتی تنوع اور جنگلی حیات میں کافی مالا مال ہے۔کھلاڑیوں کیلئے جنت نظیر ہے جسے قدرت کی پاکیزہ نشانی کہا جاتا ہے۔یہاں منفرد ثقافتی اور تمدنی مطابقت پائی جاتی ہے۔یہ جگہ ایسی دانشورانہ اور روحانی سوچوں کا مرکز رہی ہے جو آج بھی دنیا کے کچھ حصوں پر راج کرتی ہے۔روایت پرست قلم کار ہیری اولڈ میڈو کے اس نکتے کو یاد کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے ''دی وے اینڈ دی ماونٹین'' کے پیش لفظ میں لداخ کی پائیدار میراث کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ،'' یہ نوحہ سے بڑھ کر ہے اور یہ اس قابلِ حرمت روح، جس کو تباہ نہیں کیا جاسکتا ہے، کی توثیق ہے۔پیلس نے جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ قارئین کیلئے دقیق اور کٹھن لگتا ہے،لیکن شیخ نے جن مصنفین کا حوالہ دیا ہے ان کے دعووں کو ہلینا نار برگ واضح کرتی ہے۔اس لئے ہم اس کام کی جانب توجہ کرتے ہیں جس کو لداخی دانشوروں نے عمومی طور فراموش کیا ہے،شاید اس لئے کہ یہ جدت پسندی کے معیار کی مذمت کرتا ہے۔کتاب کے تعلق سے میں تجزیہ نگار کی رائے نوٹ کرتا ہوں۔وہ کہتے ہیں،'' ہر کوئی جو اس سیارے، یہاں کے بچوں کے مستقبل اور سماج کی بگڑتی حالت کیلئے فکر مند ہے، اس کو چاہیئے کہ وہ یہ کتاب پڑھے۔'' دلائی لامہ نے کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ترقیاتی کمشنر کی رائے میں مطلوب عصری ترقی یا جدت پسندی کیلئے راہیں ہموار کرنے کی خاطر لوگوں کو لالچی بنانے کیلئے کوششیں کی جانی چاہئیں اور کی گئیں۔ابھی حال ہی میں حالت یہ تھی کہ لداخ کے لوگ کسی بھی قیمت پر مقامی مصنوعات تبدیل نہیں کرتے تھے۔لیکن جوں جوں پیسے کی لالچ

بڑھتی گئی، دولت کمانے کی خاطر لوگوں نے چاہا کہ زیادہ زیادہ سیاح آجائیں۔

جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے:

''میں نے پہلے پہل لداخ میں دیکھا کہ بچے دوڑ کر میری طرف آتے تھے اور میرے ہاتھوں میں خوبانی تھما دیتے تھے۔ایسا میں نے اس سے پہلے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔اب مغربی ملبوسات زیب تن کئے یہ بچے خالی ہاتھ آگے بڑھا کر پردیسیوں کو سلام کرتے ہیں۔وہ ''ایک قلم۔۔۔ایک قلم'' کی مانگ کرتے ہیں۔یہ لداخی بچوں کا ایک نیا مقولہ بن گیا ہے۔''

(ص۔62)

نار برگ ہاج روایتی لداخ کا ایک پہلو کچھ اس طرح بیان کرتی ہے:

''لداخ میں، میں نے ایک ایسا سماج دیکھا ہے جہاں نہ کوڑا کرکٹ ہے اور نہ آلودگی۔ ایک ایسا سماج جس میں جرائم نا ہونے کے برابر ہیں۔ قبیلے مضبوط اور صحت مند ہیں۔اور کسی کمسن لڑکے کو ماں یا دادای اماں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کیلئے مضطرب نہیں کیا جاتا ہے۔اب جبکہ یہ سماج جدیدیت کے سامنے گھٹنے ٹیک رہا ہے، نصائح لداخ سے پرے بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ جہاں ہم کسی چیز کو بے کار سمجھتے ہیں، وہاں لداخی اس سے کوئی دوسرا فائدہ حاصل کرنے کی سوچتے ہیں۔ کسی چیز کو ضائع نہیں کیا جاتا ہے۔ جو کوئی چیز کھانے کے قابل نہ رہی ہو اسے جانوروں کو کھلایا جاتا ہے۔ جو ایندھن کے طور استعمال نہیں کیا جاسکتا، اُسے کھاد کے بطور استعمال کیا جاتا ہے۔لداخی تب تک اپنے ہاتھوں سے بُنے کپڑوں پر پٹیاں لگاتے ہیں جب تک وہ پہننے کے قابل ہوتے ہیں۔ جب سردیوں میں کئی ملبوسات پہننے کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ بہترین کپڑے اندر سے پہنتے ہیں تاکہ ان کو مخصوص موقعوں کیلئے نیا جیسا رکھا جا سکے۔ ناقابلِ استعمال کپڑوں کو مٹی میں لپیٹ کر ندی نالوں کے کمزور کناروں پر

رکھا جاتا ہے تاکہ پانی کے رساؤ کو روکا جاسکے۔ قدرتی طور اگنے والی گھاس، جس کو ہم عموماً ضائع کرتے ہیں، کو کسی نہ کسی مفید مقصد کیلئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اصطبلوں کی زمین کھود کر کھاد کے بطور استعمال کی جاتی ہے اور اس طرح مویشیوں کے پیشاب کی ری سائیکلنگ ہوتی ہے۔ گوبر کو نہ صرف اصطبلوں اور مویشی خانوں بلکہ چراگاہوں سے بھی جمع کیا جاتا ہے۔ اس طرح لداخیوں نے تقریباً ہر شے کی روایتی انداز میں ری سائیکلنگ کی ہے۔ یوں کہا جائے کہ کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ قلیل وسائل کے باوجود کسانوں نے خود کفالت حاصل کی ہے۔ وہ بیرون دنیا سے فقط نمک اور چائے کے علاوہ کچھ خاص قسم کے برتن اور ساز وسامان منگاتے ہیں۔''

تقریباً گاندھیائی فلسفے کے احساسات کے مدنظر درج ذیل نکتہ نگاہ اس صورتِ حال کا دعویٰ ہے جس نے دنیا بھر بشمول ریشیوں کی سرزمین کشمیر کے لوگوں کو مرعوب کیا ہے:

''روایتی ثقافت میں دیہات کے لوگ روپے پیسے کے بغیر اپنی تمام ضرورتیں پورا کرتے تھے۔ انہوں نے خود 12000 فٹ کی اونچائی پر جو کی فصل اگانے اور اس سے زیادہ اونچائی پر سرا گائے پالنے کا ہنر پیدا کیا تھا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ آس پاس دستیاب چیزوں کی مدد سے اپنے ہاتھوں سے مکان کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ انہیں بیرون دنیا سے صرف نمک کی ضرورت پڑتی تھی جس کیلئے وہ تجارت کیا کرتے تھے۔ وہ روپے پیسے کا محدود استعمال کرتے تھے۔ بین الاقوامی اقتصادیات کے ایک حصے کے طور لداخی لوگ اب دوسروں پر زیادہ منحصر ہیں۔ وہ ان لوگوں کے فیصلے کی زد میں آتے ہیں جن کو یہ معلوم ہی نہیں کہ لداخ کا بھی کوئی وجود ہے۔ اگر ڈالر کی قیمت تبدیل ہو جاتی ہے تو اس کا اثر ہندوستانی روپے پر بھی ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لداخی لوگ جن کو زندہ رہنے کیلئے پیسوں کی ضرورت ہے، اب بین الاقوامی اقتصادیات کے منیجروں

کے زیر کنٹرول ہیں۔اس سے قبل وہ اپنے مالک خود تھے۔''

(ص:66)

لوگ صدیوں تک ایک دوسرے کی مدد کر کے دوستوں کی طرح رہتے تھے۔اب جبکہ فصل کاٹنے کیلئے اجرت پر مزدور دستیاب ہیں، لوگ جتنا ہو سکے اتنی کم رقم ادا کرنا چاہتے ہیں۔رشتے بدل رہے ہیں۔ پیسہ لوگوں کے مابین دراڑیں پیدا کر رہا ہے(ص: ٦٧)۔اس حقیقت کے پیش نظر کہ روایتی اقتصادیات میں لوگ کھل کر زندگی جیتے تھے اور ہر کوئی صابر تھا، جدید اقتصادیات وقت کو سودا میں بدل دیتی ہے۔ایک ایسی شے جس کو بیچا اور خریدا جا سکتا ہے۔وقت مہنگا ہو رہا ہے اور جس طرح لوگ ''ٹائم سیونگ'' ٹیکنالوجی اپنا رہے ہیں، زندگی میں تیز رفتاری آ رہی ہے۔لداخیوں کے پاس اب نہ ایک دوسرے کیلئے وقت ہے اور نہ اپنے لئے۔

جدید کشمیر کی کہانی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ہماری صدیوں پرانی تہذیب اور ہمارے اقدار تیزی کے ساتھ ختم ہو رہے ہیں۔کیا ہم روحانیت کی قیمت پر مادیت اپنا رہے ہیں؟ ہم مادیت پر کب بحث و مباحثہ کریں گے؟ ثقافت میں کفایت شعاری کہاں ہے اور ہر گزرتے سال کے ساتھ وازوان کے پکوانوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے؟ اگر ہم نے مادیت کو پسند کیا ہے تو احترام یا خاندانی اقدار کے خاتمے کا غم کیوں کرنا؟

جدت پسندی کے دفاع میں کہا جاتا ہے کہ اس سے معیار زندگی بہتر ہوتا ہے۔تاہم مابعد ترقی کے اصول دانوں نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حقیقت سے بعید ہے۔نار برگ ہاج نے ان اصول دانوں کا نام لئے بغیر اپنا نکتہ سامنے رکھا ہے:

> ''لداخ اور ہمسایہ ملک بھوٹان کی حالت فقط مالی اعتبار سے انسانی فلاح میں خامیوں کی صفائی کے ساتھ وضاحت کرتی ہے۔تیسری دنیا کے بیشتر حصے کے ساتھ موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں مقامات کے لوگوں کا معیارِ حیات دراصل کافی بلند ہے۔لوگ اپنی ضرورتیں خود پورا کرتے ہیں اور ان کا فن اور موسیقی خوب صورت ہے۔اس کے باوجود مغرب کے مقابلے میں ان کے

پاس دوستوں، کنبے اور تفریحی سرگرمیوں کیلئے نسبتاً زیادہ وقت ہے۔ پھر بھی عالمی بینک کے مطابق بھوٹان دنیا کا ایک غریب ترین ملک ہے۔ کیونکہ اس کی مجموعی قومی پیداوار عملی طور پر صفر ہے۔ بین الاقوامی اقتصادیات کی فہرست میں اس ملک کا نام سب سے آخر میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نیویارک میں سڑکوں پر رہنے والے بے گھر افراد اور لداخی یا بھوٹانی کسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں معاملات میں کوئی آمدن نہیں ہوسکتی ہے لیکن اعداد وشمار کی حقیقت ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے جیسے دن اور رات کا فرق۔''

(نار برگ ہاج، 89 : 1991)

اب پیر فقیر (یالداخ میں لاما) نہیں بلکہ پیشہ ور حکمرانی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے مضمرات کو محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔ نار برگ ہاج نے راویتی اور جدید لداخ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے۔ ''روایتی سماج میں لاما سب سے زیادہ قابل احترام ہوتا تھا اور جدید سماج میں انجینئر محترم ہے۔'' اس نے جدید زمانے کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کا حوالہ بھی دیا ہے جو راہبوں کو بھی مقدم مانتا ہے۔ (نار برگ ہاج، 69 : 1991) وہ راہب اور انجینئر کے درمیان امتیاز کو اس طرح بیان کرتی ہے:

''دنیا لاما اور انجینئر کو مختلف نظروں سے دیکھتی ہے۔ ماضی میں یقین حقیقت پر مبنی ہوتا تھا جو وحدت پر زور دیتا تھا، جبکہ نیا سائنسی نظریہ جدائی پر زور دیتا ہے۔ لگتا ہے کہ ہم دیگر مخلوقات سے الگ ہیں۔ اور قدرت کے کارخانے کو سمجھنے کیلئے، ہمیں باریک بینی سے کام لینا ہوگا۔ لاما سے انجینئر تک منتقلی اخلاقیات سے غیر اخلاقیات تک منتقلی کے مترادف ہے۔''

(نار برگ ہاج، 71 : 1991)

روایتی ثقافت میں ہر کوئی شخص ایک فنکار ہے۔ نار برگ ہاج کے مطابق:

''میڈیا کے ذریعے پنپ رہی ثقافتی مرکزیت بھی منفی سوچ اور عدم تحفظ

کے احساس کا باعث بن رہی ہے۔ روایتی طور رقص، گانوں اور تھیٹر کی بہتات تھی۔ اس میں ہر عمر کے لوگ حصہ لیتے تھے۔ ایک گروپ میں ننھے منے بچے بھی اپنے بڑوں کی مدد سے رقص میں حصہ لیتے تھے۔ ہر کسی کو گیت گانا، سنگیت بجانا اور اداکاری کرنا آتا تھا۔ اب جبکہ لداخ میں ریڈیو آچکا ہے، اپنے گیت گانے یا اپنی کہانیاں سنانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ہے۔ آپ اپنے گھر میں ہی بہترین کلاکار یا اداکار کو سن سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے اور وہ خود آگہی حاصل کر رہے ہیں۔ آپ اپنے آپ کا موازنہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ قبیلوں کے آپسی رشتے بھی ٹوٹ رہے ہیں جب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ناچنے گانے کے بجائے بلا واسطہ ریڈیو سننے بیٹھتے ہیں۔''

(ناربرگ ہاج، 78 : 1991)

ناربرگ ہاج نے غیر مشترکہ یعنی انفرادی کنبوں، جن کو ہم نے وقت کی ضرورت مان کر قبول کیا ہے، کے معاملے کا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

انسانی سماج کے ارتقا کیلئے اجتماعیت لازمی ہے۔ یہاں ہم لداخ سے براہ راست سبق حاصل کر سکتے ہیں، جہاں کنبے بڑے اور قبیلے چھوٹے ہیں۔ مختلف نسلیں بچوں کی نگہداشت کرتی ہیں اور بچے دادا دادی کی صحبت میں رہ کر کافی استفادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ بڑے کنبے میں رشتے کافی نزدیک کے ہوتے ہیں تاہم ان میں وہ شدت نہیں ہوتی ہے جو انفرادی کنبے کے رشتوں میں ہوتی ہے۔ مشترکہ کنبے میں افراد ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک ہی فرد کو دباؤ نہیں سہنا پڑتا ہے۔ میں نے لداخ میں کبھی بھی احساس جرم محسوس نہیں کیا ہے جو کہ انفرادی کنبے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔

(ناربرگ ہاج، 113 : 1991)۔

ناربرگ ہاج اس کی وضاحت اس طرح کرتی ہے:

''جوں جوں اقتصادی اور سیاسی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں، توں توں ارد گرد کے لوگ گمنام ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی رفتار بڑھ

جاتی ہے جس سے اچھے خاصے رشتے بھی مختصر بن جاتے ہیں۔لوگوں کے رشتے باہری حدوں تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔لوگوں کو ذات کی نہیں بلکہ اثاثہ کی بنیاد پر پہچانا جاتا ہے۔''

(ناربرگ ہاج،75 : 1991)۔

آنندا کمارا سوامی نے شہروں میں پائی جانے والی جدید تہذیب کی بدصورتی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

کھیتوں میں کنبے کے سبھی افراد، دادا دادی، ماں باپ، بچے غرض سب لوگ مل جل کر مختلف کام کیا کرتے تھے۔فصل کاٹنے کی ہر سرگرمی اور موقعے کی مناسبت سے ایک خاص گیت گایا جاتا تھا۔کھیتوں میں کاٹی ہوئی فصل بڑی مقدار میں دیکھی جاسکتی تھی۔اتنی کہ زمین کے کسی حصے کو دیکھنا محال بن جاتا تھا۔روشنی سے وادی چمک اٹھتی تھی۔یہاں زمین کی تقسیم نہیں ہوئی تھی لہٰذا اس کی خوبصورتی برقرار تھی۔ہر چیز آنکھوں اور روح کو تراوت بخشتی تھی۔دور کہیں کسی کھیت میں کوئی شخص اپنے کھیت جوتتے ہوئے خوبصورت گیت گاتا تھا:

''اے دو پیارے بیلو۔۔۔اے سراگائے کے بچو
تماری ماں گائے ہے، لیکن تم شیر اور چیتا جیسے ہو
تم جانوروں کے شہنشاہ۔۔۔شاہین کی طرح ہو
کیا تم بلندیوں کے رقاص نہیں؟
کیا تم وہ نہیں جو پہاڑوں کو اپنی آغوش میں لیتے ہیں؟
کیا تم وہ نہیں جو ایک ہی گھونٹ میں ساگر پی جاتے ہیں؟
اے دو پیارے بیلو۔۔۔کھینچو۔۔کھینچو۔۔''

(ناربرگ ہاج،18 : 1991)

عبدالغنی شیخ نے بھی لداخی گیتوں اور زبانی ادبی ثقافت کیلئے کچھ جگہ وقف کی ہے۔تقریباً ہر موقعے کیلئے گیتوں کی عظیم ثقافت اور کہانیاں روایتی ثقافت کا ایک حصہ رہ چکی ہیں اور کشمیر اور لداخ کو

اس پر ناز تھا۔ موسم بہار میں ایک مخصوص گیت گایا جاتا ہے جو اونچائیوں پر واقع چراگاہوں یا ''پھو'' کی جانب جانے والے چوپایوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ زمین ان کے لئے مقدس مانی جاتی ہے جہاں وہ آرام سے گھوم پھر کر کھا سکتے ہیں اور وہاں انہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ یہ گیت جدیدیت کی آمد کی عکاسی کرتا ہے۔

''اے خوبصورت چوپائے۔۔۔اے طاقتور چوپائے!

تمہاری دم لمبی ہے اور تمہارے سینگ آسمان چھوتے ہیں!

ہماری زمین جوتو،

ہمارے لئے اب محنت سے کام لینا،

اور ہم تمہیں چراگاہوں میں لے جائیں گے

جہاں تم گھاس اور پھولوں کی صورت میں اچھی غذا کھاؤ گے

اور وہاں دن بھر کوئی کام نہیں کرنا ہے!

اے خوبصورت چوپائے!''

(نار برگ ہاج، 21 : 1991)

چوپایوں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک بھی روایتی ثقافت کی ایک خصوصیت ہے جبکہ جدت پسندی کی آڑ میں جانوروں سے بے دردی کے ساتھ ایسا کام لیا جاتا ہے جو فقط انسان کے مالی فائدے پر مرکوز ہوتا ہے۔ جانوروں کو اب مکنیکی ذبح خانوں میں ذبح کیا جاتا ہے۔

مچھلی کبھی نہیں کھائی جاتی ہے۔ کیونکہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک زندگی کے خاتمے کے بجائے بہتر ہے کہ اس کو بڑے جانوروں کیلئے چھوڑ دیا جائے۔ جانوروں کو مارنا معمولی نہیں سمجھا جاتا ہے:

''وہ جانور جن کو سواری یا مال ڈھونے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے

جن کو میرے لئے ذبح کیا گیا ہے

آہ! وہ جانور جن کے حصے کی غذا میں نے کھائی ہے،

کاش انہیں جلد از جلد عقل عطا ہو''

(نار برگ ہاج، 24 : 1991)

آخراس رویّے کو کب بڑے پیمانے پر داخلیت میں تبدیل کیا جائے گا۔ اگرچہ یہ قابل ذکر ہے کہ کشمیر میں لوگ خام یا چھوٹی مچھلیاں خریدنے سے گریز کرتے ہیں اور کچھ لوگ دیگر کئی وجوہات کی بنا پر مچھلیاں کھاتے ہی نہیں ہیں۔

بڑے بڑے کاموں میں جہاں ہم مشینوں کا استعمال کرتے ہیں وہاں لداخی لوگ گیت گاتے ہوئے مل جل کر یا جانوروں کی مدد سے ایسے کام کرتے ہیں:

''لہمو کھیا نگ، لہمو کھیا نگ

یالے کھیا نگ، لہمو لی

(''اس کو آسان بناؤ، آسان کام تکمیل کو پہنچتے ہیں۔۔۔(نار برگ ہاج، 26 : 1991)

یہ ایسا ہی ہے جیسے کشمیر میں کوئی مشکل کام انجام دیتے ہوئے خدا کے نام پکارے جاتے ہیں۔ ماننے کی بات یہ ہے کہ روایتی ثقافتوں میں ہر کام کی تطہیر کے ساتھ ساتھ اس کو آسان بنایا جاتا ہے۔

معاملاتِ زندگی کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ نہ لینا روایتی نظریّے کی ایک اور خصوصیت ہے۔ تقدیر کے ساتھ لگاؤ سے روایتی ثقافت کے وصف بیان ہوتے ہیں۔ شیخ نے اپنے کام میں جن گیتوں کا حوالہ دیا ہے وہ قبولیت کے گیت ہیں۔ ان میں آسمانوں کی کوئی شکایت نہیں ہے۔

زندگی اور موت کیلئے لداخیوں کا رویّہ ناپائیداری کے الہامی فہم اور تعلق کے مسلسل فقدان کی بنیاد پر قائم ہے۔ میں نے اپنے لداخی دوستوں میں بارہا یہ رویہ دیکھا ہے جس سے میں کئی بار متاثر ہوا ہوں۔ حالات کیسے ہونے چاہیئے، اس پر سوچنے کے بجائے لگتا ہے کہ وہ اطمینان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ مثال کے طور پر فصل کٹائی کے وسط میں بارش یا برفباری ہوسکتی ہے جس سے محنت سے اگائے گئے جو اور گیہوں کی فصل تباہ ہوسکتی ہے۔ اس سے بھی وہ پریشان نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کے برعکس اپنے حال پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتے رہتے ہیں۔

جذباتیت روایت کی روح کیلئے اجنبی ہے۔ نار برگ ہاج کہتی ہے کہ اس نے لداخیوں کو جذباتی طور اتنا منحصر نہیں پایا جتنا ہم صنعتی سماج میں ہیں۔ یہاں پیار اور دوستی ہے لیکن اس میں شدت اور لالچ کا عنصر نہیں ہے۔ میں نے ایک خاتون کو اپنے 18 سالہ بیٹے کو سلام کرتے ہوئے اور اس کا

خیر مقدم کرتے ہوئے دیکھا جو ایک سال تک گھر سے باہر رہا تھا۔ وہ حیران کن طریقے پر شانت تھی جیسے کہ اس کو بیٹے کی یاد آئی ہی نہ ہو۔ مجھے کافی وقت لگا یہ رویہ سمجھنے میں۔ میرا خیال ہے کہ سردیوں کے دوران لداخ سے باہر رہنے کے بعد۔ جب میں واپس آئی تو میرے لداخی دوستوں نے میرے ساتھ عجیب سلوک کیا۔ میں نے ان کیلئے تحائف لائے تھے اور مجھے امید تھی کہ وہ یہ تحفے دیکھ کر خوش ہوں گے لیکن ان کا سلوک کچھ ایسا تھا جیسے میں کہیں گئی ہی نہ تھی۔ انہوں نے اگرچہ تحائف کیلئے میرا شکریہ ادا کیا لیکن اس انداز میں نہیں جس کی مجھے امید تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ حیران ہو جائیں گے اور ہماری خاص دوستی کی تائید کا اظہار کریں گے۔ میں ذرا سا مایوس ہوگئی۔ میں چھ ماہ باہر رہی یا ایک دن، ان کا رویہ میرے ساتھ ویسا ہی تھا۔

مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ حالات سے بالاتر کسی بھی صورتِ حال کے ساتھ سمجھوتہ کرنا ایک طاقت سے کم نہیں ہے۔ مجھے اپنے لداخی دوستوں کے رویّے کی تعریف کرنا ہی پڑی۔ لداخی کسی بھی چیز سے اتنا منسلک نہیں ہوتے ہیں جس قدر ہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن فرق ہے۔ کوئی کسی دوست کے جانے یا کسی کے چیز کے کھو جانے پر مغموم ہو سکتا ہے لیکن اتنا زیادہ نہیں۔

(نار برگ ہاج، 59 : 1991)

خود شناسی اور زندگی خوشی خوشی گزارنے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لمبے سفر پر نکلتے ہی اگر شدید بارش شروع ہو جائے تو مغموم کیوں ہونا۔ آپ اس کو ناپسند کر سکتے ہیں، لیکن لداخی مانتے ہیں کہ ناخوش کیوں ہونا۔

(نار برگ ہاج، 60 : 1991)

اپنے شاہی گھوڑے پر سوار
بادشاہوں کی طرح اڑتے ہوئے
یہ سوچ کر کہ انہوں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے
کیا ان کو اس بات کا کوئی ادارک نہیں کہ پرندے بھی اڑتے ہیں
(تاشی ربگیس، 1980ء میں سیاحوں سے ناراض ہو کر)

(نار برگ ہاج، 60 : 1991)

اس کے لئے لداخ تقدیس کا گواہ ہے۔ ایک ایسا گواہ جو خود کو سیکولر، معقول اور بڑی حد تک سرمایہ دار کہلاتا ہے۔ لوگ صنعتی دنیا میں قدرت کے ساتھ بہتر توازن کے متلاشی ہیں۔ اس عمل میں وہ روایتی ثقافتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ہم اس چیز کو سیکھنے کی شروعات کر رہے ہیں جو روایتی لداخی لوگ کبھی بھول نہیں پاتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہر کوئی انسان غیر مشروط پیار کا حقدار ہے اور یہ کہ بچے اسی ماحول میں پنپ سکتے ہیں جہاں خود کو ثابت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

دنیا بھر میں، نفسیات سے طبیعات تک، کھیتی باڑی سے کنبے کے رسوئی گھر تک، غرض زندگی کے ہر شعبے میں زندگی کے باہمی تعلقات کی جانکاری کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ نئے محرکات ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ اعداد بڑھ رہے ہیں اور تبدیلی کی خواہش وسیع ہو رہی ہے۔ ان رجحانات کو عموماً ''نیا'' کہا جاتا ہے۔ لیکن جس طرح لداخ نے ظاہر کیا ہے یہ رجحانات کافی قدیم ہیں۔ یہ دراصل ان اقدار کی دوبارہ دریافت ہے، جو ہزاروں سال تک زندہ رہ چکے ہیں۔

(نار برگ ہاج، 117 : 1991)

مجھے لگتا ہے کہ ہمیں بڑے پیمانے پر لداخ کی وضاحت، مثلاً ترقی اور خوشحالی کی وضاحت میں خاص کر ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ہمیں لداخ کی مخصوص دانشمندی پر زیادہ زور دینا ہوگا۔ شیخ ایسا ہی کرتا ہے جبکہ پیلس اور نار برگ ہاج معقول انداز میں اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ قدرت کے شاہکاروں کا مشاہدہ کرنے کیلئے ہر کشمیری کو لداخ کی سیر پر جانا چاہیئے۔ کئی مصنفین نے لداخ کو عقیدتی مقام کے طور گردانا ہے، خصوصاً مارکو پیلس نے۔ عبدالغنی شیخ نے لداخ کے بارے میں کام کرنے میں اپنی پوری زندگی صرف کی ہے اور اس کے کام کو لداخ کیلئے ایک کنٹری بیوشن مانا جانا چاہیئے۔

اب ہم براہ راست جدت پسندی کے پروجیکٹ کی طرف آتے ہیں جو صدیوں پرانے ثقافتی اقدار کیلئے خطرہ ثابت ہو رہا ہے۔ فلموں نے لداخ کو ایک سیاحتی مقام کے طور پیش کیا ہے جس کی وجہ سے لداخ میں سیاحتی سرگرمیوں کو فروغ ملا اور سرکار کئی دیگر طریقوں سے سیاحت کو بڑھاوا دے رہی ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ لداخ اب کافی معروف جگہ ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کافی دکھ ہوتا ہے کہ عقیدتی

سیاحت کی قیمت کافی زیادہ ہے۔تاہم ماحولیاتی مسائل کبھی زیادہ مہنگے پڑے ہیں۔سماجی اقدار پر کیا اثرات پڑتے ہیں، وہ الگ۔ایک حساس سیاحتی پالیسی غیر مادی دولت پر اثرانداز ہوسکتی ہے۔

فلموں میں حسین، بہادر پُرجوش اور جمال انگیز افراد زندگی کے مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔لداخی نوجوانوں کیلئے یہ صورتِ حال ناقابل مزاحمت ہے۔اس کے برعکس ان کی اپنی زندگیاں غیر موثر ہیں۔جدید زندگی کا یک رخی نظریہ منہ پر ایک طمانچے کے مترادف ہے۔وہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ان کے والدین انہیں کھیتوں میں کام کرنے کی ترغیب دیتے ہیں جس میں محنت کے باوجود کافی کم معاوضہ ملتا ہے۔ان میں اپنی ثقافت سیاحوں اور فلمی اداکاروں کے مقابلے میں مضحکہ خیز دکھائی دیتی ہے (نار برگ ہاج، 64 : 1991)۔دنیا کے دیہی علاقوں کے لاکھوں نوجوانوں کیلئے مغربی ثقافت ان کی اپنی ثقافت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔یہ کوئی حیرانگی کی بات نہیں ہے۔وہ دباؤ، اکیلے پن، عمر رسیدگی کے ڈر جیسے اس کے سماجی یا نفسیاتی پہلوؤں پر غور نہیں کرتے ہیں۔نہ وہ اس کی وجہ سے ہونے والے ماحولیاتی نقصانات، افراط یا بڑھتی بے روزگاری جیسے مسائل کو دیکھ سکتے ہیں۔دوسری طرف وہ اپنی ثقافت کے حدود ونقائص اور اندرون وبیرون سے آشنا ہوتے ہیں۔

مغربی تحریک کی اچانک سرائیت نے کچھ لداخیوں، خصوصاً نوجوانوں میں احساسِ کمتری پیدا کیا ہے۔وہ اپنی ثقافت کو یکمشت مسترد کرکے نئی ثقافت اپناتے ہیں۔وہ جدت پسندی کی علامتوں مثلاً سن گلاسز، واک مین اور بلیو جینز کی دنیا میں کھوئے ہیں۔ان میں سے اکثر جینز چھوٹی ہوتی ہیں۔وہ یہ جینز اس لئے استعمال نہیں کرتے کہ یہ آرام دہ ہوتی ہیں، بلکہ اس لئے کہ یہ ماڈرن زندگی کی علامت ہے۔

جدید علامتوں نے بھی لداخ میں جارحیت پھیلانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔اب نوجوان لڑکے سکرین پر بھی جارحیت اور تشدد ہی دیکھتے ہیں۔مغربی فلمیں دیکھنے سے انہیں آسانی سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انہیں ماڈرن ہونا چاہئیے۔انہیں سگریٹ کے کش لگانے چاہئیں اور انہیں شہر کے مضافات میں تیز رفتار گاڑی چلا کر لوگوں کو دائیں بائیں دھکیلنا چاہیے۔

لداخی دوستوں میں تبدیلی دیکھ کر کافی دکھ ہوتا ہے۔وہ سب شدت پسند نہیں بنتے، البتہ ناراض ہوتے ہیں۔میں نے ثقافتی تبدیلی دیکھی ہے۔۔۔۔۔ایک ایسی تبدیلی جس میں مرد یہاں تک

کہ نوجوان مرد بھی خوشی خوشی ایک بچے کو پیار سے گلے لگاتے ہیں یا اپنی دادیوں، نانیوں کے ساتھ محبت بھرا سلوک کرتے ہیں۔

(نار برگ ہاج،64 : 1991)

کمار اسوامی اور لارڈ ناور بورن جیسے دانشوروں کے ترقی کے خیالات جن کی دیگر کئی سکالر، انسانیت نواز، ماہر اقتصادات اور ماہر ماحولیات تائید کرتے ہیں، پر ایک ناقدانہ نظر کے ساتھ غور کرنا نئے لداخ کی تعمیر کیلئے لازمی ہے۔ جدید لداخ کی کہانی محرومیت کی درد بھری کہانی ہے۔ اگر ہم میں کرنے کی چاہ ہو تو ہم آج بھی کوئی معقول تبدیلی لا سکتے ہیں۔ لداخ کے بارے میں حساسیت کو پیدا کرنے میں شیخ کا کام قابلِ قدر ہے اگرچہ اس نے بھی بنیادی مسائل پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ کچھ خرابیوں، جو روایتی لداخی سماج کا احاطہ کرتی ہیں، کو رد کرنے کے بغیر ہماری نظر اچھائیوں پر ہونی چاہیئے، جو اب نظروں سے اوجھل ہو رہی ہیں۔

......●●●......

حوالہ جات

1. Pallis, Marco, The Way and the Mountain Tibet and Tradition, World Wisdom Inc, 2008
2. Pallis, Marco, Peaks and Lamas, Casell & Company Ltd, London, 1939
3. Sheikh, A. G., Reflections on Ladakh Tibet and Central Asia, Skyline Publications Pvt. Ltd. 2010
4. Norberg-Hodge, Helena, Ancient Futures: Ladakh, 1992 by Sierra Club Books, 1992

☆......جان بیرے
(انگریزی سے ترجمہ: روف راتھر)

ہمہ جہت معلومات کا ذخیرہ[1]

(Reflections on Ladakh Tibet and Central Asia)

عبدالغنی شیخ لداخ خطے کے معروف قلمکاروں اور مورخوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ لداخ اور کشمیر میں اپنی اُردو تحریروں کی وجہ سے جانے جاتے ہیں تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ انگریزی زبان کے بھی ایک بسیار نویس ادیب ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 1970ء کے اواخر سے لے کر تا ایں دم انگریزی زبان میں لکھے گئے اُن کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

1936ء میں لیہہ لداخ میں پیدا ہوئے عبدالغنی شیخ نے راجستھان یونیورسٹی سے تاریخ کے مضمون میں ماسٹرس ڈگری حاصل کر کے مدرسی کا پیشہ اختیار کر کے تنگ موگانگ لداخ میں بچوں کو پڑھانا شروع کیا۔ تاہم جلد ہی اس پیشے کو خیر باد کہہ کر انہوں نے انڈین انفارمیشن سروس جوائن کی اور کشمیر، نئی دہلی نیز آل انڈیا ریڈیو لیہہ میں بطور صحافی اپنی خدمات انجام دیں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد انہوں نے ازسرِنو تعلیمی میدان میں قدم رکھا اور تقریباً دو سال تک اسلامیہ ہائی اسکول لیہہ کے پرنسپل رہے۔ تاہم یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنی پوری توجہ قلمی مصروفیات کے لئے وقف کی۔

عبدالغنی شیخ کے اردو ادبی سرمایے میں اُن کے دو ناول، ستر سے زائد افسانے اور لداخ خطے کے ایک مشہور انجینئر اور سیاسی رہنما سونم نوربو پر لکھی ہوئی اُن کی سوانح عمری شامل ہے۔ اُن کے افسانوں کے ایک مجموعے کا انگریزی زبان میں ”فورسیکنگ پیراڈائیز Forsaking

"Paradise" کے عنوان سے 2001ء میں ترجمہ ہوا ہے۔

اس کے علاوہ شیخ صاحب نے بیسیوں ریڈیو سکرپٹ اور ٹیلی ویژن ڈرامے تحریر کئے ہیں۔ سال 1980ء میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی نے اُن کے ناول "دِل ہی تو ہے" کو "بیسٹ بک ایوارڈ Best Book Award کے لئے منتخب کیا۔

شیخ صاحب نے اگرچہ زندگی کے مختلف معاملات اور دلچسپیوں کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے تاہم اُن کے زیرنظر مجموعے سے عیاں ہوتا ہے کہ خطہ لداخ کی تاریخ کا مطالعہ اُن کی ادبی دلچسپیوں کا محور رہا ہے۔ چنانچہ دورانِ ملازمت انہوں نے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ ایسے نسخے ترتیب دیئے ہیں جن میں قدیم لداخیوں کے رہن سہن، سرکاری ریکارڈ اور طبع شدہ کتابوں سے لئے گئے احوال درج ہیں۔

جناب عبدالغنی شیخ سے میری پہلی ملاقات 1980ء کے وسط میں ہوئی اُس کے بعد سے ہم اکثر ایک دوسرے سے لداخ اور لداخ سے باہر ملاقی ہوئے۔ لداخ مطالعات کی بین الاقوامی ایسوسی ایشن International Association of Ladakh Studies (IALS) کی کانفرنسوں میں بھی ملے۔ میں نے انہیں ہمیشہ ایسوسی ایشن یعنی IALS کے تیئں مخلص مدد ومعاون پایا۔ انہوں نے کئی برس تک IALS کے لداخ کے ٹریجرر (خزانچی) کے طور کام کیا۔ اس دوران وہ ایسوسی ایشن کے پرانے اور نئے سکالروں کے ساتھ اپنے علمی تجربات اور مشاہدات بھی بانٹتے رہے۔ شیخ صاحب کے ساتھ میری حالیہ ملاقات کے دوران انہوں نے نیم افسردہ حالت میں اس بات کا اعتراف کیا کہ طلبِ علم کی خاطر مجھے بعض اوقات اپنی نماز ترک کرنا پڑی۔ اسی اثناء میں میں نے ایک مشہور حدیث سُنی ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حصولِ علم کے لئے چین بھی جانے سے گریز نہ کرو۔ شیخ صاحب کی طلبِ علمی اور تحقیق کی گہری جستجو نے اُنہیں مغربی یوروپ، تُرکی اور سعودی عرب تک پہنچایا۔

زیرنظر کتاب:۔

یہ کتاب عبدالغنی شیخ کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے 22 مضامین پر مشتمل ہے، جن میں وہ چھ مقالے بھی شامل ہیں جو انہوں نے IALS کانفرنسوں میں پیش کئے۔ ایک مقالہ اسلام آباد

(پاکستان) میں 1995 میں منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں پڑھا۔ باقی The Tibet Journal
New Hope (Srinagar) اور Ladakh Culture at the Crossroads
(edited by Monisha Ahmad and Clare Harris, 2005) اور دیگر متعدد
ملکی رسالوں اور جریدوں میں چھپے ہیں۔ اُن کا تازہ ترین مقالہ "Leh through the
Ages" چودھویں IALS کانفرنس میں پڑھا گیا جو 2009ء میں لیہہ میں منعقد ہوئی۔

کتاب میں شامل مضامین کو کچھ اس مخصوص انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ جس سے حاشیاتی اور حوالہ جاتی مطالعے یا اظہار میں قاری کو مدد ملتی ہے۔ کتاب میں شامل اُردو، لداخی اور تبّتی حروف کو نقل کرنے یا دوسری زبان میں منتقل کرنے کی قاری کو ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ اس کام کو بھی بسا اوقات مصنف نے صوتیاتی عمل کے ذریعے دلکش پیرائے میں پیش کیا ہے۔ حالانکہ کہیں کہیں تفاصیل کے حوالے سے کچھ معمولی غلطیاں ہوئی ہیں۔ نیز اصل مضمون یا مقالے کی نسبت کسی جگہ بہت تفصیل فراہم کی گئی ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی کتاب میں شامل شُدہ مضامین کے مشمولات وہی ہیں جو اس سے قبل کے اصل مضامین کا خاصہ رہے ہیں۔ مصنف نے اپنی اس تصنیف کے آخر پر مخصوص انداز سے کتابیات ترتیب دی ہے جس میں شامل 130 سے زائد حوالہ جات مصنف کے وسیع مطالعے کی بخوبی عکاسی کرتے ہیں۔

تاریخی تناظر:

کتاب میں شامل مضامین کو موضوعاتی طور مُرتب کیا گیا ہے نہ کہ تقویمی طور اور اِس ضمن میں مصنف نے اپنی دلچسپیوں کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ کتاب میں شامل چار تاریخی مقالوں میں پہلا مقالہ History of Ladakh: A New Perspective یعنی تاریخ لداخ: ایک نیا تناظر، خطۂ لداخ کی تاریخ لکھنے والے معروف مورخوں اے۔ ایچ فرانکی حشمت اللہ خان اور جوزف گرگن پر تنقیدی جائزے کے ساتھ ساتھ ہم عصر سکالروں لوسینو پیٹیک اور روبرٹو وٹالی کی حالیہ تحقیق پر بھی تبصرہ پیش کرتا ہے۔ یہ دلچسپ مقالہ فرانکی کے اس ریمارک پر اختتام کو پہنچتا ہے کہ خطۂ لداخ کی تاریخ بار بار لکھنے کی ضرورت پڑے گی کیونکہ مستقبل میں اس حوالے سے نیا تحقیقی مواد دستیاب ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں شامل دوسرا مضمون "Leh-Through the Ages" اُن

ماخذوں کا احاطہ کرتا ہے جس سے شیخ صاحب کے اپنے آبائی قصبے لیہہ کی تاریخ ماخوذ ہے۔ مصنف نے دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ اُن مغربی سیاحوں کی رپورٹوں کو بھی قلم بند کیا ہے جو وقتاً فوقتاً لیہہ کی سیاحت پر آئے ہیں۔ مقالے کے آخر پر انہوں نے اس تاریخی قصبے کو اپنے بچپن یعنی 40 کی دہائی کے دِنوں کو یاد کرتے ہوئے دیکھنے اور پرکھنے کی سعی کی ہے۔

کتاب کا اگلا مضمون "Kargil from the Perspective of Historical Travellers and Government Officials" سابقہ مضمون کے مشابہ لداخ کے دوسرے اہم قصبے کرگل کے تاریخی ماخذوں پر تبصرہ کرتا ہے۔

کتاب کے اس حصے کا اختتامی مضمون اس سے پہلے 1997ء میں IALS کے آرہس (ڈنمارک) میں منعقد ہوئے سیمنار میں پیش ہوا۔ یہ دلچسپ مضمون 1830ء سے لے کر 1947ء تک کے ڈوگرہ اقتدار کے دوران سرزمین لداخ کی اقتصادی صورتِ حال کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ مصنف کے مطابق عمومی طور رومانوی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جانے والا لداخ خطہ اُس دور میں اقتصادی بدحالی کا شکار تھا۔

لداخ اور تبت میں اسلام:

کتاب کا اگلا حصہ پانچ مضامین پر مشتمل ہے، لیہہ کے مُسلم طبقے کے تبت اور وسط ایشیا سے تعلقات کی عکاسی کرتا ہے۔ پہلے مضمون A Brief History of Muslims in Ladakh یعنی ''لداخ کے مسلمانوں کی مختصر تاریخ'' میں لداخی مسلمانوں کے کردار پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے جو انہوں نے لداخی تہذیب وتمدن کو دوام بخشنے میں نبھایا ہے۔ جبکہ دوسرا مضمون ''لداخ میں صوفی ازم کی روایات'' پر مرکوز ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے اُن متعدد صوفیوں کی لداخ آمد اور اُن کی دینی اور روحانی خدمات پر بات کی ہے شیخ صاحب نے اس مضمون میں یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ بودھ مت کی طرح صوفیت میں بھی پیر طریقت یا گورو کے تئیں فرمان برداری کا درس ہے۔ مضمون کے آخر پر مصنف نے بودھوں اور مسلمانوں کے مابین مذہبی رواداری پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس رواداری کو قائم ودائم رکھنے میں صوفیت کا عنصر کارفرما ہے۔

لیہہ میں اسلامی فن تعمیر کے عنوان کے تحت اس حصے کے تیسرے مضمون میں مصنف نے خطۂ لداخ میں دلکش اور یادگار فن تعمیر کا ذکر کرتے ہوئے شے اور لیہہ کی قدیم مسجدوں کی تاریخ پر نظر ڈالی ہے۔ لداخ کے شاندار ثقافتی ورثے میں مسلمانوں کی دین پر بات کرتے ہوئے وہ مشہور معروف بلتی کاریگر ژندن علی کی مثال دیتے ہیں، جنہوں نے مشہور لیہہ پیلس کے داخلی دروازے کی تعمیر اور اس کے جھروکوں کی عمدہ اور نفیس طریقے سے تزئین کاری میں بُنیادی رول نبھایا ہے۔

کتاب کے اس حصے کے اگلے دو مضامین لداخ کے آرغون مسافروں اور ان کی تبت اور وسط ایشیا روانگی سے متعلق ہیں۔ ان مسافروں میں چند انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے مشہور و معروف دریافت کاروں سے وابستہ ہیں جن میں فرانسس ینگ ہاسبنڈ اور سوین ہیڈن شامل ہیں۔ ارغون مسافروں کی کارکردگی کی اُس حد تک پذیرائی نہ ہوئی، جس کے وہ مستحق تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں مذکورہ دریافت کاروں کے افسرانِ مجاز کا بھی عمل دخل ہو، جن کے ماتحت وہ کام کررہے تھے۔ مضمون (Some well-known Adventurers of Ladakh) (چند نامور مہم جو لداخی) میں اس دور کے سرکردہ آرغون مسافروں کا تذکرہ ہے۔ جن میں محمد عیسیٰ، رسول گلوان، غلام رسول، شکور علی اور زنسکار کا ایک بودھ چھومبیل شامل ہے۔ مضمون ہذا میں رسول گلوان کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے جو لداخ کا معروف آرغون مہم جو مسافر تھا اور اپنی کتاب Servant of Sahibs کے لئے مشہور ہے۔ یہ کتاب 1923ء میں چھپی۔

کتاب کے اس حصے کے آخری مضمون میں تبّتی مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی گئی ہے، جس میں خاص طور پر لہاسہ کے کھاچے طبقے جو لداخ کے اکثر آرغون خاندان کا رشتہ دار مانا جاتا ہے، کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ اس طبقے کی ایک مشہور شخصیت فضل اللہ ہے، جو تبّتی زبان میں لکھی اخلاقی پند و نصائح پر مبنی کتاب ''کھاچے پھالُو'' کا مصنف ہے۔ یہ کتاب تبت اور لداخ کے بودھ اور مسلمانوں میں مشترکہ طور مقبول ہے۔

عبدالغنی شیخ اپنی تحریروں میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ بودھ اور مسلمان دونوں روحانی پیشوا دلائی لامہ کے تئیں گہری عقیدت رکھتے ہیں۔

علاقائی تناظر:

لداخ ہندوستان اور وسط ایشیا کے اہم ترین تاریخی تجارتی راستے پر واقع ہے۔ تبت کے ساتھ اس کے مذہبی تعلقات رہے ہیں۔ یہ علاقائی اثرات لداخ کی تاریخ میں ایک متاثر کن کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ ''لداخ اور اُس کے ہمسایے۔ ماضی اور حال'' (Ladakh and its Neighbours: Past and Present) عنوان کے تحت مضمون میں شیخ صاحب نے ساتویں صدی عیسوی سے لے کر ماضی قریب کے لداخ کے علاقائی تعلقات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ 'وسط ایشیائی تجارتی راستے' (Central Asian Trade Routes) اور 'وسط ایشیا کے ساتھ لداخ کے تعلقات' (Ladakh's Relations with Central Asia) عنوانات کے تحت مضامین میں مصنف نے چینی تُرکستان اور لداخ اور وسط ایشیا کے قریبی اقتصادی اور تہذیبی تعلقات کی عکاسی کی ہے جو زمانے کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود تقریباً بیسویں صدی کے وسط تک قائم و دائم رہے۔

کتاب کے اس حصے کے اختتام پر انہوں نے اپنے مضمون "Ladakh and Baltistan through the Ages" میں لداخ اور بلتستان کی مُشترکہ تہذیبی قدروں کا اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دونوں خطے 1947ء سے ہندوستان اور پاکستان کے مابین جاری کشیدگی کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ رہے ہیں۔ یہ تقسیم خود عبدالغنی شیخ کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوئی کیونکہ شیخ صاحب کے برادرِ اکبر جو 1947ء سے اسکردو (بلتستان کا دارالخلافہ) میں سکونت پذیر تھے، تقسیم وطن کے بعد پھر کبھی لداخ واپس نہ آسکے۔

کلچر اور تبدیلی کے مظاہر:

زیر نظر تصنیف کا چوتھا اور آخری حصہ مصنف کی خواہشات، احساسات نیز دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ ان کی اس سوچ کا بھی مظہر ہے کہ ہم عصر اقتصادی اور سماجی ترقی مثبت تبدیلیوں کی صورت میں اُبھر آنی چاہیئے نہ کہ منفی نتائج کی شکل میں۔ مضمون ''لداخ کی تہذیب و تمدن صدیوں سے'' خطے پر پڑنے والے مختلف تہذیبوں کے اثرات کا دور رس عکاس ہے۔ کتاب کے اس حصے کے اگلے تین ابواب 'لداخ کے گُنپے' (Monastries of Ladakh)، لوک گیت اور لوک ناچ (Folk

Songs and dances) اور تہوار (Festivals) خطے کی تہذیب وتمدن کے اہم اور مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہیں۔

اِس تصنیف کا سب سے تیکھا مضمون ''گوکشو گاؤں: تہذیب کا مشترکہ سنگم'' رہا ہے۔ ماضی کی طرف نظر دوڑائی جائے تو یہ دونوں فرقے (بودھ اور مسلمان) ایک ساتھ امن وآشتی سے رہے ہیں، یہاں تک کہ دونوں ایک ہی ہانڈی میں سے کھانا بھی پروستے رہے ہیں۔ لیکن آج حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ دونوں فرقے قطبین کی طرح ایک دوسرے سے الگ اور دور ہو گئے ہیں جو خطے میں حالیہ سماجی اور سیاسی صورت حال کا نتیجہ ہیں۔

کتاب میں شامل مضمون گیشس ایشے ٹنڈپ (Gashes Ishey Tondup) بیسویں صدی عیسوی کے لداخ کے ایک معزز ترین بودھ رہنما گیشس ایشے تنڈپ کے تیئں خراجِ عقیدت ہے۔ لداخ کے ستوق گاؤں میں پیدا ہوئے گیشس ایشے تنڈوپ نے تاشی لُومبُو میں تعلیم حاصل کی۔ 1930ء میں وہ لداخ واپس آئے۔ انجام کار وہ بودھ مت اور کلاسیکی تبّتی کے ایک جانے مانے اور ذی احترام اُستاد قرار دیئے گئے۔

''لداخ کے جنگلی جانور'' (Wildlife in Ladakh) نامی مضمون میں مصنف نے لداخ کے ماحولیات پر جدید ترقی کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اُنیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے لداخ کی سیاحت پر آنے والے سیاحوں کے مُشاہدات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ تب خطے میں جنگلی جانوروں کی بہتات تھی۔ آج کل صورت حال دگرگوں ہے۔

کتاب کے اختتام پر عبدالغنی شیخ نے دریائے سندھ کے تاریخی اور تہذیبی پسِ منظر میں سنگے کھابس یعنی دریائے سندھ سے متعلق لکھا ہے:

''دریائے سندھ فقط ایک دریا ہی نہیں بلکہ خطے کی ثقافت کی علامت بھی ہے۔''

......●●●......

* جان بیرے، پریزیڈنٹ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹڈیز (IALS)

! یہ مقالہ عبدالغنی شیخ کی کتاب، Reflections on Ladakh, Tibet and Central Asia کا تعارفی نوٹ ہے۔

☆......ڈاکٹر اشرف آثاری

عبدالغنی شیخ لداخی کا تخلیقی بیانیہ

معروف نقاد کلیم الدین احمد کہتے ہیں کہ ''فکشن کا سارا کاروبار الفاظ کے رہین منت ہے پلاٹ، کردار، مکالمہ اور موضوع حتیٰ کہ مختلف انواع کے تصورات، سب کا دارومدار الفاظ پر ہے پھر ''بیانیہ'' میں الفاظ کی اہمیت کیوں نہ ہو؟''

پلاٹ، کردار، موضوع، وحدتِ تاثر وغیرہ سب خصوصیات اپنی جگہ پر، لیکن بیانیہ کی اہمیت و افادیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے خوبصورت و موثر بیانیہ سے افسانوں کا متوصف ہونا سونے پر سہاگہ والی بات ہے بیانیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر فکشن تلوار ہے تو بیانیہ اس کی دھار، کیونکہ بیانیہ سے ہی فکشن میں اسلوب اور امتیازی شان، خوبصورت آہنگ، مربوط ماجرا سازی، ترسیل یا قاری کے ذہن تک رسائی وغیرہ ممکن ہے۔ الفاظ سے بیانیہ تشکیل پاتا ہے اور پھر بیانیہ سے افسانہ۔

خوبصورت بیانیہ افسانہ کی افسانویت کو جلا بخش دیتا ہے اور ان کی جان ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کے تعلق سے جن معروف اور معتبر افسانہ نگاروں نے ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ادوار میں سانس لینے کے باوجود بھی اپنا انفراد اور اختصاص قائم رکھا، ان میں عبدالغنی شیخ لداخی کا نام بھی سرِ فہرست ہے۔ کئی دہائیوں پر محیط اپنے فعال اور متحرک افسانوی سفر میں، یہ آج تک بالکل اطمینان و اعتماد کے ساتھ رواں دواں ہیں کہ نہ تو انہیں خوبصورت رنگ برنگی کاغذی پھولوں کی رنگت ہی اپنی طرف متوجہ کرسکی اور نہ ہی وقتی اور چکا چوند کر

دینے والی روشنی ہی ان کی نگاہوں کو خیرہ کرسکی۔ اس بات کی تائید وحمایت میں ان کے اولین افسانوی مجموعے اور تازہ ترین افسانوی مجموعے کو پیش کیا جاسکتا ہے جن کے مطالعے سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے اور میری متذکرہ بات کی تائید وحمایت بھی۔

ایک عرصہ قبل میں نے ان کا افسانہ 'آج کل' میں پڑھا تھا جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔ افسانے کا دھندلا سا عکس آج تک میرے ذہن میں موجود ہے جو ایک ایسے شخص کی کہانی تھی جو مذکورہ افسانے کے واحد متکلم کا دوست تھا اور افسانہ نگار کی سرحدی علاقے میں سکونت کے باعث، تقسیم کے وقت اس پار پاکستان چلا گیا تھا اور اس نے اپنا ایک مقفل پرانا صندوق اپنے دوست کے پاس بطورِ امانت رکھا تھا جس کی زندگی اپنے دوست کی اس امانت کی حفاظت میں گزر گئی اور پھر جب ایک لمبے عرصہ کے بعد صندوق کو کھولا گیا تو اس میں دو چار ضروریات زندگی کی معمولی چیزیں نکل آئیں چند دہائیوں پر محیط گزرے ہوئے وقت نے بوسیدہ اور ناکارہ بنادیا تھا جس سے اس افسانے کے واحد متکلم کے پاؤں تلے زمین کھسک گئی کہ اپنے دوست کی کس امانت کی پہرہ داری کرتے ہوئے اس کی زندگی گزر گئی؟ بظاہر یہ ایک معمولی واقعہ تھا لیکن افسانہ نگار نے افسانہ نگاری کے فن سے مکمل آگاہی اور تجربہ رکھتے ہوئے بڑی مہارت اور چابکدستی سے، خوبصورت اور موئثر بیانیہ سے اپنے افسانے کو شاہکار بنادیا تھا کہ یہ قارئین کے ذہن سے آج تک نہیں اتر پایا ہے جبکہ اس دوران اینٹی اسٹوری اور اینٹی پلاٹ والے کتنے ہی تجریدی اور مبہم علامتی افسانے پڑھ کر ہمارے سروں سے گزر گئے ہوں گے کہ جیسے پڑھے ہی نہیں تھے۔

حال ہی میں اگست 2015 میں عبدالغنی شیخ لداخی کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''دو ملک ایک کہانی'' چھپا ہے اور اس میں بطور خاص میں ''دو ملک ایک کہانی'' افسانے کا ہی ذکر کروں گا جو تقسیم کے موضوع پر ہے اور ایک الگ انداز سے لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی، اس کے واحد متکلم کے بڑے بھائی کی کہانی ہے جو 38 برس بعد پاکستان سے اپنے آبائی وطن پہنچنے والے تھے جو ڈوگرہ سرکار کے آخری وزیر لالہ امرناتھ کے ہمراہ اسکردو روانہ ہو گئے تھے کہ بٹوارہ ہو گیا اور وہ پاکستان والے علاقے میں رہ گئے اور یہیں سے اس کہانی کا نقطہ آغاز شروع ہوجاتا ہے۔ لاتعداد نشیب وفراز آجاتے ہیں عزیز واقارب کی دوسری شادی کی خبر آنے، بچوں کی شادیاں ہوجانے اور نئی نئی نوکریاں لگ جانے جیسے روزمرہ زندگی میں

پیش آنے والے لاتعداد واقعات کا ذکر ہوتا ہے اور پھر 38 برس بعد بھائی صاحب کا اپنے آبائی وطن آکر اپنے پرانے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے اور بغل گیر ہونے کا تذکرہ بھی ہے۔ یادیں، آہیں، آنسو اور سسکیاں ہیں اور بچپن کی میٹھی میٹھی یادیں اور دوستوں اور رشتہ داروں سے بچھڑنے کا غم بھی ہے۔

بٹوارہ اسی کو کہتے ہیں یہ زمین و جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہے بلکہ دلوں اور روحوں کا بٹوارہ ہے اور افسانہ نگار اپنے خوبصورت متاثر کن اور فکر انگیز بیانیہ سے اسے اور بھی یادگار بنا دیتے ہیں جس کا اندازہ اس مختصر سے اقتباس سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

''بٹوارہ ایک ملک کا نہیں ہوا تھا، ایک شہر کا، ایک قصبہ کا، ایک گاؤں کا اور ایک خاندان اور گھر کا ہوا تھا۔ لائن آف کنٹرول کے آر پار سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو ہل جوتنے، پانی دینے، فصل کاٹنے اور کھلیان جمع کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے لیکن جب ایک بھائی دوسرے بھائی سے ملنا چاہتا ہے تو لہہ یا کرگل آنا پڑتا ہے۔ لہہ سے دہلی ہوائی جہاز سے پرواز کرتا ہے۔ مہینوں کی تگ و دو اور انتظار کے بعد اگر ویزا ملے تو وہ کراچی، اسلام آباد یا لاہور جاکر اپنے بھائی سے ملاقات کرسکتا ہے۔ وہ بھی بھائی کے گاؤں میں نہیں، اپنے بھائی کے گاؤں سے اتنا قریب ہوکر بھی وہ اس گاؤں سے بہت دور ہے۔ آسمان کے ایک تارے کی طرح، جسے وہ دیکھ سکتا ہے، چھو نہیں سکتا۔''

اور پھر اسی افسانے کا اختتام ان سطور سے ہوتا ہے کہ

''ہندوستان اور پاکستان کی 65 سالہ مشترکہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں، کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کبھی تو وہ کہانی ضرور لکھی جائے گی جو بچھڑے دلوں کو ملا دے گی۔''

افسانوی مجموعے میں 45 کے قریب افسانے شامل ہیں جو مختلف موضوعات پر الگ الگ خوبصورت عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر افسانہ نگار موصوف کے طویل وقفے پر محیط ان کی فنی اور علمی معلومات و مشاہدات اور ان کے اسلوب و انداز اور سب سے بڑھ کر ان کے خوبصورت بیانیہ کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بیانیہ کے فن سے ناآشنا فکشن نگار زندگی سے متعلق حقائق کا بیان احسن طریقے سے نہیں کرسکتا کیونکہ فن افسانہ کے جزئیات میں بیانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے اس کے بغیر فکشن کا تصور بھی ناممکن ہے

تقریباً تمام اصناف سخن اس کی محتاج ہیں اس لئے اس پر مکمل دسترس ضروری ہے۔ عبدالغنی شیخ لداخی کا افسانوی ادب خوبیوں سے آراستہ ہے اور انہیں بیانیہ پر بھی کامل دسترس حاصل ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جدیدیت کے دور میں اردو افسانے میں بیانیہ گم ہوگیا تھا۔ بیانیہ ہی کیوں؟ راوی، کردار، کہانی پن، قصہ، منظر یہ سب بنیادی ارکان گم ہو گئے تھے اور اب ان کی واپسی ہوئی ہے جو ایک نیک فال ہے اور بذاتِ خود ان لوگوں کے لئے بیانیہ کی زبردست اہمیت وافادیت کا ثبوت بھی جو اس سے منحرف ہوگئے تھے۔ ایک اچھا اور زوردار بیانیہ فکشن نگار کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر صحت مند تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ یہ اس کی فنی اور مشاہداتی بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔ بیانیہ کی گمشدگی سے افسانوں میں قصص کی روایت بھی غائب ہوگئی تھی۔ دورِ جدیدیت میں بیانیہ کے انہدام کے لاتعداد تجربے کئے گئے جو کامیاب نہیں ہوئے بے جا ابہام، نامانوس علامتی پیرایہ، تجریدیت، لایعنیت سے نہ اردو افسانے کے قاری پر ہی پکڑ مضبوط ہوسکی اور نہ افسانے کے مزاج ومنہاج نے ہی اسے قبول کیا۔ حالانکہ اس دور میں بھی کچھ یادگار اور شاہکار افسانے جیسے 'بجوکا'، 'پوشاک'، 'پرندہ پکڑنے والی گاڑی' اور پاکستان میں 'آخری آدمی'، 'کونپل'، 'زمین کا نوحہ' وغیرہ افسانہ تخلیق ہوئے جبکہ ایک بھی قابل ذکر ناول سامنے نہیں آیا۔ شاید جدیدیوں کے پاس آفاقی وژن، کامل تخلیقی صلاحیت اور جوان اور موثر قابلِ فہم بیانیہ نہ تھا۔ حالانکہ یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ جدید افسانہ ہر کسی کے لئے نہیں لکھا جاتا اور نہ اسے قاری یا نقاد کی ضروریات ہے لیکن یہ سب پھر ایک مفروضہ ہی ثابت ہوا۔ اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔

سلام بن رزاق کے اس قول کی کہ "تکنیکی طور پر ایک ہزار تجربے کیے جائیں مگر افسانہ، افسانویت کے بغیر اس خوشنما پھول کی مانند ہے جس کی خوشبو چھین لی گئی ہو۔۔۔"

یہ بات آج بھی قابلِ توجہ اور تحقیق طلب ہے کہ عالمی، ملکی اور پھر مقامی سطح پر اردو افسانہ نگاروں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس دوران بھی اپنی ڈگر پر قائم کیسے رہی؟ جبکہ سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا اور اسی شانِ رفتہ سے افسانے، ڈارمے، ناول وغیرہ تخلیق کرتے رہے جیسے وہ قبل کر رہے تھے۔ مقامی طور پر اس ضمن میں نور شاہ، عبدالغنی شیخ، وریندر پٹواری، دیپک بدکی اور عمر مجید وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

عبدالغنی شیخ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مختلف ادوار میں مختلف نعروں کی گونج سے متاثر نہیں

ہوئے، منٹو، بیدی، عصمت، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں کی پیروی کرتے ہوئے، اردو افسانے میں ہونے والے تجربوں، جیسے جدید افسانے، منی افسانے یا افسانچے، تجریدی افسانے، تمثیلی افسانے یا پھر علامتی افسانے لکھنے والوں کی صف میں شامل نہیں ہوئے بلکہ آج تک اپنی ہی منفرد و مخصوص دھن میں مست ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں آج بھی کردار، واقعات، مکالمے، پلاٹ اور کہانی پن جیسے لوازمات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی سب چیزیں تو ایک اچھی کہانی کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں اور انہیں سے فکر و معنیٰ اور احساس و ہنر کو جلا ملتی ہے اور شاہکار افسانے تخلیق ہوتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس آج تک کہانی پن زندہ و پائندہ ہے۔ ان کی کہانیاں اپنی منزل کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہیں اور اپنے موثر و مناسب تخلیقی بیانیہ سے آراستہ اپنے مرکز کی طرف سفر کرتی ہوئیں نظر آتی ہیں اور مکمل طور پر عصری شعور و آگہی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی بجا ہے کہ ہر ادیب زندگی کے ہر پہلو اور معاملے پر اپنا ایک مخصوص نظریہ اور موقف رکھتا ہے۔ ذات، فرد، سماج، حیات و کائنات اور زبان و مکان کے بارے میں اس کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ افسانہ ہمیشہ اور ہر دور میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کا ترجمان رہا ہے۔ عبدالغنی شیخ بھی بڑی دردمندی کے احساس کے ساتھ زندگی سے متعلق انہی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں۔ سب افسانہ نگار یہی کرتے ہیں لیکن ہر ایک کا اپنا اپنا منفرد اسٹائل ہوتا ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا مخصوص انفراد ہوتا ہے جو ہر ایک کو ایک دوسرے سے الگ اور مخصوص بنا دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں اپنے موضوعات کی وسعت بھی ہے اور فکر و نظر کی گہرائی و گیرائی بھی ہے۔ زبان و بیان کی سادگی و روانی بھی ہے، شعور و فکر کی پاکیزگی و صفائی و ستھرائی بھی ہے اور الفاظ و استعارات کا وافر ذخیرہ بھی، نئے اور اچھوتے موضوعات کا تنوع بھی ہے اور صحیح الفاظ کو برتنے کا سلیقہ بھی ہے۔ انہی خصوصیات سے ان کا بیانیہ تشکیل پاتا ہے اور یہی بیانیہ اردو افسانہ نگاری میں ان کی مخصوص پہچان بن گیا ہے۔

......●●●......

☆......ولی محمد اسیر کشتواڑی

''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'': ایک تجزیاتی مطالعہ

''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' (مطبوعہ ۲۰۱۷ء) مردِ کوہستانی عبدالغنی شیخ کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں لداخ سے متعلق اُن کے قلمبند کئے گئے تواریخی، تحقیقی اور معلوماتی پندرہ مضامین شامل ہوئے ہیں۔ عبدالغنی شیخ نے اِس کتاب کا انتساب مدن پال ورما اور ستنزین وانگبو کے نام کیا ہوا ہے جو بقولِ مصنف اُردو زبان وادب سے گہری محبت رکھنے کی وجہ سے شیخ صاحب کی زبردست عزت کیا کرتے تھے۔ اپنی کتاب کی اہمیت میں اضافہ کرتے ہوئے مصنف نے آٹھ صفحات پر ۱۵ نادر تصویریں بھی شامل کی ہیں جن کو دیکھ کر لداخ کی تہذیب وثقافت کی قدامت اور رنگارنگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ زیرِ بحث تصنیف کو حتمی شکل دینے میں لگ بھگ 91 مُستند اور معتبر ماخذوں سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے جن میں اے۔ ایچ فرینکی، ایلیگزنڈر کننگھم، رابرٹ وٹالی، ایس۔ ایس۔ گیرگن، کرنل ذاکر، مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی، چمن لال دتا، پی۔ این۔ کول، اے۔ جی نورانی، مرزا محمد حیدر، کاچو سکندر خان، غلام محی الدین صوفی، فریڈرک ڈریو، رسول گلوان اور وِکاس کھتری وغیرہ وغیرہ کی مشہور اور قدیم وجدید کتابیں بھی شامل ہیں۔ ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' عنوان کی یہ کتاب لیہہ لداخ کے سب سے زیادہ شہرت یافتہ اُردو قلمکار عبدالغنی شیخ کی اُنیسویں شائع شدہ تصنیف ہونے کے باعث مواد اور عبارت کے لحاظ سے قارئین کی دلچسپی کا باعث بن رہی ہے۔ شیخ صاحب کا طویل ادبی اور تخلیقی سفر ہم جیسے شہری علاقوں میں رہنے والوں کے لئے باعثِ رشک ہے۔

عبدالغنی شیخ ''پیش لفظ'' کے ذیل میں اپنی اِس کتاب سے متعلق جانکاری فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔۔۔

''زیرِ نظر کتاب ''لداخ کی تاریخ کے اہم گوشے'' کئی اہم موضوعات کا احاطہ کرتی ہے جو قومی اور ملکی اہمیت کے حامل ہیں اور جن کے چرچے ساری دُنیا میں ہوتے رہے ہیں جیسے مضمون ''سیاچن گلیشیئر'' بتاتا ہے کہ یہ کیسے دُنیا کا بلند ترین میدانِ جنگ بنا؟۔لداخ کا جغرافیائی محل وقوع اپنے تاریخی پسِ منظر میں ہندوستان اور چین کے ماضی اور حال کے سرحدی تنازعہ کو اُجاگر کرتا ہے''۔

(صفحہ۔۷)

لداخ کی تاریخ پر انگریزی، اُردو اور لداخی میں لکھی گئیں کتابوں سے تیار کردہ منظر نامہ پیش کرتے ہوئے شیخ صاحب اپنے مضمون ''تاریخِ لداخ : نئے تناظر'' میں تحریر کرتے ہیں کہ ۔۔۔''لداخ کے موضوع پر ڈاکٹر ایچ فرانکی کی کتاب '' A History of Western Tibet'' ہے۔یہ ۱۹۰۷ء میں چھپی۔وہ موراوین مشن لیہہ سے وابستہ تھے اور لداخ کی تاریخ اور ثقافت پر کام کرنے والوں میں پیش رو ہیں۔فرانکی سے پہلے ایک انگریز الیگزینڈر کننگھم کو انگریزوں نے ۱۸۴۷ء میں ایک سفارتی مشن پر لداخ بھیجا تھا۔لداخ پر اُن کی اہم تصنیف Ladakh Physical, Statistical and Historical (1851) کے نام سے شائع کی گئی ہے۔ کتاب میں زیادہ تر لداخ کے جغرافیہ، آب وہوا، نسل، مذہب اور زبان کے احوال دیئے ہیں''۔اس مضمون میں حشمت اللہ خان لکھنوی، منشی عبدالستار، گیرگن صنم، ایس۔ایس گیرگن، لوسیانو پیٹیک اور دوسرے مورخین کی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے جو لداخ سے متعلق بنیادی تاریخی، ثقافتی اور سیاسی جانکاری دیتی ہیں۔جدید دور میں لکھی گئیں لداخ سے تعلق رکھنے والی کتابوں کا بھی سرسری جائزہ لیا گیا ہے جن میں سے ٹشی ربگیس کی ''ماریول لداقس کی سگون ربس کونسل میلونگ زلیس بیاباز و گس سوریک پاپو (۱۹۸۴ء) شری دھر کول اور ایچ این کول کی '' Ladakh through the Ages: Towards a New Indentity'' (۱۹۹۲ء) ایچ۔این کول کی

“Rediscovery of Ladakh” (۱۹۹۲ء) اور صدیق واحد کی Ladakh Between Earth and Sky (۱۹۸۱ء) خاص طور پر نمایاں ہیں۔ شیخ صاحب نے اِن ساری کتابوں پر اپنی ناقدانہ رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

”اُمید ہے کہ یہ کتابیں اور دوسرے وسائل اُبھرتے ہوئے لداخی اسکالروں میں لداخ کے موضوع پر بہتر کتابیں لکھنے کی محرک ہوں گی۔ میں یہاں ڈاکٹر فرنکی کے الفاظ دہراؤں گا جو اُنھوں نے ایک صدی پہلے اپنی کتاب ”A History of Western Tibet“ کے پیشِ لفظ میں لکھے تھے۔

۔۔۔”اس میں کوئی شک نہیں کہ اگلے پچاس سال میں اس موضوع پر اس سے ایک بہتر اور معتبر کتاب لکھنا ممکن ہوگا“

(صفحہ:۲۲)

کتاب کے دوسرے مضمون ”لداخ کا جغرافیائی محلِ وقوع۔ اس کے مُثبت، منفی اور چین سے سرحدی تنازعہ“ میں شیخ صاحب لداخ کا جغرافیائی محل وقوع بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

”لداخ کا محلِ وقوع گہری اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مشرق میں تبت، شمال میں مشرقی ترکستان (شین جیانگ)، شمال مغرب میں بلتستان، مغرب میں کشمیر اور ڈوڈہ (وادیٔ چناب) اور جنوب میں ہماچل پردیش اور پنجاب ہیں۔ لیہہ وسطِ ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ وسطِ ایشیا کے ملکوں تبت، پنجاب، کشمیر، ہماچل پردیش اور بلتستان کے تاجر لیہہ آتے تھے اور اشیا کی خرید و فروخت اور تبادلہ کرتے تھے۔ تجارت کے علاوہ تبت، کشمیر اور بلتستان سے لداخ کے سماجی، ثقافتی اور مذہبی تعلقات تھے۔ اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے ہمسایہ ملکوں اور خطوں میں لداخ کی بڑی قدر و قیمت تھی جس سے لداخ کو فائدہ اور نقصان دونوں پہنچے ہیں۔ کبھی منگول حکمران تبت پر حملہ کرتا تھا اور کبھی مشرقی ترکستان (شین جیانگ) میں بغاوت ہوتی تھی۔ دونوں خطوں کی سرحدیں

لداخ سے ملتی ہیں۔اس لئے لداخ چین کے دونوں خطوں کے بارے میں صحیح
معلومات فراہم کرسکتا تھا“۔

(صفحہ:۲۳)

اس مضمون میں لداخ کی مناسبت سے چین اور ہندوستان کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اسے تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(i) ساتویں صدی سے نویں صدی کا زمانہ: جب لداخ، وسطِ ایشیا، گلگت اور بلتستان کا پورا خطہ ایک بڑا سیاسی اور فوجی اکھاڑہ بنا تھا اور چین، تبت، کشمیر اور عرب حکومتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوئی تھیں۔

(ii) اٹھارہویں صدی سے اوائل بیسویں صدی کا زمانہ: جب زارِ روس نے توسیع پسند پالیسی اختیار کی تھی اور برصغیر ہند کی سرحد پر لداخ اور گلگت کو فوری طور خطرہ لاحق ہوگیا تھا جسے تاریخ میں Great Game کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اور

(iii) موجودہ دور چین میں کیمونسٹ حکومت برسرِ اقتدار آنے کے بعد سرحدی تنازعہ نے دوبارہ سر اُٹھایا ہے اور معاملات سنگین صورت اختیار کررہے ہیں۔ اس تنازعے کا تاریخی منظر پیش کرتے ہوئے شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ۔۔۔

”۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی مسئلے پر لمبی گفت وشنید ہوئی اور فریقین نے اپنے دعوے پیش کئے لیکن دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ۱۹۵۸ء میں ہندوستان نے شکایت کی تھی کہ چین کے نقشے میں مشرقی لداخ کا بڑا علاقہ دکھایا گیا ہے جو جموں وکشمیر کا حصہ ہے۔ نہرو نے ۱۴ردسمبر ۱۹۵۸ء کو اپنے ایک خط میں یہ بھی واضح کیا تھا کہ شمال مشرقی فرانیٹر ایجنسی (اروناچل پردیش) دیرینہ طور پر ہندوستان کا علاقہ تسلیم کیا گیا ہے۔اس کے جواب میں چواین لائی نے ۲۳ جنوری ۱۹۵۸ء کو لکھا کہ چین۔ ہند سرحد کی کبھی حد بندی نہیں ہوئی ہے۔اکتوبر ۱۹۶۲ء میں چین نے نیفا اور لداخ پر بیک

وقت دھاوا بولا۔ اس لڑائی میں ہندوستان کو سخت ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ حکومت نے دسمبر ۱۹۶۲ء میں لیفٹیننٹ جرنیل ہنڈرسن بروکس اور بریگیڈیئر پریم ایس بھگت کو جنگ میں شکست کی وجوہات کی تحقیقی ذمہ داری سونپی۔ انھوں نے اپریل ۱۹۶۳ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ تاہم حکومت نے اس رپورٹ کو ۱۵؍سال تک صیغۂ راز میں رکھا۔ ۲۰۱۴ء میں یہ رپورٹ جزوی طور پر منظر عام پر آئی۔ رپورٹ کے مطابق شکست کا سبب ہندوستان کی فارورڈ پالیسی تھی جو غلط سوچ کا نتیجہ تھا۔۔۔۔ چین لائن آف ایکچول کنٹرول کی نشاندہی پر لیت ولعل سے کام لے رہا ہے۔ ایل۔اے۔سی کی حد تعین نہ ہونے سے دونوں ملکوں کے مابین سرحدی بات چیت میں تعطل آیا ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں کے دوران چین اور ہندوستان کے مابین اعلیٰ اور نچلی سطحوں پر متعدد میٹنگیں ہوئی ہیں جن میں سرحد پر امن قائم رکھنے اور باہمی مسائل کو بات چیت سے حل کرنے کے سلسلے میں کئی معاہدے ہوئے ہیں لیکن کئی دفعہ چین نے خاص کر لداخ میں ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی ہے''۔

(صفحہ:۷۹۔۸۰)

اس تناظر میں کتاب کا یہ مضمون چین۔ ہندوستان کے موجودہ سرحدی تناؤ کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اپنے اندر کافی بُنیادی مواد سموئے ہوئے ہے جس کا مطالعہ ہر ہندوستانی دیش بھگت کو کرنا چاہیئے۔

کتاب کے تیسرے مضمون میں ''لداخ پر کپتان رمزے اور لبزانگ جیوا کا کی نگارشات'' کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی کتابیں بالترتیب ''Western Tibet, A Practical dictionary of the language and customs of the district included in the Ladakh Wazarat'' اور ''An English Budhist in Rizong Monastery'' کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ کپتان رمزے کی لداخ پر اپنی نوعیت کی

واحد کتاب ہے جس میں نہ صرف لداخی الفاظ کے متبادل انگریزی الفاظ یا معانی دیئے ہیں بلکہ الفاظ کے ذریعے لداخ کی ثقافت، رسم ورواج، لباس، عقاید، مالیہ، بیگار وغیرہ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ شیخ صاحب مذکورہ کتاب کے نگارشات کی چند جھلکیاں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ۔۔۔۔

''رمزے کے زمانے میں لداخ کا لڑکا لگ بھگ چودہ سے بیس سال اور لڑکی چودہ سے اٹھارہ سال کے درمیان شادی کرتی تھی۔ بودھ اور آرغون دونوں میں شادی کے لئے یہی عمر مروج تھی۔ بودھوں میں سگائی سے پہلے رشتے کی موزونیت سے متعلق جوتشی سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اگر جوتش میں قسمت ٹھیک نہ نکلے تو سگائی نہیں ہوتی تھی۔ لڑکا نہ ہونے کی صورت میں بڑی بیٹی کے لئے خانہ داماد لایا جاتا تھا۔ اولاد نہ ہو تو ایک رشتہ دار لڑکی کو گود لیا جاتا تھا۔ تین سے زیادہ بیٹے ہوں تو باقی کسی گُنپے میں بھکشو بن جاتے تھے۔ رمزے کے زمانے میں ''کھاؤں'' چھوٹا گھر میں عمر رسیدہ ماں باپ کی الگ رہائش کی سماجی رسم پر پوری طرح عمل ہوتا تھا۔ لداخی مرد اور عورتیں پٹو کے پاجامے پہنتی تھیں۔ بودھ عورتیں بچہ جننے تک سفید پٹو کے چوڑی دار پاجامہ پہنتی تھیں جبکہ ارغون عورتیں سفید پاجامہ شادی ہونے تک نہیں پہنتی تھیں۔ اس کے بعد سیاہ رنگ کا پاجامہ استعمال کرتی تھیں۔ لوگ میلوں، تماشوں کے بڑے شوقین تھے۔ رمزے لکھتا ہے کہ راستہ دشوار گزار اور دور افتادہ ہونے کے باوجود لوگ اُن دنوں زانسکار، چانگ تھانگ وغیرہ سے ہمس میلہ دیکھنے آتے تھے''۔

(صفحہ: ۸۴-۸۵)

شیخ صاحب رقمطراز ہیں کہ ''لبز انگ جیوا کا'' اندازاً ۱۹۵۹ء میں لداخ آیا جہاں اُن کو نو آموز بھکشو، گیزول کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں اُس نے اپنی کتاب شائع کی جس میں اس نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ مثلاً ایک صبح جیوا کا کو اچانک لندن کلب کی آسائشیں یاد آئیں جہاں آرام دہ بستر تھا اور ٹرالی پر پرتوسٹ، مربہ، انڈا اور Bacon (سور کا نمکین خشک گوشت) پر مشتمل

لذیذ ناشتہ لایا جاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔۔۔۔

''میں خوابوں کے اس طلسم سے فوراً باہر آیا اور لندن کو بھول گیا''۔ وہ ناگواری سے لکھتا ہے کہ اس کے چھوٹے سے کمرے میں دوسرے ساتھی بن بُلائے گھُس آتے۔ گپ شپ کرتے۔ اس سے سوالات پوچھتے۔ اونچی آواز میں کتاب پڑھتے اور اس کی پڑھائی میں مخل ہوتے تھے۔ ایسے ماحول میں کام کرنا مُشکل تھا۔ اُس نے ایک گیلونگ سمتن کو اپنی بپتا سُنائی۔ اس سے کچھ فرق پڑا۔''

شیخ صاحب مزید بتاتے ہیں کہ

''جیوا کا نے گیلونگ سمتھن کو کاغذ بناتے ہوئے دیکھا اور لکڑی کے بلاک پر سیاہی پوت کر اس کی تحریروں کو کاغذ کے صفحات پر چھاپتے دیکھا۔ جب لداخ میں اُس کے رہنے کے ویزا کی معیاد ختم ہو جاتی ہے تو لوبزانگ جیوا کا واپس جانے کی تیاری کرتا ہے۔ اگلی بہار میں دوبارہ ریزونگ گُنپا آنا چاہتا ہے۔ کُوشوق کہتے ہیں۔ ''اگلی دفعہ جب وہ آئے گا تو اُس کا رتبہ بڑھا کر اُس کو گُنپا کی لائبریری میں رکھا جائے گا''۔ ریزونگ گُنپا سے لیہہ تقریباً نوے کلومیٹر دور ہے۔ لبزانگ جیوا کی پُرانی پھٹی ہوئی چپل اُس کے لئے تکلیف دہ تھی۔ سپتیک میں اس نے رینگبو چھے کو اپنی چپل دکھائی اور لداخی پاپوش خریدنے کے لئے پچیس روپے اُدھار مانگے۔ رینگبو چھے نے تیس روپے دیئے۔ ایک فوجی طیارے میں وہ لیہہ سے لوٹا تو کوشوق بکولا اور راس رینگبو چھے نے اسے الوداع کیا۔

(صفحہ:۸۶۔۸۸)

یہاں اِس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ لبزانگ جیوا کا ایک انگریز ڈاکٹر تھا جس نے بدھ مت اختیار کر کے اپنا نام بدل کر لبزانگ جیوا کا رکھا تھا۔ اُسے تبّتی بُدھ مت سے گہری دلچسپی تھی اور اس

سے متعلق جانکاری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا یہ تجسس اس کو لداخ لے گیا جہاں وہ ایک مشہور گنپا ریزونگ میں لاما (بھکشو) بن گیا۔ اس نے گنپا کے باورچی خانہ میں بطورِ مددگار کام کیا۔ اُس کی کتاب کا نام ''An English Budhist in Rizong Monastery'' ہے۔

کتاب کے چوتھے مضمون ''بدلتا ہوا لداخ'' میں عبدالغنی شیخ نے نیشنل جیوگرافی میگزین کے مئی ۱۹۴۹ء، مئی ۱۹۶۳ء اور مارچ ۱۹۷۸ء کے پرچوں میں چھپے ہوئے تین سیاحوں کے لکھے ہوئے مضامین کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے لداخ کے بدلتے ہوئے حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک مضمون نگار فرانسیسی خاتون Lafugie (لافوگئی) ہیں جو غالباً ۱۹۴۵ء میں لداخ کی سیاحت پر گئی تھی۔ وہ ایک مصورہ تھی اور تبت کی جُزوی سیاحت کی تھی۔ لافوگئی کا مضمون مع فوٹو اور اس کے خاکے جریدے کے مئی ۱۹۴۹ء کے شمارے میں ''ایک عورت تبتیوں کے خاکے بناتی ہے'' کے عنوان سے چھپا۔ اس نے سرینگر میں سات ماہ کے لئے اشیائے خورد و نوش کمبل، خیمے وغیرہ خریدے تھے۔ مصورہ کے الفاظ میں اس لمبے سفر کے لئے اس نے صندوق کو چاندی سے بھر دیا۔ اٹھارویں روز وہ لیہہ پہنچی جہاں مختلف نسلوں کے لوگوں سے اُس کا آمنا سامنا ہوا۔ اس نے لیہہ کو Melting Pot کھچڑی نُما کہا ہے۔

شیخ صاحب لافوگئی کے مضمون کے چند اقتباسات پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ۔

''لافوگئی نے لداخی عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''انھوں نے گلے میں زیورات کانوں میں بندے، کلائیوں میں کنگن، سر پر کوبُرا نما سرپوش، پیرق اور تنگ موہری کا پاجامہ پہنا ہے۔ مردوں نے کمر بند سے چاقو، سوئی دان، لکڑی کی پیالی، خلال کے لئے دانت کُریدنی (Tooth Pick) اور تانبے کی کان کریدنی (Ear Pick) باندھی تھی''۔ وہ لیہہ کی ایک عورت اور اس کے تین شوہروں کا ذکر کرتی ہے۔ ''ان کا اکلوتا بچہ انھیں چچا کہتا ہے۔ مصورہ نے کچن میں بیٹھے ان کی رنگین تصویر بنائی ہے۔ عورت نے پیرق اور مردوں و بچوں نے کنٹوپ پہنا ہے۔ مردوں نے سفید اونی گونچا پہنا ہے جبکہ عورت اور بچے کا لباس سُرخ رنگ میں رنگا یا ہے''۔

اس نے شام کا کھانا یہیں کھایا۔ لداخیوں کے تئیں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتی ہے:

''لداخی سادہ، بے ضرر اور مہمان نواز ہیں جو اپنی عورتوں کو الگ نہیں کرتے اور کسی عیسائی کے ساتھ کھانا کھانے سے گریز نہیں کرتے۔'' قراقرم روانگی سے پہلے لافوگئی نے اپنے ٹٹو فروخت کئے اور یاک خریدے اور ۱۸۰۰۰ فٹ بلند خردونگ درّہ کے راستے قراقرم کے لئے روانہ ہوئی۔ واپسی پر وہ پنگ گونگ جھیل گئی جہاں وہ نہائی۔ اُس نے لکھا ہے کہ لداخی بہت کم نہاتے ہیں۔ وہ لہاسہ جانے کی مُتمنی تھی لیکن اس کی اجازت تبت میں گیانڑے کے گورنر کے حدِ اختیار میں نہیں تھی۔ لافوگئی کے خاکے ایک منجھے ہوئے آرٹسٹ کا منہ بولا کام لگتا ہے۔''

(صفحہ: ۹۱۔۹۲)

دوسرا مضمون نیشنل جیوگرافک میگزین کے نامہ نگار W.E.Gerrett کا ہے جو لافوگئی کے لگ بھگ سترہ سال بعد امریکی فوج کے ہتھیاروں سے لیس ایک باربردار طیارہ ہرکیولیس ۱۳۰ میں لیہہ پہنچا اور ایک روسی ہیلی کاپٹر میں ہند چین محاذِ جنگ تک گیا تھا۔ وہ چینی حملے کے فوراً بعد صورت حال کا جایزہ لینے اور آگاہی حاصل کرنے کے لئے لداخ آیا تھا۔ ۴۳۳۵ فٹ بلند سرحدی گاؤں چھشول میں گے ریٹ کی ملاقات ایک فوجی افسر میجر سی ایس تانوار سے ہوئی جس نے لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ شیخ صاحب اس مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''گے ریٹ نے مضمون کا عنوان ''دور اُفتادہ لداخ کے پہاڑ کی چوٹی پر جنگ'' رکھا تھا۔ اُس نے لکھا ہے ''لیہہ میں بجلی نہیں ہے اور نہ نل کا پانی میسر ہے''۔ لیہہ خاموش تھا چنانچہ ایک دکاندار نے گے ریٹ کو بتایا۔ ''جب کارواں آتے تھے تو گرمیوں میں لیہہ میں بڑی رونق اور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی۔ تبتّی، چینی، افغانی حتیٰ کہ چند روسی بھی آتے تھے۔ تب کاروبار بہت بہتر تھا۔'' لیہہ میں امن وامان کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ: ''کسی لداخی

کو قتل کی کسی واردات کی یاد نہیں ہے اور چوری چکاری کا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے''۔
جریدہ میں دی گئی تصویروں میں لیہہ قصبے کا ایک فوٹو دیا ہے جب قصبہ بہت چھوٹا تھا۔ آبادی صرف کئی ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

(صفحہ:۹۳۔۹۶)

اس کے چودہ سال بعد ۱۹۷۷ء میں نیشنل جیوگرافک میگزین کے غیر ملکی اداریہ کا اہلِ کار اور نامہ نگار Thomas J.Abercromive لداخ آیا اور اپنے تاثرات رسالہ کے مارچ ۱۹۷۸ء کے شمارے میں ''لداخ آخری شنگریلا'' کے عنوان سے شائع کئے۔ اس دوران پارلیمانی چناؤ کی مہم شدومد سے چل رہی تھی نامہ نگار لکھتا ہے کہ ''تب کشمیر سے ٹرکوں میں مختلف اشیاء، ٹوکروں میں کُڑکُڑ کرتے چوزے اور الا بالا سامان لیہہ پہنچ رہا تھا۔ مقامی جیپ ٹیکسیوں پر انگریزی میں نیا دور کے ماٹو یا مقولے لکھے گئے تھے۔ جیسے ضبط و نظم سے ایک قوم بنتی ہے۔ قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے''۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ ایبر کرومیو کی آمد سے تین سال پہلے لداخ کو سیاحت کے لئے واگزار کیا گیا تھا اور غیر ملکی سیاح لداخ آرہے تھے لیکن لیہہ قصبہ میں ہوٹل اور ریستوران نام کے تھے۔ اکثر سیاح گیسٹ ہاؤس نام کے گھروں میں مکینوں کے ساتھ ٹھہرتے تھے۔ ایبروکرومو ی ہمس میلہ دیکھنے گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ لاموں اور گنپوں کے میلوں کا لوگوں کی سماجی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ اپنے اختتامی جملوں میں عبدالغنی شیخ لداخ کی بدلتی ہوئی تصویر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''تب سے دریائے سندھ میں بہت پانی بہا ہے اور آخری شنگریلا بہت بدل گیا ہے۔ عالمی نقشے پر لداخ ایک اہم سیاحتی مقام کی حیثیت سے ساری دُنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ لوگوں کے رہن سہن، خوراک، پوشاک، مکانات حتیٰ کہ ثقافت میں کافی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب ماضی کے لداخی اور کلاسیکل چیزیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ نیشنل جیوگرافیک میگزین کے ایک حالیہ شمارہ میں یہی اُجاگر کیا گیا ہے''۔

(صفحہ:۱۰۰)

کتاب کے پانچویں مضمون میں ''سیاچن گلیشیئر۔ گُلِ گلاب کا گُلستان یا بلند ترین محاذِ جنگ'' کے عنوان کے تحت سیاچن گلیشیئر کے بارے میں اہم معلومات درج کی گئی ہیں۔ شیخ صاحب سیاچین گلشیئر کو دُنیا کے بلند ترین محاذِ جنگ قرار دے کر لکھتے ہیں کہ:

''اپریل ۱۹۸۲ء میں ہندوستان نے سیاچن گلشیئر کے پاس سلتورو کے دو درّوں ۱۸۳۰۰ افٹ بلند ''سیالا'' اور ۱۸۲۰۰ افٹ بلند ''بلافون لا'' پر ہیلی کاپٹروں سے فوج اُتاری۔ پاکستان نے اُن کے متوازی ۱۷۰۰۰ سے ۱۸۰۰۰ فٹ بلند دو چوٹیوں پر اپنی فوج اُتاری۔ پہلی دفعہ سیاچن عالمی سطح پر منظر عام پر آیا۔ ہندوستان نے سیالا کے مشرقی کنارے پر مورچے بنائے جبکہ پاکستان نے اس کے مغربی کنارے پر چوکیاں بنائیں۔ یہ فریقین کی فوجوں میں معرکہ آرائی کا پیش خیمہ تھا جہاں لڑائی سے جانی نقصانات ہوئے وہاں بلندی، کڑاکے کی سردی اور برف و باد نے بڑی جانیں لیں اور بہت سارے تا دمِ حیات معذور اور بیمار رہے۔ ۲۱ سال بعد ۲۰۱۵ء میں جنگ بندی ہوئی۔ توپیں خاموش ہیں لیکن بلندی اور خراب موسم بدستور جانیں لے رہے ہیں۔ محاذِ جنگ بننے سے پہلے سیاچن عمومی طور گُمنام تھا حتیٰ کہ پچھلی صدی کے شروع میں اس کا ہمسایہ علاقہ نوبراہ کے بہت کم لوگ اس سے واقف تھے۔ سیاچن محاذ شمال میں ''کانوے سیڈل'' سے لے کر جنوب میں ''چولونگ لا'' تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۱۰ کلومیٹر ہے۔ سیاچن گلیشیئر ۷۶ اعشاریہ ۴ کلومیٹر لمبا اور ۶ سے ۷ کلومیٹر چوڑا ہے۔ سیاچن کی وجہ تسمیہ کے پیچھے ایک جنگلی گلاب ''سیا'' ہے۔ سیالداخی اور بلتی زبانوں میں گلاب یا جنگلی گلاب کو کہتے ہیں۔ چن کا مطلب اُگنے والی جگہ ہے۔ سیاچن پر زیادہ تر گلابی رنگ کے سیا پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر اس سخت جان پھول کے علاوہ یہاں اور کوئی روئیدگی نظر نہیں آتی''۔

(صفحہ: ۱۰۱۔۱۰۳)

شیخ صاحب نے سیاچن کے بارے میں چھپے ہوئے چیدہ چیدہ تبصروں کے حوالے دے کر اس بلند و بالا درے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ یہ مضمون بھی معلوماتی ہونے کے سبب کافی دلچسپ اور قابلِ مطالعہ ہے۔

کتاب کے چھٹے مضمون ''لداخ، بلتستان اور تبت کے خلاف مہاراجہ گلاب سنگھ کی فوجی مہمات: نئی تحقیق کی روشنی میں''، میں شیخ صاحب نے لداخ کی خودمختاری کے خاتمے اور ڈوگرہ راج کے ماتحت آنے کی ایک طویل تاریخ کو چند صفحات میں سمو کر یہ دکھانے کی بہترین کوشش کی ہے کہ اس سیاسی تبدیلی سے لداخ کو ناقابلِ تلافی نقصانات اُٹھانے پڑے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں انھوں نے کئی قلمکاروں کی کتابوں کے اقتباسات پیش کر کے اپنی بات کو مصدقہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تسخیر لداخ میں ناظم کشتواڑ جنرل زورآور سنگھ کلہوریہ کو سب سے زیادہ ساتھ جن اہم لوگوں نے دیا تھا اُن میں کشتواڑ کے مہتہ منگل، مہتہ بستی رام، اُتم پڈیار اور وزیر لکھپت وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ شیخ صاحب نے ایک انگریز قلمکار انڈر یولیتھ آومز کی کتاب کا یہ حوالہ دیا ہے جسے پڑھ کر آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ لداخ میں سیاسی تبدیلی نے کس قدر تباہی مچائی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''لداخ خطہ اس کے جائز حکمرانوں کے بعد ظلم اور غفلت کی وجہ سے افسوسناک طور پر بدلا ہے''۔

(صفحہ ۱۹۶)

کتاب کے ساتویں مضمون میں روس کے ایک صحافی نوٹو ویچ کی تصنیف "The unknown life of christ" پر جم کر بحث کی ہے جس میں لکھا گیا تھا کہ اس نے لداخ میں اپنے سفر کے دوران ہمس گُنپا میں ایک قدیم نسخہ دیکھا جس میں لکھا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی حیات کے نامعلوم سالوں کے دوران ہندوستان اور اس کے پڑوس کے ملکوں میں تھے۔ اس نے منظوم نسخے کے اشعار کا ترجمہ پیش کیا تھا۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ پہلے ہی سال فرانس میں اس

کے آٹھ ایڈیشن نکلے، امریکہ میں انگریزی کے تین ایڈیشن نکلے۔ ایک سال بعد لندن میں کتاب کا ایک اور دفعہ ترجمہ ہوا اور اس کا پہلا ایڈیشن نکلا۔ کتاب کا جرمنی، ہسپانوی اور سویڈش زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ قارئین نے فوراً اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا اور جریدوں اور اخبارات میں کتاب پر ریویو نکلے جن میں تنقید، تعریف، تشکیک اور تضحیک سمیت مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ بقول ایک تبصرہ نگار اس تصنیف نے ۱۸۹۴ء میں بین الاقوامی سطح پر ایک تنازعہ کھڑا کیا تھا۔"

(صفحہ: ۲۲۲)

شیخ صاحب نے اس موضوع پر کافی تحقیقی مواد پیش کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برصغیر ہند میں آمد سے متعلق گتھی ابھی سلجھی نہیں ہے اور یہ پہلے سے کہیں زیادہ پُراسرار بنی ہے۔

کتاب کے آٹھویں مضمون میں "پشمینہ اور کشمیری شال کی کہانی۔ تاریخ کے آئینے میں" بیان کی گئی ہے۔ یہ مضمون اس اہم موضوع پر ایک معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ صاحب بتاتے ہیں کہ:

"پشمینہ اور کشمیری شال کی کہانی بڑی دلچسپ اور طویل ہے۔ یہاں شال بافی محض ایک دستکاری یا صنعت کا نام نہیں بلکہ ایک ملک کی تہذیب اور ثقافت سے مشابہ ہے جس کے گرد دیومالائی ہالہ ہے۔ کشمیر کی شالیں یورپ، روس، چین، مشرقی وسطیٰ، ایران، ترکی، منگولیا وغیرہ برآمد ہوتی تھیں اور بہت پسند کی جاتی تھیں۔ شال بافی کے لئے پشمینہ مغربی تبت اور لداخ سے کشمیر درآمد ہوتا تھا۔ پشمینہ کو پشم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ فارسی لفظ ہے جس کا معنی ملائم اور نرم ہے۔ پشم ایک بکری سے حاصل ہوتی ہے جسے پشمینہ بکری کہا جاتا ہے۔ پشمینہ بکریاں چودہ ہزار فٹ اور ۱۸۰۰۰ فٹ بلندی کے درمیان رہتی ہیں۔ جہاں درجہ حرارت عموماً نقطہ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ بکری کے کھردرے لمبے بالوں کے نیچے

پشمینہ پیدا ہوتا ہے۔ پشمینہ بکری کی گردن چھوٹی، قد وقامت میانہ بدن مضبوط اور خوبصورت ہوتی ہے۔ پشمینہ تبت اور لداخ کے علاوہ روس، ایران اور دُنیا کے کئی ملکوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق مغربی تبت اور لداخ کا پشمینہ روس اور ایران سے بہتر ہے''۔

(صفحہ: ۲۲۳۔۲۲۹)

کتاب کے نویں مضمون میں 'بلتستان'' کی تاریخ، جغرافیہ اور ثقافت کا ایک خوبصورت منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں لداخ اور بلتستان کے دیرینہ تعلقات کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں تقسیمِ ہندوستان سے جو نقصانات ہوئے ہیں اُن کی بھی اچھی طرح نشاندہی ہوئی ہے۔ شیخ صاحب اِس جملے کے ساتھ اپنا مضمون مکمل کرتے ہیں۔

'بہت سارے بلتی اور لداخی اپنی جڑوں کی تلاش میں ہیں جن سے وہ صدیوں تک ایک دوسرے سے جُڑے بندھے رہے ہیں''۔

(صفحہ: ۲۷۴)

کتاب کے دسویں باب میں لداخ میں فنِ سنگ تراشی کے خزینوں سے متعلق مختلف تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں بات کی گئی ہے۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''لداخ اور اس کے ہمسایہ خطے چیلاس، گلگت بلتستان وغیرہ میں سنگ تراشی کے انمول خزینے ہیں۔ اس لئے ماہرین نے خطے کو سنگ تراشی کی گیلری یا نگارخانہ کہا ہے۔ ان علاقوں میں ابھی تک لاکھوں کی تعداد میں سنگ تراشی کے نمونے پائے گئے ہیں جن میں بہت سے اعلیٰ معیار کے ہیں۔ چٹانی آرٹ فنونِ لطیفہ کا ایک جُز ہے۔ ایک سنگ تراش کا کینواس چٹان اور چھوٹی چٹان (Boulder) ہے۔ وہ اس پر تحریریں اور تصویریں تراشتا ہے۔ ان تصویروں میں رنگارنگی اور گوناگونی ہے۔ اس چٹانی آرٹ میں گندھار، وسطِ ایشیا اور تبتی آرٹ کے نمونے ملتے ہیں۔ شروع میں بیسویں صدی کے آغاز میں یورپی

محققوں اور سیلانیوں نے سنگ تراشی کے نمونوں کا ذکر کیا ہے۔ ملکی سطح پر ڈاکٹر روہیت ووہرا نے، جو یورپ میں سکونت پذیر ہیں، اس ضمن میں کئی مرتبہ لداخ کا سفر کیا۔ انھوں نے کئی بین الاقوامی سیمی ناروں میں لداخ کے چٹانی آرٹ پر مقالے پیش کئے اور کئی کتابچے لکھے۔ مقامی طور ٹی داوا چھنکسپا نے لداخ کی سنگ تراشی پر دوررس تحقیقی کام کیا ہے اور ان کے تحفظ و ریکارڈ رکھنے کی افادیت کو اُجاگر کیا''۔

(صفحہ:۲۷۵۔۲۷۷)

کتاب کے گیارہویں باب میں کوکشو گاؤں کے بارے میں انمول جانکاری فراہم ہوئی ہے جہاں بودھ اور مسلمان ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں۔ شیخ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

''ماضی قریب تک بہت سارے غیر لداخیوں نے لکھا ہے کہ لداخ میں مسلمان اور بودھ ایک ہی چھت کے نیچے بستے ہیں۔ میرے مشاہدے اور حافظے میں ایک ایسا معاشرہ صرف کرگل کے ایک گاؤں کوکشو میں موجود تھا جو لیہہ سے ۴۳ اکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ گاؤں کے باشندے بودھ اور اسلام کی مخلوط تعلیمات اور روایات پر عمل پیرا تھے۔''

(صفحہ:۲۹۱)

کتاب کے بارہویں باب میں ''لداخ میں بھوت پریت کی واردات'' کے عنوان سے اُس کوہستانی خطے میں عجیب وغریب واقعات کے رونما ہونے پر کُھل کر بات ہوئی ہے۔ شیخ صاحب کہتے ہیں کہ:

''رات کو کسی کے پُراسرار طور غائب ہونے کی واردات کے لئے لداخی زبان میں ''ڈیپ ٹیت'' کی اصطلاح ہے جس کا لفظی مطلب شیطان یا بھوت پریت کا کسی کو بھگا کر لے جانا ہے۔ لمبا عرصہ ہوا۔ ''ڈیٹ ٹیت'' کا ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ہم لیہہ سے سرینگر بس میں سفر کر رہے تھے۔

دراس میں ہم نے رات گزاری ۔صبح مسافروں میں ہلچل سی مچی ۔ایک مسافر اپنے بستر سے غائب تھا۔اس کے جوتوں کی جوڑی بستر کے پاس پڑی تھی۔ وہ دو پہر کو لوٹا۔اس کی حالت بُری تھی۔ دونوں پیر زخمی ہوئے تھے۔اس کا کہنا تھا کہ ایک غیر مرئی طاقت اس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ساری رات اس کو پہاڑوں میں گھمایا۔ بیچ بیچ میں چند لمحوں کے لئے اُس کو ہوش آجاتا تھا اور سوچتا تھا کہ میں کہاں آیا ہوں۔اس سے پہلے کہ وہ واپس اپنی جگہ لوٹے ،اُس پر مدہوشی اور خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہوجاتی تھی۔ یہ مسافر لیہہ کے پاس ایک گاؤں کا رہنے والا تھا''۔

(صفحہ:۳۰۰۔۳۰۱)

کتاب کے تیرہویں مضمون میں لداخ کی ایک اہم شخصیت ''مُنشی چھرنگ پلگیس'' کے بارے میں واقفیت کروائی گئی ہے۔شیخ صاحب نے لکھا ہے کہ:

''اُنیسویں صدی کے اوائل اور بیسویں صدی کے پہلے ربع کے سو سال کے دوران لداخ میں کئی شخصیتیں ہو گزری ہیں۔منشی چھرنگ پلگیس ، ژندن منشی، کوشوق لبزانگ ژھولٹیم نستن ژھولٹیم دورجے، روپ چند، خواجہ غلام رسول، سانو منشی ، داوا شاہ اور ہیرا مونڈ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے منشی پلگیس کا نام مشہور رہے ۔ان شخصیتوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس دور کے لداخ کی سماجی ،سیاسی اور تمدنی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں۔یورپیوں کے سفرناموں وغیرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔انھوں نے لداخ کی شاہی تاریخ کا بودھی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے میں موراوین مشن کے ڈاکٹر کارل مارکس کی جزوی مدد کی تھی جس کی اساس پر بعد میں ڈاکٹر اے۔ایچ فرانکی نے تاریخِ لداخ لکھی''۔

(صفحہ:۳۱۴۔۳۱۹۔۳۲۰)

کتاب کے چودھویں باب میں برصغیر کے بٹوارے اور گلگت اسکاوٹس کی بغاوت کی روداد تفصیلاً قلمبند ہوئی ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

"اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور ایک نئی مملکت پاکستان وجود میں آئی۔ گلگت ریاست جموں وکشمیر کا علاقہ تھا۔ گلگت اسکاوٹس کے چند جونیئر افسر پاکستان کے حق میں سرگرم تھے۔ اس نے ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی حکومت کے ساتھ یکجہتی کا اعلان کیا اور انہوں نے اعانت کی درخواست کی۔ پاکستان مدد کرنے کے لئے سنجیدہ نہیں تھا۔ اس کی وجوہات یہ دی ہیں کہ نوزائیدہ ملک مختلف مسائل سے دوچار تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ اور ہندوستان گلگت اور بلتستان کو اپنی قلمرو میں رکھنے کے لئے بڑے سنجیدہ تھے۔ باغیوں نے یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو گلگت کے گورنر گھنسارام سنگھ کو اپنی حراست میں لیا۔ گورنر ہاؤس پر پاکستانی جھنڈا لہرایا۔ ڈاک خانہ اور تار گھر اپنے قبضے میں لائے۔ گلگت کے بعد اسکاوٹ کی نظر بلتستان پر تھی۔ اسی دوران ۲۲/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر پر قبائلی حملہ ہوا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا ہندوستان سے الحاق اور جموں میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبریں یکے بعد دیگرے گلگت، اسکردو اور لیہہ پہنچیں۔ ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء میں میجر احسان علی کی سرکردگی میں اسکاوٹس کے ۲۵۰ اسکاوٹ گلگت سے اسکردو پہنچے"۔

(صفحہ: ۳۳۳)

شیخ صاحب نے لداخ اسکاوٹ اور ہندوستانی فوج کے لداخ میں تقریباً سارے اہم معرکوں کی بطریق احسن عکاسی کی ہے۔ انھوں نے اس مضمون کو ان جملوں سے اختتام کو پہنچایا ہے۔

"گلگت او بلتستان کا خطہ برصغیر ہند میں جغرافیائی لحاظ سے زمانہ قدیم سے غیر معمولی اہم رہا ہے۔ حالیہ سالوں میں شاہراہِ قراقرم اور چین پاکستان اقتصادی راہداری کے مجوزہ معاہدے کی وجہ سے گلگت او بلتستان کی اہمیت بڑھ گئی ہے"۔

(صفحہ: ۳۶۶)

کتاب کے پندرہویں اور آخری مضمون میں عبدالغنی نے اپنے بچپن کی کچھ یادیں محفوظ کرتے ہوئے اس کا عنوان ''میرے بچپن کا لداخ۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را'' دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرے بچپن کا لیہہ بہت چھوٹا تھا۔ آبادی تین ہزار سے بھی کم تھی۔ اب لیہہ کی آبادی پچاس ہزار سے تجاوز کرتی ہے۔ گرمیوں میں سیاحوں اور مزدوروں کی آمد سے اور کئی ہزار نفوس کا اضافہ ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں لیہہ میں دو نائی تھے۔ اب نائی کی پچاس سے زیادہ دُکانیں ہیں۔ میری یادداشت کے مطابق تب درزی کی دو دکانیں تھیں۔ اب درزی کی چالیس سے زائد دُکانیں ہیں۔ میرے بچپن کے لیہہ میں سبھی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کوئی اجنبی قصبے میں آتا تو سبھی کو پتہ چل جاتا تھا۔''

(صفحہ: ۳۶۷)

اس طرح مصنف نے پُرانے اور موجودہ لداخ کا ایک شاندار تقابلی مطالعہ پیش کرکے اپنی کتاب کی زینت اور اہمیت کو دوبالا کیا ہے۔ آخر پر میں یہی کہوں گا کہ عبدالغنی شیخ لداخ کی عظمت کو بیان کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوگئے ہیں۔ اُن کا طرزِ تحریر عمدہ اور اُن کی زبان کافی میٹھی، سادہ اور سلیس ہے وہ ہر ممکنہ حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ میں اُن کی ادبی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے لداخ کا مجاہدِ اُردو قرار دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

خُدا کرے زورِ قلم اور زیادہ

......●●●......

☆......زاہد مختار

سیدھی سادی کہانیوں کا خالق

کہانیاں علامتی بھی ہوتی ہیں اور استعاراتی بھی، جذباتی بھی، سپاٹ بھی، نوکیلی بھی، رسیلی بھی۔ عریاں بھی اور پسِ پردہ بھی۔ گنجلک بھی اور سادگی سے بھرپور بھی......کہانیوں کا کیا ہے، ہر دور میں جنم لیتی ہیں اور ہر دور میں انہیں اپنے اپنے انداز سے رقم کرنے والے معتبر افسانہ نگار ملتے ہیں۔ ہر افسانہ نگار کا اپنا رنگ، اپنی ادا اور اپنی باریکیاں۔ بس کہانی قاری تک پہنچتے پہنچتے ترسیل کے کسی المیے کی شکار نہ ہوں۔

برسوں سے اردو ادب میں ایسی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں جنہیں کئی بار پڑھنے کے باوجود بھی قاری علامتوں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے لیکن کچھ ایسی متعدد کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں جنہیں ایک جست میں پڑھنے کا دل بھی کرتا ہے اور سمجھنے کا ادراک بھی حاصل ہوتا ہے اور ایسی ہی کہانیوں میں عبدالغنی شیخ (لداخی) کی لکھی کہانیاں بھی شامل ہیں سادہ تحریروں سے مزین۔ دوٹوک لفظوں میں مختصر کرداروں کے ذریعے اپنا مقصد بیان کرتی ہوئی حالانکہ کبھی کبھی یہ سادگی اپنے بیان کے پیرائے میں کچھ زیادہ ہی ''ادب برائے زندگی'' کا اشتہار بنی ہے جیسے ''ایک ملک دو کہانی'' سپاٹ، بیانیہ سے بھرپور۔ تخلیق کار کی کسی خاص تخلیقی کشیدہ کاری سے ماورا۔ جبکہ دو ملکوں کی بیچ لکیروں پر سسکتے بچھڑے دلوں کی داستان کو کچھ اور بہتر سانچے میں ڈالا جاسکتا تھا۔-- یہاں پہ ایک نقاد کی بیان کردہ منطق یاد آتی ہے جس کے زیرِ اثر وہ یوں رقم طراز ہے کہ:

"........ بات سیدھی سی ہے۔ سماج سُدھار ہو، حُب الوطنی ہو یا قدروں کی پاسداری یا کسی اور نوعیت کا اظہار جو صرف پروپگنڈا ادب کے ذریعے کسی خاص حد میں رہ کر ہی ممکن ہے۔ مگر ایسا اظہار پروپگنڈا ہونے کے باوجود بھی ادب ہی رہنا چاہئیے۔ یہ کسی اشتہاری ایجنسی کا پمفلٹ نہ بنے۔ ادب یا اُس کا بنیادی عکس اُس وقت تباہ ہو جاتا ہے جب یہ کسی دوسرے مقصد کی آبیاری کرنے لگتا ہے اور اپنے بنیادی مقصد یعنی ہم عصر مسائل کے اُس پار ازلی کائینات کے ترغیبی اظہار کو پسِ پُشت ڈال دیتا ہے...."

عبدالغنی شیخ صاحب کے متعدد افسانے اس بات کے غماز ہیں کہ شیخ صاحب سادہ تحریر میں ایک دلچسپ کہانی کا تانا بانا بُننے میں ماہر ہیں۔ اُن کے افسانے "یہ زندگی" کے کینسر سے لرزتے ایک آرٹسٹ کے کردار سے لے کر "ایک انار" افسانے کے سیاسی منظرنامے تک اس بات کے شاہد ہیں کہ شیخ صاحب واقعی عوامی زندگی کے بہت قریب رہ کر اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو من وعن تحریر کر کے جس انداز سے افسانے کا روپ عطا کرتے ہیں وہ اُن کا ایک خاصا ہے۔ اس سلسلے میں راشد سہسوامی کا یہ کہنا بھی بجا ہے کہ

"بعض مقامات پہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے چشم دید واقعات کو من وعن تحریر کی شکل دی ہے لیکن ایسی تحریروں میں بھی اخبارات کی رپورٹ کا رنگ نہیں ہوتا"

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کی ایک اور خاصیت یہ ہے کہ یہ قاری کو کہانی کے آخری سرے تک کھینچ کے لے جاتے ہیں، پہلے ایک طرح کا تجسس اُبھر آتا ہے اور پھر انجام کو جاننے کی طلب ہچکولے کھاتی ہے جسے فاضل قلمکار کہانی کے آخری سرے پر اپنی سادہ تحریر سے تھپکیاں دے کر سلانے کا کامیاب جتن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ قطرے کو سمندر بنانے اور سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے ہُنر سے شیخ صاحب بخوبی آشنا ہیں اور یہی آشنائی اُن کے بیشتر افسانوں کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

عبدالغنی شیخ کی کہانیوں میں جہاں اس دور کے عام کردار اپنی بھر پور حوصلہ مندی سے اپنے

ہونے کا احساس دلا رہے ہیں وہیں اُن کے ارد گرد ظلم و تشدد کے واقعات، غیر یقینی صورتحال، سماجی نابرابری، انسانی زندگی کی اندرونی نفسیات اس طرح سیدھے سادے لفظوں میں قاری تک پہنچتی ہے کہ کبھی کبھی افسانے کے تخلیق کار پہ مبلغ کا گمان ہوتا ہے اور یہ اس بات کا غماز ہے کہ فاضل تخلیق کار لفظوں سے کھیلنے والے جادوگر نہیں بلکہ احساس کی تپتی آگ پہ اپنی بے قراری کو عام آدمی کے کردار کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے بیشتر افسانے ہمیں اپنی کہانی لگتے ہیں، اپنے احساس کے ترجمان نظر آتے ہیں،۔

عبدالغنی شیخ جہاں لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو ادب کی خدمت کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں وہیں اُنہوں نے دوراہا اور دو ملک ایک کہانی جیسے افسانوی مجموعوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس برفیلی زمین کے سپوت میں اتنی ادبی حرارت موجود ہے جسے پورے ادبی دنیا میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شیخ صاحب کے افسانے ''آزمایش'' میں انسانیت کی آزمایش کا منظر عیاں ہے۔ وہیں راز دل میں ایک نازک اور عریاں حقیقت اپنے پوری تلخیوں کے ساتھ موجزن ہے۔

''ایک فوٹو'' میں ہر قاری کو اپنی یادوں کا البم نظر آتا ہے اور اس کہانی میں جس طرح کہانی کار نے ایک ایک کردار سے سادہ اور صاف انداز میں علامتوں جیسا کام لیا ہے۔ وہ اس افسانے میں خود عیاں ہے۔ یہ کہانی یادوں کے ایک طوفان اپنے اندر سمیٹے ہوئے نہیں ہے بلکہ ایک پوری تاریخ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں ہر کردار زندگی کے فوٹو میں یوں عیاں ہے کہ کسی نہ کسی انداز میں زندگی کے اس گروپ فوٹو میں کہیں نہ کہیں پہ اپنا آپ بھی نظر آتا ہے اور یہی تو اس آئینہ صفت افسانے کی جاودانی ہے۔

عبدالغنی شیخ نے جس طرح حقیقی زندگی سے اپنے کردار چُن کر اپنی کہانیوں کا تانا بانا بُنا ہے اُس پہ غور کرتے ہوئے اُن سچائیوں کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ تخلیق کار کس طرح ایک چھوٹی مگر اہم بات کو اپنے انداز سے فنی لوازمات کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک تخلیقی کارنامہ انجام دیتا ہے۔ شیخ صاحب بے مروت کرداروں کی بھی بات کرتے ہیں اور مشفق چہروں کو بھی بھیڑ میں ڈھونڈ کر نکال لاتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں ''اپنے سیل کو ذرا آرام دو''۔ ''ہیرو''.. اداکار..... اپنی موت سے پہلے اولاد

کوورشہ نہ دو.....راشن کارڈ.....سوئمنگ پول.....دھوپ چھاؤں.....مسافر.....مجرب نسخہ.....مظلوم.....
پہلا خط.....میں جہاں انسانی جبلت کی عکاسی کی ہے وہیں نفسانفسی کے عالم میں زندگی کی بے ثباتی کا بھی احاطہ کیا ہے۔ کرپشن، مظلومیت، پیار و محبت، انسانی بے بسی اور بے کسی کے رنگ اپنی کہانیوں میں اس طرح اُجاگر کیے ہیں کہ قاری کے سامنے موجودہ بے مروت دور کا عکس واضح ہو جاتا ہے۔

شیخ صاحب ادب برائے زندگی میں یقین رکھتے ہوئے ہی دکھائی دے رہے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں یہ بات منعکس ہے کہ وہ قلم اور قرطاس کے رشتے سے ایک ایسا جذبہ اُبھارنا چاہتے ہیں جو ثمردار ہو جو صرف لمحوں کی واہ واہ کی متلاشی نہ ہو بلکہ احساس کی چبھن لیے باضمیر انسان کے ذہن و دل پہ دستک دے۔

شیخ صاحب اردو سے محبت رکھتے ہیں تبھی تو وہ ایک ایسے خطے میں بھی اس زبان کے چراغ روشن کر کے نہ خود اُس خطے کا ادبی سماں منور کر رہے ہیں بلکہ اس بات کی مثال قائم کر رہے ہیں کہ محبت ماحول و موسم کی محتاج نہیں ہوتی۔ شیخ صاحب لداخ کی ادبی دنیا سے اُبھر کر بین الاقوامی سطح پہ اپنا نام روشن کر رہے ہیں اور امید اور دعا یہی کہ یہ پرواز، یہ اڑان، یہ جستجو، یہ حوصلہ اور اردو زبان کے تئیں اُن کی محبت ایسے ہی سادگی کی خوشبو بکھیرتے ہوئے قائم و دائم رہے

......●●●......

☆ اپنی نگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

☆......رقیہ بانو

عبدالغنی شیخ کی فکشن نگاری

خطہ لداخ میں اجتماعی طور پر اردو زبان وادب کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ البتہ اردو زبان وادب سے شغف رکھنے والے متعدد افراد اردو زبان میں تخلیقی کام انجام دے رہے ہیں۔ چاہے وہ شاعری ہو یا نثری ادب لیکن باقاعدہ لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اب تک گنتی کے چند نام ایسے ہیں جن کی تصانیف چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان میں نمایاں نام کاچو سکندر خان، اکبر لداخی، منشی عبدالستار، کاچو اسفندیار خان، عبدالغنی شیخ، عبدالحمید تنویر، عبدالرشید راہگیر اور خیال لداخی کے ہیں۔ مذکورہ ناموں میں ادبی حیثیت سے عبدالغنی شیخ کا نام اہمیت کا حامل ہے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مسلسل لکھ رہے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کی کہانیاں اور مضامین ریاستی اخبارات ورسائل کے علاوہ بیرون ریاست کے رسائل وجرائد میں بھی چھپتے رہتے ہیں چنانچہ انھیں اخبارات ورسائل کی بدولت انھیں ابتدا سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اپنے جذبات وخیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایک کارگر میدان میسر آیا جیسا کہ وہ خود ریاست سے باہر اپنی کہانیوں کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ریاست کے باہر میری ابتدائی کہانیاں ''بانو'' اور ''شمع'' میں شائع ہوئیں۔ ''شمع'' میں چھپنا آسان نہیں تھا، اس رسالے کی سرکولیشن تقریباً ایک لاکھ ہوا کرتی تھیں۔ شمع میں اکثر بلاعنوان کہانیاں شائع ہوتیں اور قارئین ہی

کہانی کا عنوان طے کرتے جب میری پہلی کہانی بلا عنوان شائع ہوئی تو رسالے
کے مدیر یونس دہلوی نے مجھے خط لکھا کہ آپ کی کہانی کو بہت پسند کیا گیا اور تقریباً
6 ہزار قارئین نے عنوان ارسال کیے ہیں جس سے مجھے بہت حوصلہ ملا اور پھر
میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔''

عبدالغنی شیخ نے ہندوستان کے ایک ایسے خطے میں رہ کر اپنی تحریری جدوجہد جاری رکھا جہاں ادبی سرگرمیوں کا کوئی رواج نہ تھا اردو دنیا کو لداخ کے طرزِ معاشرت، رسم ورواج، رہن سہن سے واقف کروانے میں عبدالغنی شیخ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے انھوں نے اردو ادب میں ایک اہم مقام بنالیا ہے۔ بابو عبدالقیوم ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انھوں نے لداخ کی تاریخ وثقافت اور ادب میں بہت ساری چیزوں کا
کھوج لگایا جس پر زمانے کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا، ان ساری چیزوں کو کھوج نکال
کر اردو داں حضرات کو ان سے روشناس کرایا۔ انھوں نے لداخ کی تاریخ،
جغرافیہ، ادب، رسم ورواج اور ثقافت وغیرہ موضوعات کے علاوہ ماہنامہ
''آجکل'' نئی دہلی میں دنیا کے سو بہترین ناولوں پر اپنا مقالہ لکھ کر اردو میں وہ
کارنامہ سرانجام دیا جو ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

(داستان لداخ'' (نشاط لائبریری، لیہ لداخ، 2010)

عبدالغنی شیخ کا ناول ''وہ زمانہ'' 1977 میں کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر سے شائع ہوا۔ ''وہ زمانہ'' ایک نیم تاریخی ناول ہے اس میں مصنف نے ناول کی کہانی کو تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے۔ مصنف اس ناول کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''وہ زمانہ ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی جس کی تخلیق میں ذاتی
مشاہدات، یاداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال بیان کے علاوہ
لداخ پر لکھی گئی 64 سے زائد کتابوں سے استفادہ حاصل کیا ہے۔''

(''وہ زمانہ'' کشمیر مرکنٹال پریس سرینگر، 1977)

اس ناول کی کہانی کو مصنف نے صیغہ واحد متکلم میں تاریخی اعتبار سے بیان کیا ہے، اس کے مطالعے سے قدیم وجدید لداخ کی تہذیب وتمدن، رہن سہن، طرزِ معاشرت، تعلیم وتربیت رسم ورواج وغیرہ سے متعلق بھرپور جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول سے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''......اسی دوران آپ کا ناولٹ ''وہ زمانہ'' شائع ہوا جس میں 1947ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی، ثقافتی اور مجلسی زندگی اور اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جزئیات مزاحیہ اور دلکش پیرائے میں پیش کی گئی ہے۔''

(کلچرل اکیڈیمی، سرینگر، 2004، صفحہ: 204)

یہ دراصل ایک ناولٹ ہے اس میں مصنف نے آزادی سے بہت پہلے اور بعد کے لداخ کو تاریخی پس منظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہم اسے مکمل تاریخ نہیں کہہ سکتے مگر یہ ایک نیم تاریخی ناول ضرور ہے، اس میں جگہ جگہ درحقیقت تاریخی بیانات قلمبند کیے گئے ہیں۔ مصنف نے اپنے بچپن سے لے کر موجودہ دور تک کے لداخ کی تہذیب وتمدن، ثقافت، تعلیم، طرز معاشرت اور رسم ورواج وغیرہ کو تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے لداخ میں ہر دور میں آئے اتار چڑھاؤ اور تعلیمی وتہذیبی پیش رفت کے بارے میں ہمیں مکمل جانکاری ملتی ہیں۔

اس ناول کے مطالعے سے قاری تھوڑی دیر کے لیے قدیم وجدید لداخ کے منظر میں کھو جاتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے سامنے پورا لداخ چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ لداخ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔ ایک قاری اس کتاب کے مطالعے سے پرانے اور نئے لداخ کے بارے میں بہت سارے مواد حاصل کر سکتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان موازنہ کر سکتے ہیں۔ پرانی اور نئی تہذیب کا تصادم۔ نئے اور پرانی نسل کے رہن سہن، طرزِ معاشرت وغیرہ کے بارے میں اچھی جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔ ''دل ہی تو ہے'' ان کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے جو 1978ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ ''دل ہی تو ہے'' لیہہ کے پس منظر میں لکھا جانے والا پہلا رومانی ناول ہے۔ خطۂ لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتیلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گم سم تھے اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اٹھتے ہیں۔ سیاحوں کی آمد سے جہاں متعدد

لوگوں کی اقتصادی خوشحالی یقینی بن جاتی ہے، وہیں اس سرزمین کے لوگوں کا ذہنی سکون، ان کی انفرادیت اور معصومیت مجروح ہونے لگتی ہے جیسے کہ ناول کی ایک کردار مس کارلا کہتی ہے:

"......لیکن بہت جلد آپ لوگوں کو سکون کی تلاش میں چنگ تھنک اور نوابرہ جانے کی ضرورت پڑے گی۔ لیہہ میں نئی تہذیب اپنی برکتوں کے ساتھ اپنے دامن میں لعنتیں اور مصیبتیں بھی لا رہی ہے۔"

ایک دوسری جگہ جب ناول کا ایک کردار یہ خوشخبری اپنے ساتھیوں کو سناتا ہے کہ نوبراہ بھی سیاحوں کے لیے کھل رہا ہے تو ایک سیاح کہتا ہے:

"سیاحوں کے جانے سے نوبراہ والوں کا سکون ختم ہو گا میں نے سنا ہے کہ نوابرہ کے لوگ بڑے ہشاش بشاش اور زندہ دل قسم کے لوگ ہیں لیکن سیاح ان کی مسرت بھری خلوت کی زندگی میں خلل انداز ہوں گے اور وہ روپیہ کے پھیر میں پڑ جائیں گے۔"

اس طرح سیاحوں کی آمد سے فائدے کے ساتھ ساتھ جو نقصانات پہنچ رہے ہیں ان کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اس ناول کا ہیرو سونم سرینگر سے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر کے جب کچھ دنوں کے لیے لیہہ واپس آتا ہے تو اسے یہاں کی ہر چیز بدلی بدلی نظر آتی ہے۔ یہاں ہر ایک شخص غیر ملکی سیاحوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ بٹورنے میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ سونم کا چچا سونم کو بھی نتیجہ نکلنے تک ٹورسٹ گائیڈ بنا دیتا ہے۔ اس دوران وہ پدماں سے ملتا ہے جو اس کی بچپن کی ساتھی ہے جو برسوں سے اس کی راہ میں آنکھیں بچھائی ہوئی ہیں جو اب بھی اسے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ پدماں سونم کی نس نس میں پیار کی جوت جگاتی ہے۔ گھر والے دونوں کی شادی کے لیے راضی ہو جاتے ہیں لیکن پھر اچانک مغربی تہذیب کی ایک تتلی نیماں سونم کو اپنے حسن سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ سونم پدماں کے خلوص اور وفا کو نظر انداز کر کے نیماں کی طرف بے تحاشہ قدم بڑھاتا ہے لیکن نیماں انجام کار اسے منجدھار میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور اپنے جذبات پر نادم ہو کر آخر پدماں کے پاؤں میں گر جاتا ہے۔ جان محمد آزاد اس ناول کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''یہ ایک سیدھی سادھی کہانی ہے، اس کے مفہوم ومعانی میں کوئی پیچیدگی یا تہہ داری نہیں۔ رومانی آرزومندی کی یہ کوشش اگرچہ جدید ادبی تقاضوں کے میزان ومعیار پر کھری نہیں اتر سکتی۔ تاہم مصنف نے اپنے ماحول کی جو پرخلوص عکاسی کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔''

(جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، کلچرل اکیڈیمی سرینگر، 2004،

صفحہ:205-206)

عبدالغنی شیخ کے اب تک تین افسانوی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' 1975ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں دس کہانیاں ہیں، پانچ کہانیاں زوجیلا کے اس پار......لداخ سے متعلق ہیں جبکہ باقی ماندہ پانچ کہانیاں زوجیلا کے اس پار اور ملک کے بعض دیگر حصوں کے پسِ منظر میں تحریر کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں مسکراہٹ، محبوبہ، گنجوں کی کہانی اور یادگار بالترتیب 'ہمارا ادب' سرینگر ماہنامہ 'فلمی ستارے' دہلی ماہنامہ 'بانو' دہلی میں شائع ہوئیں۔ لداخ سے متعلق شروع میں لکھی دو کہانیاں ''آرزوئیں'' اور ''لوسر اور آنسو'' پمپوش دہلی اور دیش سرینگر میں 1958ء میں کمال لداخی کے نام سے چھپیں۔

مصنف کا دوسرا مجموعہ ''دوراہا'' ہے جو 1993ء میں شائع ہوا۔ اس میں مجموعی طور پر 23 کہانیاں شامل کی گئی ہیں جن میں سے سات کہانیاں لداخ کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ باقی ماندہ مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔

باقر علی ''دوراہا'' کے دیباچے میں شیخ صاحب کی افسانہ نگاری سے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں:

''ہر تخلیق کے اظہار کا ذریعہ کوئی نہ کوئی تکنیک ہوتی ہے اور یہ انسان کے انگلیوں کی طرح منفرد ہوتی ہے۔ تخلیق کار اپنے واضح یا مبہم مقاصد کو عیاں کرنے کے لیے اپنے ماحول، اپنی زبان، اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنے ادب، مذہب اور تمدن سے چند لوازمات چن لیتا ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب رہے ہیں۔......انھوں نے اپنی اطراف بکھری ہوئی زندگی کے واقعات کو اپنی تحریر کا

مرکزی موضوع بنایا ہے، ان کے افسانوں میں کہانی پن ہے اور پلاٹ کی تصنع بھری پیچیدگیاں اور سنسنی پن نہیں ہے۔''

عبدالغنی شیخ کو زبان پر کافی دسترس حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے من پسند الفاظ بروئے کار لانے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی اور ان کی نثر میں بھی نظم کا رسیلا پن موجود ہے۔ زبان صاف، شستہ، سادہ اور عام فہم ہے ان کے کردار ان کے اپنے ماحول معاشرے اور وراثت کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ انھیں زبان سے مکمل واقفیت ہے اس لیے وہ چھوٹی چھوٹی جزئیات اور روزمرہ کی تفصیلات کو نہایت باریک بینی اور کمال چابک دستی سے بیان کر جاتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ حقیقت نگاری کے قائل ہیں۔ انسان کے خوشگوار مستقبل پر انھیں یقین ہے۔ مایوسی، تلخی اور جارحانہ ذہنیت کی دلخراش جھلکیاں ان کی تحریروں میں نہیں ہیں وہ بدنظمی، بے ربطگی اور خلفشار سے گریز کرتے ہیں اور خیالات، دقیانوسی گمراہی اور رسمی باتوں کے خلاف ہیں۔ ان کے افسانوں میں اردو ادب کے لیے نسبتاً گمنام مگر پیچیدہ خوبصورت علاقے کی عکاسی ہے اور پڑھنے والے ایک نئے ذائقہ سے روشناس ہوتے ہیں۔

ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''ایک ملک دو کہانی'' ہے۔ اس میں شامل بیشتر افسانے لداخ کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ لداخ میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک کے بیچ کئی کئی میلوں کا فاصلہ ہے۔ اس لیے ماضی میں پکی سڑکوں اور موٹر گاڑیوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مسافر کو دور کا سفر طے کرتے ہوئے کئی گاؤں میں رات کو ٹھہرنا پڑتا تھا۔ مسافر دن بھر چلتا اور اندھیرا ہو جانے پر نزدیک گاؤں میں کسی بھی گھر کے در پر بلا جھجک دستک دیتے تھے کیونکہ درمیان میں اس زمانے میں کوئی گیسٹ ہاؤس وغیرہ نہیں ہوتا تھا اور مسافر جس در پر بھی جاتا اس گھر کے افراد خانہ ایسے مسافر کا ہمیشہ استقبال کرتے تھے۔ افسانہ ''ایک رات'' میں ایک مسافر کے استقبال کا منظر ملاحظہ ہو:

''میں ایک پردیسی ہوں۔ ایک رات کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔''

ایک جوان مردانہ آواز نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر میں دراوزہ کھلنے کی آواز آئی۔ نیم تاریکی میں دس بارہ سال کے چھوٹے لڑکے نے ٹمٹماتا ہوا 'دیا'

دکھاتے ہوئے کہا۔ ''پردیسی اندر آئیے۔''

ایک لداخی کے لیے اس کا کچن یا باورچی خانہ غیر معمولی اہم ہوتا ہے۔ ماضی قریب تک لداخ میں کچن آج کے کچن سے مختلف ہوتا تھا۔ کچن بڑا ہوتا تھا اور درمیان میں چولہا ہوتا تھا۔ کنبہ کے سارے افراد کچن میں بیٹھتے تھے اور کھانا بھی کچن میں کھاتے تھے۔ گاہے گاہے مہمانوں کی خاطر تواضع بھی کچن میں ہی ہوتی تھی۔ افسانہ ''ایک رات'' میں کچن کا منظر:

''کمرے میں الاؤ جل رہا تھا، اس کے گرد ایک خاتون چھ سات سال کا ایک گول مٹول بچہ اور ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔''

لداخ ایک ٹھنڈا علاقہ ہے۔ یہاں سال کے بیشتر مہینے سردی کی لپیٹ میں رہتے ہیں۔ گرمی کا موسم لداخ میں بمشکل سے ڈھائی یا تین مہینے ہوتے ہیں۔ ان دنوں بھی رات کو ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہاں مہمانوں کو بجائے پانی اور چائے کلچہ کے سب سے پہلے سردی سے راحت پہنچانے کے سامان کا بندوبست کرتے ہوئے چولہے میں آگ لگاتے ہیں یا پہلے سے آگ لگی ہوئی ہو تو اس میں مزید لکڑیاں ڈال دی جاتی ہیں تاکہ مہمان کو راحت محسوس ہو۔ افسانہ 'ایک رات' میں مہمان کی خاطر مدارت کرتے ہوئے عورت کہتی ہے:

''قریب آجاؤ بیٹا، ٹھیک طرح آگ تاپنا، عورت بڑے بیٹے سے مخاطب ہوکر کہتی ہے ''دادا ان کو کمبل اوڑھا اور لڑکی سے بولتی ہے تم باہر سے سوکھی لکڑیاں لانا۔''

عورت جب کھانے کا ذکر کرتی ہے تو مہمان کھانے سے زیادہ آگ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے اس طرح جواب دیتے ہیں:

''نہیں ماں اتنی بھوک تو نہیں۔ اس سردی میں کھانے سے زیادہ آگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔''

●❖●

☆......جواد جالب امینی

عبدالغنی شیخ بحیثیت سوانح نگار

''صنم نربو'' کے حوالے سے

لداخ میں اردو زبان وادب کی خدمت کرنے والوں کی فہرست میں سب سے بڑا اور اہم نام عبدالغنی شیخ کا ہے۔ ان کا تعلق خطۂ لداخ کے ضلع لہہ سے ہے اور وہ پچھلی کئی دہائیوں سے اردو زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ انہوں نے افسانوی اور غیر افسانوی ادب دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ہی ساتھ انگریزی زبان میں بھی مقالے اور مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ''وہ زمانہ'' (ناول)، زوجی لا کے آر پار (افسانوی مجموعہ)، دل ہی تو ہے (ناول)، لداخ کی سیر، کتابوں کی دنیا، 'قلم، قلم کار اور کتاب'، 'لداخ: تہذیب وثقافت' وغیرہ شامل ہیں۔

''صنم نربو'' ان کی تصنیف کردہ سوانح عمری ہے جو انہوں نے ایک معروف لداخی سپوت آنجہانی انجینئر صنم نربو کی حیات اور شخصیت سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ یہ سوانح عمری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ریاست جموں وکشمیر کے اُس وقت کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے لکھا ہے۔

''عرضِ حال'' کے عنوان سے اس سوانح عمری کے مقدمے میں سوانح نگار عبدالغنی شیخ نے صنم نربو کے متعلق اپنے خیالات اور تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''صنم نربو اُن بڑے آدمیوں میں ہیں جن کی زندگی اور سبق آموز باتیں

آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ وہ بین الاقوامی شہرت کی شخصیت نہیں تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کوئی تاریخ ساز یا عہد آفرین طلسماتی ہستی بھی نہیں تھی۔ لیکن ان کی زندگی میں ایک طلسماتی ہستی کی وہ اثباتی باتیں نظر آتی ہیں جو ایک بڑے انسان کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ ایک سرکردہ انجینئر ہی نہیں تھے بلکہ ایک سرکردہ انسان بھی تھے۔''

صنم زبو کی شخصیت، ان کے عادات واطوار، ان کی حق گوئی، سادگی اور ان کی بے لوث زندگی ہی نے دراصل سوانح نگار کو ان کی سوانح عمری قلمبند کرنے کی تحریک دی ہے۔ یوں تو صنم زبو اپنی حیات میں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ ایک انجینئر، ایک منتظم، ایک سفیر اور ایک سیاسی رہنما تھے لیکن سوانح نگار ان کی شخصیت، سیرت، ان کے اچھے عادات واطوار اور ان کے طرزِ حیات سے زیادہ متاثر ہیں جو واقعتاً اس کتاب کے قارئین کو بھی متاثر کرتا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجہانی صنم زبو نے ایک ایسی زندگی گزاری ہے جو آنے والی نسلوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ ان کی حیات اور شخصیت ہمارے دور اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک آئیڈیل ثابت ہو سکتی ہے۔

یوں تو صنم زبو ۲۷ جولائی ۱۹۰۹ء کو لہہ کے پاس سکراہ محلے میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لیکن خوش قسمتی سے اُس دور کے لداخ کی تمام تر بے سروسامانیوں کے باوجود وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انہیں لہہ سے سرینگر کا طویل سفر (۴۰۰ رکلومیٹر) پیدل کرنا پڑا۔ آٹھویں کا امتحان انہوں نے لہہ سے پاس کیا۔ پھر انہوں نے کبھی پیدل کبھی گھوڑسواری کے ذریعے لہہ سے سرینگر تک کے اس وقت کا دشوار گزار سفر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے طے کیا۔ سرینگر کے سری پرتاپ ہائی اسکول سے ۱۹۲۹ء میں میٹرک اور ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ایف اے سی مکمل کیا۔ گریجویشن کے بعد آنجہانی صنم زبو کو نائب تحصیلدار کی ٹریننگ کے لئے منتخب کیا گیا۔ ٹریننگ کے بعد وہ فیلڈ میں کام کر رہے تھے کہ اسی دوران وہ انجینئرنگ کے لئے منتخب ہوئے اور انہیں اس ٹریننگ کے لئے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں وہ برطانیہ سے ٹریننگ مکمل کر کے واپس وطن پہنچے۔ اس کے بعد بارہمولہ میں بطور اسسٹنٹ انجینئر ان کی تقرری ہوئی۔

صنم نربو کی خوبیوں میں سے ایک متاثر کن خوبی ان کے اپنے کام کی تئیں جانفشانی سے کام کرنا ہے۔ وہ اپنے کام کو ہی سب سے بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ اپنے کام کی خاطر وہ اپنی جان تک کو خطرے میں ڈالنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ یہ خوبی ان کی شخصیت کی سب سے دلکش اور قابلِ تعریف خوبی ہے۔ اس حوالے سے سوانح نگار عبدالغنی شیخ صاحب صنم نربو کی زندگی کے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، جو ۱۹۴۸ء کے اُس حساس دور سے تعلق رکھتی ہے جب قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ اس دوران ہند سرکار نے انہیں لہہ لداخ میں ایک ہوائی اڈہ تعمیر کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس روداد کو مصنف عبدالغنی شیخ نے وید مہتہ نامی ایک قلمکار کا صنم نربو کے ساتھ ایک انٹرویو سے لیا ہے جو انہوں نے اپنی انگریزی کتاب Portrait of India میں شامل کیا تھا۔ ۱۶ر فروری ۱۹۴۸ء کو صنم نربو فوج کے دو افسران اور ہماچل پردیش اور لداخ کے سترہ جوانوں کو لے کر سرینگر سے لہہ کے لئے روانہ ہوئے۔ واضح رہے کہ درّہ زوجیلا پر سردیوں کے موسم میں سفر کرنے کا ارادہ کرنا ہی بذاتِ خود ایک کارنامہ ہے کیونکہ اب بھی یہ شاہراہ پانچ چھ مہینے تک وادی سے منقطع رہتی ہے۔ ان کی گاڑیوں کو سرینگر سے سونہ مرگ تک جانا تھا لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ کیونکہ یہ قافلہ ابھی سرینگر سے صرف اٹھارہ میل کا فاصلہ طے کر کے گاندربل پہنچا تھا کہ زبردست برف باری شروع ہوگئی۔ پھر بھی انہوں نے بڑی مشکل سے پندرہ میل کا سفر طے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے مقامی قلیوں کو سامان اور رسد اٹھانے کے لئے کرایہ پر لیا اور پیدل سفر شروع کیا۔ شدید برفباری کی وجہ سے صنم نربو کے اس قافلہ کو گونڈ کنگن میں سات دن رُکنا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر پیدل سفر شروع کیا۔ آگے کی کہانی مصنف سے ہی ملاحظہ کیجئے جو انہوں نے صنم نربو کے انٹرویو سے نقل کیا ہے۔ صنم نربو کہتے ہیں:

> ''میں نے قلیوں کو جمع کر کے کہا 'ہم آج سونہ مرگ جا رہے ہیں۔ گنڈ میں آسمان صاف تھا لیکن سونہ مرگ تک پندرہ میل کے سارے راستے میں برف باری ہوتی رہی۔ تاہم شام تک ہم سونہ مرگ پہنچ گئے۔ ریاستی ملیشیا کے بریگیڈیر فقیر سنگھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بریگیڈیر بولے:
>
> 'آگے جانا ممکن نظر نہیں آتا۔'

’لیکن ہمیں جانا ہوگا‘ میں نے کہا۔

دوسری صبح میں ڈھائی بجے اٹھا۔ میں نے تمام قلیوں کو جگایا اور ان کو اپنا سامان اٹھانے کے لئے کہا۔ انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ’کیا آپ ہم کو موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتے ہیں؟‘

کڑاکے کی سردی تھی۔ قلیوں کے رخساروں پر آنسو منجمد ہوتے تھے۔ میں نے سفر جاری رکھنے کے لئے ان کو التجائیں کیں۔ دھمکیاں دیں اور ساڑھے تین بجے ہم نے چلنا شروع کیا۔ برف نرم اور بھربھری تھی اور اتنی گہری تھی کہ ہر قدم پر ہم گلے تک برف میں دھنس جاتے تھے۔ پارٹی کے جو آدمی آگے آگے چل رہے تھے، وہ ایک قدم برف پر رکھتے اور گلے تک برف میں دھنس جاتے۔ اپنی لاٹھی کی مدد سے نکل آتے اور دوسرا قدم رکھتے۔ ہم اس برف میں سفر کرتے رہے اور بال تل تک آٹھ میل کا سفر مسلسل سولہ گھنٹوں میں طے کیا۔ اُس وقت شام کے سات بجے تھے۔“

حیرت کی بات یہ ہے کہ انجینئر صنم زربو کی قیادت کا یہ قافلہ یہاں تک پہنچ کے نہ رُکا اور اپنے کام کے تئیں اُن کی جانفشانی دیکھئے کہ انجینئر صنم زربو نے فروری کے مہینے میں دس پندرہ فٹ یا ہوسکتا ہے اس سے بھی زیادہ ہو، کے ہوتے ہوئے زوجیلا درّے کو عبور کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور اگلے دن انہوں نے اس پُر خطر سفر کی شروعات کی۔ آگے کا حال مصنف عبدالغنی شیخ صنم زربو کی کہانی انہی کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں:

”زوجی لا پر گزرگاہ بڑی تنگ ہے۔۔۔ تاہم ہم نے صبح سفر ساڑھے تین بجے شروع کیا۔ بال تل کے ڈاکیے نے ہمارے رہبری کی۔ زوجی لا کی بلندی سے آندھی کا ایک بگولا آیا۔ بگولا اتنا تیز تھا کہ ہمیں سانس لینے میں بڑی دقت پیش آئی۔ ہمارا دم رُک گیا۔۔۔ اترائی میں کئی دفعہ ہم ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے اور کبھی پیٹ کے بل رینگ کر چلنے لگے۔۔۔ گیارہ بجے سب صحیح

وسلامت زوجی لا کی بلندی پر پہنچے۔''

اس سوانح عمری سے آنجہانی صنم نربو کی شخصیت کا دوسرا اہم اور متاثر کن پہلو اور خوبی جو قارئین کو متاثر کرتا ہے وہ ان کی حق گوئی ہے۔ اس ضمن میں سوانح نگار عبدالغنی شیخ صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ پیش کیا ہے جس سے ان کی حق گوئی سے محبت اور دروغ گوئی سے نفرت کا پتہ چلتا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب صنم نربو ملازمت سے سبکدوش ہوکر سیاست کے میدان میں آئے اور وہ ایم ایل سی بن گئے تو ایک دن ان کو ایک وزیر نے یہ مشورہ دیا کہ وہ وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کے پاس جاکر ایک بیان دیں جس کی بنا پر ان کو ریاستی کابینہ میں شامل کرنے کا امکان تھا۔ لیکن اس بیان میں غلط بیانی کا پہلو مضمر تھا۔ ان کے قدر دانوں، حامیوں اور پرانے سیاست دانوں نے اُن سے اس بات کی استدعا کی اور کہا یہ بے ضرر بات کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اپنے دوستوں کی بات خاموشی سے سننے کے بعد اُٹھ کر چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولے، ''مجھ سے یہ بات نہیں کہی جائے گی۔''

غرض عبدالغنی شیخ کا لکھا ہوا یہ سوانح آنجہانی صنم نربو کو قارئین سے اچھی طرح متعارف کرواتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری ایک ایسے سرکاری آفیسر، انجینئر، منتظم، سفیر، سیاست دان اور سب سے بڑھ کر ایک مثالی انسان اور اصولوں کے پیکر سے واقف ہوکر متاثر ہوتا ہے جو صنم نربو کی ذات میں رچا بسا ہے۔ قاری کو کبھی کبھار ایسا لگنے لگتا ہے کہ وہ ایک فرشتہ صفت اور مثالی انسان کی حیات وشخصیت کا مطالعہ کر رہا ہے۔

اس سوانح کو پڑھ کر قاری ایک ایسے شخص سے متعارف ہوتا ہے جو اپنے اصولوں کے بہت پکّے تھے۔ وہ ایک نہایت ہی سچا، دیانتدار اور ایماندار شخص تھے جو اپنے اصولوں سے کبھی بھی کسی بھی قیمت پر مفاہمت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ایک سیکولر، غیر متعصب اور نیک نیت انسان تھے۔ صنم نربو کی شخصیت، ان کے عادات واطوار، ان کی نفاست پسندی، دیانت داری اور اپنی زندگی کو اپنے کام کے لئے وقف کرنا جیسی خصوصیات اس قدر متاثر کن اور سبق آموز ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو خصوصاً عبدالغنی شیخ صاحب کی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

●●●

☆......منشور بانہالی

عبدالغنی شیخ: دیدہ ور محقق اور ثقافت شناس شخصیت

عبدالغنی شیخ (۱۹۳۶ء) سرزمین لداخ سے متعلق ایک ایسے معتبر اور کہنہ مشق محقق ہیں جو ایک بے لوث محسن کی طرح اِس سرزمین کے ساتھ جُڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ لداخ کے چٹیل میدانوں میں دور سے ہی ایک چنار کی طرح سایہ فگن نظر آتے ہیں۔ لداخ کا جب ذکر کیا جائے گا عبدالغنی شیخ کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب کی بات ہو، لداخی ادب کی بات ہو یا تحقیق و تاریخ کی بات ہو آپ ہر میدان میں یکساں طور پر سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ آپ جہاں ایک مستند فکشن نگار ہیں وہیں آپ کو اپنے اس زاد بوم اور خطۂ ارض کی تاریخ و ثقافت کے ساتھ جنون کی حد تک وابستگی ہے، جس کا ثبوت آپ کی مرتب کی ہوئی کئی تصنیفات اور مطبوعات میں دیکھا جاسکتا ہے، جن میں آپ نے اس خطۂ ارض کے مختلف تاریخی، تہذیبی، ادبی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اور ایک فرض شناس محبّ وطن اور دیدہ ریز محقق و ثقافت شناس کا حق ادا کیا ہے۔ آپ کی مطبوعات کی ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں آپ کی اردو اور انگریزی کتابیں شامل ہیں۔

لداخ ریاست جموں و کشمیر کے تینوں خطوں میں رقبہ کے لحاظ سے سب سے بڑا خطہ ہے، جو ستانوے ہزار کلومیٹر سے زیادہ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے جس کی آبادی ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ڈھائی لاکھ کے قریب نفوس پر مشتمل تھی۔ چند سال قبل یہ آبادی کے لحاظ سے ملک کا سب سے چھوٹا ضلع مانا جاتا تھا جو اب دو اضلاع پر مشتمل ہے۔ اپنے مخصوص جغرافیائی اور ثقافتی خواص کی بنا پر اسے مختلف ناموں

سے یاد کیا جاتا ہے۔ اپنے بلند محل وقوع کی بنا پر اسے چاند کی زمین Moon Land یا عالم بالا یا دُنیا کی چھت Roof of the World، مختلف رسومات اور ثقافت کے پیش نظر جادوئی ملک (Magic World) یا پُر اسرار زمین، زاہدوں کی مملکت (Kingdom of Hermits) اور جنگلی جانوروں کی کثرت کے لئے (Sportman's Paradise) جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ خطۂ ارض ملک کے سیاحتی نقشے پر ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے اور قدیم ایام سے ملکی اور غیر ملکی مورخین، محققین، مہم جوؤں اور سیاحوں کی توجہ اور دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے، جنہوں نے یہاں کے مختلف تاریخی، جغرافیائی، تمدنی، لسانی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ لداخ سے متعلق عبدالغنی شیخ کی ایک اہم کتاب ''لداخ، محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' ۲۰۱۱ء میں چھپ کر سامنے آئی ہے جس میں صدیوں سے زمانہ حال تک لداخ میں آنے والے قریباً دو سو بائیس سے زائد ملکی و غیر ملکی سیاحوں، اسکالروں، محققین اور کئی منتظمین کے تاثرات اور مشاہدات کو اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ مصنف موصوف نے لداخ میں آنے والے سیاحوں اور محققوں کو چھ زُمروں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ سیاسی، سفارتی اور تجارتی مشن پر آنے والے برطانوی ہند کے نمائندے۔

۲۔ روس کی توسیع پسند پالیسی کے سدِ باب اور وسطِ ایشیا سے تجارتی تعلقات کو تقویت دینے کی خاطر وقتاً فوقتاً آنے والے وفود۔

۳۔ سلک روڈ اور صحرائے گوبی میں آثارِ قدیمہ کے انمول خزانے تلاش کرنے والے مہم جو۔

۴۔ قدرت کے سربستہ رازوں کا انکشاف کرنے والے مہم جو، دلدادۂ فطرت اور سروے کرنے والی ٹیمیں۔

۵۔ عیسائی مشنریز اور محقق تبلیغی مشن پر آنے والے پادری (جن میں کئی پادریوں نے لداخی اور تبّتی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرلی) بزرگانِ دین اور علمائے کرام۔

۶۔ عام سیاح، شکاری اور برطانوی آفیسر جو خاص کر جنگلی بکرا، کیل، ہرن، برفانی چیتا، یاک اور بارہ سنگھا اور تبّتی غزال وغیرہ جیسے جانوروں کا خاص طور سے شکار کرتے تھے۔ اِن سیاحوں، مہم جوؤں اور محققین میں ولیم مور کرافٹ (۱۸۲۰ء) کیپٹن جے۔ڈی۔ کننگھم (۱۸۴۱ء)، سرلارنس (۱۸۴۶ء)،

فریڈرک ڈریو (۱۸۴۲۔۸۹)، کیپٹن تھامسن جارج منٹگمری (۱۸۶۲ء)، ڈاکٹر ہنری کیلے (۱۸۹۷ء)، رابرٹ شا (۱۸۶۸ء)، کیپٹن گاڈفری، وزیر حشمت اللہ خان، چودھری خوشی محمد ناظر، جینت رِضوی، وید مہیتہ وغیرہ وغیرہ متعدد نام شامل ہیں۔ طرز رہن سہن، سماجی، معاشرتی زندگی اور عقائید و مذہب کے بارے میں بہت ہی دلچسپ معلومات اور حقائق کو سامنے لایا ہے۔ مثلاً یہ کہ ابتدا میں سیاح جان ہتھیلی پر رکھ کر بِلا اجازت لداخ میں داخل ہوتے تھے۔ لداخ کا سفر اتنا کٹھن تھا کہ کئی مقامات پر مسافروں کو گھٹنوں اور پیٹ کے بل چلنا پڑتا تھا اور سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں کئی مقامات پر گرنے کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ لیکن پھر بھی یورپ کے مہم جوؤں نے لداخ کا چپہ چپہ چھان مارا، برفانی چوٹیاں سرکیں، جھیلوں کی گہرائیوں کا پتہ لگایا، بے آب وگیاں میدانوں اور گھاٹیوں کی دشت نوردی کی۔ مختلف مقامات کی بلندیوں اور درجہ حرارت کو معلوم کیا اور کئی سیاح اپنی زندگیوں تک کو بھی گنوا بیٹھے۔ مصنف موصوف کے مطابق زمانہ قدیم سے لداخ کے راستے مسافر، علما، مبلغین اور محققین، تبت، چین اور وسط ایشیا سے یہاں آتے جاتے رہے۔ لیہہ صدیوں سے وسطِ ایشیا کا تجارتی مرکز رہا اور یہاں سینٹرل ایشیا کے علاوہ شمالی ہند، سائبیریا اور افغانستان کے تاجر جمع ہوا کرتے تھے اور اشیا کا تبادلہ اور خرید وفروخت کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دُنیا کے بہت سارے ممالک سے عام سیاح سے لے کر مختلف شعبہ ہائے حیات کے ماہرین آتے رہے اور اپنا سفرناموں اور یاداشتوں میں یہاں کی مجموعی زندگی اور بود و باش سے متعلق گرانقدر معلومات ہم تک پہنچاتے رہے۔ جنہوں نے خاص معلومات حاصل کی ہیں۔ بقول مصنف قدیم لداخ سے متعلق مورخوں کو کم مواد ملا ہے۔ چینی سیاح فاہیان، ہیون سانگ اور اوکونگ نے بھی اپنے سفرناموں میں قدیم لداخ کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی آمد سے متعلق یہاں ثبوت موجود نہیں ہیں۔ فاہیان نے چوتھی صدی عیسوی میں لداخ کو کھچاپایا خاچن پا کہا ہے۔ 'خا' لداخی میں برف کو کہتے ہیں یعنی برف کا گھر۔ تاریخ میں پہلے پہل یونانی مورخ ہیروڈٹس نے پانچ صدی قبل مسیح میں بلا واسطہ طور پر لداخ کا ذکر کیا ہے اور اپنے سفر کا تذکرہ کرنے والا پہلا چینی یاتری ہوئی چاو ہے جو ۷۲۷ء میں ہندوستان سے وسط ایشیا روانہ ہوا۔ اُس نے بڑا پولو اور دیگر دو مقامات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ علاقے تنگ ہیں۔ یہاں گُنپے اور بھکشو ہیں اور

بدھ مت کے پیروکار رہیں۔ تب بڑا پولولتستان کو کہتے تھے۔ ہیون سانگ نے ساتویں صدی عیسوی میں لداخ کو سائیپو کے نام سے یاد کیا ہے۔ مولوسو اور سانپو لداخ کے قدیم نام ہیں۔ سیاحوں نے لداخ کو شنگریلا یا آخری شنگریلا بھی کہا ہے۔ شنگریلا شمبھالا کا ہم معنی ہے۔ بودھ عقیدہ کے مطابق یہ ماورائی خوبصورت جنت نما دیش ہماری اِس دُنیا میں کہیں پوشیدہ ہے۔

مصنف کی اس کتاب میں معلومات کا ایک انبار دیکھنے کو ملتا ہے جس میں آپ نے مختلف سیاحوں کے سفرناموں کے حوالے سے اور اُن کی روشنی میں، اس جادوئی دیش کے لوگوں کے رسم و رواج، طرزِ رہن سہن، سماجی، سیاسی، معاشرتی زندگی اور عقائد و مذہب کے بارے میں بہت ہی دلچسپ معلومات اور حقائق کو سامنے لایا ہے۔ مثلاً یہ کہ ابتدا میں سیاح جان ہتھیلی پر رکھ کر بلا اجازت لداخ میں داخل ہوتے تھے۔ لداخ کا سفر اتنا کٹھن تھا کہ کئی مقامات پر مسافروں کو گھٹنوں اور پیٹ کے بل چلنا پڑتا تھا اور سینکڑوں فٹ کی گہرائی میں کئی مقامات پر گرنے کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ لیکن پھر بھی یورپ کے مہم جوؤں نے لداخ کا چپہ چپہ چھان مارا، برفانی چوٹیاں سر کیں، جھیلوں کی گہرائیوں کا پتہ لگایا، بے آب و گیاہ میدانوں اور گھاٹیوں کی دشت نوردی کی۔ مختلف مقامات کی بلندیوں اور درجہ حرارت کو معلوم کیا اور کئی سیاح اپنی زندگیاں گنوا بیٹھے۔ مصنف موصوف کے مطابق زمانہ قدیم سے لداخ کے راستے، مسافر، علما، مبلغین اور محققین تبت، چین اور وسط ایشیا سے یہاں آتے جاتے رہے۔ لیہہ صدیوں سے وسطِ ایشیا کا تجارتی مرکز رہا اور یہاں سینٹرل ایشیا کے علاوہ شمالی ہند، سائبیریا اور افغانستان کے تاجر جمع ہوا کرتے تھے اور اشیا کا تبادلہ اور خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں دُنیا کے بہت سارے ممالک سے عام سیاح سے لے کر مختلف شعبہ ہائے حیات کے ماہرین آتے رہے اور اپنے سفرناموں اور یادداشتوں میں یہاں کی مجموعی زندگی اور بود و باش سے متعلق گراں قدر معلومات ہم تک پہنچاتے رہے۔

آپ نے پتھر کے زمانہ سے لے کر جدید دور تک کے زمانے کے تاریخی ادوار اور واقعات کو بیان کیا ہے۔ تبت اور لداخ کے قدیم باشندوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ یہاں آدم خور قسم کے وحشی لوگ بھی رہتے تھے۔ لداخ کے موجودہ لوگ، مون، درد اور منگول نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لداخ کا قدیم

مذہب بون تھا، جو خدا کے علاوہ کئی دیوتاوں کو بھی مانتے تھے۔ لیہہ کی ایک نسل کو آرغون کہتے ہیں، کئی سیاحوں نے اُن پر حرف گیری بھی کی ہے لیکن بیشتر نے اِن کا دفاع بھی کیا ہے اور اُن کی تعریف بھی کی ہے۔ ہندوستان کو آزادی ملنے سے قبل لداخ آنے والے تقریباً تمام مغربی سیاحوں نے لداخیوں کے چال وچلن کی تعریف کی ہے اور انہیں خوش اخلاق، راست باز اور امن پسند بتایا ہے۔ تاہم بیشتر سیاحوں نے لکھا ہے کہ یہ بہت کم نہاتے دھوتے ہیں، جس کا اکثر سبب سردی کا ہونا بتایا گیا ہے۔ لیکن اب موجودہ دور کے لداخی بہت ہی صاف ستھرے رہتے ہیں اور خوش پوش بھی۔ کئی سیاحوں نے یہاں پر حضرت عیسیٰؑ کی آمد کا بھی ذکر کیا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے دوران یہاں ارہٹ نیما گوں گروپدما سمبھا وا بودھ عالم کی آمد کا ذکر کیا گیا ہے جن کی توسط سے یہاں کئی گُنپے تعمیر ہوئے۔ اِس کے علاوہ یہ بھی ذکر ملتا ہے کہ کنشک نے پانچوں کشمیری بودھ عالم یہاں پرچار کے لئے بھیجے جو بدھ مت کی تشہیر کرتے رہے۔ رنچن زنگپو جو ایک مُستند بودھ عالم تھے، تین بار کشمیر آئے اور یہاں سے مصور اور معمار ساتھ لے گئے اور مغربی تبت تک ۱۰۸ وہار اور استوپا تعمیر کرائے وہ بعد میں نیر مایونیورسٹی میں پرنسپل رہے جس کو ۹۹۲ء میں راجہ ایشے ادوھ نے تعمیر کیا تھا۔ آپ نے لداخیوں کو اچھی نظامِ علاج اور جیوتش کے علم سے بھی روشناس کرایا۔ کئی سیاحوں کے مطابق لداخی، لداخ کو دُنیا کا ناف کہتے تھے اُن کا خیال تھا کہ یہ دُنیا کے مرکز میں ہے۔

پولو لداخیوں کا مقبول کھیل رہا ہے۔ اِس کھیل میں کھلاڑی گھوڑے پر سوار ہو کر گیند کو ہوا میں اُچھالتے ہیں اور گھوڑے سے اُترے بغیر گیند کو ہاتھوں میں لیتے ہیں۔ پولو گراونڈ کو لداخ میں ''شغارن'' کہتے ہیں۔ مختلف سیاحوں مور کرافٹ اور الیگزنڈر، کننگھم نے بھی قریباً دو سو سال پہلے اس کھیل کا ذکر کیا ہے۔ کئی سیاحوں نے یہاں پر سانس لینے کی تکلیف کی بیماریوں کا ذکر کیا ہے جس کو کبھی لرڈوک یا درّے کے زہر کے نام سے بھی پکارا ہے۔ اس بیماری کے علاج کے لئے تیز کالی چائے کا پینا، خرگوش کے گوشت کا استعمال یا سوکھی خوبانیوں کے سفوف کو علاج کے طور پر مُجرب گردانا گیا ہے۔

۱۳۸۸ء میں نامور ولی خدا اور عالم دین میر سید علی ہمدانی لداخ آئے۔ لیہہ میں آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی۔ انہوں نے جہاں پر قیام کیا وہاں پر آج ایک جامع مسجد شریف موجود ہے۔ آپ کی

لکھی ہوئی اورادِ فتحیہ کا ورد آج بھی لداخ کی مساجد میں کیا جاتا ہے۔ آپ کی وجہ سے ہی کشمیر میں شال بافی کو فروغ ملا۔ اسی طرح سید شریف الدین بُلبل کشمیر کے آخری ہندو راجہ سہدیو (۱۳۰۰۔۱۳۲۰ء) کے عہد میں وسط ایشیا سے لداخ کے راستے سے کشمیر آئے اور لداخی شہزادہ نے آپ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا۔ بعدازاں شیخ زین شاہ ولی (۱۴۲۳۔۱۴۷۸) سلطان زین العابدین کی ناراضگی کے سبب مریدوں کے ہمراہ لداخ چلے آئے اور یہاں تبلیغ دین کیا۔ بعد میں جب سلطان بیمار ہوا تو اُس نے اپنی بیماری کو شیخ موصوف کی ناراضگی اور بددعا کا نتیجہ سمجھا اور انہیں واپس کشمیر بُلایا۔ جن کا روضہ اب عیش مقام کشمیر میں ہے جہاں اِن کے ایک لداخی عقیدت مند کا مقبرہ بھی ہے۔

۱۵۰۵ء میں شمس الدین اراکی (ایران کا ایک شہر) ۵۰ عُلما اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کشمیر سے پوریگ آئے اور وہاں سے بلتستان گئے اور کئی لوگوں نے یہاں نوربخشی مسلک اختیار کیا۔ بعد میں یہاں بابا نصیر الدین غازی آئے اور لوگوں کو پیغام حق سے مُشرف کیا۔

۱۵۳۱ء میں ترک جرنیل مرزا حیدر گورگان نے لداخ پر حملہ کیا اور قابض ہوا اور اِس کے بعد ترک حکمران سُلطان سعید نے لداخ پر حملہ کیا جو بعد میں دَم گیری کی بیماری سے مرگیا۔ مرزا حیدر کے مطابق ایک ہی رات میں دو ہزار گھوڑے اِس بیماری سے مر گئے۔ مرزا نے یہاں کے جنگلی یاک کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر یہ کسی پر حملہ کرے تو اُسے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کیونکہ یاک اپنے شکار کو ہوا میں اُچھال کر موت کے گھاٹ اُتارے بغیر نہیں چھوڑتا ہے۔

قدیم ایام میں یہاں جن، بھوت پریت اور آسیب کا بڑا چرچا رہا ہے اور آسیب زدہ شخص کو لہولہان کیا کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ختم ہو کر رہ گیا۔ کئی مخلص سیاحوں نے لداخیوں کے مصائب کا بھی ذکر کیا ہے۔ ولیم ہیڈے اور ایڈورڈ پاگیل نے ۱۸۵۵ء میں لداخ کا سفر کیا۔ انہوں نے لداخیوں پر گلاب سنگھ کے کارندوں کے بھاری ٹیکسوں کا ذکر کیا ہے۔ جس کے سبب بہت سے لداخی برطانوی ہند کے علاقوں میں فرار ہو گئے۔ اُن کے مطابق بیگار کا نظام سخت تھا۔ سرکار کسانوں سے نقل و حمل کا کام مفت لیا کرتی تھی۔ بلکہ لیہہ سے سرینگر تک ڈاک رسان بیگار میں شامل تھی۔ رشوت ستانی زوروں پر تھی۔ ایک منتظم اعلیٰ جب سرینگر سے لیہہ تبدیل ہوا تو اُسے اپنے سامان اور خاندان کے افراد

کو لانے کے لئے بارہ گھوڑے درکار تھے۔ چند ماہ بعد جب وہ وہاں سے اسکردو گیا تو چوبیس گھوڑوں پر صرف اپنا سامان لے گیا اور دفتری ریکارڈ کے لئے بارہ گھوڑے، افراد خانہ کے لئے سات پالکیاں اور تیس کے قریب قلی منگوالیئے۔

ولیم مورکرافٹ کو آپ وہ پہلا یورپی مانتے ہیں جو انیسویں صدی کے پہلے ربع کے دوران راجگان لداخ کے دور میں دو سال تک لداخ میں رہا اور اُس نے زانسکار کے سوا تقریباً سارا لداخ دیکھا اور یہاں کے رسم و رواج، پیداوار، معدنیات اور چرند و پرند اور سماجی اور سیاسی و معاشی صورتِ احوال پر سیر حاصل معلومات رقم کیں۔ مورکرافٹ پیشے سے ایک ویٹرنری ڈاکٹر تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی کا نام جارج ٹریبیک کا ملازم تھا اور یہی دونوں چھوٹے صاحب اور بڑے صاحب کے نام سے یہاں مشہور تھے۔ مورکرافٹ انگریزوں کی صنعتی مصنوعات اور اونی اور سوتی کپڑوں کی منڈی تلاش کرتا تھا۔ اُس کی پارٹی میں چودہ مسلح گورکھا سپاہی، کئی ہندوستانی منشیوں اور اہلکاروں سمیت پچاس مستقل ملازم تھے۔ ۱۸۲۱ء میں مورکرافٹ اور لداخی حکومت کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا، جس پر یہاں کے پشمینہ کے تاجر مایوس ہوئے کیونکہ وہ فرنگیوں کے ساتھ تجارت کرنے کے حق میں نہ تھے۔ مورکرافٹ یہاں مریضوں کا علاج بھی کرتا رہا اور وہ لداخ میں فلینگ گویا یا انگریز نمبردار کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ وہ دراصل لداخ کو برطانوی ہند کی چھتر چھایا میں دیکھنا چاہتا تھا اور وسط ایشیا کو انگریزوں کے اثر ورسوخ میں لانے کا حامی تھا۔ آپ کا سفرنامہ اور یادداشتیں اِس دور کے لداخ کا ایک اہم اور دلچسپ ریکارڈ ہیں۔ آپ کے دوسرے ساتھ جارج ٹریبیک نے بھی خطوط کی صورت میں معلومات چھوڑی ہیں۔ یہ نگارشات قریباً دس ہزار صفحات کی ضخامت پر مشتمل ہیں جنہیں (Moorcraft Collections) کے نام سے لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے محافظ خانہ میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ آپ کے سفرنامہ کو ایچ۔ ایچ ولسن نے ۱۸۴۱ء میں شائع کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کے تاثرات اور یادداشتوں کو ایک بڑا اثاثہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ آپ کا لیہہ کے بعد لہاسہ علاقہ میں بارہ سال تک قیام کرنا بھی بتایا جاتا ہے۔ ۱۸۱۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک اور اہلکار میر عزت اللہ لداخ کے راستے بُخارا روانہ ہوا۔ میر کو دراصل مورکرافٹ کے سفر کی راہ ہموار کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ میر

نے خود بھی یہاں کے رسم ورواج اور سماجی زندگی سے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ البتہ اُس نے لیہہ لداخ کو تبت کہا ہے اور لیہہ کو تبت کی راجدھانی بتایا ہے۔ اُس کے مطابق ''لیہہ میں ایک مسجد ہے اور امام کو ہر تاجر مال کی آمد پر ایک جٹو دیتا ہے۔ چوبیس جٹو کا ایک روپیہ ہوا کرتا تھا۔ جٹو پر مغل بادشاہ محمد شاہ کا نام تھا۔ مغلوں نے لداخی راجہ کو عاقبت محمود خان کا نام دیا ہے وہ بدھ مت کا پیرو کار تھا۔

مور کرافٹ کے مطابق لداخ کے دریاؤں میں مچھلیوں کی بھر مار ہے لیکن بودھ مت کی تعلیمات کے مطابق یہ لوگ مچھلیوں کو نہیں پکڑتے۔ آپ کے مطابق لداخی عورتیں خوش مزاج ہیں اور اپنے لباس اور لوازمات میں یورپ کی کسی راجدھانی کی فیشن زدہ خواتین میں تہلکہ مچا سکتی ہے۔

مور کرافٹ ۲۷/اگست ۱۸۲۵ء کو وسط ایشیا کے ایک شہر اندکوہی میں بخار اور کمزوری سے چل بسا اور اس کے ساتھی جارج ٹریبک، ڈاکٹر گوتھرائی اور میر عزت اللہ بھی بعد میں چل بسے۔ مور کرافٹ کے بارے میں یہ انوکھا واقعہ بھی ہے کہ وہ وسط ایشیا سے تبت گیا اور بارہ سال تک وہاں ایک کشمیری کے بھیس میں رہا لہاسہ میں رہا اور بعد میں ہندوستان جاتا ہوا تبت میں رہزنوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

لداخ پشمینہ کے لئے مشہور ہے۔ ۱۸۳۴ء میں وزیر زورآور سنگھ کی لداخ پر فوج کشی کا ایک بڑا سبب پشمینہ پر ڈوگرہ حکومت کی اجارہ داری تھا۔ لداخ میں شدید سردی پڑتی ہے۔ کبھی کبھی مرغیاں اور مرغ ڈربوں میں اور گائیں گاؤخانوں میں مردہ پائی جاتی تھیں۔ لیہہ کو لداخ کی جان کہا گیا ہے جس کی تعریف متعدد سیاحوں نے کی ہے۔ ارتھر نیو (۱۸۸۲ء) کے مطابق لیہہ آریاؤں اور منگولوں کے ملن کی جگہ ہے اور یہاں کی شفاف فضا کو دیکھ کر اکثر شیکسپیر کے اشعار یاد آتے ہیں۔ نیز یہاں سبزیاں بھی اُگائی جاتی ہیں۔ لیہہ کا تاریخی محل پہاڑی پر واقع ہے، جسے ۱۶۲۰ء میں راجہ سنگیے نمگیل نے تعمیر کیا ہے جو لداخی آرٹ کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ جسے اب محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ لداخی آرٹ کا ذکر کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں کہ لداخ کی دیواری مصوری اور نقاشی پر مختلف ملکوں اور خطوں اور آرٹ سکولوں کا اثر رہا ہے۔ ان میں ایشیا، نیپال، ایران، تبت، کشمیر، چین، گندھارا، بنگال، بہار کے پالا سپنا اور مغل آرٹ کے اثرات شامل ہیں۔

لداخ میں عورتوں کو پوری آزادی حاصل ہے اور بچی پیدا ہونے پر کسی کو مایوسی کا احساس یا

قلق نہیں ہوتا۔ لداخی عورت اپنے گھر کی مالکن ہے۔ مرد اس کی مضبوط قوت کے زیر نگین ہے۔ لداخی باپ کے بجائے ماں کی قسم اُٹھاتے ہیں۔

سیاحوں نے دور ماضی میں لداخی کے بودھوں میں کثیر ازدواجی (Polyandry) کے رواج کا ذکر کیا ہے جس میں ایک بیوی کے ایک سے زیادہ شوہر ہوا کرتے تھے اور پیدا ہونے والے بچے کا نام بڑے بھائی کے نام پر رکھا جاتا تھا۔ لیکن زمانہ حال میں اس کے خلاف زوردار تحریک چلائی گئی اور اِس کا قلع قمع کیا گیا۔

الیگزینڈر کننگھم جسے ۱۸۴۷ء میں برطانوی ہند کے گورنر جنرل نے سرحدی تبتی کمیشن کے سلسلے میں لداخ بھیجا۔ آپ نے جہاں یہاں کے نظامِ حکومت، تاریخ، زبان اور تجارت پر مفصل تبصرہ کیا ہے وہیں آپ مجرموں کی سزاؤں سے متعلق رقم طراز ہیں ''مجرموں کو یہاں قید، دُرے مارنا، ملک بدر کرنا اور سزائے موت جیسی سزائیں دی جاتی ہیں۔ گنپوں کی بے حُرمتی کرنے والے مجرم کو ہاتھ رسی سے باندھ کر اور ایک پتھر گلے میں ڈال کر دریا میں پھینک دیا جاتا ہے۔'' ۱۸۵۶ء میں ایک جرمن سیاح اڑولف شلیگے گن جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا لداخ میں آیا۔ لیکن اُسے پُراسرار طور پر مارا گیا اور اُس کی ڈائیری ایک نسوار فروش کو بیچی گئی جسے ایک شخص عبدالودُود نے سولہ ماہ کی چھان بین کے بعد ایک روپیہ میں خرید کر بازیاب کیا۔''

چودھری خوشی محمد ناظر جو گجرات پنجاب کے رہنے والے تھے ۱۹۰۷۔۱۹۱۰ء تک لداخ میں وزیر وزارت رہے۔ وہ ایک اچھے منتظم کے علاوہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ جب وہ چنگ تھنگ کے دور دراز پہاڑی علاقے میں گئے تو کم آبادی والے اس علاقے میں محنت کش اور سادہ لوگوں کی زندگی اور فطری ماحول کی دلفریبی سے کافی متاثر ہوئے اور اپنی ایک نظم میں اس کا یوں نقشہ کھینچا:

آ گئے ایسی جگہ ناظر جہاں کوئی نہیں
گردِ راہ کوئی نہیں اور کارواں کوئی نہیں
شور ناقوس اور آوازِ اذان کوئی نہیں
تفرقہ شیخ و برہمن کا یہاں کوئی نہیں

آپ نے یہاں کی معاشرتی اور سماجی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

۱۸۵۰ء میں سر والٹر لارنس لداخ آیا۔ اس دوران اگرچہ اُس کی کوئی تحریر نہیں لیکن ۱۹۰۹ء

میں اُس نے امپریل گزیٹر آف انڈیا مُرتب کیا جس میں لداخ کی مالیات اور نظام حکومت کے متعلق کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ بے اولاد عورتوں سے متعلق وہ لکھتے ہیں ''اگر کسی عورت کا بچہ نہیں اور جب اُس کا شوہر مرجائے تو وہ اُس کی اُنگلی پر دھاگہ باندھ کر اپنی اُنگلی سے باندھ لیتی ہے اور اُسے توڑ دیتی ہے اور یہی اُسے باقی شوہروں سے بھی طلاق لینے کی علامت ہے۔

اکثر سیاحوں نے لیہہ سے متعلق رسول گلوان کو ایک قابل ترین کارواں لیڈر قرار دیا ہے۔ جو تبتی، انگریزی اور تُرکی زبانیں جانتا ہے اور سیاحوں کی بہترین رہنمائی کرتا رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں امرناتھ نامی افسر لیہہ میں تحصیل دار رہے۔ اُس نے لداخ سے متعلق ایک گائیڈ بُک لکھ کر یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''لداخی کم بسترہ کا استعمال کرتے ہیں اور لکڑی کا سرہانہ استعمال کرتے ہیں۔ درد قبیلہ کے لوگ رات کو چراغ نہیں جلاتے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ دیوتا رات کو روشنی جلا کر رکھنے سے ناراض ہوتے ہیں۔ بچہ پیدا ہونے پر شوہر ایک ماہ تک گھر میں مقید رہتا ہے اور اُس کی بچے کی ماں سے بھی زیادہ خدمت کی جاتی ہے۔ لوسر اور دوسمو چھے یہاں کے مشہور تہوار ہیں جن میں راجہ خود شرکت کر کے گھوڑوں پر جلوس کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ لداخی رقص و موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ مورناچ، سانپ ناچ، چھمز (لاموں کا مذہبی رقص) اور تلوار ناچ وغیرہ یہاں کے اہم تفریحی ناچ ہیں۔ پیالی ہمیشہ لداخیوں کے ساتھ رہتی ہے۔ غریب لوگوں کی پیالی لکڑی کی ہوتی ہے اور امیر لوگوں کی پیالی پر چاندی کا پتر الگا ہوا ہوتا ہے۔ پیالی کے ساتھ ایک چمچی بھی ہوا کرتی ہے جسے وہ چائے پینے اور ستو گھولنے کے کام میں لاتے ہیں۔'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ جب ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ ہری سنگھ تخت نشین ہوا تو اُس نے سرینگر میں تعینات انگریز ریذیڈنٹ کو یونین جیک لہرانے سے منع کرنے کی کوشش کی جسے بعد میں حکومتِ برطانیہ کی مداخلت پر لہرایا گیا۔''

۱۸۶۶ء میں ولیم ہنری جانسن لداخ آیا جو بعد میں یہاں چودہ سال تک وزیر وزارت رہا۔ اُس نے بعد میں ایک لداخی عورت سے شادی کی اور کئی اچھے کام بھی کیے۔ وہ رنگین مزاج تھا اور بعد میں بودھوں کی ناراضگی کا شکار ہوا۔ قرینِ قیاس ہے کہ بعد میں زہر سے اُس کی موت واقع ہوئی۔

۱۸۸۵ء میں لیہہ میں موراوین مشن قائم ہوا اور ڈاکٹر کارل مارکس اور فادر اڈولف اس کے

بانی تھے۔ اس مشن کے ذریعے لداخ میں گراموفون، کیمرے اور سلائی مشین جیسی اشیا متعارف ہوئیں
اور ۱۹۰۴ء میں انہوں نے لداخ میں پہلی بار ایک اخبار کا بھی اجراء کیا۔

کیپٹن۔ ایچ۔ ایل۔ رُمزے (Capt. H.L. Ramzay) ۱۸۸۵۔۱۸۹۱ء تک لیہہ میں برٹش کمشنر رہا۔ اس دوران اُس نے لداخ کے رسم و رواج اور معاشرت سے متعلق کئی پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطابق ان دنوں شادی کرتے وقت لڑکے کی عمر ۱۴۔۲۰ سال تک اور لڑکی کی عمر ۱۴۔۱۸ سال تک ہونا لازمی ہوا کرتی تھی اور شادی سے پہلے جیوتشی سے مشورہ لیا جاتا تھا اگر قسمت اچھی نہ نکلتی تو شادی اس جوڑے کے درمیان نہ ہوتی۔ اسی طرح اچھے اور بُرے شگونوں پر یقین رکھنے کا بھی عقیدہ تھا۔ رمزے نے علاقے میں تین طرح کے غلاموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک وہ لڑکے جن کو مغربی تبت سے والدین نے غربت کے سبب کم سنی میں لداخیوں کو فروخت کیا تھا۔ دوسرا گروہ ڈوگرہ سپاہیوں کی وہ ناجائز اولاد تھی جن کو وہ یہاں سے چلے جانے کے بعد چھوڑ گئے تھے اور اُنہیں غلام زادہ کہا جاتا تھا اور سرکار بھی اُن کی کم و بیش مدد کرتی تھی۔ تیسرا گروہ مقروضوں کا تھا جن کو باقیدار کہا جاتا تھا۔ اس دور میں لداخ میں کاغذ ایک پودے کی جڑوں سے تیار کیا جاتا تھا جس کا نام (Astrogebes Strictus) ہوا کرتا تھا۔

رمزے نے اِس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ لداخی سیاحوں کو شاندار اور روایتی طریقے سے استقبال کیا کرتے تھے۔ عورتیں برتنوں میں خشک پھل اور پھول، آٹا اور لسی لئے سیاحوں کی راہ میں ایک طرف قطار میں کھڑی رہتی تھیں اور غریب لوگ سیاحوں کو گلدستے پیش کرتے تھے۔

وزیر حشمت اللہ خان نے لداخ بلتستان، گلگت اور چترال میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا۔ آپ نے تاریخ جموں، لداخ، کشتواڑ بلتستان اور گلگت وغیرہ کے نام سے اِن خطوں کی تاریخوں کو مرتب کیا ہے اور یہاں کے رسم و رواج، شادی بیاہ اور طلاق، میلوں اور تہواروں کے حوالے سے کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ لداخ میں وہ شادی کی رسم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ شخص جس کا سلسلہ نسب باپ یا ماں کی طرف سے سات پشتوں کے اندر مل جاتا ہے ایک دوسرے کے ساتھ شادی نہیں کر سکتے۔ جہاں تک طلاق کا تعلق ہے، مرد ہر وقت طلاق کا حق رکھتا ہے اور وہ ایک سے زیادہ اور تین تک

بیویاں رکھ سکتا ہے۔ ایک اور سیاح نے لداخ کے ایک اور خانہ بدوش قبیلے چانگپا پر تحقیق کا کام کیا ہے، یہ بہت ہی محنتی اور جفا کش ہیں اور پشمینہ بکریاں پالنے کا کام کرتے ہیں اور اچھے دام کماتے ہیں۔ عورتیں ہر وقت کتائی بُنائی میں مگن رہتی ہیں۔ ادیب وید مہتہ نے لداخ کے ایک سرکردہ انجینئر صنم زبو کا ذکر کیا ہے، جو اُس وقت سرینگر کے ہوائی مُستقر کا انچارج تھا اور اُس نے ۱۹۴۸ء میں جُرأت مندانہ طور سخت برف باری کے دوران اپنی ٹیم کے ساتھ سری نگر سے لیہہ تک کا سفر پیدل چل کر طے کیا۔ لیہہ میں ہوائی اڈہ کو تعمیر کروایا اور وہاں فوج کو اُترنے کے لئے ممکن بنایا۔ اردو کے جانے مانے افسانہ نگار ستیش بترا ۱۹۸۵ء میں لداخ آیا۔ اُس نے کرگل شہر کی کافی تعریف کی ہے، بقول اُس کے قدیم زمانے میں کوہ قاف کی پریاں خوبصورتی کے لئے مشہور تھیں اب وہی خوبصورتی یہاں کی دوشیزاؤں کے انگ انگ میں رچی معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح سے جنت رضوی ایرلینڈ سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون بھی لداخ پر تحقیق کا کام کر رہی ہے، جو اب ایک آئی اے ایس آفیسر سجاد رضوی کے ساتھ شادی کرنے کے بعد ہندوستان میں بس گئی ہے۔ اس کے مطابق لداخی اب پہلے سے زیادہ خوش حال ہیں اور پوری عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جو تاجر کشمیر سے یہاں پشمینہ خریدنے کے لئے آتے ہیں اُنہیں تبت بقال کہا جاتا ہے۔ بقول اُس کے ماضی میں کسی ملازم کو یہاں بھیجنا ایک سزا کے مترادف سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہاں تمام طرح کی سہولیات میسر ہیں۔

عبدالغنی شیخ یہاں کے ایک اہم قلمکار ہیں، جو ادب، تاریخ، فلسفہ اور مذہبیات جیسے موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں۔ آپ کے دو اردو ناول ''دل ہی تو ہے'' اور ''کتابوں کی دنیا'' کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی اور ریاستی سرکار کی جانب سے انعامات سے بھی نوازا گیا ہے اور اس کے علاوہ بھی اردو میں آپ کی قابل قدر تصنیفات موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ لداخ سے متعلق ایک دیدہ ریز محقق اور تہذیب و ثقافت شناس ہیں۔ زیر بحث آپ کی تصنیف ''لداخ محققوں اور سیاحوں کی نظر میں'' آپ کی جگر کاوی اور محنت شاقہ کا ثمرہ ہے جسے لگ بھگ ۱۷۵ سے زیادہ کتابوں اور ماخذوں سے استفادہ کر کے تیار کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ کہیں واقعات کی تکرار اُلجھن بھی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً جہاں مور کرافٹ کی موت کو بخار کا سبب بتایا گیا ہے، وہیں اس کی موت کو رہزنوں کے

ہاتھوں قتل ہونے کی وجہ بھی بتایا گیا ہے۔لیکن مجموعی طور اس کتاب میں معلومات کا ایک وافر مواد موجود ہے۔ نیشنل بُک ٹرسٹ انڈیا نے اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیشِ نظر ۲۰۱۴ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کیا ہے۔عبدالغنی شیخ ایک منجھے ہوئے ادیب، محقق اور تہذیب وثقافت شناس ہیں، جنہیں اردو کے علاوہ انگریزی زبان و ادب پر بھی نظر ہے۔محاورے کی چست بندش، سلاست اور اختصار آپ کی تحریریوں کا خاصہ ہے۔آپ لداخ سے متعلق تحقیق وتدقیق کے ایسے مردِ میدان ہیں جو ہر دم مستعد نظر آتے ہیں اور جن کے کام کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

••• ......

شیرازہ اُردو ''عبدالاحد آزاد نمبر''

روایت سے بغاوت کرنے والے عبدالاحد آزاد ایک بہت بڑے شاعر، تذکرہ نگار اور ادبی مورّخ تھے۔ ان کی تصنیف ''کشمیری زبان اور شاعری'' اپنے موضوع پر ایک منفرد کارنامہ ہے، جس سے اُن کی بالغ نظر اور محققانہ ذہن کا پتہ چلتا ہے۔عبدالاحد آزاد کے کارناموں کا احاطہ کرنے کے لئے شیرازہ کا خصوصی شمارہ کچھ عرصہ پہلے منظرِ عام پر آیا ہے۔

اس پتے پر منگوائیں:

☆......کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

☆☆☆

☆......جاوید انور

عصری حسیت کا نباض: عبدالغنی شیخ

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر میں لداخی تہذیب و معاشرت کی عکاسی نمایاں طور پر کی گئی ہے۔ان کے یہاں جو مختلف افسانوی موضوعات برتے گئے ہیں، ان میں ملکی اور بین الاقوامی کے ساتھ ساتھ علاقائی موضوعات کا ترجیحاتی طور پر اظہار اس لئے لائق صد تحسین ہے کہ ان کے توسط سے لداخ کی مشکل زندگی کے ساتھ اس کے رسوم اور رواج سے بھی واقفیت کے در وا ہو جاتے ہیں۔ان کے بعض افسانے جن میں نثریہ و مزاحیہ عناصر ہیں، اپنے اندر تاریخی قصے اور واقعات بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر دور میں چاہے وہ بادشاہوں، راجاؤں کا دور رہا ہو یا انگریزوں اور نوابوں کا، کسی نہ کسی صورت میں ظلم ہوتا ہی رہا ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ان کا ایک افسانہ اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد کا ہے۔اس میں عبدالغنی شیخ نے دکھایا ہے کہ بادشاہ اکبر کی سرزمین ہندوستان پر آج کے دور میں دوبارہ آمد ہوتی ہے انہوں نے ایک پاگل جو خود کو بادشاہ اکبر سمجھتا ہے، کے ذریعے آج کے حالات کو اجاگر کیا ہے۔اس سے راوی کی ملاقات ایک پبلک پارک میں ہوتی ہے۔اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

''جان کی امان پاؤں تو ایک سوال کروں؟

اجازت ہے۔

جہاں پناہ، آپ نے انارکلی کو زندہ دیوار میں چنوا دیا۔اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اور ولی عہد جہاں گیر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔

نورالدین نے خاندان چغتائی نام پر داغ لگایا۔

شہنشاہِ اعظم! گستاخی معاف، حضور نے یوسف شاہ چک کی حکومت چھین لی اور حبہ خاتون کو اپنے محبوب سے جدا کر دیا۔

تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟

میں نے جماعت دہم تک تاریخ پڑھی ہے، عالم پناہ۔

جہاں پناہ! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

گستاخ! تم نے دوبارہ ایسا سوال پوچھا تو تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو نائی کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

اس افسانے کی خصوصیت یہ ہے کہ مرکزی کردار کے ارد گرد گردش نہیں کرتا۔ عبدالغنی شیخ نے اس میں کردار نگاری کو اہمیت تو دی ہے، لیکن دوسرے افسانوی عناصر یعنی مکالمہ، منظر نگاری وغیرہ اس توازن کے ساتھ افسانے کو آگے بڑھاتے ہیں کہ ابتدا سے آخر تک تجسس اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے شولز اور کلاگ کے حوالے سے بیانیہ پر گفتگو کرتے ہوئے کردار نگاری کے تعلق سے یہ بیان درج کیا ہے۔

> "کردار نگاری کا سب سے اہم عنصر وہی ہے، جسے کردار کی داخلی زندگی کہتے ہیں۔ یہ عنصر جتنا کم ہوگا فن پارے کی تعمیر میں دوسرے عناصر مثلاً پلاٹ، حالات کا بیان، دوسرے واقعات کے حوالے اور بدیعیات کا حصہ زیادہ ہوگا۔ کامیاب بیانیہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اس میں داخلی زندگی پر زور دیا جائے اور اسے تفصیل سے پیش کیا جائے۔ لیکن اسے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے دوسرے عناصر کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔ اگر اسے خود کو انسانی دلچسپی کی چیز کی حیثیت سے باقی رکھنا منظور ہو۔ یونانی داستانی قصوں میں یہ کمی پیچیدہ پلاٹ، محاکاتی بیان اور ضائع بدائع سے بھرپور بدیعیات سے پوری کی جاتی تھی۔ یہی حال سولہویں اور سترہویں صدی کے انگریزی اور فرانسیسی داستانی قصہ گویاں کا

ہے جو یونانیوں کے متبع تھے۔''

(بحوالہ۔ نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیئے اور مباحث،

مرتبہ۔ گوپی چند نارنگ، ص:۲۹۔۲۸)

عبدالغنی شیخ نے اس افسانے میں مکالمہ نگاری کی جو فضا تعمیر کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرکزی کردار دراصل خود مکالمہ نگاری ہے جو کہ کرداروں کے مراکز تبدیل کرتی رہتی ہے۔ کبھی اپنے عمل کی بابت بادشاہ اکبر کا کردار مرکز میں نظر آتا ہے تو کبھی راوی کا اور کبھی اس کے دوست کا۔ منظر کشی میں بھی عبدالغنی شیخ نے اپنے فنی جوہر دکھائے ہیں جو کردار اور مکالموں سے ہم آہنگ ہو کر افسانے کی دلچسپی اور وقار کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

''یہ شاہی محلات کن کے ہیں۔''

یہ شاہی محلات نہیں عالم پناہ، یہاں امرا، روسا اور بیرو کریٹ رہائش پذیر ہیں۔

بیوروکریٹ؟ تم نے پھر فرنگی زبان بولی۔

جہاں پناہ، یہ منصب داروں، وزیروں، عاملوں اور عمائدینِ شہر کی رہائش گاہیں ہیں۔

''یہ تو بڑے عالیشان ہیں۔''

ان کے پاس اور بھی محلات ہیں ظلِ سبحانی۔ دھن دولت، روپیہ پیسہ۔

''ان کو فی الفور سرکار کی تحویل میں لاؤ۔ تجوریوں کو توڑ دو، جن میں روپیہ رکھا ہے۔''

عالم پناہ، کالا دھن ہاتھ میں آنا بہت مشکل ہے۔

حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کرنے والی مزید چند سطریں ملاحظہ ہوں:

''یہ بڑے بڑے کاغذ پر کیا پڑھ رہا ہے۔''

یہ اخبار ہے بادشاہ سلامت۔ اس میں روز روز کی خبریں چھپتی ہیں۔

آج کی خبریں ہیں۔؟ اس نے پوچھا

عالم پناہ، زیادہ خبریں گھوٹالوں کی ہیں۔ ثاقب بولا

''گھوٹالوں''

جہاں پناہ، اس کا مطلب ہے خرد برد، غبن، بدعنوانی اور رشوت ستانی۔ میں نے وضاحت کی ثاقب بولا۔ بجلی کی رقم میں خرد برد، پانی کی رقم میں غبن، سڑک کی رقم میں ہیر پھیر، سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ، ملازموں کی بھرتی میں بدعنوانی۔

"مرحبا! مرحبا! یہ بڑی اچھی بات ہے کہ اس میں خرد برد کی باتیں چھپتی ہیں۔ لوگوں کو ان کا علم ہو جاتا ہے۔"

عالم پناہ! ثاقب بولا۔ خبریں تو روز چھپتی ہیں، لیکن ہم نے کسی کو سزا پاتے نہیں دیکھا ہے۔ اگر کبھی کوئی سزا پاتا ہے تو وہ چھوٹا غریب ملازم ہوتا ہے اور چھوٹی سی رقم ہوتی ہے۔ جو لاکھوں کروڑوں روپئے ہڑپ کرتے ہیں، وہ ڈکار تک نہیں لیتے، بادشاہ سلامت۔

"سزا کیوں نہیں ملتی۔"

جہاں پناہ! قانون میں ایسی پیچیدگیاں رکھی ہیں اور ملزم ایسے طور طریقے اختیار کرتے ہیں کہ ان کا بال بیکا نہیں ہوتا۔"

عبدالغنی شیخ نے اس افسانے میں عصر حاضر کے مسائل کو تاریخی جبر کے ساتھ منسلک کر کے (اکبر کا یوسف شاہ چک کی حکومت چھین لینا اور حبہ خاتون کو اس کے محبوب سے جدا کر دینا) اردو افسانے کی مختلف صورتِ حال کو نمایاں کیا ہے۔ آج کی حقیقت اور قصہ پارینہ کا یہ باہم انسلاک جہاں سیاست کے روز اول سے جاری منفی رویوں کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے، وہیں افسانے کی تخیلی حیثیت اور اس کی خود مختاری جو کہ اس فن کی شرطِ اول ہے، کو ملحوظ رکھتے ہوئے عبدالغنی شیخ نے وسیع تناظر میں حقیقت نگاری کے تقاضوں کی بھی تکمیل کی ہے۔ افسانے کا اختتام دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ طنزیہ ومزاحیہ عناصر سے منسلک ہو کر بہت دیر اور بہت دور تک غور وفکر پر بھی مجبور کرتا ہے۔ آخری چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"اخبار پڑھا۔؟

نہیں تو۔

ایک خبر ہے: مفرور پاگل تین گھنٹے بعد واپس پاگل خانہ لوٹا۔ آگے لکھا ہے: اس نے نفسیاتی معالج سے کہا، میں بڑے پاگل خانے سے چھوٹے پاگل خانے میں واپس آیا ہوں۔"

''دوملک ایک کہانی'' ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے میں جدا ہوئے ایک خاندان کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ لیہہ کی سرزمین کو مرکز بنا کر لکھا گیا یہ افسانہ یا تو مصنف کی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے یا پھر راوی جو کہ مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے، کے ذریعہ تخیلی اقدار کے بلند معیار کو پیش کیا گیا ہے۔ شاید اسی قسم کے افسانوں کے متعلق پروفیسر حامدی کاشمیری نے لکھا ہے:

''افسانہ بہرحال ایک ایسی منفرد اور خود مرتکز وحدت کی صورت اختیار کر گیا ہے، جو اختصاریت، اشارت اور ابہام کے ساتھ مخصوص لسانی برتاؤ سے ایک ایسی انجانی فضاء پر محیط ہو جاتا ہے جو فرضی کردار و واقعہ کے عمل اور ردِ عمل سے ایک ڈرامائی صورتِ حال کو خلق کرتا ہے اور قاری تجسس، تحیر اور تحسین و انبساط کے جذبات سے آشنا ہوتا ہے۔ ایسا افسانہ تخلیقی فن کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔''

(اردو افسانہ، تجزیہ، از پروفیسر حامدی کاشمیری، ص:۱۷)

''دوملک ایک کہانی'' کے پلاٹ کا لب لباب یہ ہے کہ زندگی خواہ کتنی ہی مشکل یا آسان کیوں نہ ہو، وہ نسل در نسل آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اس میں ایک پورے خاندان کا المیہ اپنی کھٹی میٹھی یادوں اور عروج و زوال، نشیب و فراز اور نسل در نسل خاندان کے آگے بڑھنے کی داستان کو بڑے درد و کرب اور خوشی و انبساط کے ساتھ پیش کرتے ہوئے موسم اور آب و ہوا کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس کا انسلاک ان کی آرزوؤں سے بھی جڑ جاتا ہے۔ دو سطریں ملاحظہ ہوں:

''اب اڑتیس سال کے بعد بڑے بھائی لیہہ پہنچ رہے تھے۔ ہم نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کل موسم خوش گوار رہے اور دہلی۔ لیہہ ہوائی اڑان منسوخ نہ ہو جائے۔''

عبدالغنی شیخ کے اس افسانے میں ان کے علاقے کا ذاتی کرب بیان ہوا ہے۔ میں نے اس قسم کے واقعات جموں و کشمیر کے افسانوں میں پڑھے ہیں لیکن خطہ لداخ بھی ان زخموں سے چور ہے، اس کا اندازہ مجھے عبدالغنی شیخ کے اس افسانے کے مطالعے کے بعد ہوا۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ ہو سکتا ہے کہ اس خطہ میں اس خونی لکیر کے متعلق تخلیقی سطح پر کم اظہارِ خیال کیا گیا ہو، یا پھر میری نظر سے اس قسم

کی افسانوی تحریریں نہ گزری ہوں۔ بہر حال، اس افسانے کا اختتام خطۂ لداخ کے باشندوں کی دیرینہ خواہش کو نمایاں کرتا ہے اور یہ خواہش کیوں کر وجود میں آئی، اس کا سبب بھی عبدالغنی شیخ نے بیان کر دیا ہے۔ آخری چند سطور ملاحظہ ہوں:

''دوسری صبح بھائی جان مجھے الوداع کہنے کے لئے اسلام آباد کے ائیر پورٹ پر آئے تھے۔

مرنے سے پہلے ایک دفعہ لداخ آنا چاہتا ہوں۔ بھائی جان بولے۔

آپ اپنے بچوں کے لئے بھی پاسپورٹ بنوالیں۔ میں نے کہا تا کہ ہماری دوسری اور تیسری نسلوں کی اولاد ایک دوسرے سے ملیں۔

بھائی جان لداخ نہیں آسکے اور شاید ایک دفعہ دوبارہ لداخ آنے کی خواہش کو دل میں لے کر اس دنیا سے چلے گئے۔

ہندوستان اور پاکستان کی 65 سالہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں، کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔

کبھی تو وہ کہانی ضرور لکھی جائے گی جو بچھڑے دلوں کو ملا دے۔''

عبدالغنی شیخ نے اپنے علاقے کی ان حقیقتوں کو بھی افسانوی جامہ پہنا کر پیش کیا ہے جن کی تکمیل اور عدم تکمیل کا اثر عام آدمی کے ساتھ ساتھ فن کار اور عالم اور رئیس طبقوں پر بھی پڑتا ہے۔ ان کی جلد تکمیل کے فوائد اور تاخیر سے نقصانات کو طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ اس قسم کے افسانے شاہد ہیں کہ عبدالغنی شیخ ہر قسم کی افسانوی طرز پر دسترس رکھتے ہیں اور انہیں برتنے کا فن بھی بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ''کھودا پہاڑ، نکلا چوہا'' کی چند ابتدائیہ سطریں ملاحظہ ہوں:

''ہم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ لیہہ کو ریلوے لائن سے ملا دیا جائے گا۔

میری باچھیں کھل گئیں۔ بہت سال پہلے میرے باپ کی باچھیں کھلی تھیں، جب انہوں نے یہ خبر سنی کہ ہمارے گاؤں میں بجلی آئے گی۔ میں ان دنوں کمسن تھا اور ستقنا ہائیڈل پروجیکٹ پر کام شروع ہوا تھا۔ لیہہ قصبہ اور دو تین گاؤں کو ڈیزل

جنریٹر سے بجلی فراہم کی جا رہی تھی۔''

اس کے تین سطر آگے عبدالغنی شیخ نے طنز و مزاح پر مہارت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اس محاورے ''باچھیں کھلنا'' پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

''لغت میں باچھیں کھلنے کا جو بھی مطلب ہو، صرف خوشی سے ہی باچھیں نہیں کھلتی ہیں، غم سے بھی کھل سکتی ہیں۔ غصے میں بھی کھل سکتی ہیں۔ کسی مضحکہ خیز واقعہ پر بھی باچھیں کھل سکتی ہیں۔ جب کوئی بات دل و دماغ پر نہ اترے، تب دل میں تمسخرانہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ لبوں پر استہزائیہ مسکان آتی ہے اور باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اب تو خوشی میں ہماری باچھیں کم ہی کھلتی ہیں۔''

افسانے کی یہ سطور عبدالغنی شیخ کی عصری حسیت کی آئینہ دار ہیں۔ مہدی جعفر نے اپنے مضمون ''نسلی خلیج اور عصری حسیت'' میں نئی نسل کے جن احساسات کو عصری احساسات کہا ہے، میرے خیال میں ان کو احاطۂ تحریر میں لانے کے لئے نئی اور پرانی نسل کی وضاحت میں عمر کی کوئی حد معنی نہیں رکھتی۔ نئی نسل کا فنکار بھی اپنے طرز، رجحان اور اسلوب کے سبب پرانی نسل کی نمائندگی کر سکتا ہے اور عمر کا کافی حصہ گزار چکا فنکار بھی عصری احساس کی کامیاب تخلیقیت کے پیش نظر نئی نسل کا نمائندہ ہو سکتا ہے اور اگر فنکار عبدالغنی شیخ ہوں جن کو جدید اور قدیم پر یکساں قدرت حاصل ہے تو وہ نئی نسل کے ساتھ قدامت کے حامل ان نایاب فنکاروں میں بھی شامل ہو جاتے ہیں، جن کے متعلق مہدی جعفر نے اسی مضمون میں لکھا ہے:

''نئی نسل کے فنکاروں کے یہاں عصری احساس کے حلقے میں داخل ہو کر اظہار کا سارا پسِ منظر یکسر بدل گیا اور انہوں نے مزید فعالیت اور سرعت کے باعث اپنی نئی لفظیات کا استعمال فنکارانہ دسترس کے لئے ضروری سمجھا۔ فنکار نے فکری اور استدلالی طریقِ کار چھوڑ کر حسیاتی، جبلی اور وجدانی امیجری اپنی بڑھتی ہوئی مشکل اور پیچیدہ شکل میں تمثیل، استعارے اور علامت کی طرف یا نئے بیانیۂ اظہار کی جانب اپنے نشان ثبت کر رہا ہے۔ نئی نسل اپنی فعالیت کی شناخت پر مصر ہے، چنانچہ وہ ایک اشارے، ایک موڑ یا ایک لفظ سے اپنی بات کو گہرائی تک پہنچا دینا چاہتی ہے۔ برخلاف اس کے قدامت کے حامل فنکاروں

کے یہاں اتنی فعال اور عمیق امیجری جو بیک وقت مختلف الجہت ہو، اس کی کارفرمائی بہت کم نظر آتی ہے۔''

(نئی افسانوی تخلیقیت، از مہدی جعفر، ص: ۱۸)

یہاں یہ بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ہر علامت یا تمثیل پیچیدہ نہیں ہوتی۔ عام مروجہ الفاظ بھی بہترین تمثیل اور علامت بن سکتے ہیں، استعارہ کا کام دے سکتے ہیں۔ شرط یہ کہ ان کو برتنے کا سلیقہ فن کار کو آنا چاہئے۔ عبدالغنی شیخ کے افسانے ''کھودا پہاڑ، نکلا چوہا'' سے چند سطریں درج ہیں:

''میرے والد آئے دن بجلی کی باتیں کرتے تھے۔ خاص کر جب شام کو دیا جلایا جاتا تو ان کو بجلی یاد آجاتی تھی۔

ستقنا پن بجلی پروجیکٹ کے کام کا سلسلہ معشوق کی زلف کی طرح دراز ہوتا گیا اور اس کے ساتھ اس سے متعلق دل آویز خبروں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہ خبریں سن کر میرے والدیوں پُر امید ہوتے، جیسے زندگی بخش دوا لینے سے مایوس مریض خوش ہوتا ہے۔''

فارسی میں مثال ہے ''دروغ برگردنِ راوی'' بقول ایک راوی ستقنا پروجیکٹ کے آغاز اور تکمیل کے تیس پینتیس سال کے دوران مقامی ریڈیو اسٹیشن سے 273 مرتبہ، سرینگر سے 89 مرتبہ اور آکاش وانی دہلی سے 19 مرتبہ پروجیکٹ سے متعلق دل آویز خبریں نشر ہوئیں۔ ابا ریڈیو سننے کے بڑے شوقین تھے۔ اسی امید و نا امیدی اور بیم و رجا میں وہ دل میں حسرت لے کر ایک روز اس دنیا سے چلے گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے مجھے وصیت کی کہ جب ستقنا ہائیڈل پروجیکٹ مکمل ہو جائے گا تو ان کی قبر پر آکر انہیں بتا دیں۔ چنانچہ ستقنا پروجیکٹ کی تکمیل پر میں ابا کی قبر پر پہنچا۔ بڑی دعاؤں اور مرادوں کے بعد یہ بجلی گھر مکمل ہوا تھا۔

''ابا، پہاڑ کھودا گیا، لیکن اس میں سے صرف ایک چوہا نکلا۔ ستقنا پروجیکٹ سے صرف ڈھائی میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔''

اس کے آگے بجلی کی مدھم روشنی، ستقنا کنال میں ریت بھر جانے کے سبب بجلی کی سپلائی بند

ہو جانے اور ریت کی نقل وحمل سے انجینئروں کو فائدہ ہونے کا بیان ہے۔ پھر پانی بھر جانے اور برف جم جانے کے سبب ساری سردی بجلی پیدا نہ ہونے کے واقعات افسانے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ اس افسانے کا اختتام بھی بہت متاثر کن ہے اور ابتدا سے آخر تک افسانے کے ارتباط میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

''میرے مرنے کے بعد جب زوجیلا پر ٹنل بنے تو میری قبر کے پاس آکر مجھے بتادیں۔ تمہارے دادا نے مجھے وصیت کی تھی کہ سقتنا پروجیکٹ کے بننے پر ان کی قبر پر آکر انہیں خبر دے دیں۔ میں نے بڑی تابعداری سے ان کو آگاہ کیا۔ میں جانتا ہوں، تم بھی بڑے فرماں بردار ہو۔ ہاں ایک اور وصیت ہے۔ لیہہ ریلوے لائن سے متعلق باتیں نہیں کرنا۔ یہ اپنے پوتے اور پڑپوتے پر چھوڑ دینا۔ شاید تب تک قیامت آئی ہوگی۔''

میرے بیٹے نے بڑی فرماں برداری سے سرخم کیا۔''

عبدالغنی شیخ کی افسانوی زبان پر گفتگو کی جائے تو لسانی اظہار اور کردار منظر کشی وغیرہ کے ذریعے کا عمل اپنے مستحکم وجود کے ساتھ افسانے میں نمایاں ہے۔ اسے کامیاب افسانہ نگاری کی ایک اہم خصوصیت کہا جاسکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے سوسیئر Saussure کے حوالے سے لکھا ہے:

''زبان میں عملی سطح پر signifiantاور signifie کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا اور زبان میں کوئی signifie نہیں ہے، جس کا signifiant نہ ہو۔ اس کا الٹ بھی صحیح ہے، یعنی کوئی معنی، کوئی تصور، کوئی مفہوم اس وقت تک اپنا وجود نہیں رکھتا، جب تک اس کو اس کا اظہاری پیکر نہ مل گیا ہو، خواہ وہ باطنی طور پر تخیل کی وجہ سے ہو یا خارجی طور پر تقریر و تحریر کے ذریعے ہو۔''

(بحوالہ۔ نیا اردو افسانہ، انتخاب، تجزیئے اور مباحث، مرتبہ۔ گوپی چند نارنگ، ص:۸۵)

عبدالغنی شیخ نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں، وہ افسانوی اظہار کی کسی نہ کسی خصوصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا تمام دلائل کی روشنی میں میرے خیال میں ان کے اردو زبان وادب کے ایک بہترین افسانہ نگار ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

.....●●●.....

☆......ولایت علی

عبدالغنی شیخ اور نظامِ تعلیم

عبدالغنی شیخ بنیادی طور فکشن نگار ہیں۔انہوں نے دوناول اور چار افسانوی مجموعے لکھے ہیں، تاہم سنجیدہ مضامین جیسے فلسفہ، نفسیات، مذہب، تعلیم اور سائنس سے ان کو بڑی دلچسپی ہے۔ان کی لائبریری میں ان موضوعات پر کتابوں کے علاوہ ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے متعدد نوٹ بک ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''اکثر کتابیں مستعار لیتا رہا ہوں۔کئی دفعہ مارکیٹ میں میرے کام کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں، اس لئے لکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔تب لیہہ اور سرینگر میں فوٹو کاپی بنانے کی سہولیت نہیں تھی۔آج بھی کئی دفعہ اپنی ضرورت اور پسند کے مختصر مواد کو قلم بند کرتا ہوں۔تعلیم پر متعدد کتابوں سے میں نے اہم نکات اور اقتباسات نوٹ کئے ہیں۔اکثر اخبارات اور رسائل سے تراشے رکھتا ہوں۔شاید آگے کام آجائے۔''

عبدالغنی شیخ نے یہ تراشے سنبھال کے رکھے ہیں۔ان میں بقول ان کے تعلیم کے بارے میں متعدد تراشے ہیں۔''جب بھی تعلیم سے متعلق کوئی نادر مضمون میں دیکھتا ہوں، جس میں نئی بات کہی گئی ہو یا تعلیم کے نئے رجحانات اور میلانات کا تذکرہ ہو، میں اپنے شوق اور دلچسپی کو دبا نہیں سکتا۔اسے سنبھال کر رکھتا ہوں۔''

یہاں میرا موضوع نظامِ تعلیم ہے اور عبدالغنی شیخ کی نسبت سے اپنے نفسِ موضوع پر ہی بات کروں گا۔

عبدالغنی شیخ نے تعلیم پر مضامین لکھے ہیں اور لیہہ میں اس موضوع پر لکچر دئے ہیں۔ ان کا مضمون 'لداخ میں تعلیم کی کہانی' اپنے موضوع پر ایک جامع اور معلوماتی مضمون ہے جو ان کی کتاب ''لداخ۔ تہذیب وثقافت'' میں شامل ہے۔ لداخ میں خاص کر ماضی میں تعلیم پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے اس میں اچھا خاصا مواد ہے۔

سقراط سے لے کر آج تک بہت سارے مفکروں اور دانش وروں نے تعلیم کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے طور پر اپنا نظریہ پیش کیا ہے، جیسے شخصیت کی نشو ونما، نیک اخلاق، اچھا شہری بننا، زندگی میں آگے پیش آنے والے چیلنج سے عہد برآ ہونا، حساس انسان بننا، اکتساب علم، حصولِ روزگار، عملی انسان بننا وغیرہ تعلیم کے نصب العین متعین کئے ہیں۔ عبدالغنی شیخ کہتے ہیں:

''ایک معلم اور متعلم کا مطمح نظر یہ ہونا چاہئے کہ مذکورہ سارے اوصاف کو یکجا کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ کئی مفکرین نے اپنے نظریہ حیات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تعلیمی ادارے کھولے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں سر سید احمد خان، راجا رام موہن رائے اور رابندر ناتھ ٹیگور جیسی بڑی شخصیتوں نے اس ضمن میں مثالیں قائم کی ہیں۔ فلسفی برٹرینڈ رسل اپنے زاویہ نگاہ کے مطابق ایک سکول قائم کرنا چاہتے تھے لیکن ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔''

مختلف ماہرین تعلیم نے دنیا کو نظری اور عملی طور تعلیمی میدان میں گرانمایہ تحفہ دیا ہے جسے سبھی فیض یاب ہورہے ہیں۔ ان میں فروبیل، پستالوزی، روسو، ڈیوی، مارگریٹ مالیان، واٹسن، ڈیوڈ ہارن برو، منسٹیوری، ولیم جیمز، ایڈورڈ ڈی بونو چند اہم نام ہیں۔ کینڈر گارٹن فروبیل اور نرسری مارگریٹ مالیان کی دماغی اُپج ہیں۔ ایڈورڈ ڈی بونو نے Thinking یعنی سوچ بچار کا نظریہ تعلیم دیا۔ ہمارے اپنے ملک نے ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور خواجہ غلام السیدین جیسے ماہرینِ تعلیم پیدا کئے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کہتے ہیں:

''ہر ذہین اور قابل اُستاد اپنی معلّمی کے دوران ایسے مشاہدات اور تجربات سے گزرتا ہے، جن سے مختلف ماہرین تعلیم گزرے ہوتے ہیں۔ وہ شعوری اور غیر شعوری طور وہی سوچتا ہے، جو ماہرین تعلیم نے سوچا ہوتا ہے۔ ایک اچھا استاد اپنے محدود وسایل اور نا گفتہ بہہ ماحول میں بھی اچھا کردار ادا کرسکتا ہے۔ جبکہ ماہرینِ تعلیم اپنے تجربات کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔''

عبدالغنی شیخ نے اپنے اوائل زندگی میں لداخ کے ایک گاؤں تمسگام کے لوئر ہائی سکول میں بطور ہیڈ ماسٹر چار سال کام کیا اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لیہہ کے اسلامیہ پبلک ہائی اسکول میں بطور پرنسپل اپنا فریضہ سرانجام دیا۔

عبدالغنی شیخ نے 'ہمارا نظام تعلیم۔ اصلاح کا متقاضی' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو اگست 2009ء میں 'اردو دنیا' دہلی میں شائع ہوا ہے۔ دس سال گزرنے کے بعد بھی مضمون کی معنویت اپنی جگہ قائم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''متعدد کمیشنوں سے ہمارے نظامِ تعلیم میں اصلاحات لانے کی سفارشات کی ہیں لیکن ان پر عمل نہیں ہوا ہے۔ ماہرین نے موجودہ نظامِ تعلیم کو Overhaul تشکیلِ نو اور تبدیل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ماہرین کی نظر میں ہمارے نظامِ تعلیم میں بنیادی خامی یہ ہے کہ Knowledge یا حصولِ علم پر دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم دوسرے ملکوں کے مقابلے میں تعلیمی طور پسماندہ ہیں۔''

مصنف مزید رقم طراز ہیں:

''اسکولوں کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے انگریزی کے ایک کثیر الاشاعت اخبار نے یہ سرخی جمائی تھی: Most students pass, Few actually learn یعنی اکثر طلباء پاس ہوئے ہیں لیکن چند نے علم سیکھا ہے۔''

ایک اور اخبار نے لکھا ہے: 'ہم علم سے آراستہ نوجوانوں کے بجائے صرف خواندہ پودا پیدا کررہے ہیں۔' اس ضمن میں ایک انگریزی سکالر نے ایک جملے میں یوں اپنے تاثرات ظاہر کئے ہیں:

'ہندوستان ان پڑھ گریجویٹ پیدا کرتا ہے۔'

حالیہ برسوں میں بورڈ کے امتحانات میں زیادہ نمبر دینے کے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے انگریزی کے مذکورہ کثیر الاشاعت اخبار نے یہ سرخی دی ہے۔ Marks mask incompetence، نمبر نااہلی کو چھپاتے ہیں۔ اب تو حد ہوگئی ہے کہ 500 نمبرات میں سے 498، 499 حتیٰ کہ 500 برابر نمبرات دئے جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک صحافی نے طنزیہ طور لکھا ہے کہ انہیں ان شیکسپیروں سے ملاقات کا اشتیاق ہے جنہوں نے اتنے نمبرات حاصل کئے ہیں اور جنہوں نے انہیں یہ نمبرات دئے ہیں۔

ڈیڑھ سال پہلے یونیسکو نے 127 ملکوں کی تعلیمی رپورٹ میں ہندوستان کو تعلیمی معیار کے لحاظ سے آخری پندرہ ملکوں کی صف میں رکھا ہے۔ عالمی پیمانے کے مطابق دنیا کی 226 بہترین یونیورسٹیوں میں ہماری ایک بھی یونیورسٹی شامل نہیں ہے۔ جبکہ ایشیائی ملکوں میں بہترین یونیورسٹیاں 11 جاپان، 10 چین اور ایک اسرائیل میں ہے۔ ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی تعداد صرف گیارہ فیصد ہے۔

ایک مغربی ماہرِ تعلیم نے ناقص نظامِ تعلیم پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا:

''انسان بے وقوف پیدا نہیں ہوتا۔ تعلیم نے اس کو بے وقوف بنایا ہے۔''

عبدالغنی شیخ نے آگے مختلف حوالہ جات دیتے ہوئے ملک میں سکولوں کی خستہ حالی اور معیار تعلیم کی گراوٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آئے روز تعلیمی حالات کے جو سروے ہوتے ہیں، اس میں سرکاری سکولوں کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پانچویں جماعت کے معیار دوسری جماعت کے معیار پر پوری نہیں اترتے۔ دیہی علاقوں کے پرائمری اسکولوں میں چار میں سے ایک استاد غیر حاضر رہتا

ہے۔ دو میں سے ایک نہیں پڑھاتا ہے۔

رپورٹوں کے مطابق پرائمری جماعتوں میں 95 فیصد سے زیادہ بچے پاس ہو جاتے ہیں لیکن بورڈ کے امتحان میں پاس ہونے کی شرح 64 فیصد سے آگے نہیں رہتی۔

ایک اور رپورٹ کے مطابق 47 لاکھ استادوں میں بہت کم تربیت یافتہ استاد تھے۔ تقریباً آدھی تعداد ایسے استادوں کی تھی، جن کی تعلیمی ڈگری بارھویں جماعت سے زیادہ نہیں تھی۔۔۔۔ چار لاکھ پرائمری سکولوں میں بہت سارے سکولوں میں پڑھائی کے کمرے اور بیت الخلاء نہیں تھے۔''

آگے مصنف رقم طراز ہیں:

''سرکاری سکولوں میں تعلیمی معیار پست ہونے کی وجہ سے بہت سارے لوگ پرائیویٹ سکولوں پر تکیہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک سروے کے مطابق شہری علاقوں میں اوسطاً 53 فیصد بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں۔ کئی ریاستوں میں یہ شرح اس سے زیادہ ہے۔ سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں بتدریج کمی آرہی ہے۔''

'طالب علموں سے دو باتیں' کے عنوان سے ایک مضمون میں عبدالغنی شیخ نے ایک مضمون قلم بند کیا ہے۔ اکتسابِ علم کے ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

''ہر انسان طالب علم ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق علم کے ہر شیدائی پر ہوتا ہے۔ اکتساب علم میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ ایف۔ ڈبلیو۔ رابرٹسن نے کہا:
'بظاہر تعلیم اسکول کے کمرے میں ختم ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ (انسان کی) موت پر ختم ہوتی ہے۔'

تاہم یہاں میرا روئے سخن روایتی طالب علموں سے ہے، جو تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے عبدالغنی شیخ نے کہا:

لغت میں علم کے معنی دانش، آگاہی، واقفیت جوہر اور دانائی دیے گئے ہیں جبکہ تعلیم کا مطلب سکھانا اور بتانا ہے۔ تعلیم ایک وسیلہ ہے، جس کے ذریعے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ زمینی حالات بتاتے ہیں کہ تعلیم حاصل کرنے والے تو بے شمار ہیں لیکن اکتساب علم والے خال خال ہیں۔ کیمبرج کی ایک تقریب میں ایک ہندوستانی طالب علم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ وہ فخر سے بولا: 'آج سے میرا حصولِ علم ختم ہوتا ہے۔' اس کا استاد اور نگران جو سامنے ایک نشست پر بیٹھا تھا۔ برجستہ بولا: اور میرا شروع ہوتا ہے۔" ظاہر ہے یہ طالب علم کے لئے ایک کراری چپت تھی۔

روزگار کے سلسلے میں انٹرویو دینے کے لئے جنرل نالیج قبیل کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور جب ملازمت مل جاتی ہے تو مطالعہ کو خیر باد کہا جاتا ہے۔ سول امتحانات میں کامیاب ہونے والے اکثر امیدوار عموماً پڑھا کو ہوتے ہیں لیکن ملازم بننے کے بعد اکثر مطالعہ جاری نہیں رکھتے۔

اکتسابِ علم ایک مسلسل عمل ہے۔ حدیث ہے، مہد سے لحد تک علم حاصل کرو۔ ایک تبّتی عالم کا مقولہ ہے، اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ آنے والا کل تمہاری زندگی کا آخری دن ہے، تو آج کے دن بھی علم حاصل کرو۔"

عبدالغنی شیخ نے اپنی کتاب "اسلام اور سائنس" کے ایک باب 'اسلام اور علم' میں علم کی فضیلت کے بارے میں قرآن مجید کی آیات اور متعدد احادیث کا حوالہ دیا ہے اور علماء، فضلاء، مسلم سائنسدانوں، فلسفیوں اور دانش وروں کی مثالیں دی ہیں، جنہوں نے حصولِ علم اور حکمت کے لئے اپنی زندگی وقف کی۔

زبان سیکھنے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف رقم طراز ہیں:

"یہاں تعلیم کا مدعا امتحان پاس کرنا ہے۔ زبان سیکھنے سکھانے کا مقصد یہ ہونا چاہئے تھا کہ طالب علم متعلقہ زبان میں مہارت حاصل کرے یعنی ٹھیک

طرح سے اظہارِ خیال کر سکے، صحیح لکھ سکے، صحیح پڑھ سکے اور الفاظ و معانی سمجھ سکے۔ لیکن ہمارے نظام تعلیم میں مخصوص اسباق کو رٹوا کر حفظ کرا کے امتحان پاس کرایا جاتا ہے۔ خاص کر بول چال کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔

ایسے کتب بینوں کی کمی نہیں جو پڑھتے بہت ہیں لیکن ان کی زبان صحیح نہیں ہوتی، چاہئے تحریر ہو یا تقریر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دھیان سے نہیں پڑھتے ہیں یا کچھ سیکھنے کی نیت اور ارادے سے مطالعہ نہیں کرتے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اسی نسبت سے لکھا ہے: ''بعض لوگ اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح بکریاں ادھر اُدھر منہ مارتی ہیں۔ جدھر منہ پڑ گیا ایک بکٹا بھر لیا۔ باقی کچھ خبر نہیں۔''

وقت کی پابندی کے ضمن میں عبدالغنی شیخ نے لکھا ہے: ''مطالعہ اور تخلیقی کام کرنے کے لئے Time Management وقت کا صحیح استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ کامیاب انسانوں نے وقت کی قدر و قیمت کو سمجھا ہے۔ ٹینی سن نے 'انفارنو' جیسی ضخیم کتاب کا لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے چائے ابلنے کا وقت مخصوص رکھا تھا۔ چائے کی پتی کیتلی میں ڈال کر اس کے ابلنے تک جو تھوڑا وقت ملتا۔ اس دوران وہ ترجمے کا کام کرتا تھا۔ اس طرح انہوں نے یہ اہم اور بڑا کام ختم کیا۔ معروف سائنس دان لاوائزر وقت کی بچت کے لئے سیال خوراک استعمال کرتا تھا۔ متعدد بڑی شخصیتوں نے کم نیند کی ہے اور اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کئے ہیں۔''

عبدالغنی شیخ نے ہماری ریاستی سرکار کے محکمہ تعلیم کے جریدے Edu News میں بھی لکھا ہے۔ یہ اردو سمیت سہ لسانی جریدہ ہے۔

موصوف نے Mots یعنی More of the same اور Hots یعنی High Order thinking skills کے بارے میں لکھا ہے:

''ماہرینِ تعلیم کا یہ نیا نظریہ ہے۔ Hots کا تقاضا ہے، نظامِ تعلیم میں

وسعت لائی جائے اور سوچ بچار اور غور وفکر پر زور دیا جائے۔ غور وفکر کے ضمن میں کسی نے نامور سائنس دان آئزک نیوٹن کے اس واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔ جب وہ اپنے باغ میں کرسی پر بیٹھا تھا، اچانک پیڑ سے ان کے سامنے ایک سیب گرا۔ نیوٹن نے سوچا کہ سیب زمین پر کیوں گرا؟ اوپر کیوں نہیں گیا؟ دائیں بائیں کیوں نہیں گرا؟ نیوٹن نے سنجیدگی سے اس نکتے پر سوچا، تجربے کئے اور کشش ثقل کا تاریخ ساز نظریہ دریافت کیا۔''

عبدالغنی شیخ کے مطابق شروع میں یہ نظریہ برازیل کے ماہر تعلیم ڈاکٹر ایڈورڈ ڈی بونو نے دیا۔ ڈاکٹر ڈی بونو کہتے ہیں:

'ذہانت ہی کافی نہیں۔ بہت سارے ذہین لوگ سوچنے والے نہیں ہوتے یا سوچتے کم ہیں۔ میرے پاس چار ذہین بچے ہیں، جو ٹھیک طرح سوچ نہیں پاتے۔ تیس بچوں سے پوچھا جائے کہ اگر انہیں پانچ پانچ روپے دیے جائیں تو وہ کیا کریں گے تو وہ کچھ نہ کچھ جواب دیں گے۔ چند آئس کریم خریدنا چاہیں گے، بعض کو مٹھائی پسند کریں گے۔ ان سے کہا جائے کہ وہ دوبارہ سوچ کر جواب دیں تو ان کا جواب مختلف ہوگا۔ ڈی بونو کا خیال ہے کہ بچوں کو Thinking سوچ بچار کی عادت ڈالنی چاہیے۔ تا کہ اپنی ذہانت کا مثبت طور استعمال کریں۔ انہوں نے اس ضمن میں ایک مثال دی ہے۔ امریکہ کے شہر لاس انجلیز میں اولمپک میچ ہونے والا تھا۔ منتظمین کے سامنے اخراجات کا سوال تھا۔ وہ حکومت سے مدد لینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک رکن پیڑ او بے روٹھ نے یہ تجویز رکھی کہ اولمپک کی مشعل کو دوماہ کے لئے دنیا کے مختلف ملکوں میں لیا جائے۔ تب تک مشعل کو سٹیڈیم میں دو گھنٹے گھمایا جاتا تھا۔ مختلف ممالک میں مشعل لینے سے ایک کروڑ ڈالر کی آمدن ہوئی۔ اس نظریۂ تعلیم پر برازیل کے علاوہ روس، سنگاپور، ملائشا وغیرہ میں عمل ہو رہا ہے۔'

بچوں میں توجہ کی عادت ڈالنے کی بڑی ضرورت ہے۔ توجہ
کے بغیر طالب علم کا دماغ محض ایک کمپیوٹر کی طرح ہے۔''

مصنف کا کہنا ہے کہ طالب علموں میں نصاب کے تمام مضامین میں دلچسپی پیدا کرنا ضروری ہے۔ میٹرک میں ریاضی سے مجھے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے میں ریاضی میں کمزور تھا۔ میرے لاشعور میں ریاضی کے تیئں کدورت رچی بسی تھی جس کا اثر اور ردعمل لگ بھگ پوری زندگی میں رہا۔ میں خواب دیکھتا ہوں کہ ریاضی کا امتحان ہونے والا ہے اور میں نے تیاری نہیں کی ہے۔ اس لئے میرے ذہن پر خوف مسلط ہے۔ یا میں امتحان ہال میں بیٹھا ہوں، ریاضی کا پرچہ ہے۔ وقت بہت کم بچا ہے اور میں نے بہت کم سوال حل کیے ہیں۔ ایسے میں بڑا فکر مند ہوں۔

عبدالغنی شیخ نے بتایا کہ انہوں نے استادوں کے اجتماع میں کئی دفعہ بتایا کہ بچوں کو پرندوں، جانوروں، پھولوں، پھلوں اور سبزیوں وغیرہ کے بارے میں کتابی طور سمجھانے کے ساتھ عملی طور ان کا مظاہرہ کرنا چاہئے تاکہ بچوں میں ان کی شناخت ہو۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ نام سے بہت کچھ جانتے ہیں لیکن پہچان کم ہے۔ ''میں اس کو ادھورا علم سمجھتا ہوں۔ میں ایک دفعہ سرینگر میں پھولوں کی نمائش محض اس لئے دیکھنے گیا تاکہ پھولوں کی پہچان ہو۔ میری دلچسپی دیکھ کر ایک آدمی نے مجھے پوچھا کہ مجھے اپنے باغ کے لئے کن کن پھولوں کے بیج مطلوب ہیں۔ میں لیہہ میں مُرچے وٹرنری فارم کا منیجر تھا۔ ہم نے کچھ پھول اگانے کا فیصلہ کیا۔ پھولوں کی فہرست دیکھ کر بجٹ کے مطابق دو اقسام کے پھولوں کے سستے بیج منگائے۔ اگانے پر ایک بیج سے 'کھی ناما' Comb Cock پیدا ہوا۔ دوسرا Artinicia نکلا جس کو مقامی طور خمبے میتوق کہا جاتا ہے۔ دونوں پودے ہیں اور ان پر پھول نہیں اُگتے اور گھٹیا سمجھے جاتے ہیں۔ کھی ناما کا لفظی ترجمہ 'کتے کی دم' ہے۔ خمبے میتوق یا خانہ بدوش خمبہ قبیلہ کا پھول بھی غالباً منفی طور استعمال ہوا ہے۔

لیہہ کے ایک زمیندار نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک غیر مقامی ایگریکلچر افسر کے سامنے گوبھی، بند گوبھی اور پھول گوبھی رکھی۔ ان کی صحیح شناخت وہ نہیں کرسکا۔ اگرچہ نام سے وہ واقف تھا۔ یہ ہمارے ناقص نظامِ تعلیم کی علامت ہے۔ ایک جرمن استانی نے مجھے بتایا کہ جرمنی میں بچوں کو ہر

چیز عملی طور پر دکھائی جاتی ہے۔ سبزیوں اور پھولوں کی پہچان آنکھیں بند کرا کر سونگھا کر یا انگلی سے چھو کر کرائی جاتی ہے۔ اسی طرح سکول میں بچوں کو کھانا کھانے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے۔

میں نے عبدالغنی شیخ سے پوچھا۔ ایک اچھے استاد میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا:

''ایک استاد اور قلم کار ولیم ارتھر وارڈ نے کہا ہے:

ایک عام استاد صرف بتاتا ہے

ایک اچھا استاد وضاحت کرتا ہے

ایک بہتر استاد مظاہرہ کرتا ہے

ایک عظیم استاد inspire کرتا ہے

ایک اورش استاد کے بارے میں اس کے ایک شاگرد نے کہا ہے:

''میں جینے کے لئے اپنے باپ کا ممنون ہوں۔ تاہم اچھی طرح جینے کے لئے اپنے استاد کا ممنون ہوں۔''

علم کے ایک شیدائی ٹری یون ایڈورڈز نے ٹھیک کہا ہے:

Throughly to teach other is the best way to learn for yourself.

(کسی کو بھرپور طور سکھانا اپنے لئے سیکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔)

......●●●......

☆......محمد شریف لداخی

حقیقت پسند موضوعات کا خالق

لداخ ریاست جموں وکشمیر کا تیسرا صوبہ ہے جہاں کے ننگے پہاڑوں اور بنجر میدانوں میں اپنی دلکشی اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ یہاں ہر طرف اونچے پہاڑ اور وسیع میداں نظر آتے ہیں۔لداخ میں میلوں تک پیڑ پودوں کی بات تو دور، گھاس کا ایک تنکا بھی نظر نہیں آتا۔میلوں سفر کرنے کے بعد اگر کوئی سرسبز وادی نظر آتی ہے تو دل خوش اور آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔لداخ کے شمال اور مشرق میں چین، شمال مغربی علاقہ میں گلگت اور اسکردو، مغرب میں وادیٔ کشمیر اور جنوب میں پنجاب اور ہماچل پردیش ہیں۔لداخ جغرافیائی اور تہذیبی اعتبار سے بالکل الگ خطہ ہے۔رقبے کے لحاظ سے 45 ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے صرف دو ضلعوں (کرگل اور لیہہ) پر مشتمل ہے۔یہ خطہ اپنی تہذیب وثقافت، تاریخی اور مذہبی مقامات اور اپنی قدیم روایتوں کے لیے مشہور ہے۔یہاں پر قدیم مساجد، امام بارگاہیں، محلات، قلعے اور سنگ تراشی کے نمونے بھی ملتے ہے۔ان میں تیرہ اہم تاریخی مقامات اور گُنپوں کو محکمہ آثار قدیمہ نے قومی یادگار کے طور پر اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

یہاں کی منفرد تہذیب وثقافت کو خاص طور سے لداخ کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے لداخ میں افسانہ نگاری کی صنف پر قلم اٹھانے والے کئی قلم کار ہیں مگر طباعت کی منزلوں سے گزر کر منظر عام پر آنے والے افسانوی مجموعوں میں عبدالغنی شیخ کے چار مجموعے اور عبدالرشید راہگیر کا ایک افسانوی مجموعہ شامل ہے۔

لداخ میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز اکبر لداخی کے افسانوں سے ہوتا ہے لیکن ابھی تک ان کا

کوئی افسانوی مجموعہ یا ان کے افسانوں پر کتاب نہیں چھپی۔ اس لیے لداخ میں اردو افسانہ کا باقاعدہ آغاز عبدالغنی شیخ سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ عبدالغنی شیخ نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگیوں سے اپنے افسانوں کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ وہ نہ صرف یہاں کے باشندوں سے متعلق واقعات کو ایک نئے انداز سے پیش کرتے ہیں بلکہ لداخ جیسے علاقے کی تہذیب و ثقافت اور یہاں کی زندگیوں کے مختلف رنگوں سے اردو دنیا کو روشناس بھی کراتے ہیں۔ نور شاہ نے لداخ کے معتبر افسانہ نگار کے بارے میں اپنی کتاب ''جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات اور حالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا''۔[1]

عبدالغنی شیخ نے گزشتہ آدھی صدی سے زیادہ مدت سے لداخ میں اردو افسانہ کی شمع روشن رکھی ہے۔ انہوں نے افسانے، ناول، تاریخ، خاکے، ادبی اور علمی مضامین لکھے ہیں۔ ان کی تخلیقات اور مضامین اردو کے مختلف رسائل آجکل۔ شمع، بیسویں صدی، شاعر، بانو، اردو دنیا، ایوان اردو، ہمارا ادب، شیرازہ، تعمیر، جدید فکر و فن، سبق اردو، پمپوش، دیش وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔

عبدالغنی شیخ کے چار افسانوی مجموعے چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''زوجیلا کے آر پار'' 1970ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل دس افسانے ہیں۔ جیسا کہ مجموعہ کے نام سے یہ ظاہر ہے ''زوجیلا کے آر پار'' زوجیلا کی حد بندی کشمیر کے آخری ضلع گاندربل کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔ یہاں سے ہی ضلع کرگل کی ابتدا ہوتی ہے۔ زوجیلا مشکل ترین درہ ہے اس کی بل کھاتی ہوئی سڑک سے گزر کر انسان ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے فلک بوس اور نہ ختم ہونے

---

[1] جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار (تعارف، فن، اور مکالمہ) نور شاہ، ص۔ 87، میزان پبلشرز۔ سرینگر کشمیر۔ 2011

والے ننگے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے کی پانچ کہانیاں انہیں ننگے پہاڑوں کے بیچ بسے انسانوں کی ہے۔ جبکہ باقی پانچ کہانیاں زوجیلا کے اس پار کشمیر اور ملک کے بعض دیگر حصوں کے پسِ منظر میں لکھی گئی ہیں۔

''دوراہا'' عبدالغنی شیخ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 1993ء میں شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے میں کل تیئس (23) افسانے شامل ہیں۔ یہ سارے افسانے ملک کے اہم رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے راشد سہسوامی لکھتے ہیں:

> ''عبدالغنی شیخ نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ مختلف پہلوؤں اور الگ الگ زاویوں سے دیکھا ہے اور پھر ان مشاہدات کو کہانیوں کا روپ دے کر صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔ عبدالغنی شیخ کے افسانے عوامی زندگی سے لیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں مشاہدے کا حصہ تخیل اور تمثیل دونوں سے زیادہ ہے۔ وہ آدرش واد اور پند و نصائح سے گریز کرتے ہیں جن واقعات کو عام طور سے قابلِ توجہ سمجھا نہیں جاتا، افسانہ نگار ان میں بھی زندگی کی پیچیدگیوں اور نفسیاتی الجھنوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے چشم دید واقعات کو من و عن تحریر کی شکل دے دی ہے۔ لیکن ایسی تحریروں میں بھی اخبارات کی رپورٹ کا رنگ نہیں ہوتا۔ مصنف کو انسانی اقدار پر مکمل اعتماد ہے۔ وہ محبت، دوستی اور ہمدردی کے انسانی جذبات میں گہرا عقیدہ رکھتے ہیں''۔[۲]

عبدالغنی شیخ کا تیسرا افسانوی مجموعہ (Forsaking Paradise) (اردو افسانوں کا انگریزی ترجمہ) ہے جو 2001ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل بارہ (12) کہانیاں ہیں۔ یہ عبدالغنی شیخ کی اردو اور لداخی کہانیوں کا انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ امریکہ میں مقیم ایک خاتون ڈاکٹر اگروال نے کیا۔

''دو ملک، ایک کہانی'' عبدالغنی شیخ کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 2015ء میں شائع ہوا۔ اس میں کل 45 افسانے شامل ہیں جو ہندوستان کے مختلف اردو رسائل میں شائع ہو چکے

---

[۲] دو ملک، ایک کہانی، عبدالغنی شیخ، ص۔ 335، اپلائڈ بکس، 2015ء

ہیں۔اس مجموعے میں شامل زیادہ تر افسانوں میں انہوں نے اپنے علاقے اور وادی کشمیر کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اس میں مزاحیہ اور طنزیہ افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا، ایک انار سو بیمار اور اکبر بادشاہ کی دوبارہ آمد شامل ہیں۔ان کی ہر کہانی انسانی نفسیات، زندگی کی تلخ سچائیوں اور سماج کی حقیقی صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے۔

اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ ''دو ملک، ایک کہانی'' کے پہلے افسانے ''یہ زندگی'' میں عبدالغنی شیخ نے زندگی میں آنے والی بیماری خواہ وہ سماجی ہو، مذہبی ہو، سیاسی ہو، اخلاقی ہو یا خود انسانی زندگی کی صحت سے جڑی ہوئی کوئی بیماری ہو، ان تمام طرح کی بیماریوں کو موضوع بنا کر یہ افسانہ تحریر کیا ہے۔اس افسانے میں مصنف نے بیماری کو موضوع بنا کر اس کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔انسانی زندگی میں کوئی بیماری آئے۔خواہ وہ جسمانی بیماری ہو یا سماجی۔سیاسی ہو یا اخلاقی، ایسے میں اگر انسان ہمت اور حوصلے سے کام لے تو وہ بیماری سے جلد نجات پا سکتا ہے۔لیکن اگر کوئی انسان اپنی بیماریوں سے مایوس ہو جائے تو وہ بہت جلد فنا کی آغوش میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔اس بات کو عبدالغنی شیخ نے اپنے افسانہ ''یہ زندگی'' میں یوں تحریر کیا ہے:

> ''ڈاکٹر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا آپ آرٹسٹ ہیں، فنکار ہیں آپ سے چھپانا نہیں چاہتا آپ کو معدے کا کینسر ہے۔اس کا دل ڈوب گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔چند لمحہ کے لیے اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور ڈاکٹر کی پوری بات سنے بغیر تیزی سے کلینک سے باہر نکل آیا۔
> وہ سڑک پر بلا وجہ چلتا رہا۔ایک دفعہ ایک گاڑی کی زد میں آتے آتے بچ گیا۔
> ڈرائیور نے غلیظ سی گالی دی لیکن نازک مزاج اور احساس ہونے کے باوجود اس پر گالی کا کوئی اثر نہیں ہوا''۔[۳]

عبدالغنی شیخ نے اپنے افسانوی مجموعے میں طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، رشوت خوری اور ظلم و تشدد کو موضوع بنایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پیار و محبت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔شیخ کی تحریروں

۳۔ دو ملک، ایک کہانی، عبدالغنی شیخ، ص۔9، اپلائڈ بکس، 2015ء

میں لداخی ماحول اُن کا رہن سہن، لباس کلچر، بودھی اور اسلامی تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔اس کے علاوہ یہاں کے سیدھے سادھے لوگوں کی زندگی کے مسائل اور نفسیاتی اُلجھنوں کے ساتھ ساتھ منظر نگاری، پلاٹ سازی، کردار نگاری، واقع نگاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کے افسانوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں اپنے مادر وطن لداخ سے بے پناہ محبت ہے جس کا جا بجا اظہار اُن کی کہانیوں میں ملتا ہے۔انہیں اپنا کلچر اور تہذیب وتمدن بڑا عزیز ہے۔ایک جگہ برج پریمی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''لداخ میرا وطن ہے۔ یہاں کے تمدن و معاشرے کی نیرنگیاں میرے ذہن میں رچ بس گئی ہیں۔ ہر گھر کے کنج اور ہر کوچے کی نکڑ پر مجھے یہاں کی معاشرے سے متعلق کہانیاں بکھری ملتی ہیں اور میں اُن کی عکاسی کرنا اپنا پہلا فرض جانتا ہوں۔آپ مجھ سے اور کہانیاں ڈرامے وغیرہ طلب کر سکتے ہیں جو یہاں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نقاب اُٹھاتی ہیں''۔[۴]

عبدالغنی شیخ کے بارے میں پریم رومانی رقمطراز ہیں:

''عبدالغنی شیخ کو افسانوی تکنیک پر پوری گرفت ہے وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔اُن کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔وہ اپنے کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں''۔[۵]

عبدالغنی شیخ کی افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔کہ وہ اپنے کرداروں میں بے ربطگی نہیں پیدا ہونے دیتے۔وہ اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے کردار فرسودہ اور غیر متحرک نہیں ہوتے۔بلکہ ان کے کردار پلاٹ کے گرد اس طرح گھومتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ایک جانی پہچانی دنیا گھوم جاتی ہے۔علی باقر اُن کے پلاٹ سازی اور کردار کے استعمال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۴۔ ماہنامہ دیش، سرینگر، ص۔40، 1978ء

۵۔ ایک مطالعہ، برج بریمی۔ مرتبہ، ص۔25، پریمی رومانی

”عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لیے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت منداور توانا لگتے ہیں۔وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔شیخ حقیقت نگاری کے قایل ہیں اوراپنے کرداروں کے احساسات نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں“۔[6]

عبدالغنی شیخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لداخ میں بیٹھ کر دہلی اور ممبئی کا احوال بیان نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔اپنے کلچراور تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔مشتاق احمد وانی نے اُن کے افسانوں کے کردار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

”عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری کا اختصاص یہ ہے کہ وہ حقیقی زندگی سے اپنے کردار لیتے ہیں۔خواب خیال کی باتیں یا فکرو فلسفے سے بوجھل مسئلے ان کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتے۔وہ کرداروں کے احساسات اور جذبات کو ایک حسین انداز میں پیش کرتے ہیں جو کسی حد تک بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔عبدالغنی شیخ افسانے کے فنی لوازمات کا پورا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں کے کردار اپنے ماحول اور معاشرے کی بہتر نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی دلچسپی نہ صرف اردو فکشن سے ہے بلکہ وہ تاریخ، فکرو فلسفہ اور صحافت سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں“۔[7]

ان کے تمام افسانے حقیقی فکشن (Factual Fiction) پر منحصر ہیں۔وہ اپنے افسانوں کے لئے مواد اور موضوعات کا انتخاب اپنے اردگرد کے حالات، انسانی نفسیات، سماجی مسایل، ادھورے سپنوں، ذہنی الجھنوں اور متعدد تلخ حقیقتوں سے کرتے ہیں۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی کہانیوں میں نفسیاتی پہلوؤں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے بیان کیے گئے افسانوی موضوعات پر قاری غور و فکر کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔وہ آج بھی پرورش لوح وقلم میں مصروف ہیں۔

.....●●●.....

---

[6] دوراہا، عبدالغنی شیخ، ص۔ 1، جبران پبلی کیشنز لیہہ، 1992

[7] اردو افسانے اور جموں وکشمیر کے افسانہ نگار: 1980 کے بعد، مشتاق احمد وانی، فکرو تحقیق سہ ماہی، نئی دہلی، بحوالہ، دو ملک، ایک کہانی، عبدالغنی شیخ، ص۔ 337، اپلائڈ بکس، 2015ء

شیخ صاحب کے غیر مطبوعہ مسودے

(کتابوں کی دنیا اور لداخ کی سیر کا اجمالی تعارف)

عبدالغنی شیخ لداخی کے تخلیقی اور ادبی سفر کا دایرہ گزشتہ پانچ دہائیوں پر محیط ہے اور بلاشبہ ان کا شمار نہ صرف ریاست کے اہم ادبی شخصیات میں ہوتا ہے بلکہ ان کے خطے میں ایسا کوئی دوسرا قلمکار ہمیں نظر نہیں آتا جسے ہم ان کے آس پاس یا برابر دیکھ سکیں۔ انہوں نے ادب کی کئی اصناف میں بیکِ وقت نہ صرف کامیاب طبع آزمائی کی بلکہ ایسے محکم اور پائیدار نقوش بھی چھوڑے جو ان کے نام کا دیر تک اور دور تک زندہ رکھیں گے۔ ان کی اب تک افسانہ اور ناول، تاریخ اور سوانح، سفرنامہ اور خاکہ (ادبی مضامین) پر تقریباً ڈیڑھ درجن تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ البتہ بچوں کے حوالے سے ان کے تحریر کردہ دو کتابچے ''کتابوں کی دنیا'' اور ''لداخ کی سیر'' اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں جس کی بنیادی وجہ شیخ صاحب کی تساہل پسند طبیعت اور اُس وقت کی ریاستی سرکار کی غفلت شعاری ہے۔ کیونکہ مصنف نے 1979ء میں بچوں کے عالمی سال پر دو کتابچوں ''کتابوں کی دنیا'' اور ''لداخ کی سیر'' کے مسودے کتابی مقابلے میں ریاست جموں و کشمیر کو پیش کیے تھے اور ان پر انہوں نے ایوارڈ بھی ملے تھے۔ موصوف اپنی مشہور کتاب ''قلم، قلم کار اور کتاب'' میں ''کتابوں کی دُنیا'' کے مسودے کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'''' کتابوں کی دنیا' کا مسودہ 1979ء میں بچوں کے عالمی سال پر

کتابوں کے ایک مقابلے میں ریاست جموں وکشمیر سرکار کو پیش کیا تھا اور اس پر ایوارڈ ملا تھا۔ ریاستی سرکار نے اسے اور بچوں کے لئے لکھی ایوارڈ یافتہ دو کتابوں کے ساتھ شایع کرنے کے لئے انتخاب کی تھی لیکن کوئی کتاب شائع نہیں کی اور نہ مسودہ واپس کیا۔ ڈھونڈنے پر اس کی کاربن کاپی نکلی۔ تحریریں دھندلی ہو گئی تھیں اور کئی صفحات غائب تھے۔ پیش لفظ میں لکھا تھا کہ کتاب کے لئے ۲۹ ر کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تاہم تفصیل نہیں دی گئی تھی۔''

شیخ صاحب کا مسودہ ''کتابوں کی دنیا'' میں بچوں کے لئے آسان اور سلیس زبان میں کتاب کے ارتقائی سفر کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ درختوں کی چھال اور مٹی کی تختی سے لے کر کاغذ کی ایجاد اور چھپائی کے لئے حروف و الفاظ تراشے گئے لکڑی کے بلاک تک کتاب نے انتہائی لمبا سفر کیا ہے۔ سولھویں صدی عیسوی میں چھپائی کی مشین کی ایجاد سے زمانہ حال میں موبائیل، کمپیوٹر اور الیکٹرانیک بک (E-Book) کی اختراع نے کتاب کو لامثال معراج بخشا ہے اور علوم وفنون میں عظیم اور حیرت انگیز انقلاب آیا ہے۔ آج کتاب کروڑوں اور اربوں کی تعداد میں ہارڈ کاپی اور سافٹ کاپی کی شکل میں چھپتی ہے اور ہر فرد کے ہاتھ میں آسانی سے پہنچتی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے قاری اپنے گھر کے کمرہ کی چار دیواری کے اندر سمندروں کی گہرائیوں اور آسمانوں کی بلندیوں، سائنس کے عجوبات اور خدا کی تخلیقات، پُرانے زمانے کے حالات اور نئے زمانے کی ایجادات کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکتا ہے۔ بقول مصنف:

''ہم کتاب سے گھر بیٹھے دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔ اہرامِ مصر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک سائنس داں کی تجربہ گاہ میں جھانک سکتے ہیں۔ پانی پت کی لڑائیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لا سکتے ہیں۔ مریخ اور زہرہ پر گھوم پھر سکتے ہیں۔''

کتاب واقعی سائنس دانوں کی صدیوں کی کاوشوں اور دریافتوں کا ثمرہ ہے۔ کیونکہ اس میں صدیوں پرانی باتیں محفوظ رہتی ہیں، اس میں فرد اور ملک کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اس لئے کتاب انسانی تہذیب کا سب سے گراں مایہ اور لازوال تحفہ ہے۔ مصنف نے چلڈرنز برٹینیکا کا قول نقل کیا ہے

جس میں لکھا ہوا ہے:

''کتاب انسان کی تمام ایجادوں میں سے بڑی ایجاد اور دریافت ہے۔
نئے خیالات والے مرد اور عورتیں مرجاتے ہیں لیکن کتابیں کبھی نہیں مرتیں۔
کیونکہ کتابیں بار بار چھاپی جاسکتے ہیں۔''

کتاب جب نایاب یا کمیاب تھی تو پسماندہ لوگ اس کو عجوبہ سمجھتے تھے اور ناخواندہ لوگ اس سے خوفزدہ تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ موصوف نے تحریر اور کتاب کے سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جب تحریر اور کتاب عام نہیں تھی تو یہ صورتِ حال کئی لطیفوں کو جنم دیتی تھی۔'' پھر مصنف نے اس حوالے سے کئی واقعات درج کئے ہیں جن سے میں چند ایک نقل کر رہا ہوں:

''انگلینڈ کے ایک پادری جان ولیمز بحر اوقیانوس کے جنوب میں واقع ایک جزیرے میں تبلیغی کام کرتے تھے۔ جزیرے کے باشندے بالکل وحشی تھے۔ ایک دن پادری کو ہتھوڑے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک کالے پتھر پر بیوی کے نام چاک سے لکھا کہ اسے ہتھوڑا بھیجا جائے اور پتھر جزیرے کے ایک آدمی کے ہاتھ میں دیا۔ بیوی نے پیغام پڑھ کر ہتھوڑا اس شخص کے حوالہ کیا۔ پتھر کے جادو پر وہ آدمی بہت حیران ہوا اور مدت تک اس پتھر کو اپنے گلے میں لگائے رکھا۔''

مصنف کتاب اور تحریر کے جادو کی نسبت سے لکھتے ہیں:

''ایک یورپی قانون داں نے اپنے سیاہ فام غلام سیمبو کے ہاتھ اپنے شوہر کو کھانے کے لئے کئی بھنے ہوئے مرغ بھیجے اور ساتھ میں ایک رقعہ بھی دیا۔ سیمبو نے جب راستے میں بھنے ہوئے مرغ دیکھے تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے سوچا اگر وہ ایک مرغ کھالے تو صاحب کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ چنانچہ اس نے ایک مرغ ہڑپ لیا۔ صاحب نے ایک مرغ کم پایا۔ اس نے سیمبو سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ حیرت زدہ ہوا کہ سفید کاغذ کیسے بول سکتا ہے۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ جس فرد یا قوم نے کتاب کے ساتھ دوستی کی۔ اس نے کارہائے نمایاں

انجام دئے۔ کیونکہ کتابیں پھل دار درخت کی مانند ہوتی ہیں۔ یہ قوم کی تہذیب وثقافت، سائنسی اور عملی ترقی کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی بہترین دوست بھی ہے۔ کتابوں سے دوستی رکھنے والا شخص تناور رہتا ہے نہ ناکامی اور مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندگی میں بڑے کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔اس ضمن میں شیخ صاحب دلچسپ مثالیں دیتے ہیں:

''لندن کے ایک مجسٹریٹ نے ایک سولہ سالہ لڑکے سے پوچھا۔

'تم نے سانپوں کو کیسے قابو میں کیا؟ لڑکے نے لندن کے ایک چڑیا گھر سے زہریلا سانپ چرا کر ایک تھیلے میں اپنے گھر لایا تھا۔

'جناب! میں نے اسے کتابوں سے سیکھا۔' لڑکے نے جواب دیا۔

''فریڈ ریبل آسٹریلیا کا رہنے والا تھا۔وہ امریکہ کا شہر لاس انجیلز دیکھنا چاہتا تھا۔آسٹریلیا سے لاس انجیلز آٹھ ہزار میل دور ہے۔ ریبل غریب لیکن محنتی تھا۔اس نے کتابوں کی مدد سے جو سڈنی کی پبلک لائبریری سے حاصل کیں، جہاز رانی سیکھی اور کتابوں کی مدد سے فاصلہ معلوم کرنے کا ایک آلہ بنایا۔آخر کار وہ ایک کشتی میں بحر الکاہل کے سفر پر نکلا اور ایک سال ایک ہفتہ کے بعد ریبل لاس انجیلز پہنچا۔''

آگے مصنف ایک اور مثال درج کرتے ہیں:

''آئرش ری پبلکن آرمی کو روسی ہتھیار ملے تھے لیکن وہ ان کا استعمال نہیں جانتے تھے۔انہوں نے روسی زبان سیکھی اور کتابوں کی مدد سے ہتھیار استعمال کرنا سیکھا۔''

''کتابوں کی دنیا'' مسودہ کتابوں کے ارتقائی سفر کے بارے میں قاری کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ چند اقتباسات بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

''دُنیا کی قدیم ترین کتاب تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے پائپرس نام کے ایک پودے کی چھال پر لکھی گئی تھی۔عراق میں نینوا کے قدیم شہر میں دس ہزار مٹی کی ٹکیوں کی ایک پبلک لائبریری دریافت ہوئی ہے جو دنیا کی ایک قدیم

ترین لائبریری ہوسکتی ہے۔"

"کاغذ کی ایجاد سے پہلے انسان درختوں کی چھال، نرم مٹی کی تختیوں، جانوروں کی کھال، پتے، ٹھیکروں، ہڈیوں، پتھروں، کپڑے، موم وغیرہ پر لکھتا تھا۔ ایک اوسط قدیم کتاب کے لئے گیارہ بھیڑوں کی کھالیں درکار تھیں۔ بکری کی اس سے زیادہ کھالیں لگتی تھیں۔"

آگے کاغذ، حروفِ تہجی، کتاب اور چھپائی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"چین نے ۱۰۵ء میں کاغذ دیا۔ فونیشیائی (Phonecia) نے حروفِ تہجی دیے۔ یونان نے حروف کی بہتر اشکال دیں۔ روم نے کتاب کا روپ دیا۔ چھپائی کی مشین جرمنی کی دین ہے۔"

(کتابوں کی دنیا: مسودہ)

جدید دور میں اگرچہ مطالعے کے لئے نئے نئے ذرائع متعارف کروائے گئے ہیں اور ٹیکنالوجی کے باعث علم و آگہی کے حصول میں انقلاب برپا ہو چکا ہے مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ کتابوں کی دائمی اہمیت و افادیت اپنی جگہ قایم و دایم ہے اور اس میں روز اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ موصوف نے کتاب کی اہمیت و عظمت پر دانشوروں کے مقولے دیے ہیں جیسے میکالے کا ایک قول ہے:

"اگر مجھے عیش و عشرت کے سامان سے آراستہ لیکن کتابوں سے خالی ایک محل اور کتابوں سے بھری پڑی ایک جھونپڑی میں سے ایک کو انتخاب کرنے کے لئے کہا جائے تو میں جھونپڑی کو ترجیح دوں گا۔"

کتابیں قومی ترقی کی ضامن اور اچھی کتابیں انسان کو مہذب اور معتبر بناتی اور اس کی شخصیت کو وقار عطا کرتی ہیں۔ شاید یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ کتاب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی شئے نہیں جو انسان کو شعور، علم اور ترقی کی نئی منزلوں سے روشناس کراتی ہے۔ ایک اچھی کتاب پڑھنے کے ضمن میں وہ فرانسس بیکن کے اس قول کا حوالہ دیتے ہیں:

"کتابیں دو اقسام کی ہوتی ہیں۔ وقتی اور ابدی کتابیں۔ وقتی کتابیں

صرف چکھنے کے لئے ہیں جبکہ ابدی کتابیں ہضم کرنے کے لئے ہیں۔ یہ کتابیں ہر زمانے میں کام آتی ہیں اور آفاقی پیغام رکھتی ہیں۔''

بچوں کے لئے مصنف کا لکھا ہوا دوسرا مسودہ ''لداخ کی سیر'' ہے۔ جبکہ اس نوعیت کی ایک اور کتاب بعنوان ''لداخ تہذیب وثقافت'' بڑوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ دونوں میں بہت یکسانیت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ البتہ ''لداخ تہذیب وثقافت'' میں چند ابواب یا مضامین زیادہ ہیں۔ جن میں وہاں کی تہذیب وتمدن، رہن سہن، تجارت، سیاست کے علاوہ لوک ادب، زبان اور جنگلی جانور وغیرہ کے حوالے سے اچھی خاصی جانکاری ملتی ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں مصنف رقمطراز ہیں:

''لداخ تہذیب وثقافت' اردو میں لداخ پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو میرے بینتالیس سال کی تحقیق اور ریاضت کا ثمرہ ہے۔ اس میں لداخ کی تاریخ، ثقافت، تمدن، یادگاروں، اہم مقامات، مذاہب، شخصیات، لوک ادب، زبان، جنگلی جانوروں وغیرہ پر مختلف مضامین میں بصیرت افروز روشنی ڈالی گئی ہے۔''

(حوالہ: لداخ تہذیب وثقافت از عبدالغنی شیخ)

کتابچہ ''لداخ کی سیر'' اردو دان بچوں کو لداخ سے متعارف کرنے کے لے لکھی ہے۔ اس میں لداخ کے جغرافیہ، محل وقوع، ہمسائے، موسم، دروں، پہاڑوں، دریاؤں، جھیلوں، گرم پانی کے چشموں، جنگلی جانوروں، پرندوں، نباتات اور عجوبات کے حوالے دیے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کا تیسرا اور خوبصورت خطہ لداخ ہے۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ یہ مختلف نام لداخ کو اس کے منفرد جغرافیائی، آب وہوا، محل وقوع اور تمدنی خصوصیات کی وجہ سے پڑے تھے لیکن جس نام کو قبولِ عام کی سند ملی وہ واقعی 'لداخ' ہے۔ لداخ کے مختلف ناموں کی تفصیل شیخ صاحب کے مسودہ ''لداخ کی سیر'' میں یوں درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''لداخ کا سب سے پرانا نام 'جنگ جونگ' ہے۔ جنگ جونگ ایک جنگلی جانور کا نام ہے جس کو لداخی میں نیاں اور انگریزی میں Ovis

Ammon کہا جاتا ہے۔ ماضی میں لداخ میں یہ بھیڑ نما جانور بکثرت پایا جاتا تھا۔ اس کے سینگ بڑے لمبے اور نادر ہوتے ہیں۔ یورپی شکاری اپنے گھروں کی زینت کے لئے دیوار پر آویزاں رکھتے تھے۔ یہ جانور صرف لداخ اور تبت میں پائے جاتے ہیں۔ چینی سیاح فاہیان نے لداخ کو خاچن پایا برفانی ملک کہا ہے۔ ماضی میں لداخ میں آج کے مقابلے میں بہت زیادہ برف پڑتی تھی۔ لداخ کے علاقہ دراس میں آج بھی ۲۰ رسے ۳۰ رفٹ برف پڑتی ہے۔ سائبیریا کے بعد دُنیا کی سرد ترین جگہ ہے۔ ہیون سانگ نے لداخ کو سانپو کہا ہے۔ سانپو لداخی میں دریا کو کہتے ہیں۔ لداخ میں دریائے سندھ سمیت پانچ دریا بہتے ہیں۔ ایک ہزار سال پہلے لداخ کو مریُول یا سرخ دیش کہا گیا ہے۔ لداخ میں اکثر مقامات پر پہاڑ اور مٹی کا رنگ سرخ مایل ہے۔ غالباً اسی بنا پر یہ نام پڑا تھا۔ اس دور کا ایک مقبول نام نارس کورسوم یا تین صوبوں والا ملک تھا۔ تب لداخ کا علاقہ تین صوبوں میں بٹا تھا۔ کشمیر کی تاریخی کتاب ''سری وار'' میں لداخ کو بھوٹٹا کہا گیا ہے۔ مغلیہ حکومت کے زمانے میں لداخی سکہ پر اردو خط میں بھوٹان لکھا جاتا تھا۔ فارسی تاریخ نویسوں نے لداخ کو تبت خورد اور تبت کلان (چھوٹا یا بڑا تبت) کہا ہے جبکہ اصلی تبت کو تبت بزرگ کہا ہے۔ تاہم جس نام سے یہ مشہور ہے، وہ لداخ ہے۔ لداخ کا مطلب درہ پر بسنے والا ہے۔ لداخ میں ہر طرف بیسوں سینکڑوں درّے ہیں۔ بلند ترین درہ قراقرم ہے جس کی بلندی ۱۸۶۸۰ رفٹ ہے۔''

شیخ صاحب نے بڑی تحقیق، جستجو کر کے لداخ کے متعدد نام اور ان کا وجہ تسمیہ بیان کر کے اس علاقے کے ناموں کا البم مرتب کیا ہے۔ اس سے واقعی اردو دان طبقے کو لداخ کے تئیں معلومات میں اضافہ ہوگا۔ علاوہ ازیں لداخ سے چند اور نام اس کی طبعی خصوصیات اور تمدنی عوامل کی وجہ سے کئی اصطلاحی اور تشبیہی نام دیئے گئے ہیں جن کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''اپنی طبعی خصوصیات اور تمدنی عوامل کی وجہ سے لداخ کو Moon

Land چاند جیسی سرزمین، Magic Land جادوئی دیش اور Mysterious Land پراسرار ملک کہا گیا ہے۔ ان ناموں کی نسبت سے لداخ پر کتابیں چھپی ہیں اور ہوٹلوں وغیرہ کے نام رکھے ہیں۔ اپنی بلندی کی وجہ سے لداخ کو بامِ عالم یا دنیا کی چھت بھی کہا گیا ہے۔''

مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ لداخ کو ''لاموں کا دیش'' Land of Lamas، ''کثیر الازواجی'' دیش A Land of Polyandry، شکاریوں کی جنت Sports man's Paradise، ''سرزمین اولیس آمون'' Land of Ovisammon نیز ستو پاؤں کی سرزمین، ''دنیا کی ناف''، ''شنگر بلا'' جیسے ان گنت ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

لداخ ریاست جموں وکشمیر کا وہ مشرقی خطہ ہے جس کو قدرت نے فلک بوس اور دلفریب پہاڑوں، دروں اور ٹیلوں وغیرہ نے گھیر لیا ہے۔ نیز اس علاقے کے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے دلکش چوٹیوں نن، کُن اور خوبصورت وادیاں بھی کچھ کم نہیں۔ جو سیاحوں کی کشش کے موجب ہیں۔ حالانکہ یہاں کے موسمی حالات خوشگوار نہ ہونے کے باوجود بھی سیاح آنے سے جی نہیں چراتے ہیں۔ کیونکہ پُر کشش قدرتی نظارے ہر سیاح کو آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے موسم کی غیر یقینی کی پروا کیے بغیر لداخ میں سیاحوں کی آمد و رفت جاری وساری ہیں۔ یہ سیاح لداخ کی ننگی چوٹیوں، بنجر میدانوں، اونچے پہاڑوں، چٹیل ریگ زاروں اور حسین وادیوں کا جی بھر کر نظارہ کر کے خوشی خوشی اپنی سیاحت اور سیر وتفریح کی پیاس بجھاتے ہوئے اپنے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ لداخ کے پہاڑوں، چوٹیوں اور موسم کے بارے میں شیخ صاحب لکھتے ہیں:

''لداخ میں کوہ ہمالیہ سمیت دُنیا کے کئی اونچے پہاڑی سلسلے ہیں۔ نن، کُن اور ساسیر جیسی برفانی چوٹیاں سر کرنے کے لئے کوہ پیما ٹیمیں آتی ہیں۔

لداخ میں دھوپ کی بڑی اہمیت ہے۔ سورج کی تعریف میں گیت کہے گئے ہیں۔ دھوپ کی نسبت سے ایک یورپی نے لداخ کے موسم کے بارے میں لکھا ہے۔ 'یہاں گرمی ہے لیکن گرم موسم نہیں۔ یہاں سردی ہے بھی اور نہیں بھی۔

ایک آدمی یہاں بیک وقت پسینے سے شرابور ہوتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرتا بھی
ہے۔ دھوپ میں رہے تو گرمیوں میں گرمی محسوس ہوتی ہے اور چھاؤں میں
جائے تو سردی محسوس ہوتی ہے۔''

پہاڑوں کے علاوہ لداخ میں نامور دریا اور مشہور جھیلیں بھی ہیں۔ دریاؤں میں دریائے سندھ، شایوک، نوبرا، سورو، زنسکار اور دراس خاص طور قابلِ ذکر ہیں جبکہ جھیلوں میں پنگونگ، چھوموری دی، چھوکر اور چھورول سیاحوں کی دلکشی کے مراکز ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جنگلی حیات کسی بھی ملک کا سرمایہ ہوتی ہے اور اس کے تحفظ کے لئے کام کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ ہندوستان میں جنگلاتی زندگی کی حفاظت کرنا ایک قدیم روایت رہی ہے۔ ''پنچ تنتر' اور 'جنگل بک' وغیرہ کی کہانیاں اس کی تصدیق کرتی ہیں جن میں جنگلاتی زندگی سے پیار و محبت کا ذکر ہے۔ ان سے نوجوانوں کے دل و دماغ پر کافی مثبت اثر پڑا ہے۔ شیخ صاحب نے بھی اپنے مسودہ ''لداخ کی سیر'' میں پالتو جانوروں کے بجائے جنگلی جانوروں پر کچھ صفحات سادہ، شستہ اور آسان زبان میں سیاہ کیے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے قاری کو نہایت اہم اور دلچسپ معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس مسودہ میں مشہور جنگلی جانوروں مثلاً جنگلی بھیڑ، بکرا، گائے، جنگلی گدھا، برفانی چیتا، خرگوش، مرگ، لومڑی، ریچھ وغیرہ اور ان کی اقسام کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری ہے۔ لداخ کو متنوع جنگلی جانوروں کی بنیاد پر Sportsman's Paradise یعنی شکاریوں کی جنت کہا گیا ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''کہا گیا ہے، انٹی لوپ (ژوس) کی اون شہتوس پشمینہ سے بہت اعلیٰ
ہوتی ہے۔ اور سونے کے بھاؤ بکتی ہے۔ شہتوس کی ایک شال کئی لاکھ روپے میں
فروخت ہوتی ہے۔ Ibex (ریدقس) پھرتیلا اور بلندیوں پر رہنے والا جانور
ہے۔ یہ لداخ سکاؤٹس اور گلگت سکاؤٹس کے تمغے کی علامت ہے اور سکاؤٹس
کی فوجی ٹوپی پر ابیکس کا بیج (badge) لگایا جاتا ہے۔ جنگلی یاک تندخو اور
خوفناک جانور ہے۔ کئی دفعہ شکاری پر حملہ کرتا ہے۔ شکاری محفوظ مورچے میں رہ

کراسی پر گولیاں چلاتا ہے۔ پالتو یاک گلیشیر پر سکیٹنگ کرتا ہے۔ برفانی چیتا کی لمبائی ساڑھے چھ فٹ تک ہوتی ہے۔ تقریباً آدھی لمبائی دم کی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ جب ایک چیتا بھیڑ بکریوں کے باڑے میں گھس جاتا ہے تو ۳۰ر سے ۴۰ر بھیڑ بکریوں کو مارتا ہے۔ یہ صرف خون پیتا ہے۔ دو کوہان والا اونٹ آج کل سیاحوں کی سواری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اونٹ اور یاک دونوں کئی روز تک خوراک اور پانی کے بغیر زندہ رہتے ہیں۔

ریچھ لداخ میں دراس، سکیومر کھا اور کئی دور افتادہ اور دشوار گزار دیہات میں پایا جاتا ہے۔ ریچھوں کی نسل کی افزائش نہیں ہوئی ہے۔ اس کی ایک انوکھی وجہ بتائی جاتی ہے۔ ریچھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا ہے۔ اس علاقے میں گرمیوں میں پانی کے بہت سارے نالے بہتے ہیں۔ ریچھ اپنا ننھا بچہ لے کر نالہ پار کرتا ہے اور اپنے خیال میں اس کی حفاظت کے لئے اس کے اوپر ایک بڑا اور بھاری پتھر ڈالتا ہے۔ پھر ایک کے بعد ایک دوسرے بچوں کو اپنے ساتھ کنارے پر لے جاتا ہے اور ان کے اوپر بھاری پتھر ڈالتا ہے۔ جب وہ آخری بچہ لے کر نالہ پار کرتا ہے تو سارے بچے بھاری پتھر کے بوجھ سے دب کر مرے ہوتے ہیں اور آخری زندہ بچہ لے کر وہ اپنا راستہ لیتا ہے۔"

جنگلی جانوروں کے علاوہ لداخ میں مختلف اقسام کے پرندے بھی پائے جاتے ہیں۔ محققین کے مطابق یہاں ۳۶۳ر اقسام کے پرندے ہیں جن کو روز مروں مقیم پرندے اور مہاجر پرندے میں رکھا جاتا ہے۔ مہاجر پرندے سردیوں کے آغاز میں لداخ سے نکلتے ہیں اور گرمیوں میں واپس لوٹتے ہیں۔ علاوہ ازیں لداخ میں کئی نادر نایاب اور قیمتی تتلیاں اور دریاؤں میں مختلف النوع کی روپہلی اور سنہری مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ غرض قدرتی نظاروں اور وسائل سے لداخ مالا مال ہیں۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

"لداخ میں چار سو کے قریب پرندے پائے جاتے ہیں، جن میں اکثر

مہاجر پرندے ہیں۔ یہ پرندے سائبیریا سے لداخ آتے ہیں۔ یہ پرندے زیادہ تر جھیلوں کے کنارے رہتے ہیں۔ سیاحت کی وجہ سے پرندے جھیلوں سے گھبرا کر اب دوسرے مقامات منتقل ہو رہے ہیں۔ لداخ سیاہ گردن والی سارس کے لئے مشہور ہے۔ یہ صرف لداخ اور تبت میں پائی جاتی ہے۔ لداخ میں گدھ بہت پائے جاتے ہیں۔ ماضی میں یہ لیہہ میں نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی بڑا اور بھیانک سا گدھ غوط کھاتا اور جانکار لوگوں کے مطابق ایک خرگوش کو اپنے پنجے میں دبا کر آسمان کی بلندیوں میں اٹھا لے جاتا تھا۔ ایک انگریز Adair نے لداخ میں ۵۰۰،۷ افٹ بلند سپنگ درہ کے سامنے ایک چٹان پر داڑھیل گدھ کو پانی پیتے دیکھا جس کی لمبائی ایک پر کے سرے سے دوسرے پر کے سرے تک لگ بھگ ۹ ر میٹر تھی۔ ایڈیر نے لداخ کے علاقہ کورزوق میں پائی جانی والی ۴۲ قسموں کی تتلیوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ ایک لداخی چٹکی Piebald سے متعلق یہ روایت ہے کہ یہ وبائی بیماریوں کو روکتی ہے۔ جب اسے کشمیر لیا جائے تو زوجی لا سے آگے نہیں جیتی ہے۔''

بحیثیت مجموعی شیخ صاحب کی کہانیاں پڑھ کر بچے جنوں، بھوتوں اور پریوں کے دیس میں پہنچتے ہیں اور لداخ کی سیر بھی کرتے ہیں۔ کتاب کے احوال اور ارتقائی سفر سے باخبر ہوتے ہیں اور مافوق الفطری واقعات کا مزہ بھی لیتے ہیں۔ شیخ صاحب نے روایتی، سبق آموز اور نصیحت آموز کہانیوں کے علاوہ معلوماتی کہانیاں بھی تحریر کی ہیں جو ادبِ اطفال کے لئے ایک مستحسن قدم ہے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے یہ مختصر کتابچے اپنے موضوع کی ندرت اور بیان کی مطابقت کے باعث عام کہانی کی بھیڑ میں صاف پہنچانے جاسکتے ہیں۔ الغرض جہاں انہوں نے بڑوں کے لئے فلسفیانہ اور عالمانہ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہاں بچوں کے لئے نہایت آسان اور دلکش زبان میں دلچسپ موضوعات کو پیش کیا جس کی بدولت وہ ادبِ اطفال میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

...... ● ● ● ......

☆.......رشید کانپوری

عبدالغنی شیخ کے تاریخی مضامین
لداخی تہذیب وثقافت کے تناظر میں

ریاست جموں وکشمیر میں جن بلند پایہ شعرا اور ادبا نے گلستانِ اردو کی اپنے قلم سے دن رات آبیاری کی اور اس کی ترقی وترویج کے لئے خون پسینہ ایک کر کے قابلِ فخر کام انجام دیا۔ اُن میں عبدالغنی شیخ لداخی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا نام ریاست کے صفِ اوّل کے محققین ومورخین میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ خطّہ لداخ کی منفرد آواز ہے۔ عبدالغنی شیخ نے سینکڑوں تحقیقی اور تواریخی مضامین لکھے اور ان کی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اُن کی یہ تحریریں آنے والی پود کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خصوصاً تحقیق وتنقید کے طالبِ علموں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

عبدالغنی شیخ ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''میں نے فِکشن (کہانیوں اور ناول) ادبی مضامین، تاریخ، سوانح عمری، خاکے اور سفر نامے لکھے ہیں۔ اخبارات کے لئے کالم اور مذہب، فلسفہ تعلیم وغیرہ پر مضامین قلمبند کیے ہیں۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کا کام کیا ہے۔ ریڈیائی بات چیت، فیچر اور ٹی وی کے لئے سریل اور سکرپٹ لکھے ہیں۔

جن کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔''

(مضمون: تخلیق کار کے لئے مطالعہ ومشاہدہ ناگزیر۔
مطبوعہ شیرازہ اُردو جموں وکشمیر اکیڈیمی۔ جلد:۵۱، شمارہ:۵)

چند لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے لکھتے ہیں لیکن عبدالغنی شیخ واضح لفظوں میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی انا کے لئے نہیں بلکہ جب کوئی خوبصورت جگہ دیکھتے ہیں اور اُن کا دل باغ باغ ہواٹھتا ہے تو وہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی خوشی اور مشاہدہ میں شریک کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بھی اس سے محظوظ ہوں۔ اسی طرح اگر ان کو کوئی خاص بات یا کوئی خاص واقعہ متاثر کرتا ہے تو وہ قاری کو بھی اس میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ہم جب کسی پر ظلم یا زیادتی ہوتے دیکھتے ہیں تو ہمارا دل کڑھتا ہے۔ اگر میں صاف صاف لکھ نہ سکوں تو ایسے واقعات کے لئے فکشن کا سہارا لیتا ہوں۔''

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عبدالغنی شیخ نے ادبی، علمی، مذہبی وغیرہ مضامین قلمبند کئے ہیں۔ اگر چہ انہوں نے تنقید سے بقولِ اُن کے گریز کیا ہے پھر بھی اُن کی کتاب 'قلم، قلمکار اور کتاب' میں انہوں نے ادیبوں کے شب وروز کی مصروفیات، عادات واطوار، جذبات، مطالعہ اور لکھنے کی چاہت، طرزِ تحریر، زود نویسی، بسیار نویسی، تیز وتند تحریریں، اُن کے ناولوں اور کہانیوں کے کردار قلمکار اور نقاد، قلمکار اور قاری، قلمکار اور ناشر، مدیر، قلمکار اور غریبی، قلمکاروں کی ازدواجی زندگی، قلمکار اور جیل خانہ، ادبی سرقہ، ممنوعہ کتابیں، اہم شخصیتوں اور ان کی کتابوں کے Ghost Writer اور فرد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عبدالغنی شیخ کی دلچسپ اور خوبصورت کہانیاں ملک کے موقر اور اعلیٰ پایہ کے جراید ورسائل میں چھپ چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے انگریزی، ہندی، جرمنی، گجراتی، کشمیری وغیرہ میں ترجمہ کیا گیا ہے جنہیں ہندوستان کے باہر بھی کافی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی کہانیوں کا جرمن زبان میں ایک اردو دان ریز کیمنگ ترجمہ کررہا ہے۔

۱۹۹۴ء سے جموں وکشمیر اکاڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویجز نے اپنے شہرۂ آفاق رسالہ ''شیرازہ'' کا ایک خصوصی سلسلہ ''جموں، کشمیر اور لداخ۔ تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں شائع کرنا

شروع کیا اور سالِ گزشتہ تک اس کے گیارہ شمارے لگاتار شائع ہوتے رہے۔ ان شماروں میں عبدالغنی شیخ متواتر قارئین کے دل و دماغ پر اپنی نگارشات کی وجہ سے چھائے رہے۔

۱۹۹۴ء کے پہلے ہی شمارے میں ان کا ایک طویل، ۱۲۰ رصفحات پر مشتمل مضمون 'لداخ۔ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں' شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون تاریخی بھی ہے اور تحقیقی بھی۔ مضمون میں جہاں لداخ کی تاریخ، ثقافت، تہذیب و تمدن کا مفصل طور پر تاریخی حوالہ جات دے کر تذکرہ کیا گیا ہے، وہیں یہاں وارد ہوئے مہم جوؤں، سیاحوں، تاجروں، مورخوں اور سفیروں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے تاثرات جو مختلف کتابوں، سفرناموں، تواریخ اور ڈائیریوں میں درج ہیں پر مدّلل روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کی ابتداء میں لکھتے ہیں:

> ''لداخ صدیوں سے سیاحوں، محققوں اور مہم جوؤں کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کے بلند و بالا پہاڑ، دشوار گزار درّے اور بے آب و گیاہ میدان مہم جوؤں اور من چلے سیاحوں کی مہم جوئی اور شوقِ سفر کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔ لداخ کا جغرافیائی محلِ وقوع مسافروں اور مہم جوؤں کے لئے اہم گزرگاہ کا کام دیتا رہا۔ زمانۂ قدیم سے لداخ کے راستے مسافر، حملہ آور، علماء، مبلغین، تبت، چین اور وسطِ ایشیاء آتے جاتے رہے ہیں۔ لیہہ صدیوں سے وسطِ ایشیاء کا اہم تجارتی مرکز رہا ہے۔''

ان دعوؤں کی تائید میں انہوں نے تاریخی واقعات، اہم دستاویزات اور کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ شیرازہ کے جموں کشمیر اور لداخ۔ تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں دوسری جلد کے شمارہ 4 تا 11 میں عبدالغنی شیخ لداخی کا ایک اور طویل اور مربوط مضمون ''لداخ۔ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں'' کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ مضمون ۴۵ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون میں یہاں کے لوگوں کا بدھ مذہب اختیار کرنا، کشمیر سے مختلف لوگوں کی لداخ میں آمد کا تذکرہ ہے۔ شائع شدہ مضمون میں جن واقعات، سفرناموں یا سیاحوں وغیرہ کا تذکرہ رہ گیا تھا۔ اس مضمون میں فاضل قلم کار نے تحریر کیا ہے۔ یہ دو مضامین پڑھ کر قاری کو لداخ کے بارے میں دستکاریوں سے لے کر مال مویشیوں تک، میوہ جات سے لے کر حکمرانوں تک تاریخی شواہد کے ساتھ واقعات اور حالات کی تصویر ملتی ہے۔

شیرازہ کے جلد ۳ میں عبدالغنی شیخ کے تحریر کردہ اسی سلسلے کے دو مضمون 'رسول گلوان کی خود نوشت سوانح حیات' اور 'لداخ مہم جوؤں کی سرزمین' کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں۔

پہلے مضمون میں مصنف نے نہایت دلچسپ انداز میں رسول گلوان کے خاندان اور اس کے آباواجداد کے لداخ وارد ہونے کے اسباب تحریر کیے ہیں۔ رسول ناخواندہ تھا۔ بارہ سال کی عمر میں بطورِ قلی وہ ینگ ہسبنڈ کے ہمراہ وسطِ ایشیاء کی مشہور مہم پر روانہ ہوا۔ اس سے قبل اس نے ڈاکٹر جرال کے ساتھ کشمیر کا بھی سفر کیا تھا۔ اس نے اپنی سوانح ۵۲ رسال کی عمر میں لکھی۔ عبدالغنی شیخ رسول گلوان کے سوانحِ حیات تحریر کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"غالباً رسول گلوان ریاست کا پہلا باشندہ ہے، جس نے اس زمانے میں انگریزی میں اپنی سرگزشت لکھی۔ وہ روایتی طور پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔۔۔ اپنی محنت اور تجربہ سے کام چلانے کے لئے انگریزی میں شُد بُد رکھتا تھا اور ترقی کرتا ہوا اقسقال کے عہدے پر پہنچا۔ جو وسطِ ایشیاء سے لداخ آنے والے تاجروں کا افسر ہوتا تھا اور لیہہ میں برٹش جوائنٹ کشمیر کے تحت کام کرتا تھا۔ رسول گلوان نے اپنی کتاب ایک امریکی سیاح اور محقق رابرٹ براٹ کی تحریک پر لکھی۔"

مضمون میں رسول گلوان کے تعلق سے اس وقت کے حقایق سامنے لائے ہیں۔

دوسرا مضمون گزشتہ جلدوں میں شائع شدہ دو مضامین کی باقیات میں سے ہے جس میں مختلف سفرناموں اور تذکروں کا ذکر اور اُن کے مصنفین کا ذکر کرنے کے علاوہ بطورِ نمونہ حوالہ اقتباسات بھی دیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ مختلف مشکلات و مصائب برداشت کر کے بھی سفیروں، مہم جوؤں اور مسافروں کا کام آسان بناتے رہے۔

شیرازہ کے جلد ۴ ر میں عبدالغنی شیخ کے دو مضامین 'ولیم مورکرافٹ۔ کشمیر اور لداخ میں' اور 'لداخ میں فنِ سنگتراشی کے خزینے' شامل کئے گئے ہیں۔ مضامین کے عنوانات سے ہی قاری کو ان میں شامل مواد کی نسبت جانکاری ملتی ہے۔

اسی طرح جلد ۵ ر میں 'لداخ پر کپتان رمزے اور لبز انگ کی نگارشات اور 'لداخ کی ثقافتی

روایات اور اردو' کے عنوان سے تحریر کئے گئے نہایت خوبصورت، دلچسپ اور معلوماتی مضامین ہیں۔

جلد ۶ر میں ''پشمینہ اور شال کی کہانی' اور 'بدلتا ہوا لداخ' کے علاوہ لداخ کے ہمس گنپہ کا 'پراسرار صحیفہ' کے عنوان سے تین مدلل مضامین درج ہیں۔ ان مضامین کے عنوان سے ہی قاری کو ان میں شامل مواد کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔

جلد ۷ر میں 'تاریخ لداخ ۔۔۔ نئے تناظر میں'، کوکشو ۔۔۔ جہاں بودھ اور مسلمان ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں' اور 'منشی چھرنگ پلگیس' کے عنوان سے تین جامع اور معنی خیز مضامین شایع ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون ان جملوں سے شروع ہوتا ہے:

> ''لداخ کی تاریخ پر انگریزی، اردو اور لداخی میں ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ہر مورخ نے لداخ کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ تاہم ان میں چند موضوع ہذا پر گراں قدر تصنیفات ہیں۔''

اس کے بعد تقریباً ایک درجن سے زاید مورخوں اور تواریخ کا تذکرہ مفصل طور کیا ہے۔ نیز ان نو ر مورخین کے قلمی نسخوں کی موجودگی کے بارے میں کافی کچھ لکھا گیا ہے۔

اسی طرح جلد ۸، ۹، ۱۰ اور گیارہ میں بالترتیب اُن کے یہ مضامین شامل ہیں:

جلد ۸: (۱) بلتستان، (۲) سیاچن گلیشر ۔۔۔ تاریخ کے آئینے میں۔

جلد ۹: (۱) لداخ کے بعض عقائد اور اوہام، (۲) لداخ کا جغرافیائی محل وقوع۔

جلد ۱۰: (۱) گلگت سکاؤٹس کی بغاوت کی روداد، (۲) لداخ بلتستان اور تبت کے خلاف مہاراجہ گلاب سنگھ کی مہمات۔

جلد ۱۱: (۱) تبت میں آباد کشمیری مسلم، (۲) گاہے گاہے باز خوان این قصۂ پارینہ را۔

ان تمام مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالغنی شیخ نے خطِ لداخ کے ہر ایک پہلو پر قلم اٹھایا ہے اور ہر ایک گوشہ پر روشنی ڈالی ہے اور اگر ان مضامین کو لداخ کی مکمل تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

......●●●......

☆......شاہد اقبال

عبدالغنی شیخ بحیثیت افسانہ نگار

جب لداخ میں اردو افسانوی ادب کا ذکر آتا ہے تو ہماری نگاہ سب سے پہلے عبدالغنی شیخ پر ٹھہرتی ہے۔ لداخ میں اردو افسانوی ادب کا آغاز اس وقت ہوا جب موصوف نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور لداخ میں اردو افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے ایک مضبوط اور مستحکم بام و در کی تعمیر و تشکیل میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

اردو نثر کے حوالے سے عبدالغنی شیخ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوے اور اپنی تمام عمر اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے وقف کر دی اور ہنوز ان کا تحقیقی و تخلیقی سفر جاری ہے۔ ریاست جموں و کشمیر اور بالخصوص لداخ میں اردو زبان کے ارتقاء سے متعلق بحث و تمحیص ان کے ادبی کارناموں کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتی۔ وہ بیک وقت مورخ، ناول نگار، محقق اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا شمار ریاست کے ساتھ ساتھ برصغیر کے نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جس کا واضح ثبوت موصوف کی وہ لازوال کہانیاں فراہم کرتی ہیں جو 'آج کل'، 'شاعر'، 'ایوان اردو' اور 'شیرازہ' جیسے معروف ادبی رسائل میں اکثر و بیشتر شایع ہوتی رہیں۔ ان کی چند کہانیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ انھیں انگریزی، ہندی اور تیلگو جیسی مشہور زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا۔ افسانہ نگاری کے حوالے سے اب تک موصوف کے تین مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'زوجیلا کے آرپار' ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کے ذریعے انہوں نے پہلی

مرتبہ لداخ کے اردو ادب میں ادب برائے زندگی کے اہم تصور کو شامل کیا۔ یہ افسانوی مجموعہ اس لئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ موصوف کی ادبی زندگی کا آغاز بھی اسی سے ہوا۔ اس مجموعے میں 'لو سرا اور آنسو'، 'گنجا' اور 'دادی اماں' جیسی مشہور کہانیاں شامل ہیں۔ عبدالغنی شیخ کا دوسرا افسانوی مجموعہ بعنوان 'دوراہا' ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا جس میں ۲۲ کہانیاں شامل ہیں۔ 'دوراہا' میں افسانہ نگار نے رومانیت پسندی اور حقیقت نگاری کا ایک حسین امتزاج قائم کیا ہے۔ 'دوراہا' ان کے اس مجموعے کا مشہور رومانی افسانہ ہے اس افسانے کی رومان پرور فضا میں اس وقت مزید چاشنی پیدا ہوتی ہے جب لڑکی کی طرف سے اظہار محبت ہوتا ہے۔ افسانوی مجموعہ 'دوراہا' میں جدت طرازی اور ظرافت نگاری کی ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جو موصوف کے متحرک ذہن اور وسیع تخیل کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'ایک ملک، دو کہانی' ۲۰۱۴ء میں مطبع اپلائڈ بکس نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل ۴۵ کہانیاں شامل ہیں۔ فن افسانہ نگاری کے اعتبار سے یہ مجموعہ اہم مقام رکھتا ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کے تمام ادبی حلقوں میں ان کی افسانہ نگاری کی پذیرائی ہوئی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جموں و کشمیر اسٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن نے ان کی مشہور کہانی 'دادی اماں' کا انگریزی ترجمہ دسویں جماعت کے نصاب میں شامل کیا ہے اور انہیں وقتاً فوقتاً ریاست اور بیرون ریاست منعقدہ ادبی تقاریب میں بحیثیت معروف ومقتدر مورخ اور افسانہ نگار مدعو کیا جاتا ہے۔ عبدالغنی شیخ کی انفرادیت کا راز اس بات میں بھی مضمر ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ خطہ لداخ کی عام زندگی، سماجی، تہذیبی و ثقافتی مسائل اور سیاسی کشمکش کو اپنے افسانوں میں پیش کر کے ان مسائل کو اردو افسانوی ادب کا حصہ بنایا۔ ان کی اسی انفرادیت کا اعتراف کرتے ہوئے ریاست کے معروف افسانہ نگار نور شاہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''عبدالغنی شیخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لداخ جیسے برفیلے علاقے میں اردو افسانوی ادب کو زندہ رکھا اور اپنے افسانوں میں لداخ کے اطراف میں بکھری ہوئی زندگی اور زندگی سے وابستہ ان گنت واقعات اور حالات کو ایک منفرد انداز سے سمیٹا اور پیش کیا''

عبدالغنی شیخ نے اپنے افسانوں میں مختلف چھوٹے بڑے موضوعات کو جگہ دی ہے مثلاً وہ اپنی

ایک کہانی 'زندگی' کے ذریعے انسان کو زندگی کے انمول خزانے کا احساس کراتے ہوئے اسے بے ثباتی حیات کی حقیقت سے بھی ہمکنار کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک خاوند اور اس کی بیوی شادی کے بعد ایک حسین زندگی کا خواب دیکھتے ہیں لیکن خوشی کے ماحول میں اچانک اس وقت ماتم چھا جاتا ہے جب شوہر کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کینسر کی بیماری کی زد میں آ گیا ہے تو ان کے سارے خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے

> ''میاں بیوی نے کتنے سارے منصوبے باندھے تھے۔ اپنے لئے ایک خوبصورت مکان بنانے کا، ایک کار خریدنے کا اور بیرون ملک جانے کا۔ اب یہ سارے منصوبے خاک میں ملتے نظر آنے لگے۔ اس کو اپنا دوست اکبر یاد آیا۔ ہمیشہ پریشان رہنے والا دائم المریض اکبر۔ ''اکبر! میں تم سے پہلے جا رہا ہوں'' اس نے دور خلا میں نظریں جما کر آہستہ سے کہا۔''

ان کے افسانوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو کبھی ناامید نہیں ہونے دیتے بلکہ اسے زندگی کے ناساز حالات میں مسلسل جدوجہد کرنے اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور قارئین کے لئے امید کا ایک چراغ روشن کر دیتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے ایک سچے اور ذمہ دار ادیب کی طرح آئے دن سماج و معاشرے میں پیش آنے والی برائیوں کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بنایا ہے مثلاً ان کے افسانے 'آزمائش' میں شوکت اور خانم ایسے والدین ہیں جو اپنے بچے دانش کے اغوا ہو جانے پر بے بس اور پریشان نظر آتے ہیں۔ اس افسانے سے ان تمام والدین کے درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو کسی حادثے میں اپنی اولاد کھو بیٹھتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں عصبیت اور سفارش نوجوان نسل کے لئے بہت بڑا مسئلہ ہے۔ بغیر سفارش کے کوئی ملازمت حاصل کرنا یا پھر کوئی دفتری کام سرانجام دینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال کئی ذہین و ذکی اور قابل نوجوان کوئی سفارشی وسیلہ نہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ موصوف نے اپنے افسانے 'راشن کارڈ' اور 'جھنڈا والا' میں اس عیب کو بے نقاب کیا ہے۔

افسانے 'جھنڈا والا' میں ایک نوجوان محکمہ ٹرانسپورٹ میں ملازمت کی درخواست پیش کرتا ہے تو محکمے کے اراکین اس سے کسی منسٹر کا سفارشی خط لانے کو کہتے ہیں۔ جب وہ ایک لیڈر جو جھنڈا والا کے نام سے مشہور ہے، کی مدد سے ایک وزیر کا سفارشی خط محکمے میں لے جاتا ہے تو وہاں ایسے ہی کئی سفارشی خطوط موجود ہوتے ہیں۔ افسانے 'جھنڈا والا' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں نے ایک بابو جی سے پوچھا میرا کوئی چانس ہے، وہ بولا سفارش دو قسموں کی ہوتی ہے۔ ایک کچی اور ایک پکی، یہ ساری سفارشیں کچی ہیں پکی سفارش کے لئے منسٹر افسر سے براہ راست بات کرتا ہے یا افسر کو بلا کر ذاتی طور پر ہدایت دیتا ہے۔''

مفلسی و فاقہ کشی ہندوستانی عوام کا ایک دیرینہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے ہر سال ہزاروں مزدور اور کسان خودکشی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں، لاکھوں بیمار معقول علاج کے بغیر دم توڑ دیتے ہیں اور کئی جوان بیٹیوں کے گھر بسانے کے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم نے عوام کو اونچے، متوسط اور نچلے طبقات میں تقسیم کر دیا ہے اور ہمیشہ جاگیردارانہ نظام کے ہاتھوں متوسط طبقہ استحصال کا شکار ہوتا رہا ہے۔ دولت کی اسی غیر مساوی تقسیم کی وجہ سے روس میں انقلاب آیا تھا۔ عبدالغنی شیخ نے اپنی کہانیوں کے ذریعے دولت کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کے خلاف ایک احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے اسے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کا افسانہ 'سوئمنگ پول' اس کی بہترین مثال ہے۔ اسی طرح موصوف کے افسانے 'گمشدہ' اور 'ہوا' بھی انسان کے غیر اخلاقی رویے کو بے نقاب کرتے ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنی کہانیوں میں دیگر اہم موضوعات کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت کے قصے شامل کر کے موضوعات میں تنوع پیدا کیا ہے۔ 'راز دل' اور 'ایک رات' ایسے افسانے ہیں جو امن واتحاد اور خلوص ومحبت کا پیغام دیتے ہیں۔

عبدالغنی شیخ نے سماج، مذہب، سیاست، حب الوطنی، عشق ومحبت اور تہذیب وثقافت غرض کہ زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو ضبط تحریر کیا ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں جو تنوع اور بوقلمونیت ہے، اس سے متعلق پریمی رومانی لکھتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے موضوعات میں تنوع ہے۔ان میں پیار و محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے اور سماجی نابرابری کا احساس بھی، ظلم وتشدد کے واقعات بھی ہیں اور وطن سے محبت بھی۔ بعض کہانیوں میں بھرپور طنز ملتا ہے۔ وہ سماج، سوسائٹی اور فرد پر کبھی کبھی طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔''

انھوں نے اپنے افسانوں میں شہری اور دیہی زندگی اور بالخصوص متوسط طبقے کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ان کے افسانوں کے کردار ہمارے سماج کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ہمیں ان کرداروں میں اپنی روزمرہ زندگی کا ایک عکس نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور افسانہ نگار علی باقر موصوف کے افسانوی مجموعے 'دوراہا' کے پیش لفظ میں ان کی کردار نگاری کے حوالے سے یوں تحریر فرما ہیں:

''عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے، صحت مند اور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ شیخ حقیقت نگاری کے قائل اور اپنے کرداروں کے احساسات، نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں''

عبدالغنی شیخ کے چند افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے اردو افسانہ نگاری کے مبادیات و مطالبات پر کھرے اترتے ہیں۔ انھوں نے قصہ، کہانی، کردار نگاری، ایجاز واختصار، وحدت تاثر اور فن افسانہ نگاری کے دیگر تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوے افسانے تحریر کئے ہیں اور ان کی کہانیوں کے مطالعہ میں قارئین کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں فن افسانہ نگاری عروج پر دکھائی دیتا ہے۔اس حوالے سے پریمی رومانی لکھتے ہیں:

''عبدالغنی شیخ کو افسانوی تکنیک پر پوری گرفت ہے۔ وہ مبہم اور غیر واضح بیانات سے گریز کرتے ہیں۔ان کے ہاں بے جا عبارت آرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ اپنی کہانیوں میں فلسفہ نہیں بگھارتے بلکہ جچے تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔''

عبدالغنی شیخ کا تعلق اگرچہ ریاست جموں وکشمیر کے اس دور افتادہ، بالائی اور برفیلی علاقے

سے ہے جو ہمیشہ نصف سال بھاری برف باری اور شدید سردی کی وجہ سے ریاست اور ملک کے تمام علاقوں سے منقطع رہتا ہے لیکن اس محدود ماحول میں رہنے کے باوجود بھی عبدالغنی شیخ کی تخلیقات سے ان کی دوربین اور دوررس نگاہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کا اعتراف اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور دیگر بڑی زبانوں کے ناقدین ومبصرین نے کیا ہے اور آج بھی نہ صرف ریاست جموں وکشمیر بلکہ ہندوستان اور بیرونی ممالک سے تشنگان علم وادب ان کے علمی وادبی کارناموں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

......●●●......

......●......

شیرازہ "خواجہ ثناء اللہ بٹ نمبر"

شیرازہ اُردو کی یہ خصوصی اشاعت ریاست کے بابائے صحافت

خواجہ ثناء اللہ بٹ کی شخصیت اور کارناموں پر مبنی ہے۔ اس میں ریاست کے

مقتدر صحافیوں اور ادیبوں نے خواجہ صاحب کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر

بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔

اس پتے پر منگوائیں:

☆......کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

......●......

☆......فیاض حمید

عبدالغنی شیخؔ کی ناول نگاری

عبدالغنی شیخ ریاست جموں وکشمیر کے صوبہ لداخ سے تعلق رکھتے ہیں اگر چہ انہوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی لیکن وہ اردو فکشن کے ایک معتبر اور مستند فکشن نگار مانے جاتے ہیں انہوں نے دو ناول لکھے جن میں ''وہ زمانہ'' ۱۹۷۷ء اور ''دل ہی تو ہے'' ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ ''وہ زمانہ'' ناول کو کشمیر مرکنٹائل سرینگر نے شائع کیا۔ یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد مقام رکھتا ہے ''وہ زمانہ'' عبدالغنی شیخ کا ایک تاریخی ناول ہے جس میں عبدالغنی شیخ نے لداخ کی پرانی تاریخ کو ناول کا جامہ پہنایا ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اس کو ناول کی شکل دی۔ اس میں انہوں نے لداخ کے رسم و رواج، رہن سہن، تہواروں، میلوں، کے بارے میں روشنی ڈالی ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر قاری لداخ کی فضا سے واقف ہو جاتا ہے۔ جس کی بنیاد حقیقت پر مبنی ہے ان کا دوسرا ناول ''دل ہی تو ہے'' جو ۱۹۷۸ء میں کشمیر مرکنٹائل سرینگر نے شائع کیا ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے جس میں عشق و محبت کی داستان اور ساتھ ہی ساتھ بدلتے ہوئے لداخ کی تصویر کشی ناول نگار نے بڑے دلفریب انداز میں کی ہے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو ناول نگاری پر پوری گرفت حاصل ہے انہوں نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو اس حسین پیرائے سے اپنے تخلیقی قلم سے باندھا ہے کہ کہیں بھی قاری کی دلچسپی نہیں جاتی۔ چنانچہ ۱۹۷۸ء میں جموں وکشمیر آرٹ کلچر آکیڈمی نے اسکو بہترین کتاب کے اعزاز سے نوازا ہے۔

'وہ زمانہ':

'وہ زمانہ' عبدالغنی شیخ کا پہلا ناول ہے یہ ناول کشمیر مرکنٹائل پریس سرینگر سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا ہے اس سے پہلے مصنف نے چند مضامین قلمبند کئے اور چند کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ ناول نگاری کی طرف مائل ہوئے اور اردو ناول پر اپنے نقوش چھوڑ گئے''۔ وہ زمانہ'' ناول ۱۶۰ صفحات پر محیط اور ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے اس ناول کا انتساب عبدالغنی شیخ نے اپنے مرحوم باپ کے نام کیا ہے یہ بنیادی طور پر ایک تاریخی ناول ہے۔ جس میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی اور آزادی کے بعد لگ بھگ تین دہائیوں کے دوران رونما ہونے والی تبدیلیوں کو مزاحیہ اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں کوئی پلاٹ نہیں ہے بلکہ مختلف واقعات کو بالترتیب اکیس ابواب میں یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے اس ناول کی کہانی کو مصنف نے صیغہ واحد متکلم میں تاریخی تسلسل سے بیان کیا ہے ناول کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا لداخ میں خوب پذیرائی ہوئی۔ جس سے قدیم وجدید لداخ کی تہذیب، تمدن، رہن سہن، طرز معاشرت، تعلیم وتربیت، رسم ورواج وغیرہ سے متعلق بھرپور جانکاری حاصل ہوتی ہے جان محمد آزاد اس ناول کے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''۔۔۔اسی دوران آپ کا ناولٹ ''وہ زمانہ'' شائع ہوا جس میں ۱۹۴۷ء سے پہلے کے لداخ کی معاشرتی، ثقافتی، اور مجلسی زندگی اور اس کے بعد رونما ہونے والی تبدیلیوں کی جزئیات مزاحیہ اور دلکش پیرائے میں پیش کی گئی ہے''

اس ناول کے مطالعے سے یہ ادراک ہوتا ہے کہ اس میں ناول نگار نے گزشتہ ایک صدی سے زیادہ مدت کے دوران لداخ میں ہونے والے اہم واقعات اور تغیر وتبدل کو افسانوی انداز میں پیش کیا ہے اور حقائق کا خاص خیال رکھا ہے اس لئے لداخی اور غیر لداخی اُن قارئین نے اس سے سراہا ہے جنھیں لداخ کے بارے میں علم ہے۔ مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات، تجربات اور براہ راست کرداروں سے رابطے کے علاوہ چونسٹھ سے زائد کتابوں سے استفادہ کیا ہے عبدالغنی شیخ اس کتاب کے پیش لفظ میں یوں لکھتے ہیں:

> ''وہ زمانہ'' جو ایک ناول بھی ہے اور ایک تاریخ بھی جس کی تخلیق میں

ذاتی مشاہدات، یادداشتوں اور متعدد لوگوں اور بزرگوں کے احوال بیان کے
علاوہ لداخ پر لکھی گئی چونسٹھ سے زائد کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے“

اس ناول میں لداخ کی تہذیب وتمدن، طرز معاشرت، پکوان، لباس، رسم ورواج، میلے تہواروں، تفریحات اور بدلتی قدروں پر دلکش پیرائے میں روشنی ڈالی ہے دراصل عبدالغنی شیخ کے اس ناول کو اگر ناول سے زیادہ تاریخ مانا جائے تو بُرا نہ ہوگا کیونکہ ناول کے مطالعے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس میں لداخ کی تاریخ سمو دیا گیا ہے اور ناول کو پڑھتے پڑھتے ہم لداخ کی ایک صدی سے زیادہ مدت کے بدلتے واقعات سے ہم آشنا ہو جاتے ہیں ساتھ ہی ساتھ کل اور آج کے لداخ کی بدلتی تصویریں ہمارے ذہن پہ چھا جاتی ہیں جنھیں پڑھنے والے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اصل میں مصنف تاریخ کو فکشن کے روپ میں پیش کرنا چاہتے تھے کیونکہ فکشن زیادہ پڑھا جاتا ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ ناول کا آغاز ذیل کے اقتباسات سے ہوتا ہے:

”یہ اُس زمانے کا قصہ ہے جب ہندوستان کو آزاد ہونے میں ایک سال باقی تھا لیہہ میں انگریز جوائنٹ کمشنر آنے والا تھا۔ صبح دس بجے مڈل اسکول کے بچوں نے لیہہ بازار میں مارچ پاسٹ کیا۔ ان بچوں نے خاکی وردیاں پہنی تھیں۔ ان کے گلے میں سرخ رومال، کندھے پر سٹک اور پیٹی سے سکاؤٹ روپ (Rope) لٹک رہی تھی، آگے آگے بینڈ بج رہا تھا۔ بچوں کی لمبی قطار تھی میں قطار کے آخر میں دو بچوں سے آگے تھا آخری بچہ غلام محی الدین تھا جو اپنے چھوٹے قد و قامت کے ناطے فل سٹاپ کہلاتا تھا ہم دونوں تیسری جماعت میں پڑھتے تھے۔“

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا آغاز لداخ میں انگریز جوائنٹ کمشنر کے آنے سے ہوتا ہے جو وسط ایشیا کے تجارتی امور کا ناظم ہوتا ہے اور گرمیوں میں لداخ میں تین چار مہنے کے لئے آتا ہے اور سردیوں سے پہلے واپس چلا جاتا ہے۔ پہلے چار ابواب میں مصنف نے جوائنٹ کمشنر کے استقبال اور اس کی تفریح کے لئے دکھائے جانے والے میلوں کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے جیسے وہ لکھتے ہیں:

’’لیہہ میں استقبالیہ محرابیں کھڑی کی گئی تھیں جن پر اردو اور انگریزی میں Welcome اور خوش آمدید لکھا تھا دوکانوں پر رنگ برنگی جھالریں لٹک رہی تھیں اور بازار کی ریتلی مٹی پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا‘‘

اس ناول میں مصنف نے منظر نگاری کے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں۔ مصنف لیہہ کے موسم بہار کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

’’موسم بہار پورے جوبن پر تھا لیہہ کے باغیچوں میں گلاب، گل لالہ، ڈھلیا، سورج مکھی، سپید کوسموس، ہالو Holy hock اور گیندے کے پھول کھلے تھے کھیتوں میں سوسن اور تمرس کے سفید اور گلابی پھولوں کی بہار تھی۔۔ پہاڑ، وادیاں اور گھاٹیاں خود رد تارا پھول، قیف نما پیٹونیہ، جنتیانا، بچھو بوٹی، یوروشیا، لیونڈر کی جھاڑیوں اور پیری مولا کے پیلے اور ارغوانی گلابی پھولوں کی خوشبوؤں سے رچی تھیں۔‘‘

’’وہ زمانہ‘‘ میں جہاں مصنف نے اپنے گھریلو حالات کا ذکر کیا ہے تو وہاں لیہہ میں تعینات باہر سے آنے والے ملازمین کی مشکلات کا ذکر یوں کیا ہے:

’’اُن دنوں لداخ آنا ہفت خوان طے کرنے کے مترادف تھا ملازم اعزاء اور احباب یہ سوچتے تھے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گا چنانچہ چند پنڈت گھرانے پہلے ہی واہ سنکار کی رسم سرانجام دیتے کوئی وصیت نامہ لکھ کر لداخ جاتا۔ تمام لواحقین اور دوست یار تبدیل ہو کر لداخ جانے والے ملازم کو رخصت کرنے کے لئے وایُول تک جاتے اور روتے پیٹتے ہوئے خدا کے حوالے کرتے تھے‘‘

برف پگھنے اور راستے کھلنے پر مختلف اطراف سے لوگ لداخ پہنچتے تھے۔ ان میں یورپی سیاح، وسط ایشیا کے تاجران، پنجابی دُکاندار، لداخ تبدیل ہونے والے سرکاری ملازم، یاتری وغیرہ شامل تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دور دور سے لداخ کی جھیلوں میں بسیرا کرنے کے لئے پرندے پہنچ جاتے تھے۔ چوتھے باب تک ان کا ذکر ہے آگے کے ابواب میں آزادی سے پہلے کی لداخ کی

پسماندگی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کھینچی گئی ہے جیسے جب لداخ میں سڑک نہیں بنی تھی۔ گاڑی نہیں تھی ۔ہوائی جہاز سے لوگ ناآشنا تھے۔ ٹارچ اور ریڈیو کا کچھ آتا پتا نہیں۔ جب لوگ توہمات پر یقین رکھتے تھے عبدالغنی شیخ توہمات کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

"لوگ کہتے تھے کہ کبھی فوٹو نہ لینے دو اس سے عمر چھوٹی ہوتی ہے۔

کسی کا سایہ اپنے پر پڑنے دینا بدشگون سمجھا جاتا تھا۔

سیڑھی کے نیچے چلنا بدنصیبی سے تعبیر کی جاتی تھی۔

آپس میں بات چیت کرتے دوران منہ پر ہاتھ رکھتے تا کہ دوسرے کی روح جسم میں داخل ہو کر نقصان نہ پہنچائے۔

جسم پر کالا داغ اقبال مندی کی علامت تھی۔

کسی جگہ پاگل ہو تو وہ اُس بستی کے لئے فال نیک اور اچھا شگون خیال کیا جاتا تھا۔

بچوں کو نظر بد سے بچانے کے لئے ماتھے پر کالک کا لمبا تلک لگایا جاتا تھا

لوگ پھٹے پرانے کپڑے اوپر پہنتے تھے لوگوں کے خیال میں پھٹے پُرانے کپڑے نظر بد کو روکنے کے ضامن بھی تھے اور انکساری کی علامت بھی تھی۔"

لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے جیوتشی اور نجومی کے مشوروں پر عمل کرتے تھے۔ حجام حکمت کرتا تھا اور "لابا" یا کاہن اپنی طاقت سے بیماری کا علاج کرتا تھا لوگ بُھوت پریت پر اعتماد رکھتے تھے۔ ناول میں بھوت پریتوں کے کئی اقسام کا ذکر بھی کیا گیا ہے پھر ۱۹۴۷ء میں قبائیلی حملہ آوروں کا بھی تذکرہ ہے۔ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ جہاں پورے ملک میں ذات پات اور مذہب کے نام پر قتل وخون کا بازار گرم تھا وہاں لداخ ان چیزوں سے کوسوں دور تھا۔ مصنف لداخ کے ایک دیہات گُوکشو کا ذکر کرتا ہے جہاں ایک بھائی مسلم ہے تو دوسرا بودھ ہے کسی کا نام آدھا مسلم ہے تو آدھا بودھ ہے کوئی خود مسلم ہو تو اس کے بھائی ماموں، خالہ، چچا وغیرہ بودھ تھے۔ یہی حال ایک بودھ کا بھی تھا۔

'وہ زمانہ' میں عبدالغنی شیخ نے لداخ کے سود خور زمینداروں ، سرکاری اہلکاروں اور بارسوخ افراد کا لوگوں پر ظلم وزیادتی کی روداد کی بھی عکاسی کی ہے اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے مشاغل ، بچوں کے کھیل کود ، میلوں تہواروں کو بھی افسانوی انداز میں پیش کیا ہے عورتوں کے بناؤ سنگھار کا اپنا پیمانہ تھا شمپو ، کریم وغیرہ نہیں تھے عورتیں جھاڑی بوٹیاں وغیرہ استعمال کرتی تھیں کھیلوں کے بارے میں مصنف یوں رقمطراز ہے:

> ''لداخ میں مختلف موسموں میں مختلف کھیل اور مشغلے ہوتے ہیں گوقلو، مونگلو کھیلنا ، یخ بستہ برف پر پھسلنا سرمائی کھیل ہے مونگلو ، بکری کے ٹخنے کی چھ کون والی چھوٹی اور موہنی سی ہڈی کو کہتے ہیں یہ کھیل عموماً بودھوں کے سالانہ تہوار 'لوسر' کے دنوں کھیلا جاتا ہے پولو فٹ بال ، ہاکی لداخ کے مقبول کھیل ہیں جبکہ پتنگ بازی ، تیراندازی ، آپوکقلو ، اپچو لولو ، تتلو (آنکھ مچولی) ، اپوگونجونگ ، کھیل موسم سرما میں کھیلے جاتے تھے لڑکیوں میں بھیڑ اور بھیڑیا یا Wolf and Lamb کا کھیل مقبول تھا''

لداخ میں ''لوسر'' ایک اہم تہوار ہے جو بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اس میں اعلیٰ خاندان کی عورتیں تقشوس ناچ پیش کرتی ہیں ۔ اس کے ساتھ اور تہواروں کا بھی ذکر ہے جن میں میلہ دسمو چھے ، ستورلوق وغیرہ قابل ذکر ہے ۔ آزادی کے بعد بدلتے ہوئے لداخ اور مختلف تبدیلیوں کا تذکرہ ہے جیسے ہوائی جہاز کا لداخ میں آنا ، گاڑیوں کا چلنا ، سکول اور شفاخانے کا قیام ، ریڈیو ، گیس ، پریشر کوکر ، سلائی مشین ، بجلی ، ٹیلی فون ، ٹیلی ویژن وغیرہ کا چلن شامل ہے ۔

سڑک کی تعمیر کے بعد ۱۹۶۰ء کی دھائی میں اندرونی ملک سے گوناگوں لوگ آتے ہیں یہ تہذیبی اور ثقافتی یلغار تھی ان میں ناچ سنگیت کی منڈلیاں بھی تھیں فلمی ستاروں کی ٹولیاں بھی تھیں دست شناسوں اور دوا فروشوں کے جتھے بھی تھے ، عبدالغنی شیخ نے ان پر بھی مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے ۔ آخری ابواب میں موصوف نے پرانی اور نئی نسل کے درمیان Generation Gap کو مختلف کرداروں کی معرفت سے اجاگر کیا ہے کہ کس طرح یہ نئے ذہن کے لڑکے اپنے آباواجداد کے راستے

سے انحراف کرتے ہیں اور پُرانی ڈگر پر چلنا ان کو گوارہ نہیں ہوتا۔ بیرونی لداخ سے تعلیم حاصل کر کے لداخ آنے والے اس نئی نسل کے جوانوں کا زوایہ نگاہ بڑوں سے جدا ہوتا ہے دراصل موصوف یہ دکھاتا ہے کہ مغربی لباس اور رنگ ڈھنگ آج لداخی نوجوان نسل کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے اور وہ اس مغربی کلچر میں پوری طرح رنگ چکی ہے۔

جہاں تک ناول کی زبان کا تعلق ہے سادگی، سلیس اور عام فہم ہے۔ کہیں کہیں مقامی الفاظ کا برمحل استعمال ہوا ہے۔ ناول میں منظر نگاری اعلیٰ پایہ کی ہے لداخ کا ماحول ہُنر مندی سے پیش کیا گیا ہے مکالمے بھی اس ماحول کے ساتھ میل کھاتے ہیں اور کرداروں کا انتخاب بھی بڑی خوبی سے کیا گیا ہے ناول میں پہلے سے طے شدہ منضبط پلاٹ نہیں ہے مگر مختلف واقعات کی کڑیوں کو سلیقے سے جوڑ دیا ہے۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہے کہ ''وہ زمانہ'' دراصل ایک تاریخ ہے جس کو ناول کا روپ دیا گیا ہے اور جسے مصنف نے اپنے مشاہدات کے بل بوتے اور یادداشتوں کے سہارے ایک منفرد اسلوب دینے کی کوشش کی ہے۔ ناول کے مطالعہ سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ عبدالغنی شیخ کو لداخ کی تاریخ تہذیب و ثقافت کی پوری جانکاری ہے، جسے مصنف نے چابک دستی سے فکشن میں ڈھالا ہے اور ریاست جموں و کشمیر کے اردو ادب میں ایک تاریخی ناول کا اضافہ کیا ہے۔

دل ہی تو ہے:

'دل ہی تو ہے' ایک رومانی ناول ہے جس میں ناول نگار نے واقعات کو سیدھے سادے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اپنے تخیل کی مدد سے ان میں رنگ آمیزی کی ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے لداخ کے تاریخی پس منظر میں یہ ناول لکھا ہے۔ جب لداخ کو سیاحت کے لئے واگزار کیا گیا اور لوگوں کی زندگی میں بتدریج دوررس تبدیلیاں آئیں۔ اس کے لئے ان کو رومانیت سے بھرپور ایک ماحول ملا ہے۔ عبدالغنی شیخ کو دراصل بچپن سے ہی تاریخ سے دلچسپی تھی وہ ناول کے آغاز میں خود لکھتے ہیں:

''۱۹۷۰ء کے لیہہ ماحول اور یورپی سیاحوں کے پس منظر پر لکھا ہوا ایک دلچسپ رومانی ناول''

عبدالغنی شیخ نے اس ناول میں لداخ کی تاریخ ثقافت، رہن سہن، اور رسم ورواج وغیرہ پر قلم اُٹھا کر اسکو ایک رومانی انداز میں پیش کیا ہے اور جس میں وہ کامیاب بھی ہوگئے ہیں۔ کیونکہ تاریخ جیسے خشک موضوع کو چھونا سب کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے اپنے گہرے مطالعہ، غور فکر اور سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع کو اس اسلوب سے ترتیب دیا ہے کہ رومانی فضا میں ہم بدلتے لداخ سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آتی ہے لداخ کے ننگے پہاڑ اور ریتلے میدان جو صدیوں سے خاموش اور گُم تھے اچانک سیاحوں کی آمد سے جاگ اُٹھتے ہیں اور کچھ سیاح تو ناول کے مرکزی کردار سونم کے ساتھ بس میں سفر کر رہے ہیں جن کو سونم اپنے دیس کے متعلق معلومات فراہم کر رہا ہے۔ بس لیہہ کے بس سٹینڈ میں پہنچ جاتی ہے۔ سونم کی آنکھیں بھیڑ میں چچا کو ڈھونڈنے لگیں جو ہر وقت سونم کو لینے آتا تھا لیکن آج سونم چچا سے مایوس ہوگیا لہذا اُس نے بستر اور سوٹ کیس خود ہی اُٹھایا اور چچا کے مکان کی طرف چل نکلا۔ چچا کے مکان میں داخل ہوتے ہی اس کو پتہ چلتا ہے کہ دراصل چچا، چاچی اور ان کا بیٹا سیاحوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اب ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ صرف پیسہ کمانے کا چکر ہے۔ یہاں تک کہ سونم کے کمرے کو بھی سیاحوں کو دیا گیا ہے۔

لیہہ میں دوسرے روز ریڈ کراس کا میلہ تھا لہذا نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان میلوں میں گھومنے جاتے ہیں سونم بھی اپنے دوست جمیل کے ساتھ گیا تھا کہ اچانک ایک نسوانی آواز نے سونم کا نام لیا۔ جس کو سونم پہچان نہ سکا وہ پدماں تھی، اس کے بچپن کی ساتھی۔ بچپن سے ہی سونم اور پدماں ایک دوسرے میں دلچسپی لئے تھے۔ اب چونکہ نو سال پہلے گھریلو حالات نے ان کو ایک دوسرے سے دور رہنے کے لئے مجبور کر دیا تھا جس سے دونوں کا رابطہ منقطع ہوا تھا، دونوں کے چہروں سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آج بھی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ پدماں اب اسکول میں بطور اُستانی کام کر رہی تھی۔ سونم سے ملاقات کے بعد پدماں کی زندگی اور طور طریقوں میں یک لخت تبدیلی آئی۔ سونم نے اب عارضی طور ٹورسٹ گائیڈ کا کام شروع کیا اور سیاحوں کو لداخ کے مختلف تاریخی مقامات دکھانے شروع کئے چونکہ سونم گاؤں کا پہلا ڈاکٹر تھا لہذا سارا گاؤں اُس کی عزت کرتا ہے پدماں کے گھر والے ایک دن سونم کو گھر بلاتے ہیں اور پدماں کی نانی سونم کی ماں ڈولکر سے پدماں اور سونم کی شادی کی بات کرتی ہے

اور خوشی خوشی رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ لیکن کہانی میں نیا موڑ اس وقت آتا ہے جب سونم نیماں کو دیکھتا ہے فراک شلوار کے ہالے میں دودھ کی طرح سپید، چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، گھنی زلفیں اپنے چوڑے شانوں پر چھٹکائے ہوئے وہ خراماں خراماں چل رہی تھی۔ دل ہی دل میں سونم سوچنے لگا کہ کیا کوئی لڑکی اتنی مکمل اور اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے نیماں ہزاروں میں ایک ہے یہ ایسی لڑکی ہے جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کو مجنون اور رانجا بنا سکتی ہے۔ سونم کے دل میں خیال آتا ہے کہ شادی بہر حال پدماں سے ہی ہوگی لیکن التفات مجھے نیماں کا چاہے اور شام تک سوچتا رہا کہ کاش یہ لڑکی اتنی خوبصورت نہ ہوتی۔ آرمی ترشول اور سول ٹیم کے درمیان پولو میچ ہوتا ہے پولو گراونڈ میں بہت سارے تماشائی ہوتے ہیں اور گیند اچھل کر نیماں کو لگتی ہے چونکہ سونم یہاں کا پہلا ڈاکٹر ہے لہذا اس کو بلایا جاتا ہے اور وہ نیماں کو اپنے ساتھ ہسپتال لے جاتا ہے پھر کچھ دنوں بعد وہ نیماں کو بازار میں دیکھتا ہے اور اس کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے سامنے اپنے پیار کا اظہار کرے لیکن سونم کا پیار اُس وقت شرمندۂ تعبیر ہو جاتا ہے جب نیماں اس کے پیار کو ٹھکرا کر کسی اور سے شادی کی خواہش کرتی ہے۔ سونم اپنی ساری توجہ نیماں کی طرف دیتا ہے جس سے پدماں کا حال بے حال ہو جاتا ہے وہ دراصل سونم کو بے حد پیار کرتی ہے اور سونم کو نیماں کے ساتھ دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر پاتی۔ آخر کار نشیب و فراز کے بعد قصہ کا اختتام اسی پہ ہوتا ہے کہ سونم کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور وہ پدماں سے معافی مانگتا ہے اور پدماں اس سے معاف بھی کرتی ہے۔

پلاٹ:

ناول کا پلاٹ مربوط ہے ناول میں پلاٹ، موضوع اور کرداروں پر عبدالغنی شیخ کی مضبوط گرفت نے اس میں ایک ایسی کشش اور تاثر بھر دیا ہے جو قاری کو ایک لمحے کے لئے بار نہیں گزرتا۔ عبدالغنی شیخ نے ناول کو اپنی فنکارانہ صلاحتیوں سے اس کے واقعات کو ایک لڑی میں پرویا ہے۔ مصنف نے عالمی ادب کے شاہکار ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور اُن سے فیض حاصل کیا ہے۔ انھیں پوری طرح احساس تھا کہ پلاٹ ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے یہ نہ ہو تو ناول کی عمارت اُٹھ نہیں سکتی۔ اس لئے عبدالغنی شیخ نے اپنے ناول ''دل ہی تو ہے'' کے پلاٹ کو تعمیر کرنے میں اپنی تمام تر فنکارانہ صلاحیتوں کو

بروئے کار لایا جس کی عمدہ مثال ہمارے سامنے ہے۔

کردارنگاری:

قصہ اور پلاٹ کے بعد ناول کے اجزائے ترکیبی میں کردارنگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کرداری نگاری کے بغیر نہ کہانی بیان کی جاسکتی ہے اور نہ پلاٹ کی تعمیر ہوسکتی ہے ''دل ہی تو ہے'' تین مرکزی کرداروں پر مبنی ہے۔ سونم، پدماں اور نیماں، جن کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹے چھوٹے بہت سارے کردار ہیں۔ ناول کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کے تمام کردار اپنی جگہ مکمل ہیں اور اپنے ماحول اور مخصوص تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناول کا ہیرو سونم اور پدماں اس کی ہیروئن کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس ناول کے تمام کردار شروع سے آخر تک ناول کے کنیوس پر بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا رول ادا کرتے ہیں اور کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں ان میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ دراصل عبدالغنی شیخ کے کردار وقت کے کٹھ پتلی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی زندگی خود جی رہے ہیں ان میں کسی قسم کی بناوٹ یا سنگار نہیں ملتا اور یہ کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ علی باقر اُن کی کردارنگاری کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

> ''عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے صحت منداور توانا لگتے ہیں وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہیں اور سماج اور تہذیب کے بلند رشتوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں شیخ حقیقت نگاری کے قائل ہیں اور اپنے کرداروں کے احساسات نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں''

مکالمہ نگاری؛ ناول میں مکالمہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ناول کی کامیابی اور ناکامی کا بڑی حد تک اس پر دارومدار ہوتا ہے۔ یہ ناول مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی ایک منفرد ناول ہے۔ دراصل عبدالغنی شیخ کو مکالمہ نگاری میں بڑی مہارت حاصل ہے سبب یہ ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں سے ان کا واسطہ رہا ہے اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس کردار کی زبان سے کیا مکالمے ادا ہوسکتے ہیں شیخ انسانی نفسیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں خاص کر نسوانی کرداروں پر اُن کی پوری گرفت ہے اور ہر کردار کے مُنہ سے وہی مکالمہ ادا کراتے ہیں جو اس سے مطابقت رکھتا ہے جیسے:

''سونم میں نے پہلے ہی بہت زخم کھایا ہے'' ۔۔۔ پدماں کہتی ہے۔

''تم میری زخم کا مرہم ہو۔ میری درد کی دوا ہو۔ میں ڈوب رہا ہوں''

پدماں نے کچھ جواب نہیں دیا۔

''پچھلے ایک ہفتے سے میں سو نہ سکا''

''آپ ایک ہفتہ کی بات کر رہے ہیں میں پچھلے آٹھ سال سے آپ کی یاد میں جل رہی ہوں'' پدماں بولی۔

''آج نیاں چلی گئی۔ لیکن کل اور کوئی نیاں ہوگی''

''سونم جھینپ گیا۔ وہ پدماں کو ہمیشہ سیدھی سادی اور کم گو سمجھتا تھا''

''پدماں میں دو چار دن تک سرینگر جا رہا ہوں''

''جہاں بھی جائیں آپ لوگوں کا کیا ہے جب چاہیں دھکا دیا۔ جب چاہیں پیار کے دو بھول کہہ کر منا لیا۔ ہم پہ کیا گذرتی ہے وہ آپ کیا جانیں۔۔''

پدما بولی۔

منظر کشی:

منظر کشی سے ناول کی دلکشی اور تاثر میں اضافہ ہو جاتا ہے منظر کشی کامیاب ہو تو جھوٹا قصہ بھی سچا لگنے لگتا ہے اس ناول یں عبدالغنی شیخ نے منظر کشی کی طرف مکمل دھیان دیا ہے وہ لفظوں اور جملوں سے تصویر بنانے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں پدماں کے گھر کا منظر اس طرح بیان کیا ہے کہ پورا ماحول ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے جیسے

''چھت پر گھاس کے پولے اور اوپلے، نچلی منزل میں بھیڑ بکریاں کے باڑے اور گاؤ خانہ، چھوٹا سا آنگن، صاف ستھرے کمرے، گاوں کا ایک جانا پہچانا گھر ہے باورچی خانہ میں کالک لگے سیاہ طاق پر برتن، دیگچے اور رکابیاں قرینے سے سجائی ہیں۔ ننگے فرش پر سبز گھاس کے ایک ٹکڑے پر کلھیا میں لسی رکھی ہے جس میں مکھن کا ایک پیڑا تیر رہا ہے چنگیر میں ایک کپڑے میں بھنے

ہوئے مٹر کے آٹے سے پکائے گئے تکونے ٹکڑے رکھے ہیں۔ پاس میں ایک ڈبیا میں پیسی ہوئے سرخ مرچ ہے سامنے مٹی کے دو برتن ہیں۔ ایک برتن میں دوائی رکھی ہوئی ہے۔ چھکے میں مکھن کا ایک بڑا ڈلا ہے۔ پرات میں آٹا گوندھا ہوا ہے کھونٹے سے اون کے کاتے ہوئے کئی گولے لٹکے ہوئے ہیں اور ایک تھال میں پونی دھری ہے فرش پر ایک ننھا صحت مند بچہ غوں غوں کر رہا ہے"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالغنی شیخ نے ناول میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرنے کے لئے نہیں بلکہ صرف منظر نگاری کا کمال دکھانے کے لئے مختلف تصاویر کھینچی ہیں۔

اسلوب:

یہ ناول رومانی طرز نگارش کا ایک عمدہ ناول ہے۔ اس ناول کی زبان نہایت عام اور گفتگو کی زبان ہے جو ہم اور آپ روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ ترشے ترشائے جملے اپنے اندر بڑی لطافت اور نغمگی رکھتے ہیں۔ دراصل عبدالغنی شیخ کے پاس لفظوں کا خزانہ ہوتا ہے اور جنھیں وہ اچھی طرح استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتا ہے اس ناول کے اسلوب نگارش سے ناول نگار کے تخلیقی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے وہ ہر ایک لفظ سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں دراصل عبدالغنی شیخ کو عورتوں کی زبان، محاوروں اور ضرب الامثال پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے جذباتی تقریریں اور رنگین بیانی سے عموماً پرہیز کرتے ہیں۔ ناول میں انگریزی ہندی کے ساتھ کہیں کہیں لداخی الفاظ کا خوبصورت استعمال ہوا ہے۔ یہ الفاظ اپنے بولنے والے کرداروں کی شخصیت کے ساتھ ان کی تہذیب اور ماحول کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ مکالمے مختصر مگر فکر اور جذبے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس ناول میں نہ طنز کی نشتریت ہے اور نہ مصنف کے لہجے میں شدت ہے۔ بلکہ صاف ستھرے الفاظ میں مصنف نے اپنی بات پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ غالباً ان خوبیوں کی وجہ سے ناول کو ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے اس سال (۱۹۷۸ء) کا اردو کی بہترین تصنیف قرار دی۔

عبدالغنی شیخ فی الحال تحقیقی اور تخلیقی مشاغل میں مصروف ہیں اور لیہہ میں قیام پذیر ہیں۔

......●●●......

افسانہ

☆......عبدالغنی شیخ

جہاندیدہ

عبدالرزاق جہاندیدہ کا فون آج اچانک بند ہوا۔ اس کی اہلیہ رقیہ بانو پریشان ہوئی۔ جہاندیدہ ہر دوسرے تیسرے روز بلا ناغہ فون کرتا تھا۔ اس نے یہ ہدایت دی تھی کہ اس کو فون کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ وہ ایک جگہ نہیں ٹکتا ہے۔ اپنے مالک مسٹر جان جیکسن کے ہمراہ انہیں دیس بدیس گھومتا رہتا ہے۔ ویسے بھی بیرون ملک فون کرنا مہنگا رہتا ہے۔ اس کے باوجود رقیہ نے جہاندیدہ کے دونوں فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں فون مسلسل سوئچ آف آتے تھے۔ رقیہ نے جہاندیدہ کے بھائی عبدالقادر اور کئی دوستوں کو جہاندیدہ کا فون نہ آنے کا ذکر کیا۔ عبدالقادر اور دوستوں نے کہا کہ انہیں بھی پچھلے تین چار ہفتے سے کوئی فون نہیں آیا۔ ایک دوست بولا: 'جہاندیدہ جیکسن صاحب کے ساتھ شہر شہر، جنگل جنگل اور صحرا صحرا گھوم رہا ہوگا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'

ایک ماہ پہلے جہاندیدہ نے رقیہ کے اکاونٹ میں تیس لاکھ روپے جمع کئے تھے اور فون پر رقیہ کو اس کی اطلاع دی تھی۔

عبدالرزاق جہاندیدہ ہر سال نومبر میں جان جیکسن کے ہاں کام کرنے امریکہ جاتا تھا اور چھ ماہ بعد اپریل میں گھر لوٹتا تھا۔ جب چار ہفتے کوئی فون نہیں آیا تو عبدالقادر نے جان جیکسن کو ای میل کیا اور جہاندیدہ کی خیر خیریت پوچھی۔ جان جیکسن کی بیٹی ایمیلی نے جواب میں کہا کہ پاپا کو انتقال ہوئے سات سال ہوئے ہیں۔ تب سے عبدالرزاق جہاندیدہ امریکہ نہیں آیا۔ ہمیں کوئی علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ اب تو رقیہ اور عبدالقادر سچ مچ فکر مند ہوئے۔ پوچھیں تو کن سے پوچھیں۔ کوئی اتہ پتہ نہیں۔ پچھلے

سات سال سے وہ لیہہ میں اپنی دکان 'جہاندیدہ انٹیک شاپ' بند کر کے امریکہ جان جیکسن کے ہاں کام کرنے کے بہانے گھر سے نکلتا تھا اور اپریل میں لوٹتا تھا۔

لگ بھگ تیس سال پہلے جان جیکسن اور مسز سارہ جیکسن لداخ سیاحت پر آئے تھے۔ تب عبدالرزاق ٹیکسی چلاتا تھا۔ اس نے گریجویشن کیا تھا اور ڈھنگ کی کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملی تھی۔ جان جیکسن اور مسز جیکسن نے اس کی ٹیکسی میں کئی سیاحتی مقامات دیکھے۔ میاں بیوی اس کی شائستگی اور کارکردگی سے بڑے خوش ہوئے۔ جہاندیدہ بڑا چاق و چوبند اور وقت کا پابند تھا۔ ہر دم چوکس رہتا تھا۔ بڑے تپاک سے گاڑی کا درواز کھولتا اور بند کرتا تھا۔ علاقے کی جانکاری اور انگریزی جاننے کی وجہ سے انہیں گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑی۔ جان جیکسن نے ایک ہفتے کا ٹریکنگ بھی کی اور جہاندیدہ کو اپنے ساتھ لیا۔ انہوں نے اپنے قیام کے دوران ایک فلاحی تنظیم اور جہاندیدہ کی وساطت سے چند مستحق افراد کی مالی طور مدد کی۔ میاں بیوی کو لگا کہ جہاندیدہ دیانت دار بھی ہے۔

دو سال بعد جان جیکسن دوبارہ لداخ آیا۔ تب وہ اکیلا تھا۔ جان جیکسن نے آہ بھر کر جہاندیدہ کو بتایا کہ اس کی رفیقۂ حیات اس دنیا میں نہیں ہے اور وہ پہلے سے زیادہ سفر کرنا چاہتا ہے۔ جہاندیدہ کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولا: ''میری عمر چھیاسٹھ سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مجھے ایک ہم سفر کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم میرا ساتھی بنو۔''

جہاندیدہ بڑا خوش ہوا اور بولا ''سر میں آپ کی خدمات کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہوں۔''

'مارکو پولو اور ابنِ بطوط کے نام سنے ہیں؟' جان جیکسن نے پوچھا۔

'ہاں جناب! میں نے ان کے بارے میں پڑھا ہے۔ وہ ماضی کے بڑے مہم جو سیاح تھے۔ ابن بطوط نے ہندوستان اور افریقہ کا سفر کیا تھا اور مارکو پولو چین گیا تھا۔ تب پیدل اور گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ ڈاکوؤں کا بڑا خطرہ رہتا تھا۔

'آج سفر زیادہ مشکل نہیں۔ ہمیں جدید دنیا کی سہولیات میسر ہیں۔ جان جیکسن بولا۔

'سر! میں سفر کی کٹھنائیاں برداشت کر سکتا ہوں،' جہاندیدہ بولا۔

جہاندیدہ کو شادی کیئے ہوئے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ نوبیاہی بیوی رقیہ بانو کو اپنے شوہر کا امریکہ جانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔ جان جیکسن نے اس کی کفالت کے لئے بنک میں اس کے نام ایک معقول رقم رکھی۔ لیکن یہ روپیہ شوہر کی جدائی اور اس کی تنہائی کا مداوا نہیں تھا۔ جہاندیدہ اپنی بیوی کو جلدی واپس آنے کا دلاسا دے کر جان جیکسن کے ساتھ امریکہ روانہ ہوا۔

جان جیکسن بوسٹن میں رہتا تھا۔ جہاں جہاندیدہ کو جان جیکسن کے بارے میں دو باتوں کا انکشاف ہوا۔ جان جیکسن ارب پتی تھا۔ الیکٹرونیکس سامان بنانے کے کئی کارخانوں کا مالک تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا بیٹا اور بیٹی اس کا کام دیکھتے تھے۔ دویم، سفر کرنا جان جیکسن کی گھٹی میں تھا۔ اس نے اب تک تقریباً سو ممالک کی سیاحت کی تھی اور مہم جو قسم کا سیاح تھا۔

جان جیکسن بولا، 'رزاق، میں نے چین دیکھا ہے اور افریقہ کے بیس سے زائد ممالک کی سیاحت کی ہے۔ میں دوبارہ چین جانا چاہتا ہوں۔ قدیم سلک روٹ اور صحرائے گوبی کی بادیہ پیمائی کرنا چاہتا ہوں جہاں سے ہوکر مارکوپولو چین گیا تھا۔ کیوں منظور ہے؟'

'سر، آپ کہیں تو میں ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھوں گا۔' جہاندیدہ بولا۔

ایک سال سے زیادہ مدت کے بعد جب وہ گھر لوٹا تو اس کو بتانے کے لئے بہت ساری باتیں تھیں۔

'عبدالرزاق، تم چین گئے ہو۔ دیوار چین دیکھی؟' ایک آدمی نے پوچھا۔

'یہ بھی سوال ہوا۔ چین جائے اور دیوار چین نہ دیکھے۔ زیان شہر میں ہم نے ٹیریکوٹا کے بنائے ہوئے پرانے جنگجو سپاہی دیکھے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ صاحب نے مجھے بتایا یہ مسیح سے تین صدی پہلے کے ہیں۔ یہ مختلف شکل وصورت کے ہیں۔ زیان سلک روٹ کے زمانے کا ایک تاریخی شہر ہے۔ تب یہ چانگن کہلاتا تھا۔

سلک روٹ پر واقع ایک اور قدیم شہر ڈون ہانگ کے بارے میں بتانے کے لئے جہاندیدہ کے پاس بہت کچھ تھا۔ جہاں ایک ہزار غار تھے۔ جہاندیدہ بولا۔ ''چین کی حکومت نے تین سو غاروں کو بند رکھا ہے۔ ان غاروں میں بڑی خوبصورت تصویریں ہیں۔ آج ڈون ہانگ سیاحت کا اہم مرکز ہے

اور ریگستان میں شاہکار آرٹ کی گیلری کہلاتا ہے۔ جیکسن صاحب مجھ سے یہ باتیں نوٹ کراتا ہے اور تصویریں بھی کھینچواتا ہے۔ وہ اپنی سیاحت کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے جہاندیدہ کے چہرے پر ایک چمک آئی۔ صاحب دون ہانگ میں ایک ہفتہ ٹھہرے۔

جہاندیدہ کو گھر آئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ جان جیکسن کا فون آیا کہ ایک ہفتہ تک بنکاک پہنچے۔ رقیہ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ تب سے یہ دستور بن گیا۔ کبھی سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ گھر آتا تھا اور مہینہ ڈیڑھ مہینے کے بعد واپس جاتا تھا۔ تب نومبر میں روانگی اور اپریل میں واپسی والی بات نہیں تھی۔ شروع شروع میں رقیہ کو جدائی بڑی کھٹکتی تھی۔ بعد میں وہ اس کی عادی ہوگئی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ رقیہ نے اپنی خالہ کی ایک لڑکی گود لی تھی۔ جہاندیدہ اخراجات کے لئے رقیہ کے نام بنک میں معقول رقم رکھ کر جاتا تھا اور ضرورت پڑنے پر فاضل رقم بھیجتا تھا۔

جان جیکسن ملک اور بیرونِ ملک کئی فلاحی تنظیموں کو مالی امداد دیتا تھا۔ چند سال بعد جب وہ لیہہ آیا تو فلاحی تنظیموں نے اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی۔ اس موقعے پر رقص وسرود کی ایک محفل کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جان جیکسن نے اپنی تقریر میں عبدالرزاق کی سراہنا کی اور اسے تجربہ کار اور جہاندیدہ قرار دیا۔ تب سے وہ جہاندیدہ کے نام سے مشہور ہوا۔

جہاندیدہ جب بھی گھر آتا، اپنے سفر کے بارے میں نئی نئی باتیں سناتا تھا۔

'یار، تم مصر گئے ہو۔ اہرامِ مصر کیسا ہے؟'

'اہرامِ مصر تو مشہور ہے۔ سب کو معلوم ہے۔ ایک اہرام میکسیکو میں ہے جو AZTEC اہرام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سولہویں صدی کے شروع میں ایزٹیک سلطنت مغرب میں بحراوقیانوس تک اور مشرق میں بحرالکاہل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح یہاں سے نزدیک جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اینکاس تہذیب عروج پر تھی۔ پیرو میں آج بھی اس دور کی یادگاریں موجود ہیں۔'

آتش فشاں پہاڑ کا ذکر چھیڑا تو جہاندیدہ نے اٹلی کے شہر پومپیئی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: آتش فشاں پہاڑ کا بڑا واشگاف دہانہ آج بھی اپنا خوفناک منہ کھولے دو ہزار سال پرانی داستان سنا رہا ہے۔

جس نے پومپئی شہر کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لیا اور ہزاروں لوگوں کو سلگتے بڑھکتے لاوا میں ڈھانپ لیا۔ شہر کے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ یہ بڑا خوبصورت شہر تھا۔ اٹھارہویں صدی میں اس کی کھدائی ہوئی تھی۔ جان جیکسن کو پرانی یادگاریں اور تاریخی کھنڈرات دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ انہوں نے اجنتا، ایلورا، مہنجوداڑو اور ہڑپا بہت پہلے دیکھے تھے۔ وہ ہوائی جہاز میں بھر موڈا ٹرا اینگل دیکھنے گئے تھے، وہاں موجود سبھی مجسم سوال بنے جہاندیدہ کو دیکھنے لگے۔ جہاندیدہ بولا یہ مغربی بحرالکاہل میں ہے۔ یہاں متعدد سمندری جہاز اور ہوائی جہاز پُراسرار طور سمندر میں غرقاب ہوئے تھے۔ سنی سنائی روایت کے مطابق زیر آب کوئی مقناطیسی قوت انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔'

'اگلے سال کیا پروگرام ہے؟' کسی نے سوال پوچھا۔

'انہوں نے نہیں بتایا۔ کبھی وہ روانگی سے دو تین دن پہلے بتاتے ہیں۔ سردیوں میں ہم گلگت، ہنزا اور چیلاس میں تھے۔ پورے خطے میں سنگ تراشی کے خزینے ہیں۔ سلک روٹ کی شاخ کے ان راستوں پر ہزاروں فوجی، یاتری، تاجر اور مبلغ گزرے تھے۔ ان میں بہتوں نے چٹانوں پر اپنی اور دوسروں سے تراشوائی ہوئی ہزاروں تصویریں اور تحریریں چھوڑی ہیں۔ بہت ساری تصویروں پر سنگ تراشوں کے نام دیئے گئے ہیں۔ تصویروں میں بدھ، دیوی دیوتا، اپسرا، جانور، پرندے وغیرہ شامل ہیں۔ انہیں دیکھ کر جان جیکسن بولے۔ یہ پورا خطہ سنگ تراشی کی جیتی جاگتی ایک بڑی گیلری ہے۔ مجھے تو امریکہ میں ماؤنٹ روش مورے پر تراشے گئے چار امریکی صدور کے دیو نما بڑے بڑے چہرے پسند آئے۔

یہ کون کون سے صدر تھے؟ کسی نے پوچھا۔

جہاندیدہ نے اپنے سمارٹ فون میں ماؤنٹ روش مورے پر ان کی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا: 'یہ جارج واشنگٹن، ابراہیم لنکن، تھامس جفرسن اور تھیوڈر روز ویلٹ ہیں۔ صاحب نے بتایا کہ سنگ تراشوں نے انہیں تراشنے میں چودہ سال لگائے تھے۔'

'تمہیں اب تک کون سی جگہ سب سے زیادہ پسند آئی؟' ایک نے پوچھا۔

'ایک جگہ ہو تو بتاؤں۔ کن کن کے نام لوں؟ البتہ دو منظر نامے میرے دل و دماغ پر نقش

ہو گئے ہیں۔ ایک امریکہ میں گریٹ کین یون اور دوسرا آبشارِ نیاگرا۔ ہم کینیڈا میں ٹورنٹو میں تھے، جہاں سے ہم آبشار نیاگرا دیکھنے گئے۔ دنیا میں خوبصورت جگہوں اور شہروں کی بہتات ہے۔ پچھلے ماہ ہم استنبول میں تھے۔ بڑا خوبصورت شہر ہے۔ یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ بحر مارا اور بحر اسود کو ملاتا ہے اور آبنائے بوسفورس شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا ہے۔ شہر میں پرانے اور نئے بہت سارے قابلِ دید مقامات اور یادگاریں ہیں۔

'چچا جہاندیدہ' ایک لڑکا بولا؛ 'آپ شہروں اور ملکوں کے بارے میں بتاتے ہوئے نہیں تھکتے ہیں۔ کچھ خوبصورتی کے بارے میں بتائیں۔'

'برخوردار۔ کس خوبصورتی کی بات کر رہے ہو؟'

'خوبصورت لڑکیوں کی۔'

جہاندیدہ اور وہاں موجود سبھی لوگ ہنسے۔

'جان جیکسن بڑے حُسن پرست ہیں۔'

'اور آپ؟'

'میں بھی حسن پرست ہوں۔'

سبھی ہنسے۔

'جان جیکسن حسن پرست ہیں۔ مگر ہوس پرست نہیں۔ ابھی تو وہ بزرگ ہیں۔ ان کا ایک دوست اور ہم سفر ڈیوڈ جانسن کہتا ہے۔ اس نے جیکسن کو کبھی کسی عورت کے پیچھے جاتے نہیں دیکھا۔ کبھی قحبہ خانے کا رُخ کرتے نہیں دیکھا تاہم وہ بلا کا حسن پرست ہے۔ میں نے بھی دیکھا کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک جاتا ہے۔ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ بدتمیزی سے نہیں۔ لڑکی کو پتہ نہیں چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ خوبصورت لڑکیاں ہم بہت دیکھتے ہیں لیکن حسین وجمیل لڑکیاں خال خال ہوتی ہیں۔ ایک جاذبِ نظر چہرہ شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ 'وہ کیا ہوتا ہے سر؟' میں نے پوچھا۔ ان کا جواب تھا۔ الفاظ میں کوئی اسے بیان نہیں کر سکتا ہے۔ صرف محسوس کر سکتا ہے۔ اس کو دیکھ کر انسان پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ دل و دماغ پر انجانا سا نشہ چھا جاتا ہے اور بے ساختہ قدرت کی کاریگری کو داد دینے کو جی چاہتا

ہے۔ کچھ توقف کے بعد جہاندیدہ بولا۔لندن کے ایک پارک میں ایک لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے اور مجھے بولے۔ 'رزاق، اس چہرے کو ذرا دیکھو، کتنا unique اور جاذب نظر ہے! چہرے کا حسن بڑھانے میں خوبصورت آنکھیں اہم ہیں۔' کیا وہ چہرہ unique اور جاذب نظر تھا؟ ایک دوست نے پوچھا۔

'بالکل تھا۔ نشہ آگیں اور دل نشیں۔ جان جیکسن حسن شناس بھی ہے۔ روم کے مال میں ایک چہرہ دیکھ کران کے قدم رُک گئے۔ بیروت کے ہوائی اڈہ پر ایک لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولے، 'ایسا جاذبِ نظر چہرہ ہزاروں میں ایک ہوتا ہے۔' وہ ایک عرب لڑکی تھی۔ جس نے اپنے بالوں کو سکارف میں چھپایا تھا۔ سنگاپور کے ایک ہوٹل کے لاؤنج میں ایک ایسے چہرے کی جھلک دیکھی۔ دیر تک وہ اس کا گُن گاتے رہے۔ تاشقند میں ہم جان جیکسن کے بے تکلف دوست خواجہ رحیموف کے مہمان تھے۔ خواجہ کی تیرہ سالہ خوبرو بیٹی کو دیکھ کر وہ خواجہ سے مخاطب ہو کر بولے۔

'رحیموف، تمہاری بیٹی ہزاروں میں ایک ہے۔'

خواجہ قہقہہ زن ہوئے اور جان جیکسن نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ 'بیٹی، تم اپنے حسن سے انجان ہو۔ سیدھی سادی اور بھولی بالی ہو۔ وہ دن دور نہیں ہے، جب تم تاشقند کے ہزاروں جوانوں کے دل کی دھڑکن بنوگی۔

لڑکی سچ مچ بھولی بالی تھی۔ کوئی ردعمل نہیں دکھایا۔

جس سال اس نے لیہہ میں نوادرات کی دکان کھولی، اسے چار ماہ پہلے وہ اپنے ساتھ جان جیکسن کا سفرنامہ ساتھ لایا۔ یہ سفرنامہ رنگین تصویروں سے مزین تھا۔ اس میں اس کے کئی فوٹو تھے۔ ایک میں وہ ریوڈی جینرو میں جان جیکسن کے ساتھ ایک ہنڈولے میں بیٹھا تھا۔ دوسرے میں لندن میں میڈم توسیڈو کے میوزیم میں نپولین بوناپارٹ کی مومی مورت کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک اور فوٹو میں وہ اور جان جیکسن اُلن بٹور میں دو قد آور گھوڑوں پر سوار نظر آرہے تھے۔

جب سے دکان سنبھالی، جہاندیدہ نے سفر کی روداد سنانا چھوڑ دیا تھا۔ جب پوچھا جاتا تو وہ جواب میں کہتا تھا، مسٹر جیکسن اب چھیاسی سال کے ہیں۔ سفر نہیں کرتے ہیں۔ وہ اکثر گھر پر رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دفتر جاتے ہیں۔ میں اکثر دفتر میں کام کرتا ہوں۔ وہ اکثر فخر سے کہتا، 'میں نے

جان جیکسن کے ساتھ بیس سال کے دوران پچھتر ممالک کی سیاحت کی ہے۔'

چھ ماہ گزار کر آغازِ بہار میں جب وہ گھر لوٹتا اور کوئی جان جیکسن کا ذکر چھیڑتا تو وہ پہلے ان کی عمر میں ایک سال کا اضافہ کرتا اور ان کی روداد سناتا۔ پانچ سال بیت چکے تھے۔ ایک گھوڑے والے نے جوان کے ہمراہ ٹریکنگ پر گیا تھا، صاحب کی خیر خیریت پوچھی تو جہاندیدہ نے کہا۔'صاحب اب اکیانوے سال کے ہیں۔ پیرانہ سالی کی وجہ سے عصا لے کر چلتے ہیں۔

ادھر رقیہ بانو اور عبدالقادر غمزدہ ہی نہیں تھے بلکہ بڑے شش و پنج میں تھے کہ عبدالرزاق گیا تو کہاں گیا۔ سردیوں کے چھ ماہ وہ کہاں غائب رہتا ہے۔ عبدالقادر نے رقیہ سے کہا۔ رزاق کے ذاتی سامان وغیرہ ہوں گے۔ ان میں ڈھونڈو شاید کوئی سراغ لگے۔

رقیہ نے جواب دیا۔'میں نے ان کا سوٹ کیس کھنگالا۔ دونوں بیگ کھول کر دیکھا اور ٹرنک میں ڈھونڈا، کچھ نہیں ملا۔ اب صرف چرمی صندوق ہے، جس پر تالا لگا ہے۔ میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے۔

'تالا توڑ ڈالو' عبدالقادر نے کہا۔

دونوں نے مقفل صندوق کو کھولا۔ بڑے بڑے لفافوں میں کاغذات رکھے تھے۔ ایک ایک کاغذ کو پڑھا۔ ایک لفافے میں چھ سات سال کی ایک بچی کا فوٹو نکلا۔ دونوں بچی کو نہیں جانتے تھے اور قدرے حیران ہوئے کہ بچی کون ہوسکتی ہے۔ ایک استعمال شدہ چیک بک نکلا، جس کے حاشیے پر ربینہ دیدی، نسیمہ بانو، جمیلہ خانم اور سلمیٰ خان جیسے نام تھے۔ رقیہ نے کہا وہ کئی غریب عورتوں کی مدد کرتے تھے۔ شاید یہی عورتیں ہوں گی۔

صندوق کے کونے میں پاکٹ سائز کی ایک ڈائری نکلی۔ یہ چار سال پرانی ڈائری تھی۔ الٹ پلٹ کر دیکھا تو گوا میں نوادرات کا کاروبار کرنے والے کسی تاجر کا پتہ تھا۔ گوا کے پتہ پر عبدالقادر قدرے چونکا۔ ڈھائی ماہ پہلے میں نے رزاق کو فون کیا تھا۔ وہ گوا میں تھا۔ بولا۔ جیکسن صاحب گوا آئے ہیں۔ تین چار سال پہلے میں نے فون کیا تھا۔ تب بھی گوا میں تھا۔ اور بولا جیکسن صاحب گوا گھومنے آئے ہیں۔'

رقیہ، ہمیں اس آدمی سے رابطہ قائم کرنا چاہئیے۔ شاید وہ ہمارے خط کا جواب نہ دے۔ بہتر ہے کہ ہمیں اس سے ملنے گوا جانا چاہئیے۔ چنانچہ دونوں گوا روانہ ہوئے۔

پونیت شاہ نام کا یہ آدمی گجرات کا رہنے والا تھا اور نوادرات کا کاروبار کرتا تھا۔ عبدالرزاق کے بارے میں پوچھا تو بولا۔ 'چند سال پہلے ہمارا لین دین تھا۔ اب کوئی لین دین نہیں ہے۔ ہماری ملاقات ہوئے بڑی مدت ہوئی ہے۔ آپ اولڈ مارکیٹ جائیے اور جہاندیدہ انٹیک شاپ کے بارے میں پوچھئے۔'

'جہاندیدہ انٹیک شاپ!' عبدالقادر حیرت سے بولا۔

'ہاں' وہاں ان کو دکان لگائے چھ سات سال ہوئے ہیں۔ آپ ان کا کیا لگتا ہے؟

'میں ان کا رشتہ دار ہوں۔'

'آپ کو معلوم نہیں ہے؟ آپ مارکیٹ جا کر معلوم کریں۔ اغل بغل کے دکاندار سے پتہ چل جائے گا۔ وہ وہیں بیٹھتا ہے۔'

رقیہ اور عبدالقادر حیران تھے۔

'معاملہ بڑا پُر اسرار لگتا ہے رقیہ' عبدالقادر بولا۔

'رزاق نے دکان کے بارے میں کبھی نہیں بتایا' رقیہ بولی۔

جہاندیدہ کی انٹیک شاپ (Jahandida Antique Shop) پانے میں انہیں کوئی دقت نہیں آئی۔ لیکن عبدالرزاق کی جگہ کوئی اور آدمی دکان پر بیٹھا تھا۔

عبدالرزاق کے بارے میں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ عبدالرزاق نے تین ماہ پہلے دکان اور سامان اس کو فروخت کیا۔ عبدالرزاق کی صحت ٹھیک نہیں رہی تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ کاروبار چھوڑ دیا۔

'ابھی وہ کہاں ہیں؟'

'اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ پنجم میں رہتا ہے۔'

'بیوی اور بچی!' رقیہ چلائی۔

'ہاں، میں پتہ دیتا ہوں۔ آپ لوگ کون ہیں؟'

'ہم عبدالرزاق کے رشتہ دار ہیں،' عبدالقادر بولا۔

اس آدمی نے کاغذ کی چٹ پر پتہ لکھ کر دیا۔

'رقیہ، معاملہ زیادہ پیچیدہ اور پُر اسرار ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے دکان پھر مکان اور اب بیوی، بچی۔ عبدالقادر نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

رقیہ پر رقت سی کیفیت طاری تھی۔ چہرہ فق تھا۔ اس کے لب پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

'میرے دل میں بڑا وسوسہ اٹھ رہا ہے۔ وہاں جا کر ہمیں کیا جواب ملے گا۔

عبدالقادر بولا، رقیہ اگر رزاق گھر پر نہ ہوں تو اس عورت کو اپنی شناخت نہیں بتانا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ نہ کہنا کہ عبدالرزاق کی بیوی ہو۔ نام بھی بدل دینا۔ رشیدہ، رفیعہ۔۔۔؟

دونوں فلیٹ کے دروازے پر پہنچے۔ جس پر نسیمہ بانو کی تختی لگی تھی۔ بیل بجائی اور ایک عورت اور سات آٹھ سالہ بچی نمودار ہوئیں۔

'میں عبدالرزاق کا بھائی عبدالقادر ہوں۔ رشیدہ ان کی ایک عزیزہ ہے۔ ہم عبدالرزاق سے ملنے آئے ہیں۔'

'عبدالرزاق اب نہیں رہے۔ ان کی فوت ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوا ہے۔'

رقیہ نے چیخ ماری اور چکرا گئی۔ عبدالرزق نے اپنی بانہوں کا سہارا دیا۔

عورت نے ان کو اندر آنے کے لئے کہا۔

وہ صحت مند تھے۔ کیسے فوت ہوئے؟ عبدالقادر نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

'نومبر میں جب وہ امریکہ سے لوٹے تو ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ دسمبر میں بیمار پڑے۔ ڈاکٹر نے کینسر کی تشخیص کی۔ بمبئی لیا۔ کچھ فرق نہیں ہوا۔ واپس آکر دکان اور اس کا سامان بیچ دیا۔ ان کی حالت بگڑتی گئی اور ۴ر مارچ کو وہ چل بسے۔

وہ امریکہ کب گئے؟ عبدالقادر نے پوچھا۔

'وہ ہر سال اپریل میں مسٹر جان جیکسن کے ہاں کام کرنے امریکہ جاتے تھے اور نومبر میں لوٹتے تھے۔'

رقیہ زاروقطار رورہی تھی اور نسیمہ بھی رونے لگی۔

'رشیدہ سے مرحوم کو بڑا پیار تھا' عبدالقادر بولا۔

'وہ کسی رقیہ بانو کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ رشیدہ کا نام میں نے نہیں سنا'

'رشیدہ ان کی خالہ زاد بیٹی ہے اور رقیہ چچازاد بیٹی ہے۔' عبدالقادر بولا۔

'میرے پوچھنے پر بتایا کہ رقیہ ان کی عزیزہ ہے۔' عورت بولی۔

جب رونا بند ہوا تو عبدالقادر بولا۔ 'نسیمہ بہن، کیا آپ ہمیں مرحوم کی قبر دکھائیں گی؟ قبرستان نزدیک تھا۔ نئی قبر پر کتبہ لگا تھا۔

''یہاں جہاندیدہ عبدالرزاق مدفون ہے، جس نے مسٹر جان جیکسن امریکی کے ہمراہ ساری دنیا کا سفر کیا۔''

لوحِ تربت پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں یہ دو جملے لکھے تھے۔

'مرنے سے پہلے انہوں نے یہ کتبہ بنوایا' عورت بولی۔

......●●●......

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

تجزیہ

☆......ڈاکٹر الطاف انجم

عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ
(جہاندیدہ کے خصوصی حوالے سے)

میرؔ کا مشہورِ زمانہ شعر ہے۔

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ریاستِ جموں و کشمیر کا ایک دور دراز جغرافیائی خطۂ لداخ جہاں قدرت کے حسن و جمال کا خوب صورت مظہر ہے وہیں زندگی گزارنے کے محدود وسائل یہاں کے ہزاروں نفوس کے شب و روز کے معمولات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ قدرتی ماحول کی سختی اور سنگینی سے باشندگانِ لداخ کے باہمی میل جول، آمد و رفت، دستر خوان، رسوماتِ آرائش و زیبائش، طریقۂ حصولِ معاش، تہذیبی اظہارات اور ثقافتی بوقلمونیت کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ سال کے نصف حصہ میں شدید سردی کے باعث یخ بستگی چہار سو نظر آتی ہے۔ غرض ان ہی عناصر سے لداخ کے جغرافیہ کی تشکیل ہوتی ہے جو بیرونی سیاحوں کے استقبال کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خطے کی معلوم قدیم تاریخ سے اس کے مذہبی، روحانی اور ثقافتی نشانات کا بہتر طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حالیہ برسوں میں معروف اسکالر اور منتظم پرویز دیوان نے لداخ کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ پر مستند تحریریں پیش کی ہیں۔ واضح رہے کہ انتظامی سطح پر اس خطے کو دو اضلاع لیہہ اور کرگل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دونوں اضلاع نے ہر زمانے میں نابغۂ روزگار لوگوں

کو پیدا کیا ہے جوان علاقوں کی شہرت کے ساتھ ساتھ بیرونی دنیا میں ان کے علمی وادبی سفیر کے طور پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ان ہی شخصیات میں عبدالغنی شیخ کا شمار ہوتا ہے جوفی زمانہ لیہہ کے معتبر اُردو ادیب اور دانشور تصور کیے جاتے ہیں۔شیخ نے اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ قلم وقرطاس کے ساتھ گزار کر اُردو دنیا میں پورے لداخ خطے کی ترجمانی کے فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیا۔

☆......**شیخ کی افسانہ نگاری کا آغاز وارتقا**

عبدالغنی شیخ فطرتاً قلم کار واقع ہوئے ہیں۔اس دعویٰ کی صداقت پر کئی دلائل ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔انہوں نے دہائیوں پہلے افسانہ نگاری کا سفر شروع کیا۔کئی کتابوں کے مصنف عبدالغنی شیخ نے سن ۲۰۱۷ء میں اُردو دنیا کوایک افسانوی مجموعہ ''دوملک ایک کہانی'' کے عنوان سے تفویض کیا۔اس میں چار درجن کے قریب افسانے شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً اُردو دنیا کے مؤقر ومعروف رسائل وجرائد میں شائع ہوکر سنجیدہ اور باذوق قارئین سے دادو تحسین وصول کر چکے ہیں۔

☆......**شیخ کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ: نمائندہ افسانوں کے حوالے سے**

عبدالغنی شیخ کے افسانوں کا پلاٹ گردوپیش کے حالات وواقعات کے اینٹ گارے سے تیار ہوتے ہیں۔ایک مابعد جدید تخلیق کار کی سب سے بڑی خوبی اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عالمی نوعیت کے افکار وخیالات اور مسائل ومیلانات کے بجائے مقامی اقدار ورسومیات اور احتیاجات سے اپنی تخلیقی دنیا کی تعمیر وتشکیل میں یقین رکھتا ہے۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ عالمی سطح کے مسائل کی سنگینی اور بنی نوع انسان پر ان کے اثرات سے بے خبر ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہ تخلیقی متون کی تشکیل کے دوران اپنی سطح پر موضوعات کی ترجیحات کا تعین اس انداز سے کرتا ہے کہ مقامی مسائل اور میلانات بنیادی اہمیت حاصل کرتے ہیں اور عالمی نوعیت کے موضوعات سے مقرر کردہ بنیادی موضوع کوتقویت پہنچائی جاتی ہے۔اس ضمن میں عبدالغنی شیخ کے افسانے ''جہاندیدہ'' کوبطورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس افسانے کا بنیادی قصہ لداخی معاشرت کے اُس پہلو کو منکشف کرتا ہے جس سے آبادی کا ایک معتدبہ حصہ متاثر ہوا ہے۔لیکن افسانہ نگار نے بیرونی دنیا کا مظاہر کا ذکر اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ ایک تو وہ افسانے میں ناگزیر معلوم ہوتے ہیں دوسرے وہ افسانے کے پلاٹ کی حسنِ تشکیل میں بھی

معاون معلوم ہوتے ہیں۔ عبدالغنی شیخ کے کئی ایک افسانے ناقدینِ ادب سے سنجیدہ قرأت کا اور تحسین کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کے ہر ایک افسانے پر تفصیلی مطالعہ پیش کرنا ایک منضبط اور مبسوط مقالے کے تحت ہی ممکن ہے تاہم زیرِ نظر مقالے میں ان کے ایک تازہ افسانے ''جہاندیدہ'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

☆......جہاندیدہ: ایک فریب آسا انسان کی دوہری شخصیت کا انکشاف

عبدالغنی شیخ کا تازہ افسانہ ''جہان دیدہ'' حکومتِ ہند کے محکمہ پبلی کیشنز ڈیوژن کے ایک معتبر اُردو رسالہ ماہنامہ '' آج کل'' بابت نومبر ۲۰۱۸ میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ یہ افسانہ جہاں افسانہ نگار کی جہاندیدگی کا مظہر ہے وہیں لداخ کے ایک اہم معاشرتی مسئلہ پر اہم تخلیقی بافت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ نہایت چست ہے جو عبدالغنی شیخ کی فنی ہنرمندی کا بین ثبوت ہے۔ راقم نے یہاں پر اسی افسانے کو تفصیلی تجزیے کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ افسانہ کئی اعتبار سے افسانہ نگار کے world view کے اظہار کا اہم ثبوت پیش کرتا ہے۔

☆......جہاندیدہ: ایک بیانیاتی تشکیل

''جہاندیدہ'' کے بیانیاتی مطالعہ کے دوران قاری کئی طرح کے تجربات سے روشناس ہو جاتا ہے۔ افسانے کی ابتدا ہی چونکا دینے والے بیان سے کی گئی ہے جس میں افسانہ نگار واحد غائب واری کے صیغہ میں ''جہاندیدہ'' کی گمشدگی اور اس کے نتیجے میں رقیہ کی بے کسی اور بے بسی کی صورتِ حال کو پیش کر رہا ہے۔ اس ابتدایہ سے بظاہر افسانے کی شروعات معلوم ہو رہی ہے لیکن افسانہ نگار نے کمالِ فن کاری کے تحت اختتامیہ کا حصہ ابتدا میں پیش کر کے قارئین کو حیرت انگیز صورتِ حال سے آشنا کر دیا۔ گویا اس میں کسی واقعہ کا ذکر نہیں جسے ہم بیانیہ کی تشکیل کا جواز سمجھ لیتے۔ اس ابتدایہ کو آپ بھی دیکھیے:

''عبدالرزاق جہان دیدہ کا فون آنا اچانک بند ہوا۔ اس کی اہلیہ رقیہ بانو پریشان ہوئی۔ جہاندیدہ ہر دوسرے تیسرے روز بلاناغہ فون کرتا تھا۔ اس نے یہ ہدایت دی تھی کہ اس کو فون کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ وہ ایک جگہ نہیں ٹکتا ہے۔ اپنے مالک مسٹر جان جیکسن کے ہمراہ دیس بدیس گھومتا رہتا ہے۔

ویسے بھی بیرون ملک فون کرنا مہنگا رہتا ہے۔اس کے باوجود رقیہ نے جہاندیدہ
کے دونوں نمبر پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں فون مسلسل سوئچ
آف آتے تھے۔رقیہ نے جہاندیدہ کے بھائی عبدالقادر اور کئی دوستوں کو
(سے) جہاندیدہ کا فون نہ آنے کا ذکر کیا۔عبدالقادراور دوستوں نے کہا کہ انہیں
بھی پچھلے تین چار ہفتے سے کوئی فون نہیں آیا۔ایک دوست بولا' جہاندیدہ جیکسن
صاحب کے ساتھ شہر شہر، جنگل جنگل اور صحراصحرا گھوم رہا ہوگا پریشان ہونے کی
ضرورت نہیں ہے''

افسانے کا یہ ابتدائیہ قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ اُس صورتِ حال
کی نمائندگی کرتا ہے جو رقیہ اور عبدالقادر کو درپیش ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں واقعات کی
ترتیب کو الٹ کر پیش کر کے قارئین کو نہ صرف مختلف جمالیاتی ذائقے سے آشنا کیا ہے بلکہ افسانے کی
روایتی ترتیب 'ابتدا'، 'وسط' اور 'انجام' کی تثلیث کی ردِ تشکیل کردی ہے۔ روایتی افسانے کی شعریات
کے مطابق ''جہاندیدہ'' کی ابتدا درج ذیل عبارت سے ہونی چاہئے تھی:

''لگ بھگ تیس سال پہلے جان جیکسن اور مسز سارہ جیکسن لداخ سیاحت
پر آئے تھے۔تب عبدالرزاق ٹیکسی چلاتا تھا۔اس نے گریجویشن کیا تھا اور ڈھنگ
کی کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملی تھی۔ جان جیکسن اور مسز جیکسن نے اس کی ٹیکسی
میں کئی سیاحتی مقامات دیکھے۔میاں بیوی اس کی شائستگی اور کارکردگی سے بڑے
خوش ہوئے۔ جہان دیدہ بڑا چاک و چوبند اور وقت کا پابند تھا۔ ہر دم چوکس رہتا
تھا۔ بڑے تپاک سے گاڑی کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا تھا۔علاقے کی جانکاری
اور انگریزی جاننے کی وجہ سے انہیں گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑی۔ جان جیکسن
نے ایک ہفتے کا ٹریکنگ بھی کیا اور جہاندیدہ کو اپنے ساتھ لیا۔انہوں نے اپنے
قیام کے دوران ایک فلاحی تنظیم اور جہاندیدہ کی وساطت سے چند مستحق افراد کی
مالی طور مدد کی۔میاں بیوی کو لگا کہ جہاندیدہ دیانت دار بھی ہے''

اس افسانے میں صورتِ حال کی روئداد (Description) اس طرح پیش کی گئی ہے کہ کوئی نہ کوئی واقعہ بالواسطہ یا بلاواسطہ متن کا حصہ بن جاتا ہے جس سے افسانے کا بیانیہ موثر اور مستحکم بن جاتا ہے۔ چند مثالیں اس طرح ہیں:

۱۔ 'عبدالرزاق کا فون آنا اچانک بند ہوا۔ اس کی اہلیہ رقیہ بانو پریشان ہوئی'

۲۔ 'جان جیکسن کی بیٹی ایمیلی نے جواب میں کہا کہ پاپا کو انتقال ہوئے سات سال ہوئے ہیں'

۳۔ 'جان جیکسن نے آہ بھر کر جہاندیدہ کو بتایا کہ اس کی رفیقہ حیات اب اس دنیا میں نہیں ہے'

۴۔ 'جہاندیدہ اپنی بیوی کو جلدی واپس آنے کا دلاسہ دے کر جیکسن کے ساتھ امریکہ روانہ ہوا'

۵۔ 'دونوں نے مقفل صندوق کو توڑا۔ بڑے بڑے لفافوں میں کاغذات رکھے تھے۔ ایک ایک کاغذ کو پڑھا۔ ایک لفافے میں چھ سات سال کی بچی کا فوٹو نکلا'

۶۔ 'ایک استعمال شدہ چیک بک نکلا، جس کے حاشیے پر ربیعہ دیدی، نسیمہ بانو، جمیلہ خانم اور سلمٰی خان جیسے نام تھے'

۷۔ '(ڈائری کو) الٹ پلٹ کر دیکھا تو گوامیں نوادرات کا کاروبار کرنے والا (والے) کسی تاجر کا پتہ تھا۔ گوا کے پتہ پر عبدالقادر قدرے چونکا'

۸۔ 'ہماری ملاقات ہوئے بڑی مدت ہوئی ہے۔ آپ اولڈ مارکیٹ جائیے اور ''جہاندیدہ انٹیک شاپ'' کے بارے میں پوچھیئے: جہاندیدہ انٹیک شاپ! عبدالقادر حیرت سے پوچھا'

۹۔ 'ابھی وہ کہاں ہیں؟

اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ پنجم میں رہتا ہے

'بیوی اور بچی!' رقیہ چلاّئی

۱۰۔ 'میں عبدالرزاق کا بھائی عبدالقادر ہوں۔ رشیدہ بانو ان کی ایک عزیزہ ہے۔ ہم عبدالرزاق سے ملنے آئے ہیں۔

عبدالرزاق اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کو فوت ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوا ہے۔ رقیہ نے چیخ ماری اور چکرا گئی۔ عبدالرزاق (عبدالقادر) نے بانہوں میں سہارا دیا'

۱۱۔ دسمبر میں بیمار پڑے۔ڈاکٹر نے کینسر کی تشخیص کی، بمبئی لیا۔کچھ فرق نہیں ہوا۔واپس آکر دکان اور اس کا سامان بیچ دیا۔ان کی حالت بگڑتی گئی اور ۴ مارچ کو وہ چل بسے'

یہ اس افسانے کے لسانی ساختیے ہیں جن سے اس کا تار و پود تیار ہوا ہے۔ان ساختیوں میں افسانہ نگار نے بیانیہ کی پوری قوت داخل کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ بعض مقامات پر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ادبی تخلیق بالخصوص افسانے کی کہانی کو مانوس سے نامانوس (Defamaliarization) بنانے کے عمل میں فنکار کی فنی اور تخئیلی صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ کس طرح حقیقت پر مبنی یا یوں کہیں ایک فطری واقع کو نیا، اجنبی اور حیرت انگیز بنا کر پیش کرے تا کہ قاری پر اس کی قرأت کے دوران تحیر اور مسرت کے نئے در وا ہوسکیں۔اس افسانے میں ابتدائی طور پر عبدالرزاق کے فون نہ آنے سے پیدا شدہ صورتِ حال کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد عبدالرزاق موسوم بہ جہاندیدہ کی جان جیکسن کے ساتھ فرضی سیاحت کے قصے راوی غائب نے مزے لے کر بیان کیے ہیں۔'ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم' کے مصداق عبدالرزاق اپنے گھر اور بیوی کے لیے نایاب ہی رہا کرتا اور یوں افسانے کی روئیداد جاری رہتی ہے لیکن جب راوی گویا میں جہاندیدہ کی بازیافت کی کوشش میں عبدالقادر اور رقیہ کی سعی کو بارآور ثابت کر رہا ہے تو افسانے کے داخلی ہیئتی نظام میں قاری کی شرکت یقینی بن جاتی ہے اور یوں قاری میں ''آگے کیا ہوگا'' کے تحت تجسس کے امکانات روشن ہونے لگتے ہیں۔افسانے کے اختتام کی جانب سفر کرتے ہوئے قاری کے بحرِ خیال میں کشمکش کی لہریں زور زور سے اٹھنے لگتی ہیں۔اختتامی حصے کا یہ بیان جس میں عبدالقادر اور نسیمہ نے مکالماتی طور پر عبدالرزاق کی جہاندیدگی اور جہانگیری کا طلسم اس انداز سے توڑا کہ راوی خاموشی کے ساتھ بات کہہ کر قارئین کو محوِ حیرت میں ڈال دیتا ہے:

''وہ امریکہ کب گئے'' عبدالقادر نے نسیمہ سے پوچھا

''وہ ہر سال اپریل میں مسٹر جان جیکسن کے ہاں کام کرنے امریکہ جاتے ہیں اور نومبر میں لوٹتے ہیں''

اس مکالمے نے عبدالقادر اور رشیدہ (رقیہ) کے سامنے ساری حقیقت آشکار کر دی لیکن نسیمہ

پر اب بھی عبدالرزاق کی افسانوی شخصیت کے دبیز پردے آویزاں ہیں۔ تاہم عبدالرزاق کی قبر کے کتبہ کی عبارت کے بارے میں قاری اب بھی متجسس ہو کر سوچتا ہے کہ یہ کس کی تحریر ہو سکتی ہے کیوں کہ عبدالرزاق خود کبھی نہیں چاہیں گے کہ وہ عبارت کتبے کا حصہ بنے جو حقیقت سے کوسوں دور ہے:

"یہاں جہاندیدہ عبدالرزاق مدفون ہے جس نے مسٹر جان جیکسن امریکی کے ہمراہ ساری دنیا کا سفر کیا"

☆...... جہاندیدہ کے کرداروں کا جائزہ

اس افسانے کے کردار یوں تو کسی ارتقائی صورت میں نظر نہیں آتے تاہم جہاندیدہ اس کے مرکزی کردار کے طور پر اپنا وجود منواتا ہے۔ جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ افسانہ نگار اس افسانے کا نام ہی اس کردار کے نام پر رکھنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ اس کو ہم اس افسانے کا سب سے متحرک (Round) کردار کے طور پر بھی تسلیم کر سکتے ہیں کیوں کہ اسی کی ذات کے اردگرد افسانے کا تارو پود تیار ہوتا ہے۔ دوسرے کردار جیسے جان جیکسن، رقیہ بانو، عبدالقادر، مسز سارہ جیکسن اس افسانے کے ذیلی یا ضمنی کردار ہیں جن کے یہاں افسانہ نگار نے کسی تحرک کو پنپنے کا موقع نہیں دیا ہے بلکہ وہ ہر شعوری یا غیر شعوری کوشش سے جہاندیدہ کے کردار کو تقویت پہنچانے میں مصروف نظر آتے ہیں جس وجہ سے یہ سپاٹ (flat) کردار کے طور پر اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

رقیہ بانو کے کردار کے ضمن میں افسانہ نگار نے سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ یہ کردار مرکزی کردار کے متوازی اپنی شناخت قائم کر سکنے کی اہلیت رکھتا تھا لیکن یہ افسانہ نگار کی عدمِ توجہی کا مکمل طور پر شکار ہوا ہے۔ اس افسانے کی قرأت کے دوران جستہ جستہ یہ احساس قاری پر حاوی ہونے لگتا ہے کہ افسانہ نگار معاصر تانیثی رجحانات سے ناقابلِ یقین حد تک ناواقف ہے۔ آج کے مابعد جدید دور کے زائیدہ تانیثیت (Feminism) کے نظریہ کے تحت کوئی بھی فن کار اتنی جرأت کر ہی نہیں سکتا کہ وہ نئی نویلی دلہن کے شوہر کو امریکہ رسید کر دے اور اس کے دبے ہوئے جذبات اور ناراضگی کو مناسب طور پر اپنے فن پارے میں جگہ نہ دے۔ بلکہ کچھ موقعوں پر رقیہ بانو کے ازدواجی احتیاجات اور خواہشات کو بھی افسانہ نگار نے دبانے کی غیر شعوری کوشش کی ہے۔ اگر رقیہ کی گود ہری نہیں ہوئی تو اس کی وجہ شوہر

کی گھر سے طویل مدتی دوری بھی ہو سکتی ہے جس کی جانب افسانہ نگار نے توجہ نہیں کی ہے:

۱۔ ''جہاندیدہ کو شادی کیے ہوئے ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ نو بیاہی بیوی رقیہ کو اپنے شوہر کا امریکہ جانا ایک آنکھ نہیں بھائی (بھایا)''۔

۲۔ ''جہاندیدہ کو گھر آئے ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ جان جیکسن کا فون آیا کہ ایک ہفتے تک بنکاک پہنچے۔ رقیہ پر آسمان ٹوٹا۔ تب سے یہ دستور بن گیا۔ کبھی سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ گھر آتا اور مہینے کے بعد واپس جاتا تھا''

۳۔ ''شروع شروع میں رقیہ کو جدائی بڑی کھٹکتی تھی۔ بعد میں وہ اس کی عادی ہوگئی۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی''

☆......جہاندیدہ: ایک معاشرتی جائزہ

لداخی معاشرہ یوں تو سیدھا سادا تھا لیکن گزشتہ صدی کے ربع آخر کے بعد سے یہ مقام دنیا کے سیاحتی نقشے پر چمکنے لگا۔ جس سے لوگوں کی سماجی، تہذیبی اور تمدنی زندگی میں نئی لیل و نہار کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس خطے کی مخصوص جغرافیائی صورت کی وجہ سے سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ میں کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی ہے یہی وجہ ہے کہ جان جیکسن کو لداخ کی سیاحت کے دوران یہاں کے کچھ علاقوں کی مفلسی اور محرومی نے فلاحی کاموں کے لیے اُکسایا:

۱۔ ''انہوں نے اپنے قیام کے دوران ایک فلاحی تنظیم اور جہاندیدہ کی وساطت سے چند مستحق افراد کی مالی طور مدد کی۔''

۲۔ ''جان جیکسن ملک اور بیرون ملک کئی فلاحی تنظیموں کو مالی امداد دیتا تھا۔ چند سال بعد جب وہ لیہہ آیا تو فلاحی تنظیموں نے اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی۔

☆......مکالمہ نگاری

اس ذیل میں افسانہ نگار سے بڑی بھول ہوئی ہے اس نے جان جیکسن سے بھی اُردو میں بات کروائی جو کہ ناقابلِ یقین حد تک ناممکن ہے کیونکہ جان جیکسن اور مسز سارہ جیکسن تیس سال پہلے چند ہفتوں کے لیے لداخ کی سیاحت کے لیے آئے تھے، ان سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ

جہاندیدہ کے ساتھ بہ آسانی اُردو زبان میں فطری انداز میں مکالمہ قائم کر سکیں۔ جیسے یہ مکالمہ:

''جہاندیدہ کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر (جیکسن) بولا: میری عمر چھیاسٹھ سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مجھے ایک ہم سفر کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم میرا ساتھی بنو''

جہاندیدہ بڑا خوش ہوا اور بولا: سر میں آپ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہوں

''مارکو پولو اور ابنِ بطوطہ کے نام سُنے ہیں؟'' جان جیکسن نے پوچھا

جہاندیدہ: ہاں جناب، میں نے ان کے بارے میں پڑھا ہے، وہ ماضی کے بڑے مہم جو سیاح تھے۔

☆ ......''جہاندیدہ'' واحد غائب راوی کی جہاندیدگی سے جہانگیری تک کے سفر کا بہترین ثبوت ہے

اس افسانے موسوم بہ ''جہاندیدہ'' میں واحد غائب راوی کے صیغے میں افسانہ نگار نے اپنے قارئین کو جن جہانوں کی سیر کرائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راوی ہر جگہ سے سرسری گزرنے کا مرتکب نہیں ہوا ہے بلکہ اس نے باریک بینی اور دیدہ ریزی سے ہر جا کو جہانِ دیگر کی صورت میں موجود پایا اور اس سے محظوظ ہو کر نہ صرف اپنی جمالیاتی حِس کو تقویت پہنچائی بلکہ اپنے آئینۂ ادراک میں ان جہانوں کا عکس بھی منقش کیا۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

۱۔ 'میں نے چین دیکھا ہے اور افریقہ کے بیس سے زائد ممالک کی سیاحت کی ہے۔ میں دوبارہ چین جانا چاہتا ہوں۔ قدیم سلک روٹ (Silk Route) اور صحرائے گوبی کی بادیہ پیمائی کرنا چاہتا ہوں جہاں سے ہو کر مارکو پولو چین گیا تھا'

۲۔ عبدالرزاق تم چین گئے ہو، دیوارِ چین دیکھی؟ ایک آدمی نے پوچھا

یہ بھی سوال ہوا۔ چین جائے اور دیوارِ چین نہ دیکھے۔ زیان شہر میں ہم نے ٹیریکوٹا کے بنائے ہوئے پُرانے جنگجو سپاہی دیکھے۔ ان کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ صاحب نے مجھے بتایا یہ مسیح سے تین صدی پہلے کے ہیں۔ یہ مختلف شکل وصورت کے ہیں۔ زیان سلک روٹ کے زمانے کا ایک تاریخی شہر ہے۔ تب یہ چانگن کہلاتا تھا۔

۳۔ سلک روٹ پر واقع ایک اور قدیم شہر دُون ہانگ کے بارے میں بتانے کے لیے جہاندیدہ

کے پاس بہت کچھ تھا۔ جہاں ایک ہزار غار تھے۔ جہاندیدہ بولا ’’چین کی حکومت نے تین سو غاروں کو بند رکھا ہے۔ ان غاروں میں بڑی خوب صورت تصویریں ہیں۔ آج ڈون ہانگ سیاحت کا بڑا مرکز ہے اور ریگستان میں شاہکار آرٹ کی گیلری کہلاتا ہے۔

۴۔ ’’یار تم مصر گئے ہو، اہرامِ مصر کیسا ہے؟

اہرامِ مصر تو مشہور ہے۔ سب کو معلوم ہے۔ ایک اہرام میکسیکو میں ہے جو AZTEC اہرام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سولہویں صدی کے شروع میں ایزٹیک سلطنت مغرب میں بحرِ اوقیانوس تک اور مشرق میں بحرالکاہل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے ملک پیرو میں اینکاس تہذیب عروج پر تھی۔ پیرو میں آج بھی اس دور کی یادگار موجود ہیں‘‘۔

۵۔ ’’آتش فشاں پہاڑ کا ذکر چھیڑا تو جہاندیدہ نے اٹلی کے شہر پومپیئی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ آتش فشاں پہاڑ کا بڑا واشگاف دہانہ آج بھی اپنا خوفناک منہ کھولے دو ہزار سال پرانی داستان کو سنا رہا ہے جس نے پومپیئی شہر کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لایا (لیا) اور ہزاروں لوگوں کو سلگتے بڑھکتے لاوا میں ڈھانپ لیا۔ شہر کے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ یہ بڑا خوب صورت شہر تھا۔ اٹھارویں صدی میں اس کی کھدائی بھی ہوئی تھی‘‘

۶۔ ’’جان جیکسن کو پرانی یادگاریں اور تاریخی کھنڈرات دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ انہوں نے اجنتا، ایلورا، موہنجوڈارو اور ہڑپا بہت پہلے دیکھے تھے۔ وہ ہوائی جہاز میں برموڈا ٹرینگل دیکھنے گئے تھے۔ یہ مغربی بحرالکاہل میں ہے۔ یہاں متعدد سمندری جہاز اور ہوائی جہاز پُراسرار طور سمندر میں غرقاب ہوئے تھے۔ سنی سنائی روایت کے مطابق زیرِ آب کوئی مقناطیسی قوت انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی تھی‘‘۔

۷۔ ’’سردیوں میں ہم گلگت، ہنزا اور چیلاس میں تھے۔ پورے خطے میں سنگ تراشی کے خزینے ہیں۔ سلک روٹ کی شاخ کے ان راستوں پر ہزاروں فوجی، یاتری، تاجر اور مبلغ گزرے تھے۔ ان میں بہتوں نے چٹانوں پر اپنی اور دوسروں سے ترشوائی ہوئی ہزاروں تصویریں اور تحریریں چھوڑی ہیں۔ بہت ساری تصویروں پر سنگ تراشوں کے نام دئے گئے ہیں۔ تصویروں میں بدھ، دیوی، دیوتا، جانور، پرندے وغیرہ شامل ہیں‘‘۔

۸۔ ’’مجھے تو امریکہ میں ماؤنٹ روش مورے پر تراشے گئے چار امریکی صدور کے دیونما بڑے بڑے چہرے پسند آئے، یہ کون کون سے صدور تھے؟ کسی نے پوچھا:

جہان دیدہ نے اپنے سمارٹ فون میں ان کی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا: یہ جارج واشنگٹن، ابراہیم لنکن، تھامس جفرسن اور تھوڈر روز ویلٹ ہیں۔ صاحب نے بتایا ہے کہ سنگ تراشوں نے انہیں تراشنے میں چودہ سال لگائے ہیں۔

۹۔ ’مارکو پولو اور ابنِ بطوطہ کے نام سنے ہیں‘ جان جیکسن نے پوچھا ’ہاں جناب‘ میں نے ان کے بارے میں پڑھا ہے۔ وہ ماضی کے بڑے مہم جو سیاح تھے۔ ابنِ بطوطہ نے ہندوستان اور افریقہ اور مارکو پولو چین گیا تھا تب پیدل اور گھوڑے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ ڈاکوؤں کا بڑا خطرہ تھا‘

دنیا کے مختلف حالات و واقعات، معروف شخصیات اور مظاہر کے متعلق راوی کی معلومات بہت صحت مند ہیں۔ اس کی زیرکی اور علمیت کا اندازہ اس افسانے میں جستہ جستہ ہوتا ہے۔ یوں بھی مطالعہ کائنات ایک معیاری ادبی تخلیق چاہے شعر ہو یا افسانہ؛ ہر دو کے لیے ناگزیر ہے جس کے مطالعہ کے دوران قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی راہ پر گامزن ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ متذکرہ بالا مقامات اور دوسرے مظاہر کے متعلق افسانہ نگار کی واقفیت قابلِ حیرت ہے۔ افسانہ نگار نے غیر شعوری طور پر مابعد جدید شعریات کی پاسداری کرتے ہوئے مقامی سطح کے ایک معاشرتی مسئلے پر مبنی بیانیہ کو عالمی تجربات و مشاہدات کی مدد سے موثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس افسانے کا اسلوب بالکل سادہ اور سلیس ہے لیکن افسانہ نگار نے اپنی زبان دانی کی بنیاد پر کہیں کہیں پر اس سادگی میں پُرکاری کے رنگ بھرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ رموزِ اوقاف کا دامن اکثر مقامات پر افسانہ نگار کے ہاتھ سے چھوٹتا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ کسی بھی طرح مجموعی طور پر افسانے کے حسن پر حاوی نہیں ہوتا۔ زبان کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں کے حسن سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے عبدالغنی شیخ نے اس افسانے میں نہ صرف اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی تجسیم کاری کی ہے بلکہ اپنے تصورِ جمال کی وضاحت بھی شرح و بسط کے ساتھ کی ہے:

’’جان جیکسن حسن پرست ہیں مگر ہوس پرست نہیں ہیں .... اس نے

جیکسن کو کبھی کسی لڑکی کے پیچھے نہیں دیکھا، کبھی قحبہ خانے کا رُخ کرتے نہیں دیکھا۔ تاہم وہ بھلا کا حُسن پرست ہے۔ میں نے بھی دیکھا کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک جاتا ہے، پلٹ کر دیکھتا ہے۔ بدتمیزی سے نہیں۔ لڑکی کو پتہ نہیں چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: خوب سورت لڑکیاں ہم بہت دیکھتے ہیں لیکن حسین وجمیل لڑکیاں خال خال ہوتی ہیں۔ ایک جاذبِ نظر چہرہ شاذ ونادر ہی نظر آتا ہے۔ وہ کیسا ہوتا ہے سر؟ میں نے پوچھا، ان کا جواب تھا الفاظ میں کوئی اسے بیان نہیں کرسکتا ہے۔ صرف محسوس کرسکتا ہے۔ اس کو دیکھ کر انسان پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ دل ودماغ پر انجانا سا نشہ چھا جاتا ہے اور بے ساختہ قدرت کی کاری گری کو داد دینے کو جی چاہتا ہے'۔ کچھ توقف کے بعد جہاندیدہ بولا: لندن کے ایک پارک میں ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئے اور مجھے بولے: رزاق اس چہرے کو ذرا دیکھو، کتنا unique اور جاذبِ نظر ہے۔''

یہ اقتباس راوی کے نظریہ جمال کی توضیح ہے جس میں ہم اس کے حسن پرست زاویہ نظر کو احسن طریقے پر محسوس کرسکتے ہیں۔ اسی طرح اس افسانے میں روم کے مول (Mall) میں نظر آنے والی لڑکی اسے بے حد متاثر کرتی ہے تو دوسری جانب بیروت کے ہوائی اڈے پر پری ناز چہرے کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ: ''ایسا جاذبِ نظر چہرہ ہزاروں میں ایک ہوتا ہے''۔ تاشقند کے دوست خواجہ رحیموف کی بیٹی کی خوبصورتی پر وہ داد دیے بغیر نہیں رہ پاتا۔ غرض یہ افسانہ جہاں لداخ کے ایک معاشرتی مسئلہ کی جانب افسانہ نگار کی ارتکازِ فکر کا غماز ہے وہیں ان کے جمالیاتی وجدان کی آئینہ داری بھی کرتا ہے۔ یہی اس افسانے کے امتیازی اوصاف ہیں جو اسے معاصر افسانوں میں اہم مقام عطا کرتے ہیں۔

......●●●......

افسانہ

☆......عبدالغنی شیخ

دو ملک، ایک کہانی

میرے بڑے بھائی اڑتیس سال بعد پاکستان سے لیہہ پہنچنے والے تھے۔ دو روز پہلے وہ اسلام آباد سے دہلی پہنچے تھے۔

اڑتیس سال میں زمانہ بہت بدلا ہے۔ ہر چیز میں تبدیلی آئی ہے۔ ہمارے خاندان نے اس دوران کئی نشیب وفراز دیکھے۔ خوشی اور غمی کے لمحات آئے۔ بھائی جان کی روانگی سے کچھ عرصہ بعد دادا جان چل بسے۔ اس کے چند سال بعد والد صاحب نے داغِ مفارقت دیا۔ پھر والدہ خدا کو پیاری ہوئیں۔ اسی اثنا میں دو ماموں، ممانیاں، خالائیں اور بھائی جان کے کئی احباب فوت ہوئے۔ اس دوران ہمارے خاندان اور اعزا واقارب کے گھروں میں متعدد پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیوں کا اضافہ ہوا۔

ادھر بھائی جان کی زندگی میں بھی کئی اونچ نیچ آئی اور وہ دولہا میاں سے دادا جان بنے۔ ہمارے بھائی سکردو بلتستان میں مقیم تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے بلتستان متحدہ کشمیر میں لداخ کا ایک تحصیل تھا۔ ڈوگرہ منتظم اعلیٰ جس کو وزیر کہا جاتا تھا، گرمیوں کے چھ ماہ لیہہ اور چھ ماہ سکردو میں گزارتا تھا۔ وزیر کے ہمراہ اس کا سارا عملہ ارکان سکردو جاتا تھا۔ میرا بھائی کلرک تھا۔

سن ۱۹۴۷ء اور اکتوبر کا مہینہ تھا۔ لیہہ میں موسم سرما نے اپنی پرچھائیاں ڈالنی شروع کی تھیں۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا اور عالمی نقشے پر ایک نیا ملک پاکستان منظر عام پر آیا تھا۔ لیہہ میں غیر یقینیت کا عالم تھا۔

میرے بھائی حسب معمول ڈوگرہ سرکار کے آخری وزیر لالہ امرناتھ کے ہمراہ سکردو روانہ

ہوئے۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا۔ بھائی جان کے ناک نقشے کی دھندلی دھندلی تصویر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے۔ جاتے وقت انہوں نے مجھے ایک اکنّی دی تھی۔

ایک سال کے اندر بلتستان پاکستان کے زیر نگیں آیا اور بھائی جان ہمیشہ کے لئے وہاں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اکیلے نہیں تھے اور بھی کئی لداخی ملازم تھے جو سکردو میں پھنس گئے۔ منشی غلام محمد ٹاک، خواجہ محمد اقبال، منشی عبدالحمید، ماسٹر غلام نبی حمامی، صنم چھرنگ، منشی غلام نبی۔ یہ چند نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ شروع شروع میں وہ اس امید پر جی رہے تھے کہ وہ دوبارہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملیں گے۔ ادھر ہمیں بھی یہی امید تھی کہ ان کی واپسی کا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ بھابی صفیہ اور امی کو ہم روز دلاسہ دیتے تھے کہ بھائی جان ہم سے ضرور آملیں گے۔ ایسے میں دو سال گزر گئے۔

پہلے پہل دونوں ملکوں کے مابین خط و کتابت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار سنی سنائی اُڑتی سی خبر آتی تھی کہ بھائی جان خیریت سے ہیں۔

دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے تحت رسل و رسائل اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا اور بُری اور اچھی خبروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ منشی غلام محمد پہلا آدمی تھا، جس کو پہلی بُری خبر ملی۔ ان کی جوان اہلیہ کا لیہہ میں انتقال ہوا تھا۔ منشی کو یہ خط براہ راست موصول ہوا۔ کوئی تعزیت کرنے والا نہیں۔ کوئی ڈھارس دینے والا نہیں۔ وہ روتا دھوتا اپنے دوستوں کے پاس گیا اور بری خبر سنائی۔

اس سانحہ کے بعد انہوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک کا نجی خط براہ راست مکتوب علیہ کے بجائے کسی دوسرے دوست کو ملا کرے۔ اب ڈاکیہ کے لئے منشی غلام محمد ٹاک، منشی عبدالحمید تھا۔ منشی عبدالحمید، منشی غلام محمد ٹاک تھا۔ دین محمد، خواجہ محمد اقبال تھا۔ خواجہ محمد اقبال، غلام نبی حمامی تھا۔

بری خبریں ہی نہیں، چٹھیوں میں خوش خبریاں بھی ہوتی تھیں۔ فلاں کو بچہ ہوا۔ اصغر کو میڈیکل سیٹ ملی۔ انیس کو انجینئرنگ میں داخلہ ملا۔ جمیلہ کا بیٹا ملازم لگا۔ طفیل نے نیا مکان بنایا۔ لیکن سکردو میں رہتے ہوئے سب جانتے تھے کہ آگے پیچھے ہر ایک کو صدمہ پیش آنے والا ہے کیونکہ سبھوں کے خاندان کے افراد تو لیہہ میں تھے۔ اس لئے ہر ایک سہما سہما رہتا تھا کہ کب کس کو بری خبر ملے۔ خواجہ محمد اقبال، منشی عبدالحمید اور صنم چھرنگ کو ماں، بہن اور کئی عزیزوں کے انتقال کی اطلاعات ملیں۔

ایک روز بھائی جان نے بھابی صفیہ کو طلاق نامہ بھیجا۔ اس کے ساتھ بھابی صفیہ کے نام ایک مفصل خط بھی تھا۔ اور باتوں کے علاوہ اس میں لکھا تھا۔ ''صفیہ! خدا بہتر جانتا ہے کہ ہم میں کبھی ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں لیکن فی الحال آثار یہ بتاتے ہیں کہ ہماری ملاقات کا امکان کم ہے۔ پچھلے چھ سال سے تمہاری یادوں کے سہارے میں اب تک جی رہا ہوں اور ہر لمحہ تم سے ملاقات کا خواب دیکھتا آیا ہوں۔ تم کب تک میرا انتظار کرو گی۔ میں بھاری دل کے ساتھ طلاق بھیج رہا ہوں۔ تم ابھی چھوٹی ہو، حسین ہو۔ تمہیں ایک اچھا سا آدمی اپنی رفیقہ حیات بنائے گا۔''

اس کے تقریباً ایک سال بعد بھائی جان نے اپنے ایک خط میں اپنی شادی کی خبر دی تھی۔ یہ ستم ظریفی ہے، جس روز ہمیں یہ خط ملا، اُسی روز ہمارے والد خدا کو پیارے ہوئے۔

بھائی بان کے نام ہمارا بھیجا ہوا خط خواجہ محمد اقبال کو ملا۔ اس روز بھائی جان نے اپنے مکان کی کھڑکی سے دیکھا کہ منشی غلام محمد، عبدالسلام، خواجہ محمد اقبال، صنم چھرنگ اور چند احباب خراماں گھر کی طرف آ رہے ہیں۔

''یہ آج کیوں آ رہے ہیں؟ عید پر مبارک باد دینے اکٹھے آتے تھے۔ ہو نہ ہو بری خبر لے کر آ رہے ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگے اور دل دھڑکنے لگا۔ ''خدایا! میرے ماں باپ صحیح و سلامت ہوں۔'' وہ دعا کرنے لگے۔

منشی غلام محمد کی قیادت میں وہی سب گھر میں داخل ہوئے۔ جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ والد صاحب فوت ہوئے تھے۔

ڈیڑھ ماہ بعد بھائی جان کی طرف سے ہمیں تعزیتی خط ملا۔ لکھا تھا: ''کاش وہ بذاتِ خود اس صدمہ میں شریک ہونے کیلئے لیہہ آ سکتے۔''

بھائی جان سرکاری ملازم تھے۔ سکردو ریاست جموں و کشمیر کا حساس سرحدی علاقہ تھا اور لیہہ آنے کی اجازت حاصل کرنا مشکل تھا۔ ادھر میں بھی سرکاری ذرائع ابلاغ سے منسلک تھا۔ میرے لیے بھی سکردو جانے میں یہی مسئلہ درپیش تھا۔

اس کے سات سال بعد والدہ نے وفات پائی۔ پھر یکے بعد دیگرے دو ماموں اور کئی احباب

انتقال کر گئے۔

بٹوارہ ایک ملک کا نہیں ہوا تھا، بٹوارہ ایک شہر کا، ایک قصبہ کا، ایک گاؤں کا اور ایک خاندان اور گھر کا ہوا تھا۔ لائن آف کنٹرول کے آر پار سے ایک بھائی دوسرے بھائی کو کھیتوں میں ہل جوتتے، پانی دیتے، فصل کاٹتے اور کھلیان جمع کرتے ہوئے دیکھ سکتا ہے لیکن جب ایک بھائی دوسرے بھائی سے ملنا چاہتا ہے تو لیہہ یا کرگل آنا پڑتا ہے۔ لیہہ سے دہلی ہوائی جہاز سے پرواز کرتا ہے۔ مہینوں کی تگ ودو اور انتظار کے بعد اگر ویزا ملے تو وہ کراچی، اسلام آباد یا لاہور جا کر اپنے بھائی سے ملاقات کر سکتا ہے۔ وہ بھی بھائی کے گاؤں میں نہیں۔ اپنے بھائی کے گاؤں سے اتنا قریب ہو کر بھی وہ اس گاؤں سے بہت دور ہے۔ آسمان کے ایک تارے کی طرح، جسے وہ دیکھ سکتا ہے، چھو نہیں سکتا۔

موسم بہار تھا۔ لیہہ کے کھیتوں میں گیندے اور گل لالہ کے پھول کھلے تھے۔ بھائی جان کا خط ملا۔ یہ خوش خبری دی تھی کہ ان کے گھر میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔ اس کا نام ذکیہ رکھا ہے۔ بھابی زہرہ کی طرف سے سب کو سلام قبول ہو۔

ایک سال کی گردش پوری ہوئی۔ بڑے بھائی نے ایک اور بچی کی پیدائش کی خبر دی۔ اس کا نام زرینہ رکھا تھا۔

پھر خط وکتابت کا سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ۱۹۶۵ء کی لڑائی کے بعد ایک لمبے عرصے تک خط وکتابت کا سلسلہ بند ہوا۔ یہی صورت حال ۱۹۷۱ء کی لڑائی کے بعد بھی ہوئی۔

خطوط کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو معلوم ہوا، ذکیہ دسویں جماعت میں پڑھ رہی تھیں۔ زرینہ نے آٹھویں جماعت پاس کی تھی۔ گھر میں فخر الدین اور محمد نعیم دو اور مہمانوں کا اضافہ ہوا تھا۔ اب خطوط میں سلام ودعا بھابی اور بھائی کی ہی نہیں، چاروں بہنوں اور بھائیوں کے سلام آتے تھے۔ ادھر میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ بنا تھا۔

انسانی نسل کی بقا کے لئے قدرت کا قانون چلتا آیا ہے۔ پیدائش، شادی اور موت کا یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ ہماری ماں اکثر کہتی تھیں۔ لڑکی پرائی ہوتی ہے۔ ایک روز متوقع طور پر بھائی کا

خط ملا۔ ذکیہ کی شادی ہونے والی تھی اور رسمی طور پر خط کے ساتھ ایک دوت نامہ بھی تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد زرینہ بھی رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئی۔

وقت کی گھڑی کی سوئی چلتی رہی۔ دن ہفتے میں، ہفتہ مہینے میں اور مہینہ سال میں تبدیل ہوتا رہا۔ بھائی جان اب دادا بن گئے تھے۔

اب اڑتیس سال کے بعد بڑے بھائی لیہہ پہنچ رہے تھے۔ ہم نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی کہ کل موسم خوشگوار رہے اور دہلی-لیہہ کی ہوائی اڑان منسوخ نہ ہو جائے۔

ہم تین ٹیکسیوں میں ائرپورٹ پہنچے۔ ان میں ہمارے خاندان کے افراد، اعزا و اقارب اور بھائی جان کے کئی احباب تھے۔ افق پر بوئنگ طیارہ نمودار ہوا اور آن کی آن میں ہوائی اڈے پر اترا۔ تھوڑی دیر بعد بھائی جان لاؤنج سے نکلے۔ اگر ان کا ایک حالیہ فوٹو نہ ہوتا تو پہچاننا مشکل تھا۔ ہم نے سنا تھا جوانی میں وہ بڑے وجیہہ تھے۔ ایک ایک سے ان کا تعارف کیا گیا اور وہ ہر ایک سے بغلگیر ہوئے۔ سبھی جذباتی ہو گئے۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انسان بھی کیا عجیب ہے۔ دکھی ہوتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ جب خوشی کا کوئی لمحہ آتا ہے تب بھی آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔

ٹیکسیاں لیہہ کی طرف چلیں۔

''لیہہ بہت بدل گیا ہے۔'' ائرپورٹ سے آگے سڑک کے دونوں طرف کے مکانات دیکھ کر بھائی جان بولے۔ ''یہ جگہ بالکل ویران ہوتی تھی۔ لوگ کہتے تھے یہاں بھوت پریت آتے ہیں۔ اس لئے شام کے بعد لوگ چلنے سے گھبراتے تھے۔''

''کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں بستیاں آباد ہوں گی۔'' بھائی جان کا ایک دوست بولا۔

لیہہ میں تبدیلیوں کے احوال بھائی جان پہلے بھی سنتے آرہے تھے۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ تبدیلیاں سکردو میں بھی آئی تھیں۔

بلتستان اور لداخ کے لوگ نسلی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے ایک ہیں۔ دونوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں گہری یکسانیت ہے۔ اور تو اور لوگوں کا مزاج اور افتاد طبیعت بھی ایک جیسی ہے۔ انیسویں

صدی کی چوتھی دہائی تک دونوں خود مختار تھے۔ بلتستان نے لداخ کو پولو، موسیقی کے آلات اور غزل سے متعارف کرایا۔ لداخ نے بلتستان کو داستانیں اور گیت دیئے۔ بلتستان لداخ کو مکھن، سوکھی خوبانیاں، گری، سلاجیت، مٹی کے نادر برتن اور زہر مہرہ کی پیالیاں فراہم کرتا تھا اور ہم بلتستان کو پشمینہ، اون اور نمک مہیا کرتے تھے۔

پچھلے اڑتیس سالوں کے دوران لیہہ اور سکردو میں بجلی، نل کا پانی اور فلم آئی۔ دونوں قصبوں میں کالج اور ریڈیو اسٹیشن قائم ہوئے۔

بھائی جان کے گھر پہنچتے ہی کئی لوگ ملنے آئے۔

''دین محمد! مجھے پہچانتے ہو؟'' ایک دوست نے پوچھا۔

بھائی جان غور سے دیکھنے لگے۔

''نہیں پہچانا۔''

''میں احمد الدین ہوں۔''

''کیا برادر امیر الدین خیریت سے ہیں؟''

''وہ چھ ماہ پہلے چل بسے۔'' احمد الدین کے لہجے میں اداسی تھی۔

''دین محمد، ہمارے اکثر دوست اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''جب کسی کے انتقال کی خبر سنتا تو میرا دل روتا تھا۔'' بھائی جان اپنے دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولے۔ ''میں سوچتا تھا، کاش میرے دو پر ہوتے اور میں پھر سے اڑکر یہاں چلا آتا۔''

''خدا کا شکر ہے، مرنے سے پہلے ہماری ملاقات ہوئی۔''

بھائی جان بولے۔ ''میں کبھی کبھی سوچتا تھا احمد کہ زندگی میں لداخ کو کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔''

''یہ پرویز احمد ہے۔ انجینئر ہے۔'' کسی نے ایک جوان سے بھائی کا تعارف کرایا۔ بھائی جان نے لاعلمی کے اظہار میں اپنے شانے اچکائے۔

''مرحوم اکبر شیخ کے بیٹے ہیں۔''

''یہ میرے سکردو جانے کے بہت سال بعد پیدا ہوا ہے۔'' بھائی جان بولے۔ ''آپ کے

والد مرحوم سے ہمارے گہرے تعلقات تھے۔ان کی وفات کی خبر مجھے سکردو میں ملی۔''

ایک نو وارد نے بھائی جان سے پہلے معانقہ کیا اور پھر مصافحہ کیا۔

''آپ غلام رسول ہیں؟'' بھائی نے پوچھا۔

''جی ہاں! غلام رسول ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔''آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا۔''

''آپ کے دو پیارے ننھے منے بچے ہوتے تھے۔وہ آج کل کہاں ہیں؟''

''آپ کی دعا سے دونوں میرے ساتھ ہیں۔ مجید چار بچوں کا باپ ہے۔وہ اپنا ہوٹل چلا رہا ہے۔اکبر ٹھیکہ داری کرتا ہے۔اس کے دو بیٹے ہیں۔''

''مبارک ہو۔''

''آپ میرے گھر کب آئیں گے؟''

''انشاءاللہ، میں ضرور آؤں گا۔''

غلام رسول کے چلے جانے کے بعد بھائی جان بولے۔''غلام رسول بہت غریب ہوتا تھا۔ گھر میں فاقہ کشی چلتی تھی۔ ماشاءاللہ اب بڑا خوش حال لگتا ہے۔''

''اب بڑا متمول ہے۔'' احمد الدین بولے۔''دونوں بیٹوں کا اچھا روزگار ہے۔ان کے دو ٹرک اور دو ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں۔''

''پچھلے اڑتیس سال کے دوران حالات بڑے بدلے ہیں۔'' چچا غلام سلطان بولے۔

''سکردو میں بھی یہی نقشہ ہے۔'' بھائی بولے۔

پھر منشی غلام محمد کا چھوٹا بھائی اور بیٹا ملنے آئے اور منشی کی خبر خیریت دریافت کی۔

''وہ خیریت سے ہیں۔انہوں نے میرے ہاتھ چٹھی اور کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔''

ایک بزرگ آئے اور کسی عبدالخالق کے بارے میں پوچھنے لگے۔

میں نے سنا وہ کراچی میں ہے۔پچھلے پندرہ بیس سال سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔''

صنم چھرنگ کے والد آئے اور اپنے بیٹے کی خیریت پوچھنے لگے۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' بھائی جان بولے۔'بلتستان کے ایک گاؤں گنوخ میں رہتا ہے۔

شادی کی ہے۔ دو یا تین بچے ہیں۔ کبھی کبھی ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لئے سکردو آتا ہے اور ملاقات ہوتی ہے۔ پچھلے دو تین ماہ سے نہیں دیکھا۔"

"آپ کے لداخ آنے کا اس کو علم نہیں ہوگا۔"

"جی نہیں۔"

"آپ کب واپس جا رہے ہیں؟"

"میں ابھی یہاں ہوں۔"

"میرا خط لے کر جائیے۔"

"ضرور لے جاؤں گا۔"

"میں کچھ تحفہ بھی آپ کے ہاتھ بھیجوں گا۔ مہربانی کر کے اسے دے دیجیے۔"

"بہتر۔ آپ لے آئیے۔"

دوسرے روز صبح بھائی جان بولے۔ "بھائی، مجھے قبرستان لے چلو۔ ابا اور امی کی قبریں دکھاؤ۔"

ہم قبرستان گئے۔ وہ والد اور والدہ کی قبروں کے پاس کچھ دیر دوزانو بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پر دنیا بھر کا غم سمٹ آیا تھا۔ اڑتیس سال بعد وہ ایک نئے اور اجنبی ملک سے اپنے آبائی وطن آئے تھے اور ان کی طویل غیر حاضری کے دوران والد اور والدہ دونوں اس دنیا سے چلے گئے تھے جن کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

بھائی جان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ہونٹ کانپنے لگے۔ میں ان کی دلی کیفیت پڑھنے لگا۔ شاید وہ ابا اور امی سے کہہ رہے تھے۔ "میں جیتے جی آپ دونوں سے نہیں مل سکا۔ آپ کی علالت پر آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ آپ دونوں نے مجھے پیار اور شفقت سے پال پوس کر جوان کیا۔ میں برسر روزگار ہوا لیکن میں آپ دونوں کا حق ادا نہیں کر سکا۔ میں آپ کے احسانات کیسے چکاؤں؟ مجھے معاف کریں۔ میں بہت مجبور تھا ورنہ میں اس طرح غیر حاضر نہیں رہتا۔۔۔"

ایک مہینہ گزرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ بھائی جان کے ویزا کی معیاد ختم ہو رہی تھی۔ اپنے نئے

وطن سے ان کو گہری محبت تھی۔ جہاں ان کی اولاد، نئے رشتہ دار اور احباب تھے۔

ہم ان کو چھوڑنے ائیر پورٹ گئے۔ وہ اپنے ساتھ وہ تصویریں لے گئے جو لیہہ میں ان کے قیام کے دوران کھینچی گئی تھیں۔

''اب آپ کو ویزا حاصل کرنے میں دقت نہیں ہوگی۔ بھابی زہرہ کے ہمراہ دوبارہ جلدی آجائیں۔'' میں نے کہا۔

''پہلے بھابی آمنہ کے ساتھ آپ پاکستان آجائیے۔'' وہ بولے۔

سب نے بھاری دل کے ساتھ بھائی جان کو وداع کیا۔

۱۹۸۹ء میں میرے بیٹے کی شادی پر برادر اور بھابی زہرہ لیہہ آنے والے تھے لیکن بھابی زہرہ اچانک چل بسیں۔ پھر کشمیر میں شورش ہوئی۔ اس کے بعد خط وکتابت میں بڑی بے قاعدگی رہی۔ لمبی مدت کے بعد بھائی جان کا ایک خط ملا جس سے یہ عیاں ہوا کہ انہوں نے باقاعدگی سے خط لکھے ہیں لیکن مجھے نہیں ملے ہیں۔ میرے بھیجے گئے خطوط کی بھی یہی درگت ہوئی ہے۔ شروع میں ہم اپنی جگہ یہ سوچتے رہے کہ خط لکھنے میں ہماری طرف سے سستی ہورہی ہے۔ آہستہ آہستہ صورت حال واضح ہوتی گئی۔ ہم حیران تھے کہ خیر خیریت کے سیدھے سادے بے ضرر یہ سارے نجی خطوط کہاں غائب ہوجاتے ہیں۔

پھر میں نے براہ راست لیہہ سے سکردو خط بھیجنے کے بجائے لیہہ آنے والے یورپ کے کسی سیلانی کو لفافہ حوالہ کرتا ہوا میں درخواست کرتا کہ اس پر اپنے ملک کے ٹکٹ چسپاں کر کے پاکستان بھیجنے کی زحمت کریں۔ ستم ظریفی ہے کہ میرے خطوط کبھی لندن، کبھی برمنگھم، کبھی کوپن ہیگن یا یورپ کے کسی شہر سے ہزار میلوں کا سفر طے کر کے سکردو پہنچتے جبکہ سکردو لیہہ سے صرف دوسو تین میل دور ہے۔

سکردو جانے کی تمنا مجھے ہمیشہ رہی ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہاں میرے بھائی ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ بلتستان اور لداخ مشترکہ ثقافت کے وارث رہے ہیں۔ دونوں خطوں کے عمر رسیدہ لوگ آج بھی ایک دوسرے کو دیکھنے اور ملنے کی تمنا رکھتے ہیں۔

کہتے ہیں، جب چاہ ہوتی ہے تو راہ نکل آتی ہے۔ اگست ۱۹۹۵ء میں پاک جرمن ریسرچ

پروجیکٹ اور پاک لوک ورثہ کے اشتراک سے اسلام آباد میں ہندوکش قراقرم اور ہمالیہ کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہوا۔ مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت ملی۔ پروگرام میں سکردو سمیت شمالی علاقہ کا دورہ رکھا تھا۔ اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔ میں نے بھائی کو عمداً اس کی اطلاع نہیں دی۔ میں ان کو سرپرائیز دینا چاہتا تھا۔ اچانک سکردو پہنچتا اور ان کے مکان پر جا کر دروازے پر دستک دیتا اور کہتا۔ ''دیکھئے کون آیا ہے!''

لیکن میری یہ تمنا بر نہیں آئی۔ پاکستان کی وزارتِ داخلہ نے ہندوستانی شرکا کو شمالی علاقہ جانے کی اجازت نہیں دی۔ میں نے پاکستان کے ممتاز تاریخ داں پروفیسر احمد دانی کو بتایا کہ میرا بھائی سکردو میں ہے اور پچھلے پینتالیس سال کے دوران ہماری صرف ایک دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔

''آپ کو ویزا مل جائے گا۔ آپ الگ سے درخواست دیں۔ یہ انسانی مسئلہ ہے۔'' وہ بولے۔

پاک جرمن ریسرچ پروجیکٹس کی چیئرمین پروفیسر Irmatrud Stellrecht بولیں۔

''یہ تو بھائی اور بھائی کی ملاقات کا معاملہ ہے۔ ویزا مل جائے گا۔'' لیکن ویزا نہیں ملا۔ اسلام آباد میں لوک ورثہ کے ادارہ کے سربراہ ایم این خان نے میری دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''بھارت آکر یہی مسئلہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ مجھے تاج محل دیکھنے کا شوق تھا لیکن مجھے دہلی سے آگرہ جانے کی اجازت نہیں ملی۔''

مجھے بھائی جان کو اپنی آمد کا فون پر اطلاع دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اسلام آباد پہنچے۔ سات سال بعد یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ ماضی کی یادیں ایک دفعہ پھر تازہ ہوئیں۔ ذکیہ اپنے شوہر کے ساتھ اسلام آباد میں رہتی تھی۔ ان سے اور ان کے چھ بچوں سے ملاقات ہوئی۔

اسلام آباد میں ہمارا آخری دن تھا۔ بلتی ادیبوں نے جن سے ہم پہلے سے متعارف تھے، مجھے اور لداخی قلم کار نوانگ چھرنگ شقسپو کو عشائیہ دیا۔ فریقین نے ایک دوسرے کے تئیں اپنے احساسات اور جذبات کو ٹیپ ریکارڈوں میں صدابند کیا اور کتابوں کا تبادلہ کیا۔

اسی شام اسلام آباد کے پریزیڈنٹ ہوٹل میں، میں نے بھائی جان کو اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمیشن کے فرسٹ سکریٹری کے نام اپنا ایک خط دیا کہ وہ ویزا کے لئے ان سے رابطہ قائم کریں۔

ہائی کمیشن نے ہندوستانی مندوبین کو ایک عشائیہ دیا تھا جہاں میں نے فرسٹ سکریٹری جی پر تھا سارتی سے جو بعد میں ہائی کمشنر بنے، اپنے بھائی کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا۔ ''آپ کو حکومت پاکستان ویزا دے یا نہ دے، ہم آپ کے بھائی کو لیہہ جانے کے لئے ضرور ویزا دیں گے۔''

دوسری صبح بھائی جان مجھے الوداع کرنے کے لئے اسلام آباد کے ائیر پورٹ آئے تھے۔

''مرنے سے پہلے ایک دفعہ لداخ آنا چاہتا ہوں۔'' بھائی جان بولے۔

''آپ اپنے بچوں کے لئے بھی پاسپورٹ بنالیں۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ ہماری دوسری اور تیسری نسلوں کی اولاد ایک دوسرے سے ملیں۔''

بھائی جان لداخ نہیں آسکے اور شاید ایک دفعہ دوبارہ لداخ آنے کی خواہش کو دل میں لے کر اس دنیا سے چلے گئے۔

ہندوستان اور پاکستان کی ۶۵ سالہ مشترکہ کہانی غلط فہمیوں، نفرتوں، کدورتوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔

کبھی تو وہ کہانی ضرور لکھی جائے گی جو بچھڑے دلوں کو ملا دے گی۔

......●●●......

تجزیہ

☆......عرفان عالم

ہجرت کے اضطراب کا کلامیہ
''دو ملک، ایک کہانی'' کے تناظر میں

کسی بھی فن کار کی منطقی دلیل ادب کے لسانی اور ثقافتی منبع سے جڑی ہوتی ہے۔ جس سے تخلیق میں تغیر پذیری پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے درد نے ایک الگ دبستانِ ادب کی بنیاد ڈال کر رنج و غم کے کلامیے کو جنم دیا۔ مہاجری غم اب ادب کا استعارہ اس طرح سے بنا ہے کہ برصغیر میں ادب کا پورا منظر نامہ ہی بدل گیا ہے اور اسے ادبی زبان میں ثقافتی ضابطہ اخلاق یا مکالمات کے مطالعے میں ثقافت کے نظریاتی حکمت عملی کا ایک نیا در وا ہوا ہے اور اس در سے زبان میں ایسا معنیاتی نظام معرضِ وجود میں آیا کہ لفظوں کی ساخت میں ابہام اور احساس کا نیا بیانیہ نظر آنے لگا، جسے فن پارے کی قرات کا طریقہ ہی بدل گیا ہے۔ اس وقت اُردو افسانے کی تنقید موضوع، اسلوب و تکنیک اور سماجی مسائل کے محو گردش ہے۔ کسی بھی افسانے کے متن کی تنقید یا تجزئے کے دوران اس افسانے کا ہر پہلو سے جائزہ لیا جانا چاہیے۔ ایک اندازے کے مطابق اس سلسلے میں زیادہ زور افسانے کے موضوع پر ہی دیا جا رہا ہے، جبکہ اسلوب و تکنیک کے بحث و مباحثے سے فراریت اختیار کی جاتی ہے۔ اس طرح جب ہم افسانے کی تنقید کا مطالعہ کرتے ہیں تو موضوعی تنقید کا پہلو اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں اور اب معروضی تنقید کے نام پر تنقید کے ایسی تفہیم، اصول و ضابطے پیش کئے جاتے ہیں کہ اسلوب و تکنیک کی دنیا سے آگے بات ہی نہیں بڑھتی۔ اسلئے ہمیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ افسانے کے

تجزیہ کے دوران موضوعی اور معروضی تنقید سے احتراز کرتے ہوئے خلاصہ بازی کے فن سے نکل کر اصل تجزیاتی فن کی اور قدم بڑھایا جائے، تاکہ افسانے کی شعریات پر مکالمہ قائم کیا جاسکے۔ زیر نظر تجزیہ میں عبدالغنی شیخ لداخی کا افسانہ ''دوملک، ایک کہانی'' ہجرت کے اضطراب کا کلامیہ کو ذہنی بے چینی اور تشکیک کے علاوہ سیاسی جارحیت پسندی کے حوالے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عبدالغنی شیخ لداخی خصوصاً جموں وکشمیر کے جدید اُردو افسانے کے ایک ایسے منفرد نام ہیں، جن کے افسانوی تجربوں اور اظہار کی تکنیک نے نئی نسل کو متاثر کیا ہے۔ زیر بحث افسانہ ادب اور تاریخ کا انوکھا رقص پیش کر رہا ہے۔ اس وقت بین الاقوامی سطح پر مہاجری ادب سب سے زیادہ بحث طلب موضوع ہے۔ دنیا کا ہر حصہ کسی نہ کسی صورت میں جدائی کے درد میں مبتلا ہے۔ جہاں اس سلسلے میں کہیں ایک دیواریں مسمار بھی ہوئیں۔ وہیں سیاست نے کئی ایک سطح پر نئی مضبوط دیواروں کی بھی بنیاد رکھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان جہاں آزادی کی مبارک خوشیوں سے ہمکنار ہوا، وہیں اس آزادی در آزادی نے ہجرت کی صورت میں نہ تھمنے والا کرب بھی ہمیشہ کے لئے عطا کیا۔ اردو ادب میں ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں ہجرت کے کرب کو اپنے وجود کا کرب بنالیا ہے۔ وہی منٹو نے افسانوی دنیا کو ہجرت کا ایک نیا بیانیہ عطا کیا۔ ہندوستان کی تقسیم کی خوفناک چیخیں جہاں پنجاب کے پانیوں میں بہتی ہوئی عیاں نظر آنے لگیں۔ وہیں کشمیر خصوصاً لدخ کے بالائی علاقوں میں ہجرت کا یہ درد وکرب تہہ در تہہ برف میں یوں جم گیا کہ سورج کی کرنیں بھی اسے عیاں کرنے میں تاب نہ لاسکی۔ لیکن عبدالغنی شیخ لداخی کے ذہن و دل میں اپنے بچپن کی وہ یادیں اب بھی محوِ سفر ہیں کہ اب میں کسے ''اکنی'' مانگوں، مجھے کون ''اکنی'' دے گا۔ حالانکہ یہ صرف اُس کا ہی غم نہیں ہے، بلکہ پورے کشمیر کا المیہ ہے۔

''دوملک، ایک کہانی'' کی کہانی، کہانی کار نے کچھ یوں بُنی ہے کہ اُس نے اپنے پاس موجود حقیقت پر مبنی مواد کو صفحہ قرطاس پر اتارا، کہ کس طرح اچانک چند سرکاری ملازمین تقسیم وطن کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور پھر واپس اپنے وطن لوٹ ہی نہیں پاتے۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے اس درد کو ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ کیسے ایک زبردستی کی کھینچی گئی خونی لکیر نے تحکم کی جلاوطنی کا علامیہ جاری کیا کہ قریب نصف صدی گزر جانے کے باوجود اِن بدنصیب لوگوں کو اپنے ہی گھر چند روز آنے کے

لئے کتنے ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور اس دوران یہ لوگ کس طرح جدائی کے کرب سے گزرتے رہے۔ حالانکہ یہ اپنے بچھڑے گھر کے اتنے قریب رہتے ہیں کہ جب کھیتوں میں کام کرتے ہیں یا مسجد سے آذانوں کی آواز بلند ہوتی ہے، تو یہ دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اپنے گھر آنے کے لئے انہیں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اسلام آباد سے دلی ہوتے ہوئے لیہہ آنا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ اس افسانے میں ہجرت کا موضوع تاریخ اور ادب کا انوکھا رقص پیش کر رہا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے افسانے میں متحدہ کشمیر کی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”۔۔۔۔۱۹۴۷ء سے پہلے بلتستان متحدہ کشمیر میں لداخ کا ایک تحصیل تھا۔ ڈوگرہ منتظم اعلیٰ جس کو وزیر کہا جاتا تھا، گرمیوں کے چھ ماہ لیہہ اور چھ ماہ سکردو میں گزارتا تھا۔ وزیر کے ہمراہ اس کا سارا عملہ ارکان سکردو جاتا تھا۔ میرا بھائی کلرک تھا۔“

(عبدالغنی شیخ لداخی، دو ملک، ایک کہانی، ص ۱۵۹)

ادب میں کسی خاص واقع کو صفحہ قرطاس پر اُتارنے سے پہلے تاریخ کی طرف رجوع کرنا ناگزیر بن جاتا ہے۔ تاریخ ہی ہمیں اُس خاص وقت کے بارے میں صحیح رائے فراہم کر سکتی۔ مگر یہ بھی دھیان میں رہے کہ ادب کی تاریخ کا معاملہ، عام تاریخ کے مقابلہ میں بے حد سنجیدہ، پیچیدہ اور نازک ہے۔ ادبی تاریخ عام تصور تاریخ، کے مطابق صرف دنوں کی گنتی نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:۔

”۔۔۔اصل فن کار وہ ہے، جس کا تاریخی شعور زندہ ہو۔“

(نئی تنقید، مرتب: خاور جمیل، ص ۸۳۔)

حالانکہ ادیب ادب میں فلسفیانہ اور لسانی شعور سے فراریت حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن تاریخی شعور کی اہمیت اس وجہ سے بھی غیر معمولی بن جاتی ہے کہ فلسفیانہ، لسانی اور دیگر تصورات کے بارے میں ہم تب ہی بات کر سکتے ہیں، جب ہمیں ادب پارے کی تاریخی اہمیت معلوم ہو، اسی کے ذریعے ہم فن پارے یا ادب پارے کا تعین زمان کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر ادبی شعور ہو، مگر تاریخی شعور نہ ہو، تو ہم کسی بھی چیز کا زمانی تعین نہیں کر سکتے۔ یاد رہے کہ ادب کو اپنا زمانی تعین کرنے کیلئے تاریخ سے استفادہ

کرنا پڑتا ہے۔اس طرح دو الگ الگ مکاتیب فکر آپس میں مل جاتے ہیں، (''تاریخ'' اور ''ادب'') اور ان کے ملنے کے عمل کے ردعمل میں ایک اور نئی چیز جنم لیتی ہے۔ جسے ہم ''ادبی تاریخ'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اس سے وابستہ مورخ اور ادیب، مورخ یا ادیب ہی نہیں رہتا، بلکہ ادبی مورخ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ادبی مورّخ کا کام ادیب اور مورّخ کے مقابلے میں اور بڑھ جاتا ہے، کیونکہ ادب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبی مورخ کو ان تمام سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی عوامل کا تجزیاتی مطالعہ بھی کرنا ہوتا ہے، جو کسی عہد کو مخصوص رنگ دے کر خصوصی تقاضوں پر مبنی خاص نوع کی فضائے تخلیق معرضِ وجود میں لاتے ہیں جو عوام کو بالعموم اور تخلیق کاروں کو بالخصوص خاص طرح کے نفسی سانچے میں ڈھال کر اس عہد یا زمانے کی فضائے تخلیق سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ادبی مورخ کیلئے یہ سب باتیں اور ان کے عمل اور ردعمل کا خیال رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ادبی مورخ کو ہر وقت درست اور صحیح ادبی تاریخ دینے کی ضرورت ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ادیب کے لئے کچھ اور شرائط بھی لازمی ہیں جن کی بنا پر ادب کو لافانی بنایا جاسکتا ہے۔جس میں ارضی، جغرافیائی، اقتصادی، سیاسی اور لسانی حالات وغیرہ شامل ہیں۔

افسانے سے لی گئی درج بالا سطور ڈوگرہ عہد کے حکومتی طریقہ کار کو پیش کرتا ہے۔ ہندوستان میں جموں وکشمیر واحد ریاست ہیں جہاں کا سرکاری مستقر ہر سال پابندی کے ساتھ چھ چھ مہینوں کے لئے بدلتا رہتا ہے۔گرمیوں میں ''سرینگر'' اور سردیوں میں ''جموں''۔ یہ سلسلہ ڈوگرہ حکمرانوں کا وضع کردہ ہے، جو آج بھی برابر حکومتی سطح پر قائم ودائم ہیں۔ مجوزہ افسانے سے یہ تاریخی پہلو اُجاگر ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ جموں، کشمیر اور لداخ کے اہم مقامات پر رسمی طور پر قائم تھا۔صرف جموں اور سرینگر تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ لداخ میں بھی سرکاری سطح پر چھ مہینوں کے لئے ''لیہہ'' اور چھ مہینوں کے لئے ''سکردو'' میں دربار برابر کھلتا تھا۔ یہاں پر افسانہ نگار نے صرف گرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ ''ڈوگرہ منتظم اعلیٰ جس کو وزیر کہا جاتا تھا، گرمیوں کے چھ ماہ لیہہ اور چھ ماہ سکردو میں گزارتا تھا۔'' ہوسکتا ہے کہ دربار موکا یہ سلسلہ بعض دور دراز علاقوں میں بھی ہوتا آیا ہو۔افسانہ نگار اس تاریخی واقعے کو بیان کرنے کے بعد ایک اور تاریخی واقعے کو نمناک لفظوں کے ساتھ بیان کر رہا ہے، وہ یہ کہ ۱۹۴۷ء میں بہر کیف ہندوستان برسوں کی غلامی سے آزاد تو ہوگیا۔لیکن یہ آزادی ہندوستان کی تقسیم کا المیہ بھی ساتھ لے آئی۔واقعہ

لداخ کا بیان ہوا ہے کہ دربار مو کے ساتھ جو سرکاری ملازمین سکردو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے چلے گئے، اسی دوران بلتستان پاکستان کے اور لیہ ہندوستان کے قبضے میں چلا گیا اور ایک نئی خونی لکیر جموں وکشمیر کا مقدر بن گئی اور جو لوگ وزیر وزارت کے ہمراہ دربار مو کے ساتھ اسکردو گئے وہ دوبارہ واپس نہیں لوٹے۔ اسی طرح کا معمہ اُن لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہوگا جو سکردو وغیرہ سے لیہ آئے تھے، واپس نہیں جا پائے۔ جدائی کی اس لکیر نے ایسی مستقل دراڑیں اور دیواریں بنا دیں کہ اچانک اپنے اجنبی ہو گئے۔ افسانہ نگار یہاں صرف۔ اپنے بھائی کے کھونے کا ماتم نہیں کر رہا ہے، بلکہ وہ ورثے کی تقسیم کا رونا بھی رو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''بلتستان اور لداخ کے لوگ نسلی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے بھی ایک ہیں۔ دونوں کی تاریخ اور جغرافیہ میں گہری یکسانیت ہے اور تو اور لوگوں کا مزاج اور افتاد طبعیت بھی ایک جیسی ہے۔''

(عبدلغنی شیخ لداخی، دو ملک، ایک کہانی، ص ۱۶۴)

افسانہ نگار کو ہر رنگ میں دو ممالک کی ایک ہی کہانی نظر آ رہی ہے۔ جب وہ رہن سہن کی بات کرتے ہیں تو وہ دلبرداشتہ ہوتے ہیں کہ اگر کہانی ایک ہی ہے تو یہ کہانی افسانہ کیوں ہو گئی۔ ثقافتی لحاظ سے ہوں یا مذہبی یا پھر لسانی، اس حصے کی ایک ہی تہذیب بکھر کر رہ گئی۔ تہذیب کے ذریعے سے ہی انسان کی اصل واقفیت بہم پہنچتی ہے۔ ایک انسان کو سمجھنے کے لئے اُسکی تہذیب کا مطالعہ لازمی ہے۔ کسی تہذیب کے مطالعہ سے اُس کے ادب کا صحیح مطالعہ کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہر تہذیب وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی چاہتی ہے۔ لیکن تبدیلی اس نام پر نہیں ہوتی کہ تہذیب اثر انداز ہو جائے، کیونکہ انسان تبدیلی چاہتا ہے۔ انسان کی اس تغیر پسندی کو سماج اور تہذیب کا پابند بتایا گیا ہے۔ اُسی سماج اور تہذیب کا، جس کی تعمیر انسان خود کرتا ہے۔ تہذیب کی تعمیر میں انسان کا بڑا حصہ ضرور ہے، لیکن کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی بناء پر اس کی تہذیب ڈھلتی ہے، تعمیر ہوتی ہے یا تباہ ہو جاتی ہے۔ اگر خارجی حالات اس کے حق میں ہیں، تو وہ تہذیب کی منازل آسانی کے ساتھ طے کرتی چلی جاتی ہے۔ ماضی کی صحت مند اقدار کی بازیافت ہر ادیب کے فن کا حصہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں افسانہ نگار

اپنی روایات سے دستبردار نہیں ہو رہا، بلکہ وہ بھائی کی جدائی کے ساتھ ساتھ روایت، ثقافت، تہذیب یا کلچر کے لٹ جانے کو بھی شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (۳) سماجی علوم میں اس ضمن میں لکھا گیا ہے:

''۔۔۔۔۔۔ کلچر کی اصطلاح انسانیاتی (anthropological) تناظر میں مخصوص معنوں میں کی جاتی ہے۔ اس خاص مفہوم میں کلچر سے مُراد انسان کا سماجی ورثہ ہوتا ہے۔ انسانی گروہ دو اعتبار سے باہم مختلف ہوتے ہیں، ان میں سے ایک جسمانی ساخت اور ہیت ہے اور دوسرا سماجی یا عمرانی ورثہ ۔۔۔۔۔۔۔ کلچر نہ صرف ورثے میں پایا جاتا ہے بلکہ انسان اپنے ارضی مسکن پر زندگی کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے اپنے ماحول میں تبدیلیاں بھی لاتا ہے اور کلچر کے اندر ردوبدل کا باعث بھی بنتا ہے۔''

(جامع اُردو انسائیکلوپیڈیا، جلد۳، (سماجی علوم)، ص ۴۸۷۔)

''دو ملک، ایک کہانی'' رشتوں اور ورثے کی تقسیم کا المیہ ہے، ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے دوران مہاجرین نے اکثر و بیشتر بڑے شہروں میں مستقل سکونت اختیار کی۔ لیکن اس کہانی میں جن لوگوں نے ہجرت کی، اُن میں افسانہ نگار کے بھائی کے علاوہ جن لوگوں کے نام ملتے ہیں اُن میں خاص طور پر ''منشی غلام محمد ٹاک، خواجہ محمد اقبال، منشی عبدالحمید، ماسٹر غلام نبی حمامی، صنم چھرنگ، منشی غلام نبی، عبدالسلام'' کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔ بیانیہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سب لوگ اسکردو سے باہر نہیں نکلے۔ چونکہ یہ لوگ مہاجر تھے اور مہاجروں کو رہنے کے لئے اُس دوران دارالسلطنت جیسے کراچی وغیرہ میں گھر اور زمینیں مل سکتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اِن لوگوں نے اسکردو سے ہجرت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کی ایک سب سے بڑی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اگرچہ ان کے لئے لیہہ سے غیر ممکنہ ہجرت قبول تھی، لیکن اس کے بعد اپنے کلچر سے مزید ہجرت قبول نہیں تھی۔ حالانکہ پاکستان اسلام کے نام پر الگ ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان کی تہذیب بھی قدرے یکساں تھی۔ اس کے باوجود اسکردو سے باہر جانا شاید انہیں اس میں تہذیبی تصادم کی صورت نظر آئی ہو کہ مختلف تہذیبوں سے تعلق

رکھنے والے لوگ ایک جغرافیائی حدود میں تہذیبی تصادم سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس نوزائد اسلامی ملک کے اندر اپنی آبادی میں موجود ایسی مسلم برادی کے چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں جو اپنی تہذیب و ثقافت اور اقدار پر اصرار کر رہی ہے اور باہری تہذیب، اس کی اقدار اور معاشرے میں مکمل شرکت سے بھاگی ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اونچے محلوں میں رہنے سے بہتر یہی سمجھا کہ اپنی تہذیب، کلچر اور زبان میں رہ کر ایک صحت مند ماحول کے لئے زمین ہموار کی جائے۔

''دو ملک، ایک کہانی'' کی کہانی میں افسانہ نگار نے بڑی ہی چابکدستی سے حقیقت کو بیان کرنے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ افسانہ نگار نے خونی لکیر کے دونوں اطراف میں ہونے والی مختلف واقعات کس طرح مہاجروں کی زندگیوں کو اجیرن بنا دیتی ہیں اور یہ عمل گزشتہ چھ دہائیوں سے جاری ہے۔ جس میں ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے کھلم کھلا زہر آلود پراپیگنڈا نشر کر کے ایک طرح کی ''سرد جنگ'' کئی مہینوں بلکہ برسوں تک جاری رہتی ہے، جس میں قومی اور مذہبی جذبات کو استعمال کرتے ہوئے ''دشمن'' کے خلاف نفرت کو ابھارا جاتا ہے۔ دونوں ممالک کے عوام میں ویزوں کے حصول اور سرحد پار سفر کرنے کی خواہش موجود ہے۔ یہ خواہش پوری ہونے کی امید ابھی ٹھیک سے قائم نہیں ہوتی کہ اس پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار اپنی اُن دشواریوں کو بیان کر رہا کہ کن دشوار گزار مراحل کو حل کرنے کے بعد وہ پاکستان پہنچے اور اس پر بدنصیبی یہ بیان ہو رہی کہ بھائی سے ملنے کے لئے ویزا نہیں دیا گیا۔ البتہ پاک جرمن تحقیقی پروجیکٹ اور پاک لوک ورثہ کے اشتراک سے پاکستانی دارالحکومت اسلام آباد میں ہندوکش قراقرم اور ہمالیہ کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار ہوا اور اس سمینار میں جانے کے لئے دعوت نامہ اور ویزا دونوں ملے۔ شرط یہ تھی کہ اسکردو نہیں جا سکتے تھے۔ اسی طرح کے معاملات ہندوستان میں پاکستانیوں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں۔ لوگ دلی جا سکتے ہیں لیکن آگرہ جانا اور تاج محل دیکھنا شجرہ ممنوعہ ہے۔

کہانی کار اپنے بھائی کو خط ارسال کرنے کے واقعات جس طریقے سے بیان کر رہا ہے، اسے قاری دنگ رہ جاتا ہے۔ غالبؔ انگریزوں کے لائے ہوئے ڈاک کے نظام سے بے حد متاثر تھے۔ اس نظام ڈاک کی یہ خصوصیت ہوتی تھی، نہ ہی خط ضائع ہوتا تھا۔ غالبؔ کو کلکتے کے سفر کے

دوران انگریزی ڈاک کی خوبیوں کا بار بار تجربہ ہوا، یہی وجہ ہے، وہ عموماً اپنے خطوط میں انگریزی ڈاک سے مستفید ہونے کی تلقین کر رہے تھے اور ہندوستانی نظام ڈاک کے نقائص کی اور دھیان کھینچ رہے تھے۔ یہی حال افسانہ نگار کا بھی ہوا ہے۔ اُس کے بھائی کے ساتھ اب کوئی رابطہ ہی نہیں، کیونکہ خطوط ایک دوسرے تک پہنچ ہی نہیں رہے ہیں۔ دوممالک کی آپسی رنجشوں نے اپنے ہی عوام کے جذبات کا خون کیا ہے۔ افسانہ نگار کے نہ جانے کتنے ہی خطوط ضائع ہو چکے ہیں۔ اب افسانہ نگار نے اپنے خطوط لیہہ آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے حوالے اس تاکید کے ساتھ کئے ہیں کہ جب آپ اپنے ممالک پہنچے گے، تو وہاں کی ڈاک ٹکٹ چسپاں کر کے ان خطوط کو اسکردو روانہ کریں اور یہ کوشش ثمر آور بھی ثابت ہوئی۔ یورپ، امریکہ وغیرہ سے خطوط تو پہنچ گئے۔ یہی طریقہ شاید اسکردو میں رہنے والے بھائی صاحب نے بھی اپنایا ہوگا۔ نام نہاد آزادی کے نصف صدی بعد بھی حاکموں کے ذہن زہر آلودہ ہیں اور سیاست اسی سے چمکتی بھی ہے۔ محرومی، ناخواندگی، غربت، بیروزگاری کی تاریکی نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سماجی اور معاشی تفریق نے اس خطے میں اس طرح قدم جمائے ہیں کہ لوگ آنکھ بند کر کے اسی تفریق کے ہرجائی ہو گئے ہیں۔

زیر بحث افسانہ ہجرت کی ایک الگ کہانی سنا رہا ہے۔ جو کہ اردو کے باقی ماندہ ہجری کہانیوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس کہانی میں ہجرت کا پس مہاجری درد وغم بیان ہوا ہے کہ کس طرح آنگن میں دیواریں حائل کی گئی ہیں۔ تقسیم وطن کے بعد روایتی افسانہ نگاری کا طلسم یکسر ٹوٹ گیا۔ ہجرت نے جس طرح کا مواد تخلیق کاروں کو میسر کیا وہ ہماری سماجی تاریخ کا حساس ترین موضوع بن گیا۔ اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ اور فرد کی بے بسی اور لاچاری نے انسان کے بنیادی رشتوں کی بدلتی صورتحال میں نئی تفہیم کی اور انسانی جذبات اور شکست وریخت کی ایک الگ اور منفرد تصویریں پیش کیں۔ ان موضوعات پر تخلیق کیے جانے والے افسانوں میں ایک ایسی گھٹن سے انسان تڑپ رہا کہ وہ خود سے بھاگنا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس افسانے میں جب غلام محمد کو اپنی اہلیہ کے انتقال کی خبر ملتی ہے، تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی خصلت اجتماعی زندگی گزارنے کی ہے۔ لیکن یہاں وہ کس کے شانوں پر سر رکھ کر روئے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی صدمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بجائے اس کے اُس کے دوست اُس کے پاس

آتے اور اُس کی دل جمعی کرتے ، اس کے برعکس اسے ہی اپنے دوستوں کے پاس جانا پڑا اور تعزیت کی یہ خبر سنانی پڑی۔ یہ واقعہ ان سب لوگوں کے لئے ایک بڑا اور بڑا سانحہ تھا۔ اس کے بعد جو حکمت عملی انہوں نے اپنائی اس کے بارے میں افسانہ نگار لکھتے ہیں:

> ''اس سانحہ کے بعد انہوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ ہر ایک کے نجی خط براہ راست مکتوب الیہ کے بجائے کسی دوسرے دوست کو ملا کرے۔ اب ڈاکیہ کے لئے منشی غلام محمد ٹاک ، منشی عبدالحمید تھا۔ منشی عبدالحمید، منشی غلام محمد ٹاک تھا۔ دین محمد، خواجہ محمد اقبال تھا۔''

(عبدلغنی شیخ لداخی ، دو ملک ، ایک کہانی ، ص ۱۶۰)

اس طرح کی صورتحال کو ہم تہذیبی و سماجی انتشار کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر معاشرتی تبدیلی وقوع پذیر ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنے لوگوں اور اپنی ثقافت سے کٹ کے رہ گئے تھے۔ ایسا اژدہام ہی معاشرتی اور سماجی تبدیلی کا موجب بنتا ہے، ثقافت معاشرے کا ایک ایسا پہلو ہے جس کا تعلق ان انسانی سرگرمیوں کے ساتھ ہے جو انسانی معاشرے میں انجام پاتی ہیں۔ پہلی ہجرت انسان کے شعور اور لاشعور میں ہمیشہ خواب خیال کی طرح بہتی رہتی ہے اور وہ اس سے بھاگ نہیں سکتا۔ یہ افسانہ بھی کماحقہ پہلی ہجرت کے ہی اضطراب کا ہی قصہ ہے۔ جو کوششیں افسانہ نگار یا اس کے بھائی نے اپنے بچھڑے وطن جانے کے لئے کی وہ اجتماعی حرکت افسانے میں نسل دوم کے یہاں نظر نہیں آرہی ہے اور نہ ہی افسانہ نگار اس اور توجہ کھینچ رہا ہے، بلکہ وہ خود اس کوشش میں ہیں کہ دوسری نسل بھی اس تعلق کو نہ توڑے۔

اگر اس افسانے کو فنی نقطہ سے دیکھا جائے، تو یوں لگتا ہے کہ یہ خاکہ کے قریب ہے۔ چونکہ اس میں ہجرت کا ایک دلخراش واقعہ تحریر ہوا ہے، اس تعلق سے یہ کہانی واقعاتی ہونے کے باوجود اپنے اندر کئی ایک معنوں میں افسانوی حسن بھی رکھتی ہے۔ اس افسانے میں جذبے کی صداقت، فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ کسی حد تک فنی پختگی بھی نظر آتی ہے۔ بہر کیف حقیقت پر مبنی یہ کہانی ایک تاریخی سانحہ کی گواہ ہے۔

......●●●......

افسانہ

●......عبدالغنی شیخ

بدلاؤ

پروفیسر سریندر ناتھ نے انگریزی ادب کے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ نصاب کے علاوہ انہوں نے کون کون سے ناول پڑھے ہیں۔ ''میری مراد شاہکار ناول ہیں۔'' پروفیسر بولے۔ ''جو بڑے مقبول ہیں۔ مختلف زبانوں میں جن کا ترجمہ ہوا ہے اور انعامات ملے ہیں۔'' پروفیسر نے اپنے شاگردوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

ان کے چار شاگردوں نے اپنے پسندیدہ ناولوں کا ذکر کیا۔ ان میں سنیتا شرما پیش پیش تھی۔ اس نے انگریزی، روسی، فرانسیسی اور کئی زبانوں کے شاہکار ناول پڑھے تھے جن میں کئی ناولوں کو نوبل پرائز اور بوکر پرائز ملے تھے۔ پروفیسر نے سنیتا شرما کی تعریف کی اور کہا۔ ''صرف لطف اندوزی کے لئے ہی نہیں پڑھو بلکہ کچھ سیکھنے کے لئے پڑھو۔ ایک سنجیدہ قاری زبان کے علاوہ مصنف کی تخلیقی صلاحیت، تخیل کی اڑان، منظر نگاری اور کردار نگاری سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے اور اسے قاری کے تخلیقی مادہ کو جلا ملتی ہے۔''

پھر پروفیسر دوسرے شاگردوں کی طرف راغب ہوئے اور یکے بعد دیگرے ہر ایک کو اپنا سوال دہرایا۔

سلیم کا دل دھڑکنے لگا۔ پھر اس کی باری آئی۔

''ہاں، سلیم بتاؤ۔''

''سر، دوستو وسکی کا، جرم وسزا، سلیم بولا۔''

پروفیسر بولے۔ ''بڑا اچھا ناول ہے۔''

سلیم کی نظر پھسلتی ہوئی ایک لمحہ کے لئے حمیرہ پر پڑی۔

'جرم وسزا' کے مرکزی کردار کا کیا نام ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

سلیم کا چہرہ سرخ ہوا۔ اور بولا ''سر، اس ناول کو پڑھے ہوئے بہت دن ہوئے۔ مجھے یاد نہیں۔''

''کسی اور ناول کے اہم کردار کا نام بتا سکتے ہو؟''

''شرلاک ہومز'' سلیم بولا

''ہاں، شرلاک ہومز سر کینن ڈائل کے جاسوسی ناولوں کا مرکزی کردار ہے'' پروفیسر بولے۔

''خدا نے میری لاج رکھ لی۔'' سلیم نے دل ہی دل میں سوچا اور اس کی نظر پھر حمیرہ پر پڑی۔

''شرلاک ہومز ایک شہرہ آفاق کردار ہے۔'' سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پروفیسر نے کہا۔ ''ستم ظریفی ہے کہ اس کے برعکس اس کا مصنف سر کینن ڈائل گمنام ہے۔ ایک واردات میں جب مصنف نے شرلاک ہومز کی موت دکھائی تو لوگوں نے سخت احتجاج کیا۔ لندن میں اس کے پرستاروں نے جلوس نکالا اور مصنف کو اپنے سراغ رساں کیریکٹر کو از سر نو زندہ کرنا پڑا۔ ہومز کے ان گنت شیدائی اپنے ہیرو کے نام پر ایک یادگار تعمیر کرنے کی مانگ کرتے آئے ہیں۔ جاپان اور سوئزرلینڈ میں اس کی مورتیاں نصب ہیں۔ لندن کے 221 / بی بیکر اسٹریٹ میں شرلاک ہومز میوزیم ہے۔ اس پر 175 سے زیادہ فلمیں بنی ہیں۔''

پروفیسر اپنے شاگردوں میں بڑے مقبول تھے۔ وہ اپنا لیکچر نصابی کتابوں کی درس وتدریس تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ موضوع سے وابستہ دوسری معلومات فراہم کرتے تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ انگریزی پڑھنے کا مقصد درسی کتابیں پڑھا کر امتحان پاس کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد انگریزی کتابوں کی نگارشات سمجھنا، اس میں بات چیت کرنا اور لکھنے کی صلاحیت حاصل کرنا ہے۔

پروفیسر کے چلے جانے کے بعد امیت بولا۔ ''آج کی مجلس کی ہیروئین سنیتا ہے۔''

''یہ تو چھپا رستم نکلی۔'' وجے نے تائید کی۔

''آج اس نے پڑھنے کے لئے کون سا ناول لایا ہے؟'' راشد نے پوچھا۔

''کچھ نہیں لایا ہے۔''

''یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ صبح یہ بس میں ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔'' سنگیتا بولی۔

''اس کے بیگ کی تلاشی لو۔'' انیل بولا۔

''بملا نے بیگ چھین لیا اور بیگ سے کتاب نکال کر اسے گھما لہرا کر بولی۔

''اینا کرینا۔ لیوٹالسٹائی۔''

''جھوٹ نکلا۔'' حمیرہ بولی۔

''تم اپنا بیگ دکھاؤ۔'' سنیتا شرما بولی۔

''میں کہاں پڑھتی ہوں!''

''حمیرا خود ایک ناول ہے۔'' ماجد بولا۔

''کیا مطلب؟'' حمیرہ کی تیوری پر بل آئے۔

''میرا مطلب ہے۔ ایک دلچسپ ناول کی خوبصورت ترین کریکٹر۔''

''واہیات بکتے ہو۔'' حمیرہ غصے سے بولی۔

''ماجد سچ کہتا ہے۔'' سلیم نے زبان تک آکر اپنے الفاظ واپس لئے۔

سلیم نے ایک ہفتہ پہلے حمیرہ کو یونیورسٹی کے کیمپس میں چند سہیلیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ ماجد کے ہمراہ وہاں شہناز کو ایک کتاب دینے آیا تھا۔ حمیرہ کے دلکش تیکھے نقوش دیکھ کر وہ اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ جب حمیرہ کھڑی ہوئی تو اس کا سڈول بدن اور لمبی قامت قیامت ڈھانے لگی۔ جب وہ مسکرائی تو اس پر بجلی سی گری۔

''کسی کسی پر قدرت کتنی مہربان ہوتی ہے! یہ لڑکی سراپا حسن ہے۔'' سلیم نے دل ہی دل میں سوچا۔

''شہناز کے ساتھ وہ لڑکی کون تھی؟'' اس نے ماجد سے پوچھا۔

''حمیرہ! اگر یہ لڑکی عالمی مقابلہ حسن میں حصہ لے تو یقیناً مس ورلڈ منتخب ہوسکتی ہے۔'' ماجد بولا۔

دوسرے روز پروفیسر سریندر ناتھ نے ایک نیا موضوع لیا۔

’’جانتے ہوایک کامیاب ادیب اپنی تخلیق کے لئے کتنی ریاضت کرتا ہے۔‘‘

انہوں نے اپنے منفرد انداز میں سوال کیا۔اس کا جواب وہ خود دینے لگے۔

’’افلاطون نے اپنی مشہور کتاب The Republic کے پہلے جملے کو دلکش اور دلنشیں بنانے کے لئے پچاس مرتبہ لکھا۔ہمینگوے نے اپنے مقبول ناول A Farewell to Arms کا آخری صفحہ 39 رمرتبہ لکھا۔گولڈ اسمتھ چار مصرعہ لکھنا دن بھر کا کام سمجھتا تھا۔ذین گیرے ایک کہانی لکھنے کے لئے مہینوں بلکہ ایک سال سے بھی زیادہ مدت محنت کرتا تھا۔وہ اسے بار بار دیکھتا۔کرداروں کو بدلتا۔پلاٹ میں تبدیلی لاتا اور پھر اسے پڑھتا تھا۔کارل مارکس نے Das Capital کی تصنیف کے سلسلے میں پندرہ سو زائد کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس پر چالیس سال کام کیا......‘‘

پروفیسر مثالوں پر مثالیں دینے لگے۔

ایک دن حمیرہ ایک لڑکی کے ہمراہ کلاس سے آرہی تھی۔شوخ رنگ کے سوئٹر میں وہ اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی۔سلیم نے سوچا۔’’ہر لباس اس کے بدن پر پھبتا ہے اور ہر زاویہ سے وہ دلکش نظر آتی ہے۔‘‘

’’کیا پروفیسر صاحب کلاس میں ہیں؟‘‘اس نے حمیرہ سے پوچھا۔

’’خود جاکر دیکھ لو۔‘‘وہ رکھائی سے بولی۔

’’حمیرہ! یہ کیا بدتمیزی ہے! اخلاق سے بات کرو۔کیا سوال کا اس طرح سے جواب دیا جاتا ہے۔‘‘حمیرہ کے ساتھ والی لڑکی نے ڈپٹ پلائی۔

’’آپ اس کی بات کو برا نہ مانیں۔‘‘اس نے سلیم سے معذرت کا اظہار کیا۔

’’نہیں، میں نے برا نہیں مانا۔‘‘

’’پروفیسر صاحب کلاس میں نہیں ہیں۔‘‘لڑکی بولی۔

’’آپ سے تعارف نہیں ہے!‘‘سلیم مجسم سوال بن گیا۔

’’مجھے منیرہ کہتے ہیں۔‘‘

سلیم نے سنا تھا کہ حمیرہ کی ایک جڑواں بہن ہے۔ہو نہ ہو، یہ وہی ہے۔اور وہی تھی۔اس

نے یہ بھی سنا تھا کہ دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ حمیرہ جہاں تیز ہے، منیرہ حلیم ہے۔ دونوں کی شکل وصورت میں بھی بڑا فرق ہے۔ حمیرہ بڑی خوبصورت ہے اور منیرہ عام شکل وشباہت کی لڑکی ہے۔

سلیم نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا۔ وہ یونیورسٹی کی بغل میں فردوس ریستوران میں چائے پی رہے تھے۔

''اس کو اپنے حسن کا بڑا ناز ہے۔'' راشد بولا۔ ''اور تعریفوں نے بڑا مغرور بنا دیا ہے۔''

''دراصل چند امیر زادوں نے اس کو سر چڑھا رکھا ہے۔ اس لئے نک چڑھی ہوگئی ہے۔''

ارشد بولا

انل بولا۔ ''حسن ایک اضافی چیز ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر دو آنکھیں، دو کان اور ناک ہوتی ہے۔''

''لیکن کسی کسی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے اور اس کا تیرِ نظر کسی کو بھی گھائل کر سکتا ہے۔'' ماجد بولا ''تم نے وہ نظم نہیں پڑھی۔ جس میں پتنگا شمع پر فدا ہوتا ہے۔ بھونرا پھول پر مرتا ہے اور جگنو ستارہ کی چاہ رکھتا ہے۔''

''یہ انسان کی اپنی اپنی سوچ اور سوچنے کا انداز ہے۔'' انل بولا

ایک روز حمیرہ سلیم کے پاس آئی۔

''کل آپ نے کلاس اٹینڈ کی؟'' حمیرہ نے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''میں کل نہیں آئی تھی۔ مجھے کل کے سبق کا نوٹ چاہئے۔ آپ کے ساتھ نوٹ بک ہوگا؟''

''میں نے سرسری سا لکھا ہے۔ آپ چاہیں تو میں لکھ کر دوں گا۔''

''آپ دیجئے۔ کل تک دے سکتے ہیں۔''

سلیم کا دل جھوم اٹھا۔ جیسے اچانک ایک خزانہ ملا ہو یا کوئی بڑا اعزاز ملا ہو۔

سلیم نے دوسرے روز نوٹ بنا کر دیا۔ اور حمیرہ نے شکریہ ادا کیا۔

''جب بھی میری مدد کی ضرورت ہو۔ مجھے کہا کیجئے۔'' سلیم بولا

اس کے دوسرے روز جب وہ کیمپس سے گزر رہا تھا تو حمیرہ ایک لڑکی سے غصہ بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ پہلے اپنی اوقات دیکھ لیتا۔''

سلیم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف ہے۔

اس روز پروفیسر نے حقیقت نگاری پر ایک لیکچر دیا۔اور حسب معمول مثالیں دیں۔ پروفیسر نے ایک انگریز قلم کار پیٹر مورٹمز سے متعلق بتایا کہ اس نے محض تجربے کے لئے انگلینڈ میں ایک دھیلا لئے بغیر تقریباً ایک ماہ کے دوران اپنے کتے کے ہمراہ لگ بھگ آٹھ سو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ اپنے سفر نامہ My Peniless Journey میں اپنے تجربوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس دوران کیسے کیسے ٹٹ پونجی لوگوں سے اس کا پالا پڑا۔ کیسے کیسے مسافر اس کی مدد کے لئے آگے آئے اور کیسے کیسے لوگ مصنف کے ساتھ سرد مہری اور رکھائی سے پیش آئے۔

پروفیسر نے بتایا کہ معروف ادیب جارج آرویل نے اپنی کتاب Down And Out in Paris and London لکھنے کے لئے رضا کارانہ طور پر انتہائی غریبی اور بے بسی کی زندگی بسر کی۔ مصنف نے کتاب میں ٹیلی فون ڈائریکٹری کی طرح رین بسیراؤں کی فہرست دی ہے جہاں بے خانماں اور غریب لوگ رات بسیرا کرتے تھے۔

چارلس ڈکنز کی ایک اولاد مونیکا ڈکنز نے ایک خادم کی زندگی سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ایک گھر میں بطور نوکرانی کام کیا۔

جاسوسی اور جرائم پر لکھنے والی امریکی ادیبہ پٹریشیا کورن ویل نے محض مشاہدے اور تجربے کے لئے سرجیکل وارڈ اور مردہ خانہ میں ڈاکٹروں کے ساتھ روزانہ بارہ بارہ گھنٹے گزار دیئے۔''

پروفیسر نے ایسی کئی مثالیں دیں اور طلبہ کو تاکید کی کہ فکشن لکھتے وقت حقائق کا دامن کبھی نہ چھوڑیں۔

گرمیوں کی تعطیلات کے بعد جب سلیم اپنے گاؤں سے لوٹا تو خوش خبری اس کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کے لئے منتخب ہوا ہے۔ گریجویشن کے بعد اس نے دو مرتبہ سول سروسز کا امتحان دیا تھا لیکن ناکام ہوا تھا اور اب تیسری مرتبہ اس کی محنت اور کوشش بر آئی تھی۔

کچھ مدت کے بعد اس کو ٹریننگ کے لئے بلایا گیا۔ اسی اثناء میں وہ منیرہ سے گھل مل گیا تھا۔ منیرہ سے کہا: ''منیرہ، میری محبت تمہاری امانت ہے۔ حمیرہ اور میرے درمیان تم سے بڑھ کر اور کوئی معتبر اور مستند امانت دار نہیں ہو سکتا ہے۔''

''آپ کے بارے میں ابو اور امی سے ہمارے گھر میں کئی دفعہ باتیں ہوئی ہیں۔ آپ مطمئن رہئے۔''

''یہ الفاظ میرے لئے بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ میں یہاں سے پر امید جا رہا ہوں۔''

منیرہ اور سلیم کے درمیان گاہے گاہے فون پر باتیں ہوتی رہیں۔ دو مرتبہ حمیرہ سے بھی باتیں ہوئیں۔

پھر یک لخت سلیم کا فون آنا بند ہوا۔ اور دو مرتبہ سلیم نے منیرہ کا فون نہیں اٹھایا۔ سلیم نے جب مسلسل چار ماہ تک فون نہیں کیا تو منیرہ نے سلیم سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ خیر خیریت پوچھنے کے بعد منیرہ نے فون نہ کرنے پر گلا کیا تو سلیم نے اس کی وجہ مصروفیات اور اپنی کاہلی بتائی۔

منیرہ بولی۔ ''آج مجھے فون کرنے کی ضرورت اس لئے بھی پڑی ہے کہ حمیرہ کو ایک بہت اچھے گھرانے سے پیغام آیا ہے۔ امی کہتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ سلیم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے تو اسی کے مطابق فیصلہ لینا ہوگا۔'' منیرہ صاف صاف بولی

''میں دو روز بعد آ رہا ہوں۔ پھر تفصیل سے باتیں کریں گے۔'' سلیم بولا

''آپ کو معلوم ہے کہ حمیرہ کو اس دوران دو اور اچھے گھرانوں سے پیغامات آئے تھے۔

''بس دو دن کی بات ہے۔ ہم کہاں ملیں گے؟''

''کہاں ملیں گے؟''

''کیا فردوس ٹھیک رہے گا؟ سلیم بولا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔''

''شہر پہنچنے پر میں فون کروں گا۔''

''بہتر۔''

وہ فردوس میں ملے۔ اس روز اتوار تھا۔ اس لئے ریستوران میں کوئی طالب علم نظر نہیں آ رہا تھا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد سلیم اپنے مقصد پر آیا۔

سلیم نے منیرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ جھجکتے اور کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ ''منیرہ! میں تمہیں چاہتا ہوں۔''

منیرہ مجسم حیرت بنکر چند لمحوں کے لئے سلیم کو دیکھنے لگی۔

''اگر تمہیں قبول ہو تو میں تمہارے ابو اور امی کو پیغام دوں گا۔''

سلیم، یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' منیرہ بولی۔ ''تم نے حمیرہ سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔ میرے والدین کیا سوچیں گے! میں ان کو کیسے اپنا منہ دکھاؤں! کیا آپ نے اس پر سوچا ہے؟''

''حمیرہ کی شادی کسی اچھے گھرانے میں کرا دو۔ اگر تم مجھے قبول کرو، تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھوں گا۔''

''سلیم، مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آپ نے میرے لئے ایک بڑا مسئلہ پیدا کیا ہے۔ آپ میں اچانک یہ بدلاؤ کیسے آیا؟''

''منیرہ، زندگی میں بدلاؤ ایک دفعہ آ سکتا ہے۔ بار بار نہیں آتا۔ میں تم سے 'نا' سننا نہیں چاہتا منیرہ!''

سلیم نے منیرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کبھی کبھی ہاتھ کا لمس وہ باتیں کہہ دیتا ہے جو زبان نہیں کہہ سکتی۔

......●●●......

تجزیہ

● ......محمد یوسف مشہورؔ

''بدلاؤ''...... چند توجیہات

مرحوم مولانا شبلی نعمانی کے مشہور قول کا مفہوم ہے کہ جب کسی سماج میں فکری پستی پیدا ہوتی ہے تو وہاں افسانوی ادب کو فروغ ملتا ہے۔ اِس رائے سے دو صورتیں وجود میں آئی ہیں جن سے اتفاق واختلاف کی کافی گنجائش موجود ہے۔ اوّل الذکر صورت میں افسانوی ادب کا وہ وافر ذخیرہ بطور ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے جس میں فکری گہرائی وگیرائی نام کی کوئی شے ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی ہے۔ صرف جذبات کا چڑھتا اُترتا طوفان ہے جس کی نوعیت ہنگامی ہے۔ آخر الذّکر صورت میں وہ شاہکار تخلیقات پیش کی جاسکتی ہیں جن میں فنی پختگی کے علاوہ علمی بصیرت اور حکمت ودانائی کے لعل وگہر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دستیاب ہیں۔ اردو زبان کے فکشن میں دونوں نوع کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ ایسے فکشن نگاروں کی تعداد اچھی خاصی ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے علوم وفنون کی باریکیوں کو دل نشین انداز میں اپنے قارئین تک پہنچا کر اُنہیں فیض یاب کیا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اُنہوں نے کوئی خطیبانہ یا واعظانہ اسلوب اختیار نہیں کیا بلکہ فنی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ اِس زُمرے میں جن افسانہ نگاروں کو شامل کیا جاسکتا ہے انہوں نے کہانی کی بنت، پس منظر، کردار، مکالمہ اور زبان کے تخلیقی استعمال سے خوب استفادہ کیا ہے۔ جدید فکشن نفسیات سے استفادہ کرتے ہوئے کردار کے شعور وتحت الشعور میں اس طرح غواصی کرتا ہے کہ کبھی کبھی خود کردار بھی اس انکشاف سے حیرت زدہ ہوتا ہے کہ اُس کے چھپائے ہوئے اسرار کی پوٹلی کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ع

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اِس قبیل کے زرخیز و متمول افسانوں میں ہم عبدالغنی شیخ کا افسانہ ''بدلاؤ'' بطورِ خاص مثال پیش کر سکتے ہیں۔ ''بدلاؤ'' لفظ خود ہمارے بدلتے ہوئے لسانی رویئے کا غماز ہے جو ہمارے روزمرہ اور سماجی زندگی سے اثر قبول کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ عربی مصدر تبدّل سے تبادل اور تبدیلی کی بجائے بدلاؤ کا اشتقاق ہندوستانی لسانی ماحول سے اثر پذیری کی واضح مثال ہے۔ اس قسم کی کوشش ہمارے لسانی رویے کی خاصیت رہی ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کو ہندیانے کا عمل لسانیاتی اعتبار سے قابلِ ستائش تصرف ہے۔ اس قسم کی کوشش ایک طرف زبان میں وسعت کا باعث ہے تو دوسری طرف لسانی روا داری کی جانب اچھا اقدام۔ ''بدلاؤ'' عنوان قائم کر کے عام قارئین کے لئے آسانی پیدا کی گئی ہے جو اسے اُلجھاو، سلجھاؤ اور برتاؤ کے وزن پر اسم کے معنی میں بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یہی عنوان قاری کو بالکل ابتداء میں ہی مضبوط گرفت میں لے کر منہمک کرتا ہے کہ دیکھیں کہانی میں کس موڑ پر کس طرح کا بدلاؤ آتا ہے۔ اسی بات کی تلاش میں قاری کہانی کے مطالعہ میں جُٹ جاتا ہے۔ دورانِ مطالعہ کہانی میں ایک نہیں، کئی ایک بدلاؤ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک بدلاؤ وہ ہے جو خود کہانی کار نے کہانی کے ٹریٹ منٹ میں روا رکھا ہے۔ کہانی کے دلچسپ انداز میں آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ علم و آگہی کے کارآمد نکات نہایت فنکارانہ طریقے سے سمجھائے جاتے ہیں۔ کیا مجال کہ قاری روایتی کلاس میں بیٹھے طالب علم کی طرح بوریت محسوس کرے اور دلچسپی کھو بیٹھے۔ استاد (پروفیسر سریندر ناتھ) ماہرِ تعلیم کی طرح اپنے شاگردوں کا شوقِ مطالعہ اور ذوقِ آگاہی بڑھانے کے لئے اُنہیں محدود نصابی کتب کے مطالعہ سے زیادہ وسیع اور سنجیدہ مطالعہ کی طرف راغب کرتا ہے۔ وہ انہیں اپنے کلاس روم لیکچر میں عملی طور شریک کرتا ہے جس سے اُن کی دلچسپی برابر بنی رہتی ہے۔ وہ ان کی طرف فرداً فرداً توجہ کرتا ہے مگر اُن کی معمول حرکتوں سے جو اُن کی عمر کا فطری تقاضا ہیں مصلحتاً صرفِ نظر کرتا ہے۔ افسانہ کو علمی سے زیادہ تعلیمی بنانے کے لئے تخلیق کار نے پروفیسر سریندر ناتھ جیسے ماہر تعلیم کا کردار خلق کیا ہے جس کا مطالعہ نہایت وسیع ہے۔ وہ باتوں باتوں میں اپنے شاگردوں کے علمی، ادبی اور فنی ذوق کو پروان چڑھاتا ہے عام قارئین عموماً اور تدریسی پیشہ سے وابستہ قارئین اس کہانی سے انسپائریشن حاصل کر سکتے ہیں۔ پروفیسر

سریندر ناتھ اگرچہ انگریزی زبان وادب کا استاد ہے مگر اس کی استادانہ شخصیت ہر مضمون کے اساتذہ اور طلباء کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ اُس کا اپنا مطالعہ تو وسیع ہے ہی مگر وہ اپنے شاگردوں کو بھی اس سے منوّر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ فنکارانہ اور خلاقانہ طریق کار اپناتا ہے۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں ہے کہ اپنے شاگردوں کو نصابی کتب میں قید رکھتے اور اُن کے ذہنوں پر امتحان کا بھوت سوار کردے۔ وہ انہیں نصاب اور امتحان کے خوف سے آزاد کر کے آزادانہ ماحول میں علم وعرفان کے موتی اپنے دامن میں سمیٹنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ انہیں دنیا کے ادبی شاہکاروں سے متعارف کراتا اور ساتھ ہی اِن کے ترجموں کی اہمیت بھی ذہن نشین کراتا ہے۔ ترجمہ بین اللسانی و بین الاقوامی علمی وادبی وراثت کو ہر ایک اہلِ ذوق تک پہنچانے کا کارگر وسیلہ ہے۔ استاد یہ سب باتیں شاگردوں کو اس لئے سکھاتا ہے تاکہ وہ آگے چل کر تخلیقِ ادب کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دینے کے اہل بن جائیں۔ یہ کام اگرچہ آسان نہیں ہے مگر ناممکن بھی نہیں، محنت اور لگن سے کچھ بھی ممکن ہے۔ اُسے محنتِ شاقہ پر پورا یقین ہے۔ وہ طلباء وطالبات کے سامنے دنیائے علم وادب کی چوٹی کی شخصیات کے کارنامے رکھتا ہے جو اُنہوں نے سخت اور پیہم جدوجہد کر کے انجام دیئے ہیں۔ پروفیسر سریندر ناتھ کی زبانی دو مختصر اقتباس ملاحظہ ہوں:

"جانتے ہو! ایک کامیاب ادیب اپنی تخلیق کے لئے کتنی ریاضت کرتا ہے...... افلاطون نے اپنی مشہور کتاب The Republic کے پہلے جملے کو دل کش اور دل نشین بنانے کے لئے پچاس مرتبہ لکھا۔ ہیمنگوے نے اپنے مقبول ناول A Farewell to Arms کا آخری صفحہ ۳۹ مرتبہ لکھا۔ گولڈ اسمتھ چار مصرعے لکھنا دن بھر کا کام سمجھتا تھا۔ ذین گیرے ایک کہانی لکھنے کے لئے مہینوں بلکہ ایک سال سے بھی زیادہ مدت محنت کرتا تھا۔ وہ اسے بار بار دیکھتا۔ کرداروں کو بدلتا۔ پلاٹ میں تبدیلی لاتا اور پھر اسے پڑھتا تھا۔ کارل مارکس نے Das Capital کی تصنیف کے سلسلے میں پندرہ سو سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس پر چالیس سال کام کیا۔"

کہانی کا مرکزی کردار سلیم پروفیسر سریندر ناتھ کا ایک طالبِ علم ہے۔ وہ اپنی ہم جماعت حمیرہ کے حُسن وجمال پر فریفتہ ہے۔ حمیرہ، سلیم کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ نہایت

گھمنڈی ہے۔ اس کی جڑواں بہن منیرہ نرم مزاج اور سلیقہ مند ہے۔ وہ سلیم کے آئی۔اے۔ایس میں کامیابی کے بعد اُس کو حمیرہ کا ہاتھ تھامنے کے سلسلے میں کوشش کرتی ہے۔ جب فون پر بات کرنے کے بعد سلیم اور منیرہ فردوس ریستوران میں ملتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلیم کی پسند میں بدلاؤ آ گیا ہے۔ وہ اب مغرور حمیرہ کا خیال ترک کر کے منیرہ میں اپنی دل چسپی ظاہر کرتا ہے حالانکہ وہ نسبتاً کم شکل وصورت کی مالک ہے۔ شاید افسانہ نگار حسنِ اخلاق کو حُسن صورت پر ترجیح دینے کی وکالت کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منیرہ نے ہوٹل میں سلیم سے ملاقات کے دوران اپنے اندر کچھ ایسا بدلاؤ لایا ہو جس سے سلیم حمیرہ کو بھول کر منیرہ کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ شاید حمیرہ کی طرح 'تیوری پر بل' لانے اور غصہ جھاڑنے والوں کی قسمت اچانک بدل جاتی ہے اور وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

کہانی اگرچہ کرداروں کے مکالموں کے ذریعے مرحلہ وار آگے بڑھتی ہے تاہم اِس غرض کے لئے راوی کے بیانیہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ 'بدلاؤ' میں راوی کا کردار پروفیسر کے کردار کے بعد بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کہانی کے سبھی کرداروں کی ترجمانی کرتا ہے۔ بظاہر کہانی میں تخلیق کار کا کوئی اتا پتہ یا Signature نہیں ہے لیکن سریندر ناتھ کو راوی کی زبانی بڑھ چڑھ کر پیش کرنا تخلیق کار کا سُراغ بتاتا ہے۔ وہ بیانیہ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔ وہ فن میں مقصدیت اور سماجی اصلاح کا قائل ہے۔ خاص طور سے اس کی توجہ کا مرکز نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو ہر قسم کے بدلاؤ میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ وہ بھلا ہی مختلف مذہبی عقیدوں اور پیشوں سے وابستہ ہوں مگر روشن خیالی اُن میں قدرِ مشترک ہے۔ چنانچہ سلیم، امیت، راشد، ماجد، انل، ارشد، شہناز، سُنیتا، حمیرہ، منیرہ، بملا اور سنگیتا تعلیم کے نور سے آراستہ ہونے کی وجہ سے کسی تنگ نظری کے شکار نہیں ہیں۔ آپس میں بے تکلف مگر علمی گفتگو کرتے ہیں۔ اپنے گھریلو اور عقیدتی پسِ منظر کو رکاوٹ بننے نہیں دیتے۔ استاد انہیں حقیقت پسندی کا درس دیتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ عالمی ادب وثقافت کی روشن مثالیں اُن کے سامنے رکھتا ہے۔ کہانی میں استاد اور شاگردوں کا مقدس رشتہ قابلِ رشک ہے۔ جہاں عزت واحترام اور شفقت کا بول بالا ہے۔ دھونس دباؤ اور خوف وخطر کا ماحول موجود نہیں ہے۔ امتحان، نمبرات، ڈویژن، رزلٹ اور پاس فیل کا کوئی چکر نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے نامی مفکروں، ادیبوں اور فن کاروں کی اعلیٰ پایہ تصانیف کی روح تک

رسائی کرنا اور اِن سے فیض حاصل کرنا اصل غرض و غایت ہے۔ فضولیات اور وقت ضائع کرنے سے دور رہتے ہیں۔ چائے خانے میں بھی دانشورانہ مکالمہ جاری رکھتے ہیں۔ تاہم بشری تقاضوں پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ مخالف جنس کے جسمانی و اخلاقی حسن میں دلچسپی لینے پر کوئی پابندی نہیں ہے محنت و مشقت کو وظیفہ حیات سمجھا جاتا ہے۔ امتحان میں ایک یا دو بار فیل ہونے پر بھی حوصلہ قائم رکھا جاتا ہے جس سے کامیابی تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ وہ کسی طرح سے مَردوں کے پیچھے یا احساسِ کمتری کی شکار نہیں ہیں۔ سنیتا ایک خاتون ہونے کے باوجود اپنے ہم درسوں سے مطالعے میں آگے ہے۔

ادبی شاہکاروں سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ادیب اور فن کار اپنے پسندیدہ کردار کو اپنی شخصیت سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس کو پروان چڑھانے کے لئے تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ چنانچہ کینن ڈوئل کے جاسوسی ناولوں کا کردار شرلاک ہومز اپنے خالق سے کہیں زیادہ معروف اور ہر دل عزیز ہے۔ یہ قلم کار کے قلم کا جادو ہے کہ قارئین اُس سے زیادہ اس کے تخلیق کردہ کردار پر فریفتہ ہیں۔ 'بدلاؤ' میں استاد اپنے شاگردوں کو سنجیدہ مطالعہ اور گہرے تجربے کی اہمیت واضح کرتا ہے تاکہ وہ بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھاریں اور ایسے کردار تخلیق کریں جو اَمر ہو جائیں۔

خود افسانہ نگار راوی اور پروفیسر کے قالب میں چھپ کر اساتذہ فن و ادب کو باذوق قارئین کو فیض پہنچانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ملی جلی ثقافت اور انسانی اخوت کو مقامیت اور دیگر حد بندیوں پر ترجیح دیتا ہے۔ عالم گیریت اور آفاقیت کی حمایت کرتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زبان میں تخلیق شدہ علم و ادب ساری انسانیت کی میراث ہے۔ اس سلسلے میں کسی تعصب کا شکار نہیں ہونا چاہتا ہے۔ حقیقت نگاری ہی مطمح نظر ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ادیبوں، شاعروں اور دوسرے تخلیقی فنکاروں کو اپنے اپروچ میں بدلاؤ لانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کہانی کے راوی کی زبانی کہا جاتا ہے کہ:

''جاسوسی اور جرائم پر لکھنے والی امریکی ادیبہ پٹریشیا کورن ویل نے محض مشاہدے اور تجربے کے لئے سرجیکل وارڈ اور مردہ خانے میں ڈاکٹروں کے ساتھ روزانہ بارہ گھنٹے گزار دیئے۔''

"چارلس ڈکنز کی ایک اولاد مونیکا ڈکنز نے ایک خادم کی زندگی سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ایک گھر میں بطور نوکرانی کام کیا۔"

ادب کو زندگی کے قریب لانے کے لئے حقیقت نگاری اور قریبی مشاہدے کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ چاہے اس کو حاصل کرنے کے لئے دشواریاں جھیلنا پڑیں۔ عیش و آرام کو رضا کارانہ طور اور مصلحتاً چھوڑنا پڑیں۔ صوفی کی طرح ترکِ لذات اور نفس کشی سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا ہے۔ تب جا کر بصیرت افروز فن پارہ دنیا کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

الغرض 'بدلاؤ' ایک قابلِ توجہ افسانہ ہے جسے عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں ہی نہیں بلکہ پورے اردو افسانوی ادب میں خاص مقام دیا جانا چاہیئے۔ اِس کی علمیت قاری کو مسرور و محظوظ کرتی ہے۔ معرفتِ باطن کو اس طرح چراغاں کرتی ہے کہ اشیاء کے بارے میں نظریئے میں بدلاؤ آ جاتا ہے۔

......●●●......

افسانہ

☆......عبدالغنی شیخ لداخی

ہوا

پہاڑ کا نصف حصہ چڑھنے کے بعد ہم ایک بڑے پتھر کے سامنے ستانے کے لئے رک گئے، پو پھٹ گئی اور لمحہ بہ لمحہ صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف نظر ڈالی۔ ہرے بھرے ڈھلوان کھیت، چراگاہیں، پرانے قلعے کا کھنڈر، پہاڑی پر واقع مندر، اسکول کی پرانی شکستہ عمارت جہاں میں نے پانچویں جماعت تک پڑھی تھی، چٹیل میدان، تنگ گلیاں جہاں ہم نے اچھے اور برے دن گزارے تھے۔

میری نظر بے ساختہ اپنے مکان پر پڑی جو سفیدہ اور بید کے درختوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔ چھت پر گھاس کے گچھے اور گوبر کے اپلے سکھانے کے لئے قرینے سے رکھے نظر آرہے تھے۔ دودھیل جرسی گائے ناند میں گھاس چر رہی تھی۔ باغیچے کے پاس سبز تلے پر گھوڑا پگے سے بندھا تھا۔

میری نظر چھلکتی ہوئی چھوٹے سے آبائی قبرستان پر پڑی جہاں میرے ابا اور اجداد مدفون تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آئے۔

''ابا، ہم آج تمہیں چھوڑ کر اس گاؤں سے جارہے ہیں۔ اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے عالم میں۔''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے گاؤں کو الوداع کہا۔

میری بیوی اور بیٹی کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ کچھ دیر تک ستا کر ہم دوبارہ چڑھنے لگے۔ سونم کے الفاظ ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ کوئی ڈھائی تین گھنٹہ پہلے دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر چپکے سے میرے گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ سہما سہما سا لگتا تھا اور ننگے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر سرگوشیانہ انداز میں کہنے لگا:

''صدیق تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔''

سہمے سہمے ہم اس کا منہ تاکنے لگے۔

''تمہیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔''

''ابھی مذاق نہ کر۔'' میں نے اپنے عزیز دوست سونم سے کہا۔

''مذاق نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں.....ابھی.....اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔''

''کیوں؟'' میں چلا پڑا۔

''اس کیوں کا اس وقت میرے پاس جواب نہیں ہے صدیق۔''

یہ کہتے ہوئے آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ میری بیوی اور بیٹی رونے لگیں۔

''آخر ہم سے کیا قصور سرزد ہوا ہے؟ کون سا ہم نے جرم کیا ہے؟''

''قصور نہ تمہارا ہے اور نہ ہمارا۔ یہ ہوا شہر سے آئی ہے۔''

''تمہیں کس نے کہا؟''

''مجھے ٹشی نے کہا۔ ٹشی کو دورجے نے بتایا تھا۔ دورجے کو چھینگ نے اور چھینگ.....ٹشی بتا رہا تھا کہ یہ بات تم کسی کو نہ بتاؤ ورنہ یہ لوگ اس کے مکان کو جلا دیں گے۔''

''یہ لوگ...!''

''ہاں شہر سے آئے ہوئے یہی لوگ کہتے ہیں کہ تم اپنا مذہب یا گاؤں دونوں میں سے ایک چھوڑ دو۔ صدیق ایسی ہوا انسان لاتا ہے۔''

سونم کا اندازِ بیان بڑا پراسرار تھا۔ ہم حیران تھے کہ اچانک یہ کیسے ہوا۔ گاؤں والے کل تک ہم پر بڑے مہربان تھے۔ ہم تین پشتوں سے یہاں آباد ہیں۔ تنگ کرنا تو درکنار، ہر ایک نے ہمیشہ ہمیں

پیار و محبت دیا تھا اور ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوا تھا۔

''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا سونم۔''

''کاش ایسا ہوتا۔''

پھر وہ میری بیوی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بھابی' یہ وقت رونے دھونے کا نہیں ہے۔ ابھی نکلنے کی تیاری کرو۔''

چند لمحے توتوقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''پہاڑ سے نکل جاؤ صدیق اور شہر پہنچ جاؤ۔''

''اس اندھیری رات میں کیسے پہاڑ سے جائیں!''

''راستے سے جانے میں خطرہ ہے۔'' سونم نے اٹھتے ہوئے کہا اور پیچھے غائب ہو گیا۔ وہ ایک چور کی طرح آیا تھا اور چور کی طرح نکل گیا۔

ہم نے بیوی کے زیورات' کچھ کپڑے اور چند ضروری چیزوں کی تین پوٹلیاں بنائیں' کچھ سوکھی روٹیاں اٹھائیں' ناند کو گھاس اور چارے سے بھر دیا۔ گائے اور گھوڑے کو کھونٹے سے باندھ دیا۔ بھیڑ بکریوں کے لئے باڑے میں گھاس ڈالی اور نالہ پار کر کے پہاڑ کی طرف بڑے۔

سورج کی زرد کرنیں پہاڑ کی اونچی چوٹی پر لرزنے لگیں اور کچھ وقفے کے بعد ایک پہاڑ کی اوٹ سے سورج نکل آیا۔ چوٹی سے ہم سو ڈیڑھ سو قدم نیچے رہ گئے تھے کہ ہم نے دماموں کی آواز سنی اور اس کے ساتھ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح دھیما دھیما شور بھی سنا۔ ہماری ٹانگیں اپنی اپنی جگہ رک گئیں۔ چند ہی لمحوں میں درختوں کی جھنڈ سے لوگوں کی ایک بھیڑ نکلی۔ ہم ایک چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے۔ بھیڑ آگے بڑھنے لگی اور نعروں کی آواز آنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے چاروں طرف تیز و تند آندھیاں چل رہی ہیں۔ سونم ٹھیک کہتا تھا کہ ہوا انسان لاتا ہے۔

پانچ دہے پہلے شہر سے ایک ہوا آئی' جس نے اپنے ساتھ چیچک کی متعدی بیماری لائی۔ بیسوں چراغ بجھ گئے' گھر اجڑ گئے۔ میری دادی اماں' باجی اور چھوٹا بھائی اس کے شکار ہوئے۔ پھر پروا تھی یا باد بہار' آزادی کا پیام لائی۔ دلکش جھونکے چلے' تعلیم کا اجالا پھیلا' بجلی آئی' پینے کا صاف پانی آیا۔

لیکن یہ ہوا بالکل مختلف تھی۔ باد سرسر اور باد سموم کی طرح۔ گاؤں میں ایسی ہوا کبھی نہیں چلی

تھی۔ یہ ہوا اس ہوا سے بھی موذی اور زہریلی تھی جس نے چھوت کی بیماری لائی۔ اس ہوا نے انسان کی جانیں لی تھیں، لیکن انسان اور انسان کو جدا نہیں کیا تھا۔

بھیڑ آہستہ آہستہ میرے مکان کی طرف بڑھنے لگی۔ لوگ اکثر میرے لئے اجنبی تھے۔ بھیڑ میں میں نے اپنے ہمسایہ دور جے کو دیکھا۔

''دور جے!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ابا، وہ دیکھو..... جلوس میں سونم بھی ہے۔'' میری بیٹی چلا پڑی۔

''یہ نہیں ہوسکتا..... سونم کبھی نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا.

''وہ دیکھو ابا..... جس نے جھنڈا اٹھایا ہے وہ سونم ہی تو ہے۔''

''سچ مچ، جھنڈا اٹھانے والا سونم تھا۔''

''وہ دیکھو ابا، چچا چھینگ اور ٹشی بھی جلوس میں ہیں۔'' میری بیٹی پھر چلائی۔

''آہستہ بولو فاطمہ۔'' میری بیوی نے سرزنش کی۔

اپنے جگری دوست چھینگ اور ٹشی کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

جلوس مکان کے سامنے رک گیا اور اشتعال انگیز نعرے بلند کرنے لگا جو پہاڑوں سے ٹکرا کر خوف وہراس کا سماں پیدا کرنے لگا۔ ہر نعرہ کے جواب میں سونم، دور جے، چھینگ اور ٹشی کے ہاتھ فضا میں بلند ہوتے تھے۔

جلوس میں حصہ لینے والے اکثر لوگوں کو غالباً یہ خیال تھا کہ میں اور میرے بیوی بچے مکان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ جب مکان سے کوئی نہیں نکلا تو متعدد لوگ مکان میں گھس گئے، ان میں سونم، دور جے، چھینگ اور ٹشی بھی تھے۔

کچھ دیر بعد جب یہ لوگ باہر نکلے تو ان کے ساتھ میرے گھر کا لوٹا ہوا سامان تھا۔ سونم نے گیس سیلنڈر اور چولھا اٹھایا تھا۔ ٹشی نے بڑی دیگ اٹھائی تھی جو گاؤں کے ہر تہوار اور دعوت پر مجھ سے مستعار لی جاتی تھی۔ دور جے نے بغل میں کوئی چیز دبائی تھی۔ شاید قالین تھا۔ چھینگ نے ناند کے کھونٹے سے باندھی رسی تڑائی اور گائے کو ہانک کر لے لیا۔ ایک آدمی نے گھوڑے کو سنبھالا، دو آدمی بھیڑ بکریوں کو

باڑے سے نکال لائے اور ایک طرف لے گئے۔ ایک آدمی تنبو کے بوجھ تلے دبے دبے گزرنے لگا۔ دوسرا بھاری ٹرنک اٹھائے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں آیا۔ میری بیوی اور بیٹی چٹان کی اوٹ میں چھپ کر آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔

کیا کل رات سونم نے ہمارے سامنے مگرمچھ کے آنسو بہائے تھے؟

کیا چھینگ، ٹشی اور دورجے نے مجھے گھر سے بے گھر بنانے کے لئے یہ سازش رچی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دنیا کتنی بے وفا ہے اور دوست کیسے طوطا چشم ہیں۔ ابھی میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہا تھا کہ مکان کی ایک کھڑکی سے دھواں نکلا اور آن کی آن میں سارا مکان آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میری بیوی چیخ پڑی۔

''خدا کا شکر کرو خدیجہ، ہماری جان محفوظ ہے۔''

پھر بھیڑ آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگی اور ہم چٹان کی اوٹ میں سے نکلے اور چھپتے چھپتے پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے۔ تھکاوٹ اور بھوک نام کی چیز بالکل ختم ہو گئی تھی۔

دوسرے روز شام کے وقت شہر پہنچے جہاں ہم نے اپنے جیسے کئی اور پناہ گزیں دیکھے۔ ہمارا گاؤں سے بالکل رابطہ ٹوٹ گیا اور کچھ خبر نہیں ملی کہ کھیت کھلیان، باغ اور مویشیوں کا کیا حشر ہوا۔ ایسے میں دو ماہ سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز میں نے سونم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میرے دل میں نفرت امنڈ آئی اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''اب کیا لینے آئے ہو؟'' یہ کہہ کر میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔

''صدیق، مجھے افسوس ہے۔ ہم تمہارا مکان اور سارا سامان بچا نہیں سکے، ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ لوگ تمہارے مکان کو آگ نہ لگائیں، لیکن ہماری کوشش بے کار گئی۔ البتہ تمہارا گیس سیلنڈر اور چولھا میرے پاس ہے۔ ٹشی کے پاس دیگ ہے۔ دورجے نے قالین بچائے ہیں۔ چھینگ نے تمہاری گائے پال رکھی ہے۔ اس رات ہم چپکے سے تمہارے نیم جلے مکان دیکھنے گئے۔ کچھ برتن بھانڈے اور

اناج کی دو بوریاں بچائیں جو ہم نے حفاظت سے رکھی ہیں۔ یہ سب ہمارے پاس تمہاری امانت ہیں.....ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب تم گاؤں لوٹ کر آ جاو۔ ہماری آنکھوں اور دور جے کی بیوی ڈولماں کہتی ہیں کہ فاطمہ اور خدیجہ کے بغیر گاؤں سونا سونا لگتا ہے۔''

بادِ نسیم تھی یا بادِ صبا، ایک لمبی مدت بعد میں نے ہوا کا ایک دلکش جھونکا محسوس کیا۔

......●●●......

میر غلام رسول نازکی نمبر

میر غلام رسول نازکی اُردو، کشمیری، عربی، فارسی اور انگریزی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنے تبحرِ علمی اور بلند خیالی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں خاصے مقبول تھے۔ اُردو، کشمیری، فارسی اور عربی میں ان سے کئی تصانیف یادگار ہیں۔ میر غلام رسول نازکی پر ''شیرازہ'' کی خصوصی اشاعت، شیرازہ اُردو کا ایک کارنامہ ہے جس کو علمی اور ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

اس پتے پر منگوائیں:

☆......کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

......●......

تجزیہ

☆......ڈاکٹر ریاض توحیدی

ہوا

(تواریخی فکشن کی عمدہ مثال)

لداخ کی اپنی ایک شاندار تاریخ رہی ہے۔ چونکہ یہ خطہ صدیوں تک نہ صرف سنٹرل اشیا کا تجارتی مرکز رہا ہے بلکہ اس خطے نے سیاحتی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی معاملات وتعلقات میں بھی کلیدی رول ادا کیا ہے۔ پیشِ نظر افسانہ ''ہوا'' کا موضوع بھی بنیادی طور پر لداخ کی تہذیب وثقافت اور سیاسی وسماجی صورت حال کی عکاسی کررہا ہے اس لئے یہ افسانہ تواریخی فکشن (Historical Fiction) کے زمرے میں آسکتا ہے۔ تواریخی فکشن لکھنے کے لئے تاریخی مطالعہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے یعنی فکشن نگار جس خطے یا علاقے کے تاریخی منظرنامے کو اپنی تخلیق میں پیش کرے تو اس منظرنامے کی آگہی کا وہ مناسب شعور رکھتا ہو۔ اس تناظر میں دیکھیں تو زیرِ نظر افسانے کا تخلیق کار عبدالغنی شیخ لداخی نہ صرف اسی خطہ کا پشتنی باشندہ ہے بلکہ وہ لداخ شناسی میں بھی ایک اہم مقام رکھتا ہے' کیونکہ ان کے تاریخی مضامین مثلاً 'لداخ کا جغرافیائی محل وقوع' 'لداخ ...غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں' 'سیاچن گلیشر ...تاریخ کے آئینے میں' وغیرہ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ وہ لداخ کی تاریخ وثقافت کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اسی تاریخی شعور کی فنی عکاسی ان کے بیشتر افسانوں' مثلاً ''ایک فوٹو'' میں بھی صاف نظر آتی ہے۔

افسانہ ''ہوا'' میں ماضی کی ایک ایسی کرب ریز سماجی صورتِ حال کی تاریخی کہانی بیان ہوئی ہے جو فسانہ سے زیادہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ پہلے افسانے کے عنوان 'ہوا' پر ہی ارتکاز کریں تو یہ لفظ

افسانے میں بطور علامت استعمال ہوا ہے اور پورے افسانے کی درد بھری کہانی کا علامتی حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اس علامتی حوالے کے برتنے میں افسانہ نگار کا فنی کمال یہ ہے کہ پورا افسانہ پڑھنے کے بعد بھی یہ ایک علامت ہی رہتا ہے کیونکہ پوری کہانی میں ایک ایسا ابہام موجود ہے جو ظاہر ہونے کے باوجود بھی پوشیدہ ہی رہتا ہے اور کہیں پر بھی ہوا کی مخصوص شناخت ظاہر ہونے نہیں دیتا ہے بلکہ اشاروں کنایوں میں ہوا کے بنیادی محرکات کی طرف قاری کا دھیان پھیر دیتا ہے۔ افسانے کی شروعات مرکزی کردار کے درد بھرے جذبات سے ہوتی ہے جو ابتدا میں ہی قاری کی توجہ کھینچنے میں کارگر نظر آتی ہے:

"پہاڑ کا نصف حصہ چڑھنے کے بعد ہم ایک بڑے پتھر کے سامنے ستانے کے لئے رک گئے۔ پو پھٹ گئی اور لمحہ بہ لمحہ صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف نظر ڈالی۔"

افسانے کی ابتدا سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ مرکزی کردار رات کے اندھیرے میں اپنے گھر یا گاؤں سے نکل کر پہاڑ کی جانب نکل پڑا ہے۔ لیکن ابھی یہ واضح نہیں ہو رہا ہے کہ یہ کیوں رات کے وقت گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہوا ہے۔ اس کے بعد جب وہ گاؤں کی طرف نظر ڈالتا ہے تو اسے گاؤں کے ہرے بھرے کھیت، اسکول، قلعے کا کھنڈر، مندر، اپنا گھر، ناند میں گھاس چر رہی اپنی گائے، گھوڑا وغیرہ سب نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ ابھی تک وہ حیرت زدہ ہو کر صرف دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر آبائی قبرستان پر پڑتی ہے جہاں اس کے آبا واجداد مدفون تھے اور یہی منظر نہ صرف افسانے کے بنیادی موضوع کی طرف اشارہ کرتا ہے بلکہ مرکزی کردار کے درد بھرے جذبات اور گاؤں چھوڑنے کے بنیادی مسئلے کو بھی اجاگر کر دیتا ہے:

"میری نظر چھلکتی ہوئی چھوٹے سے آبائی قبرستان پر پڑی جہاں میرے ابا اور اجداد مدفون تھے. میری آنکھوں میں آنسو آئے۔

'ابا، ہم آج تمہیں چھوڑ کر اس گاؤں سے جا رہے ہیں۔ اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے عالم میں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے

دل ہی دل میں اپنے گاؤں کو الوداع کہا۔

میری بیوی اور بیٹی کی آنکھیں اشک بار تھیں. کچھ دیر سستا کر ہم دوبارہ چڑھنے لگے۔"

اب افسانہ نگار نے ابہامی طور پر مرکزی کردار کی زبان سے گاؤں چھوڑنے کی مجبوری کا اشارہ دے دیا کہ یہ لوگ اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں جو کہ چھوٹے سے قبرستان سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے ہی انہیں مخصوص ہوا کے دباؤ میں آکر گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور یہ صرف ایک ہی آدمی کی مجبوری نہیں بلکہ پورے پریوار کی مجبوری ہے کہ انہیں اپنا سب کچھ چھوڑ کر بھاگنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

افسانے کی ابتدا میں تین کردار سامنے آتے ہیں یعنی مرکزی کردار (صدیق)، بیوی (خدیجہ) اور بیٹی (فاطمہ)۔ اس کے بعد کہانی کے دوسرے کرداروں کا سامنا ہوتا ہے جن میں سونم، ٹشی، دورجے اور چھینگ کے علاوہ زہریلی ہوا کو پھیلانے والے لوگ، جن کی شناخت یہ کہتے ہوئے پوشیدہ رکھی گئی ہے کہ "یہ ہوا شہر سے آئی تھی" شامل ہیں۔ افسانے میں مرکزی کردار کے علاوہ سونم بڑا متحرک کردار دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ افسانے کا پلاٹ اسی کردار کی بدولت بدلتا رہتا ہے اور کہانی کو کوئی دلچسپ موڑ دینے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ جب مرکزی کردار اپنی فیملی سمیت بے بسی کے عالم میں پہاڑ کے نصف حصے میں بیٹھ کر سستانے لگتا ہے اور اپنی مجبوری کو یاد کرتا ہے تو اس مجبوری کا پردہ سونم کے کردار سے ہی کھل اٹھتا ہے۔ کیونکہ سونم ہی چند گھنٹے پہلے مرکزی کردار کے گھر میں چھپ کر آیا تھا اور سہمے سہمے لہجے میں کہہ گیا تھا کہ:

"صدیق تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔"

سہمے سہمے ہم اس کا منہ تاکنے لگے۔

"تمہیں یہ گھر چھوڑ کر جانا پڑے گا۔"

"ابھے مذاق نہ کر۔" میں نے اپنے عزیز دوست سونم سے کہا۔

"مذاق نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں.... ابھی.... اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ۔"

’’کیوں؟‘‘ میں چلا پڑا۔

’’اس کیوں کا اس وقت میرے پاس جواب نہیں ہے صدیق۔‘‘

یہ کہتے ہوئے آنسو کا ایک قطرہ اس کے رخسار پر ڈھلک آیا۔ میری بیوی اور بیٹی رونے لگیں۔

اس مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سونم جو کہ صدیق کا دوست بھی ہوتا ہے خود بھی نہیں جانتا ہے کہ یہ ہوا کیوں صدیق کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے لیکن وہ دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے صرف یہ چاہتا ہے کہ صدیق اپنے آپ کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کی جان بھی بچائے۔ صدیق اس کی بات سن کر کوئی معقول وجہ جاننا چاہتا ہے کہ:

’’آخر ہم سے کیا قصور سرزد ہوا ہے؟ کون سا ہم نے جرم کیا ہے؟‘‘

لیکن سونم بے بسی کے عالم میں صرف اتنا ہی کہتا ہے کہ:

’’قصور نہ تمہارا ہے اور نہ ہمارا۔ یہ ہوا شہر سے آئی ہے۔‘‘

یہ سن کر مرکزی کردار حیرت زدہ ہو کر پوچھتا ہے کہ اسے کس نے بتایا تو سونم تھوڑی وضاحت کے ساتھ پوری بات بتا دیتا ہے:

’’مجھے ٹشی نے کہا۔ ٹشی کو دورجے نے بتایا تھا۔ دورجے کو چھینگ نے اور چھینگ..... ٹشی بتا رہا تھا کہ یہ بات تم کسی کو نہ بتاؤ ورنہ یہ لوگ اس کے مکان کو جلا دیں گے۔‘‘

’’یہ لوگ...!‘‘

’’ہاں شہر سے آئے ہوئے یہی لوگ کہتے ہیں کہ تم اپنا مذہب یا گاؤں دونوں میں سے ایک چھوڑ دو۔ صدیق ایسی ہوا انسان لاتا ہے۔‘‘

یہاں پر سونم ایک معنی خیز جملہ بولتا ہے کہ ’’ایسی ہوا انسان لاتا ہے‘‘ یعنی یہ کوئی قدرتی آفت نہیں ہے بلکہ انسان کی ہی پھیلائی ہوئی ایسی زہریلی ہوا ہے جو انسان کو انسان سے جدا کرنے یا مارنے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہ ہوا فساد برپا کرنے والوں کی وہ زہریلی ہوا ہوتی ہے جس کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی وطن۔ سونم کی پُراسرار باتیں سن کر مرکزی کردار حیران ہو جاتا ہے کہ:

''اچانک یہ کیسے ہوا۔ گاؤں والے کل تک ہم پر بڑے مہربان تھے۔ ہم تین پشتوں سے یہاں آباد ہیں۔ تنگ کرنا تو درکنار، ہر ایک نے ہمیشہ ہمیں پیار و محبت دیا تھا اور ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوا تھا۔''

لیکن یہ سب سوچنے اور بحث و تکرار کے بعد آخر کار مرکزی کردار فیملی سمیت اپنا گھر بار چھوڑ کر پہاڑ کی جانب بھاگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ساتھ جب یہ لوگ پہاڑ کی چوٹی کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں تو پھر کہانی نیا موڑ لیتی ہے۔ گاؤں سے نعرے بلند ہو جاتے ہیں اور چند جانے پہچانے چہروں کے علاوہ کئی انجانے لوگ مرکزی کردار کے مکان پر ہلہ بول دیتے ہیں۔ جب انہیں مکان خالی نظر آتا ہے تو پھر لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ہی مکان کو آگ لگائی جاتی ہے۔ لیکن اس دوران مرکزی کردار اور اس کے گھر والے اپنے ہمسایوں اور دوستوں کو دیکھ کر اور زیادہ دکھی ہو جاتے ہیں کہ یہ لوگ بھی زہریلی ہوا کا ساتھ دینے لگے:

''دورجے!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ابا، وہ دیکھو...... جلوس میں سونم بھی ہے۔'' میری بیٹی چلا پڑی۔

''یہ نہیں ہو سکتا..... سونم کبھی نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا.

''وہ دیکھو ابا..... جس نے جھنڈا اٹھایا ہے وہ سونم ہی تو ہے۔''

''سچ مچ، جھنڈا اٹھانے والا سونم تھا۔''

''وہ دیکھو ابا، چچا چھینگ اور ٹشی بھی جلوس میں ہیں۔'' میری بیٹی پھر چلائی۔

''آہستہ بولو فاطمہ۔'' میری بیوی نے سرزنش کی۔

اپنے جگری دوست چھینگ اور ٹشی کو دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔''

یہ خوفناک منظر دیکھ کر مرکزی کردار کے دل میں دوستی کے محبانہ رشتے کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے اور وہ سونم اور دوسرے دوستوں کی لوٹ کھسوٹ دیکھ کر جذباتی ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا کل رات سونم نے ہمارے سامنے مگرمچھ کے آنسو بہائے تھے؟ کیا چھینگ، ٹشی اور دورجے نے مجھے گھر سے بے گھر بنانے کے لئے یہ سازش رچی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ دنیا کتنی بے وفا ہے اور

دوست کیسے طوطا چشم ہیں۔ بقول شاعر:

باغباں نے آگ لگا دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

(ثاقب لکھنوی)

اس حشر سماں منظر کے بعد کہانی کا ڈسکورس بدل جاتا ہے۔ ابھی تک افسانے میں جس قسم کی اندوہ ناک صورتحال پیش ہوئی تھی اور انسانی رویوں کے بدلاؤ کا منفی پہلو سامنے آئے تھا۔ وہ اچانک مثبت پہلو میں بدل جاتا ہے۔ کیونکہ دو ماہ بعد جب سونم شہر جا کر صدیق سے ملنے جاتا ہے تو فساد کے دوران اپنی اور دوسرے دوستوں کی عملی کارکردگی کا احوال یوں سناتا ہے:

''صدیق، مجھے افسوس ہے۔ ہم تمہارا مکان اور سارا سامان بچا نہیں سکے، ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ لوگ تمہارے مکان کو آگ نہ لگائیں، لیکن ہماری کوشش بے کار گئی۔ البتہ تمہارا گیس سیلنڈر اور چولھا میرے پاس ہے۔ ٹشی کے پاس دیگ ہے۔ دورجے نے قالین بچائے ہیں۔ چھینگ نے تمہاری گائے پال رکھی ہے۔ اس رات ہم چپکے سے تمہارے نیم جلے مکان دیکھنے گئے۔ کچھ برتن بھانڈے اور اناج کی دو بوریاں بچائیں جو ہم نے حفاظت سے رکھی ہیں۔ یہ سب ہمارے پاس تمہاری امانت ہیں..... ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں جب تم گاؤں لوٹ کر آجاو۔ ہماری آنگموں اور دورجے کی بیوی ڈولماں کہتی ہیں کہ فاطمہ اور خدیجہ کے بغیر گاؤں سونا سونا لگتا ہے۔''

ابھی تک مرکزی کردار ہوا کے ساتھ ساتھ اپنے دوست احباب کے دل شکن رویوں سے دل شکستہ ہو کر نفرت انگیز کیفیت کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا لیکن وہ رویہ اب اچانک سونم کے ملنے اور اس کے انسانیت ساز کردار سے محبت آمیز کیفیت میں بدل جاتا ہے اور مرکزی کردار فساد کے قیامت خیز سانحہ کا دکھ بھول کر راحت کی سانس لیتے ہوئے کہتا ہے:

''بادِ نسیم تھی یا بادِ صبا' ایک لمبی مدت بعد میں نے ہوا کا ایک دلکش جھونکا

محسوس کیا۔"

اس طرح سے افسانے کا اختتام سماجی ہم آہنگی (Social harmony) کے انسانیت پرور پیغام پر ہوجاتا ہے اور یہی خوبی اس افسانے کو جاندار کلائمکس دینے کا باعث بن جاتی ہے۔افسانے میں فسادات کی زد پر لوگوں کے ذہنی تناؤ اور فساد برپا کرنے والوں کے ذہنی جنون کی ہنرمندانہ عکاسی کی گئی ہے۔

افسانے کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں کہانی کو تہہ در تہہ پیش کیا گیا ہے اور منطقی انداز سے سارے واقعات پلاٹ میں سموئے گئے ہیں جس کی وجہ سے پلاٹ میں کہیں پر جھول نظر نہیں آتا ہے۔ایک اور بات یہ بھی کہ افسانے میں مرکزی کردار کی جو درد بھری کیفیت پیش ہوئی ہے وہی کیفیت قاری پر بھی طاری رہتی ہے۔بہر حال افسانے کا موضوعاتی برتاؤ اور فنی واسلوبیاتی خوبیاں ضرور متاثر کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس افسانے کا ترجمہ کئی اور زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔

...... ●●● ......

شیرازہ اُردو "صوفیانہ موسیقی اور کشمیر نمبر"

اِس خصوصی اشاعت میں صوفیانہ موسیقی کی ابتداء، اس کا تدریجی سفر، اساتذہ کے کوائف، صوفیانہ موسیقی میں گایا جانے والا عارفانہ کلام، اس میں بجائے جانے والے ساز، سرکردہ موسیقاروں کے ساتھ انٹرویو، نادر و نایاب تصاویر، نوٹیشن اور دیگر اہم دستاویزات شامل ہیں۔

اس پتے پر منگوائیں:

☆......کتاب گھر، سرینگر/ جموں/ لیہہ/ لداخ

☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

انجام

کردار

صنم چھوانگ	گاؤں کا پچاسی سالہ ایک بزرگ
نمبردار	
مہنت	
ٹشی پھلیے	مہنت کا معاون
پدماں	ٹشی پھلیے کی بیٹی
ماں	پدماں کی ماں
صنم	ایک ڈاکٹر
ماں	صنم کی ماں
ینگچن	صنم کی بہن
فلاحی تنظیم کا ممبر	
انسپکٹر نعمان	
سب انسپکٹر	
ہیڈ کانسٹیبل	
کانسٹیبل	

گاؤں کا نمائندہ

اخبار کا نامہ نگار

ریڈیو کا نامہ نگار

لال گوئل — مجرم

انگت — مجرم

گنپہ تنظیم کا صدر

تنظیم کے ممبران

عورت

ٹی۔وی کا نامہ نگار

گاؤں کا ممبر

....

سین......ا

منظر: لداخ کا ایک گاؤں۔ پہاڑی پر قدیم گنپہ (خانقاہ) گنپہ کے پاس بہت سارے لوگ جمع ہیں جو گنپہ کی پوتر مورتی کی چوری پر واویلا کر رہے ہیں۔

وقت: صبح کا وقت۔

صنم چھوانگ: گنپہ کی گم شدہ مورتی چنڈازک (اویلوکیتیشورا) ہمارے گاؤں کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔اس کے دم سے یہاں برکت ہے۔

نمبردار: اس کی وجہ سے ہم بلاؤں اور چھوت کی بیماریوں سے محفوظ رہے ہیں۔ اس کی چوری گاؤں کی تاریخ کا سب سے اندوہناک واقعہ ہے۔

صنم چھوانگ: یہ مورتی بہت پرانی ہے۔ میں جب کمسن تھا، یہ پوتر مورتی اس گنپہ میں تھی۔ میرے دادا اور پردادا سے یہ بات ہم تک چلی آرہی ہے کہ مورتی تب بھی یہاں موجود تھی۔

عورت: اس کے ہاتھ جل جائیں، جس نے ہمارے مقدس چنڈازک کو چھوا ہو اور اس کی آنکھیں اندھی ہو جائیں، جس نے بُری نظروں سے اس کو دیکھا ہو۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: ٹشی پھلیے! آخر یہ چوری کیسے ہوئی؟ ہمارے گاؤں میں ایسی واردات پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

ٹشی پھلیے: (رونی آواز میں) جناب! میں کل شام حسب معمول گنپہ میں مورتیوں کے حضور میں شمعیں جلانے گیا تھا۔ تب ساری پوتر مورتیاں موجود تھیں (صبح سے وہ یہ واقعہ کئی آدمیوں کو سنا چکا تھا۔)

صنم چھوانگ: (بات کاٹ کر) لاما جی کہاں تھے؟

ٹشی پھلیے: مہنت جی گاؤں گئے تھے۔ سب جانتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں میں شمعیں جلاتا ہوں۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: پھر کیا ہوا؟

ٹشی پھلیے: آج صبح تڑکے جب میں دروازہ کھول کر گنپہ کی بڑی عبادت گاہ میں داخل ہوا تو چنڈازک کی پوتر مورتی غائب تھی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھایا۔ میں نے جلدی جلدی دوسری مورتیوں اور تھنکوں کو دیکھا۔ سارے موجود تھے۔ میں نے فوراً دوسرے لاما پجاریوں اور نمبردار کو یہ بری خبر سنائی۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: چور مورتی کی اہمیت کو جانتا ہوگا۔

ٹشی پھلیے: جناب! میں کیا کہہ سکتا ہوں! (ایک چٹان کی کھوہ کی طرف اشارہ کرتا ہوا) ہم چابی اسی کھوہ میں رکھتے ہیں۔ صرف مہنت اور مجھے اس جگہ کا علم ہے۔ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں سہولیت کے لئے ہم گنپے کی چابی یہاں چھپا کر

رکھتے ہیں۔ چابی یہاں رکھی تھی۔ حسبِ معمول گنپہ کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو یہ بُرا دن دیکھا۔ (وہ بے بسی میں اپنا سر ہلانے لگا۔)

گاؤں کا نمائندہ: تم نے گنپہ کے آس پاس کسی مشکوک آدمی تو نہیں دیکھا ہے کل یا آج۔

ٹشی پھلیے: کسی کو نہیں دیکھا، جناب۔

فلاحی تنظیم کا ممبر: یہ واردات رات کو ہوئی ہوگی۔

نمبردار: ٹشی پھلیے! یہ اچھا نہیں ہوا۔ اب ہم پر مصیبت آئے گی۔
(پھر مہنت پہنچا۔ اس کے کانوں میں چوری کی بھنک پڑی تھی۔)

مہنت: (ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا اپنے ماتھے پر دو تھپڑ مار کر) یہ اس گاؤں کا سب سے انمول خزانہ تھا۔ چنڈ ازک کی یہ مورتی چھ سو سال پرانی ہے۔ راجا ٹق بُوم دے کے زمانے میں تبت سے لداخ لائی گئی تھی اور راجا نے یہاں رکھوائی تھی۔ (گاؤں کے سرکردہ افراد کی طرف دیکھ کر) ہمیں اب کیا کرنا چاہئیے؟

نمبردار: ہمیں پولیس کو فوراً رپورٹ کرنی چاہئیے۔

نمائندہ: کسی آدمی کو فوراً لیہہ بھیج دو۔

سین ۲

(تین روز بعد تفتیش کے لئے لیہہ سے ایک پولیس سب انسپکٹر کی قیادت میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں پر مشتمل ایک ٹکڑی آئی۔ پولیس نے جائے واردات کو دیکھا اور ان کے سامنے ٹشی پھلیے نے ایک دفعہ وہی بیان دیا، جو وہ سب کے سامنے دے چکا تھا۔

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) تمہیں کسی پر شک ہے؟

ٹشی پھلیے: کسی پر نہیں جناب۔

سب انسپکٹر: (مہنت سے) کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟

مہنت: نہیں۔ مجھے کسی پر شک نہیں۔ ایسی واردات پہلے یہاں کبھی نہیں ہوئی۔

سب انسپکٹر: کیا اس دوران کوئی اجنبی گنپہ دیکھنے آیا؟

مہنت: کوئی نہیں آیا۔ البتہ حال میں بڑے دن پر ہمارے گاؤں والوں اور آس پاس کے دیہات کے بہت سارے لوگوں نے گنپہ کی یاترا کی۔

نمبردار: بودھی پہلے ماہ کی پندرھویں تاریخ کو ہر سال گنپہ کی یاترا کے لئے لوگ آتے ہیں اور گنپہ میں نذرانہ اور تیل چڑھاتے ہیں۔

سب انسپکٹر: یہ کب کی بات ہے۔

مہنت: دس گیارہ دن پہلے کی بات ہے۔ مورتی کی چوری چار دن پہلے ہوئی۔

سب انسپکٹر: یہ گاؤں غیر ملکیوں کے لئے ممنوعہ علاقہ میں آتا ہے۔ پھر بھی کوئی کوئی سیاح انجانے میں یا جان بوجھ کر قانون توڑتا ہے۔ کیا ایسی وارداتیں یہاں نہیں ہوتی ہیں؟

نمبردار: اس سال کوئی نہیں آیا۔ پچھلے سال دو غیر ملکی سیاح یہاں آئے تھے۔

انسپکٹر: کیا اس گاؤں میں غیر مقامی آدمی کام کے سلسلے میں موجود ہیں؟ جیسے آج کل یہاں لداخ میں نیپالی، پنجابی ترکھان، بہاری معمار کاریگر، مزدور وغیرہ نظر آتے ہیں۔

نمبردار: جی نہیں، ہمارے گاؤں میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔

سب انسپکٹر: آپ کی نظر میں گاؤں میں کوئی ایسا آدمی ہے، جس کا چال وچلن مشکوک ہو یا جس کے خلاف چوری کا الزام ہو یا عدالت میں مِثل ہے یا پولیس میں کسی جرم کے لئے کیس بنا ہے؟

نمبردار اور مہنت: کوئی ایسا آدمی نہیں ہے۔

سب انسپکٹر: پچھلے دو تین ماہ کے دوران گاؤں میں کوئی اجنبی آیا ہوگا؟ اور گاؤں دیکھا ہوگا؟ آپ یاد کیجئے۔

مہنت نمبردار اور ممبر نے چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے کو دیکھا اور مہنت بولا۔

مہنت: کوئی ایسا آدمی یاد نہیں آرہا ہے۔ گنپہ دیکھنے کوئی اجنبی نہیں آیا۔

نمبردار: ہم نے کوئی مشکوک آدمی نہیں دیکھا۔ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ کوئی بھی آئے، سب کو فوراً پتہ چل جاتا ہے۔ البتہ پچھلے ماہ دو روز کے لئے گاؤں میں ایک میڈیکل کیمپ لگا تھا۔ ایک ڈاکٹر اور دو ملازم ان کے ساتھ تھے۔ وہ سب لداخی تھے۔

سب انسپکٹر: ڈاکٹر کون تھا؟

ممبر: ڈاکٹر صنم۔

(سب انسپکٹر خاموش سامنے کھڑے پہاڑوں کو تاکنے لگا۔ پھر وہ ہیڈ کانسٹیبل کی طرف مڑا۔ دونوں میں تھوڑی دیر کے لئے کانا پھوسی ہوئی۔)

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) تم کہاں رہتے ہو؟

مہنت: یہ اس سامنے والے چھوٹے مکان میں رہتا ہے۔

سب انسپکٹر: چلئے، وہاں تک چلتے ہیں۔

(سبھی مکان تک پہنچے۔ دروازہ مقفل تھا۔)

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) کیا تم اکیلے ہو؟

گاؤں کا ممبر (ٹشی پھلیے سے پہلے جواب دیتا ہے) اس کی بیوی اور ایک لڑکی بھی ہے۔ بیوی بیمار تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت پر لڑکی کے ہمراہ لیہہ گئی ہوئی ہے۔

سب انسپکٹر: (ٹشی پھلیے سے) تالا کھولو۔ ہم تمہارے گھر کی تلاشی لیتے ہیں۔

(ٹشی پھلیے دروازہ کھولتا ہے اور پولیس مکان کی تلاشی لیتی ہے۔ مکان کے ایک کمرے میں ایک ٹوکری میں سے ایک مورتی برآمد ہوتی ہے۔)

سب انسپکٹر: (ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ سے مورتی لے کر خوشی سے چلاتا ہوا) مورتی مل گئی۔

(سبھی سب انسپکٹر کے گرد جمع ہوتے ہیں)

مہنت: (حیرانی سے) ارے میتریا کی یہ مورتی یہاں کہاں سے آئی۔ صاحب، ہماری مورتی اودیلوکتیشورا ہے۔ یہ پوتر مورتی میتریا ہے۔ لیکن یہ کہاں سے آئی؟

نمبردار اور ممبر: (حیرت سے) ہاں یہ کہاں سے آئی؟

ٹشی پھلیے: (ڈرتا ہوا) کل سہ پہر کو میں نے اسی ٹوکری میں بکریوں کو گھاس ڈالی تھی۔ تب یہ خالی تھی۔

سب انسپکٹر: آپ ٹھیک طرح سے دیکھ لیجئے لاما جی۔ یہ آپ کی گم شدہ مورتی ہو سکتی ہے۔

مہنت: نہیں۔ یہ نہیں ہے۔ ہماری چنڈازک ہے۔

نمبردار: جی ہاں، لاما جی ٹھیک بول رہے ہیں۔

سب انسپکٹر: پھر یہ مورتی کہاں سے آئی؟ (خونخوار از نظروں سے ٹشی پھلیے کی طرف دیکھ کر) بتاؤ! یہ مورتی کہاں سے چوری کی؟

ٹشی پھلیے: (تھرتھر کانپتا ہوا) جناب، کل میں نے اس ٹوکری سے بکریوں کو گھاس ڈالی تھی۔ تب اس میں کوئی مورتی نہیں تھی۔

سب انسپکٹر: پھر یہ کہاں سے آئی؟ آسماں سے اڑ کر تو نہیں آئے گی! (ٹشی پھلیے کی زبان کو چپ لگ گئی)

نمبردار: ہم بھی حیران ہیں۔ آخر یہ مورتی کہاں سے آئی؟

سب انسپکٹر: یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ دوسری مورتی بھی یہیں کہیں ہونی چاہیئے۔

سب انسپکٹر: (دھاڑتا ہوا) تم نے یہ مورتی کہاں سے چرائی؟ بتاؤ۔ (سب انسپکٹر ٹشی پھلیے کو زور سے ایک چانٹا مارتا ہے اور ٹشی پھلیے اوندھے منہ گرتا ہے)۔

(سب انسپکٹر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کرنے لگا۔)

ٹشی پھلیے: (ہاتھ جوڑ کر روتا ہوا) مجھے معلوم نہیں۔

سب انسپکٹر: لاما جی، آپ نے ایک چور کو یہاں کیوں رکھا ہے؟

مہنت: انسپکٹر صاحب، یہ بیس سال سے یہاں کام کر رہا ہے۔ ہمیں کبھی اس کے خلاف معمولی شکایت بھی نہیں رہی ہے۔

ممبر: یہ بڑا سیدھا سادا آدمی ہے صاحب۔ یہ کبھی چوری نہیں کرے گا۔

(نمبردار سے بھی ٹشی پھلیے کی حالت نہیں دیکھی گئی۔ اس کی ناک اور چہرے سے

خون بہہ رہا تھا۔)

نمبردار: لاما جی اور ممبر صحیح کہہ رہے ہیں۔ ٹشی پھلیے شریف آدمی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل: انسان کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔ اس نے سنا ہوگا کہ مورتی کا بڑا دام ملتا ہے اور لالچ میں آ گیا۔

سب انسپکٹر: ہمیں ایک دفعہ پھر اس کے گھر اور آس پاس جگہوں کی تلاشی لینی چاہیئے۔ اس نے مورتی کہیں چھپائی ہوگی (کانسٹیبلوں سے) اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مکان کے پچھواڑے، کھیت کھلیان چٹانوں وغیرہ میں تلاش کرو۔

(دو گھنٹوں کی تلاشی کے بعد مورتی کا کچھ سراغ نہیں ملا۔)

سب انسپکٹر: (مہنت اور نمبردار پر نظر ڈال کر) ہم اس کو حراست میں لیتے ہیں۔ اس کے گھر سے مورتی برآمد ہوئی ہے۔ قانون کی نظر میں یہ مجرم ہے۔ ہم اس سے مزید پوچھ تاچھ کے لئے لیہہ لے جاتے ہیں۔ (ایک کانسٹیبل نے ٹشی پھلیے کو ہتھکڑی پہنائی اور گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔)

سین......۴

لیہہ کا پولیس تھانہ۔ گنپہ تنظیم کا ایک وفد سب انسپکٹر سے ملاقی ہوتا ہے۔

تنظیم کا صدر: (سب انسپکٹر سے) آپ کو مبارک ہو۔ آپ نے کم سے کم میتریا کی مورتی بازیاب کی۔

تنظیم کا ایک ممبر: ایک سال پہلے اس مورتی کی چوری ہوئی تھی۔ ایک ہزار سال پرانی یہ مورتی تبت سے لداخ لائی گئی تھی۔

تنظیم کا صدر: اب آپ کو دوسری مسروقہ مورتیوں کی بازیابی کے لئے قدم اُٹھانا چاہیئے۔

سب انسپکٹر: ہمیں پورا یقین ہے کہ اویلو کیتیشورا کی مورتی بھی اسی آدمی نے چرائی ہے۔ یہ

میتریا کی مورتی چُرا سکتا ہے تو بھلا اویلوکیتیشورا کی مورتی کیوں چرا نہیں سکتا۔

ممبر: اس نے مورتی اب تک کیوں نہیں بیچی؟

سب انسپکٹر: عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، وہ انتظار کر رہا تھا کہ لوگ مورتی چوری کی دوسری وارداتوں کو بھول جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو لیہہ لانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ آج کل گاڑی سے مورتی لانا اور لیہہ سے باہر لے جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح پتہ چل جاتا ہے۔

تنظیم کا صدر: کیا ملزم نے اقبالِ جرم کیا؟

سب انسپکٹر: چور کہاں کہتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ دو تین روز تک جرم کا اقبال کر لے گا اور دوسری مورتی کا سراغ لگ جائے گا۔ آپ دو تین روز صبر کریں اور پھر دیکھ لیجئے۔

تنظیم کا ایک اور ممبر: آپ میتریا کی مورتی کب گنپہ کے حوالہ کر رہے ہیں؟

سب انسپکٹر: جب تحقیقات مکمل ہو جائیں گی تو ہم فوراً حوالہ کر دیں گے۔

تنظیم کا صدر: آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کی کوشش بیکار نہیں گئی ہے۔ براہِ کرم دوسری مسروقہ مورتیوں کی بازیابی کے لئے موثر اقدام اٹھائیں۔

(وفد کے صدر اور ممبران سب انسپکٹر سے ہاتھ ملا کر جاتے ہیں)۔

سین......۴

(ڈاکٹر صنم کا گھر۔ ڈاکٹر اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔)

ینگچن: (ڈاکٹر نے دہلیز پر قدم رکھا ہوتا ہے)؟ صنم! تم نے سنا؟ پدماں کا باپ مورتی چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے لیہہ لایا گیا ہے اور حوالات میں بند ہے۔

صنم: (حیرت سے) کب؟ کہاں اور کیسے؟

ینگچن: مورتی اس گنپہ سے چرائی ہوگی، جہاں وہ کام کرتا ہے۔

ماں: (درست کرتی ہوئی) نہیں۔ وہ کسی اور گنپہ کی مورتی تھی جو اس کے گھر سے نکلی۔

صنم: ماں، وہ چوری نہیں کرے گا۔ میرا دل نہیں مانتا ہے۔

ماں: سبھی کہتے ہیں۔ اسی نے چوری کی ہے۔

صنم: پدماں کہاں ہے؟

ینگچن: کل سے وہ یہاں نہیں آئی۔

ماں: صنم کیا تم مورتی چور باپ کی بیٹی سے شادی کروگے؟

صنم: میں باپ بیٹی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا ماں۔

ینگچن: پکا ثبوت ملے تو......؟

صنم: اگر وہ بے گناہ بری ہو جاتا ہے تو کیا تم ہماری شادی پر اعتراض کروگی؟ (چند لمحوں کے بعد) میں پدماں کو بہت چاہتا ہوں۔ میں اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔

(ایک ہفتہ گزر گیا اور تحقیقات میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ملزم ٹشی پھلیے پر ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ مارا پیٹا گیا، لالچ اور ترغیب دی گئی لیکن وہ آخری دم تک اپنے بیان پر ڈٹا رہا کہ وہ بے گناہ ہے اور اس کے گھر سے برآمد شدہ مورتی اس نے نہیں چھپائی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ جس ٹوکری میں مورتی پائی گئی وہ اس نے گھاس لانے کے لئے استعمال کی تھی۔

ادھر گم شدہ مورتی نہ ملنے پر علاقے کے لوگوں میں غم و غصہ تھا۔ گنپہ تنظیم کا ایک وفد سپرنٹنڈنٹ پولیس سے ملتا ہے اور مورتی نہ ملنے پر تشویش کا اظہار کرتا ہے۔

سین......۵

(سپرنٹنڈنٹ پولیس کا دفتر۔ گنپہ تنظیم کا وفد چیمبر میں موجود ہے اور مورتی کے بارے میں گفتگو کرنے میں محو ہے۔)

گنپہ تنظیم کا صدر: ایس۔ پی صاحب مسروقہ مورتی کی بازیابی میں کچھ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ یہاں لوگوں میں بڑی تشویش پائی جاتی ہے۔

وفد کے ارکان: لوگ ہمارے پاس شکایتیں لے کر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انتظامیہ اور محکمہ پولیس کو متحرک کریں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: میں اسے باخبر ہوں۔ میں نے انسپکٹر نعمان کی چھٹی منسوخ کی ہے اور انہوں نے مورتی چوری کا یہ کیس اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ آپ جانتے ہیں اس نے ماضی میں ایسی کئی وارداتوں کا سراغ لگایا ہے۔

گنپہ تنظیم کا صدر: آپ نے بہت اچھا کیا۔ ایک قابل افسر ہی معاملہ کی تہہ تک جاسکتا ہے۔

وفد کا ایک ممبر: ہم نے سنا کہ ایک دور افتادہ گنپہ میں ایک اور قدیم تھنکا غائب ہوا ہے۔ ہماری تنظیم اس کی تصدیق کرا رہی ہے۔

وفد کا دوسرا ممبر: اگر یہ بات صحیح ہو تو بڑی تشویش ناک ہے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: ہم مجوزہ مسروقہ مورتی کے لئے بڑی مستعدی سے تحقیق کر رہے ہیں۔ (اس مرحلے پر وہ آفس کی گھنٹی بجاتا ہے اور چپراسی نمودار ہوتا ہے۔) نعمان صاحب کو بلاؤ۔

(انسپکٹر نعمان نمودار ہوتا ہے اور سر کی جنبش سے سب کو خوش آمدید کہتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ پولیس: نعمان صاحب، یہ صاحبان حالیہ مسروقہ مورتی کے کیس کے بارے میں دریافت کرنے آئے ہیں۔

انسپکٹر نعمان: میں نے از سرِ نو کیس کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہماری تحقیق میں کئی خامیاں رہ گئی ہیں اور معاملے کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

گنپہ تنظیم کا صدر: ہمیں آپ سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ نے پہلے بھی ایسے کئی پیچیدہ معاملات کی کامیابی سے تحقیق کی ہے۔

انسپکٹر نعمان: میں اس کیس کی نئے زاویئے سے جانچ کر رہا ہوں۔ اُمید ہے، ہم کسی مثبت نتیجے پر پہنچیں گے۔

وفد کے ارکان: شکریہ! بہت شکریہ!

سین......۶

(انسپکٹر نعمان ڈاکٹر صنم کو اپنے آفس بلاتا ہے اور تبادلۂ خیال کرتا ہے۔)

انسپکٹر نعمان: ڈاکٹر، آپ کو میں نے اس لئے زحمت دی ہے کہ مورتی چوری کے کیس سے متعلق تبادلۂ خیال کروں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے گاؤں میں ایک میڈیکل کیمپ منعقد کیا تھا اور آپ نے گنپہ میں وہ مورتی دیکھی تھی۔

صنم: جی ہاں انسپکٹر، میں نے گنپہ میں وہ مورتی دیکھی تھی جس کی چوری ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ٹشی چھلیے کو کہا تھا کہ پرانی مورتیوں کی اکثر چوری ہوتی ہے۔ اس لئے خبردار اور ہوشیار رہے۔ اس کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ باپ بیٹی دونوں مجھے بولے۔ کیا دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو گنپوں کی مورتی چراتے ہیں؟ میں نے محسوس کیا کہ وہ یہ بات بڑی معصومیت سے کہہ رہے ہیں۔ دراصل ان کا لوگوں سے بہت کم رابطہ ہے۔ یہ شاذونادر ہی یہاں آتے ہیں۔ یہاں اور باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کو بالکل پتہ نہیں ہے۔

انسپکٹر نعمان: لیکن مورتی کی چوری کون کر سکتا ہے؟

صنم: نعمان صاحب، آپ ایک تجربہ کار پولیس آفیسر اور منجھے ہوئے سراغ رسان ہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ کون مورتیوں کی چوری کرتے ہیں۔

انسپکٹر نعمان: (انسپکٹر نعمان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکان اُبھرآتی ہے۔) ڈاکٹر، ملزم کی لڑکی بڑی خوبصورت ہے۔آپ نے اپنے پیشے میں سائیکالوجی پڑھی ہے۔ خوبصورتی کئی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔چوری کی اس واردات کے پیچھے بھی کوئی کہانی ہونی چاہیئے۔

(انسپکٹر معنی خیز انداز میں مسکراتا ہے)۔

صنم: انسپکٹر صاحب، کیا اس واقعہ کے پیچھے بھی لڑکی کی خوبصورتی کا کوئی رول ہے؟

انسپکٹر نعمان: بالکل۔لیکن معاملہ زیر تحقیق ہے۔اس لئے اس بات کو آپ فی الحال اپنے تک محدود رکھیں۔ڈاکٹر، کیا آپ لڑکی کے حسن سے متاثر ہیں؟

صنم: میں متاثر ہی نہیں بلکہ لڑکی سے محبت کرتا ہوں انسپکٹر صاحب۔

سین......۷

(ایک ماہ سے زیادہ عرصے ہوا۔لوگ چوری کی واردات کو تقریباً بھول چکے تھے۔ایک روز اچانک سپرنٹنڈنٹ پولیس نے قصبے کے چند سرکردہ افراد، گنپہ تنظیم کے عہدہ داروں، اخبار کے نامہ نگاروں، ریڈیو اور ٹی وی سٹیشنوں کے نمائندوں کو اپنے دفتر میں بلایا۔)

سپرنٹنڈنٹ پولیس: (حاضرین کا سواگت کرتے ہوئے) خوش آمدید! ہم نے آپ کو یہاں مسروقہ مورتی کی بازیابی کی خوشخبری دینے کے لئے زحمت دی ہے۔مجرم گوئل اور اس کے ساتھی انگت کو حراست میں لیا گیا ہے۔انہوں نے کچھ سنسنی خیز باتوں کا انکشاف بھی کیا ہے جن سے آگے چل کر ہمیں گروہ کے دوسرے مجرموں کو پکڑنے میں مدد ملے گی۔(ایس پی نے نعمان کی طرف توصیفی نظروں سے دیکھ کر کہا)۔

مورتی کی بازیابی اور مجرموں کی گرفتاری میں انسپکٹر نعمان کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اس پیچیدہ مسئلے کو حل کیا ہے۔

ایک اخباری نامہ نگار: انسپکٹر، آپ نے یہ گتھی کیسے سلجھائی؟

انسپکٹر نعمان: ہمارے سامنے پہلا بڑا سوال یہ تھا کہ آخر ملزم ٹشی پھیلے کو مورتی کی چوری کی واردات کے بعد ایک پرانی مورتی کو اپنے گھر میں رکھنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ جس کا وہ بذاتِ خود انکار کرتا ہے۔ دوسرا بڑا سوالیہ نشان یہ تھا کہ اس کے گھر سے ملی مورتی اصلی بھی ہے یا نہیں۔ پہلے سوال سے ہمیں اس مفروضے پر سوچنے کی تحریک ملی کہ اگر ملزم نے مورتی اپنے گھر میں چھپا نہیں رکھی تھی تو اس کو چھپانے والا کوئی اجنبی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا کوئی واقف کار ہونا چاہیئے۔

اخباری نامہ نگار: اور دوسرے سوال کا کیا جواب ملا؟

انسپکٹر نعمان: جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے، میری پہلی نظر اور سوچ کہتی تھی کہ یہ اصلی مورتی ہو نہیں سکتی۔ کوئی بھی جانکار آدمی سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ اصلی مورتی نہیں ہے۔ اصلی اور پرانی مورتی کی پشت پر مہر لگتی ہوتی ہے۔ یہ خالص پیتل یا کانسے کی بنی ہوتی ہے۔ مورتی کے اندر کئی قیمتی چیزیں، مقدس منتر اور دعائیں لکھے ہوئے نسخے محفوظ کئے گئے ہوتے ہیں۔ نئی مورتی سانچے میں ڈھالی جاتی ہے جبکہ پرانی اور اصلی مورتی انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوتی ہے۔ نئی مورتی کئی باتوں میں اس معیار پر نہیں اترتی تھی۔

ریڈیو کا نمائندہ: پھر؟

انسپکٹر نعمان: مورتی کو پرانا بنانے اور زنگ آلودہ دکھانے کے لئے ایسڈ کا استعمال ہوتا ہے یا جلتی ہوئی موم بتی انڈیل کر آگ پر تپائی جاتی ہے۔ یہ کام بھی اس مورتی پر کیا گیا تھا لیکن بڑے بھدے اور بے ڈھنگے طریقے سے۔ ناتجربہ کار ہاتھوں کی یہ کوشش صاف دکھائی دیتی تھی۔ ہم نے ایک جانکار سے رائے بھی پوچھی تو اس

نے میری بات کی تصدیق کی اور مزید تصدیق کے لئے ہم نے اس کا کیمیائی تجزیہ کرایا اور ہمارا مفروضہ درست ثابت ہوا۔ بے شک نتیجہ آنے میں کچھ وقت لگا اور آپ بیتابی سے انتظار کرنے لگے۔ تاہم دیر آید درست آید، ہماری کوشش کامیاب رہی۔

خباری نامہ نگار: اور نقلی مورتی ......

اانسپکٹر نعمان: (بات کاٹ کر) یہی نقلی مورتی ہے۔ (انسپکٹر نے میز پر رکھی نقلی مورتی کو ہاتھ میں اُٹھا کر سب کی طرف دکھاتے ہوئے گھمایا)۔ گم شدہ مورتی ایک ہزار سال پرانی تھی اور گندھارا آرٹ کا نمونہ تھی۔

ٹی وی کا نمائندہ: اصلی مورتی کہاں گئی؟

انسپکٹر نعمان: سنیئے تو۔ اب سوال پیدا ہوا کہ آخر یہ نقلی مورتی اس غریب آدمی کے گھر میں کیوں چھپائی گئی۔ یا تو چور اپنے جرم سے توجہ ہٹانا چاہتا تھا یا ملزم سے مجرم کی دشمنی تھی۔ وہ اس کو بدنام کرنا چاہتا تھا اور کسی جرم میں ماخوذ کر کے اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ پہلی دلیل کے مقابلے میں ہمیں دوسری دلیل زیادہ وزن دار لگی۔ چنانچہ ہمارے ساتھ دو مسئلے پیدا ہوئے۔ دو سوال ابھرے۔ پہلا یہ کہ اس علاقے میں ڈیڑھ سال کے دوران کون اچانک دولت مند بن گیا ہے اور دوسرا ٹشی چھیلے اور اس کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ (ایک لمحہ کے توقف کے بعد) تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ مجرم نے گاؤں میں ایک سال کے دوران ایک نیا بڑا مکان تعمیر کیا ہے۔ دس کنال زمین خریدی۔ ایک دکان کھولی، جس پر اس کا لڑکا رہتا ہے۔ لیہہ میں آٹھ لاکھ روپے میں ایک کنال زمین خریدی اور خود چھوٹے چھوٹے ٹھیکے لینے شروع کئے۔ گاؤں والے حیران تھے کہ یہ سب کچھ کرنے کے لئے اس کو کہاں سے خزانہ ہاتھ لگا۔ ہم نے ٹشی چھیلے سے باز پُرس کی۔ ہسپتال کے بیڈ پر اس کی بیوی سے رابطہ قائم کیا اور اس کی لڑکی کا بیان لیا کہ مجرم سے ان کے کیا

تعلقات تھے؟ دشمنی تو نہیں تھی؟ کیا وہ بھی گنپہ میں آیا تھا؟ تب کئی دلچسپ تفصیلات منظر عام پر آئیں۔ وہ ایک پتھر سے دو پرندے مارنا چاہتا تھا۔ مورتی کی چوری بھی کرنا چاہتا تھا اور لڑکی سے شادی کرنا بھی چاہتا تھا۔ عمر میں وہ تقریباً لڑکی کے باپ کے برابر ہے۔ اس نے اپنی پہلی بیوی کو پہلے ہی طلاق دی ہے۔ ماں باپ اور لڑکی تینوں اس شادی کے خلاف ہیں جبکہ وہ شادی کرنے پر مصر ہے۔ اس دوران اس نے یہ بھی سنا کہ ایک نوجوان متمول ڈاکٹر لڑکی میں دلچسپی لیتا ہے۔ اس لئے وہ جلد از جلد معاملہ نپٹانا چاہتا تھا۔

گنپہ تنظیم کا صدر: یہ سارا واقعہ فلمی جاسوسی کہانی کی طرح لگ رہا ہے۔

انسپکٹر نعمان: جی ہاں بالکل لگ رہا ہے۔ حالیہ مورتی کی چوری سے کچھ روز پہلے وہ گنپہ میں تیل کا نذرانہ چڑھانے آیا۔ یہ محض نمائشی عقیدت کا اظہار تھا۔ ٹشی پھلیے نے اس کے لئے کئی مرتبہ گنپے کا دروازہ کھولا۔ ایک روز اس نے ٹشی پھلیے کو ایک چٹان کے نیچے گنپے کی چابی چھپاتے ہوئے دیکھا۔

ایک اخبار نامہ نگار: کیا ٹشی پھلیے نے اس کے سامنے چابی چھپائی۔

انسپکٹر نعمان: ٹشی پھلیے نے اس کو نہیں دیکھا۔ وہ ہر لمحہ ٹشی پھلیے کی ٹوہ میں لگا تھا۔ چابی کے چھلے پر اس کے مکان کے دروازے کے تالے کی چابی بھی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں مہنت چٹان کی کھوہ سے چابی نکال کر گنپہ کی ڈیوڑھی کھولتا تھا۔ صرف ٹشی پھلیے اور مہنت اسے واقف تھے کہ وہ کہاں چابی چھپا کر رکھتے ہیں۔ اس کے تین روز بعد مورتی غائب ہوئی۔ دروازے پر تالا لگا تھا لیکن مورتی نہیں تھی۔

چابیاں حاصل کرنے کے بعد مجرم نے دوسرے مجرم انگت کے ذریعے گنپہ اور ٹشی پھلیے کے گھر کی چابیوں کی ایک ڈپلیکیٹ بھی تیار کی تھی اور پولیس کے پہنچنے سے صرف دو گھنٹہ پہلے ٹشی پھلیے کے مکان میں کسی کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نقلی مورتی ٹوکری میں چھپالی اور مکان پر تالا لگایا۔

ریڈیو کا نمائندہ: چابیاں اس نے اتنی جلدی کیسے بنائیں؟

انسپکٹر نعمان: موم پر اس نے دونوں چابیوں کا قالب اتارا۔ یہ ترکیب اس کو انگت نے بتائی تھی۔ اسے لیہہ لایا جہاں اتفاق سے اُن دنوں نیچے سے چابیاں بیچنے اور بنانے والا ایک آدمی آیا تھا۔ وہ کئی سال سے یہاں آرہا ہے اور مسجد کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے۔ ہم نے اس سے رابطہ قائم کیا اور اس سے بھی ہمیں چوری کا سراغ لگانے میں مدد ملی۔

گنپہ تنظیم کا صدر: مجرم کو آپ نے کیسے پکڑا؟

انسپکٹر نعمان: جب ہم مجرم کو پکڑنے اس کے گھر گئے تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ گاؤں سے اچانک غائب ہوا تھا۔ ہم گاڑی میں لیہہ واپس آرہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ایک آدمی ہمیں دیکھ کر چٹانوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ جب اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھا تو ایک چٹان کی اوٹ لیتا ہوا تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ ڈھائی گھنٹے کے مسلسل تعاقب کے بعد ہمارے دو جوانوں نے اس کو گرفتار کیا۔ یہ وہی آدمی تھا؟ جو ہمیں مطلوب تھا۔ گرفتاری سے پہلے اس نے دو دفعہ اونچائی سے ہمارے اوپر بڑے بڑے پتھر لڑھکائے۔ لیکن ہم نے جب ہوائی فائر کئے تو اس نے ہار مان لی۔ (انسپکٹر نے سامنے لگے سکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔) آپ اس ڈرامائی منظر کو سکرین پر دیکھ لیجئے۔ ہمارا مووی کیمرہ تب بڑا کام آیا۔

(سبھی بڑے اشتیاق سے فلم دیکھنے لگے۔)

ایک اخباری نامہ نگار: اس پر ایک خوبصورت جاسوسی فلم بن سکتی ہے۔

انسپکٹر نعمان: اب کیا تھا۔ دو گھنٹے بعد مجرم نے اقبالِ جرم کیا اور صاف صاف بتایا کہ اس نے کیسے دو مورتیاں چرائیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم میتریا کی نادر مورتی نہیں بچا سکے۔ وہ اس کو پہلے ہی فروخت کر چکا تھا۔

ٹی وی کا نمائندہ: کس کو فروخت کی۔

انسپکٹر نعمان: اُس نے اور انگت نے اصلی مورتی ایک بڑے ڈبے میں اچار کے نیچے ڈال کر ہوائی جہاز میں لیہہ سے چندی گڑھ لی، جہاں سے اس کی ڈپلیکیٹ بنانے دونوں علی گڑھ گئے اور علی گڑھ سے بمبئی روانہ ہوئے جہاں مورتی اور دو تھنکوں کے لئے چالیس لاکھ روپے ملے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ملک سے باہر اس کا دام کم سے کم ایک کروڑ روپیہ ہوگا۔

(اویلو کیتیشورا کی مسروقہ مورتی دکھاتا ہوا) نئ چرائی گئی مورتی یہی ہے۔ یہ چھ سو سال پرانی ہے۔ اس پر تبت، پالا اور گندھارا تینوں آرٹ کا اثر ہے۔ گیا لپوٹق بوم دے کے زمانے میں تبت سے لداخ لائی گئی ہے۔

گنپہ تنظیم کا صدر: نعمان صاحب، آپ نے ایک دفعہ پھر بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

گنپہ وفد کارکن: بلاشبہ، یہ آپ کا ذہین دماغ ہے، جس نے بڑی خوبی سے اس ناپاک چوری کا یہ پیچیدہ مسئلہ حل کیا۔

گنپہ تنظیم کا صدر: اس کے علاوہ اس نے اور بھی چوریاں کی ہوں گی!

انسپکٹر نعمان: جی ہاں، اس نے اس کے علاوہ ایک گنپہ سے ایک مورتی اور دوسرے گنپہ سے تین پرانے تھنکے چرانے کا اقبال کیا۔

اخباری نامہ نگار: بمبئ میں مورتی کس نے خریدی؟

انسپکٹر نعمان: یہ ایک اہم سوال ہے۔ معاملہ کی تحقیقات جاری ہیں، جو اس وقت ہم ظاہر نہیں کر سکتے۔ تاہم میں اتنا کہوں گا کہ مورتی چوری اور سمگلنگ کرنے میں باقاعدہ ایک منظّم گروہ کا ہاتھ ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس گروہ میں سماج کے کئی معزز آدمی بھی شامل ہیں جو تحقیقات کرنے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔

ریڈیو کا نمائندہ: آپ نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے میتریا کی مورتی کہاں بنوائی اور کیوں ٹشی بھیلے کے مکان میں چھپائی؟

انسپکٹر نعمان: یہ مورتی بھی علی گڑھ میں بنوائی، جو اصلی مورتی کی کاربن کاپی تھی۔ یہ اس نے ایک سال تک پہاڑ پر ایک چٹان کے نیچے چھپا رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لڑکی کے باپ کو مورتی چوری کے الزام میں گرفتار کیا جائے۔ جب باپ راستے سے ہٹ جائے گا تو لڑکی کو پانا اور اس سے شادی کرنا آسان ہوگا۔ ماں ہمیشہ بیمار رہتی تھی اور اس کے خیال میں یہ اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

گنپہ وفد کا ایک رکن: آخر چند لوگوں کو یہ ناجائز اور ذلیل کام کرنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟

انسپکٹر نعمان: وہی لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں جو ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں کہ کب اس کو سو بنائیں۔ یہ لوگ راتوں رات کروڑ پتی بننا چاہتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس: کوئی مذہب نہیں کہتا کہ دوسرے مذہب کے ماننے والوں کے عقیدے اور جذبات کو ٹھیس پہنچائی جائے جو کوئی مورتی چرا کر بیچتا ہے، اس کا کوئی ضمیر اور مذہب نہیں ہوتا۔

......●●● ......

☆ شیرازہ اردو اور ہمارا ادب میں اشاعت کے لئے اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر ارسال کریں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

تجزیہ

☆......ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری

عبدالغنی شیخ لداخی کا منفرد ڈراما ''انجام''

عبدالغنی شیخ کا شمار دبستان جموں وکشمیر کے چند نمائندہ قلم کاروں میں ہوتا ہے۔لداخی کلچر اور تاریخ پر ان کی کتابیں اور مضامین سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ افسانہ اور ناول بھی لکھتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی کے لیے ڈرامے اور فیچر بھی تحریر کرتے ہیں۔ان کا ایک ڈراما ''انجام'' کے عنوان سے جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ اینڈ کلچر نے ہمارا ادب ہم عصر ڈراما نمبر ۱۷۔۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔اصل میں یہ ایک مختصر ساٹی وی ڈراما ہے جو کہ خصوصی طور پر انہوں نے دُور درشن کیندر لیہہ کے لیے لکھا ہوگا۔

ڈراما ''انجام'' سات منظروں پر مشتمل ایک مختصر ساٹی وی اسکرین پلے ہے جو اپنے موضوع یا تکنیک کے اعتبار سے کچھ نیا نہیں ہے۔اس میں لداخ کا روایتی ماحول دکھایا جاتا ہے اور ہر منظر کی جائے وقوع لداخ کا ہی علاقہ ہے۔ یہاں دو ہی باتوں پر زیادہ زور دے دیا گیا ہے۔اس میں لداخ میں بڑھتا ہوا کرائم اور آج کے پولیس کی ہوشیاری دکھائی گئی ہے۔اب تیسری بات کو بھی اس کے موضوع کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں کہ کہیں بھی کسی کرائم کے ہونے سے یا کسی شخص پر اس قسم کا کوئی الزام عائد ہونے سے ملزم اس قدر داغ دار ہو جاتا ہے کہ اس کی سزا اس کے گھر والوں کو بھی بھگتنی پڑتی ہے، خاص کر اگر ملزم بیٹی کا باپ ہو!۔دوسری طرف ایک شریف النفس لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے اس کے ذی عزت باپ کو کیسے جرم میں پھنسایا جاتا ہے یا ایک لڑکی کو کیسے بے بس کیا جاتا ہے۔اسی طرح کے

مسئلے کو ناول امراؤ جان ادا (مرزا محمد ہادی رسوا) یا نرملا (منشی پریم چند) میں بھی اُٹھایا گیا ہے۔

ڈراما ''انجام'' کے پلاٹ کو مختصر بنانے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ اس کی طوالت اور بھی بڑھ سکتی تھی۔ مگر مصنف نے یہاں اصل واقعات کو عمل سے کم، بلکہ مکالموں میں ہی پیش کیا ہے۔ اب پہلے ایک نظر اس کے پلاٹ پر ڈالتے ہیں۔ ڈراما ''انجام'' کے پہلے سین میں لداخ کے ایک گاؤں کی منظر کشی کی گئی ہے۔ جہاں صبح کے وقت گاؤں کے لوگ گنپہ کے پاس اس لئے جمع ہو گئے ہیں کیونکہ گنپہ کی پوتر مورتی یعنی چنڈازک (اویلوکیتیشورا) کی چوری ہوگئی ہے۔ اس پر سبھی لوگ واویلا کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں گاؤں کا پچاسی سالہ بزرگ صنم چھوانگ، نمبردار، مہنت کا معاون یعنی ٹشی پھلیے، فلاحی تنظیم کا ممبر مہنت اور ایک عورت ہوتی ہے۔ ان میں کوئی مورتی کی عظمت بیان کرتا ہے، کوئی اس بات پر حیرت ظاہر کرتا ہے اور عورت حسب روایت مورتی چور کو کوسنا شروع کر دیتی ہے۔ چونکہ زیادہ تر لوگ مذہبی طور پر توہم پرست ہوتے ہیں، اس لئے اب انہیں ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں اب اس گاؤں پر کوئی آفت نہ آجائے!۔ اب مسئلے کا حل یہی ہے کہ لیہہ جا کر پولیس کو رپورٹ کی جائے۔ دوسرے سین میں لیہہ سے تفتیش کے لیے پولیس کی ایک ٹیم آجاتی ہے، جس میں ایس آئی ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل ہوتے ہیں۔

وہ پہلے مہنت اور اس کے معاون ٹشی پھلیے سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے پیشہ ورانہ طریقے سے گاؤں کے دوسرے لوگوں کو پوچھتے ہیں۔ اس دوران انہیں کئی اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے، جیسے اس گاؤں میں چند سیاح آئے تھے، باہر کے مزدور کام کرنے کے لیے آتے ہیں، کچھ دن پہلے یہاں ایک میڈیکل کیمپ لگا تھا، اس کے بعد وہ سیدھے ٹشی پھلیے کے مکان پر چھاپہ ڈالتے ہیں۔ ان کی بیوی اور بیٹی لیہہ گئیں تھیں۔ مکان بند پڑا تھا۔ جہاں سے انہوں نے ایک ٹوکری سے ایک مورتی برآمد کی، مہنت بڑی حیرانگی میں کہتے ہیں:

> ''ارے میتریا کی یہ مورتی یہاں کہاں سے آئی۔ صاحب، ہماری مورتی اویلوکیتیشورا ہے۔ یہ پوتر مورتی میتریا ہے۔ لیکن یہ کہاں سے آئی؟''

اس طرح ٹشی پھلیے بُری طرح پھنس گیا، مگر کوئی اس بات کی گواہی نہیں دیتا ہے کہ یہ نیک

شخص ایسا کام کرسکتا ہے اور نہ یہ چنڈ ازک مورتی ہوتی ہے!۔

تیسرے سین میں لیہہ کے تھانے میں بہت سارے لوگ سب انسپکٹر سے ملتے ہیں اور انہیں میتر یا مورتی کی بازیابی کے لیے مبارک باد دیتے ہیں۔ اب چوتھے منظر میں اس ڈرامے کا دوسرا پہلو سامنے لایا جاتا ہے، جس میں ڈاکٹر صنم کے گھر (اس کی ماں اور اس کی بہن ینگچن) میں اس بات پر گفتگو ہو رہی ہے کہ کیسے وہ ایک چور کی بیٹی کو گھر میں بیاہ کر کے لائیں گے، جبکہ صنم کو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا ہے کہ ان کی محبوبہ پدماں کا باپ چوری کرسکتا ہے۔ پانچویں سین میں سول سوسائٹی کے ممبران اب سُپر انٹنڈنٹ آف پولیس پر اصل مورتی کی بازیابی پر زور دیتے ہیں اور اس طرح سُپر انٹنڈنٹ یہ کیس انسپکٹر نعمان کے حوالے کر دیتا ہے۔ چھٹے سین میں انسپکٹر نعمان ڈاکٹر صنم کو اپنے آفس میں بلا کر اس سے اس بات پر تبادلہ خیال کرتا ہے اور اس بیچ میں پدماں اور صنم کے تعلقات کی بھی بات چلتی ہے۔ تو اس طرح انسپکٹر اپنی تفتیش کو بڑی سرعت سے آگے بڑھاتا ہے۔

مصنف نے ساتویں اور آخری سین کو بالکل مختلف انداز میں دکھایا ہے۔ یعنی اس ڈرامے میں چند ابتدائی واقعات ہی پیش کئے جاتے ہیں۔ کہانی میں تھوڑا تصادم آجاتا ہے۔ جبکہ انہوں نے پلاٹ کا بیشتر حصہ اسی سین میں دکھایا ہے۔ دراصل یہاں انہوں نے اس ڈراما کی ساری Action اپنے بہت طویل مکالموں میں دکھائی ہے۔ یعنی یہاں تصادم بڑھنے لگتا ہے۔ اُلجھاؤ بھی پیدا ہوتا ہے، نقطۂ عروج بھی یہیں پر ہوتا ہے اور ایک دم اُوپر سے نیچے خاتمے کی طرف ۹۰ ڈگری کی صورت میں چھلانگ لگائی جاتی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ ایک ماہ کے عرصے کے بعد سُپر انٹنڈنٹ نے سرکردہ افراد کی موجودگی میں ایک پریس کانفرنس بلائی، جس میں انسپکٹر نعمان اصل مورتی کی بازیابی کی خبر لوگوں کو دیتا ہے اور یہ بھی تفصیلاً بتاتا ہے کہ لداخ میں ایک پیشہ ور مجرم ہے، جو راتوں رات امیر بنا۔ وہ ٹشی کی بیٹی یعنی پدماں سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ عمر میں وہ ان کے باپ کے برابر ہے۔ اس نے نقلی مورتی کو ٹشی کے گھر میں رکھا اس نقلی مورتی کو مجرم نے علی گڑھ میں بنوایا تھا جبکہ اصلی مورتی اس نے لاکھوں روپیوں میں چنڈی گڑھ میں بیچ ڈالی، اس کارروائی کے دوران پولیس کے ساتھ اس کی مڈبھیڑ بھی ہوئی، مگر آخر کار وہ پکڑا

گیا۔ غرض یہ کہ اس واقعہ کی ساری تفصیل بیان کی اور اسکرین پر بھی کچھ شاٹس انہیں دکھائے۔

زیرِ نظر ڈرامے میں مصنف نے اپنے اردگرد کے ماحول کو مدِ نظر رکھ کر اس کے کچھ مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے گا، تو ایسے مسائل ہر سماج میں خود بخود پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ چاہے وہ مذہبی جگہوں پر چوری کے واقعات ہوں یا ان سے باہر۔ یا ایسے واقعات کا Social Impact ہو۔ یہاں مصنف کا زیادہ تر فوکس یہی رہا۔ البتہ جہاں تک ڈرامے کے فن کا تعلق ہے چاہیے وہ ریڈیو، ٹی وی ڈراما ہو یا اسٹیج ڈراما اس کا اپنا اپنا فن ہوتا ہے۔ ہر فن کے لوازمات کو برتنے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں اکثر قلمکار چوک جاتے ہیں۔

دراصل کہانی کہانی ہوتی ہے اور ڈراما ڈراما ہوتا ہے، مصنف نے یہاں ڈرامے کی صورت میں ایک کہانی ہی پیش کی ہے۔ حالانکہ ٹی وی ڈرامے نے یہ فرق کچھ مٹا تو دیا ہے، مگر پھر بھی بہت سارے لوگوں نے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے کچھ ایسے ڈرامے لکھے، جنھیں معمولی سی ترمیم یا اضافے کے بعد باضابطہ طور پر اسٹیج کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ڈرامے کا اصل مقصد اس کا اسٹیج کرنا ہے۔ زیرِ نظر ڈرامے میں اس چیز کا زبردست فقدان نظر آتا ہے۔

اس ڈرامے کی زبان عام فہم ہے جیسی ہماری صحافت یا ریڈیو، ٹی وی میں اردو استعمال کی جاتی ہے اور مقامی لب و لہجے میں ہی بات کی جاتی ہے۔

ڈرامے میں مقامیت اس قدر غالب ہے کہ لداخ سے باہر اس کو دیکھنا کچھ زیادہ دلچسپی پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ یہ ڈراما مختصر سہی کم از کم ایک آدھ منظر اگر پدما اور صنم کی ملاقات کا بھی ہونا چاہیے تھا۔ وہ مناظر ناظرین میں دلچسپی پیدا کرسکیں گے۔

......●●●......

☆......عبدالغنی شیخ

سفرنامۂ روم واستنبول

میں نے ایک درجن سے زائد ممالک دیکھے ہیں۔ ان میں آٹھ ممالک یورپ، چار ایشیا اور ایک لاطینی امریکہ میں ہے۔ اس دوران مجھے دنیا کے چند خوبصورت شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں لندن، پیرس، روم، استنبول، ریوڈی جنرو، زوریگ ہائیڈل برگ، اسلام آباد، سنگاپور، کوپن ہیگن، مشہد اور کونسٹنز شامل ہیں۔ ان ملکوں کو دیکھنے کے لئے مجھے اخراجات کا بارگراں اٹھانا نہیں پڑا، جن کا میں متحمل بھی نہیں ہوں۔ کئی اداروں اور تنظیموں خاص کر انٹرنیشنل ایوسیشن فار لداخ سٹیڈیز (IALS) نے کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کرنے کے لئے مدعو کیا۔ IALS ہر تیسرے سال لداخ کے بارے میں سمینار منعقد کرتا ہے۔

بہت سارے لوگوں کی طرح مجھے بھی سیاحت کا بڑا شوق ہے۔ میں نے بچپن سے ہی خوبصورت مقامات دیکھنے کے خواب دیکھے ہیں۔ کچھ دن میں پورے ہوئے چند تا دمِ تحریر پورے نہیں ہوئے۔ ایک خواب ریوڈی جنرو دیکھنے کا تھا۔ برازیل کے اس خوبصورت شہر کے بارے میں، میں نے کہیں پڑھا تھا۔ برسوں بعد اتفاقی طور پہ خواب پورا ہوا۔ میں نے لندن میں برٹش میوزیم، کوپن ہیگن میں گول گنبد (جو درسی کتاب میں تھا) روم میں ویٹکن، دیوارِ چین اور اہرامِ مصر دیکھنے اور پیرس میں ایفل ٹاور پر چڑھنے کے شاید خواب دیکھے تھے۔ جس نوٹ بک پر اپنی یہ تمنائیں لکھی تھیں، وہ تلاشنے پر ہاتھ نہیں آیا۔

زیر نظر سفرنامہ میں روم اور استنبول میں میری سیاحت کا تذکرہ ہے۔ اٹلی کے دارالحکومت

روم میں 7 ستمبر سے 10 ستمبر 2007ء تک IALS کا چارروزہ سمینار منعقد ہوا۔اس کے اخراجات روم کی LA PIEZA یونیورسٹی نے فراہم کئے۔ اس ضمن میں یونیورسٹی کے شعبۂ تبت کے استاد پروفیسر ایلینا روزی فیلی پینک نے غیر معمولی دلچسپی لی۔اس مجلسِ مناظرہ میں چالیس سے زائد مقالے پیش کئے گئے۔ چودہ لداخیوں کو پیپرز پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ان کے علاوہ آئی اے ایل ایس (IALS) کے تین ہندوستانی ممبروں نے تنظیم کی دعوت پر سمینار میں شرکت کی۔راقم الحروف نے ''لداخ، میں صوفیانہ روایات'' کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔مقالات میں لداخ کی تاریخ اور ثقافت کے علاوہ خطے سے وابستہ طب، مذہب، ماحولیات، زراعت، سیاحت، آرٹ اور جنگلی جانوروں سے متعلق مقالات شامل تھے۔سمینار کی کئی نشستیں واٹکین کے قریب ایک عمارت AURELIA VILLA میں ہوئیں۔اس کمپلیکس میں 30، 60، 80، اور 150 نشستوں کے میٹنگ ہال ہیں۔ اکثر شرکا کے قیام کا انتظام بھی اسی کمپلیکس میں کیا گیا تھا۔سمینار کی دو نشستیں FACOLTADI STUDI ORIENTALI اور ایک بیٹھک گیسیو پوٹوچی میوزم میں ہوئی۔اوّل الذکر علوم مشرقیات کی تعلیم وتدریس کا ایک ادارہ ہے۔میوزم میں لداخ سے متعلق تصاویر ہیں۔ یہ فوٹو لداخ آنے والے اطالوی محققوں ڈاکٹر فلیسپو فلیپی، ڈینیلی اور ٹوچی کے کھینچے ہوئے ہیں۔ اوّل الذکر دو محققین 1914 میں لداخ آئے تھے جبکہ ٹوچی 1920 کی دہائی میں کئی مرتبہ لداخ آئے تھے۔ٹوچی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔وہ کلاسیکل لداخی جانتے تھے۔ان کے علاوہ لداخ آنے والے دو اطالوی فادر ڈیزی ڈیری اور لوسینو پیٹک مشہور ہیں۔ ڈیزی ڈیری 1715 میں لداخ آئے تھے۔ جہاں سے وہ تبت روانہ ہوئے۔ان کا سفر نامہ اس دور کے لداخ کی تصویر پیش کرتا ہے۔لوسینو پیٹک کی تصنیف Kingdom of Ladakh لداخ کی تاریخ پر ایک اہم تصنیف ہے۔ وہ پہلے 1930 کی دہائی میں اپنے ڈاکٹریٹ کے تھیسیس کے ریسرچ کے سلسلے میں لداخ آیا تھا۔ Chronicle of Ladakh کے نام سے انہوں نے اپنے تھیسیس کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

سمینار میں انگلینڈ کے جان بیرے کو IALS کا صدر مقرر کیا گیا۔ سابق صدر ڈاکٹر ہنری اوسمسٹن کے انتقال کے بعد یہ عہدہ خالی پڑا تھا۔لداخ کی تاریخ اور ثقافت پر جان بیرے کی گہری

نظر ہے۔آئی اے ایل ایس کی ایک سینئر ممبر ڈاکٹر منیشا احمد اکثریتی ووٹوں سے جان بیرے کی جگہ آنزیری سکریٹری مقرر ہوئیں۔ وہ ممبئی سے تعلق رکھتی ہیں۔انہوں نے آکسفورڈ میں تعلیم پائی ہے اور ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے۔ پروفیسر مارٹین مل تنظیم کے جریدے لداخ سٹڈیز کے نئے مدیر نامزد ہوئے۔

ایک سنیئر ممبر جینت رضوی کی صدارت میں لداخ کے معروف مورخ کاچوسکندر خان مرحوم کی یاد میں ایک میٹنگ ہوئی۔ جان بیرے کی فرمائش پر کاچوسکندر خان کے فرزند کاچوممتاز حسین خان اور میں نے مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی اور گلہائے عقیدت پیش کئے۔ جینت رضوی لداخ پر دو مقبول کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ وہ سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھتی ہیں۔انہوں نے ایک آئی اے ایس آفیسر ایس۔ایس۔رضوی سے شادی کی ہے اور گوڑ گاؤں میں مقیم ہیں۔

آئی اے ایل ایس کے مغربی مملک کے کئی ممبران لداخ کی تاریخ اور ثقافت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔اس لئے سمینار میں پیش کرنے کے لئے معیاری اور مستند مضامین ہی قبول کئے جاتے ہیں۔ مغربی مصنفین اور سکالروں نے لداخ کے سربستہ، انوکھے واقعات اور تاریخی حقائق کو قلم زد کر کے منظر عام پر لایا ہے۔ جن سے متعلق لوگ یا تو بہت کم جانتے تھے یا ان پر دھیان نہیں دیا جاتا تھا۔ ہر سال مغرب سے دو تین افراد اپنے تھیسیس کے ریسرچ کے لئے لداخ آتے ہیں۔

اٹلی یورپ کے ان ملکوں میں شمار ہوتا ہے جہاں انگریزی سیکھنے کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ Aurelia Villa میں کام کرنے والے اکثر اطالوی ملازمین انگریزی نہیں جانتے تھے۔ہم نے انگریزی اور اطالوی دونوں زبانوں میں مشترکہ استعمال ہونے والے الفاظ کے سہارے معاملات نپٹالئے۔

9 ستمبر کو علومِ مشرقیات کی دانش گاہ جاتے ہوئے بس میں بیٹھے بیٹھے سمینار کے شرکا کو روم کے کئی تاریخی مقامات دکھائے گئے۔ان میں واٹیکن اور Collossium شامل تھے۔ایک لڑکی بس کی اگلی نشست پر بیٹھے اطالوی زبان کے لہجے میں انگریزی میں آنکھوں دیکھا حال بتانے لگی۔ روم میں جابجا رومن دور کے تاریخی مقامات اور ان کے کھنڈرات ہیں۔ دو مقامات پر کئی ملازمین کو، جو غالباً دربان یا پہرہ دار تھے، فوجی لباس میں مخصوص ٹوپی میں دیکھا، جو سکندر اعظم اور اس کی فوج استعمال کرتے تھے۔ تاریخ مقامات کے پس منظر یا پیش منظر انہیں دیکھ کر آنکھوں کے سامنے اس دور

کا سماں آتا تھا اور دل میں وہی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔

Collossium قدیم دنیا کے عجوبات میں ایک ہے، جہاں مختلف کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ سربکف شمشیر باز جان کی بازی لگاتے تھے اور بے تحاشا انسانی جانیں چلی جاتی تھیں۔ شمشیر بازی اور خون خرابہ کو روکنے کی کوشش میں ایک پادری مارا گیا۔ سن 442ء اور 508ء میں زلزلوں سے اس کو نقصان پہنچا۔ 1349ء میں مزید زلزلوں کے بعد اس کو بند کیا گیا۔ Collossium قدیم دنیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم ہے۔ اس کی تعمیر کی شروعات 72ء میں ہوئی تھی اور آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر میں یہودی قیدیوں سے کام لیا گیا۔ اس کی لمبائی زیادہ سے زیادہ 187 میٹر اور چوڑائی کم سے کم 155 میٹر ہے۔ اس میں اسی ہزار تماشائیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ بادشاہ، سینیٹ اور عام لوگ اس میں تماشا دیکھنے آتے تھے۔ Collossium کے پاس ایک بڑا میدان ہے۔ جس میں گھوڑ دوڑ ہوتی تھی۔

بس میں بیٹھے بیٹھے دریائے ٹیبر کے ایک پل کے جنگلے کے پاس سنگِ مرمر کی مورتیاں دیکھیں اور پاس کسی رومن بادشاہ کا مقبرہ نظر آتا تھا۔ ایک جگہ دریا میں کشمیر کی طرح ہاؤس بوٹ نظر آئے، جن کو بطورِ ریستوران استعمال کیا جاتا ہے۔

روم میں اپنے قیام کے پہلے اور آخری روز ہم میں سے کئی رومن کیتھولک فرقہ کے متبرک شہر اور پوپ کی اقامت گاہ دیکھنے گئے۔ ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا۔ بہت سارے سیاح چھوٹے چھوٹے گروپوں میں تھے۔ ان کے آگے آگے جھنڈی یا کوئی نشان لئے گائیڈ تھے تاکہ گروپ کا کوئی آدمی بھٹک نہ جائے۔

وٹیکن اپنی شاہکار تصویروں، سنگِ مرمر کے مجسموں، نوادرات اور سنگ تراشی کے نمونوں کا ایک بڑا عجائب خانہ ہے، جو متعدد ہالوں اور گیلریوں میں رکھے گئے ہیں۔ ان میں مائیکل انجلو (1475-1564ء) اور سافیل سن زیو (1483-1520ء) جیسے شہرہ آفاق فن کاروں کی شاہکار تصویریں اور سنگ تراشی کے نمونے نمایاں ہیں۔ میوزم کے اندر ایک نئی دنیا کا گمان ہوتا ہے۔

11 ستمبر کو منیشا احمد، میں اور دو لداخی ساتھیوں نے SISTINE نام کا عظیم کلیسا دیکھا۔

داخلہ فیس 9 یورو اور آڈیو گائیڈ کے لئے الگ سے 6 یورو لئے جاتے تھے۔ اس کے لئے پاسپورٹ یا شناختی کارڈ امانت رکھنا پڑتا ہے۔ آڈیو گائیڈ کا یہ آلہ انگریزی سمیت پانچ زبانوں میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ تصاویر، مجسموں، نوادرات یا گیلری کے لئے الگ الگ نمبرات لگے ہیں اور متعلقہ ہندسے کا بٹن دبانے سے معلومات فراہم ہوتی تھیں۔

مائیکل انجلو نے واٹیکن کے Sistine کلیسا کی بڑی اور بلند و بالا چھت کی شاہکار تصویریں بنائی ہیں۔ وہ عظیم سنگ تراش، مصور اور ایک اچھے شاعر تھے۔ انجلو نے سینٹ پیٹر کے گنبد کا ماڈل بھی بنایا تھا۔ مائیکل انجلو کو پوپ جولیس دوم نے 1505ء میں روم بلایا تھا۔ یوم جزاء (Judgement) اس کا دوسرا شاہکار ہے۔ یہ خوبصورت تصویروں کا مجموعہ ہے۔

رافیل 1508ء میں روم آیا۔ پوپ جولیس نے واٹیکن میں اس کے ذمہ متعدد منصوبے تحویل کیئے۔ مصوری میں اس کا بڑا کام 'مکتبہ ایتھنز' ہے، جو ایک بڑے ہال STANZA DELLA SEGNATURA میں منقش ہے۔ اس میں ارسطو، افلاطون، فیثاغورث، ٹولومی وغیرہ کی تصویریں ہیں۔ تصویروں کا یہ گلدستہ یونان کے قدیم فلسفیوں کے تئیں اظہار عقیدت ہے۔ رافیل نے یہ تصویریں 510-511ء میں بنائی تھیں۔ رافیل 37 سال میں فوت ہوا۔

واٹیکن کے باہر ایک پاکستانی ریستوران کی طرف سے اشتہارات بانٹے جا رہے تھے۔ ہم نے ریستوران کی تلاش کی لیکن نظر نہیں آیا۔ پیزا اور پستا کھا کر میں تنگ آیا تھا۔ شام کو ایک اور ریستوران میں بڑے چاؤ سے روٹی اور دال کا سالن کھایا۔ اٹلی اور استنبول میں جب بھی سوپ مانگا تو دال کا سوپ دیا گیا۔

روم دنیا ایک قدیم شہر ہے۔ جسے 23 اپریل 753 قبل مسیح رُومُولُو نے دریائے ٹیبر کے کنارے بسایا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق اسے 700 یا 600 قبل مسیح بسایا گیا۔ یہ صدیوں سے مختلف حکومتوں کا دارالخلافہ رہا ہے۔ ایک زمانے میں رومن سلطنت بہت بڑی اور طاقتور تھی۔ قدیم روم میں دس لاکھ لوگ رہتے تھے۔ اتنی بڑی آبادی والے شہر کا ہونا قدیم دنیا میں ایک انہونی سی بات تھی۔ نشاۃ ثانیہ کے دوران روم میں بڑے تعمیراتی کام ہوئے۔ اسی دوران واٹیکن کو بھی توسیع دی گئی۔

509ء میں رومن قلمرو کو جمہوریہ بنایا گیا۔ جولیس سیزر نے مطلق العنانیت لانے کی کوشش کی لیکن بعد میں وہ مارا گیا۔

موجودہ روم وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ مکانات عموماً پانچ منزلہ اونچے ہیں۔ آبادی 50 لاکھ ہے۔ شہر میں سات پہاڑیاں ہیں۔

12 ستمبر کو ہم ٹرکش ائر لائینز میں روم سے استنبول آئے۔ روم سیمنار کے پانچ شرکا میرے ہم سفر تھے۔ یہ لداخ کے کرگل ضلع کے محمد سلیم میر، گلزار منشی، ڈاکٹر محمد رضا عباسی، کاچو ممتاز حسین اور جواہر لال یونیورسٹی میں پروفیسر ہرجیت سنگھ تھے۔ روم سے استنبول تقریباً ڈھائی گھنٹے کا ہوائی سفر ہے۔ جہاز میں استنبول میں شائع ہونے والے انگریزی اخبار Today Zaman سے معلوم ہوا کہ عبداللہ گل ترکی کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ اخبار زماں کا ترکی زبان کا ایڈیشن دس لاکھ چھپتا ہے۔

استنبول کے اتاترک انٹرنیشنل ائر پورٹ پر پانچوں مجھ سے بغلگیر کے ساتھ جدا ہوئے۔ ان کی منزل دہلی تھی۔ ہوائی اڈہ پر میرے ایک میزبان محمد علی مجھے لینے آئے تھے۔ محمد علی نے اپنے موبائل فون سے نذیر احمد ڈول کو مطلع کیا اور وہ چند منٹوں میں اپنی گاڑی لے کر پہنچے۔ نذیر احمد ڈول کو روم سے میں نے فون کیا تھا کہ وہ استنبول کے سلطان احمد ایریا میں کسی ہوٹل میں میرے لئے ایک کمرہ بک کریں۔ نذیر احمد نے جواب میں کہا تھا کہ وہ میری رہائش کا انتظام صفا کوئی میں کر رہے ہیں۔ نذیر احمد اردو جانتے تھے۔ محمد علی اردو اور لداخی دونوں زبانیں بولتے ہیں۔ دونوں نے کشمیر میں تعلیم حاصل کی تھی اور 1977ء میں کشمیر سے ترکی گئے تھے۔ ان کا فلیٹ ائر پورٹ کے پاس صفا کوئی میں ہے۔ نذیر احمد نے مجھے اپنے فلیٹ میں لیا اور اہلِ خانہ سے ملایا۔ اس کے یہاں تین بیٹیاں ہیں۔ نذیر احمد اور محمد علی آبائی طور ترکی نسل کے ہیں۔

استنبول شہر سے متعلق میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ یورپ کے شہروں کی طرح بالکل صاف ستھرا ہے اور ساری تعمیرات منصوبہ بند طریقے سے ہوئی ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے 1892ء میں ترکی کا سفر کیا تھا۔ وہ ممبئی سے سٹیم شپ میں روانہ ہوئے تھے اور 22 دن سفر کرنے کے بعد استنبول پہنچے۔ تب سے 115 سال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے استنبول

بہت بدلا ہوگا۔ مولانا مصر اور شام بھی گئے تھے۔ انہوں نے اپنا سفر نامہ ''سفر نامۂ روم و مصر و شام'' کے نام سے لکھا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان کے مسلم لیڈر مولانا محمد علی جوہر بھی ترکی گئے تھے۔ تب استنبول خلافت کا مرکز تھا۔ سلطنت ٹرکی کو روم سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

رات کا کھانا میں نے نذیر احمد ڈول کے ایک رشتہ دار محمد یوسف ڈول کے ہاں کھایا۔ ان کا اپنا اپارٹمنٹ ہے، جس میں کئی فلیٹ ہیں، جو انہوں نے کرایہ پر دے رکھے ہیں۔ وہ فصیح اردو بولتے ہیں۔

دوسرے روز روزہ تھا۔ ٹی وی پر رمضان کی آمد کا چرچا تھا اور مختلف چینل خصوصی پروگرام نشر کر رہے تھے۔ دوسرے روز اخبار 'زماں' نے رمضان سے متعلق کئی صفحات کا ضمیمہ نکالا تھا۔

رمضان کی شروعات کے ساتھ اجتماعی افطار کا سلسلہ شروع ہوا اور Today Zaman سے معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں استنبول میں متمول اور خیر خواہ افراد اور بلدیہ (ٹرکی زبان میں بھی میونسپلٹی کو بلدیہ کہتے ہیں) کی طرف سے شہر میں مختلف مقامات پر سو سے زائد لمبے لمبے خیمے نصب کئے گئے ہیں۔ جہاں ہزاروں لوگوں کے لئے افطار کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بہت سارے روزہ دار مغرب کی نماز وہیں ادا کرتے ہیں۔ افطار میں محلے کے لوگ، مسافر اور ایسے ملازم شریک ہوتے ہیں، جو افطار کے لئے وقت پر گھر پہنچ نہیں پاتے۔ اخبار میں کئی غیر ملکی سیاحوں کا فوٹو دیا تھا، جو ڈنر میں شامل ہوئے تھے۔ استنبول کے گورنر کی طرف سے بھی 3500 سے 4000 افراد کے لئے اجتماعی افطار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بڑے خیمے میں بیک وقت پانچ سو آدمی افطار کر سکتے تھے۔ بلدیہ کے پاس ایسے خیمے ہیں، جن میں 570 آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ اخبار کے مطابق راج دھانی انقرہ میں ایسے 201 خیموں میں اجتماعی افطار دیئے جا رہے تھے۔ صفا کوئی میں جس گھر میں بھی مجھے مدعو کیا، سبھی روزہ دار تھے اور پابندِ صلوٰۃ تھے۔

اس دوران اردو بولنے والے چند اور ترکوں سے ملاقات ہوگئی۔ یہ سبھی مشرقی ترکستان (موجودہ شین جیانگ) کے رہنے والے ہیں۔ یہ سبھی نقل مکانی کر کے لداخ اور کشمیر میں آباد ہوئے تھے۔ جہاں سے 1970ء کی دہائی میں ترکی کی حکومت کی ترک پناہ گزینوں کی آباد کاری کی پالیسی کے تحت ترکی گئے تھے اور انہیں استنبول میں آباد کئے گئے تھے۔ کئی لوگوں نے لیہہ میں لداخی عورتوں سے

شادی کی تھی۔ صفا کوئی میں ایک درجن سے زیادہ ایسے ترکی گھرانے ہیں، جن کی اولاد کی مائیں لداخی اور باپ ترکی ہیں۔ میں نذیر احمد ڈول اوران کے برادران سے ان کی لداخی ماں نصرت خانم کی وساطت سے متعارف ہوا۔ ان کی دو بیٹیاں ثریا اور نریمان بھی استنبول میں مقیم ہیں۔ جبکہ ماں نے لیہہ نہیں چھوڑا ہے۔ استنبول میں آباد مشرقی ترکستان کے سارے مہاجرین مجموعی طور خوشحال ہیں۔

لیہہ صدیوں سے وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ کمیونسٹ چین برسر اقتدار آنے کے بعد 1949ء میں لیہہ کی یہ حیثیت ختم ہوگئی۔ تجارتی تعلقات کی وجہ سے بہت سارے لداخی روانی سے ترکی زبان بولتے تھے۔ میرے والد کا ترکوں سے چھوٹا سے کاروبار تھا۔ اس رابطے کی وجہ سے میں نے طالب علمی کے زمانے میں ترکی زبان سیکھ لی تھی۔ جواب تقریباً بھول گئی ہے۔ ترکی کے نوبل انعام یافتہ ادیب اُوہان پامک کے دو ناول بینم آدم کرمزی (میرا نام لال ہے) اور کارا (برف) میں نے ترکی زبان میں سمجھ لیا۔ پامک نے استنبول کے نام سے بھی ایک ناول لکھا ہے۔ اس کے اکثر ناولوں میں ماضی اور حال کا استنبول نظر آتا ہے۔

ترکی کے موجودہ باشندے عمومی طور نسلی لحاظ سے مشرقی ترکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ زمانۂ وسطی میں ہزاروں ترکی نئی زمین کی تلاش میں نقل وطنی پر مجبور ہوئے تھے اور بازنطین رومن سے لمبی لڑائی کے بعد ترکی پر قابض ہوئے تھے۔ اس لئے ترکی اور مشرقی ترکستان کی زبان ایک ہے۔ تاہم صدیوں کے بعد لب ولہجہ میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ محمد علی نے مجھے بتایا کہ جداگانہ لب ولہجہ کی وجہ سے شروع میں ان کو زبان سمجھنے میں دقت ہوئی۔

پہلے ترکی زبان کا رسمِ خط فارسی یا اردو تھا۔ جدید ترکی کے معمار مصطفیٰ کمال پاشا نے، جو اتاترک کے نام سے مشہور ہیں، ترکی کو جمہوریہ قرار دینے کے بعد رومن رسم الخط میں بدل دیا۔

استنبول کی سیاحت میری دیرینہ تمنا تھی۔ روم میں آئی اے ایل ایس کے طفیل استنبول کا سفر آسان اور سستا پڑا۔

ترکی مشرق اور مغرب کے مابین ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ایشیائی حصے کو اناطولیہ اور یورپی حصے کو تھریس کہا جاتا ہے۔ استنبول میں اناطولیہ اور تھریس دونوں آتے ہیں۔ استنبول

مشرق اور مغرب اور یورپ اور ایشیا کا سنگم ہے۔ یہ دنیا کا واحد شہر ہے جو دو براعظموں کے درمیان واقع ہے۔شہر یورپی اور ایشیائی علاقوں اور جزیرہ پر مشتمل ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے استنبول کا محلِ وقوع اہم ہے۔ یہ ترکی، بلقان کی ریاستوں اور مشرقی وسطیٰ کا تجارتی مرکز ہے۔ اگرچہ 1923ء میں انقرہ کو ترکی کا دارالحکومت بنایا گیا، تاہم یہ آج بھی ترکی کا سیاسی اور ثقافتی مرکز ہے۔

استنبول اپنی خوبصورتی، ثقافت، دلکشی، صفائی اور تاریخی مقامات کی وجہ سے سیاحوں کے لئے بڑی جاذبیت اور کشش رکھتا ہے۔ استنبول رعنائی اور صفائی میں یورپ کے کسی بھی شہر سے کم نہیں ہے۔ آبنائے بوسفورس نے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگائے ہیں۔ یہ بحر مارمارا (Sea of Marmara) اور بحر اسود (Black Sea) کو ملاتا ہے۔ اس کی لمبائی 31 اعشاریہ 7 کلومیٹر ہے۔ اس کا ایشیائی ساحل 35 کلومیٹر اور یورپی 55 کلومیٹر لمبا ہے۔ اس کے کنارے کہیں کہیں باغات، ریستوران اور پارک ہیں۔ ساحل کے ساتھ مکانات اور محلات بنے ہیں۔ بوسفورس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی 4 کلومیٹر ہے اور کم سے کم 660 میٹر ہے۔ اس پر کئی پل بنے ہیں جو ایشیا اور یورپ کو ملاتے ہیں۔ اتاترک کے نام پر بنا معلق پل 1560 میٹر لمبا ہے۔ اس پر روزانہ دو لاکھ گاڑیاں اور چھ لاکھ لوگ پیدل چلتے ہیں۔ استنبول کی لمبی تاریخ میں آبنائے بوسفورس حملہ آوروں کے لئے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔ پہلے پہل 400 قبل مسیح ایران کے بادشاہ ڈاڑوس نے کشتیاں اور لٹھوں کے ٹھاٹھیں جوڑ کر اس پر پل بنایا تھا۔

روس، بلگیریا اور یوکرین کے لئے آبنائے بوسفورس شہہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سے ہر سال پچاس ہزار بار بردار جہاز، تیل کے ٹینکر وغیرہ گزرتے ہیں۔ برٹش چینل کی طرح آبنائے بوسفورس کے نیچے ایک ٹنل بنایا گیا ہے۔ جس میں شاپنگ کمپلیکس وغیرہ ہیں۔ 2007ء میں اس پر کام چل رہا تھا۔

بوسفورس اپنے قدرتی حسن کے لئے مشہور ہے۔ اس کے پانی کا رنگ فیروزہ کی طرح نیلا ہے۔ اس میں کئی جزیرے ہیں۔ اس کے ساتھ واقع سات کلومیٹر لمبا گولڈن ہارن یورپی علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

چمل جہ استنبول کی سب سے اونچی پہاڑی ہے۔ یہ سطح سمندر سے 267 میٹر بلند ہے۔ یہاں سے شہر کا بیشتر حصہ دکھائی دیتا ہے۔

استنبول کی آبادی دو کروڑ بیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ہر سال شہر کی آبادی میں پانچ لاکھ لوگوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ شہر کی لمبائی 150 کلومیٹر اور چوڑائی 50 کلومیٹر ہے۔ رقبہ 7500 مربع کلومیٹر ہے۔

ہر سال ایک کروڑ سے زیادہ سیاح استنبول دیکھنے آتے ہیں۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ حالیہ برسوں میں استنبول جانے والے ہندوستانی سیاحوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔

روم کی طرح استنبول دنیا کا ایک قدیم شہر ہے اور اس کی لمبی تاریخ نے بڑے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ شہر کے اہم خوبصورت مرکز نے، جہاں توپ کاپی محل ہے، کانسے کا زمانہ دیکھا ہے۔ 513 ق م میں اس پر ایرانی قابض ہوئے۔ 407 ق م میں یہ یونانیوں کے زیر قبضہ آیا۔ 196 بعد مسیح میں یہ رومی قلمرو میں شامل کیا گیا اور اس کا نام رومی شہنشاہ CONSTATINE کے نام پر CONSTANTIN POLE رکھا گیا۔ جو مشرق میں قسطنطینہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 395ء میں رومی سلطنت کا بٹوارہ ہوا اور یہ مشرقی روم کی بازنطین مملکت کا پایہ تخت بنا۔ شاہ جسٹی نیان (JUSTINIAN) کے دور حکومت (527-565ء) میں ہوسیا صوفیا سمیت بہت ساری عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ سن 666ء میں عربوں نے استنبول کو زیر نگین لانے کے لئے مہم بھیجی۔ 669ء میں امیر معاویہ نے یزید کو قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے معمور کیا۔ یزید نے شہر کا محاصرہ کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس محاصرے میں مشہور انصار حضرت ابوایوب انصاری شامل تھے۔ تب وہ 80 سال کے تھے۔ اس محاصرے کے دوران انہوں نے رحلت پائی۔ ایک روایت کے مطابق وہ شہید ہوئے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین استنبول کے مضافات میں ایک مقام پر عمل میں آئی۔ آج یہ مقام تھریسن میں استنبول کی حدود کے اندر ہے۔ ان کے مزار کو ایک آستانہ کا درجہ حاصل ہے۔ اس جگہ ان کے نام پر ایک مسجد بھی ہے۔ مولانا وحید الدین خان نے لکھا ہے:

''حضرت ابوایوب انصاری راستے میں بیمار ہو گئے۔ انہوں نے اپنے

ساتھیوں کو وصیت کی کہ اگر راستے میں ان کی موت آجائے تو تب بھی ان کو اپنے ساتھ قسطنطینہ لیا جائے اور وہیں ان کو دفن کریں۔ چنانچہ انتقال کے بعد ان کی تدفین استنبول میں کی گئی۔ یہ 52 ہجری (672ء) کا واقعہ ہے۔ صحابہ کے اس قافلہ میں دوسرے اصحاب کے علاوہ حضرت امام حسن، حضرت امام حسین اور حضرت عبداللہ بن عمر بھی تھے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب 622ء میں مکّہ سے مدینہ ہجرت کی تو مدینہ میں بہت سارے لوگوں نے حضورؐ کو ان کے گھر مہمان بننے کے لئے دعوت دی تھی۔ حضورؐ کسی کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جہاں ان کی اونٹنی بیٹھے گی، وہاں وہ قیام فرمائیں گے۔ اونٹنی حضرت ابوایوب انصاری کے مکان کے پاس بیٹھ گئی۔ نبی کریمؐ نے حضرت ابوایوب انصاری کے گھر میں چھ ماہ قیام فرمایا۔ حضرت ابوایوب کا پورا نام خالد بن کلیب بن ثعلبہ تھا۔ ان کا تعلق مدینہ کے بنی نجار قبیلے سے تھا۔

عربوں کی فوج کشی 870ء تک رہی۔ تاہم عرب استنبول کو فتح نہیں کر سکے۔ پہلی اور چوتھی صلیبی لڑائیوں کی فوجیں استنبول سے گزریں۔ چودھویں صدی کے پہلے نصف میں ترکوں نے اس کا محاصرہ کیا۔ آخر کار 1453ء میں سلطان فتح محمد دویم نے استنبول کو فتح کیا اور شہر کا نام اسلام بُول یا اسلام آباد رکھا۔ جو بگڑ کر استنبول ہو گیا ہے۔ اس طرح خطے میں سلطنت عثمانیہ (Ottoman Empire) قائم ہوئی۔ مصر پر سلطنت عثمانیہ کی عمل داری قائم ہونے کے بعد خلافت استنبول منتقل ہوئی اور یہ اسلامی دنیا کا ایک اہم مرکز بن گیا اور ترکی ارضِ مقدس کا محافظ بنا۔

سلطان محمد فتح 1481ء میں فوت ہوئے۔ عثمانی خلافت 1299ء میں قائم ہوئی اور 625 سال بعد 1924ء میں ختم ہوئی۔

استنبول کے اہم تاریخی یادگاروں میں Blue Mosque یا نیلی مسجد، توپ کاپی محل، ہاجیا صوفیا، آرکیالوجیکل میوزم، میوزم آف ٹرکیش اینڈ اسلامک آرٹس، Hosaic میوزم، DOL MABACE محل، رومانی کا پرانا قلعہ اور اس کا عجائب گھر، یانیم میوزم، مسجد سلیمانیہ، پرانے گرجا گھر اور

قلعے ہیں۔ استنبول کی سب سے قدیم یادگار ساڑھے تین ہزار سال پرانا چلیپا (OBELISK) ہے۔

ہوسیایا آیا صوفیا بازنطین دور کا سب سے بڑا اور مقدس کلیسا ہے جو پرانی دنیا کا ایک اہم ترین ثقافتی ورثہ مانا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر 537ء میں عمل میں آئی۔ آیا صوفیا کے لفظی معنی رومانی دانائی ہے۔ اس کی دیواروں پر بنی حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، سینٹ جان، ماڈونا اور دوسری شبیہیں آج بھی موجود ہیں۔ اب یہ تصویریں مدھم ہوئی ہیں۔ عثمانیہ دورِ حکومت میں اسے مسجد بنایا گیا۔ اتاترک نے اسے میوزم میں تبدیل کیا۔ سلطنت عثمانیہ کی حکومت کے دوران اردو رسم الخط میں بڑے بڑے حروف میں لکھے ہوئے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور چار خلفائے راشدین کے طغرے موجود ہیں۔ یہاں ہم نے کئی ہندوستانی سیاح دیکھے۔ آیا صوفیا کے پاس نیلی مسجد ہے۔ چھ مینار والی یہ بلند و بالا مسجد سترہویں صدی کے شروع میں سلطان احمد اوّل نے تعمیر کی تھی۔ اس میں لگی نیلی ٹائلوں کی وجہ سے اس کا نام نیلی مسجد پڑا ہے۔ یہ استنبول کی سب سے بڑی اور خوبصورت ترین مسجد ہے۔ اس مسجد میں اذان دینے کے لئے دو چبوترے ہیں جن پر موٹے حرفوں میں بلال حبشی لکھا ہے۔ دیواروں پر قرآنی آیتیں لکھی ہیں۔ آیا صوفیا اور نیلی مسجد کا فنِ تعمیر ایک جیسا ہے۔

مسجد نمازیوں سے آباد رہتی ہے۔ جب میں گیا تو بہت ساری خواتین مردوں کے عقب میں نماز ادا کر رہی تھیں۔

استنبول میں متعدد مساجد ہیں، جن کا طرزِ تعمیر عموماً یکساں ہے۔

توپ کاپی محل تقریباً چار سو سال تک سلطنت عثمانیہ کی فرماں روائی کا گہوارہ اور نظم و نسق کا مرکز رہا۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں سلطنت عثمانیہ اپنے عروج پر تھی۔ یورپ، شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ تک اس کی حدودِ مملکت پھیلی ہوئی تھیں۔ آج کل توپ کاپی محل ایک بڑے میوزیم میں تبدیل کیا گیا ہے۔ محلات فصیل کے ہالے میں ہیں، جس کی لمبائی پانچ کلومیٹر ہے۔ توپ کاپی کا پورا رقبہ 7 لاکھ مربع میٹر ہے جو واٹیکن کے رقبہ سے دوگنا ہے۔ اس کے محلات، شاہی باورچی خانہ، حرم وغیرہ مرصع تلواروں، خنجروں، بلوریں برتنوں، مزین تخت و تاج، پوشاکوں، پرانے قالینوں اور دوسرے نوادرات سے سجے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں، صرف باورچی خانوں میں بارہ ہزار عدد گوناگوں ساز و سامان رکھے

گئے ہیں جن کو دیکھنے کے لئے گھنٹوں لگتے ہیں۔ ایک تلوار پر آیت الکرسی لکھی ہوئی ہے۔ ایک گیلری زیر مرمت تھی۔ میں نے سنا، اس میں رسول اللہؐ سے منسوب چیزیں ہیں۔ جن میں آپ کا جبہ، دو تلواریں اور شاہ مقوقس کے نام آپؐ کا مکتوب وغیرہ ہیں۔ مولانا وحید الدین خان نے الرسالہ میں لکھا ہے کہ یہ تبرکات پہلے عباسی خلفاء کے پاس تھے۔ جب سلطان سلیم کو خلیفہ کا منصب عطا کیا گیا تو خلیفہ المتوکل نے سلطان کو پیش کیا۔ یہاں حضرت علی کی شمشیر اور دوسرے تبرکات بھی ہیں۔

توپ کاپی محل میں حرم ایک طرف بڑے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے الگ سے فیس لی جاتی ہے۔ حرم مریضانہ جنسی ذہنیت کا عکاس ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ ''سلطانوں کے لئے خوبصورت داشتائیں دوسرے ملکوں سے لائی جاتی تھیں اور شاہزادوں کو داشتاؤں سے تعلقات رکھنے کے گُر بتائے جاتے تھے۔''

توپ کاپی کی وجہ تسمیہ ان بڑی توپوں کی وجہ سے ہے، جو اس کے پھاٹکوں پر رکھی گئی ہیں۔

استنبول کی سیاحت پر آنے والا ہر فرد کم سے کم ایک دفعہ ضرور بوسفورس میں جہاز رانی کا لطف لیتا ہے۔ اس جہاز کو ویپر کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں مسافروں کے رہنے کی گنجائش ہے۔ جہاز ایک فیشن ایبل جگہ ایمی نونو سے نکلتا ہے اور ایشیائی علاقہ اُسکو در تک جاتا ہے۔ آبنائے میں سفر کے دوران DOLMABACE محل نظر آتا ہے۔ اتاترک نے زندگی کے آخری ایام اسی محل میں گزارے تھے اور یہاں ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس عظیم الشان محل میں 285 کمرے 43 ہال اور 6 حمام ہیں۔ محل کا پورا رقبہ پچیس ہزار مربع میٹر ہے۔ یہ 1843 اور 1856ء کے درمیان تعمیر ہوا تھا۔ اس کی زیبائش اور آرائش پر چودہ ٹن سونا اور چالیس ٹن چاندی استعمال کیا گیا ہے۔

مساجد میں نمازیوں میں، میں نے زیادہ تر نوجوانوں کو دیکھا۔ تقریباً سبھی ننگے سر ہوتے ہیں۔ چند باریش بھی نظر آئے۔ اپنے دس روزہ قیام کے دوران میں نے صرف ایک نوجوان کو Skull Cap پہنے دیکھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سے داڑھی تھی۔ مجھے وہ ہندوستانی یا پاکستانی کسی مدرسہ کا فارغ التحصیل لگا۔ بہت ساری عورتوں نے اپنے بالوں کو اسکارف میں چھپایا ہے۔ ان میں بیشتر نے عبائی طرز کا لمبا لباس پہنا ہے یا مغربی لباس زیب تن کیا ہے۔ جبکہ بہت ساری عورتیں ننگے سر ہیں اور

بالوں کو اپنے شانوں پر چھوڑا ہے۔ غرض جینز اور حجاب ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ میں نے ایک جریدے میں پڑھا کہ ایک سروے کے مطابق اسکارف پہننے والی عورتوں کی تعداد ساٹھ فیصدی سے زیادہ ہے۔ ٹرکی کے موجودہ معاشرے نے اسکارف استعمال کرنے والی اور نہ کرنے والی دونوں عورتوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔ ایک ہی گھر میں دو بہنوں میں ایک اسکارف لگاتی ہے اور دوسری نہیں لگاتی ہے۔ ان دنوں اسکارف لگانے اور نہ لگانے پر بڑی بحث چل رہی ہے۔ یونیورسٹی میں اسکارف کے استعمال پر پابندی ہے۔ اس پابندی کو ہٹانے کے لئے موجودہ حکومت آئین میں ترمیم لانے کے لئے پارلیمنٹ میں ایک بل لانا چاہتی ہے۔ صدر عبداللہ گل کی اہلیہ اور وزیراعظم رجب طیب ایرڈوگن کی اہلیہ اور دونوں بیٹیاں سکرف لگاتی ہیں۔ وزیراعظم نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ اسکارف اعلیٰ تعلیم کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنا ہے۔ ترکی کی یونیورسٹیوں میں محض اسکارف کی پابندی کی وجہ سے انہوں نے اپنی دونوں بیٹیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ بھیجی ہیں۔ دونوں لیڈر اسلام نواز اور اعتدال پسند سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی پارٹی انصاف اور ترقیات (اے کے) کے دور میں ترکی کی معیشت میں بہتری آئی ہے۔ میری جن سے باتیں ہوئیں، وہ ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا دامن بدعنوانیوں سے پاک ہے اور بدعنوانی اور رشوت ستانی ختم کرنے کے لئے انہوں نے موثر اقدام کئے ہیں۔ بعد میں ہوئے چناؤ میں پارٹی کو اچھی حمایت ملنے اور عوامی مقبولیت کی وجہ سے پہلے کی طرح فوج کو مداخلت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

میں نے استنبول میں بسوں اور ٹراموں میں بزرگوں اور عورتوں کو سیٹیں پیش کرتے ہوئے دیکھا۔ یورپ کے شہروں کی طرح گاڑیوں کے ہارن کی آواز بھی نہیں سنی۔ ٹریفک میں رہگیر اطمینان سے سڑک پار کرسکتے ہیں۔ جب میں تیز چلتا یا دوڑتا ہوا سڑک پار کرتا، تو محمد علی کہتے تھے، ''اطمینان سے سڑک پار کریں، آپ کیوں دوڑتے ہیں؟''۔ ''آپ تیز نہ چلنے کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے شہروں میں دوڑنا پڑتا ہے''، میں جواب دیتا۔ ''جب کسی کے ہاتھ میں سٹیئرنگ ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو سڑک کا بادشاہ سمجھتا ہے۔''

اس دوران میں نے Today Zaman کے علاوہ استنبول میں چھپنے والے دو اور انگریزی اخبار Istanbul Times اور Turkish Daily News دیکھے۔

ایک روز میں اور محمد علی شام کے وقت شہر کے فیشن ایبل بازار امی نونُو سے گزر رہے تھے۔ میونسپلٹی کی ایک گاڑی سے روزہ توڑنے کے لئے کھانے کے پیکٹ بانٹے جا رہے تھے۔ آن کی آن میں لمبی قطار لگ گئی۔ مرد عورتیں اور بچے سبھی تھے۔ ہم بھی قطار میں کھڑے ہوئے۔ پیکٹ میں ایک کھجور، تین زیتون، بریڈ، مربہ، پنیر کا ایک ٹکڑا، پانی کی شیشی اور جوس تھا۔ ان کے استعمال کے لئے پلاسٹک کی چمچیاں تھیں۔ آبنائے بوسفورس کے کنارے ایک کھلے ریستوران میں بیٹھنے کے لئے چھوٹے چھوٹے سٹول اور میزیں رکھی تھیں۔ سامنے چند لوگ تفریحی طور کانٹے سے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ افطار کا وقت تھا اور روزہ دار افطار کے منتظر تھے۔ ہمیں دو خالی سٹول مل گئے۔ ہمارے آمنے سامنے دو لڑکیاں افطار کا انتظار کر رہی تھیں۔ محمد علی نے ان سے باتیں کیں تو معلوم ہوا کہ وہ دو بہنیں ہیں۔ ایک استنبول میں کسی سکول میں استانی تھی اور دوسری انقرہ میں ملازمہ تھی اور اپنی بہن سے ملنے استنبول آئی تھی۔ ان کا ڈیرہ وہاں سے دو گھنٹے کا سفر تھا۔ اس لئے انہوں نے یہیں روزہ کھولنے کا ارادہ کیا تھا۔ انہوں نے برگر اور پیپسی سے اپنا روزہ کھولا۔ ہم نے اپنے مختصر افطار میں ایک لڑکے اور بزرگ کو شامل کیا۔ ترکی میں پوشاک کی طرح کھان پان میں بھی یورپ کا اثر ہے۔ ترکی میں اپنی روایتی خوراک ہیں، تاہم ناشتہ میں مربہ، مکھن، شہد اور بریڈ استعمال کئے جاتے ہیں۔

دوسرے روز ہم مسجد سلیمانیہ دیکھنے گئے۔ نیلی مسجد کی طرح یہاں بھی بہت لوگ اور سیاح آتے ہیں۔ مرد اور خواتین دونوں نماز ادا کرتے ہیں۔ مسجد کے باہر ایک بڑا ریستوران تھا۔ جہاں بلدیہ کی طرف سے روزہ داروں کے لئے افطار کا اہتمام کیا گیا تھا اور متعدد میزوں پر روزہ کھولنے کے لئے کھجوریں وغیرہ سجا رکھی تھیں۔

اس کے بعد محمد علی مجھے حضرت ابوایوب انصاری کے مقبرے پر لے گئے۔ سینکڑوں ہزاروں مرد عورتیں مقبرے کے پاس جمع تھے۔ افطار کا وقت تھا۔ چھوٹے چھوٹے خاندان ٹولیوں میں دسترخوان بچھائے افطار کے منتظر تھے۔ سامنے کے ریستوران کی نشستیں بک تھیں۔ ہمیں بیٹھنے کے لئے جگہ نہیں

ملی۔ پھر پاس کہیں سے گولہ داغا گیا۔ یہ افطار کا اعلان تھا۔ اس کے ساتھ ہی پاس کی ایوب انصاری مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ افطار کے بعد مزار کا دروازہ کھولا گیا اور بہت سارے مرد اور عورتیں مزار کی زیارت کے لئے قطار میں کھڑے ہوگئے۔ ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہوئے۔ مزار پر ترکی زبان میں لکھا تھا کہ دعا صرف اللہ سے مانگی جاتی ہے۔ فاتحہ خوانی پر اکتفا کریں۔ اس لئے سبھی فاتحہ پڑھتے تھے۔ البتہ مزار کے احاطہ سے نکلتے ہوئے اکثر لوگ اپنی پیٹھ مزار کی طرف نہیں کرتے تھے۔

سلطان محمد فتح کے وقت سے یہ رائج تھا کہ جب کوئی سلطان تخت نشین ہوتا تو حضرت ابوایوبؓ کے مقبرے پر اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی جاتی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے احترام کا جواز بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ کو حضور اکرمؐ سے گہری عقیدت تھی اور بدر، احد، خندق، خیبر، حنین اور مکہ کے غزوات میں حصہ لیا تھا۔ ان لڑائیوں میں وہ ہمیشہ حضورؐ کی حفاظت کے لئے ساتھ رہتے تھے۔ حضرت علیؓ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حضرت علیؓ جب خلیفہ تھے، اپنے عراق کے دورے کے دوران انہیں اپنا جانشین بنایا تھا۔

مزار کے پاس سلطان محمد فاتح کا لگایا ہوا 500 سال پرانا درخت ہے۔

میں نے سنا ترکی میں کئی اور صحابہ کی قبریں ہیں۔ لیکن ان کے اسمائے گرامی نہیں ملے۔

میں نے استنبول میں اپنے مختصر قیام کے دوران شہر کے مختلف مقامات پر کتابوں کی چار نمائشیں دیکھیں۔ ترکی زبان میں ادب، مذہب، سائنس اور ہنر غرض ہر موضوع پر کتابیں ہیں۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کی نصابی کتابیں ترکی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ انگریزی کی طرح جرمنی کی تدریس کی طرف خاص توجہ دی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ لاکھوں ترک باشندے جرمنی میں آباد ہیں یا کام کررہے ہیں۔ اپنے ایک میزبان نثار احمد ڈول کے مکان پر میں نے ابن کثیر کی تفاسیر کی سترہ جلدیں اور دوسری مذہبی کتابیں دیکھیں۔ ان کے بھائی نذیر احمد ڈول کے ہاں احادیث کی پندرہ جلدیں نظر آئیں۔ ان کو کسی ترکی عالم نے مرتب کیا ہے۔ اتاترک پارک کی لائبریری میں، میں نے کتابوں کا جائزہ لیا، جو نمائش اور فروخت کے لئے باہر رکھی تھیں۔ کتابیں مختلف موضوعات پر تھیں اور ساری ترکی زبان میں تھیں۔ ترکی زبان میں عربی اور فارسی کے متعدد الفاظ ہیں۔ اس لئے کچھ

ٹائٹل سمجھ آجاتے ہیں۔ دینی کتابیں بہت ہیں۔ ان میں قرآن مجید اور ترجمہ، تفاسیر، احادیث، فتویٰ اور سیرت پاک جیسے موضوعات شامل تھے۔ ترکی کے مشہور شاعر ناظم حکمت کی کتابیں نظر آئیں لیکن نوبل انعام پانے والے ترکی کے واحد ادیب اُوہان پامک کی کوئی کتاب نظر نہیں آئی۔ غیر ملکی ادیبوں میں علامہ اقبال، ٹالسٹائی، کافکا اور بالزاک کی کتابوں کے ترجمے دیکھے۔ عرب یا برصغیر ہند کے کسی مذہبی عالم کی تصنیفات کا کوئی ترجمہ نظر نہیں آیا۔ مجلد اور غیر مجلد دونوں طرح کی کتابیں ہیں۔ تاہم صوری لحاظ سے ساری کتابیں معیاری ہیں۔ ایک کتاب کے ٹائٹل پر خاص طور پر میری توجہ مبذول ہوئی۔ اس پر ATATURK-UNKUKURAN's KULTURU لکھا تھا۔ میں نے محمد علی سے اس کا مطلب دریافت کیا۔ محمد علی نے 'قرآن۔ اتاترک کی نظر میں' بتایا۔ اتاترک کو عام طور پر مذہب مخالف سمجھا جاتا ہے۔ ان کے کئی اقدام سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ تاہم جن ترکوں سے میرا تبادلۂ خیال ہوا، وہ اس کو غلط بتاتے ہیں۔ محمد یوسف ڈول اچھی علمیت رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب مخالف سرگرمیوں کے لئے اتاترک کے ایک ساتھی اور جانشین عصمت انونو ذمہ دار ہے۔ اتاترک نے قدامت پرستی کے خلاف جہاد کیا۔ ترکی کی سلامتی برقرار رکھی اور اسے ترقی کی راہ پر لگایا۔

عام ترکوں کو اتاترک سے گہری عقیدت ہے۔ نذیر احمد ڈول نے کہا کہ ترکی میں اتاترک مخالف باتوں سے لوگ برافروختہ ہوتے ہیں۔

مجھے لگا کہ ترکی حکومت لوگوں میں ذوق مطالعہ پیدا کرنے کے لئے بڑی کوشاں ہے۔ اتاترک پارک کی لائبریری کی دیواروں پر موٹے حروف میں 'اوکومک' لکھا تھا۔ جس کا مطلب 'پڑھو' ہے اور مطالعہ کے فوائد کو بتایا گیا تھا۔

میں نے کہیں پڑھا کہ ترکی میں چھوٹے جرائم کے لئے مطالعہ کتب کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کا تجربہ کئی سال سے ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے ترکی میں یورپ کے لوگوں کی طرح کتابیں پڑھنے والے نظر نہیں آئے۔ یورپ میں ٹرینوں، بس اڈوں، ریستورانوں، ائرپورٹ کے لاؤنج وغیرہ میں کتب بین ہاتھ میں کتابیں لئے یا پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میں نے ترکی کے کئی گاؤں دیکھے۔ میں نے محمد علی اور نذیر احمد سے اپنی اس خواہش کا اظہار

کیا تھا کہ میں دیہی زندگی اور معاشرت دیکھنا چاہتا ہوں۔ نثار احمد ڈول نے مجھے اپنے گاؤں کے مکان دکھانے لیا جو ابھی مکمل ہوا تھا۔ یہ استنبول سے 63 کلومیٹر دور سمندر کے پاس ایک پُرفضا مقام پر ہے۔ استنبول میں اپنے سٹور روم کی طرح مکان کی ڈیوڑھی کے ماتھے پر' مالک اللہ اینی دیر' (زمین اللہ کی ہے) تحریر تھا۔ نثار احمد نے بتایا کہ گرمیوں میں استنبول میں سخت گرمی پڑتی ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ مکان عارضی رہائش کے لئے بنایا ہے۔

استنبول سے نثار احمد کے دیہی مکان تک ہم جن گاؤں سے گزرے، سارے مکانات پختہ اور ماحول صاف ستھرا تھا۔ بادی النظر میں لوگ خوش حال نظر آتے تھے۔ نثار احمد نے کہا کہ یہاں گاؤں اور شہر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نثار احمد سے معلوم ہوا کہ ترکی میں دیہی علاقوں میں فوج تعینات ہے۔ پولیس کہیں نہیں ہے۔ امن و امان فوج قائم رکھتی ہے۔ ترکی میں فوجی تربیت لازمی ہے۔ ٹریننگ ڈیڑھ سال دی جاتی ہے۔ یونیورسٹی سے ڈگری لئے افراد کو چار ماہ ٹریننگ دینی پڑتی ہے۔ کشمیر اور لداخ سے گئے تمام مہاجرین نے ٹریننگ لی تھی۔ ایک مہاجر عبدالرزاق نے کہا کہ ترکی کی سلامتی کو روس، یونان اور بلگیریا سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہا ہے۔

ترکی کے میرے ذوقِ سفر میں اس کی تاریخ کو دخل تھا۔ صرف سیاحت اور تاریخی مقامات دیکھنا نہیں تھا۔ ترکی جہاں سترھویں صدی میں ترقی اور طاقت کے عروج پر تھا، وہاں اٹھارویں صدی میں سلطنت عثمانیہ روبہ تنزل تھی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ Renaissance کی ہوا ترکی نہیں پہنچی یا اس کا اثر نہیں لیا۔ جس کی وجہ سے ترکی سائنس اور تکنالوجی میں یورپ سے بہت پیچھے رہ گیا اور یورپ کے مرد بیمار The sickman of Europe کہا جانے لگا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد بہت سارے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ان میں جزیرہ نما عرب شامل تھا۔ سلطنت عثمانیہ کی عظیم الشان عمارت منہدم ہوئی۔ 1917ء میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری ہونے لگی۔ 1187ء کی صلیبی جنگ کے بعد 1917ء میں ایک برطانوی جرنیل (ایک مورخ نے جرنیل کو فرانسیسی بتایا ہے) سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرے پر پہنچا اور دل کی بھڑاس نکالتا ہوا بولا:

"Saladin! Look, we have come."

اس مخدوش صورتِ حال میں ترکی کو مصطفیٰ کمال پاشا کی ذات میں ایک مردآہن ملا۔ اوران کی قیادت میں بے پناہ قربانیاں دے کر ترکی کے لوگوں نے اپنی سالمیت اور حاکمیت برقرار رکھی۔ میں نے مصطفیٰ کمال کی مختصر سوانح حیات پڑھی تھی اور جزیرہ نما گیلی پولی دیکھنے کی خواہش تھی، جہاں اتاترک نے اتحادی فوج کو کراری شکست دی تھی۔

ترکی کے اس بحرانی دور میں ہندوستان کی تحریک آزادی نے ایک نیا رُخ اختیار کیا۔ خلافت کے خاتمے سے ہندوستان کے مسلمان بڑے آزردہ اور آگ بگولا ہوئے اور تحریک خلافت اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ ستمبر 1920ء میں مہاتما گاندھی نے کانگریس کے اجلاس میں ترک موالات کی قرارداد پاس کی جو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تائید کے بعد اکثریتی رائے سے منظور ہوگئی۔ ہندوستان کا بڑا علاقہ اس تحریک کی لپیٹ میں آ گیا۔ جگہ جگہ خلافت کمیٹیاں قائم ہوئیں اور خلافت کی بحالی کے لئے زبردست مہم چلائی گئی۔ ترکی طبی مشن، مالی امداد اور ادویات بھیجی گئیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اسے پہلے اتفاق کا اتنا روح پرور منظر کبھی نہیں دیکھا گیا اور نہ اس کے بعد دیکھا گیا۔ مولانا محمود الحسن نے جو تحریک آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں مالٹا کی جیل سے رہا ہو کر آئے تھے، ایک بیان میں تحریک خلافت میں ہندو بھائیوں کی شمولیت کو ایک بڑا احسان قرار دیا۔ جنگ آزادی کے بہت سارے لیڈر جیل چلے گئے۔ خان عبدالغفار خان کو خلافت تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں تین سال قید ہوئی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے اپنی والدہ بی آماں کے ساتھ مل کر سارے ملک کا دورہ کیا۔ وسط ستمبر 1921ء میں دونوں لیڈروں کو کئی دوسرے لیڈروں سمیت گرفتار کیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ 4 نومبر 1921ء کو مولانا شوکت علی، سوامی شنکر اچاریہ، مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو دو دو سال کی قید با مشقت کی سزا سنائی۔ اس زمانے میں کسی نے صدائے خاتون کے نام سے ایک نظم لکھی، جو بڑی مقبول ہوئی۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پر دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پر دے دو

سید آصف علی نے خلافت کے خاتمے کے خلاف اپنی بیرسٹری کی ڈگری واپس کی اور دلی میں آصف والنٹیر کور کے پہلے جتھے کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔

بہار میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، مولانا مظہر الحق اور شاہ محمد زبیر پر مشتمل خلافت کمیٹی بنی۔

اُن دنوں مولانا حسرت موہانی کا اخبار اردوئے معلیٰ، مولانا محمد علی کا ہمدرد، مولانا ابوالکلام آزاد کا الہلال اور مولانا ظفر علی خان کا زمیندار عوام میں بیداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے اور تحریک میں شدت لانے کے لئے پیش پیش تھے۔

ایسے ہی محرکات تھے کہ میں 20 ستمبر کو گیلی پولی گیا۔ نذیر احمد اور محمد علی نے ساتھ دیا۔ نذیر احمد نے گاڑی چلائی۔ جزیرہ نما گیلی پولی کا رقبہ 490 مربع کلومیٹر ہے۔ اس میں کئی چھوٹے گاؤں ہیں، جن کی مجموعی آبادی دس ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ اتحادی فوج سمندر کے راستے کئی اطراف سے گیلی پولی میں گھس آئی تھی۔ اتحادی جزیرہ نما گیلی پولی کو قبضہ کرنے کے بعد استنبول کی طرف پیش قدمی کرنا چاہتے تھے۔ جہاں روس کے ساتھ رابطہ کر کے جرمنی کے خلاف ایک اور محاذ کھولنا چاہتے تھے۔ لیکن اتاترک کی قیادت میں ترک فوجیوں نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ جزیرے میں مختلف مقامات پر گھمسان کی لڑائیاں ہوئیں اور سارا جزیرہ انسانی خون سے لالہ زار ہو گیا۔ آج گیلی پولی اس جنگ کی زندہ علامت بنا ہے۔ جزیرے کو ایک بڑے پارک میں بدل دیا گیا ہے۔ اس کا رقبہ 33000 ہیکٹر ہے۔ اس قومی پارک میں 78 یادگاریں ہیں جن میں ترکوں کی 46 اور اتحادیوں کی 32 یادگاریں ہیں۔ ان یادگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں جہاں لڑائیاں ہوئی ہیں، وہیں مرنے والوں کی یاد میں یادگاریں تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ لڑائیاں بلندیوں، اترائیوں، وادیوں، سمندر اور سمندر کے ساحل پر ہوئی ہیں۔ غرض جزیرے کے ہر حصے میں اتحادی اور ترکی کی فوجیں دست و گریباں ہوئی ہیں اور فریقین کی فوجوں کا بھاری جانی نقصان ہوا ہے۔ لڑائیوں کے دوران عارضی جنگ بندیاں ہوئیں اور مرنے والوں کی تدفین عمل میں آئی۔ تحریری کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر یادگاریں جنگ کے بعد مختلف ادوار میں تعمیر کی گئیں اور ان کا سلسلہ 1980ء کی دہائی تک جاری رہا۔ تمام یادگاروں کا سڑک سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ اتحادی فوجیوں میں برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور برطانوی ہند

کے فوجی شامل تھے۔ ترکی کی حکومت نے اتحادی فوجوں کی حکومتوں کو یادگاریں تعمیر کرنے کے لئے فراخ دلی سے سہولیات فراہم کی ہیں۔ ایک کتبے سے معلوم ہوا کہ آسٹریلیا کا ایک وزیر اعظم بھی وہاں جنگ میں کام آیا۔ وہ اپنے فوجیوں کو شردھانجلی دینے آیا تھا۔ ان ملکوں کے لوگ ہر سال اپنے عزیزوں کی قبروں اور یادگاروں کو دیکھنے اور عقیدت کے پھول چڑھانے کے لئے آتے ہیں۔ اس روز بھی بہت سارے یورپی آئے تھے۔ ان میں سیاح بھی ہو سکتے ہیں۔ نیوزی لینڈ کی ایک یادگار پر تازہ پھول مالا چڑھائی گئی تھی۔ ہم نے ترکی کے مرد اور خواتین بھی دیکھے۔ غالباً مرنے والوں میں ان کے اعزا و اقارب ہوں گے۔ بہت سی قبروں پر نام لکھے تھے اور بہت سارے گمنام تھے۔

شروع میں ترکی پہلی جنگ عظیم میں غیر جانبدار رہا۔ 12 اگست 1914ء میں ترکی جنگ میں کود پڑا۔ اتحادیوں نے شروع میں بحریہ کو بروئے کار لایا۔ بعد میں ہزاروں کی تعداد میں بری فوج استعمال کی۔ یہ جنگ ایک سال اور دو مہینے سے زیادہ چلی۔

جزیرہ گیلی پولی استنبول سے 365 کلو میٹر دور ہے۔ سڑک پختہ اور سیدھی ہے۔ اس لئے سفر آسان ہے۔

گیلی پولی فوجی حکمت عملی کے نقط نظر سے زمانہ قدیم سے بہت اہم رہا ہے۔ خاص کر اس کے ایک مقام ایکبت کو جنگی اہمیت کے پیش نظر مختلف حملہ آوروں نے اپنے قبضے میں لیا ہے۔ ایکبت کا پرانا نام مے ڈوس تھا۔ یہاں آبنائے DARDANELLES کا پاٹ چوڑائی میں کم ہے۔ اس لئے بحریہ کو نقل و حمل میں آسانی رہتی تھی۔ ہیروڈٹس کے مطابق ایکبت کے پاس چار سو سال قبل مسیح یونانیوں اور Spartans کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور یونانیوں نے سپارٹنز کے بحری بیڑے کو نقصان پہنچا کر پسپا کیا تھا۔ 334 ق م سکندر اعظم اس جزیرہ سے اناطولیہ پہنچا تھا اور ایرانیوں کو شکست دی تھی۔ 191 ق م روس اس پر قابض ہوا۔ جب رومنی مملکت دو حصوں میں بٹ گئی تو یہ بازنطین کے زیر قبضہ آیا۔ بعد میں اس پر GOTHS قابض ہوئے۔ 441 بعد مسیح ہُن اور 559 میں اُگیُور ترکوں اور 681ء اور 717ء میں عربوں نے اس پر حملے کئے۔ تیرہویں صدی میں لاطینیوں نے جزیرہ گیلی پولی فتح کیا۔ جب لاطینی حکومت کو زوال آیا تو بازنطین نے دوبارہ اس پر اپنی عمل داری قائم

کی۔ 356ء میں ترک امیر ایکا بے نے ایکبت کو اپنی تحویل میں لایا۔ اس کے بعد بھی یہاں لڑائیاں ہوئیں اور ترک سرداروں نے اس پر فوج کشی کی۔ ایکبت کے قریب واقع شہر چنا کلے نے بھی پہلی جنگ عظیم میں خونریز لڑائیاں دیکھی تھیں۔

ایکبت کے پاس متعدد قلعے ہیں جو اس بات کے غماز ہیں کہ گیلی پولی کا بچاؤ ترکی کی حفاظت کا ضامن ہے۔

شروع میں اتحادیوں کے تین جنگی جہاز ترکی کی بچھائی گئی بحری سرنگوں سے ڈوب گئے اور کئی جہازوں کو نقصان پہنچا۔ کیلی ٹل بوہیر نام کے گاؤں کے پاس حوالدار سعید نے پورے جوش میں 276 کلوگرام وزن کا ایک گولہ اکیلے اٹھا کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ توپ میں ڈالا تھا۔ یہ گولہ Ocean نام کے اتحادی جہاز کے راڈر کو لگا۔ پھر یہ جہاز ایک سرنگ کی زد میں آیا اور غرقاب ہوا۔ حوالدار سعید کا مجسمہ کیلی ٹل بوہیر گاؤں کے پاس نصب کیا گیا ہے۔ ہم نے دیکھا ایک ترک مجسمہ کے پاس کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا۔

ترکی زبان میں کیلی ٹل بوہیر کا مطلب 'سمندر کی کنجی' ہے۔ یہاں سمندر کا پاٹ سب جگہوں سے تنگ ہے۔ اس لئے یہ نام پڑا ہے۔ ہومر کی داستان میں اس گاؤں کا تذکرہ ہے۔ یہ گاؤں جنگی زاویۂ نگاہ سے اہم ہے۔ یہاں دو بڑے قلعے ہیں۔ ایک قلعہ سلطان فاتح محمد نے 1462 میں تعمیر کیا تھا۔ قلعہ فصیل کے حصار میں ہے۔ اس کی دیوار کی موٹائی دو میٹر اور اونچائی 4 میٹر ہے۔

دوسرا قلعہ 1542ء میں سلطان سلیمان کے عہدِ حکومت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس دیوار کی موٹائی چھ اعشاریہ سات میٹر ہے۔ یہاں آٹھ مقامات پر توپیں نصب کی گئی تھیں۔ آج کل دونوں قلعے خالی ہیں۔ میں نے سنا پہلی جنگ عظیم کے دوران ان قلعوں میں فوج رکھی گئی تھی۔

اتحادیوں نے سب سے پہلے 3 نومبر 1914ء کو سیڈول بھیر گاؤں پر بمباری کی۔ ایک گولہ بارود کے ایک ڈیپو سے جا لگا جس سے پانچ ترک افسر اور 81 دوسرے لوگ مارے گئے۔ اس جگہ سب سے پہلے انگریز اور فرانسیسی فوج ساحل پر اتری تھی۔ یہاں ان کی یادگاریں اور دو قبرستان ہیں۔ جن پر مرنے والوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ اس لڑائی میں کل 4382 فرانسیسی فوجی کام آئے تھے۔

سیڈول بھیر ایکے بٹ سے 33 کلومیٹر دور جزیرہ کے مغربی سرے پر واقع ہے۔ گاؤں میں بلگیریا اور رومانیہ سے آئے ترکی نسل کے پناہ گزین بسے ہیں۔ گاؤں کے اصل باشندے جنگ کے دوران فرار ہوئے تھے۔ یہاں لڑائی میں کام آنے والے ترک فوج کی 40 میٹر ایک اونچی یادگار ہے۔ جس کے اوپر اتاترک کا ایک سنگی مجسمہ ہے۔ ترک فوجیوں کی بے نام 600 قبریں ہیں۔ مرنے والوں میں ایک پندرہ سالہ سپاہی بھی تھا۔ ان کی تعمیرات کا کام 1951ء میں شروع ہوا تھا اور 1960ء میں مکمل ہوا۔ یہ بڑا پُر فضا مقام ہے۔ سمندر نشیب میں بالکل سامنے نظر آتا ہے۔

ترکوں کی مزاحمت دیکھ کر لارڈ کچنر اور جرنیل سر برڈووڈ صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے محاذ پر پہنچے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پیش قدمی کے لئے بحریہ کی مدد کے لئے ایک مضبوط بری فوج کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہزاروں اتحادی فوجی میدان کارزار میں پہنچے۔ 25 اپریل 1915ء کو آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوج ساحل پر اتری اور بلندی کی طرف بڑھی۔ اس کی منزل جزیرہ کا ایک بلند ترین مقام کونک بائین تھا۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ گزرنے والی سڑک سے یہ چوٹی اور اس پر بنی یادگار نظر آتی ہے۔ انیسویں ڈویژن کے کمانڈر مصطفیٰ کمال نے گولیوں کی آواز سنی۔ وہ بیگالی گاؤں میں اپنے ہیڈ کوارٹر پر تھے۔ تب ان کے پاس 57 رجمنٹ کی چند کمپنیاں تھیں، جو دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی تھیں۔ مصطفیٰ کمال محاذ جنگ کی طرف بڑھے۔ یہاں مصطفیٰ کمال نے جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے اپنا مشہور زمانہ حکم دیا۔

"میں آپ کو حملہ کا حکم نہیں دیتا ہوں۔ میں مرنے کا حکم دیتا ہوں۔ ہمارے مرنے سے پہلے اس دوران دوسرے فوجی اور کمانڈر ہماری جگہ لے سکتے ہیں۔"

مصطفیٰ کمال کا یہ حکم نامہ ایک جگہ پتھر پر نقش ہے۔

57 رجمنٹ کے سارے جوان مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ دشمن بھاری جانی نقصان کے ساتھ پسپا ہوئے۔ چشم دید بیانات کے مطابق پسپا ہوتے ہوئے فوجیوں کے خون سے سمندر کا پانی 50 میٹر تک سرخ ہو گیا۔

57 رجمنٹ کے اعزاز میں ترکی کی فوج میں اس نام سے اور کوئی رجمنٹ قائم نہیں کیا گیا

ہے۔ رجمنٹ کے نام پر ایک بڑی یادگار بنی ہے۔ رجمنٹ کے کمانڈر حسین عاونی کی قبر بھی اسی یادگار کے پاس ہے۔ وہ 13 اگست کو مارا گیا تھا۔

میگالی گاؤں میں اس جگہ ایک جنگی میوزیم ہے۔ جہاں مصطفٰے کمال کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ میوزیم میں اس دور کی تصویریں ہیں، تباہ شدہ جنگی ہتھیار اور دوسرے جنگی سامان رکھے ہوئے ہیں۔ ترکی کے ایک سپاہی کی کھوپڑی بھی رکھی گئی ہے، جس پر جنگ میں لگی گولی نہیں نکالی جاسکی تھی۔ میوزیم کے پاس نوادرات کی دکانیں ہیں۔ یہاں بھی سیاح آتے ہیں۔

اس لڑائی کے بعد برطانوی فوجی بحری بیڑے کی گولہ باری کی آڑ میں جزیرہ کے مغربی سرے کے گاؤں سیڈول بھیر میں پانچ مقامات پر اترے۔ ایک جگہ توجہ ہٹانے کے لئے فرانسیسی فوج ساحل پر اترے۔ ایک رپورٹ کے مطابق سرجنٹ یحییٰ نے 63 سپاہیوں کی مدد سے تین بٹالینوں کو دس گھنٹے روکے رکھا۔ یحییٰ اور اس کے اکثر ساتھی مارے گئے۔ ان کی الگ سے ایک یادگار بنی ہے۔

سب سے خونریز لڑائیاں کریتھیا گاؤں (کریتھیا گاؤں کا دوسرا نام السی ٹے پے ہے) کے پاس ہوئیں، جہاں تین ہزار ترک فوجی ہلاک ہوئے اور چار سو قیدی بنائے گئے۔ تاہم انتہائی جارحانہ حملوں کے باوجود اتحادفوجی 350 میٹر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ جنگ کے دوران ہزاروں ترک رضا کار جزیرہ نما گیلی پولی پہنچے۔ ان میں زیادہ تر متمول باشعور طبقہ (Elite) اور یونیورسٹی کے طلباء تھے۔

19 مئی کو 42 ہزار ترکوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے مورچوں پر ہلہ بول دیا۔ فریقین کے ہزاروں جنگجو مارے گئے۔ دس ہزار ترک یا تو مارے گئے یا زخمی ہوئے اور دشمن کو پوری طرح کھدیڑے بغیر اپنے مورچے پر واپس لوٹے۔ فریقین نے مردوں کو دفنانے کے لئے سات گھنٹے کی جنگ بندی کی۔

گیلی پولی کے تمام محاذوں پر یونیورسٹی کے رضا کار طلبا نبرد آزما تھے۔ اس روز ان کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ حتیٰ کہ استنبول کے میڈیکل کالج میں اس سال کوئی گریجویٹ نہیں رہا۔ ہر سال 19 مئی کو استنبول کا میڈیکل کالج ان مرحوم طلباء کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

28 جون 1915ء کو کریتھیا گاؤں کا فوجی ہسپتال اتحادی جنگی جہازوں کی گولہ باری کی زد میں آیا۔ بہت سارے ڈاکٹر، طبی عملہ اور زخمی فوجی مارے گئے۔ ان میں اتحادی فوج بھی تھے۔ یہاں میں نے ایک فوجی مجسمہ دیکھا جو اپنے ایک بازو میں ایک زخمی سپاہی کو اٹھایا ہوا ہے اور دوسرے سے دشمن کو گولہ باری بند کرنے کا اشارہ کر رہا ہے۔

کریتھیا میں طرفین کی فوجوں کی کئی یادگاریں ہیں اور ان گنت گمنام سپاہیوں کی قبریں ہیں۔

اس گاؤں کے باشندے جنگ کے دوران جزیرہ کے ایک محفوظ مقام پر پناہ لینے گئے۔

1934 اور 1938 کے درمیان بلگیریا اور رومانیہ سے آئے ہوئے پناہ گزین یہاں آباد ہوئے۔

اتحادی فوجوں نے مختلف محاذوں پر ناکامی کے بعد ایک اور مقام اناقرتالک پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور 6 اور 7 اگست کی رات بھاری فوجی جمعیت میں ساحل سمندر پر اترے اور کونک بائین کی طرف بڑھنے لگے۔ ایک اور دفعہ ان کی منزل مقصود کونک بائین تھی۔ مصطفےٰ کمال نے اپنے کمانڈروں کو جمع کیا اور کہا کہ انہیں یقین ہے کہ ان کے جوان غنیم کو پسپا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ 8 اگست کی صبح منہ اندھیرے حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اتحادی انگریز فوجی رات کونک بائین پر جزوی طور قابض ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ ناگہانی حملہ ان کے لئے غیر متوقع تھا۔ اتحادی گولے آگ برسانے لگے اور گھمسان کی لڑائی ہوئی۔

مصطفےٰ کمال دوربین لئے اپنے فوجیوں کی پیش قدمی کا جائزہ لے رہے تھے کہ اچانک گولے کا ایک ٹکڑا ان کی چھاتی سے لگا اور وہ ڈگمگا گئے۔ ان کی جیب گھڑی چکنا چور ہوئی۔ تاہم گولہ جان لیوا ثابت نہیں ہوا۔ صرف چھاتی پر گہرا سرخ نشان پڑا۔ مصطفےٰ کمال نے اپنے پاس کھڑے ایک کمانڈر سے کہا کہ جوانوں کو اس واقعہ کی خبر نہیں ملنی چاہیئے۔ اسے ان کی پیش قدمی پر منفی اثر پڑے گا۔ اتاترک کی یہ ٹوٹی پھوٹی گھڑی جرمنی کے ایک عجائب گھر میں رکھی گئی ہے۔ اسی محاذ پر ایک روز مصطفےٰ کمال اپنی گاڑی میں اپنے جوانوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ایک اتحادی ہوائی جہاز نے اوپر سے بمباری کی۔ گاڑی کا ڈرائیور مارا گیا۔ تاہم مصطفےٰ کمال بال بال بچے۔

محاذ جنگ کی اسی جگہ اتاترک کا ایک دیو قامت مجسمہ بنایا گیا ہے، جس کے ہاتھ میں دوربین ہے۔

ہم نے دیکھا فریقین کے مورچے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ کونک بائین تک سڑک جاتی ہے۔ اس کی بلندی سے جزیرے کے اہم مقامات چناکلے، بحر Aegean اور انافرتالا کا میدان نمایاں نظر آتا ہے۔ گیلی پولی کی لڑائیوں میں بائیس ہزار سے زائد انگریز فوجی مارے گئے تھے۔

انافرتالا کی شکست سے اتحادیوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔ ادھر سردی بڑھ رہی تھی۔ 7 نومبر کو برطانیہ کی جنگی کابینہ نے گیلی پولی سے پسپا ہونے کا فیصلہ کیا اور بڑی رازداری سے انخلاء پر عمل ہونے لگا۔ 19 اور 20 دسمبر کی رات اری برنو، کونک بیری اور انافرتالا سے سینکڑوں اتحادی فوجیوں کا آخری دستہ پیچھے ہٹ گیا۔

8 اور 9 جنوری کی رات بچی کھچی فوج بھی میدان چھوڑ کر چلی گئی۔ مصطفےٰ کمال کی جنگی صلاحیت منظر عام پر آئی اور ترکی فوج کا وقار بڑھ گیا جو آگے جاکر ترکی کی بقاء کے لئے فال نیک ثابت ہوا۔

ہر سال 10 اگست کو جزیرہ نما گیلی پولی کے گاؤں کاباٹیپے میں اس کامیابی کی یاد میں یوم فتح منایا جاتا ہے۔

آج بھی جزیرہ نما میں چرواہوں اور کسانوں کو گولے، کارتوسوں کے خول اور جنگی ساز و سامان ہاتھ آتے ہیں اور بارش پڑنے پر کئی دفعہ مردوں کی باقیات اور پنجر نکل آتے ہیں۔

واپسی سے پہلے ہم نے کئی اور یادگاریں دیکھیں۔ سمندر کے کنارے ایک یادگار تھی، جس پر لکھا تھا: ''یہاں فوج کی ایک ٹکڑی نے اتحادیوں کے 1500 فوجیوں کو روکے رکھا اور پسپا کیا''۔ اس جگہ ہمارا آمنا سامنا جاپانی سیاحوں کے ایک گروپ سے ہوا۔

ایک جگہ جنگ میں کام آنے والے سینکڑوں ترک سپاہیوں کے نام معہ والدیت اور سکونت دیئے تھے۔ برطانوی ہند کے ہندوستانی سپاہیوں کی یاد میں قائم کردہ ایک یادگار بھی دیکھی۔

ایک جگہ ایک اتحادی جرنیل کے تاثرات سنگ مرمر کے سِل پر منقش تھے۔ انہوں نے ترکی کی فوج کی بہادری اور دوران جنگ بندی نظم وضبط کی تعریف کی تھی۔

ایک کتبے کے مطابق اس جنگ میں ترکی کے 58 ہزار اور اتحادیوں کے 45 ہزار فوجی کام آئے تھے۔ تاہم ایک رپورٹ کے مطابق اسے کہیں زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ صرف ترکی کے دو

لاکھ افراد کی جانیں گئیں تھیں۔

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی اور اس کے حلیف ترکی کو شکست ہوئی۔ ترکی کے چند ہمسایہ ملکوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس کی حاکمیت اور سالمیت کو خطرہ لاحق ہوا۔ یونان ترکی کے علاوہ ازمیر پر قابض ہوا۔ ترکی کی فوج نے اتاترک کی سرکردگی میں ازمیر کو خالی کرایا۔ اس لڑائی میں ایک لاکھ یونانی مارے گئے۔

اتاترک نے جمہوریہ اور سیکولر حکومت قائم کی۔ ینگ ترکز (Young Turks) کی اصطلاح ہماری صحافت میں بہت استعمال ہوتی آئی ہے۔ شاید یہ اصطلاح اس دور کی دین ہے۔

استنبول سے دہلی کے لئے مجھے ٹرکش ائرلائینز میں سیٹ نہیں ملی۔ آئی اے ایل ایس کے منتظمین نے متبادل انتظام کیا تھا۔ میں ٹرکش ائرلائینز میں روم اور وہاں سے ڈچ ائرلائینز کے ایک جہاز میں ایمسٹرڈم آیا۔ تب رات کے گیارہ بجے تھے۔ ائرپورٹ کے پاس ایک ہوٹل IBIS میں میرے لئے ایک کمرہ پیشگی بک کیا تھا۔ میں شہر دیکھنا چاہتا تھا، جو نہروں کے لئے مشہور ہے۔ لیکن رات بہت زیادہ ہوئی تھی۔ ٹی وی کھولا۔ بی بی سی کی خبر دیکھی۔ کم سے کم تین یورپی چینلوں پر فحش فلمیں چل رہی تھیں۔ اہلِ مغرب کی صفات اور کمالات کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن لبرل ازم اور آزادی کے نام پر انہوں نے معاشرہ میں جو ئی باتیں روا رکھی ہیں، کوئی معقول انسان قائل نہیں ہو سکتا۔ صبح سفر کرنا تھا۔ میں جلدی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

9/11 کے سانحہ کے بعد یورپ کے ہوائی اڈوں پر بڑی تلاشی لی جاتی ہے۔ جوتے اور جراب نکالنے پڑتے ہیں۔ ایمسٹرڈم ہوائی اڈے پر جوتے اور جراب کے علاوہ بٹوہ اور پاسپورٹ تک کو سکریننگ مشین سے گزارا گیا۔

دہلی جانے والے ڈچ ہوائی جہاز میں زیادہ تر ہندوستانی مسافر تھے۔ میرے ذہن پر اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کے کارنامے مسلط تھے۔ دہلی میں کناٹ پیلس میں ترکی کے اس عظیم معمار کی حیات پر کسی کتاب کی تلاش میں، میں نے بک شاپوں کا چکر کاٹا لیکن نہیں ملی۔

......●●●......

☆......عبدالغنی شیخ

سفر نامہ انگلستان اور برازیل

مجھے سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میں ملک سے باہر نہیں گیا تھا۔ میں ایک واقف کار ٹریول ایجنسی کے پاس گیا اور سیاحت سے متعلق بیرون ملک کے لئے لٹریچر مانگا۔ اس نے پوچھا۔ ''بھلا کیوں؟''

''مجھے دنیا دیکھنے کا شوق ہے۔ فی الحال تصویریں دیکھ کر اپنا ذوق پورا کر رہا ہوں'' وہ مسکرایا۔

اس کے پندرہ بیس سال بعد مجھے انگلینڈ جانے کا موقع ملا۔ یہ مارچ ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹڈیز کا ایک سمینار تھا۔ مجھے ''لداخ میں اسلام'' کا موضوع دیا گیا۔

بیرون ملک جاتے ہوئے میرا پہلا مشاہدہ ائر انڈیا کا دیو ہیکل ہوائی جہاز تھا جو زمین پر ایک عظیم عمارت کی طرح لگ رہا تھا۔ بمبئی سے صبح لندن کے لئے اڑان ہوئی۔ سمندر پار جانے والے ایک نئے مسافر کو دلچسپ مشاہدات اور تجربات پیش آتے ہیں۔ جہاز ۲۸، ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ سمندر میں کہیں برفانی چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں ایسا لگتا تھا کہ سمندر پر یخ کی وسیع چادر بچھی ہے۔ کہیں لمبے چوڑے ریگستان کا گمان ہوتا تھا اور کہیں نخلستان سا لگتا تھا۔ جہاز جب خشکی کے اوپر سے گزرتا تو نیچے عمارتیں اور مکانات نظر نہیں آتے تھے۔ سڑکیں ایک لمبی لکیر کی طرح نظر آتی تھیں لیکن گاڑیاں نظر نہیں آتی تھیں۔

جہاز میں تین سکرینوں پر فلمیں دکھائی جا رہی تھیں اور اکثر مسافر فلمیں دیکھ رہے تھے۔ کئی

لوگوں نے کانوں سے ائرفون لگایا تھا۔ چند اونگھ رہے تھے۔ میں نے سوچا فلمیں جب بھی چاہے میں دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن یہ مناظر نہیں دیکھ پاؤں گا۔ آنکھوں میں نیند کا غلبہ تھا۔ رات دہلی سے بمبئی ہوائی سفر کیا تھا۔ میں نے نیند پر غلبہ پالیا اور نگاہیں باہر رکھیں۔

''ہم کہاں سفر کر رہے ہیں؟'' میں نے ائر انڈیا کے ایک ملازم سے پوچھا۔ ''ترکی پہنچنے والے ہیں۔'' وہ بولا۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد میں نے بحر روم کے کنارے بلیو مسجد کے مینار اور گنبد دیکھے۔ جس کی تصویر میں نے کتابوں میں دیکھی تھی۔ ہم استنبول پہنچے تھے۔ یہی واحد عمارت ہے جو میں نے اس سفر میں بلندی سے دیکھی تھی۔ یہاں میں نے پہلی دفعہ ایک ہوائی جہاز کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔

ایک مرتبہ کوئی بولا۔ یہ بحر کیسپین ہے جو آذر بائیجان اور ارمنیا کے کنارے واقع ہے۔ اب ہم سمندر کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بحر اسود Black sea ہے جو ترکی کی سرحد کے ساتھ گزرتا ہے۔

اب جہاز یورپ کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ بلقان کا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ کہیں بستیاں دھند میں چھپی تھیں کہیں دبیز بادل کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہاڑوں پر برف تھی۔ سفر کے دوران ہم نے برفانی کوہ الپس دیکھا جو یورپ کا بلند ترین پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ جہاز بلندی سے نیچے آیا اور یورپ کے شہروں کے ائرپورٹ، اسٹیڈیم، دریا اور سڑکیں نظر آتی تھیں۔ البتہ گاڑیاں اور ٹرینیں پہچانی نہیں جاتی تھیں۔ فرانس، انگلینڈ اور جرمنی کے علاقے زیادہ شاداب نظر آتے تھے۔ دوپہر کے قریب ہم نے نیچے پھر پانی دیکھا۔ یہ برٹش چینل تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی نسبت سے یاد آیا' جب جرمنی کی فوج فرانس سے ہوکر یہاں تک پہنچی تھی۔ جہاز اُترتا گیا اور لندن شہر نمایاں ہوتا گیا۔ مکانات، مارکیٹ، پارک، دریا ہر بلاک میں مکانات ایک جیسے تھے۔ کہیں بڑے اور کہیں چھوٹے، جہاز ہتھیر وائرپورٹ پر اترا۔ کچھ لوگ پوسٹر لئے متوقع مسافروں کے منتظر تھے۔ میں نے اپنا نام نہیں دیکھا۔ نام کی تلاش میں دو مرتبہ چکر کاٹا۔ نام نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ میرے لداخی رفقا پہلے ہی روانہ ہوئے تھے۔ میں لوازمات کے چکر میں اکیلا رہ گیا تھا اور ایک شریک کار کی زبانی روانگی کی تاریخ دی تھی اور کسی کو مجھے لینے ائرپورٹ پر آنا تھا۔ جیب

سے ڈائری نکالی۔ دو تین جان پہچان والے تھے۔ ان کو فون کیا۔ دو کو گھنٹی جا رہی تھی لیکن فون نہیں اُٹھایا۔ پھر لندن میں آباد ایک لداخی افضل خان کو فون کیا۔ یہاں فون کا نظام بھی اپنے علاقے سے مختلف تھا۔ بات چیت جاری رکھنے کے لئے مشین میں بار بار سکے پھینکنے پڑتے تھے۔ ایک خاتون نے کہا کہ افضل خان گھر پر نہیں ہیں۔ اب بڑا پریشان ہوا۔ پیشانی پر پسینہ آیا۔ ایک آدمی نے میری پریشانی بھانپ لی۔ وہ کسی عزیز کو لینے ائر پورٹ آیا تھا اور شاید ہندوستانی تھا۔ اس نے مجھے میری آمد وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے صورت حال سے آگاہ کیا۔

''آپ کے پاس کتنی رقم ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''صرف دس ڈالر'' میں نے کہا۔

''دس ڈالر سے کیا ہوگا؟'' وہ بولا۔ میرے پاس کچھ ہندوستانی کرنسی بھی تھی۔ لیکن وہ وہاں کسی کام کی نہیں تھی۔

اس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی جو اس فلائٹ میں ہندوستان سے آئی تھی۔ اس نے اس خاتون کے ساتھ سرگوشی کی اور مجھے بیس پونڈ دیا۔ میں نے اس مہربان کا شکریہ ادا کیا۔ اور نام پتہ پوچھا، کہ بعد میں اظہارِ تشکر میں خط لکھوں۔ وہ بھلا مانس بولا۔ ''مجھے پرماتما نے بہت دیا ہے۔'' ظاہر ہے، وہ ایک ہندو تھا۔ یہ رقم پا کر مجھے حوصلہ ملا۔ انہوں نے مجھے کاؤنٹر تک لیا اور لندن کا ایک نقشہ دلایا۔ زمین دوز ٹرین میں سفر کرنے کے لئے زیر زمین ٹکٹ کاؤنٹر گیا اور ٹکٹ لیا۔ میٹرو میں یہ میرا پہلا سفر تھا جسے لندن میں ٹیوب کہا جاتا ہے۔ میری منزل ایک لڑکی ماریا کا مکان تھا۔ وہ لداخ سے متعلق اپنے تھیسیس کے ریسرچ کے سلسلے میں آتی جاتی رہی تھی اور میں نے مدد کی تھی۔ ٹیوب سے نکل کر میں اس محلے کی تلاش میں نکلا جہاں وہ رہتی تھی۔ کئی راہگیروں سے پوچھا۔ اپنے ملک کی شکل و رنگ روپ والے لوگ ملے۔ یہ ہندوستانی یا پاکستانی نکلے۔ ماریا کا محلّہ جانا پہچانا نہیں تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا۔ ایک رہگیر نے ایک دکاندار سے کہا۔ ''خان صاحب ان کو پتہ بتا دیجئے''۔ خان صاحب کے خشک پھلوں کی دکان تھی۔ وہ بھی اس محلے سے ناواقف تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ٹیکسی لے لیں۔ ڈرائیوروں کو پورا علم ہوتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ٹیکسی کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے میں ٹیکسی میں جانے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

لندن شہر پورا جاگا تھا۔ دھوپ بڑی سہانی تھی۔ دکانوں اور ریستورانوں میں لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ کئی ریستورانوں کے سامنے تھڑے پر نوجوان لڑکے موسیقی کی دھن پر سرمستی کے عالم میں رقص کر رہے تھے۔ میں پریشان تھا۔ بھوک اور نیند غائب تھی۔ ایک جگہ ایک بڑی ڈیوڑھی کے ماتھے پر برٹش میوزم کی تختی لگی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں پڑھا تھا اور دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ایک جگہ سول آبادی میں ایک عمارت پر برٹش وزارتِ دفاع کا سائن بورڈ دیکھا۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ماریا کا مکان مل گیا لیکن مقفل تھا۔ ایک دفعہ اور مایوس ہوا۔ اپنا بیگ اُتارا۔ سمینار کا پروگرام چیک کیا۔ آج دوسرا دن تھا۔ رسل چوراہا (Russel Square) پر واقع کناٹ ہال میں افتتاحی تقریب تھی۔ شام کو برسٹل جانے کا پروگرام تھا۔ میں نے سوچا، مجھے فوراً رسل چوراہا پہنچنا چاہیئے ورنہ برسٹل جانا چھوٹ جائے گا۔ میرے دماغ نے پہلے کام کیوں نہیں کیا یا میری حماقت تھی۔ مجھے سمینار کا پروگرام دیکھنا اور ڈھونڈنا چاہئے تھا۔ پھر ٹیوب میں گھسا۔ وہاں اپنے ملک کے رنگ روپ والا ایک لڑکا نظر آیا۔ اس کو کہا کہ میں لندن میں آج صبح پہنچا ہوں اور اجنبی ہوں۔ کاؤنٹر سے رسل Square کے لئے ایک ٹکٹ لے کر دیں۔ ''کیا کراچی سے آرہے ہو؟'' لڑکا پاکستانی نکلا۔ بہر حال اس نے ٹکٹ لایا۔ میری نشست کے پہلو میں ایک انگریز عورت تھی۔ میں نے اس کو کہا کہ مجھے رسل Square جانا ہے۔ وہاں پہنچنے پر مجھے بتا دیجئے۔ اس نے کہا کہ اس کو بھی رسل Square میں اترنا ہے۔ جب وہ اپنی سیٹ سے اٹھی تو میں بھی اٹھا۔ جب جنگلے سے نکلا تو خود کار دروازہ بند ہو گیا۔ باہر نکلنے کے لئے ٹکٹ کو دراز میں سے گزارنا پڑتا تھا۔ ایک سیاہ فام آدمی وہاں ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے مجھے ٹکٹ دکھانے کے لئے کہا۔ میں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ٹکٹ تو لیا ہے لیکن مل نہیں رہا ہے۔

''وہاں بیٹھ کر اطمینان سے دیکھو۔'' اس نے ایک سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے کوٹ اور پینٹ کی جیبوں کو ایک دفعہ اور ٹٹولا اور ٹکٹ نکلا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ رسل Square پاس ہی تھا۔ کناٹ ہال کی تلاش میں، میں نے دو تین بڑے دروازے کھولے۔ قسمت نے ساتھ دیا اور ایک کناٹ ہال نکلا۔ جہاں کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے۔ پروفیسر ہرجیت سنگھ، پروفیسر کے۔ ورکیو۔ یہ تب جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور سمینار میں شرکت کے لئے

آئے تھے۔ ڈاکٹر روف لداخ آئے تھے اور لیہہ میں ہمارے گیسٹ ہاوس میں ٹھہرے تھے۔ پروفیسر جان کُروک اور پروفیسر ہنری اوسماسٹن سے یہاں متعارف ہوئے۔ یہ انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فار لداخ سٹیڈیز کے کرتا دھرتا اور بانیوں میں تھے۔ دونوں برسٹل یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ پروفیسر کُروک نے مجھے پاس کے ایک ریستوران میں لیا جہاں میں نے چائے کے ساتھ کچھ سنیکس لئے۔ شام کو برسٹل نکلے۔ لداخی ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ لندن میں صحیح منزل مقصود پر پہنچنے پر قدرے حیرت کا اظہار کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک روز پہلے ایک آدمی مجھے لینے ہیتھرو ائرپورٹ گیا تھا۔

میری پریشانی اب ختم ہوئی تھی۔ لمبی بے خوابی اور تھکن سے میں بس میں گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اس واقعہ کو ہوئے اب بہت سال ہوئے ہیں لیکن میرے ذہن میں یہ دن آج بھی تازہ ہے۔ مشکلات میں کسی کی ہمدردی اور مدد کتنی اہم ہوتی ہے۔ مجھے اس ایک دن کے سفر کے دوران تجربہ ہوا۔

رات کو برسٹل پہنچا۔ ہمیں ایک ہوٹل Burwell میں رکھا گیا۔ ہر ایک کو رہائش کے لئے الگ کمرہ دیا اور تین چابیوں کا گچھا دیا۔ ایک ہوٹل کے بڑے گیٹ کو کھولنے، دوسری کانفرنس ہال میں آنے اور تیسری اپنے رہائش کے کمرے کے لئے تھی۔ یہ دروازے خودکار طور کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ اگر چابی کھو جائے یا بھول جائے تو ہوٹل کی ماسٹر Key سے کھولے جاسکتے تھے۔ تب انگلینڈ میں خودکار نظام زندگی کے مختلف شعبوں میں مروج ہو چکا تھا۔ ہر طرف کمپیوٹر کی حکمرانی تھی۔ کار کی ٹنکی میں پٹرول ڈالنے کے لئے خودکار مشین ہے۔ سکہ ڈالو اور پیٹرول لے لو۔ کار پارکنگ کی جگہ میٹر لگا ہے۔ جہاں پیشگی کچھ سکہ ڈالنا پڑتا ہے۔ تاخیر ہونے یا زیادہ وقت کے لئے فاضل پیسہ بھرنا پڑتا تھا۔ ریستوران میں خودکار سسٹم سے چائے اور سنیکس ملتے تھے۔ آج سے تیس سال پہلے میں نے دہلی اور بڑے شہروں میں خودکار نظامِ زندگی نہیں دیکھا۔ شاید بڑے ہوٹلوں اور دفتروں میں ہو۔ سب سے بڑی حیرت مجھے ATM پر ہوئی۔ میں نے ایک آدمی کو مشین سے روپیہ نکالتے دیکھا۔ اسے خودکار بنک کہا جاتا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ انگلینڈ میں ATM کو آئے ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ افضل خان نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ انہوں نے آزمائشی طور اپنے اکاونٹ میں تین سو پونڈ زیادہ دکھائے۔ مشین نے درستی کی اور صحیح

رقم دکھائی۔ کم سے کم میرے لئے تب بہت سی چیزیں نئی تھیں۔ بٹن دبانے سے بجلی کا سوئچ کام بھی کرتا ہے اور روشنی بند بھی ہو جاتی ہے۔ جگہ جگہ خوبصورت خودکار ٹیلی فون بوتھ تھے۔ سکہ ڈالو، کہیں بھی بات کرو۔ برسٹل کے پاس ایک بلند و بالا لٹکتا ہوا پُل Hanging Bridge تھا۔ اس کے داخلہ پر رکاوٹ کھڑی کی گئی تھی۔ یہاں بھی پیسہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ مشین میں سکہ ڈالو رکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ اِس پُل پر سے کود کر کچھ لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ یہاں ایک بورڈ نصب ہے، جس پر خودکشی کرنے والے کو Smaritan کے نام سے خطاب کیا گیا تھا اور ہدایت دی گئی تھی کہ وہ فلاں نمبر پر فون کرے تاکہ اس کے مسلے کو حل کرنے میں مدد فراہم کی جا سکے۔

یکم اپریل کے سیمینار کے سیشن میں مجھے اپنے مجوزہ موضوع 'لداخ میں اسلام' پر زبانی اظہارِ خیال کے لئے کہا۔ انتظامی کمیٹی کو میری آمد کے بارے میں شک تھا۔ اس لئے مقالہ پڑھنے والوں کی فہرست میں میرا نام نہیں تھا۔ میں نے اپنے موضوع کے بارے میں اچھا ریسرچ کیا تھا۔ اس لئے مجھے دقت پیش نہیں آئی۔ اختتام پر سوالات پوچھنے کے لئے کئی ہاتھ اُٹھے لیکن سیشن کے صدر نے وقت کی کمی کی وجہ سے اجازت نہیں دی۔

انتظامی کمیٹی نے شرکا کو تاریخی مقامات دکھانے کا اچھا اہتمام کیا تھا۔ ہمیں پہلے ایک میوزیم لیا گیا جہاں لداخ کی کئی چیزیں تھیں۔ میوزیم میں ایک تبّتی لاما بھی کام کرتا تھا۔ اسی روز باتھ Bath اور ویلز Wells کے قصبے دکھائے۔ باتھ قدیم قصبہ ہے۔ یہاں دو ہزار سال پرانا رومیوں کا حمام ہے۔ اسی لئے جگہ کا نام بھی باتھ پڑا ہے۔ انگلینڈ میں وقتاً فوقتاً مختلف قوموں نے حملے کئے تھے۔ جن کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں پانچ سو سال پرانا ایک خوبصورت گرجا گھر ہے۔

باتھ کی ایک گنجان سی گلی میں ایک صاف ستھرے خوبصورت بچے نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے بوٹ کی پالش کرے گا۔ اس کے سامنے پالش اور برش رکھے تھے۔ میرا پہلا ردّ عمل یہ تھا کہ یہ ہمارے ملک کی طرح شوشائن لڑکا ہوگا، جو پیسے کے لئے یہ کام کرتا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ وہ بوائے سکاؤٹ تھا خدمتِ خلق کے لئے پالش کرنے کی پیشکش کر رہا تھا۔ میرے ساتھی وہاں سے جا رہے تھے۔ اس لئے میں نے معذرت کا اظہار کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے انکار سے نوعمر سکاؤٹ مایوس ہوا۔

ویلز کا آٹھ سو سال پرانا گرجا گھر قابلِ دید ہے۔ اس کا کلاک بہت بڑا ہے۔ ہماری موجودگی میں جب منٹ کی سوئی بارہ کے ہندسے پر پہنچی تو سمع خراش گھنٹہ بجا۔

سلمان رشدی کی کتاب Satanic Verses ان دنوں منظرِ عام پر آئی تھی۔ انگلینڈ میں مسلمانوں میں بڑا غم وغصہ تھا۔ برصغیر ہند کی طرح لندن میں اس کتاب کا چرچا تھا۔ لندن میں پبلک مقامات کی کتابوں کی دکانوں کے شیلف میں یہ کتاب نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے سنا کہ چند جذباتی مسلمانوں نے ایک بک شیلف میں یہ کتاب دیکھ کر شیشے توڑ ڈالے تھے۔ صرف ایک دکان کی بک شیلف میں یہ کتاب نظر آئی جہاں یورپیوں کی آبادی تھی۔ ڈاکٹر جان کروک کے پاس یہ کتاب تھی۔ مجھے پڑھنے کے لئے مستعار یہ کتاب دی۔ کتاب بڑی اشتعال انگیز ہے۔

۴ اپریل کو سمینار ختم ہوا۔ اختتامی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر پروفیسر جان کروک نے کہا کہ لداخ میں اسلامیات سے متعلق manuscript دستاویزات تلاش کرنی چاہیئے۔

ڈاکٹر اوسماسٹن نے جیبی خرچ کے لئے چند پونڈ دیئے۔

سمینار میں برمنگھم سے نیل ہاورڈ اور مسز ہاورڈ آئے تھے۔ وہ لداخ آئے تھے، جہاں ان کے ریسرچ میں، میں نے مدد کی تھی۔ نیل ہاورڈ نے لداخ کے قلعوں اور محلات پر اہم تحقیقی کام کیا ہے اور کتاب لکھی ہے۔ انہوں نے مجھے برمنگھم مدعو کیا۔ نوانگ چھرنگ شقسپو بھی شامل ہوئے۔ برسٹل سے برمنگھم کے درمیان دونوں جانب کشادہ شاہراہ ہے جس پر بیک وقت کئی گاڑیاں چلتی ہیں۔ دائیں بائیں بستیوں میں پیدل جانے کے لئے ہر کلومیٹر کے فاصلے پر دریا پر پل بنے ہیں۔ برسٹل سے آگے کلفٹن آتا ہے جو سیاحوں کا مرکز ہے۔ نیل نے یہاں اپنی کار روکی اور ہمیں ایک ریستوران میں لیا۔ ہم ٹرے لے کر اپنی پسند کی چیزیں لینے لگے۔ پھر چھری، کانٹا، پلیٹ اور پیالیاں لیں جن کو بھاپ سے گرم رکھا گیا تھا۔ ہاتھ دھو کر ہینڈ ڈرائز ر میں ہاتھ سکھائے۔ ہم چاروں کو چائے اور سنیکس پر تقریباً ۸ پونڈ کا بل آیا، جو ان دنوں ہمارے روپے کی قیمت کے حساب سے دو سو روپے کے برابر تھے۔ یہاں پٹرول سستا ہے۔ تب ایک لیٹر ۸ روپے میں دستیاب تھا۔ اسے مہنگی تو کافی کی ایک پیالی تھی۔ راستے میں

سمندر کے کنارے ایک دوربین نصب تھا۔ ایک پنس کا سکہ ڈالنے پر سمندر کا اچھا نظارہ ہوتا تھا۔ میں سب سے زیادہ متاثر شادابی سے ہوا۔ سڑک کی دونوں جانب شاداب چراگاہوں اور مرغزاروں میں گائیں اور بھیڑیں گھاس چر رہی تھیں۔ گاؤں دلکش اور صاف ستھرے لگتے تھے۔ ہر گاؤں میں گرجا نظر آتا تھا۔ کار میں سفر کرتے ہوئے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے خواہش ہوئی کہ راستہ طویل ہوتا جائے۔

برمنگھم بڑا شہر ہے۔ آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے۔ مسلمانوں اور سکھوں کی اچھی آبادی ہے۔ ان کی مجموعی آبادی ہندوؤں اور سیاہ فام سمیت ڈھائی لاکھ بتائی جاتی ہے۔ مسلمان زیادہ تر میرپور سے آئے تھے۔ دوسرے روز ہم نے برمنگھم شہر دیکھا۔ شہر کا سائنس میوزیم اور آرٹ گیلری قابلِ دید ہیں۔ داخلہ مفت ہے۔ میوزیم نہ صرف تفریحی اور معلوماتی نوعیت کا ہے بلکہ تعلیمی اہمیت کا حامل بھی ہے۔ یہاں بچوں کو سیکھنے اور سکھانے کی بہت ساری دلچسپ چیزیں ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے یہاں بچوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ بہت ساری مشینیں نصب ہیں، جنہیں بچے نبھا سکتے ہیں۔ اسے بچوں میں سائنس سے دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے اور وہ مستقبل میں بڑے سائنس دان بن سکتے ہیں۔ ایک بٹن دبانے سے موسیقی سماں باندھتی ہے۔ دوسرے سے پرندے گیت گاتے ہیں۔ الو بولتا ہے۔ ایک مائیکروفون لاؤڈ سپیکر کی پوری کہانی سناتا ہے۔ فون اٹھاؤ۔ سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ سائنس گیلری میں گوناگوں نئی پرانی مشینیں نصب ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں بروئے کار لائے ہوئے دو فائٹر ہوائی جہاز بھی نمائش کے لئے رکھے ہیں۔ ان دو ہوائی جہازوں نے جرمنی کے متعدد ہوائی جہاز گرائے تھے۔

آرٹ گیلری میں رنگ برنگ فوسلز، جواہرات، تصویریں، تتلیاں اور لوہے کے اوزار رکھے ہیں۔ یہاں بھی بچوں میں سائنس کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ساز و سامان ہیں اور کمپوٹر ہیں جن پر بچے اپنی دانست میں تجربے کر رہے ہیں اور جن سے بچوں میں عملی کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کے روشن امکانات ہیں۔

لندن اور برمنگھم میں پیدل چلنے والوں کی سہولت کے لئے کہیں کہیں سڑک کے کنارے ایک مشین نصب ہے کہ جس کا بٹن دبانے سے گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو یہ سگنل ملتا ہے کہ وہ اپنی گاڑیاں روک لیں اور پیدل چلنے والوں کو سڑک پار کرنے دیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد گاڑیاں پھر رواں ہوتی ہیں۔

آج برمنگھم میں وکٹوریہ سکیور میں کئی ہزار مسلمانوں نے سلمان رشدی کے خلاف مظاہرہ کیا اورشہر کی کونسل کوایک یادداشت پیش کی۔ اتفاق سے اس کے ۱۱/سال بعد۲۰۰۱ء میں میں اورمیری اہلیہ برمنگھم میں نیل ہاورڈ کے مہمان تھے۔اب کے میں آکسفورڈ میں انٹرنیشنل ایسوسی ایشن فارلداخ سٹڈیز کے سمینار میں شرکت کرنے آیا تھا۔اسی دوران نیویارک میں ٹریڈ بلڈنگ اوردوسری عمارتوں پرطیاروں کے بھیانک حملوں کی واردات پیش آئیں۔اس کا ردعمل برمنگھم میں بھی دیکھنے میں آیا۔شہر کی جامع مسجد میں بھی اس کی سخت مذمت کی گئی۔لیکن مسجد سے باہر مسلمانوں کی ایک امریکہ مخالف تنظیم کے ارکان امریکہ مخالف پمفلٹ تقسیم کررہے تھے۔۵/اپریل کو ہم برمنگھم سے لندن واپس آئے۔دونوں شہروں کے درمیان دوسوکلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ دن بھر برف اور بارش پڑی۔لندن میں ہمیں چند روز ایک انگریزی فرینک سیلی کے ہاں رہنا تھا۔انہوں نے برسٹل میں سمینار کے اختتام پر مجھےاورنوانگ چھرنگ شقسپو کوان کے ہاں آنے کے لئے کہاتھا اوراپنے فلیٹ کا پتہ دیا تھا۔فرینک سیلی کولداخ کے کلچر سے بڑی دلچسپی تھی اورکئی مرتبہ لداخ کی سیاحت کی تھی۔وہ خودنہیں لکھتے تھے۔تاہم سمیناروں میں لداخ کے بارے میں پیش کردہ مقالوں کو بڑے دھیان اورانہاک سے سنتے تھے۔ان کا فلیٹ ایک پوش کالونی وکٹوریہ سٹریٹ میں تھا۔وکٹوریہ سٹریٹ کے آس پاس پارلیمنٹ ہاؤس، بکھنگم پیلس، ویسٹ منسٹرایبے کا کلیسااوربیگ بین ہیں۔اس بلاک میں چودہ فلیٹ تھے۔فرینک سیلی کے فلیٹ کا نمبر ۹ تھا۔ہم نے ان کی ہدایت کے مطابق ۹ کا بٹن دبایااورفرینک کی آواز آئی۔ ہم نے اپنی شناخت بتائی اور دروازہ خودبخود کھل گیااورلفٹ نے ہمیں فرینک کے دروازے پر پہنچایا۔فلیٹ آرام دہ تھا۔کچھ کھاپی کرہم باہر نکلے۔ دریائے تھیمز کے کنارے پارلیمنٹ ہاؤس کے ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز کی ڈیوڑھیوں کے سامنے اجلاس کی کارروائی دیکھنے کے شائق لوگ قطار میں کھڑے تھے۔ہم نے ایک آدمی سے پوچھا کہ کیا اجلاس کی کارروائی دیکھنے کے لئے اجازت نامے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس نے کہاضرورت نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں پارلیمنٹ کے کسی ممبر سے لکھ کرلینا پڑتا ہے۔ہم ہاؤس آف کامنز والی قطار میں جاکھڑے ہوئے۔قطار لمبی تھی۔ ہاؤس آف لارڈز کی قطارچھوٹی تھی اوراسی قطار میں جاملے۔ رہداری میں ڈیٹیکٹو مشین سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہرہ دار بڑے مہذب تھے۔"کیا

ہندوستانی ہو؟'' ایک نے سوال کیا۔ ہم نے گیلری میں سے کچھ دیر تک کارروائی دیکھی۔ وہی منظر تھا جو ہم بی بی سی یا دوسرے چینلوں پر دیکھتے ہیں۔ میرے لئے یہ مشاعرے کا سماں تھا۔ اپنی پارٹی کے کسی ممبر کی تقریر پر یوں داد دی جاتی ہے جیسے مشاعرے میں کسی شعر پر داد دی جاتی ہے۔ ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ بس میں بیٹھے اور ایک جرمن لڑکی ایمیلی سے ملنے گئے۔ ایمیلی نے لیہہ میں کاہنوں Oracles پر اپنی پی ایچ ڈی کے تھیسیس کے لئے ریسرچ کیا تھا اور سمینار میں شرکت کرنے انگلینڈ آئی تھی۔ نوانگ کی فرمائش پر ایمیلی نے ہمیں ایک انگریز خاتون کاہن Oracle کے پاس لیا۔ زیر زمین ایک عمارت کے کمرے میں وہ مقیم تھی جس کی دیوار پر متعدد کاہنوں کی تصویریں چسپاں تھیں۔ اس نے Clarrivoyance کی معرفت نوانگ، ایمیلی اور میرے بارے میں بتایا۔ اس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ چند لمحوں کے لئے آنکھیں بند کرتی تھی اور پھر اپنے تاثرات بتاتی تھی اور ساتھ میں مشورہ دیتی تھی۔ اس نے مجھے کہا ''تمہارے غم اور مایوسی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور زندگی میں نیا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ اس کا عمل متاثر کن نہیں تھا۔ نوانگ چھونگ باہر آ کر اس کی نکتہ چینی کرنے لگے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ سائنس اور تکنالوجی میں ترقی یافتہ ایسے ملک میں بھی بہت سارے لوگ کاہنوں جیسے غیبی باتیں کرنے والوں پر یقین کرتے ہیں۔

آج ۶ ر اپریل ہے۔ ہم نے میوزیم آف مین کائینڈ Museum of Mankind اور برٹش میوزیم دیکھے۔ اول الذکر میں اسکیمو کی زندگی اور معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے اور سردی اور برف و باد سے اسکیموئی بستی کا ماحول بنایا گیا ہے۔ شاید میوزیم کے اس حصے میں درجہ حرارت منفی ڈگری سے کم رکھا گیا ہے جسے ایک اسکیموئی کی سخت زندگی کا تاثر ملتا ہے۔

برٹش میوزیم بہت بڑا ہے۔ یہاں قدیم مصر کی ممیاں سمیت کئی چیزیں دیکھیں۔ میں بہت کچھ دیکھنا چاہتا تھا لیکن نوانگ کو دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے بہت ساری چیزیں چھوڑنی پڑیں۔ صحرائے گوبی میں تکلے مکان کی زیر زمین قدیم بستیوں کی بہت ساری چیزیں لداخ کے راستے یورپ لی گئی تھیں جن میں بہت سارے نوادرات اور نادر مصوری کے شاہ پارے برٹش میوزیم میں رکھے گئے ہیں۔ سر ارل مستین اور سون ہیڈین جیسے مہم جو محققوں نے یہ کام کیا تھا۔

دوسرے روز ۷/اپریل کو مارک سیلی نے ہمیں پوچھا کہ آج ہمارا کیا پروگرام ہے۔ میں نے کہا کہ ہم میڈم ٹوسیڈو Tussauds کا میوزیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ۲۰/ پونڈ دیئے۔ میوزیم کے داخلہ فیس ۸ پونڈ یا لگ بھگ اتنی ہی تھی۔ میڈم ٹوسیڈو فرانس کی رہنے والی تھی۔ میوزیم کا پورا نام Plane Trussiwax Museum ہے۔ اس میں موم کے بنے ہوئے تین سو انسانی ماڈل تھے جن میں عظیم سائنس دان، سیاست دان، قلم کار، کھلاڑی، جرنیل اور برطانوی شاہی خاندان کے چشم و چراغ شامل ہیں۔ میڈم ٹوسیڈو کا بھی ماڈل ہے۔ ہر سال اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم نے سنا ہر سال بیس لاکھ لوگ یہ میوزیم دیکھتے ہیں۔ اس کی بڑی کشش یہ ہے کہ سیلانی کسی ماڈل کے ساتھ اپنی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ میں نے فٹ بال کے شہرہ آفاق کھلاڑی پیلے اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جس کا نام میں بھول گیا ہوں، کے ساتھ اپنی تصویر کھینچی۔ نوانگ نے اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے درمیان کھڑا ہو کر اپنی تصویر کھنچوائی۔ میں نے پڑھا کہ ماڈل بنانے سے پہلے متعلقہ شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس کے چہرے مہرے کی تمام باریکیوں، رنگ روپ اور قد و قامت کو ہو بہو پیش کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔ داخلے پر ایک پولیس کا ماڈل تھا۔ میں نے پہلی نظر میں اس کو جیتا جاگتا پولیس مین خیال کیا۔ بعد میں جان بیرے اور ماریا کے ہمراہ انڈیا لائبریری اور برٹش لائبریری گئے۔ انڈیا لائبریری میں لداخ اور لہاسہ سے متعلق Folding Map Picture دیکھے جس پر واٹر کلر کا کام تھا۔

شام کو میں افضل خان کے ہاں آیا۔ خان کو میں پہلے جانتا تھا اور ہماری خط و کتابت تھی۔ ان کا مکان لندن کے نواح میں سورے ٹول وارٹ میں ہے۔ ۸/اپریل کو میں ان کے ہمراہ لندن میں خوب گھوما پھرا۔ ساؤتھ ہال گیا، جہاں بہت سارے ایشیائی آباد ہیں جن میں بہت سارے ہندوستانی اور پاکستانی ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ برصغیر کے کسی شہر میں پہنچے ہیں۔ البتہ صفائی کے لحاظ سے یہ بہتر ہے۔ تاہم یورپی اور انگریز محلے زیادہ صاف ستھرے ہیں۔ ایشیائیوں کے مکانات بھی اچھے ہیں۔ جا بجا ہوٹل اور ریسٹوران ہیں۔ خان نے مجھے ایک پاکستانی ریستوران میں لیا۔ آج سے روزہ شروع ہوا تھا۔ خان بولے۔ روز یہاں جگہ نہیں ملتی تھی۔ آج روزے کی وجہ سے خالی پڑا ہے۔ ایک انگریز اور اس کی منگول شکل وصورت کی بیوی، جو کسی جنوب مشرق ایشیائی ملک کی لگتی تھی، ہوٹل کے مالک سے روزے کی

اوقات (افطار وسحری) سے متعلق ایک چارٹ مانگ کر لے گئے۔ ہم نے لنچ کیا اور پان کھایا۔

لندن میں جاپانی، چینی، ملائشائی، پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی ریستوران ہیں۔ کہیں کہیں اردو میں حلال گوشت لکھا ہے۔

لندن کا ماحول مجھے بڑا رومانی لگا۔ سینٹ کا استعمال عام ہے۔ بسوں اور ٹرینوں میں سارا کمپارٹمنٹ سینٹ کی مہک سے رچا ہوتا ہے۔ لڑکیاں دیدہ زیب لباس میں ملبوس بھینی بھینی خوشبو میں نہائے ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے جسمانی رکھ رکھاؤ کا خاص خیال رکھتی ہیں۔

لنچ کے بعد میں نے چند بڑے سٹور دیکھے جن میں Bentalاور Mark and Smith شامل تھے۔ یہاں ہر چیز دستیاب تھی۔ سٹور کی چھتوں پر مشینیں آویزاں نظر آتی تھیں۔ یہ سٹور میں آنے والوں کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کے لئے ٹی وی کیمرہ تھے۔ تب لداخ اور کشمیر میں سی سی ٹی وی نہیں تھے۔ خان بولے۔ بالائی منزل پر جانچ کے لئے ٹی وی لگے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے کوئی پیز اٹھائی اور قیمت ادا نہیں کی تو واکی ٹاکی کے ذریعے متعلقہ سیلز مین کو مطلع کیا جاتا ہے۔ سیلز مین کی جیب میں بھی مشین ہوتی ہے اور وہ آدمی پکڑا جاتا ہے، کسی کسی چیز پر ایک مادہ چپکا ہوتا ہے۔ اگر گاہک قیمت ادا کئے بغیر نکلے تو گیٹ کے پاس ایک مشین چلاّ کر انکشاف کرتی ہے اور قصوروار پکڑا جاتا ہے۔ میں نے ایک کوٹ پر مادہ چپکائے دیکھا۔ خان بولے۔ اس کو آئے دو تین سال ہوئے ہیں۔ تب لندن میں بھی سیل فون نہیں تھا۔ خان نے بتایا۔ لندن میں ہر ڈاکٹر کے پاس ایک اوزار بلِپ Blip ہوتی ہے۔ اگر ڈاکٹر مطلوب ہو یا کوئی پیام دینا ہو تو اس بلِپ نمبر کا بٹن دبایا جاتا ہے اور ڈاکٹر کی جیب کی بلِپ سیٹی دیتی ہے۔ ڈاکٹر قریب کے ٹیلی فون بوتھ پر جا کر ہسپتال سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ اس کا عمل ۱۵ ر میل کے فاصلے تک ہوتا ہے۔

لندن میں گھروں میں جو سہولیات اور آسائشی ساز وسامان ہیں، وہ آج لیہہ اور سرینگر میں بہت سارے گھروں میں نظر آتے ہیں۔ سیڑھیوں پر قالین یا دبیز رنگین کپڑے، کمروں میں جسامت کے مطابق قالین اور بچھونے لگے ہیں۔ ضروریات کے سامان، جیسے Oven، فرج، مائیکرو ویو، واشینگ مشین، فون، روسٹر، ٹی وی، صوفہ سیٹ، وارڈ روب، ڈائینگ سیٹ، گیزر وغیرہ ہوتے ہیں۔ انگلینڈ میں

بھی موسم سرما میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اس سے نپٹنے کے لئے ائرکنڈیشن ہے۔ اپریل میں سخت سردی تھی۔ سوٹ میں مجھے سردی لگتی تھی۔ خان نے مجھے اوورکوٹ، جراب وغیرہ دیئے اور مجھے راحت ملی۔ میں نے برمنگھم میں نیل ہاورڈ سے کہا۔ لداخ میں آپ اور مسز پرانے قلعوں اور کھنڈرات دیکھنے کے لئے پہاڑوں پر چڑھتے ہیں۔ گھروں میں فرش پر سوتے ہیں۔ موٹا جوٹھا کھاتے ہیں۔ میلوں پیدل چلتے ہیں۔ یہاں اتنی آسائش ہے۔ آپ لداخ جیسے دشوار گزار علاقے میں یہ سب کیسے برداشت کر پاتے ہیں۔ وہ بولے۔ ''مہم جوئی میں اپنی جاذبیت ہے۔'' میں نے انگریزوں کو بڑا مہم جو پایا ہے۔

افضل خان نے اپنا مائیکرو ودکھاتے ہوئے کہا'' اس میں یہ صفت ہے کہ کھانا یک لخت گرم ہوتا ہے۔ برتن ٹھنڈا رہتا ہے۔ بجلی سے چلتا ہے۔ انگلینڈ میں اسے آئے صرف دو تین سال ہوئے ہیں۔''

اب سائنس کی یہ ایجادات ہمارے لئے جانی پہچانی ہیں۔ دنیا اب سکڑ سمٹ گئی ہے۔ گلوبل ولیج کی اصطلاح ہماری دنیا پر چسپاں ہوتی ہے۔

خان کے ساتھ ۸/اپریل کو میں نے بہت مصروف دن گزارا۔ ہم نے لندن کے اہم بازار آکسفورڈ سٹریٹ، ریجنٹ سٹریٹ اور چائنا ٹاؤن دیکھا۔ ہائیڈ پارک کا چکر کاٹا، جہاں نوجوان لڑکے لڑکیاں بوسہ وکنار کر رہے تھے۔ ہائیڈ پارک میں ایک جھیل ہے۔ خان سے سنا کہ اسی پارک میں چند روز پہلے ایک مولانا سلمان رشدی کی کتاب 'شیطانی آیات' کے خلاف تقریر کر رہا تھا۔ ریجنٹ پارک پاس ہی ہے، جہاں ایک مسجد ہے۔

پانچ بجے ہم نیچرل میوزیم گئے۔ جہاں ڈائنا شور کے بڑے بڑے ڈھانچے ہیں۔ ایک ڈھانچہ کی لمبائی ۲۶ میٹر تھی۔ اس کا وزن دس ٹن تھا اور یہ دس کروڑ سال سے زیادہ پرانا تھا۔ ہم نے اس پر ایک مختصر فلم بھی دیکھی۔ ہم نے یہاں زیادہ وقت گزارا۔ میں نے دل ہی دل میں ارادہ کیا کہ میں اس کو دوبارہ دیکھوں گا۔

ان چند دنوں کے بعد میں اب زمین دوز ٹرین میں اکیلا سفر کرنے کے قابل بن گیا تھا۔ اگر نقشہ پڑھنا آجائے تو زمین دوز ٹرین میں سفر کرنا بڑا آسان ہے۔ بہت کم وقت میں لندن کے کسی حصے میں جاسکتا ہے۔ مضافاتی ٹرین کا نظام بھی منظم اور مربوط ہے۔ واٹرلو سے خان کے گھر ٹول ورتھ ٹرین

میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ ایک بڑے بورڈ پر کمپیوٹر پلیٹ فارم نمبر اور روانگی کا وقت اجاگر کرتا ہے۔ سٹیشن پر سامان رکھنے کا اچھا انتظام ہے۔ اس کے لئے کچھ کرایہ لیا جاتا ہے۔

لندن میں کوڑے دان میں ردی اخبار پھینکا جاتا ہے۔ ٹرین میں بھی میں نے ایسے اخبارات دیکھے جو پڑھنے کے بعد وہاں چھوڑے تھے۔ ہمارے اخباروں کے مقابلے میں زیادہ صفحات ہوتے ہیں۔ میں نے اشتہارات والے رسالے مفت تقسیم کرتے دیکھا۔ اکثر لوگ نہیں لیتے ہیں۔

لندن میں دیوانے، نیم دیوانے، شرابی، ڈرگ لینے والے، بھکاری اور بے کار آدمی نظر آتے ہیں۔ ان کو Trump کہا جاتا ہے۔ یہ بھیک مانگتے ہیں۔ رات کو بہت سارے لوگ سڑکوں کے کنارے یا فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ میں نے سنا، حکومت ان کو بطورِ امداد کچھ رقم دیتی ہے لیکن یہ لوگ شراب میں اڑا دیتے ہیں۔ ائرلینڈ سے آئے بیکار افراد بھی کام کی تلاش میں لندن آتے ہیں اور فٹ پاتھ پر سوتے ہیں۔ جان بیرے نے مجھے بتایا کہ Trumps کو فلاحی اداروں میں اس لئے نہیں رکھا جاتا ہے، اسے ان کا سماج سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے اور ان کی حالت ابتر ہوتی ہے۔ اس لئے انہیں کھلا چھوڑ دیا ہے تا کہ لوگوں سے میل جول رکھ سکیں۔ مجھے خان نے بتایا دھوکہ باز قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ہیلو کہہ کر لوٹ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے خبردار اور ہشیار رہنا چاہیئے۔

۹ر اپریل بھی مصروف دن تھا۔ آج بعد دوپہر ہم CHESINGTON ZOO دیکھنے گئے۔ اس چڑیا گھر کا نیا نام World of Adventure رکھا گیا ہے۔ یہاں جانوروں کے علاوہ اور بھی تفریحی مشغلے اور کھیل ہیں۔ تیز رو چھوٹی ریل گاڑی چھوٹی بڑی عمر کے شائقین لے کر چٹانوں اور غاروں میں سے گزرتی ہے۔ بلندی سے تیزی سے اترتی کشتی سواریوں کو لے کر ایک سرنگ میں داخل ہوتی ہے۔ Magic Carpet کے نام سے الگ شو ہے۔ ایک جگہ گولی باری کا دلچسپ منظر ہے۔ نشانہ ایک انسانی ماڈل ہے۔ گولی لگنے پر وہ کراہتا ہے۔ ایک مصنوعی عورت گھنٹی بجاتی ہے اور ایک مردانہ ماڈل بندوق کی شست باندھتا ہے۔ جانوروں میں قطبین کا ریچھ، ٹٹو سے بھی چھوٹا گھوڑا، زیبرے کی دم والا بندر اور سمندری شیر میرے لئے نئے اور انوکھے تھے۔ یہاں داخلہ ٹکٹ چار ڈالر ہے۔ Chesington ایک ڈسٹرکٹ ہے۔ یہاں Chesinghton Bowl دیکھا جہاں

Bowl میں گولے پھینکنے کا کھیل دیکھا۔ یہاں ویڈیو کے مختلف کھیل ہوتے ہیں۔ جن میں پانچ سالہ بچے سے لے کر عمر رسیدہ آدمی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اب ویڈیو کھیل ہمارے گھروں میں آیا ہے۔ اسے بچوں کا بڑا وقت ضائع ہو رہا ہے۔

میں نے سنا چیزینگٹن سے آگے Brighten کی بستی ہے۔ جہاں ننگوں کا کلب ہے۔ ساحل سمندر ساتھ پڑتا ہے۔

خان صاحب کے ساتھ شب و روز خوب گزرے۔ ان کی اہلیہ بڑی ملنسار تھیں۔ خان صاحب نے مجھے ویڈیو کیسٹ سے لندن میں ہوئے اردو مشاعرے اور ان کی بیٹی بدرالدجیٰ اور اطہر پرویز کی شادی کے ویڈیو پکچر دکھائے۔ رخصتی کا سین بڑا جذباتی اور اشک آور تھا۔ خان اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ ان کا کلام کتابی صورت میں چھپا ہے۔ خان نے بی بی سی سے نشر شدہ کئی فلمیں ریکارڈ کی تھیں۔ ان میں لہاسہ میں کمیونسٹ چین کے خلاف ہوئے مظاہروں، بھکشوؤں وغیرہ کی گرفتاری اور دلائی لاما کے انٹرویو شامل تھے۔ جو مجھے پسند آئے۔

۱۰/اپریل کو میں نے لندن کے ذیل کے چار بڑے میوزیم دیکھے۔

سائنس میوزیم، نیچرل ہسٹری میوزیم، جیولوجیکل میوزیم اور وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم۔ یہ میوزیم بہت بڑے ہیں اور ان میں رکھے ہوئے نوادرات وغیرہ کے بارے میں کتابیں لکھی جاسکتی ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ یہ چیزیں اور نوادرات برطانوی نو آبادیاتی نظام کے دور کی یادگار ہیں اور انہیں اپنے مقبوضہ ملکوں سے لوٹ کر، بٹور کر اور خرید کر ان عجائب گھروں کی زینت بنائی گئی ہیں۔ تب کہا جاتا تھا کہ سلطنت انگلیشیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ان چیزوں کو نمائش کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔

سائنس میوزیم میں مختلف چیزوں کی ایجاد اور ان کے بتدریج ارتقا کی عکاسی کی ہوئی ہے۔ جیسے وقت دیکھنے کیلئے ریت گھڑی اپنی اختراع سے لے کر متعدد منازل طے کر کے الیکٹرونک گھڑی تک پہنچی ہے۔ ابتدا میں انسان کیسے سفر کرتا ہے۔ زمیں پر نقل وحمل کے وسائل کیا تھے اور نقطۂ عروج تیز رو کار کی صورت میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہوائی جہاز کمپیوٹر، بجلی، ریل گاڑی، ادویات وغیرہ کے

ارتقا کی کہانی تاریخی تناظر میں دکھائی گئی ہے۔ خلائی سیکشن بڑا معلوماتی ہے۔ خلابازوں کے لباس، خلا میں کام آنے والی خوراک اور خلا میں داغے جانے والے راکٹ رکھے گئے ہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے Touch Button کی سہولیت ہے۔ اپنے پسندیدہ موضوع سے متعلق بٹن دباؤ ٹی وی معلومات فراہم کرے گا۔ ایک طالبہ کو دیکھا جو ٹی وی دیکھ کر غالباً ہوم ورک کر رہی تھی۔

مجھے سب سے اچھا ہمارے نظام شمسی والا حصہ لگا۔ سکرین پر مریخ، زہرہ اور دوسرے سیاروں کو دکھایا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے فلم دیکھو اور فون کا ریسیور کان سے لگائے لیکچر سنو۔

ایک روبو لیونارڈ وانسی کی مشہور تصویر مونا لیزا کی شبیہہ بار بار بنا رہا تھا۔ کاروں میں مینو کار بنانے کے عمل کو تصاویر میں اجاگر کیا گیا تھا۔ تب یہ جدید ترین کار تھی۔ یہ کار تقریباً خود کار مشین اور روبو بناتا ہے۔

میں نیچرل ہسٹری میوزیم میں پہلے آیا تھا اور ڈینو شور کے ڈھانچے دیکھے تھے۔ اب کے توجہ سے دوسری چیزیں دیکھیں۔ کیڑے مکوڑوں سے لے کر مچھلیوں تک اور ان گنت حیوانات کے پتلے تھے۔ فلموں میں ان کو زندہ اور چلتے پھرتے دکھایا جا رہا تھا۔ یہاں انسان کے مصنوعی اعضا اور پٹھے رکھے گئے تھے۔ میں نے کچھ ایسے آلات دیکھے جو غالباً انسان کی ذہانت کو آزمانے کے لئے رکھے گئے تھے۔

جیولوجیکل میوزیم میں ہماری دنیا میں پائی جانے والی معدنیات اور دھاتوں کے نمونے تھے۔ ان میں ہیرے، جواہرات، نیلم لعل، سونا، مونگا، فیروزہ، پیتل، تانبا، چاندی اور کانسا شامل ہیں۔ یہاں شہاب ثاقب کے ٹکڑے اور چاند پر سے لایا ہوا ایک سیاہ پتھر بھی تھا۔ اس سیاہ رنگ کے پتھر کو میں نے غور سے دیکھا جو ہماری دنیا سے باہر کے ایک سیارے سے لایا ہوا واحد نمونہ تھا۔

بھونچال سے متعلق ایک سیکشن تھا، جہاں وقفے وقفے کے بعد جھٹکے سے کمرہ ہلتا جاتا تھا اور بھونچال کا تاثر ملتا تھا۔ ایک فلم میں آتش فشاں کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ وہیل مچھلی کا ایک بڑا ڈھانچہ تھا۔ یاک Touch Point چھونے سے ٹی وی سکرین پر کئی تبّتی نمودار ہوئے جو برفانی پہاڑوں پر یاک کے ساتھ چل رہے تھے۔

وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم میں اسلام کے تہذیبی ورثے کو نمایاں طور دکھایا گیا ہے۔ اس کے

علاوہ ہندوستان چین، جاپان، کوریا اور یورپ کے تمدنی سرمایہ اورفن کے نادر نمونے رکھے گئے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قالین، تصاویر اور چینی برتن نمایاں ہیں۔

پرانی مورتیاں اور ان کی نقل رکھی گئی ہے۔ یونان کے اساطیری اور روایتی مورتیاں جابجا نظر آتی ہیں۔ ایک گیلری میں سترھویں صدی سے اب تک کے یورپ کے مردوں اور عورتوں کے لباس اور فیشن ماڈلوں کو زیبِ تن کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایک گیلری میں موسیقی کے مختلف آلات ہیں۔ ایک جگہ انگلینڈ اور فرانس میں مختلف دور میں مستعمل تالے، چابیاں، کنڈیاں اور اس سے وابستہ اشیاء رکھی گئی ہیں۔

ان میوزیموں کی کئی خصوصیات ہیں۔ پہلی اور بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انسان ہر شے کو عملی صورت میں دیکھ پاتا ہے اور اس کے علم اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بچوں اور بڑوں کے لئے تجربات کرنے کے وسائل ہیں۔ میں نے مختلف سیکشنوں میں سینکڑوں بچوں اور جوانوں کو مصروفِ عمل پایا۔ چند بچے بالکل ننھے منے تھے۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بٹن دبانے سے معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ کسی کو خلل ہوئے بغیر ائرفون سے سنا جاسکتا ہے۔

وطن واپسی کے لئے اب ایک دن باقی تھا۔ ائر پورٹ جانے کے لئے لندن میں ہونا ضروری تھا۔ افضل خان کے ہاں میں چار روز مہمان رہا۔ میں لندن شہر میں ایک اور میزبان نکی گریسٹ (GRIST) کے ہاں آیا۔ نکی نے مجھے اس کے ہاں رہنے کے لئے آنے کو کہا تھا۔ وہ بھی لداخ اپنے ریسرچ کے سلسلے میں آئی تھی۔ نکی نے پوریگ (کرگل) پر اپنی پی ایچ ڈی کا تھیسیس لکھا ہے۔ خان اور ان کی اہلیہ سے وداع لے کر اور واٹرلو سٹیشن سے اپنا سامان سمیٹ کر میں نکی کے پاس آیا۔ وہ لندن میں اپنے شوہر کے ساتھ برکسٹن میں رہتی ہے۔

۱۱/اپریل لندن میں میرا آخری دن تھا۔ ٹریفلر سکیور میں نیشنل گیلری دیکھی۔ یہاں سپین، انگلینڈ، فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک کے گزشتہ دو تین صدیوں کے عظیم مصوروں کی شاہکار تصویریں نمائش کے لئے رکھی تھیں۔ ان میں لیونارڈو وانسی، رافیل، Engered جیسے شہرہ آفاق مصوّر شامل ہیں۔ بعد میں سینٹ پال کا عظیم گرجا دیکھا۔ اسے ۱۶۶۶ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ انگلینڈ کی

ایک اہم ترین تاریخی یادگار اور دنیا کا بلند ترین کلیسا ہے۔ بڑے ہال میں میزوں پر انجیل مقدس (بائبل) کا صحیفہ رکھا تھا۔ پادری گرجا دیکھنے کے لئے آنے والوں کو تاکید کر رہے تھے کہ وہ بائبل کی آیات ورد کرنے کے لئے آئیں اور سیٹ پر بیٹھیں۔ لوگ مذہب سے عمومی طور بیگانگی دکھاتے تھے۔ بھیڑ میں سے اکادکا آدمی ان کی اپیل پر توجہ دیتے تھے۔

بعد میں سینٹ جیمز گرجا میں ایک ماہر تبت جان گینٹینگ کی تبت کے بارے میں ایک تقریر سنی۔ اس کی مجھے پیشگی خبر ملی تھی۔ ہال میں سامعین کی اچھی خاص تعداد تھی۔ تقریر کے بعد بہت سے سوالات پوچھے گئے۔ یہاں ایک تبتّی لڑکی یُوڈون سے ملاقات ہوئی۔

بعد میں نیلسن Column دیکھا جو ایک تاریخی یادگار مانا جاتا ہے۔ نکی مجھے اپنے دو بچوں کے سکول لے گئی۔ بڑا خوبصورت اور صاف ستھرا سکول تھا۔ ٹائلیٹ بڑا صاف ستھرا تھا۔ بچوں کو لنچ سکول میں کھلایا جاتا تھا۔ سکول دیکھ کر مجھے ہمارے سکولوں کی خستہ حالی یاد آئی۔

دوسری صبح ہندوستان روانگی کا پروگرام تھا۔ جان بیرے صبح پونے چھ بجے نکی کے فلیٹ پہنچے۔ زیرزمین ٹرین میں ہیتھر وائر پورٹ ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ ہیتھر وائر پورٹ دنیا کا ایک مصروف ترین ہوائی مستقر ہے۔ یہاں ہر پانچ منٹ میں ایک ہوائی جہاز اترتا ہے۔ ائر انڈیا کا طیارہ ۱۱ر بجے اُڑا۔ کچھ وقفے کے لئے آنکھوں کے سامنے دریا، سبزہ زار، مکانات، باغات اور سڑکیں گزریں۔ ایلپس اور سوئزرلینڈ کی کچھ جھلکیاں دیکھیں۔ موسم خراب اور ابر آلود تھا۔ اس لئے زمین بہت کم نظر آتی تھی۔ رات کے بارہ بجے دہلی پہنچے۔ دہلی ائر پورٹ پر کسٹم کا چیک نہیں ہوا۔ عام طور پر باہر سے آنے والے مسافروں کے سامان کا چیک ہوتا ہے۔

برازیل:

سن ۱۹۹۳ء اور غالباً مئی کا مہینہ تھا۔ ایک روز ڈاکٹر محمد الدین میرے گھر آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا برازیل میں ہو رہے ایک ورک شاپ میں شرکت کریں گے، جہاں تعلیم پر ایک مقالہ پیش کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر محمد الدین لیہہ سے تعلق رکھنے والے ایک ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر اور ایک غیر سرکاری تنظیم Ladakh Health and Environment کے روحِ رواں ہیں۔ میں نے

انہیں اثبات میں جواب دیا اور تعلیم سے متعلق مواد جمع کرنے لگا۔ میرے پاس بھی مواد تھا۔ کئی کتابیں ملیں۔ جدید تعلیم، مختلف کمیشنوں کا قیام، ہندوستان میں موجودہ تعلیمی پالیسی اور لداخ میں تعلیمی صورت حال کی اساس پر ایک مقالہ تیار کیا۔

۲۱/ جون کو میں اور ایک استاد چھرنگ ونگدوس دہلی سے ائر انڈیا کے طیارے میں برازیل کے لئے نکلے۔ ونگدوس ایک غیر سرکاری تنظیم SECMOL کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ورک شاپ کا اہتمام سویڈن کی ایک تنظیم The Future Earth نے کیا تھا اور اسی نے ہمارے اخراجات اٹھائے تھے۔ اب کے جہاز نے پاکستان، افغانستان اور ایران کے ہوائی راستے اڑان بھری۔ افغانستان کے پہاڑ مجھے لداخ کے پہاڑوں کے مقابلے میں زیادہ اونچے اور سنگلاخ لگے۔ تقریباً 9 گھنٹے بعد جہاز پیرس میں اترا۔ پیرس میں ایک گھنٹہ رکا اور جرمنی کے شہر فرینک فورڈ پرواز کی۔ جہاں پانچ گھنٹے رکا۔ جہاز میں سے یورپ کے دو خوبصورت اور ترقی یافتہ ملک فرانس اور جرمنی کے Landscape زمینی خدوخال نمایاں نظر آتے تھے۔ مشرقی یورپ کے ملکوں کے مقابلے میں جرمنی اور فرانس زیادہ شاداب اور دلفریب لگ رہے تھے۔ بستیاں بڑی خوبصورت نظر آتی تھیں۔ ان کے نواح میں چھتنار پیڑوں کے جھنڈ تھے، جو قرینے اور سلیقے سے لگائے گئے تھے۔ البتہ جرمنی کے اکثر شہر گنجان نظر آتے تھے۔

فرانکفورٹ سے ہم نے شام کے وقت برازیل کے ائر لائنز VARIG میں سفر کیا۔ ساری رات پرواز کے بعد جہاز صبح پانچ بجے ساؤپولو ائر پورٹ پر اترا۔ ائر پورٹ کا لاونج بڑا وسیع اور دیدہ نواز ہے۔ لوازمات پورا کرنے کے بعد ہم دوسرے ہال میں آئے۔ ہمیں لینے والا کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھا بھالا اور ڈھونڈا۔ مجبوراً میل کرنے کے لئے ایک کاغذ پر ہماری آمد کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ اچانک ایک لمبا جوان نمودار ہوا اور ہم سے مخاطب ہو کر پوچھا ”آپ ونگدوس تو نہیں؟“ میں نے قلم چھوڑ دیا۔ ”جی، میں ونگدوس ہوں۔“ ونگدوس نے جواب دیا۔ ”یہ عبدالغنی شیخ ہیں۔“

”میں پیٹر ہوں اور آپ دونوں کو لینے آیا ہوں۔“

ہم نے ہاتھ ملائے۔

"آپ کو ابھی ریوڈی جنز وفلائی کرنا ہے۔ میں ٹکٹیں لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اوجھل ہوا۔

پروگرام کے مطابق ہمیں ایک ہفتہ ساؤ پولو میں ورک شاپ کے سلسلے میں رکنا تھا۔ یہ پروگرام اب منسوخ کیا گیا لگتا تھا۔ ساؤ پولو لاطینی امریکہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی تب ایک کروڑ اسی لاکھ تھی۔

ساؤ پولو سے ریوڈی جنیر و کا ہوائی سفر ۴۰ منٹ کا ہے۔ کرایہ دو سو ڈالر ہے۔ ہوائی اڈہ بڑا اور مصروف ہے۔ پرواز کے لئے گاڑیوں کی طرح چھوٹے ہوائی جہازوں کی قطار لگتی ہے اور یکے بعد دیگرے رن وے کی طرف سرکتے ہوئے پرواز کرتے ہیں۔ لاؤنج میں ہم نے منگول شکل وصورت کے لوگ دیکھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لاطینی امریکہ کے قدیم باشندے منگول نسل کے ہیں۔ نیز بہت سارے جاپانی بھی یہاں آباد ہیں۔

ساؤ پولو اور ریوڈی جنیر و کے درمیان Landscape خوبصورت ہے۔ یہ علاقہ پہاڑی ہے اور ڈھلوان زمین پر ڈیم بنے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ڈیم کا پانی بستیوں کو بہا کر نہ لے جائے۔ سمندر بالکل سامنے ہے۔ ریوڈی کی آبادی لگ بھگ ایک کروڑ ہے۔ بہت سال پہلے میں نے کہیں سے نقل کر کے اپنے نوٹ بک پر لکھا تھا کہ ریوڈی جنیر و دنیا کا ایک خوبصورت ترین شہر ہے۔ جب میں نے یہ جملہ لکھا ہوگا تو میرے دل میں اس شہر کو دیکھنے کی خواہش نے ضرور انگڑائی لی ہوگی جو یہ ہ سے لگ بھگ بیس ہزار میل کی دوری پر ہے۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ آج میں اسی شہر میں تھا۔ مجھے بادی النظر میں ریو بمبئی اور دہلی سے ترقی یافتہ لگا۔ شہر میں جزوی طور زمین دوز ریلوے نظام ہے۔ بسیں بہتر ہیں۔ دکانوں میں لین دین کے لئے کمپیوٹر ہے۔ میں نے کہیں کہیں Escalating Stairs خودکار سیڑھیاں دیکھیں۔

ریو سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ساحل Beach بہت خوبصورت ہے۔ یہاں تفریح کے لئے آنے والوں کا بڑا جمگھٹا رہتا ہے۔ مرد عورتیں نہانے کے لئے آتے ہیں۔ یہ پیراکی کے لباس میں یا نیم برہنہ ہوتے ہیں۔ برازیل کا دارالحکومت پہلے ریوڈی جنیر و تھا۔

ریو بلاشبہ بڑا خوبصورت شہر ہے۔ کئی قابل دید مقامات ہیں۔ روپ وے کے ذریعے ایک

پہاڑی سے سیاحوں اور تفریح پر آنے والوں کو Sugar Loaf نام کے اونچی چٹان پر لیا جاتا ہے جو دلکش نظارہ پیش کرتا ہے۔ ایک خصوصی ٹرین سیلانیوں کو حضرت عیسیٰؑ کے اس دیو قامت بت تک لے جاتی ہے جو ایک اونچے پہاڑ پر نصب ہے۔ ہمیں دیکھنے کے لئے ان دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کے لئے کہا گیا۔ ہم میں سے بہتوں نے مواخرالذکر یادگار منتخب کی۔ پہاڑ کے اوپر سے نشیبی عمارتیں بادلوں میں چھپی نظر آتی ہیں۔ یہاں ایک ریستوران بھی ہے۔

کوپا کابانا سمندر کے کنارے ایک پُر فضا مقام ہے جہاں امیر لوگ رہتے ہیں۔ شہر کا نیشنل پارک دلکش ہے۔ ریو کی ایک اہم خصوصیت اس کی پہاڑیاں ہیں جن پر آبادی ہے۔ عام طور پر ان پہاڑیوں پر غریب لوگ رہتے ہیں۔ یہ مقامات جرائم پیشہ اور ڈرگ مافیا کے گڑھ بھی ہیں۔ وہ اجنبیوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس لئے وہاں جانے سے سخت منع کیا جاتا ہے۔

بلندی پر جانے کے لئے سڑکیں بنی ہیں۔ پہاڑی بستیوں سے شہر کی بلند و بالا عمارتیں بالکل نشیب میں نظر آتی ہیں۔

فٹ بال برازیل کا پسندیدہ اور قومی کھیل ہے۔ فٹ بال کا نامور کھلاری پیلے برازیل کا باشندہ تھا۔ جہاں ہم رہتے تھے۔ اس کے پاس سمندری ساحل پر چار فٹ بال گراؤنڈ تھے جن پر چھوٹے بڑے سب چاؤ سے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ایک جگہ والی بال کھیلتے دیکھا۔ ریو کا فٹ بال سٹیڈیم دنیا میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے۔ اس میں دو لاکھ تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ ۱۹۹۲ء میں برازیل نے دوسری مرتبہ فٹ بال کا عالمی کپ جیتا تھا۔ برازیل اب تک پانچ مرتبہ FIFA کپ جیت چکا ہے۔

ایک شام ونگدوس اور میں ساحل پر گئے، جو ہمارے ہوٹل سے سات آٹھ منٹ کا راستہ ہے۔ پہلے ایک پارک ہے۔ ہم پارک میں داخل ہوئے۔

برازیل کی وجہ تسمیہ ایک درخت برازیلا ہے جو اس ملک میں پایا جاتا ہے۔

لوگ عام طور پر امن پسند ہیں لیکن یہ کبھی تشدد پر اتر آتے ہیں۔ میں نے سنا، گزشتہ سال ریو کی گلیوں میں خوفناک خون خرابہ ہوا اور سات ہزار لوگوں کی جانیں گئیں جن میں بہت سارے بچے

تھے۔ میں نے یہ بھی سنا، سال میں پانچ سو بچے مارے جاتے ہیں۔ ریو میں ہماری موجودگی کے دوران سات بچوں کو پتھروں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ ان کو رات کو قتل کیا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے شہر کے دولت مندوں کی سازش بتائی جاتی ہے۔ ریو کے غریبوں کے بچے، دکانداروں اور امیروں کو بہت ہراسان کرتے ہیں۔ اسی پاداش میں انتقام لیا جاتا ہے۔ ایک لڑکی ہمارے پیچھے بری طرح پڑ گئی کہ اس کو دکان سے کولڈ ڈرنک خرید کر دیں اور میں نے مشروب کی ایک بوتل دے کر اس سے پنڈ چھڑائی۔

ونگدوس اور میں ورک شاپ میں ایک ہندوستانی نمایندے کے بعد سب سے پہلے پہنچے تھے۔ اسی دوران ہمیں چند غیر سرکاری تنظیموں کے نمائندوں سے ملایا۔ جنہوں نے معلومات فراہم کیں۔ یہ تنظیمیں ماحولیات کے تحفظ کے لئے کام کر رہی تھیں۔ ایک روز ایک ایسی دکان دکھائی جہاں Organic خوراک اور مشروبات فروخت کی جاتی تھیں۔ ایک روز ایک کنسرٹ میں لیا، جہاں برازیل کے ایک نامور فن کار نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

اس دوران لاطینی امریکہ کے مختلف ملکوں سے نمائندے ورک شاپ اور کانفرنس میں شرکت کے لئے پہنچنے لگے۔ ان ممالک میں ارجن ٹائن، کولمبیا، چلّی، پیرو، وینیز یلا اور ربولویا شامل تھے۔ فلپائن سے دو یا تین لڑکیاں آئی تھیں۔ ہندوستان سے ہم دونوں کے علاوہ ایک ترقی پسند کاشتکار موہن آیا تھا، نیز سویڈن سے چند افراد آئے تھے۔

ایک روز صبح ناشتے پر ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کانفرنس میں شرکت کرنے ساؤ پولو سے آئی تھی۔ مجھے وہ لڑکی دوسری لڑکیوں سے شکل وشباہت اور طور طریقے سے جدا گانہ لگی۔ اپنا تعارف کرتے ہوئے اس نے کہا ''میرا نام جینت موسیٰ ابراہیم ہے۔'' وہ ترکی نسل کی تھی۔ جینت نے بتایا کہ ساؤ پولو میں دس لاکھ مسلمان ہیں، جو زیادہ ترعرب ہیں۔ شہر اور مضافات میں متعدد مساجد ہیں اور دینیات پڑھانے کے لئے درس گاہیں ہیں۔

''کیا آپ کو عربی آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف پڑھنا آتی ہے۔'' وہ بولی۔

جینت نے بتایا، بہت ساری مسلم خواتین نسوانی تحریک سے وابستہ ہیں۔ جینت دوسری

لڑکیوں کی طرح بغل گیر اور بوس و کنار سے گریز کرتی تھی۔ پھر ہمیں ریو ڈی جنیر و کے مضافات میں ایک خوبصورت ہوٹل میں لیا جو ایک شاداب ٹیلے پر واقع تھا۔ میری اور ونگدوس کے سویٹ میں کئی بیڈ تھے۔ برآمدے پر جھولا تھا۔ کمرے میں فریج، فون، ٹی وی کے علاوہ ایک سیف بھی تھا۔ ایک خاندان کے پانچ چھ افراد اس میں آرام سے رہ سکتے ہیں۔ میں نے سنا، ریو سے متعدد متمول خاندان یہاں چند روز قیام کے لئے آتے ہیں۔ ہوٹل میں سویمینگ پول ہے۔ ڈائینگ ہال میں لنچ، ڈنر اور ناشتے پر بیسوں اقسام کے کھانے، ماکولات، مشروبات اور پھل سجائے جاتے ہیں۔ کھانے کے بعد پھلوں کے رس پینے کی عام رسم ہے۔ عموماً سنگترے کا رس لیا جاتا ہے۔ ہمارے معیار سے یہ تھری سٹار ہوٹل ہو سکتا ہے۔ ریو میں ہم جس ہوٹل میں رہے وہاں بھی متعدد اقسام کے کھانے اور مشروبات سجائے جاتے ہیں۔ ایک روز میں نے گنتی کی اور ۵۴ اقسام تھیں۔ ریو میں مسلمانوں کی کوئی آبادی نہیں ہے اور یورپ کی طرح ہوٹلوں میں حلال کا تصور نہیں ہے۔ میرے لئے گوشت کے بغیر کھانے کے متعدد اقسام تھے۔ یہاں کانفرنس میں ونگدوس نے SECMOL کے ادارے کی کارکردگی پر اور میں نے تعلیم پر اپنے مقالے پڑھے۔

کئی مہمان مقرروں کو مدعو کیا گیا تھا جن میں کئی لوگوں سے ہم نے بہت اچھی باتیں سیکھیں۔ کولمبیا کے گستاوو نے حصول علم پر چند کارآمد باتیں بتائیں۔ وہ بولے۔

''خوراک کی طرح علم حاصل کرو۔ جس طرح خوراک کے مختلف اجزاء ہمارے جسم میں ہضم ہوتے ہیں اور انسان زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح علوم انسان کے دل و دماغ میں ضم ہونے چاہیئے۔ حصول علم یا کام کرنے کیلئے دانشمند یا ذہین ہونا کافی نہیں، جذبہ اور احساسِ ذمہ داری لازمی ہے۔ سابق علم مابعد علم کے لئے ضروری ہے۔ سابقہ معلومات کی اساس پر نئے علوم کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ انسانی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے گستاوو نے کہا'' ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے میرے پہلو میں بیٹھے ہم سفر نے اپنے کانوں پر ورکس مین لگایا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرے ساتھ باتیں کرنا نہیں چاہتا ہے۔ اس کے برعکس کولمبیا میں ہوائی پرواز کے دوران ایک بڈھیا تھوڑی سی علیک سلیک کے بعد اپنے بغل کے مسافر کو اپنے پوتوں اور نواسوں کا البم تک دکھانے لگی۔

کانفرنس کے دوران ہم نے برازیل کے ذیل کے تین شہر دیکھے۔

MENDES، VASSOURA اور PARAKAMBI۔

مینڈیس میں سکول کے بچے شہر کا دن منانے کیلئے چوک میں جمع تھے۔ سکول کا بینڈ بجایا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں تین روز تقریب چل رہی تھی۔ یہاں سیاہ فام آبادی زیادہ ہے۔ بہت سارے بچے جسمانی طور کمزور لگ رہے تھے۔

۱۱ر جولائی کو ہم واسورا گئے۔ شہر خوبصورت ہے۔ گرجا اور میوزیم دیکھے۔ اتوار تھا اور گرجا میں عبادت ہو رہی تھی۔ میں نے مشاہدہ کیا۔ برازیل میں یورپ کے مقابلے میں لوگ زیادہ مذہبی ہیں۔ شہر کی آبادی تب اسی ہزار تھی۔ راستے میں پہاڑوں پر جنگلات دیکھے۔ کہیں کہیں ہرے بھرے ڈھلانوں پر مکانات نظر آتے تھے، جو بڑے خوبصورت لگتے تھے۔

پاراکامبی میں ہم نے ایک ایسا تعلیمی ادارہ دیکھا، جہاں تعلیم و تدریس کے ساتھ پیشہ ورانہ اور ماحولیات پر تعلیم دی جا رہی تھی۔ اس ضمن میں ہم نے کئی پروفیسروں کے خیالات سنے۔

برازیل لاطینی امریکہ کا سب سے بڑا ملک ہے۔ یہاں کا رقبہ ۸۳ لاکھ مربع کلومیٹر سے تجاوز کرتا ہے اور آبادی بارہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے برازیل ہندوستان سے تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔ برازیل میں دنیا کا سب سے بڑا دریا ایمیزان بہتا ہے۔ کئی مقامات پر دریا کا پاٹ ۳۰۰ میل چوڑا ہے۔ ایمیزان کے جنگلات اپنے جنگلی جانوروں کے لئے مشہور ہیں۔ دنیا کو ان گھنے اور وسیع جنگلات کے صرف دس فیصد حصے کا علم ہے۔

برازیل وسائل کے لحاظ سے امیر ملک ہے لیکن ان وسائل کو اب تک بروئے کار نہیں لایا گیا ہے۔ عام لوگ استحصال کے شکار ہیں۔ اس لئے ان میں بے اطمینانی پائی جاتی ہے۔ سماج کے باشعور اور دانشور افراد انقلاب چاہتے ہیں۔ کانفرنس کے دوران ایک مقرر نے بتایا کہ کئی آدمی جزیروں کے مالک ہیں۔ جہاں ان کی عشرت گاہیں ہیں۔ کسی نے بتایا چند آدمیوں کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ میری نظروں میں معیشت سے متعلق کئی اعداد و شمار گزرے۔ جیسے اس ملک میں ۸۰ فیصد وسائل پر ۲۰ فیصد لوگوں کا کنٹرول ہے۔ ۱۰ فیصد افراد ۴۶ فیصد وسائل پر قابض ہیں۔ ۱۰ فیصد غریب طبقہ صفر اعشاریہ ۶ فیصد وسائل پر جی رہا ہے۔ ایک غیر سرکاری تنظیم کے ترجمان نے شستہ انگریزی میں ملک

کے سماجی اور مالی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تنظیم انقلاب چاہتی ہے۔ ارباب اقتدار پُرامن طریقے سے مسئلہ حل کرے تو اچھا ہے ورنہ انقلاب آئے گا۔ Elite یعنی روسا اور امرا کو چاہیئے کہ وہ عوام کے موڈ کو سمجھیں۔

ایک روز کانفرنس کے دوران ایک آدمی نے کانفرنس کے شرکا میں ایک پرچہ تقسیم کیا جس میں ملک میں امیری اور غریبی کے درمیان وسیع تفاوت کو ابھارا گیا تھا۔ غالباً تب سے برازیل میں اہم تغیر و تبدل آیا ہے اور جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوگئی ہیں۔ میرا خیال ہے، حکومت نے مثبت اقدام لئے ہوں گے۔

ملک کی ۶۰ فیصد پیداوار جنوب کی دو تین ریاستوں سے حاصل ہوتی ہے۔ شمال کی ریاستوں میں پانی کی قلت ہے اور پیداوار کم ہوتی ہے۔ اس لئے ملک میں غیر متوازن ترقی ہے۔

جولائی ۱۹۹۳ء میں جب ہم وہاں تھے، برازیل بدترین افراط زر کے دور سے گزر رہا تھا اور وہاں کے روپیہ جسے CRUCEZER کہا جاتا ہے، کی قیمت برق رفتاری سے گر رہی تھی۔ ایک ڈالر کی قیمت ۴۸ ہزار کروسیزر تھی۔ جب ہم پہنچے تو اس کی قیمت مزید گر گئی تھی اور فی ڈالر کی قیمت ۵۶ ہزار کروسیزر تک پہنچی تھی۔ ہم ایک ماہ برازیل میں رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے روپیہ کی قیمت مزید گرگئی۔ ۲۳ جولائی کو میں نے کانفرنس کے سنٹر سے ۵ لاکھ کروسیزر میں ایک ٹی شارٹ خریدا۔ سیلز مین نے مجھے دو ڈالر واجب الادا رقم بعد میں لینے کے لئے کہا۔ تین چار روز بعد جب میں نے وہ رقم مانگی تو مالک نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کروسیزر کا دام مزید گر گیا ہے، اس لئے رقم ادا نہیں کی جاسکتی۔ ایک مٹھائی جو ہمارے ملک میں ۲۵ پیسے میں ملتی ہے، وہاں اس کا ایک ہزار کروسیزر لئے جاتے ہیں۔ ایک سگریٹ ۵ ہزار کروسیزر اور ماچس کی ایک ڈبیا ۱۵ ہزار کروسیزر میں فروخت ہوتی ہے۔

مسیح کے بت کے پاس ایک ریستوران میں پہنچنے پر میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ آملیٹ کھایا۔ آملیٹ قدرے بڑا تھا۔ دو یا تین انڈوں کا ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک گلاس جوس پیا۔ مجھے ساڑھے آٹھ لاکھ کروسیزر کا بل دیا جو ہماری کرنسی میں تقریباً ساڑھے پانچ سو روپیہ کے برابر ہے۔

افراط زر کی وجہ سے سرکار ہر چار ماہ بعد اپنے ملازمین کی شرح تنخواہ میں اعادہ کرتی ہے۔

مہنگائی کے حساب سے تنخواہ بڑی کم ہے۔ ایک استاد کی ماہانہ اوسط مشاہرہ ۱۲۰ سے ۲۰۰ ڈالر ہے جبکہ ایک ڈاکٹر یا انجینئر ۴۲۰ ڈالر یا اسے کچھ زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ ایک مزدور کی ماہانہ آمدن ۷۰ ڈالر ہے۔

برازیل کے ایک باشندے نے کہا افراط زر کی وجہ غیر ملکی قرضہ ہے جو حکومت کو واجب الادا ہے۔ قرضے پر ۱۶ فیصد سود ہے۔ اگر قرضہ ادا نہ کیا جائے تو ملک کی اقتصادی حالت مزید ابتر ہوگی۔ قرضے کی ادائیگی کے لئے وہ اپنی پیداوار سستے داموں میں فروخت کر رہی ہے جبکہ ملک میں یہی اشیا گراں ہیں۔

واپسی پر جب میں سرینگر ائر پورٹ سے لیہہ لوٹ رہا تھا تو سامان کی چیکنگ کے دوران نیم فوجی پہرہ داروں نے میرے بیگ میں کروسیزر کی کرنسی دیکھی، جو لاکھوں کی مالیت کی تھی۔ کرنسی دیکھ کر وہ مشتبہ نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ یہ کرنسی اپنے پاس رکھ لیں۔

غالباً غریبی اور مہنگائی کی وجہ سے یہاں بڑے جرائم ہوتے ہیں۔ ریو میں چھینا جھپٹی، اغوا اور فریب کاری کی وارداتیں عام ہیں۔ Hand Book of South America میں سیاحوں کو ہدایتیں دی گئی ہیں کہ وہ SLASHER یعنی بلیڈ یا چھری سے کپڑا یا جیب کاٹ کر لوٹنے والے، چھین جھپٹ کرنے والے، زور زبردستی کرنے والے اور دھوکا بازوں سے محتاط رہیں۔ کتاب میں لکھا ہے کئی دفعہ چائے، شراب اور سگریٹ میں نیند آور دوا ملا کر سیاحوں اور مسافروں کو لوٹا جاتا ہے نیز یہ ہدایت بھی ہے کہ کوئی اجنبی گھل مل جائے تو اس کے ساتھ بے تکلفی سے پیش نہ آئیں۔ لوٹنے اور دھوکا دہی کے لئے مختلف گر اپنائے جاتے ہیں۔ کبھی ایک چیز زمین پر پھینکی جاتی ہے۔ جب سیاح وہ چیز اٹھانے کے لئے زمین پر جھکے تو سیاح کا سامان لے کر اُچکا رفو چکر ہو جاتا ہے۔ سویڈن سے ایک پروفیسر اور ان کی اہلیہ کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ پہلے ہی روز دونوں Beach پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ایک لڑکا آیا اور پروفیسر کی بیوی کی گھڑی سے متعلق سوالات پوچھتا ہوا ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے لگا۔ اسی لمحہ دوسرا لڑکا ان کا پرس لے کر فرار ہوا۔ اس سے پہلے اس کا پیچھا کریں، پہلا لڑکا بھی چمپت ہوا اور دونوں ساحل پر موجود ہزاروں لوگوں کی بھیڑ میں کھو گئے۔ دونوں نے پیچھا کیا۔ کہاں ہاتھ آتے۔

برازیل میں تین نسلوں کے لوگ بستے ہیں۔ سیاہ فام، سفید فام اور ان دونوں نسلوں کی مخلوط اولاد جو شکل و شباہت میں وجیہہ ہوتے ہیں۔ سرکاری زبان پرتگیزی ہے اور عام لوگ بولتے ہیں۔ پرتگال نے برازیل پر تسلط جمایا تھا اور اپنی نوآبادیات قائم کی تھی۔ لاطینی امریکہ کے دوسرے ملکوں میں سپینی زبان بولی جاتی ہے۔ اسے سرکاری اور علمی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ سپین نے ان ملکوں میں اپنی نوآبادیات قائم کی تھیں۔ کئی ملکوں میں قدیم قبائیلی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں لیکن ان کو ثانوی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔

برازیل اور لاطینی امریکہ کے ممالک میں اسلام کے خلاف کوئی تعصب نہیں پایا جاتا۔ یہاں مسیحت اور اسلام کے درمیان کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ یہاں کے باشندے ماضی میں سامراجی ملکوں کی استعماریت کے شکار رہے ہیں اور ان کو استحصال کیا گیا ہے۔ ان کے ذہن میں تاریخ کے تناظر میں تلخ یادیں ہیں۔ تین سو سال پرتگال کی غلامی کے بعد ۱۸۷۹ء میں برازیل نے آزادی حاصل کی۔ برازیل میں بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے جانگھیہ اور ٹی شارٹ پہنتے ہیں۔ ایک روز میں Beach پر گیا، بڑی بھیڑ تھی۔ غالباً میں اکیلا تھا، جس نے پینٹ پہنا تھا۔ کچھ لوگ میرے پینٹ کو تجسس سے دیکھنے لگے۔ اندھوں میں کانا راجا والی مثال تھی۔

سگریٹ نوشی عام ہے۔ بہت ساری عورتیں سگریٹ پیتی ہیں۔ کسی نے مجھے بتایا متوسط اور اونچے طبقوں کے لوگوں نے سگریٹ نوشی ترک کی ہے۔

شہروں میں مغربی تہذیب کا بڑا اثر ہے۔ ہم نے سنا گاؤں والے پرانی روایات اور قدروں کے پابند ہیں۔ لڑکیوں کا کسی اجنبی مرد کے ساتھ گھل مل جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بستی کے پاس سڑک پر مسیح کی بالشت بھر مورتی دیکھی۔ اس جگہ بوتلیں اور چکنائی نظر آئی۔ غالباً مسیح کو نذرانے چڑھائے گئے ہوں۔ تب مجھے لداخ یاد آیا۔

ایک روز ہمیں افریقی اور سفید فام مخلوط النسل کے چند افراد نے اپنی عبادت گاہ میں سواگت کیا۔ عبادت گاہ میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ یہ لوگ کیتھولک اور قدیم مذہب پر مبنی ایک مخلوط مذہب کو اپنا رہے تھے۔ انہوں نے کانفرنس کی کرتا دھرتا میڈم برگیٹا کو ایک اونچے تخت پر بٹھایا۔ احترام سے

شال پہنائی۔ دو اور خواتین کو تخت پر بٹھایا اور شال پہنائی۔ سبھی ان کے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور ڈھولوں کی تھاپ پر دل آویز گیت گاتے ہوئے رقص کرنے لگے۔ پھر تحفے پیش کئے۔ آخر میں بڑے پجاری نے سبھوں سے معانقہ یا مصافحہ کیا اور احترام اور تپاک سے الوداع کیا۔

مجھے تجسس تھا کہ برگیٹا اور سبھوں کی اتنی پذیرائی کیوں کر رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ The Future Earth نے ان کی فلاح و بہبود کے لئے اچھے کام کئے ہیں۔ اس لئے یہ شکر گزار ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ The Future Earth نے اپنے اخراجات پر ورک شاپ اور کانفرنس کا اہتمام کیا ہے۔

زرد برازیل کے عوام کا پسندیدہ رنگ ہے۔ یہ ان کا قومی رنگ ہونا چاہیئے۔ کمروں میں زرد رنگ کے ٹائل ہیں۔ دیواریں زرد رنگ کی ہیں۔ ٹیکسیاں پیلے رنگ کی ہیں۔ نیون لائٹ بھی عموماً زرد ہے۔ بزایل کے فٹ بال کھلاڑی زرد رنگ کی وردی پہنتے ہیں۔ خاص طور پر برازیل کے جھنڈے کا رنگ زرد ہے۔

برازیل میں ہم دنیا کی خبروں سے نابلد رہے۔ انگریزی زبان کا چلن بہت کم ہے۔ ٹی وی پر پرتگیزی زبان میں عالمی خبریں کم آتی ہیں جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ایک روز کسی نے کہا کہ ہندوستان میں سیلاب آیا ہے۔ ٹی وی دیکھا تو پتہ چلا کہ پنجاب میں سیلاب آیا ہے۔ ریوڈی جنیرو سے Journal De Rio نامی پرتگیزی میں ایک کثیر الاشاعت اخبار چھپتا ہے۔ اس کے کئی صفحات ہیں۔ گاہے گاہے ضمیمے نکلتے ہیں جن میں فلم، فیشن اور خانہ داری، معیشت وغیرہ پر مضامین شایع ہوتے ہیں۔

برازیل تہذیب و تمدن کے لحاظ سے قابل ذکر ملک نہیں ہے۔ یہاں قدیم یادگاریں اور تہذیبی ورثہ نہیں ہے۔ ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے لاطینی امریکہ میں پیرو مشہور ہے۔ Incas قوم کا تہذیبی ورثہ دیکھنے ہزاروں سیاح پیرو جاتے ہیں۔

کانفرنس کے دوران ہم نے لاطینی امریکہ میں مروج بچوں اور بڑوں کے چند کھیلوں کا مظاہرہ دیکھا جن میں ہم نے بھی شرکت کی۔ تب میری یہ خواہش تھی کہ میں ان کھیلوں کو لیہہ میں بچوں کے سامنے دکھاؤں اور مروج کروں۔

ارجن ٹائن کے ایس پیلو نے واٹر گیم دکھایا جس میں یہ مظاہرہ کیا کہ کون کیسے پانی جیسی قیمتی دولت کو بے تحاشا صرف اور ضائع کرتا ہے اور کیونکر کفایت سے پانی خرچ کیا جاتا ہے۔

پیلو نے ایک اور کھیل دکھایا جس میں شرکا کو ایک ایک جوڑے میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک جوڑا اپنے مقابل کے ساتھی کی آنکھوں پر پٹّا باندھ کر گھما پھرا کر ایک درخت کے پاس لے جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ اس درخت کو ٹٹول کر اور پرکھ کر اس کو پہچان لے چنانچہ ساتھی اس کی جسامت، سطح کے کھر درے پن اور اس کے پاس کی جھاڑیوں وغیرہ کو ٹٹول کر جانچتا پرکھتا ہے۔ پھر اس کا ساتھی گھما پھرا کر اس کو اپنی جگہ واپس لاتا ہے۔ پُر پٹی کھولی جاتی ہے اور اس کو اپنے درخت کی شناخت کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ اسے پہچان لے تو کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے مقابل کے ساتھ سے یہی عمل کرایا جاتا ہے۔ اس طرح کسی کی ذہانت اور حافظہ کا امتحان لیا جاتا ہے۔

اسی نوعیت کے ایک اور کھیل میں شرکا آنکھیں بند کر کے ایک دائرے میں بیٹھتے ہیں۔ درمیان میں نگرانی کے لئے ایک جج بیٹھتا ہے کہ کوئی آنکھیں نہ کھولے۔ ہر شریک کار اپنے دائیں پہلو کے ساتھی کو چھوٹی سی چیز جیسے لکڑی کا ایک تنکا، کنکر یا چھوٹی سی ٹہنی دیتا ہے جو وہ اپنی چیز کے ساتھ اپنے پہلو کے ساتھی کے حوالہ کرتا ہے۔ دوسرے راؤنڈ میں ہر ایک اپنی چیز کو ٹٹول کر شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور شناخت ہونے پر آنکھیں کھولتا ہے۔ اگر صحیح پہچان کی ہو تو یہ اس کی کامیابی ہے۔

ایک اور کھیل میں شرکا کو گروپوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر گروپ کو دس سیکنڈ کے اندر کسی پیشے یا واقعہ کو اداکاری سے مظاہرہ کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ جیسے ویٹر، گاہک، دکان دار بننے کے لئے کہا جاتا ہے۔ یا ہنی مون پر جائے تو اس کا attitude رویہ یا انداز کیا ہو یا بیوٹی پارلر، کھولے تو کیسے کام چلائے گا۔ ایک جج اول، دوم اور سوم آنے والے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کھیل میں شرکا کی حاضر دماغی اور تخیل کی اُڑان کو پرکھا جاتا ہے۔

ایک غیر سرکاری تنظیم TIBA کے آرگنائزر نے حاضرین کو آنکھیں بند کر کے سوچ کر دماغ میں ایک خاکہ یا تصویر بنانے کے لئے کہا۔ اس کے بعد ہر ایک کو کاغذ کی ایک شیٹ اور پینسل دے کر کہا کہ وہ کاغذ کے ایک صفحے پر خاکہ یا تصویر بنائے جو اس کے تصور کی عکاسی کرتی ہو اور دوسرے صفحے پر

خاکہ یا تصویر کے افادی پہلو کو اجاگر کرے جو خاکہ یا تصویر بنانے والے کی خواہش کی تکمیل کی نشان دہی کا مظہر ہو۔ اس ضمن میں وہ TIBA کو اس کے بارے میں وضاحت کریں۔ غالباً یہ کسی کی فہم و فراست جانچنے کا طریقہ ہے۔

ایک سماجی کارکن خاتون Dulsi نے ایک کھیل دکھایا جس میں حصہ لینے والے ایک دائرے میں بیٹھتے ہیں۔ ایک بال کو ایک دوسرے کے گول پوسٹ کی طرف پھینکا جاتا ہے۔ اگر دوسرا چوکنا ہو تو بال کو پکڑ کر دوسرے کی طرف پھینکتا ہے۔ اگر چوکنا نہ ہو تو گول ہو جاتا ہے۔ گول کے ساتھ ہارا ہوا کھلاڑی دائرے سے نکالا جاتا ہے۔

لگ بھگ ایک ماہ برازیل میں گزارنے کے بعد ہم پھر ایک دفعہ Varig ائر لائینز سے پیرس لوٹے۔ برازیل کے شہر ریوڈی جینرو سے پیرس پرواز کرتا ہوا جب ہوائی جہاز سپین کی فضا میں پہنچا تو مجھے سپین میں آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت یاد آئی۔ جہاز کی چھوٹی کھڑکی کے شیشے سے نیچے دیکھتا ہوا میرا ذہن سوچنے لگا کہ یہاں صدیوں پہلے قرطبہ، اندلس اور غرناطہ جیسے شہروں میں انسانی تہذیب، سائنس اور ٹکنالوجی معراج پر تھی۔ آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی تک لیون، ناروے اور بارسیلونا کے حکمرانوں کو ایک سرجن (جراح) معمار، ماہر گلوکار مطلوب ہوتا، لباس بنانے کی ضرورت پڑتی تو وہ ان کے لئے قرطبہ سے درخواست کرتے تھے۔ مسلمانوں کی اسی راج دھانی کا شہرہ جرمنی تک تھا جہاں ایک سیکسن راہبہ نے اسے دنیا کا ہیرا قرار دیا۔ اسی دور میں اندلس میں اسلامی ثقافت نے اتنی بلندی چھوئی تھی کہ ایک سرکردہ ڈچ عالم ڈوزی جوش میں یہاں تک کہہ گئے کہ وہاں لگ بھگ ہر ایک لکھنا پڑھنا جانتا ہے جبکہ عیسائی یورپ میں خاص کر کلیسا کے چند افراد صرف ابتدائی علم سے واقف تھے۔ اسپین میں مسلمانوں نے ابن حزم، ابن رشد، ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن ہشیم، ابوالقاسم الزہراوی اور ابوالقاسم مسلمہ بن مجریطی جیسے حکما، علما اور سائنس دان پیدا کئے ہیں۔

ہم دہلی رات کے بارہ بجے پہنچے۔

......●●●......

ادیبوں کے فلک رنگ خطوط
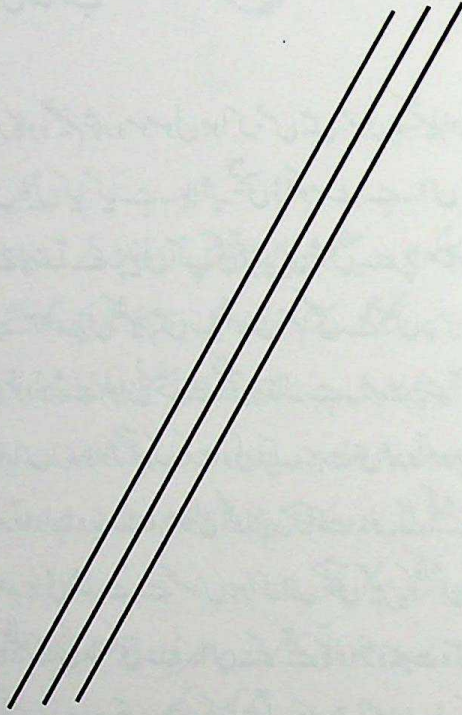
عبدالغنی شیخ کے نام

برادرم عبدالغنی شیخ صاحب

اسلام علیکم

'شیرازہ' سرینگر کا وہ ضخیم شمارہ موصول ہوا کہ جس میں جموں و کشمیر اور لداخ کو قدیم تذکروں اور سفرناموں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ بلاشبہ قیمتی ڈاکومنٹ ہے۔ اس میں آپ کے دو مقالے شامل ہیں۔ دونوں مقالے پسند آئے۔ یوں آپ کی تحریریں شوق سے پڑھتا رہا ہوں اور علم، ریاضت اور محنت کی داد دیتا رہا ہوں۔ ۲۳/برس کشمیر میں رہا افسوس ہم کبھی ملے نہیں۔

رسول گلوان کی خودنوشت سوانح حیات قیمتی مقالہ ہے۔ بہت پسند آیا، رسول گلوان واقعی ایسا کردار ہے جو زندہ رہے گا، اس زندہ اور متحرک کردار کی ایک بہت ہی عمدہ تصویر ابھرتی ہے، آپ کی تحریر نے اسے ایک ڈرامائی کردار بنا دیا ہے، رسول گلوان حقیقت ہو کے فکشن کے کردار بن جاتے ہیں۔ مضمون پڑھنے کے بعد بڑی شدت سے محسوس ہوا کہ اس حقیقی کیریر کو فکشن کی صورت دے کر لداخ کے پس منظر میں ایک عمدہ فلم بنائی جاسکتی ہے۔ اس کے قصے کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لداخ سے وسطِ ایشیائی علاقوں تک اور پھر چین کی سرحد تک، اس کی زندگی کے سفر کے جانے کتنے دلچسپ، پُر اسرار اور حیرت انگیز پہلو میری آنکھوں کے سامنے ابھر رہے ہیں۔ طبقاتی زندگی کے نشیب و فراز، انسانی رشتوں اور ماضی کی سچائیوں اور ماضی کی رومانیت سب کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

دیکھئے نا آپ کے مضمون اور اس کردار نے ایک ضعیف شخص میں کیا تحرک پیدا کر دیا ہے۔ ۷۶، ۷۷ برس کا بوڑھا بھلا کیا کرسکتا ہے۔ ڈائریکٹر پروڈیوسر مہیش بھٹ ملتے تو اُن سے کچھ کہتا کہ وہ

آپ سے رابطہ قائم کریں۔ ایسے فلم کے لئے بہت بڑے پروجیکٹ کی ضرورت ہے۔

اُمید ہے آپ اچھے اور خوش ہوں گے۔ آپ کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپ براہ کرم بھجوانے کی کوشش کیجئے۔

دعا گو

۲۳؍مئی ۲۰۰۷ء پروفیسر شکیل الرحمان

○

محترم عبدالغنی شیخ صاحب

آداب

شیرازہ میں آپ کا گراں مایہ مضمون ''لداخ میں اُردو'' پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ آپ نے اتنا جامع اور معلوماتی مضمون سپردِ قلم کر کے نہ صرف ایک مقابلتاً تاریک گوشے پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اردو کی ایک لاثانی خدمت بھی انجام دی ہے۔ میں نے اس مضمون کو نہایت دلچسپی سے دوبار پڑھا۔ یہ ناچیز چوّن سال سے زائد عرصہ سے اردو ادب سے وابستہ رہا ہے۔ مگر میرے یہ وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ لداخ جیسے دور افتادہ خطے میں اردو کا اس پائے کا کام ہوتا رہا ہے اور آپ جیسے اردو کے مخلص پرستار اور عمدہ لکھنے والے وہاں سرگرمِ عمل ہوئے۔

اس بلند پائے اور بسیط معلوماتی مضمون پر میری دلی مبارکباد مقبول فرمایئے۔ لداخ کی زیارت کے منصوبے عرصے سے بناتا آیا ہوا ہوں مگر کسی نہ کسی وجہ سے یہ پائے تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ آپ کا مضمون پڑھ کر یہ شوق اور خواہش جاگ گئی وہاں آنے کے لئے کون سے مہینے مناسب رہیں گے اور کیا مختلف جگہوں پر جہاں شب بسری ضروری ہو ایک کمرہ اور ملحقہ باتھ روم کا انتظام ممکن ہوگا اور اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا اور کِسے لکھنا ہوگا۔ اپنی سہولیت سے جب فرصت ملے تو اس بارے میں بذریعہ خط میری رہنمائی فرمایئے۔ شکرگزار رہوں گا۔ میں اپنی بیوی کے ہمراہ آنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور

ہم دونوں عمر رسیدہ ہیں۔ بفضل خدا میری صحت ٹھیک ہے مگر بیوی صرف دس بیس گز چل سکتی ہے اور ان کے لئے مجھے دستیاب سواری کا انتظام بھی درکار ہوگا۔ کیا یہاں تک ہوائی سروس ہے اور مسافروں کو راستے میں یا وہاں کوئی خطرہ ہے؟ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص

م۔م۔راجندر

۶۸۔ چتراوہار، دہلی ۹۲

○

محترم عبدالغنی شیخ صاحب

سلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کی کتاب 'قلم، قلم کار اور کتاب' محترم فاروقی صاحب کے توسط سے موصول ہوئی تھی اور میں نے آپ کو خط بھی لکھا تھا۔ مگر جواب سے محروم رہا۔ شاعر کے تازہ شمارہ میں آپ کا ترجمہ پڑھا تو آپ کی یاد تازہ ہوگئی۔ آپ بہت اہم کام کررہے ہیں۔ لداخ اور قرب و جوار کے مسلمانوں کے حالات جاننے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ فرقہ وارانہ جذبہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ تجسس ہے کہ پہاڑی علاقوں میں مسلمان کب اور کیسے پہنچے اور اب وہ کس حال میں ہیں۔ ان کے تہذیبی اور معاشی حالات کیسے ہیں؟ اس سلسلے میں آپ نے یقیناً مضامین لکھے ہوں گے اور اگر چند مضامین کی نقل فراہم کریں تو عنایت ہوگی۔

شمیم طارق

ممبئی

۱۳ رمارچ ۲۰۰۴ء

....

گرامی قدر عبدالغنی شیخ صاحب

سلام ورحمت

۲۶/اپریل کے خط کے ساتھ رجسٹری موصول ہوئی۔ پمفلٹ اور مضمون سے بہت نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ نوربخشیوں کا عقیدہ واضح نہیں ہوسکا ہے کہ اعتقاد وعبادات میں یہ قرآن وسنت کے پابند ہیں یا نہیں! میں اپنی مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ قبول فرمایئے۔

۱۔ شوکت علی میاں اور تصوف

۲۔ ٹیپو شہید کی آخری آرام گاہ پر

۳۔ غالب اور ہماری تحریکِ آزادی

۴۔ روشن لکیریں

۵۔ شرف۔۔۔ محنت وکفالت

۶۔ صوفیا کا بھکتی راگ

آخری کتاب مکتبہ جامعہ نے شائع کی ہے۔ اس میں صرف تین ابواب ہیں۔ یہ پوری کتاب تصوف اور بھکتی کے نام سے انجمن اسلام ممبئی سے شائع ہوئی۔

آپ نے جس محبت کا مظاہرہ فرمایا ہے اللہ اس کو قبول فرمائے اور محبت کے رشتے کو باقی رکھے۔ میں صرف شکریہ ادا کرسکتا ہوں۔ دعا کی درخواست ہے۔ آپ خود بھی میرے لئے دعا فرمائے اور دوسروں سے بھی دعا کروائے۔ شاعر (ممبئی) میں میرے نام ایک گوشہ آیا ہے۔

والسلام

شمیم طارق

ممبئی

۵/مئی ۲۰۰۸ء

شیخ صاحب

زندہ رہے، آباد رہے۔ شاید برسوں سے آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا مگر کاہلی اور صرف کاہلی مانع آئی۔ شاید شمع، شیرازہ کے ساتھ ساتھ ملک کے مقتدر رسائل میں آپ کی نگارشات اشاعت پذیر ہوئی تھیں تو من یہ سوچ سوچ کر اس قدر مچلتا اور خوش ہوتا تھا کہ لداخ جیسی بنجر زمین بھی کس قدر زرخیز بن گئی ہے۔ اب حال ہی میں کلچرل اکیڈیمی کا جموں وکشمیر لداخ نمبر آیا تو خط لکھے بغیر نہ رہ سکا۔ گو اس نمبر میں جموں وکشمیر کا سارا تاریخی مواد میری نظروں سے پہلے ہی گزرا تھا۔ مگر لداخ نظروں سے اوجھل ہی تھا۔ شائد اس لئے بھی کہ ہم دور دراز ممالک کے سفر تو کرتے ہیں۔ مگر اتنی ہی ریاست کے تاریخی اور صحت افزا مقامات نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔

آپ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ہر موضوع پر لکھ رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ زورِ قلم اور زیادہ اور زیادہ۔ سرینگر آجائیں تو ملاقات کا شرف ضرور بخشیں۔ بہتر رہتا اگر میرے ہی یہاں قیام رہتا۔ غریب خانہ بھی امیر خانے میں مبدل ہو جاتا!

بہت بہت دعاؤں اور تمناؤں کے ساتھ۔

۳۰ راگست ۲۰۰۵ء

پروفیسر مخمور حسین بدخشی

ہل ویو کالونی، اولڈ ایر پورٹ روڈ

وانہ بل، سرینگر

....

مکرمی عبدالغنی شیخ صاحب

اسلام علیکم

''آج کل'' نومبر ۹۶ء کے تازہ شمارے میں آپ کا گراں قدر اور فکر انگیز مضمون 'دنیا کے چند مشہور ترین ناول' پڑھا۔ ظاہر ہے، آپ نے ان سارے ناولوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہوگا، جو اپنے آپ میں ایک حیرت کا مقام ہے۔ آپ کی ادب سے دلچسپی اور اُس کے علم کا احاطہ کرنے کی جستجو کی عبادت سے کم نہیں۔ ادب کے باذوق قارئین کو اس سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔

ہر ناول کے تفہیم کو آپ نے جس اختصار اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس سے مصنف کے اسلوب اور نقطۂ نظر کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔

ملک کے اس دور دراز علاقہ میں آپ کیا کرتے ہیں؟ براہِ کرم اپنی عمر اور پیشہ وغیرہ کے بارے میں تحریر فرمائیں۔

ایک بات اور، جیمس جوائس کی تخلیق Ulysses کے بارے میں کئی ادیبوں کا بیان پڑھ چکا ہوں۔ لیکن افسوس میں اُس کے مطالعہ سے ہنوز محروم ہوں۔ کیا آپ مجھے اس کا اردو ترجمہ فراہم کرانے میں مدد کر سکتے ہیں۔ آپ اُس کا پتہ بتائیں، میں اُسے وی۔ پی۔ سے منگانے کی کوشش کروں گا۔

جواب کے لئے لفافہ حاضرِ خدمت ہے۔ امید ہے جواب دے کر ذرہ نوازی کا ثبوت دیں گے۔

خدا کرے آپ ہمیشہ بخیر و عافیت ہوں۔

نیاز مند

نسیم بن آسی

وارانسی۔ ۔ ۲۲۱۰۱۰

۱۱ر نومبر ۱۹۹۶ء

....

برادر محترم عبدالغنی شیخ صاحب

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا خط موصول ہوگیا تھا۔ افسانہ پسند آیا تھا۔ شیرازہ (کشمیر) شمارہ ۱۔۳ میں آپ کی "تخلیق" "شاہراۂ ابریشم" یعنی سِلک روڈ پڑھا۔ نہایت معلوماتی مضمون ہے۔ سلک روڈ سے اس دور میں خوب منافع بخش تجارت بھی ہوتی تھی۔ اسی روڈ سے تہذیب وتمدن اور ثقافت بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی تھی، مذاہب بھی ایک خطے سے دوسرے خطے میں سلک روڈ ہی سے پہنچتے تھے۔ اُس دور میں روڈ کس قدر مفید اور منافع بخش تھی۔ تجارتوں کے ذریعہ مختلف جگہوں پر لوگ پہنچتے تھے اور ان کے ہمراہ ان کی تہذیب، ان کا کلچر بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا تھا۔ کتنے علاقوں سے آمدورفت ہوتی تھی اور کون کون سیاح بھی اس روڈ کے ذریعے آئے۔ مثلاً فاہیان، ہیون سانگ اور اوکونگ کا بھی ذکر آپ نے کیا ہے۔ منافع بخش کاروبار کا بھی ذکرِ خیر کیا ہے۔ بہرکیف آپ کا مضمون وافر معلوماتی ہے۔ پڑھنے سے مزہ آگیا اور وقتی طور پر معلومات میں اضافہ ہوا۔ اس مضمون کے لئے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اور زیادہ کیا تحریر کروں۔ نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی، انتہائی خلوص، بہترین خواہشات اور خوبصورت توقعات کے ساتھ۔

خداحافظ

آپ کا اپنا

ایم۔ عالم

....

O

محترم عبدالغنی شیخ صاحب

سلام وآداب

امید کرتا ہوں کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کے لکھے ہوئے مضمون ''قلم، قلمکار اور کتاب'' کی ماہنامہ ''آج کل'' دہلی میں یکے بعد دیگرے چاروں قسطیں پڑھیں۔ یہ مضمون مجھے مسحور کئے ہوئے تھا۔ قلم کاروں کے مزاج، عادات، طرزِ تحریر، امید، ناامیدی، کامیابی، ناکامی، وغیرہ پر اتنا تحقیقی اور جامع مضمون آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ اس تاریخ ساز مضمون کے لئے آپ کو تہہ دل سے مبارک دیتا ہوں۔

میں بھی ایک قلم کار ہوں، بنیادی طور پر غزلیں کہتا ہوں۔ افسانوں پر بھی مشق کرتا ہوں۔ میں آپ سے ایک رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ میری مدد فرمائیں گے۔ کشمیر سے ایک رسالہ ''پروازِ ادب'' نکلتا ہے۔ وہ ہمارے یو۔ پی میں نہیں ملتا۔ اگر آپ کو اس کا پتہ معلوم ہو تو براہ کرم مجھ کو لکھ بھیجیں۔ میں اس میں اپنی تخلیقات بھیجنا چاہتا ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ میری اتنی مدد ضرور کریں گے۔ جوابی پوسٹ کارڈ منسلک ہے۔

خیراندیش

عادل بستوی

رام پرساد کی گلی، گاندھی نگر۔ بستی

یو۔ پی۔ ۲۷۲۰۰۱

مورخہ ۷؍۲؍۲۰۰۲ء

....

جناب عبدالغنی شیخ صاحب

اسلام علیکم

دور دراز علاقہ لداخ میں بیٹھ کر آپ نے ''قلم، قلم کار اور کتاب'' لکھ کر کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں نے یہ مضامین ''آج کل'' میں پڑھے ہیں۔ کتابی شکل میں پڑھنے کا مزہ کچھ اور ہی ہے۔ آپ کی کتاب تو حوالے کے کام آئے گی۔

میں اپنی ایک کتاب آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ ''قنطار''۔ علامہ اقبالؔ کے فارسی قطعات ''لالۂ طور'' کا منظوم اُردو ترجمہ۔ دیکھیئے کیسا ہے؟ اللہ کرے آپ بخیر ہوں۔ اس خط کے ساتھ ہی کتاب پوسٹ کر رہا ہوں۔ رسید سے نوازیں تا کہ اطمینانِ قلب ہو۔

آپ کا اپنا

ڈاکٹر روف خیرؔ

حیدر آباد، اے پی

۱۹ر نومبر ۲۰۰۳ء

محترمی عبدالغنی شیخ صاحب

اسلام علیکم

امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے

اگست ۲۰۰۴ء کے ''آجکل'' میں آپ کا افسانہ ''ایک فوٹو'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے مڈل اور ہائی اسکول کے دن یاد آ گئے۔ میری شادی ۱۹۶۴ء میں ہوئی۔ شادی کے فوٹوز کا البم دیکھتا ہوں تو پورے خاندان والے اور ہمارے کئی دوست احباب جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں، یاد آ جاتے ہیں، ان

کی ایک ایک بات یاد آتی ہے۔آپ کا افسانہ پڑھ کر زندگی کی کئی چیزیں یاد آگئیں۔ میں ایک طنز و مزاح نگار ہوں۔ میری تصنیف ''خدا جھوٹ نہ بلوائے'' پچھلے سال شائع ہوئی۔ میری سب سے پہلی کتاب ہے ''چودہ زبانیں، چودہ کہانیاں'' جس میں اڑیہ، بنگلہ، پنجابی، تمل، تیلگو، راجستھانی، سندھی، کشمیری، کنڑی، گجراتی، مراٹھی، ملیالم اور ہندی کی بہترین کہانیوں کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے۔ترجمے سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھاوا ملتا ہے۔ایک زبان والے دوسری زبان والوں کے قریب آتے ہیں۔ایک دوسرے کو سمجھنے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔آج اس کی اشد ضرورت ہے۔

بہر حال ''ایک فوٹو'' لکھ کر آپ نے ایسی ایسی چیزوں کا تعارف کرایا، جو اس پُرانی فوٹو کے بغیر ناممکن تھا۔آپ کب سے افسانے لکھ رہے ہیں؟ کیا آپ کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے؟ اس سال میں نے ''کرناٹک کے اردو قلمکاروں کی ڈائرکٹری'' کرناٹک اردو اکادمی کے اشتراک سے شائع کی ہے۔ جس میں 400 قلمکاروں کا بیو ڈیٹا تصویروں کے ساتھ ہے۔

کیا لہہ میں کوئی ایسی ادبی انجمن ہے جہاں وقتاً فوقتاً اردو کے قلمکار مل بیٹھتے ہیں۔

مخلص

عظیم الدین عظیم

۱۸ ستمبر ۲۰۰۴ء

مونس ٹون، بنگلور۔۵۰۰۰۷۰

مکرمی شیخ صاحب

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔آج کل میں 'قلم، قلمکار اور کتاب' مقالہ پڑھ کر آپ کا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے۔ واقعی قابلِ صد ستائش و تحسین ہے۔ یہ انتہائی دل چسپ اور معلوماتی مضمون۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ دے۔

ناچیز بھی طنز و مزاح میں کچھ الٹا سیدھا لکھنے کا گنہگار ہے۔اپنی حقیر سی تخلیق 'درگت' بطور تحفہ

سادے ڈاک سے آپ کی خدمت اقدس میں ارسال کر رہا ہوں۔ اگر مل جائے اور خاکسار کی کوئی ادا پسند آجائے تو اپنے تاثرات سے ضرور نوازیئے گا۔

مخلص

ٹی۔این۔راز

ڈیر عبدالغنی شیخ صاحب

تسلیمات!

آپ کے تحقیقی مضامین کئی رسائل اور خاص طور پر ہمارا ادب (کلچرل اکاڈمی سرینگر) میں پڑھ چکا ہوں۔ آج شاعر (ممبئی ستمبر ۲۰۰۸ء) میں آپ کا بے حد محنت اور واقفیت سے پُر لکھا مضمون ''اردو میں ترجمہ، اہمیت اور مسائل'' پڑھا۔ جس عرق ریزی، ذہانت، یادداشت اور تحقیق سے یہ مضمون لکھا گیا ہے وہ نہایت قابلِ تحسین ہے۔ میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں کہ اردو میں نئی اور اہم کتابوں کے تراجم ہونے چاہئیں۔ آج کل اکثر لوگ سستی شہرت اور پیسوں کے لئے ٹی وی کی اور کھینچ گئے ہیں۔ اِن اہم مسائل کی اور، جو آپ نے اٹھائے ہیں بہت کم لوگوں کا دھیان جاتا ہے۔ ہم ایک ہی ریاست کے رہنے والے ہیں۔ میں ایک کشمیری پنڈت ہوں اور جلاوطنی میں قریب پندرہ سال سے پہلے ادھم پور اور اب جموں میں رہ رہا ہوں۔ اردو سے اُنس ہے اور اردو میں مضامین وغیرہ لکھتا آیا ہوں۔ اردو غزل مجھے بے حد پیاری اور اچھی لگتی ہے۔ اردو کے افسانے اب حقیقت پسندی کی اور آرہے ہیں۔ آپ تحقیق کا کام جاری رکھیں اور لداخ کے بارے میں مزید مضامین لکھیں۔

آپ کا خیر اندیش

ارجن دیو مجبور

جموں

۱۷ ستمبر ۲۰۰۸ء

محترم المقام جناب شیخ عبدالغنی صاحب

ہدیۂ عقیدت

مزاج گرامی موالخیر

حضرت۔ ماہنامہ شیرازہ جلد۴۴/شمارہ ۳/زیر مطالعہ ہے۔ آپ کا تاریخی نوعیت کا مضمون یا ''سفرنامہ'' بعنوان ''برطانوی ہند کی تبت اور چین میں ایک غیر معمولی مہم'' مطالعہ سے کیا گزرا کہ ذہن کے تمام تر درودریچے واہو کر رہ گئے۔ اس طرح کے تواریخی مواد یکجا کرنا ہر قلمکار کے بس میں نہیں ہے۔ آپ نے تاریخ لداخ ترتیب دی ہے، جو کہ ہنوز احقر کی نظر سے نہیں گزری ہے۔ انشااللہ بعد از تلاش کہیں نہ کہیں سے حاصل کر ہی لوں گا۔ میں تا اختتام ماہ فروری ۲۰۰۷ء جموں میں ہی قیام کروں گا۔ گر آپ اس دوران جموں میں تشریف فرما ہوئے تو براہِ کرم اطلاع دیں۔ مزید اہل کنبہ کی خدمت میں نہایت واجبات کے ساتھ سلام ودعا عرض ہے۔

والسلام

عُشاق کشتواڑی،

حال جموں

۸/دسمبر ۲۰۰۶ء

برادرم جناب عبدالغنی شیخ صاحب

اسلام علیکم

خیرت مطلوب خیریت موجود۔ جناب محمد حسن حسرت صاحب کی زبانی گزشتہ دو سالوں

سے مسلسل آپ کا تعارف سنتا آ رہا ہوں۔ ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آپ جیسے کہنہ مشق ادیب لداخ جیسے دورافتادہ علاقے میں علم وادب پھیلانے میں مصروفِ عمل ہے۔ آپ نے حسرت صاحب کے نام پر لداخ میلونگ کی جو کاپیاں ارسال کی تھیں وہ بھی دو دفعہ پڑھ کر ختم کر چکا ہوں۔ تمام مضامین معیاری تھے۔ خصوصاً بلتستان سے متعلق آپ کا مضمون بہت ہی تعمیری اور معلوماتی تھا۔ اُمید قوی ہے کہ آپ کے زورِ قلم سے علم وادب کو مزید فروغ ملے گا۔

حال ہی میں حسرت صاحب سے آپ کا ایک اہم مضمون ''دُنیا کے چند مشہور ترین ناول'' پڑھنے کو ملا۔ بہت ہی معیاری، معلوماتی اور دلچسپ تھا۔ اس حوالے سے میں آپ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ آپ اپنے خطے کی تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں ایک ناول ضرور لکھیں، بہت ہی اہم ادبی کام ثابت ہوگا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ ایک دوسرے سے دور ہیں اور مل بھی نہیں سکتے، اس کے باوجود احساسات میں حیران کُن حد تک ہم آہنگی ہے۔

آپ کی خدمت میں ''تاریخ بون فلسفہ'' کی ایک کاپی ارسال خدمت ہے۔ اس کی تقریب رونمائی اپریل ۱۹۹۷ء کے اوائل میں اسکردو میں ہوئی تھی۔ ہر باب کے متعلق وضاحت کرنا ضروری تھا مگر طوالت کے ڈر سے یہ کرنے سے قاصر ہوں۔ پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات سے آگاہ ضرور فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔ آپ کے تمام دوستوں خاص طور پر علم وادب پھیلانے والے ہم نواؤں کو سلام عرض کریں۔

فقط والسلام

غلام حسن لوبسانگ

گلگت گیٹ وے

گلگت

یکم اگست ۱۹۹۷ء

....

برادرم عبدالغنی شیخ صاحب

سلام ورحمت

ماہنامہ ''مستانہ جوگی'' کے مارچ کے شمارہ میں آپ کا تخلیق کردہ افسانہ ''اداکار'' فردوسِ نگاہ ہوا۔ اُن دنوں کی خوشگوار یادیں ذہن میں پھر چمک اٹھیں جب ۱۹۷۱ء کی لڑائی کے دوران ہمارا قیام سرینگر میں رہا تھا۔ آپ سے مدتوں خط وکتابت بھی رہی۔

''اداکار'' آپ کی حقیقت نگاری پر دال ہے۔ یہی دیکھ کر حد درجہ طمانیت ہوئی کہ آپ ابھی تک سرگرم تخلیق ہیں۔ ورنہ عمر کی تیکھی ڈھلان پر آکر لکھنے پڑھنے سے تعلق رفتہ رفتہ کم ہوتا جاتا ہے۔

میری ریٹائرمنٹ شملہ میں ۱۹۹۱ء کے مارچ میں ہوئی تھی، آخری بارہ برس بطور فیلڈ پبلسٹی آفیسر میرا قیام شملہ میں رہا۔ اس سے قبل دھرم سالہ اور پھر کوٹہ (راجستھان) میں پوسٹنگ رہی تھی۔

ریٹائرمنٹ کے تین برس بعد ہماچل سرکار نے اپنے بند پڑے اردو رسالہ سہ ماہی ''جدید فکروفن'' کو ازسرِ نو زندہ کرنے کی خدمت مجھے سونپی تھی اسے بطور مہمان مدیر گیارہ برسوں تک نبھایا اور اس کے ۴۱ رشمارے باقاعدگی سے نکالے۔ تنِ تنہا کام کرنا پڑتا تھا۔ ۲۰۰۵ء میں اس خدمت سے سبکدوش ہوگیا۔

آپ کے کیا مشاغل ہیں آجکل افسانہ نگاری کے علاوہ؟ امید ہے آپ کے بچے اچھی طرح سیٹل ہو چکے ہوں گے اور بلند عہدوں پر کاربردار ہوں گے۔ مجھے لگتا ہے آپ کا افسانہ ''مستانہ جوگی'' والوں نے کسی اور رسالہ سے ڈائجسٹ کیا ہوگا۔ بھٹناگر صاحب ایسے ہی کرتے ہیں۔ پھر بھی اُن کی ہمت قابلِ تحسین ہے کہ یہ رسالہ ۱۰۳ ربرسوں سے ان کا خاندان چلا رہا ہے۔ صرف ''رہنمائے تعلیم'' اور ''مستانہ جوگی'' ایسے جرائد رہے ہیں جنہوں نے ایک صدی سے زائد عمر پائی ہے۔ زیادہ نیک خواہشات۔

خلوص کار

ڈاکٹر شباب للت

۸ راپریل ۲۰۰۷ء

O

محترم عبدالغنی شیخ صاحب

سلام مسنون

آپ کا ۷؍اپریل کا تحریر کردہ خط ملا۔ بہت بہت شکریہ۔

بیسویں صدی میں، میں آپ کی کئی خوبصورت اور معلوماتی کہانیاں پڑھ چکی ہوں۔ آپ بے شک ایک منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ آپ کی ہر کہانی پڑھنے کے بعد بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں۔ مگر لکھ نہ سکی۔ آپ نے پہل کر دکھائی۔ آپ کا خط میرے لئے باعث حوصلہ افزائی ہے۔ اس میدان میں میری ابھی شروعات ہے۔ مجھے آپ کے تعاون اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ میرا تعلق ضلع راجوری کے ایک پسماندہ علاقے سے ہے۔ چند رسائل واخبار پڑھنے سے مجھے لکھنے کی تحریک ملی۔ آپ جیسے کرم فرماؤں کا تعاون رہا تو ممکن ہے اس میدان میں چند قدم آگے بڑھ جاؤں۔

آپ کے دوست امین بنجارا صاحب نہایت ہی اچھے اور مخلص بندے ہیں۔ میں ان کی شکرگزار ہوں کہ جن کے طفیل سے رابطہ ہوسکا۔ طاہر ندیم میرا لڑکا ہے۔ آج کل وہ جموں میں ایم ایڈ کے ایگزام کی تیاری میں مصروف ہے۔ آپ کبھی ہمارے ہاں آنے کی زحمت گوارہ کریں اور گزارش یہ بھی کہ ''کانچ کی سلاخ'' پر کچھ تفصیلاً لکھنے کی بھی زحمت اٹھائیں۔

والسلام

آپ کی شکرگزار

زنفر کھوکھر

۱۰؍مئی ۲۰۰۴ء

....

محترم عبدالغنی شیخ صاحب

آداب

آپ کا مضمون ''ہمارا نظامِ تعلیم۔اصلاح کا متقاضی'' اردو دُنیا کے شمارے میں پڑھا۔ایسے کار آمد، جامع اور معلوماتی مضمون کے لئے دلی مبارکباد۔ویسے آپ کا تعارف تو اس میں شامل نہیں ہو سکے تو آپ لکھ بھیجیں۔میں ایک افسانہ نگار ہوں۔میرے افسانے ملک کے متعدد رسالوں میں شائع ہوتے ہیں۔تازہ افسانہ ''سیکل''، ''سب رس'' (جون) میں شائع ہوا۔میں مضامین بھی لکھتی ہوں۔ویسے میرا میدان سائنس ہے۔آپ کے اور بھی مضامین شائع ہوئے ہوں گے۔کیا آپ ان کے بارے میں جانکاری دے سکتے ہیں۔لداخ تو ایک بہت دور دراز بستی؟ وہاں سے آپ اردو کی آبیاری کر رہے ہیں۔بہت فخر کی بات ہے۔

والسلام

سلمیٰ صنم

بنگلورو۔۵۶۰۰۲۱

۹ر اگست ۲۰۰۷ء

محترم

سلام ورحمت، مزاجِ گرامی

ستمبر ۲۰۱۲ء کا شمارہ ماہنامہ 'آجکل' بدست خاص ڈاکٹر ابرار رحمانی ایڈیٹر 'آجکل' نظر نواز ہوا۔آپ کا مضمون، 'اسلامی جمہوریہ ایران کا سفر' ایک تحقیقی مضمون کی شکل میں میرے مطالعہ میں رہا۔

اسلامی کلچرل بالخصوص امام خمینی پر ترتیب و تحریر کیا ہوا یہ مضمون نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ سپردِ قلم کیا گیا ہے اور اپنے بطن میں اسلامی جمہوریہ ایران کی سماجیات و سیاسیات وہاں کے کلچر، وہاں کے شرعی علماء کے فریضے اور مزید معلومات فراہم کر کے آپ نے بذریعہ ماہنامہ آجکل انڈین سامعین کی نذر کیں۔ بے حد پسند آیا آپ کا یہ مضمون۔ مبارکباد آپ کو۔ آپ کی دوسری تحریریں بالخصوص، میں پڑھنے کا منتظر ہوں۔ لداخ پر کوئی مضمون کہیں کسی پرچہ کے لئے تحریر کیا ہو اور شائع ہوا ہو تو اس کی زیراکس میں پڑھنا چاہتا ہوں۔

مزید یہ کہ لداخ میں اردو شعر و ادب کن منزلوں میں ہے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد ''تاشی ربگیاس'' نے علم و ادب کی شمع روشن کی تھی لداخ میں۔ لیہہ میں ہی غالباً ان کا قیام تھا۔۔۔ تاشی کی اردو ادب (شعر و نظم) میں کیا خدمات رہیں اور یہ کیا تاشی حیات ہیں۔۔۔؟

مختصراً کچھ تحریر کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔۔۔ کچھ بھی نہیں آپ کا موبائل نمبر بھی چاہتا ہوں، جس پر علمی، ادبی معلومات و بات چیت کا کوئی مختصر سلسلہ جڑے۔

تاشی کی تصنیفات و نظم و غزل کے چند شعر اردو ادب میں کوئی بڑا کارنامہ۔۔؟

میں منتظر ہوں مختصراً آپ کی تحریر کا۔ والسلام

بھائی آپ کا

صغیر اشرف

محترم عبدالغنی شیخ

آداب و نیاز

یقین کیجئے احقر کو آپ سے دلی عقیدت ہے۔ برسوں سے غایبانہ تعارف چل رہا ہے۔ اب تو برادرم اکبر حیدری بھی نہیں رہے۔ جنہوں نے غالباً پچیس برس قبل آپ کی بابت مجھے تفصیل کے

ساتھ آگاہ کیا تھا۔ ۱۹۹۴ء میں لہہ (لداخ) جانے کا اتفاق ہوا۔ خیال تھا کہ آپ سے ملاقات کرنے کا موقع دستیاب ہوگا۔ لیکن یہ حسرت دِل ہی میں رہ گئی۔ طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور مجھے ڈاکٹروں کے مشورہ کے تحت واپس آنا پڑا۔

ماہنامہ 'آج کل'، نئی دہلی میں آپ کا تحریر کردہ ادبی شاہ پارہ بہ عنوان ''قلم قلم کار اور کتاب'' باصرہ نواز ہوا۔ دل باغ باغ ہوا۔ اردو ادب میں اس قدر اچھوتا اور جاندار مضمون تحریر کرنا یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ٹھہرا۔ تینوں قسطوں کو پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ کس قدر وسیع و عمیق ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ اس کارآمد مضمون کو کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جاتا تو موزوں رہتا۔

سردست اپنے تیسرے افسانوی مجموعہ ''اندھا کنواں'' کی ایک جلد حاضر خدمت ہے۔ اس اُمید کے ساتھ کہ جناب اپنے قیمتی وگراں قدر خیالات سے نوازیں گے۔ تاکہ اپنے زیر کتابت مجموعے ''گردشِ دوراں'' میں شامل کرسکوں۔

وابستہ گاں کی خدمت میں آداب۔

نیازکیش

حسن ساہو

سرینگر۔۱۹۰۰۰۹

...... ●●● ......

عبدالغنی شیخ

مشاہیر کی نظر میں

☆...... عبدالغنی شیخ کے افسانے عوامی زندگی سے لئے گئے ہیں۔اس لئے ان کے یہاں مشاہدے کا حصہ تخیل اور تمثیل دونوں سے زیادہ ہے۔وہ آدرش واداور پند ونصائح سے گریز کرتے ہیں جن واقعات کو عام طور سے قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا،عبدالغنی شیخ ان میں بھی زندگی کی پیچیدگیوں اور نفسیاتی الجھنوں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔بعض مقامات پر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے چشم دید واقعات کو من وعن تحریر کی شکل دے دی ہے لیکن ایسی تحریروں میں بھی اخبارات کی رپورٹ کا رنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک دلنشیں اسلوبِ بیان ہوتا ہے جو قاری کے سامنے واقعات کی صحیح تصویر پیش کر دیتا ہے۔

☆......راشد سہسوانی

☆...... عبدالغنی شیخ کے تخلیق کردہ کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں اور جیتے جاگتے،صحت منداور توانا لگتے ہیں۔ وہ حالات کے نابینا غلام نہیں ہے اور سماج اور تہذیب کے بلند رتبوں تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔شیخ حقیقت نگاری کے قائل اور اپنے کرداروں کے احساسات،نفسیات اور ماحول سے خوب واقف ہیں۔عبدالغنی شیخ کو انسان کے خوش گوار مستقبل پر یقین ہے۔مایوسی، تلخی اور جارحانہ ذہنیت کی دلخراش جھلکیاں ان کی تحریروں میں نہیں ہیں۔ وہ بدنظمی، بے ضابطگی اور خلفشار سے گریز کرتے ہیں اور جہالت ،گمراہی اور رسمی باتوں کے خلاف ہیں۔

☆......علی باقر

☆ ...... ''دنیا کے مشہور ناولوں کی طرح اردو کے مشہور ترین ناولوں پر بھی تبصرہ ہو سکے تو اچھا ہے۔ عبدالغنی شیخ ہی یہ ذمہ داری قبول کرلیں۔''

☆ ...... پروفیسر شفیقہ فرحت

☆ ...... عبدالغنی شیخ صاحب لداخ کے سنگلاخ خطے میں شمعِ اردو فروزاں رکھے ہوئے ہیں اور وہ بھی کچھ ایسے کہ پتھریلی سرزمین پر شبنم کے قطروں کی مانند جھلملاتی نظر آیا کرتی ہے۔ اردو نہایت مشکل صورت حال سے نبرد آزما ہے اور کوئی دن میں دم توڑا چاہتی ہے۔ آپ کتنے بھی خوش آیند خواب بُن لیجئے مگر حقیقت یہی ہے۔ ایسے میں کوئی شیخ صاحب کی کتابیں پڑھے تو طبیعت مکدر نہیں ہوتی بلکہ ان کی محنت اور جانفشانی کی داد دینا پڑتی ہے۔ ہم نے شیخ صاحب کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔ بعض ہمیں پسند بھی آئیں۔ موضوعات ان کے اپنے ہیں۔ ہمارا معاملہ تو زبان کی بقا کے تصور سے ہے۔

☆ ...... ترنم ریاض

☆ ...... اردو کی جو شخصیات ریگزاروں میں بھی پھول کھلا دیتی ہیں ان میں جناب عبدالغنی شیخ کا نام بہت اہم ہے۔ تاریخی، علمی اور ادبی موضوعات پر میں نے ان کے کئی مضامین اور کتابیں پڑھی ہیں اور صدائے تحسین بلند کی ہے۔ اُردو دنیا اور اردو والوں کے لئے ایسی شخصیات بہت بڑا سرمایہ ہیں مگر شاید ہم جیسوں نے ان کی خاطر خواہ قدر نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود ان کے سرمایۂ افتخار ہونے کا احساس بیشتر دلوں میں موجود ہے۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔

☆ ...... شمیم طارق

☆ ...... عبدالغنی شیخ لداخی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موصوف نے پوری زندگی علم و ادب اور تحقیق و تالیف میں گزاری ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین اور افسانے ایک قاری کے لئے بیش بہا خزانہ ہیں۔ ان کا اسلوب نثر دلچسپ اور معلوماتی ہوتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شیخ صاحب نے لداخ کی نمائندگی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

☆ ...... وحشی سعید

☆ ...... لداخ، اردو اور عبدالغنی شیخ لداخی کی تثلیث جزوِ لاینفک ہے۔ لداخ سے متعلق اگر کسی طالب

علم کو زبان وادب، تہذیب وثقافت، سیاحت ومہم جوئی، سیاست وصحافت، رسم ورواج، عقائد وتصوّرات اور مذہبیات وتوہمات کا مطالعہ کرنا درپیش ہو تو اُسے لابدی طور پر عبدالغنی شیخ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ عبدالغنی شیخ، لداخ کے تعلق سے دائرۃ المعارف کا رتبہ رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت لداخ کے سفیر کی سی ہے۔ لداخ، اردو ادب اور عبدالغنی شیخ ایک ایسی مثلث ہے جو نہ صرف ایک دوسرے کا تعارف ہیں بلکہ شناخت کے حوالے سے بھی یہ باہمد گر لازم وملزوم ہیں۔

☆......پروفیسر محمد اسداللہ وانی

☆...... تخلیقی کام کرنے کے لیے تخلیہ یقیناً ضروری ہے۔ محترم عبدالغنی شیخ ایک ایسے مقام پر رہتے ہیں جو غیر ادبی ہے۔ کم از کم وہاں ادبی گہما گہمی کے نام پر مشاعرے، سمینار وغیرہ کے ذریعے اردو ادب کے ڈرامہ باز جمع ہو کر ہنگامے نہیں کرتے۔ اس طرح جناب شیخ کو بڑی یک سوئی کے ساتھ ادبی کارنامے انجام دینے میں کوئی حائل ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ لگاتار اپنے شاہکار سے اردو ادب کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کو بھی اپنی انفرادیت کا احساس کروا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں صحت وعافیت سے رکھے تاکہ یہ سلسلہ جاری رہے۔

☆......ڈاکٹر رؤف خیر

☆...... عبدالغنی شیخ اُردو دُنیا میں لیہہ لداخ کے ایک نیک انسان، قدردان، شریف النفس منفرد اور معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اُردو ادب میں اپنی ایک سے زاید فن کارانہ خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ اُن کی داستانِ زندگی کلفتوں اور راحتوں کی کہانی ہے۔ میں عبدالغنی شیخ صاحب کو ذاتی طور پر تب سے جانتی ہوں جب وہ سرینگر دوردرشن کیندر میں پروگرام کے لئے بلائے جاتے تھے۔ اس سے پہلے بھی میں اُن کی کہانیاں اور معلوماتی مضامین کئی سارے رسالوں، اخباروں اور جرائد میں پڑھ چکی ہوں اور متاثر بھی ہوئی ہوں کیونکہ اُن کی کہانیاں انسانی نفسیات اور زندگی کی کسی نہ کسی حقیقت یا سماج کے کسی نہ کسی پہلو کو بخوبی اُجاگر کرتی ہیں اور ان کی تحریروں میں کشادہ ذہنی، وسیع القلبی اور سنجیدہ فکری کی نمایاں خصوصیات بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے افسانے ہوں، تنقید یا تاریخی خاکے ہوں یا مضامین وہ نئے انداز اور نئے نئے زاویوں کے ساتھ اُردو کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔ گزشتہ کئی برسوں سے اُن

کی کہانیوں میں جو تنوع اور زندگی کی رنگا رنگی ہے وہ مقامی طور پر ادبی اور ثقافتی حلقوں میں ثابت ہو چکی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ اُن کی کئی درجن کہانیوں کا کئی زبانوں میں ترجمہ اور کچھ مضامین میٹرک کے نصاب میں شامل ہوئے ہیں۔

☆......واجدہ تبسم

☆...... عبدالغنی شیخ کے افسانوں میں تنوع اور زندگی کی رنگا رنگی ملتی ہے۔ ان کے کردار عام زندگی اور روزمرہ کے واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ یہ کردار جیتے جاگتے، صحت مند، توانا اور ذہن سے چپک کر رہ جانے والے ہیں۔ وہ قاری کو اپنی افسانوی تکنیک سے گرفت میں لے لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆......ڈاکٹر سید تنویر حسین

☆...... اسلام اور سائنس میں عبدالغنی نے بڑے دلنشیں انداز میں بتایا کہ موجودہ سائنسی تحقیق نے کس طرح قرآن مجید کے سوا چودہ سو سال قبل کے بیان کردہ حقائق کی تصدیق کی ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے جدید سائنس دانوں کے تجربات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف طلبا و اساتذہ کے لئے مفید ہے بلکہ ہر انسان کو قرآن میں غور و تدبر کی دعوت دیتی ہے، قرآن کریم کی سائنسی فکر کو روشن کرتی ہے اور دنیا میں عملی تجربات کے ساتھ معرفتِ الٰہی کے حصول کی نشاندہی کرتی ہے۔

☆......ابو عدیل

☆...... عبدالغنی شیخ اُردو کے ایک باوقار اور مستند ادیب، محقق اور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے لیہہ میں اُردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اُردو زبان سے ان کی محبت صرف زبانی نہیں بلکہ عملی ہے اور پیرانی سالی میں بھی ان کا قلم رواں ہے۔

☆......محمد عارف اقبال

☆...... عبدالغنی شیخ کی افسانہ نگاری میں تخیل سے زیادہ مشاہدے کا دخل ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں کے کردار عام زندگی سے لئے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جزئیات نگاری سے بہت مختصر کام لیا گیا ہے۔ جزئیات نگاری کا اختصار اور لفظی کفایت شعاری کسی کسی مقام پر گراں بھی گزرتی ہے۔ موضوعاتی تنوع اور فکری اور نظری بوقلمونی عبدالغنی شیخ کا اختصاص ہے۔ ان کی فکر فلسفے کے بوجھ

سے گراں بار نہیں ہوتی بلکہ زندگی اور انسان کے عام محسوسات اور ادراکات سے سروکار رکھتی ہے۔

☆......محمد مقیم

☆......عبدالغنی شیخ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ناول ہوں یا افسانے، تنقید ہو یا تحقیق ہر شعبے میں وہ اپنے عمیق ترین مطالعے کا عطر اس طرح چھڑکتے ہیں کہ ان کا قاری عالمی زبانوں کے ناولوں اور افسانوں کی طرح ان کے افسانوں سے بھی لطف اندوز ہو جاتا ہے۔

☆......افتخار امام صدیقی

☆...... 2009ء کے ستمبر مہینے میں ریاستی کلچرل اکادمی نے لداخ میں ایک آل سٹیٹ رائٹرس کیمپ کا انعقاد کیا تھا۔ اس کیمپ میں خاکسار کو کشمیری زبان کی نمائندگی کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کیمپ کی خاص بات یہ رہی کہ اس میں جناب عبدالغنی شیخ صاحب اردو زبان کی نمائندگی کیلئے چنے گئے تھے۔ چنانچہ مجھے شیخ صاحب کا غائبانہ تعارف ان کے ساتھ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین سے کماحقہ پہلے سے تھا جو وقتاً فوقتاً شیرازہ اور ہمارا ادب کی زینت ہوا کرتے تھے، لیکن مجھے یہ بالکل بھی معلوم نہ تھا کہ ان کا تعلق اس ارض وطن سے ہے جسے لداخ کہتے ہیں۔ اتنی ٹھیٹھ اور سلجھی ہوئی زبان کا استعمال اور وہ بھی ایک لداخی باشندے سے یہ میرے لئے اچھمبے کی بات تھی۔ بہرکیف یہ امر مسلم ہے کہ عبدالغنی شیخ صاحب لداخ سے ہی ہے اور وہ اردو زبان وادب کی ایک تاریخ ساز شخصیت ہے۔

☆......شاہد دلنوی

☆...... عبدالغنی شیخ کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ انہوں نے مختلف محاذ پر خود کو منوایا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، سیاست، سیاحت، ادب اور نہ جانے کیا کیا؟ کبھی وہ استاد ہیں تو کبھی صحافی، کبھی تاریخ داں تو کبھی ادیب۔ ان کے فن کو کسی ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک سوشل ایکٹی وِسٹ بھی ہیں اور خطۂ لداخ کے لیہہ میں خاصے مقبول اور محترم۔ ان سب سے بڑھ کر تمام مذاہب مثلاً اسلام، ہندوازم، بدھ ازم وغیرہ کے ماننے والوں میں یکساں قابلِ قبول بھی ہیں۔ ان کی شمولیت کے بغیر لیہہ کا کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔

☆......ڈاکٹر ظہیر انصاری

☆...... عبدالغنی شیخ صاحب ایک دور دراز اور پسماندہ علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی محنت

اور لگن کے بل پر ایسا مقام حاصل کر چکے ہیں کہ ان کو رول ماڈل بنایا جائے۔

☆......مصباحی شبیر

☆ ...... یادرفتگاں رسالہ آجکل کا معروف ترین کالم رہا ہے۔ ہمارے قارئین اس کالم کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے رہے ہیں۔ اور اگر کبھی کسی وجہ سے یہ کالم نہیں شائع ہوسکا تو اس کا مطالبہ پرزور طریقہ سے ہوتا۔'یادرفتگاں' کے تحت اس کالم میں عام طور پر قلم کار حضرات اپنی آپ بیتی مختصراً پیش کرتے تھے اور اپنی فن کاری کا مظاہرہ بھی۔ لیکن عبدالغنی شیخ نے یادرفتگاں کے تحت اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنادیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اپنی اس آپ بیتی کو انہوں نے اس انداز سے پیش کیا کہ وہ نہ صرف جگ بیتی بن گئی بلکہ اسے ایک تاریخ پارہ اور جغرافیائی اشارہ بنادیا۔ بلاشبہ شیخ صاحب کا یہ فن پارہ افسانہ نما معلوم ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر عبدالغنی شیخ افسانہ نگار ہیں۔

☆...... ابرار رحمانی

......●●●......

☆ اپنی نِگارشات صاف صاف اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

دنیا کے پچاس مشہور ترین ناول

ناول ادب کی ایک اہم ترین صنف ہے۔ خاص کر نثری ادب میں ناول سب سے زیادہ مقبول ہے اور سب سے زیادہ فروخت ہوتے ہیں۔ ادبی انعامات بھی زیادہ تر ناول کو ملتے ہیں۔ ناول کو پاکٹ تھیٹر یا جیبی نگار خانہ کہا گیا ہے۔

ایک معیاری اور کامیاب ناول حقائق کا مرقع اور اپنے دور کا ترجمان ہوتا ہے۔ انسانی جذبات، احساسات اور نفسیاتی باریکیوں کو اچھے ناولوں میں بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے اُجاگر کیا جاتا ہے۔

اتحادِ زماں Unity of Time اتحادِ مکاں Unity of Space اور اتحاد عمل Unity of Action ناول کی بنیادی ضرورت ہیں۔ اگر وقت، مقام اور عمل میں تضادات ہوں تو ناول میں بھی تضادات ہوں گے۔ جب ان میں ہم آہنگی ہو تو ناول میں تاثر ہوگا۔

پلاٹ، تکنیک، کہانی، کردار اور سٹائل ناول کے اجزا ہیں جن سے ناول کا خمیر تیار ہوتا ہے۔ کبھی ایک عنصر کا غلبہ ہوتا ہے، کبھی دوسرے کا۔ کچھ ناول نگار ایک ایسا کردار تخلیق کرتے ہیں جو ناول پر چھا جاتا ہے۔ کوئی منظر نگاری سے سماں باندھتا ہے۔ کوئی جذبات نگاری سے متاثر کرتا ہے۔ کوئی برمحل اور دلچسپ مکالموں سے ترسیل اور ابلاغ کا کام لیتا ہے۔

سامرسٹ مام اپنی کتاب The Ten Basic Novels of the World

میں رقم طراز ہے:

''ناول پڑھنے میں لطف بھی ہے۔ اگر ناول لطف سے عاری ہو تو بے کار ہے۔ اس کا نفسِ موضوع قبولیت عام کی خوبی رکھتا ہو۔ یہ نقاد، پروفیسر، دانش وریا برتن مانجھنے والے اور ٹرک ڈرائیور پر مشتمل کسی ایک ٹولہ کی دلچسپی تک محدود نہ ہو بلکہ ہر مرد اور عورت کے لئے اس میں دلچسپی کا سامان ہو۔''

عظیم ناول گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہوتے۔ علامت نگاری کے نام پر ابہام نہیں پایا جاتا۔ اوسط ذہن رکھنے والا ایک قاری بھی اسے سمجھ سکتا ہے لیکن یہ بات بھی نہیں کہ ناول کی کہانی روایتی داستان کی طرح سپاٹ انداز میں پیش کی گئی ہو۔ ناول نگاری کوئی داستان سرائی نہیں بلکہ فنی تخلیق ہے جو فن کار کی ذہانت، مشاہدات، تجربات اور فکر و نظر کی عکاسی کرتی ہے۔

ہمیسنگ وے لکھتا ہے:

''افسانہ نگار جس چیز سے متعلق لکھ رہا ہے، اگر اسے اس کا صحیح علم اور واقفیت ہے تو وہ آسانی سے ایسی چیزوں کو ترک کر سکتا ہے جو اس کے اور قاری کے تجربات میں مشترکہ ہیں۔''

اس کا اطلاق ایک ناول پر بھی ہوتا ہے۔

ایک نقاد لکھتا ہے:

''ناول نگار کو قاری کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست پہ شک نہیں کرنا چاہیئے اور اپنے تجربات کو قاری کے تجربات میں شامل کرنا چاہیئے۔''

ناول کی کہانی استعارتی، علامتی یا اشاراتی طور پر پیش کی گئی ہو، فرق نہیں پڑتا۔ جب تک یہ فنکارانہ انداز اور وحدتِ تاثر Unity of impression رکھتی ہو۔ کامیاب ادیبوں نے بندھے ٹکے فورم سے گریز کیا ہے اور چند ہندسوں، خاکوں یا لکیروں سے اپنی کہانی کی تفہیم قاری تک پہنچائی ہے۔

آج تجریدی آرٹ اور علامت نگاری کی آڑ میں اول جلول اور فضول چیزیں لکھی جاتی ہیں۔ شاید اس ضمن میں آئزک سنگر نے لکھا تھا:

''ہمارے پاس ایک کافکا تھا لیکن اب ہمارے پاس ہزاروں نقال ہیں۔
جو یہ سمجھتے ہیں کہ اول جلول لکھ دیں تو بس کافکا ہو گئے۔''

ادب پر نوبل انعام یافتہ یہ ادیب رقم طراز ہے:

''اگر میں صحیح قلم کار نہ ہوتا تو میں کوئی ایسا دھندا کرتا جو صاف ستھرا ہوتا۔
میں ٹھیلا چلاتا لیکن سلیقے سے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر
پہنچانے کا کام کرتا۔ اس ملک میں بھلا ایک ہی دھندا ہے کرنے کے لئے۔ اگر
دکاندار ہمیں باسی روٹی، خراب چیز یا پھٹا دودھ دے دیتا ہے تو ہم کچھ نہیں
کرتے۔''

ہم زیرِ نظر مضمون میں دنیا کے بلند پایہ قلم کاروں کے ۵۲ شاہکار اور عظیم ناولوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں اٹھائیس ناول بیسویں صدی، سترہ انیسویں صدی، چھ اٹھارویں صدی اور ایک سترہویں صدی میں لکھے گئے ہیں۔ ان تمام ناولوں کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ ان میں سولہ ناول نویسوں کو ادب کا نوبل پرائز ملا ہے۔ یہ ناول نگار انگلینڈ، امریکہ، فرانس، چیکوسلواکیہ، جرمن، آئرلینڈ، سکاٹ لینڈ، روس، اسپین اور لاطینی امریکہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان ناولوں کا سٹائل، طرزِ بیان اور تکنیک ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔ کسی نے کلاسیکل انداز میں لکھا ہے۔ اکثروں نے جدید فنی اسلوب کو اپنایا ہے۔ کسی نے اظہارِ خیال کے لئے تشبیہاتی، اشارتی اور علامتی اندازِ تحریر اختیار کیا ہے۔ کسی کا پلاٹ غیر مربوط ہے۔ کہیں فنطاسیہ کا عکس ہے۔ لیکن ایک خصوصیت ان سبھی ناولوں میں مشترکہ ہے۔ وہ یہ کہ ہر ناول میں ایک آفاقی اپیل ہے۔ ہر رنگ و نسل، زبان، تمدن اور علاقہ کے قارئین کے لئے بلا تفریق یہ جاذبیت اور کشش رکھتا ہے، کیونکہ یہ ناول انسان کی وہی ابدی کہانی سناتا ہے جو ازل سے چلتی آئی ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔

تاہم یہ امر پیشِ نظر رہے کہ ایک مشہور ناول کو بھی ہر لحاظ سے مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ سامرسٹ مام نے اپنے پسندیدہ دنیا کے دس بہترین ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح ایک ہیرے میں نقص ہوتا ہے، اسی طرح ایک بہترین ناول میں بھی نقص ہوسکتا ہے۔ ٹالسٹائی، دوستووسکی اور

چارلس ڈکنز جیسے مشہور قلم کاروں کی زبان میں سقم پایا جاتا ہے۔

ہم یہاں زیر تبصرہ ناولوں کی کہانی کا لب لباب پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین ناول کی تھیم، پلاٹ، تکنیک اور کرداروں سے روشناس ہوں۔ ایک ذہین قاری کہانی کا اختصار پڑھ کر ناول سے متعلق اپنی رائے اور نظریہ قائم کرسکتا ہے۔

(۱) Of Human Bondage سامرسٹ مام کا شاہکار ناول مانا جاتا ہے۔ ۹۴۰ صفحات کے اس ضخیم ناول میں مام نے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ یہ اس کے بچپن اور جوانی کی کہانی ہے۔ فلپ ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ بڑا احسن پرست ہے لیکن فیل پا کا شکار ہے۔ کم سنی میں ماں باپ کے سایہ سے محروم ہوا ہے اور اپنے جسمانی نقص کی وجہ سے لعن طعن اور نکتہ چینیوں کا شکار ہے۔ مل فریڈ سے اس کو دیوانگی کی حد تک محبت ہے۔ وہ ایک ریستوران میں کام کرتی ہے۔ فلپ ریستوران میں اس میز پر جا بیٹھتا ہے جس پر مل فریڈ سروس کرتی ہے۔ مل فریڈ اس کی کمزوری سے واقف ہے۔ ایک روز فلپ اس کی تصویر بنا کر چھوڑ جاتا ہے۔ وہ مل فریڈ کے ایک بوسے کا طالب ہے لیکن مل فریڈ اس سے محبت نہیں کرتی۔ اس کو ایک جرمن نوجوان ملر سے انس ہے۔ جب ملر اس کو طلاق دیتا ہے اور وہ حاملہ ہو کر فلپ کے پاس آتی ہے۔ تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔ اس کی خاطر چچا کے پاس اس کے لئے اپنے باپ کی رکھی ہوئی امانت کی رقم میں سے بے تحاشا روپیہ صرف کرتا ہے۔ وہ اسے گھومنے کے لئے پیرس لے جانے کا منصوبہ بناتا ہے۔ فلپ چاہتا ہے۔ کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ فرش پر اس کے دوزانوؤں کا ٹیک لے کر رہنے میں اسے گہرا سکون محسوس ہوتا ہے لیکن مل فریڈ ہرجائی ہے۔ وہ کسی اور کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ پھر وہ پیشہ کرتی ہے۔ فلپ اسے بچا کر لاتا ہے لیکن دوبارہ اس کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ وہ اس کے فیل پا کو نفرت بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

پھر اس کی زندگی میں سیلی آتی ہے۔ سیلی فلپ کو کہتی ہے کہ وہ اس سے اس دن سے پیار کر رہی تھی جب وہ پارک میں بھوکا سوتا تھا۔ وہ اس کی خاطر ایک وجیہہ انجینئر کو ٹھکرا دیتی ہے۔ سیلی نے کبھی اس کے فیل پا کی طرف دھیان نہیں دیا۔

ناول کا نام بے بسی کا مظہر ہے۔ مام کہتا ہے:

"انسان اپنے ماحول کا غلام ہے۔ اس کی خواہشات کی راہ میں بہت سارے کانٹے ہیں۔"

مام کا کردار فوراً نہیں کھلتا بلکہ اس کی شخصیت کی پیاز کے چھلکے اپنے رنگ میں پرت در پرت کھلتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔ ایک کردار شروع میں اچھا ہوتا ہے جو اس کے عمل اور باتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ آگے چل کر اس میں کمزوریاں آتی ہیں۔ آگے جا کر وہ پھر شرافت دکھاتا ہے۔ یہ ماحول کی دین ہے۔ مصنف خود نہیں کہتا کہ اچھا ہے یا برا۔

ہر باب کے اختتام پر مام قاری کے ذہن پر ایک ایسا تجسس چھوڑتا ہے کہ قاری بے ساختہ آگے کا حال جاننے کے لئے بے تاب ہوتا ہے اور آگے کا باب پڑھنے پر راغب ہوتا ہے۔

(۲) THE GOOD EARTH پرل بک کا شاہکار ناول ہے جو کمیونسٹوں کے اقتدار میں آنے سے پہلے کے چین کی سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے، جب چین میں زمین داروں اور جاگیر داروں کی بالادستی تھی۔ لڑکیوں کی خرید فروخت ہوتی تھی۔ امیر لوگ داشتائیں رکھتے تھے۔ فوج کی من مانی چلتی تھی۔ جب سوکھا پڑتا یا سیلاب آتا تو ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بنتے تھے۔ لاکھوں لوگ روزی کی تلاش میں مغربی چین ہجرت کرتے تھے۔ اس پسِ منظر میں ایک مفلوک الحال کنبے کے گرد اس ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ وانگ لونگ اس کنبے کا فرد اور ناول کا سب سے اہم کردار ہے۔ وانگ کا باپ کہتا ہے۔ خوبصورت لڑکی اس گھر میں نہیں آسکتی۔ ایسی لڑکیوں کو ہر وقت کپڑوں کا خیال رہتا ہے۔"

وانگ کہتا ہے "مجھے خوبصورت بیوی نہیں چاہئے۔"

پھر اس کی شادی معمولی شکل وصورت کی عورت اولان سے ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے وانگ پہلی مرتبہ نائی سے اپنا شیو کراتا ہے۔ تب وہ اپنے آپ سے کہتا ہے:

"بس، یہ میرا پہلا اور آخری شیو ہے۔"

وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پینے جاتا ہے۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر ایک بھکاری اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور وہ اس کو ایک پیسہ دیتا ہے۔

اولان کے لاشعور میں اپنی بدصورتی کا احساس رچا بسا ہے۔ بخار میں ہذیان کی حالت میں

کہتی ہے۔ ''میں جانتی ہوں کہ میں بدصورت ہوں۔ بڑے مالک کے سامنے نہیں آسکتی۔ مجھے نہیں مارو.....''

اس کے ماں باپ اسے ایک امیر آدمی کو فروخت کرتے ہیں لیکن بدصورتی کی وجہ سے امیر اور امیر زادے کی نظر اس پر نہیں پڑتی۔ پھر ایک مرحلہ آتا ہے۔ جب وانگ اور اولان اپنی محنت کی بدولت متمول بن جاتے ہیں۔ وانگ کے دل میں ایک خوبصورت عورت سے شادی کرنے کی خواہش چٹکی لیتی ہے۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی پاتا ہے۔ اس کی خاطر خوشبودار صابن سے غسل کرتا ہے۔ لہسن کھانا چھوڑتا ہے۔ اور اپنی چٹیا کاٹتا ہے۔

اولان بیمار ہو جاتی ہے۔ وانگ ڈاکٹر لاتا ہے۔ لالچی ڈاکٹر ایک دم فیس بڑھا کر پانچ سو روپے مانگتا ہے۔ تب اولان کہتی ہے۔

''میری زندگی کی اتنی قیمت نہیں ہے۔ اس رقم سے تو زمین کا ایک اچھا ٹکڑا خریدا جاسکتا ہے۔''

وانگ اس کا دل رکھنے کے لئے کہتا ہے۔ ''اگر تم ٹھیک ہو جاؤ گی، تو میں ساری زمین بیچ دوں گا۔''

''میں تمہیں ایسا کرنے نہیں دوں گی۔'' وہ مسکرا کر کہتی ہے۔

ناول کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنفہ نے انسان کے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا ہے۔ کہیں بھی مبالغہ آرائی کا گمان نہیں ہوتا۔

کمیونسٹوں اور کومنتنگ فوجوں کی لمبی جنگ کے تذکرے نے ناول کو ایک نیا Touch دیا ہے۔ پرل بک کو اپنے کرداروں کے لئے ہمدردی یا نفرت پیدا کرنے یا ملا جلا ردعمل پیدا کرنے کا فن خوب آتا ہے۔

ناول نگاری کے میدان میں متعدد خواتین نے اپنا بلند مقام بنایا ہے۔ امریکی مصنفہ پرل بک کی طرح ورجینیا وولف بھی ایک بلند پایہ خاتون ناول نگار ہیں۔ اپنے سب سے مشہور ناول To The Light House سے متعلق وہ لکھتی ہے:

''یہ میری بہترین تصنیف ہے..... اب میرے اسلوب میں پختگی آئی ہے۔''

یہ ناول پہلی دفعہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔

(۳) To The Light House ورجینیا کی اپنی کہانی ہے۔ صرف کرداروں کے نام بدل دیے گئے ہیں۔ وہ اپنی کم سنی کا ذکر کرتی ہے۔ جب اس کے ماں باپ زندہ تھے۔ ماں ایک روز باپ سے کہتی ہے کہ وہ کل اپنے بچوں کو کشتی میں لائٹ ہاؤس (روشنی کا مینار) دکھانے لے جائے گی۔ باپ جواب میں کہتا ہے۔ ہوا کا رُخ بتاتا ہے کہ کل موسم خراب رہے گا۔ یہ سن کر ننھی ورجینیا اور اس کا بھائی جیمز اداس ہو جاتے ہیں۔ ان کے گھر میں بڑا سکون ہے۔ زندگی بڑی خوبصورتی سے گزر رہی ہے۔ گھر میں کچھ مہمان آئے ہیں۔ ننھی ورجینیا مشاہدہ کرتی ہے کہ رات کو ماں اور باپ ڈرائنگ روم میں پاس پاس بیٹھے پڑھ رہے ہیں اور درمیان میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ یہ اس بات کا ضامن ہے کہ ان کی محبت قائم دائم ہے۔ ننھی ورجینیا نے ایسی بہت ساری خوبصورت راتیں دیکھی ہیں۔ ایک روز ماں اچانک انہیں چھوڑ کر اس دنیا سے چلی جاتی ہے اور ان کی خوشگوار زندگی میں اداسی کی گہری پرچھائیاں آتی ہیں۔ دوسری صبح اندھیرے منہ باپ غیر شعوری طور پر اپنی دونوں بانہیں پھیلاتا ہے لیکن وہ بانہیں خالی لوٹ آتی ہیں۔ ماں پچھلی رات وہاں چلی گئی ہے جہاں سے کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔

ورجینیا اب سترہ سال کی ہے۔ اس کا بھائی جیمز سولہ سال کا ہے۔ دونوں اپنے باپ کے ساتھ لائٹ ہاؤس دیکھنے جاتے ہیں۔ جیمز کو وہ دن یاد آتا ہے۔ جب ایک روز ماں نے کہا تھا کہ بچوں کو لائٹ ہاؤس دکھانے لے جائے گی اور باپ نے جواب میں کہا تھا کہ موسم خراب ہوگا۔

اس سیدھی سادی کہانی میں مصنفہ نے زندگی کی بے ثباتی اور ایک خاندان کی خوشیوں اور غموں کا نقشہ کھینچا ہے جو ہر ایک کے مقدر میں لکھی ہوتی ہیں۔

(۴) The Heart Of The Matter گراہم گرین کا سب سے مشہور ناول ہے۔ یہ ناول ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا۔ یہ ناول کسی اہم تاریخی واقعہ پر مبنی نہیں ہے اور نہ کوئی خاص کہانی ہے۔ ایک منجھے ہوئے قلم کار کو سنسنی خیز واقعہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

گراہم گرین کی تکنیک اور اسلوب نگارش میں ندرت اور جدت ہے۔ پلاٹ مربوط ہے۔ کہانی کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ کردار خود ہی اپنے مکالمے اور عمل سے بتاتے ہیں کہ وہ کس قسم کے آدمی

ہیں۔ گراہم گرین کا قلم بڑی چابکدستی سے کرداروں کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرتا ہے اور واقعات کا تانا بانا بُنتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں مطلب کی بات کرتا ہے۔

انگلز لکھتا ہے:

''مصنف کے سماجی اور سیاسی خیالات جتنے چھپے ہوں گے، فن اتنا ہی لطیف ہوگا۔''

مصنف نے ہر بات مختصر رکھا ہے اور قاری بوریت محسوس نہیں کرتا۔ ناول پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں کلی طور پر مطمئن نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی سراپا غم اور سراپا خوشی نہیں ہوتی۔ دولت، محبت اور اقتدار کی خاطر وہ اخلاق اور شرافت کو خیر باد کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بھلائی بھی کرتا ہے لیکن اس کے پسِ پشت ذاتی غرض بھی ہوتی ہے۔

ناول کا اہم ترین کردار میجر سکوبی ہے۔ وہ پولیس ڈپٹی کمشنر ہے۔ ڈیوٹی کا بڑا پابند ہے۔ رشوت نہیں لیتا لیکن خوبصورت عورت کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکتا ہے اور اس کی قربت چاہتا ہے۔ اس کی بیوی لوسی شاعری کرتی ہے۔ وہ اپنے حلقہ میں دانشور سمجھی جاتی ہے۔ لوسی کٹر مذہبی ہے۔ اپنے شوہر کو کمشنر کے عہدے پر فایز دیکھنا چاہتی ہے۔ تاکہ کلب میں عورتوں کی نظروں میں اس کی قدر و منزلت بڑھے لیکن سکوبی کو ترقی کی لالچ نہیں ہے۔

ناول میں منظر نگاری کے دلچسپ نمونے ملتے ہیں۔ کمرے کی دیواروں پر چھپکلی آتی رہتی ہے اور چیونٹی کھاتی ہے۔ ٹین کی چھت پر گدھ اپنے پروں کو پھڑ پھڑاتا ہے۔

(۵) The Great Gatsby ایف سکاٹ فیز جیرلڈ کا سب سے مشہور ناول سمجھا جاتا ہے۔ مصنف نے زندگی کے چند بکھرے ہوئے واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ کہانی بڑی عمدگی سے Construct کی گئی ہے۔ مکالمے بڑے تیکھے اور برمحل ہیں۔ عمل میں توازن ہے۔ فیز جیرلڈ پہلی ملاقات میں کسی اجنبی کردار کا ضمنی یا سرسری ذکر کرتا ہے لیکن دوسری ملاقات میں جب ضرورت پڑتی ہے تو اس کی شکل اور وضع قطع کا تذکرہ کرتا ہے۔ ماحول بڑا فطری ہوتا ہے۔ مجلس سے ایک کردار اُٹھ کر باہر چلا جاتا ہے۔ یک لخت گفتگو کا موضوع بدل جاتا ہے۔ جب وہ کردار واپس آتا

ہے تو گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

The Great Gatsby بنیادی طور پر ایک رومانی ناول ہے لیکن عام رومانی ناولوں سے مختلف ہے۔ گیٹس بے ناول کا مرکزی کردار ہے جس کی عالیشان کوٹھی میں وقتاً فوقتاً پارٹیاں دی جاتی ہیں۔ گیٹس بے بڑا پُر اسرار کریکٹر ہے۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ میزبان اکثر مہمانوں کو نہیں جانتا اور نہ مہمان میزبان کو جانتے ہیں۔

کوئی گیٹس بے کو جرمنی کے قیصر ولیم کا بھتیجا سمجھتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو یورپ کے شاہی خاندان کا چشم و چراغ قرار دیتے ہیں۔ کچھ اس کو جرمنی کا جاسوس سمجھتے ہیں۔ تاہم سبھی اس کی ضیافتوں کا لطف لیتے ہیں۔

پارٹیوں پر اس کی عالشیان کوٹھی بقعہ نور بن جاتی ہے۔ لیکن رنگ و نور کی اس بھری محفل میں گیٹس بے کی نگاہیں کسی کو تلاش کرتی ہیں۔ بڑے پر اسرار انداز میں یہ بات کھلتی ہے کہ وہ اپنی محبوبہ ڈیزی کے لئے گم سم اور پریشان ہے۔ ڈیزی کی شادی کسی اور سے ہو چکی ہوتی ہے۔ گیٹس بے اسے بھولا نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے۔ کہ وہ پارٹیاں محض ڈیزی کی خاطر دے رہا ہے۔

(۶) لاطنی امریکہ کے نوبل پرائز یافتہ ادیب گبرائیل گرسیا مارکوئیز کا ناول A Hundred Year Of Solitude عالمی شہرت کے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۳۳۵ صفات پر مشتمل ناول کا ہر صفحہ ایکشن سے بھرا ہوا ہے۔

چند مہم جو لوگ امریکہ کے ایک جنگل میں ایک بستی بساتے ہیں وہ اس بستی کا نام میکونڈر رکھتے ہیں۔ یہ ان کے لئے ایک نئی اور خوبصورت دنیا ہوتی ہے۔ اپنا خون پسینہ دے کر تنکا تنکا جمع کر کے وہ یہاں اپنا آشیانہ بناتے ہیں۔ اپنی رسم، ریت اور اپنی ثقافت کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں جو ان کو بہت عزیز ہیں۔ لیکن اس بستی میں نئے حاکم آتے ہیں اور نئے قوانین نافذ کرتے ہیں۔ بستی کے لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے خون خرابہ ہوتا ہے۔

بستی میں سائنس کی نئی ایجادات پہنچتی ہیں اور لوگوں کی زندگی میں تبدیلیاں آتی ہیں۔

کہیں کہیں انسانی جذبات کی دلنشین عکاسی سے شادی کا گماں ہوتا ہے۔ جب کسی مجرم کو

فائرنگ سکاڈ کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے اور مرنے والے کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بیان دل پذیر انداز میں کیا گیا ہے اور آنکھوں کے سامنے اس کا ہو بہو نقشہ ابھرتا ہے۔

انسانی مزاج کی رنگا رنگیوں اور افتادِ طبع کی نیرنگوں کو حقائق کے آئینے میں بڑے دلکش اور موثر انداز میں دکھایا گیا ہے۔ ایک عورت کسی مرد پر مرمٹتی ہے۔ خوف اور رشک وحسد کے مرحلوں سے گزرتی ہے۔ یہی عورت بعد میں اس مرد کو نفرت سے ٹھکرا دیتی ہے۔

ناول کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان گنت واقعات اور سانحات کو چھوٹے چھوٹے پیراگرافوں میں ختم کیا ہے۔ کبھی کبھی واقعات کی کڑی ٹوٹ جاتی ہے اور آگے جا کر جڑ جاتی ہے۔

ناول کی شروعات اس کے اہم ترین کیر کٹر کرنل ارے لیانو بوئیزک کی موت کے ذکر سے ہوتا ہے۔ بہت سال بعد جب کرنل کو فائرنگ سکاڈ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ کرنل کا ہی خاندان تھا جس نے یہ بستی بسائی۔

(۷) The Grapes Of Wrath امریکی نامور ادیب جان سیٹن بک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۹ء میں نکلا۔ یہ ناول امریکہ کے ایک بڑے حصے کے اس دور کے سماج کی عکاسی کرتا ہے جب نو آباد کار بڑے بڑے زمینداروں اور سرکاری افسروں کے استحصال کے شکار تھے۔ زمینداروں کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین تھی جبکہ کاشت کار اور نو آباد کار زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے لئے ترستے تھے۔ ٹریکٹر لانے سے بہت سارے کاشت کار بے کار ہو گئے تھے۔

چنانچہ ہزاروں لاکھوں لوگ کنساس، اوکلاہما، ٹیکساس، ناوادا، میکسیکو وغیرہ چھوڑ کر بہتر اور نئی جگہوں کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ ان میں اکثروں کی منزل کیلی فورنیا ہے۔ راستے کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد جب یہ لوگ منزل پر پہنچتے ہیں تو وہاں بھی چین اور سکون نہیں ملتا۔ گھر چھوڑنے والوں میں جوڈ خاندان بھی ہے جس کے محور پر ناول کی کہانی گھومتی ہے۔ اس خاندان کا بزرگ ٹام جوڈ ہے اور 'پا' کہلاتا ہے۔ اس کی اولاد میں ٹام ناول کا سب سے نمایاں کردار ہے۔ ٹام کی ماں بڑی باہمت، رحم دل اور عملی خاتون ہیں۔

راستے میں سفر کے دوران نت نئی مشکلات پیش آتی ہیں۔ چوریاں ہوتی ہیں۔۔۔ ''تم نے

کل دودھ کی بوتل چُرائی ؟''

''ہاں ! بچے بھوکے تھے۔''

''تانبے کی تار چرائی اور گوشت خریدا؟''

''ہاں ! بچے بھوکے تھے۔۔''

کیلی فورنیا سے آگے ایک صحرا کے کنارے ان کے پاس ایک پولیس افسر آتا ہے اور انھیں صبح سویرے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیتا ہے۔اس انخلا پر وہ احتجاج کرتے ہیں۔

''ہم غیر ملکی نہیں۔ سات پشتوں سے امریکہ میں آباد ہیں۔''

پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے۔ جب جوڈ خاندان کے پاس جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے اور یہ لوگ سنگترے چننے اور پیٹیوں میں ڈالنے کا کام کرتے ہیں۔ایک جگہ ٹام کی ماں کہتی ہے۔''اگر تمہیں تکلیف ہو یا کسی چیز کی حاجت ہو تو غریبوں کے پاس جاؤ۔صرف یہی لوگ مدد کریں گے۔صرف یہی لوگ۔''

جو لوگ اسمبلی اور کانگریس کے ممبروں کو رشوت دیتے تھے، وہ جیل سے بچ جاتے تھے۔

ایک جگہ مصنف کہتا ہے:''حکومت زندوں کے مقابلے میں مرے ہوئے آدمی میں دلچسپی لیتی ہے۔''

(۸) Gone With The Wind کو دنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ناول بتایا گیا ہے۔ مارگرٹ میچل کا یہ ناول حقیقت نگاری اور جذبات نگاری کا دلچسپ نمونہ ہے۔ایک ہزار سے زیادہ صفحات کے بڑی تقطیع والے اس ضخیم ناول کا تقریباً ہر صفحہ دلچسپ ہے۔

۱۸۶۱ء میں ابراہم لنکن کی قیادت میں شمالی اور جنوبی امریکہ کے مابین اتحاد قائم رکھنے کے لئے لڑی گئی جنگ کے پسِ منظر میں یہ ناول لکھا گیا ہے۔ مصنفہ نے ناول میں شمال اور جنوب کی جنگ آزمائی سے بالاتر ہو کر مسائل اور معائب کو ابھارا ہے اور آنکھوں کے سامنے جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کی پوری تصویر آتی ہے۔

توپوں کی گھن گرج، زخمیوں کی چیخ و پکار، آنسو، آہیں، ایمبولنسوں کا شور، افواہیں، لوگوں کا فرار، عزیزوں کی گم شدگی، لوٹ مار، فوجیوں کی پسپائی، طوائفوں کی آمد، فاتح اور مفتوح فوجوں کی نقل و

حرکت وغیرہ کی ناول میں حقیقی تصویریں ملتی ہیں۔

اس بھیانک جنگ کے پہلو میں رومان کی اچھوتی کہانی چلتی ہے۔ ایک جگہ ایک لڑکی سکرلیٹ کہتی ہے۔ ''جنگ مردوں کا دردسر ہے۔ عورتوں کا نہیں۔ دوبارہ جنگ کی بات کی تو میں چلی جاؤں گی۔''

ناول میں مقام کی بڑی اہمیت ہے۔ اٹلنٹا جنگی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ تارا نام کی جگہ فاتح فوج کی نقل وحرکت کو پیش کرتی ہے۔ ٹوئیل اوکس میں کئی رومان جنم لیتے ہیں۔

ناول میں کئی مرتبہ واقعات ایسا موڑ لیتے ہیں کہ قاری کا تجسّس بڑھتا ہے اور انجام جاننے کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ ناول کے کردار بھی قارئین کی طرح سسپنس کے شکار ہیں۔ مصنفہ کو تجسّس ختم کرنے میں کوئی جلدی نہیں ہے۔ ایک رات اٹلنٹا میں زبردست دھماکے ہوتے ہیں اور شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ سکرلیٹ سوچتی ہے۔ یہ دشمن کا کام ہے یا اپنے آدمی اٹلنٹا کو جلا رہے ہیں۔ بہت آگے جا کر یہ انکشاف ہوتا ہے۔ کہ گولہ بارود کے ذخیروں کو دشمن کے ہاتھ لگنے سے پہلے نذرِ آتش کیا گیا ہے۔

(۹) لیوٹالسٹائی کا ناول War and Peace دنیا کے مشہور ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ مام نے لکھا ہے: ''میرا خیال ہے کہ بالزاک عظیم ترین ناول نگار ہے، جسے دنیا جانتی ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ War and Peace دنیا کا عظیم ترین ناول ہے..... اس ضخیم ناول میں سو کردار ہیں۔ ہر کردار کی اپنی انفرادیت ہے۔''

ناول کا تھیم انیسویں صدی کے روس کے معاشرہ کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی صدی کے آغاز میں نپولین بوناپارٹ روس پر یلغار کرتا ہے۔ روس کی راجدھانی پیٹرزبرگ میں اینا پاؤلینا کے گھر پر روس کے اعلیٰ طبقے کے افراد ایک ضیافت پر جمع ہیں۔ ان میں شاہزادہ اندرے اور ناول کا اہم کردار پیری ہیں۔ مہمانوں کا موضوعِ گفتگو نپولین ہے۔ پیری کا مطمحِ نظر دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ نپولین کی تعریف کرتا ہے۔ مہمان اس کی بات پسند نہیں کرتے۔ شہزادہ اندرے وجیہہ نوجوان ہے۔ شہزادے کی نو بیاہتا بیوی چھوٹی شہزادی سب کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کی دلکش ادا اور من موہنی مسکراہٹ سب کے دلوں

کو چھوتی ہے۔ شاہزادی کو جنگ کی بات بالکل پسند نہیں۔ گھر لوٹتے ہوئے اندرے، پیری سے اپنے محاذ پر روانگی کی بات کرتا ہے۔ یہ سن کر چھوٹی شہزادی پر بجلی سی گرتی ہے۔ ''وہ اپنی ہی سوچتا ہے۔ صرف اپنی ہی سوچتا ہے۔ دوسرے پر کیا گزرتی ہے۔ نہیں جانتا۔''

جب شہزادی بار بار یہی بات کہتی ہے تو اندرے ڈپٹتا ہے اور شاہزادی خاموش ہو جاتی ہے۔

جب اندرے اپنے باپ سے جو روسی فوج کا سربراہ رہ چکا ہے، لام پر جانے سے پہلے اجازت لیتا ہے تو باپ اپنے اکلوتے بیٹے سے کہتا ہے۔ ''جنگ میں شجاعت کا مظاہرہ کرنا اور بزدلی نہیں دکھانا۔ فرض سب سے مقدم ہے۔'' باپ کے لہجے میں تحکم ہے۔

دوسری صبح شہزادہ محاذ پر چلا جاتا ہے اور غم سے نڈھال شہزادی بے ہوش ہو جاتی ہے۔

۱۸۰۵ء میں جنگ شروع ہوتی ہے۔ ٹالسٹائی کا زرخیز دماغ اور زورِ قلم اب ہمیں پیار و محبت کے ماحول سے میدان جنگ لے جاتا ہے۔ فوج کا کمانڈر اِن چیف کوٹازون میدان جنگ کا معائنہ کر رہا ہے۔ دشمن کا ٹڈی دل لشکر نیلی وردیوں میں نمودار ہوتا ہے۔ شاہزادہ اندرے جنگ شروع ہونے سے پہلے چند سپاہیوں کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا تو کبھی مرنے سے نہیں ڈرتے۔

جنگ کا منظر روح فرسا ہے۔ فرانسیسی فوجوں کے ایک پُر زور حملے سے روسی سپاہیوں میں بھگدڑ مچتی ہے اور راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ جرنیل کوٹازون اور اندرے بھاگتے ہوئے سپاہیوں کو روک نہیں پاتے۔ شہزادہ روسی پرچم اپنے ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتا ہے اور دشمن پر پل پڑتا ہے۔ شہزادہ بڑی شجاعت کا مظاہرہ کرتا ہوا زخمی ہو کر گر جاتا ہے۔ شاہزادہ کی آنکھوں کے سامنے ساری زندگی سمٹ آتی ہے۔ وہ نیلے آسمان کی طرف تاکتا ہے۔ تب وہ سوچتا ہے۔ آکاش کتنا اونچا اور بے کراں ہے۔ زندگی کتنی پیاری اور خوبصورت ہے۔ اندرے موت کے منہ سے بچ کر آتا ہے۔ شاہزادی زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے۔ شاہزادہ اس کا بوسہ لیتا ہے۔ شاہزادی اپنے شوہر کو نہیں پہچانتی اور چل بستی ہے۔

نپولین کی فوج پیش قدمی کرتی ہے۔ روسی فوج اور زار ماسکو سے فرار ہوتے ہیں۔ نپولین میدانِ جنگ کا معائنہ کرتا ہے۔ اس کے بیس جرنیل مارے گئے یا زخمی ہوئے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے

اس کے دل میں جنگ سے نفرت اور پشیمانی ہوتی ہے لیکن دوسرے لمحہ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔

شاہزادہ اندرے دوبارہ زخمی ہوتا ہے اور اس دفعہ جانبر نہیں ہوتا۔ پیری ایک لڑکی کو بچاتے ہوئے فرانسیسی فوج کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے۔ ناول ذہن پر ایک امٹ نقشہ چھوڑتا ہے۔

ٹالسٹائی ایک بڑا زمیندار تھا۔ اس نے فوج میں ساڑھے چار سال خدمات سرانجام دی تھیں۔ ٹالسٹائی کی چھوٹی نند تانیا نے ناول کی ہیروئین نتاشا کی دلی کیفیت کی تصویر کشی پر حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے مصنف سے کہا۔ ''زمینداروں، جرنیلوں سپاہیوں اور بچوں کے باپ سے متعلق آپ نے ناول میں جس صلاحیت سے لکھا ہے' وہ تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن ایک لڑکی کے دل میں چھپی ہوئی محبت کو آپ نے جس طرح ٹھیک ٹھیک سمجھا ہے' میں یہ سمجھ نہیں سکی ہوں۔''

(۱۰) جین آسٹین کے مقبول ناول Pride and Prejudice (مطبوعہ ۱۸۱۲ء) پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ اٹھارویں صدی کے انگلستان کا ماحول اور معاشرہ ہمارے ماحول اور معاشرہ سے مختلف نہیں ہے۔ مائیں اپنی بیٹیوں کی شادی کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ ان کی نظریں متمول گھرانوں کے جوانوں پر ہوتی ہیں۔ خاندانی وقار اور حسب ونسب کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مسز بیسنیٹ کی پانچ لڑکیاں ہیں۔ پڑوس میں ایک نوجوان آتا ہے۔ مسٹر اور مسز بیسینٹ باتیں کرتے ہیں کہ کیونکر ایک لڑکی کی شادی اس نوجوان سے ہو جائے۔

جین آسٹین بتدریج واقعات سے پردہ اٹھاتی ہے۔ کردار ابھرتے ہیں۔ جہاں جہاں مصنفہ کو کوئی اہم واقعہ بیان کرنا ہو تو کسی کردار کو جنم دیتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو جہاں ضرورت ہو' بھیج دیتی ہے۔

وہ لمبے اور چھوٹے خطوط کے ذریعہ بھی حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے۔ اس کی تحریر میں مزاح ہے۔

تین بیٹیوں کی شادی ہوتی ہے۔ تب مسٹر بیسنیٹ کہتا ہے۔

''میری بیٹیو! اب کیٹی اور میری کے لئے کسی کو میرے پاس بھیج دو۔ میں بالکل فارغ ہوں۔''

(۱۱) اٹھارویں صدی کے دوران لکھا گیا ایک اور انگریزی ناول The Vicar Of Wakefield (پہلا ایڈیشن ۱۷۶۶ء) نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اس کے مصنف آلیور گولڈ سمتھ نے ایک روز

مکان مالکن کے کرایہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ناول کے مسودے کو ساٹھ پاؤنڈ میں ایک پبلشر کو فروخت کیا۔

ناول کا مرکزی کردار فادر Primrose ہے۔ ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ فادر محبّ الوطن، دیانت دار اور نیک انسان ہیں۔ ان کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار ہے۔ لیکن ایک روز ایک حادثے کے بعد فادر کو اپنا گھر خیر باد کرنا پڑتا ہے اور ایک دور افتادہ گاؤں میں اپنے بچوں کے ساتھ بستے ہیں۔ نئے ماحول میں نئے لوگوں سے ان کے تعلقات ہوتے ہیں۔ ان میں ایک Burchell ہے۔ وہ لگ بھگ تیس سال کی عمر کا ایک بڑا شائستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان ہے۔ دوسرا نوجوان مالک مکان Thornhill ہے فادر کی حسین بیٹی صوفیہ برچیل کی طرف مائل ہوتی ہے، اور تھورن ہل دوسری خوبصورت بیٹی اولیویا میں دلچسپی لیتا ہے لیکن تھورن ہل شادی کے لئے سنجیدہ نہیں ہے۔ فادر کی جہاں دیدہ نگاہیں تھورن ہل کی بری نیت کو تاڑ لیتی ہیں۔

ایک روز تھورن ہل کے ایما پر دو آدمی اولیویا کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ فادر اپنی ستم رسیدہ بیٹی کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سر راہ واقع ایک مکان میں اولیویا کو پا لیتے ہیں۔ وہ بیمار ہے۔ ادھر ایک معمولی واقعہ کے بعد صوفیہ اور برچیل کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب مصیبتیں آتی ہیں تو ایک ساتھ آتی ہیں۔ کرایہ ادا نہ کرنے کی پاداش میں سنگِ دل مالک مکان فادر کو جیل بھجواتا ہے۔ فادر کا بیٹا جارج اپنی بہن، کے ایک اغوا کنندہ پر حملہ کر کے اسے گھائل کرتا ہے اور اس جرم میں اس کو جیل خانہ بھیجا جاتا ہے۔ فادر بھی اسی جیل خانہ میں قید ہیں۔

فادر Primrose کے خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے لیکن مصیبتیں یہاں ختم نہیں ہوتیں۔ پھر یہ الم ناک خبر آتی ہے۔ کہ بیمار اولیویا چل بسی ہے اور دوسری بیٹی صوفیہ کا اغوا ہوا ہے۔ مصائب اور حزن وملال کے اس منجھدار میں بردبار، صابر اور نیک دل فادر جیل خانے میں قیدیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔

پھر حالات اچانک پلٹا کھاتے ہیں۔ برچیل پہلے جارج کو اپنے اثر ورسوخ سے رہا کراتا ہے۔ برچیل اصل میں تھورن ہل کا چچا سر ولیم تھورن ہل ہوتا ہے۔ اولیویا کی موت کی خبر غلط ثابت ہوتی

ہے۔ پھر برچیل صوفیہ کو اغوا کرنے والوں کے پنجے سے چھڑاتا ہے۔ جارج اپنی محبوبہ ارابیلا کو پالیتا ہے۔ سر ولیم تھورن ہل کی شادی اولیویا سے ہوتی ہے۔ مالک مکان تھورن ہل اور صوفیہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں۔ غالباً تھورن ہل راہ راست پر آیا ہے۔ صوفیہ کو تھورن ہل کی جائیداد کا ایک تہائی حصہ دیا جاتا ہے۔ ادھر فادر کو اپنی جائیداد کا بڑا حصہ واپس ملتا ہے جو ایک تاجر نے خرد برد کی ہوئی ہے۔ جس طرح شروع میں فادر کے خاندان میں خوشیاں تھیں۔ لمبے مصائب جھیلنے کے بعد ایک ہندی فلم کی طرح اس مصیبت زدہ خاندان کا انجام بھی مسرت انگیز ہوتا ہے۔

ولیکی کولینیز لکھتا ہے۔ ''مصنف قارئین کو اپنی تخلیق سے ہنساتا' رلاتا اور انہیں انتظار اور تذبذب میں رکھتا ہے۔''

ناول پڑھتا ہوا قاری فادر PRIMROSE کے خاندان کے مصائب پر غم زدہ ہو جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ خوشیاں لوٹ آئیں اور سسپنس کے لمبے مراحل سے گزر کر فادر کی خوشیوں میں شریک ہوتا ہے۔

(۲۱) ہنری فیلڈ ینگ کا شاہکار ناول TOM JONES (مطبوعہ ۱۷۴۹) بھی اٹھارویں صدی کے انگلستان کے معاشرے کا بھرپور نقشہ پیش کرتا ہے۔ ناول میں متعدد اور رنگا رنگ کردار ہیں جن میں کسان، اسکول کے استاد، فیشن ایبل خواتین اور بڑے زمیندار شامل ہیں۔

انگریزی کے نامور نقاد جارج سینٹس بری نے TOM JONES پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''ناول کا ہر کردار وہی کرتا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ ناول میں عام لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ بشر ہونے کی بنا پر ان سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔''

ٹام جونز ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ وجیہہ، توانا، ذہین، مہم جو اور نیکِ دل نوجوان ہے لیکن وہ بڑا حسن پرست اور عیاش ہے۔ سکاٹ اور تھیکرے نے فیلڈ ینگ کی صلاحیت کی سراہنا کی ہے تاہم انیسویں صدی کے چند نقادوں نے ناول کو مخرب الاخلاق قرار دیا ہے۔

زندگی میں گوناگوں تجربات نے فیلڈ ینگ کو انسانی نفسیات کی باریکیاں سمجھنے میں مدد دی ہے۔ وہ واقعات اور واردات کو فنکارانہ طور پیش کرتا ہے اور قاری کو بوریت کا احساس نہیں ہوتا۔ ناول کا پلاٹ مربوط ہے اور واقعات یکے بعد دیگرے فطری طور پیش آتے ہیں۔

(۱۳) سب سے مشہور ناول DAVID COPPERFIELD ہے۔ یہ چارلس ڈکنس کی اپنی زندگی سے متعلق ہے۔ اس کے ماں باپ بڑے غریب تھے۔ اس لیے چارلس نے اپنا بچپن بڑی عسرت اور مصیبت میں گزارا۔ بارہ سال کی عمر میں چارلس کو باپ نے ایک فیکٹری میں ہفتے میں چھ یا سات شیلنگ کی اُجرت پہ کام پر لگا دیا۔ اس کا کام بوتلوں کو دھونا اوران پر لیبل لگانا تھا۔ چارلس اس کام سے خوش نہیں تھا۔ احساسِ محرومی اسے ستانے لگا پھر چارلس ایک بنک منیجر کی چنچل بیٹی ماریا بیڈنیل کی زلفوں کا اسیر ہوتا ہے لیکن چارلس کی غریبی کی وجہ سے یہ محبت پروان نہیں چڑھتی ہے۔ ناول میں اس نے اپنی اس محبوبہ کا نام ڈورا رکھا ہے۔ مصنف واحدِ متکلم کے صیغے میں کہانی سناتا ہے جو فکشن کی ایک مقبول تکنیک ہے۔

ڈکنس کا طرزِ تحریر سادگی، جذبات نگاری اور ظرافت کی چاشنی سے عبارت ہے۔

کہانی کا مرکزی کردار ڈیوڈ کوپرفیلڈ ہے جو خود ڈکنس ہوتا ہے۔ چارلس ڈکنس رقم طراز ہے۔ ''تمام کتابوں میں مجھے سب سے زیادہ DAVID COPPERFIELD پسند ہے۔ بہت سارے شفیق ماں باپ کی طرح میرا بھی ایک اپنا پیارا بچہ ہے جس کا نام ڈیوڈ کوپرفیلڈ ہے۔

چارلس ڈکنس کے ناولوں میں THE PICK WIC PAPERS اور GREAT EXPECTATIONS بھی بہت مقبول اور مشہور ہیں۔

چارلس ڈکنس نے اپنے ناولوں میں عمومی طور پر انیسویں صدی کے انگلستان کے غریبوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

(۱۴) چارلس کے ہم عصر ایک اور مشہور ناول نویس ولیم تھیکرے نے سماج کے اونچے طبقے کی عکاسی کی ہے اور امراء اور رؤسا کی حماقتوں کی غمازی کی ہے۔ VANITY FAIR تھیکرے کا شہکار ناول ہے۔

زیرِ بحث ناول انیسویں صدی کے اوائل کے انگلستان سے متعلق ہے۔ جب نپولین کے حملوں اور جنگوں کی وجہ سے یورپ میں افراتفری کا سا عالم ہے۔

ناول میں لالچی، نمائشی اور خودغرض مرد بھی ہیں۔ چالاک، عیار اور ریاکار خوبصورت عورتیں

بھی ہیں اور سچی اور بے لوث محبت کرنے والے کریکٹر بھی ہیں۔ جیسے نوجوان امیلیا ہے جو اپنے نو بیاہتا کی موت کے بعد شادی نہ کرنے کا عہد کرتی ہے اور اس کا سچا محبّ ولیم ڈوبین امیلیا کی ایک نظر عنایت کے لیے اٹھارہ سال کا انتظار کرتا ہے۔

اسکول کی پرنسپل تعلیم کی تکمیل کے بعد فارغ ہونے والے طلبا اور طالبات کی الوداعی تقریب میں امیرزادی مس سیڈلے کو حسب روایت ڈاکٹر جانسن کی ڈکشنری پیش کرتی ہے لیکن غریب طالبہ بیکی شرپ کو نظر انداز کرتی ہے۔ بیکی کے ذہن پر اس واقعہ کا برا اثر پڑتا ہے اور آگے چل کر وہ ناول کا سب سے گھناؤنا کریکٹر ثابت ہوتا ہے۔

ناول کے کئی کردار جایز طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کے بل بوتے پر اونچی سوسائٹی میں اپنی رسائی کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ پارٹیاں دے کر اپنی امارت کی نمائش کرتے ہیں۔ تھیکرے کا قلم قند میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں ان سماجی کمزوریوں پہ کراری چوٹ کرتا ہے۔ اور ایک کور مغز رئیس کی حماقتوں، شیخی بازیوں اور نمود نمائش کو طشت از بام کرتا ہے۔

(۱۵) WUTHERING HEIGHT انیسویں صدی کے انگلستان کا ایک مقبول اور مشہور ناول مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں تین نسلوں کا ذکر ہے۔ کہانی دو خاندانوں کے گرد گھومتی ہے۔ ہیتھ کلف ناول کا اہم ترین کردار ہے۔

ناول کی دو اہم خصوصیات گہرا رومان اور سسپنس ہیں۔ مصنفہ ایمائل برونٹے ناول میں شروع سے آخر تک ایک پُر اسرار فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔

جب ایک آدمی لوک ووڈ ہیتھ کلف کے پاس کرائے پر کمرہ ڈھونڈے جاتا ہے تو ہیتھ کالف اور تین مکین بڑی نخوت سے پیش آتے ہیں۔ جب وہ دوسری مرتبہ جاتا ہے اس کی جان پر آبنتی ہے اور وہ خونخوار کتوں کا لقمہ بنتے بنتے بچتا ہے۔

لوک ووڈ کو تجسّس ہے۔ آخر ایک انسان کے ساتھ ان کا برتاؤ اتنا سخت گیر، پُر اسرار اور انوکھا کیوں ہے؟ یہی تجسّس قارئین کو بھی ہے۔ ہیتھ کلف کیوں سخت گیر ہے؟ جوزف کیوں سنگ دل ہے؟ ہیروئن کیوں اکھڑ ہے؟ حسین وجمیل کیتھرائن میں انسانی ہمدردی اور مروت کا فقدان کیوں ہے؟ آہستہ

آہستہ پردہ اُٹھتا جاتا ہے۔ اس پر اسرار خول کے پیچھے وہ بھی عام لوگوں کی طرح ہے جو رو سکتے ہیں، ہنس سکتے ہیں اور رحم کر سکتے ہیں ہیتھ کلف ایک جگہ لکھتا ہے:

''میرے دشمن سو سال میں جو محبت کر سکتے ہیں۔ میں ایک گھنٹے میں کر سکتا ہوں۔''

ہیتھ کلف نے بچپن میں بڑے دکھ اٹھائے تھے۔ وہ لیور پول کی ایک گلی میں پایا گیا اور کسی نے اسے متبنیٰ بنایا۔ اس کا بیٹا اس کو بہت مارتا تھا۔

ناول کے کردار جلدی جلدی مر جاتے ہیں۔ مصنفہ کی دو بہنیں ماریا اور ایلیز تپ دق سے چل بسیں۔ خود مصنفہ تیس سال کی عمر میں اس بیماری سے چل بسیں۔

بقول سامرسٹ مام ''محبت کی کسک 'سحر' دیوانگی اور سنگ دلی کو جس انداز میں اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ میں نے کسی ناول میں نہیں دیکھا۔''

ایمائل برونٹے کی بہن شارلیٹ برونٹے نے بھی ایک معرکتہ آلاراء ناول JANE AYRE کے نام سے قلم بند کیا ہے جس پر 100 GREAT BOOKS (مولف: جان کیننگ -- پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء) میں عالمی شہرت کی دوسری کتابوں کی طرح تبصرہ ہے اور WUTHERING HEIGHT سمیت اسے بہترین سو عالمی کتابوں میں ایک بہترین کتاب قرار دیا گیا ہے۔ JANE AYER ایک غریب لڑکی ہوتی ہے جس کو ایک میٹرن مسز ریڈ کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا ہے۔ مسز ریڈ کے بچے ننھی جین کو بہت ہراساں اور پریشان کرتے ہیں۔ ایک روز جین روز روز کی بدسلوکیوں سے تنگ آ کر بھنّا اٹھتی ہے اور احتجاج کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایک خیراتی ادارہ LOWOOD INSTITUTION میں داخل کیا جاتا ہے۔ اس ادارے میں شارلیٹ برونٹے اور ایمائل کے علاوہ اس کی تین اور بہنوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔

(۱۶) گاسٹاوف فلابرٹ کے کلاسیکل ناول MADAM BOVARI کے پیشِ لفظ میں لکھا ہے ''فرانس کا کوئی اور ناول میڈم بواری سے بڑھ کر شہرت حاصل نہیں کر سکا۔''

ناول پڑھنے کے بعد ذہن پر میڈم بواری چھائی رہتی ہے۔ وہ بڑی اونچی خواہشات رکھنے والی AMBITIOUS عورت ہے۔ عیش و عشرت اور شان و شوکت کی دلدادہ ہے۔ اپنے شوہر چارلس

سے مطمئن نہیں ہے اور وجیہہ اور توانا مردوں کی متلاشی ہے۔ بواری حسین وجمیل ہے۔ شروع میں اس جھجک، انکار اور شرم وحیا ہوتی ہے لیکن ایک دفعہ جب بہک جاتی ہے تو خود سپردگی اس کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ سماج، شوہر اور خدا تک کو خاطر میں نہیں لاتی اور البیلے اور چھبیلے مردوں کے پیچھے پڑتی ہے ایک روز وہ اپنے عاشق لیون سے کہتی ہے کہ وہ لوئیس ہشتم کی اسٹائل پر داڑھی رکھے اور سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کرے۔

اپنی فضول خرچیوں سے وہ شوہر کا دیوالہ نکالتی ہے، پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے جب میڈم بواری کی زندگی اجیرن بنتی ہے اور انجام خودکشی پر ہوتا ہے۔

ناول کا واقعہ سچا بتایا جاتا ہے۔ اسے لکھنے میں مصنف کو پانچ سال لگے۔ ایک ایک صفحہ لکھنے میں گھنٹوں اور دنوں لگائے۔ لکھنے سے پہلے وہ واقعات سے وابستہ تمام جزئیات پڑھتا تھا اور ضخیم نوٹ تیار کرتا تھا۔ اس تصنیف پر فلابرٹ کی خوب تعریفیں بھی ہوئیں اور بداخلاقی پھیلانے کے الزام میں مقدمہ دائر کیا گیا۔

سامرسٹ مام رقم طراز ہے۔ ''فلابرٹ نے جدید حقیقت پسندانہ ناول نگاری کی بنیاد ڈالی اور براہ راست یا بالواسطہ تمام ناول نگاروں اور کہانی کاروں کو متاثر کیا ہے۔''

(۱۷) فیوڈر ڈوستوو سکی کا ناول CRIME AND PUNISHMENT ان گنے چنے ناولوں میں ہے جس کا تاثر دیرپا اور دائمی ہے۔ ناول کی کہانی ایک حساس آدمی روڈین روسکولینوف کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ وہ قتل کا مرتکب ہوتا ہے۔ واردات کے بعد اس کا ضمیر اس کو جھنجوڑتا ہے۔ وہ ہردم بے چین رہتا ہے۔ ہر آہٹ پر چونکتا ہے، ہر اشارہ کنایہ پر شک کرتا ہے۔ اپنی محبوبہ کے سامنے دل ہلکا کرتا ہے۔ آخر کار پولیس کے سامنے جا کر اس راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس کو سائبیریا میں آٹھ سال قید با مشقت کی سزا لگتی ہے۔ اس کی محبوبہ سونیا اس کی خاطر سائبیریا جاتی ہے، گھر گھر جا کر سلائی کرتی ہے اور کبھی کبھی اس کو کچھ روپیہ پیسہ بھی دیتی ہے۔ دونوں تنہائیوں میں ملتے ہیں اور ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ رہائی ہونے تک ایک دوسرے کا انتظار کرنے کے لیے عہد وپیمان کرتے ہیں۔

مصنف نے قاتل کی نفسیات اور ضمیر کی آواز کو یوں اجاگر کیا ہے کہ قاری کو قاتل سے

ہمدردی ہو جاتی ہے۔ قاری کا دل کئی دفعہ دھڑکتا ہے کہ اب راز فاش ہوا، اب راز فاش ہوا۔ دل چاہتا ہے کہ قاتل خود راز نہ بتادے کیونکہ وہ بذاتِ خود برا آدمی نہیں ہے، وہ طالب علم ہے۔ پیٹرز برگ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا ہے لیکن غریبی کی وجہ سے گھر سے خرچ نہیں آتا ہے۔ اپنی چھوٹی موٹی چیزیں ایک بڑھیا کے پاس رہن رکھتا ہے۔ بڑھیا بڑی کنجوس اور ظالم ہے۔ وہ کوڑیوں کے مول چیزیں خریدنے کے اصول پر عمل پیرا ہے اور رہن پر رکھی ہوئی چیزوں پر بلا ناغہ سود چڑھاتی ہے۔ وہ بڑھیا کو عمداً قتل کرتا ہے۔

مصنف کی زندگی کے پسِ منظر میں یہ ناول سمجھا جا سکتا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں اس کو اور دو جوانوں کو روس کے شہنشاہ نکولس اول کے حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ گولی مارنے کے لیے ان کو درختوں سے باندھا گیا۔ مرنے کے لیے ابھی چند ہی منٹ باقی تھے کہ اچانک فوج نے نوبت بجائی اور موت کی سزا قید بامشقت میں تبدیل کی گئی۔ چار سال تک وہ سائبیریا میں رہا۔ ایک قیدی رسی کھولتے ہی پاگل ہو گیا اور کبھی ٹھیک نہیں ہوا۔ مصنف کے اعصاب بھی متاثر ہوئے اور اس کو مرگی پڑنے لگی۔

(۱۸) چند نقادوں نے THE BROTHERS KARAMAZOV کو دوستووسکی کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ اس ناول کی کہانی فیوڈور کرمازوف اور اس کے تین بیٹوں ڈیمی ٹری، ایون اور الیگزی کے گرد گھومتی ہے۔ بھائیوں کے نظریات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ڈیمی نری مادہ پرست ہے جب کہ الیگزی، جو آلی یوشا کے نام سے جانا جاتا ہے، روحانی قدروں کو مانتا ہے اور روح کی لافانیت اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کے عقیدے پر یقین رکھتا ہے۔ ناول رومانیت اور مادیت کی کشمکش کو اجاگر کرتا ہے۔

دوستووسکی نے فادر زوسیما کا کریکٹر تخلیق کیا ہے جو بڑا خدا ترس اور انسان دوست ہے اور فادر کی زبانی اپنا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ فادر زوسیما لوگوں کو محبت کا آفاقی پیغام دیتا ہوا کہتا ہے۔ ''بھائیو۔۔ ایک گنہگار آدمی سے بھی محبت کرو۔ یہ خدا سے محبت کے مشابہ اور دھرتی پہ سب سے بڑی نعمت ہے........خدا کی ہر تخلیق سے محبت کرو۔ ریت کے ہر ذرے سے پیار کرو، ہر پتے سے پیار کرو،

روشنی کی ہر کرن سے محبت کرو، جانوروں سے محبت کرو، پودوں سے محبت کرو، ہر چیز سے محبت کرو۔''
دوستوسکی ہر واقعہ کا ایک ماہر نفسیات کی طرح تجزیہ کرتا ہے اور اسے بڑی چابکدستی سے ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے۔

(۱۹) FATHER AND SONS روس کے ایک اور بلند پایہ ادیب ترگنیف کا سب سے مشہور ناول ہے۔ تاہم یہ ٹالسٹائی کے جنگ اور امن، دوستوسکی کے جرم وسزا اور شولوخوف کے AND DON FLOWS کے ہم پایہ نہیں ہے۔ Father and Sons میں پرانی اور نئی نسلوں کا ٹکراؤ دکھایا گیا ہے۔ یہ ٹکراؤ قدیم اور جدید سائنس اور روایات اور زار روس اور انقلابیوں کے درمیان ہے۔ نئی نسل کا ترجمان بازاروف ہے۔ وہ نوجوان ہے، سائنسی نقطہ نظر رکھتا ہے اور برملا مذہب اور سماجی قدروں کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس کا باپ ایک جاگیردار ہے۔ بازاروف لاابالی مزاج کا ہے۔ گھر میں تین سال کے بعد آتا ہے لیکن تین دن سے زیادہ نہیں رہتا۔ ماں کو گریاں اور ترساں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ وہ پیشے سے ڈاکٹر ہے۔ مریضوں کا علاج کرتے ہوئے چھوت کی بیماری لگتی ہے اور مر جاتا ہے۔

اس کے ناول کی قدامت پرستوں اور انقلابیوں دونوں نے مخالفت کی۔ دوستوسکی کی طرح ترگنیف بھی جیل گیا تھا۔ ناول میں رومان کا بڑا عنصر ہے۔ فنیشکا کی شخصیت میں ایک دلنواز کشش ہے۔ وہ شرمیلی شرمیلی اور سوگوار لگتی ہے۔

ایک بیوہ عورت میڈم اوڈین ٹوسوف کی کوٹھی پر ناول کے کریکٹر ملتے ہیں۔ اس کی لمبی قامت اور خوبصورت آنکھوں میں جادو ہے۔ گرچہ وہ انتیس برس کی ہے لیکن کم عمر کے بہت سارے نوجوان اس پر فریفتہ ہیں۔

یہ ناول پہلے پہل ۱۸۶۲ء میں چھپا تھا۔

(۲۰) Doctor Zhivago (مطبوعہ ۱۸۵۷ء) بورس پاسترناک کا شاہکار ہے۔ اس تصنیف پر پاسترناک کو نوبل پرائز ملا تھا۔ ناول کا زیادہ حصہ انقلاب روس سے متعلق ہے۔ انقلاب کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان لڑائیاں ہوتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر انقلابیوں اور غیر انقلابیوں کو گولی ماردی جاتی ہے۔

زھیوا گو ادیب، شاعر اور دانش ور ہے لیکن انقلاب کے بعد اس کی تخلیقی صلاحیت جمود کا شکار ہوتی ہے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ڈاکٹر ہے۔

پاسترنیک زھیوا گو کی زبانی بالشویکوں پر چوٹ کرتا ہے۔ کمیونسٹ حکومت نے روس میں اس ناول کو ممنوع قرار دیا تھا۔

بورس پاسترناک روس کے دوسرے نوبل انعام یافتہ ادیب سولیز نٹائین کی طرح سٹالین کے دور بربریت کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ انقلاب دشمن نہیں۔ تاہم خانہ جنگی اور خونریزیوں سے بددل ہے۔ ایک جگہ زھیوا گو کہتا ہے۔ ''ہر چیز کی حد ہوتی ہے۔''

ناول روس کے وسیع علاقے کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں مسلم سمیت مختلف علاقوں کے کریکٹر ہیں۔ جیسے فاطمہ، پاشا، یوسف وغیرہ۔ قاری کو زھیوا گو سے ہمدردی ہوتی ہے۔ وہ مجموعی طور پر اچھا آدمی ہے جس کی زندگی کا چراغ جنگ اور انقلاب کی وجہ سے وقت سے پہلے بجھ گیا۔

ایک جگہ زھیوا گو محاذ جنگ پر زار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''سکوں اور تمغوں پر اس کی جو شبیہہ ہے۔ وہ بوڑھا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا چہرہ بے رونق اور تھوڑا سا پیلا لگتا ہے۔''

وہ ایک مردہ نوجوان کی جیب میں ایک ڈبیہ پاتا ہے جس میں ایک کاغذ پر انجیل مقدس کی ایک آیت چھپی ہے۔ کوٹ کے حاشیے پر نوجوان کا نام کشیدہ ہے۔ ایسی ہی آیت دوسری لاش سے بھی برآمد ہوتی ہے۔ یہ آیت گولیوں سے محفوظ رہنے کے لئے موثر نسخہ سمجھی جاتی تھی اور تعویز کے طور پر پہنی جاتی تھی۔

(۲۱) Humboldts Gift سال بیلو کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں سال بیلو نے ایک نہایت ہی دلچسپ کردار Humboldt کو جنم دیا ہے۔ اور بالواسطہ طور پر امریکی مادی زندگی، چاپلوسی، جاہ پرستی اور جنسی بے راہ روی سے پردہ اٹھایا ہے۔ ہیمبولڈٹ شاعر ہے۔ وہ شکی، سنکی اور پبلسٹی زدہ ہے۔ مصنف واحد متکلم کے صغیے میں سٹرائن کے نام سے ہیمبولڈٹ کی تعریف یا تضحیک کرتا ہے۔ طنزیہ انداز میں اس کی صلاحیتوں اور کمزوریوں کو اجاگر کرتا ہے اور دبے دبے الفاظ میں اس کی اُمنگوں کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

ہیمبولڈٹ اپنے آپ کو امریکی صدر ایڈلائی سٹیونسن سے اپنی گہری وابستگی کا ذکر کرتا ہے۔

مصنف کو اپنے اعتماد میں لاتے ہوئے پر اسرار انداز میں کہتا ہے۔

''چارلی، سٹیونسن میری نظمیں پڑھتا ہے۔

مصنف پوچھتا ہے۔ صدر کو تم کیسے جانتے ہو؟''

ہیمبولڈٹ راز دارانہ انداز میں کہتا ہے۔ میں تمہیں یہ راز بتا نہیں سکتا۔ لیکن صدر سے میرا رابطہ ہے۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران وہ میرے اشعار کا مجموعہ ساتھ لیتا ہے، پھر وہ فخر سے کہتا ہے۔ چارلی، اس ملک میں اب دانشور آگے آ رہے ہیں۔ اگر سیٹونسن اقتدار میں ہیں۔ تو ادب کا بول بالا ہے اور ہمارے وارے نیارے ہیں۔ اس کی حکومت میں کابینہ کے وزراء ایسٹ اور جوئیس کی تحریروں کا حوالہ دیں گے۔ بری فوج کا سربراہ تصوسی ڈائیٹس سے متعلق معلومات رکھتا ہوگا۔ میں نئی حکومت میں گوئٹے کا مرتبہ حاصل کروں گا۔''

تب اس کی بیوی کیتھلین کہتی ہے۔ ''ہیمبولڈٹ آج رات سو نہیں پائے گا۔''

ہیمبولڈٹ کو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ سابق نازی یا گیسٹاپو کے ایجنٹ اس کو اغوا کریں گے یا روسی اس کو ہلاک کریں گے۔

وہ گہری یاسیت کا شکار ہے۔

پھر مصنف لکھتا ہے۔ اس کا ڈرامہ Von Trunk کامیابی سے چل رہا ہے۔ ہیمبولڈٹ شکایت کرتا ہے کہ مصنف نے ڈرامے میں اس کو دکھایا ہے اور اس کے نام پر روپیہ کما رہا ہے۔ وہ اپنے کئی خوشامدیوں کو تھیٹر پر مصنف کے خلاف مظاہرے کرنے کے لئے لے جاتا ہے۔ ایک پوسٹر پر لکھا ہے۔

''اس ڈرامے کا لیکھک غدار ہے۔''

وہ آگے لکھتا ہے۔ اس نے میرے اکاؤنٹ سے ۶۷۶۳ ڈالر ۸ سینٹ نکالے اور اپنے لئے ایک پرانی گاڑی خریدی۔

سال بیلو ایک کردار تخلیق کرتا ہے جو اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ دوبارہ کہیں نمودار ہوتا ہے اور مصنف اپنے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ناول جوں جوں آگے بڑھتا ہے، انکشافات ہوتے ہیں۔ وہ بین السطور ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہے۔ اسے چھوڑ کر کچھ باتیں کرتا ہے اور غیر متوقع طور پر

ٹوٹی ہوئی کڑی جوڑ دیتا ہے۔

(۲۲) سال بیلو کی طرح ایک اور نامور امریکی ناول نویس ارنسٹ ہمنگوے بھی اچھا کہانی گو تھا۔ اس کا سٹائل کئی لحاظ سے منفرد ہے۔ A FAREWELL TO ARMS (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) ہمنگوے کا سب سے مشہور ناول ہے۔ یہ ناول پہلی جنگ عظیم کے تناظر میں لکھا گیا ہے اور اٹلی کے ایسونز و محاذ جنگ سے متعلق ہے۔ ہمنگوے خود فوجی تھا اور کرنل ریٹائر ہوا تھا۔

A farewell to the Arms کی اشاعت کے بعد ہیمنگوے کو عالمگیر شہرت ملی۔

ناول کی کہانی بتانے والا ایک امریکی فوجی فریڈرک ہنری ہے۔ محاذ پر ہنری کی ملاقات ایک انگریز نرس کیتھرائن برکلے سے ہوتی ہے۔ وہ اس پر فریفتہ ہوتا ہے اور دونوں جلدی ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔

ہنری جنگ میں سخت زخمی ہوتا ہے اور علاج کے لئے اس کو اٹلی میں میلان کے ایک اسپتال میں لیا جایا جاتا ہے۔ اتفاق سے وہاں کتھرائن ہوتی ہے اور اس کی تیمارداری کرتی ہے۔ ہنری صحت یاب ہوتا ہے۔ دونوں چھٹی پر جانے کا پروگرام بناتے ہیں لیکن دشمن کی یلغار کے پیشِ نظر ہنری کی چھٹی منسوخ ہوتی ہے اور جنگ دو محبت کرنے والے دلوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔

ہنری میدان جنگ سے لوٹتا ہے اور کیتھرائن سے ملاقات کرنے میلان چلا جاتا ہے لیکن وہاں کیتھراین نہیں ہوتی۔ وہ ایک نرس کے ہمراہ سٹریسا نام کے قصبہ چلی گئی ہوتی ہے۔ ہنری سٹریسا روانہ ہوتا ہے اور کیتھرائن کو پالیتا ہے۔ کیتھرائن کے پیٹ میں ہنری کا بچہ ہے۔ قصبے کے لوگ ہنری کو ایک بھگوڑا فوجی سمجھتے ہیں۔ گرفتاری کے خوف سے دونوں ایک کشتی میں غیر جانبدار ملک سوئزرلینڈ فرار ہوجاتے ہیں۔

کیتھرائن کے لئے بچے کا حمل تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بچہ فوت ہوجاتا ہے اور ہنری کو روتا دھوتا چھوڑ کر کیتھرائن بھی اس دنیا سے چلی جاتی ہے۔ اس طرح یہ دردناک ناول ختم ہوتا ہے۔

A Farewell to the Arms جنگ کی تباہ کاریوں، حماقتوں اور بربریت کو اُجاگر کرتا ہے۔

(۲۳) مارک ٹوئین کے سب سے دلچسپ اور مزاحیہ ناول The Adventure of Tom

Sawyer میں بڑی خوبصورتی سے بچوں کی نفسیات کی عکاسی کی گئی ہے۔ بچے ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک طرح سوچتے ہیں۔ شرارتیں کرتے ہیں۔ بچوں کی تئیں ان کے والدین اور سرپرستوں کا رویہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ شرارت کرنے پر ڈپٹتے اور ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ جب بیمار ہوتے ہیں یا کھو جاتے ہیں تو ان کی پریشانی کا عالم قابلِ رحم ہوتا ہے۔

ایک روز ٹام اور اس کے دو دوست ایک جزیرے میں جاتے ہیں۔ ان کو "قانون شکن" بننے کا بڑا شوق ہے۔ ٹام رابن ہوڈ بننا چاہتا ہے تا کہ امیروں کی دولت لوٹ کر غریبوں میں بانٹے۔ ان کے اچانک غائب ہو جانے پر سبھی پریشان ہیں۔ ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

اسی اثناء میں ایک مرتبہ ٹام شام کے وقت چپکے سے گھر آتا ہے اور چھپ کر چچی اور ہاک کی باتیں سنتا ہے۔

ادھر لوگ ان کی زندگی سے مایوس ہیں۔ گاؤں کے گرجے میں ان کی گم شدگی پر ماتمی میٹنگ ہو رہی ہے۔ پادری گم شدہ بچوں کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔ ابھی دعائیہ مجلس چل رہی ہیں کہ تینوں اچانک گرجا گھر میں آدھمکتے ہیں۔ سب کی نظریں ان پر پڑتی ہیں۔

ٹام گھر آ کر یہ گل کھلاتا ہے کہ اس نے چچی اور ہاک کو خواب میں باتیں کرتے دیکھا اور چپکے سے سنی ہوئی باتیں خواب بتا کر سناتا ہے۔ چچی اس کی غیب دانی اور وجدان پر حیران اور شاداں ہوتی ہے۔ ادھر ہاک کی ماں سے چچی کو پتہ چلتا ہے کہ ٹام نے چھپ کر یہ باتیں سنی تھیں۔ چچی کو غصہ آتا ہے لیکن ٹام اپنی چرب زبانی سے چچی کو منا لیتا ہے۔

بادلِ ناخواستہ ایک روز ٹام گھر کی سفیدی کر رہا ہے۔ اس کا دوست بین وہاں پہنچتا ہے۔ بین سیب کھا رہا ہے۔ ٹام کے منہ میں پانی بھر آتا ہے لیکن وہ سیب کو نظر انداز کر کے ایسا ظاہر کرتا ہے کہ اسے مکان کی سفیدی کرنے میں بڑا لطف آ رہا ہے۔ بین کا جی چاہتا ہے کہ وہ سفیدی کرے۔ ٹام بین کو سیب کی ایک قاش کے عوض منتوں کے بعد سفیدی کرنے کا موقع دیتا ہے۔

مصنف نے یہ ناول ۱۸۷۶ء میں لکھا۔ وہ لکھتا ہے۔ ٹام کی سرگرمیوں کے پیچھے تین لڑکے ہیں جو ایک کردار کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان میں ایک لڑکا ہاک فن، میں خود تھا۔

(۲۴) فرانس کے فلسفی ادیب والٹیر کے زرخیز دماغ نے ایک دلچسپ کردار CANDIDE کو جنم دیا ہے۔اسی کے نام پر ناول کا نام بھی CANDIDE رکھا ہے۔والٹیر نے کاندید کی زبانی اپنے عہد کے سماج کی مکاریوں اور کمزوریوں پر گہرا طنز کیا ہے۔ایسی کمزوریاں جو زمان ومکاں کی قیود سے بالاتر ہیں۔

کاندید کی پرورش ایک خوبصورت محل میں ہوتی ہے۔اس کی شادی ایک ''اونچی ذات'' کی ایک عورت سے اس لئے نہیں ہوتی کہ اس کا شجرۂ نسب صرف اکہتر پشتوں تک چلتا تھا۔وہ اپنی محبوبہ کے بھائی سے ملتا ہے۔وہ کاندید سے گرم جوشی سے بغلگیر ہوتا ہے۔چند لمحوں کے بعد کاندید اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے تو وہ غضب ناک ہو کر نیام سے اپنی تلوار نکالتا ہے اور دونوں میں شمشیر بازی ہوتی ہے۔

پھر کاندید سفر پر نکلتا ہے۔وہ ایک عجیب وغریب ملک میں پہنچتا ہے جہاں راستے کے کنکر، جواہرات اور سونے کے ہوتے ہیں۔وہ وہاں سے سونے کے جواہرات لے کر دوسرے ملک میں پہنچتا ہے۔سمندری سفر کے دوران جہاز کا کپتان کاندید اور اس کے ساتھی سے دھوکے سے ان کا مال لے کر بے یارومددگار چھوڑ دیتا ہے لیکن وہ وہاں سے بچ نکلتے ہیں اور پیرس پہنچتے ہیں جہاں دونوں ایک سرائے میں ٹھہرے ہیں۔اس کا ساتھی مارٹن اس کو بتاتا ہے کہ فرانس میں لوگ بے سہاروں اور غریبوں کو پوچھتے تک نہیں۔لیکن جب سرائے والے کو پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس بڑی دولت ہے تو بن بلائے دو ڈاکٹر سرائے پہنچتے ہیں اور دو عورتیں ان کی خدمت کرتی ہیں۔

کاندید بیمار ہو جاتا ہے۔محلے کے پادری صاحب اس کے پاس تشریف لاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ وہ دوسری دنیا کے دربان کو دینے کے لئے ان سے سٹرٹیفکیٹ خریدیں۔کاندید نہیں مانتا ہے اور پادری صاحب کو کھڑکی سے باہر پھینکنے کا ارادہ کرتا ہے۔

کاندید کے ہاں جوا کھیلنے کے لیے بہت سارے لوگ آتے ہیں۔وہ ہمیشہ ہارتا ہے اسے بڑی حیرت ہے کہ کسی بھی بازی میں یکا اس کے ہاتھ نہیں آتا۔

کاندید ایک لڑکی پر فریفتہ ہوتا ہے۔وہ ایک عورت سے ملاقات کرتا ہے۔تاکہ اس کی مدد حاصل کرے لیکن وہ عورت اس کی قیمتی انگوٹھی دیکھ کر اس سے محبت کا ناٹک رچاتی ہے اور انگوٹھی بٹور کر

اسے چھوڑ دیتی ہے۔

ایک واقف کار کاندید اور اس کے ساتھی کو گرفتار کراتا ہے۔ پولیس افسر دونوں کو ہتھکڑیاں پہناتا ہے۔ جب کاندید افسر کی مٹھی گرم کرتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ ''اگر آپ اتنی ہی رقم میرے بھائی کو بھی دیں گے تو ہم کسی بھی آدمی کو قتل کر دیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ ان کو چھوڑ دیتا ہے پھر اس کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوتی ہے جس کے گھر میں ایک بڑی لائبریری ہے لیکن وہ آدمی دنیا کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کو گالیاں دیتا ہے۔

والٹیر نے کاندید کے ذریعے اٹھارویں صدی کے فرانس اور غالباً یورپ کے سماج کا سراغ لگایا ہے۔ وہاں ایک اور فرانسیسی ناول نگار Stendhal نے ایک اور کردار جولین سوریل کے ذریعے انیسویں صدی کے فرانس کی اونچی سوسائٹی کا گھناؤنا رخ دکھایا ہے۔

(۲۵) سامرسٹ مام نے اپنی تصنیف The Ten Best Novels of the World میں Stendhal کے ناول SCARLET AND BLACK کو دنیا کے دس بہترین ناولوں میں شمار کیا ہے۔

میں نے اس کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ ناول کلاسیکل سٹائل پر لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس میں فنی خوبیوں کا فقدان ہے۔

مصنف لکھتا ہے۔ ''قلم کار کا تخیل رومانی اور اس کا سٹائل کلاسیکل ہونا چاہئے۔''

سٹینڈ ہال نے کہانی کا پلاٹ دسمبر ۱۸۶۷ء میں ایک گزٹ میں چھپے واقعہ سے لیا ہے اور ۱۸۳۰ء کے آس پاس اسے ناول کا روپ دے کر شایع کیا۔

ناول میں فرانس کے شاہ پرست اور لبرل نظریات رکھنے والے لوگوں کی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے جس کے نتیجے میں چارلس دہم کا اغوا کیا گیا۔

ناول کی اہم خصوصیات رومان اور جنسی اُٹھان کی شدت ہے جس نے کئی سکنڈلوں کو جنم دیا۔ اس میں فرانس کی اونچی سوسائٹی کی کئی عورتیں ماخوذ ہوتی ہیں۔ اس کا مرکزی کردار جولین سوریل ہے۔ اس کا انجام سزائے موت ہوتا ہے۔

مصنف کی تحریر میں والٹیر کے طنز کا تیکھا پن اور ظرافت کی چاشنی ہے۔

(۲۶) فرانس کے نامور ناول نگار بالزاک نے ایک انوکھا کردار GORIOT تخلیق کیا ہے۔ اسی کردار کے نام پر اپنے مشہور ناول کا نام OLD GORIOT رکھا ہے۔ بوڑھا گوریئت اپنی دو بیٹیوں کے لئے سب کچھ نثار کرتا ہے۔ صعوبتیں جھیلتا ہے۔ ہر قدم پر ان کی ناز برداری کرتا ہے۔ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی باتیں کرتا ہے۔ ان کی خاطر اپنی بیوی کے مرنے کے بعد دوسری شادی نہیں کرتا لیکن ناز و نعم سے پالی پوسی بیٹیاں باپ کی ذرّہ بھر پروا نہیں کرتیں۔۔ وہ باپ کی محتاج ہیں لیکن باپ کو گھر پر اپنے ساتھ رکھنے کے لئے روادار نہیں ہیں۔ دونوں لڑکیاں پیرس کی چوٹی کی فیشن ایبل خواتین میں شمار ہوتی ہیں اور اونچی سوسائٹی تک ان کی پہنچ ہے۔ دونوں بڑی شان وشوکت سے رہتی ہیں اور پانی کی طرح روپیہ صرف کرتی ہیں۔ فرانس کا ہر فیشن زدہ نوجوان ان کا التفات حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہے۔

قاری سوچتا ہے کہ وہ اپنی دو بیٹیوں کے لئے اتنے مصائب کیوں جھیلتا ہے؟ وہ کسی سنسنی خیز انکشاف کا انتظار کرتا ہے لیکن بے سود۔

ایک ایسے کردار کی تخلیق بالزاک جیسے قلم کار کے دماغ کی اپج ہے۔ بالزاک بڑا زود نویس تھا۔ جانکار افراد کے مطابق اس نے ۱۸۲۱ء سے ۱۸۲۵ء کے درمیان چار سال کے دوران پچاس ناول لکھے۔ وہ ہر سال ایک یا دو بڑے ناول، ایک درجن ناولٹ، کہانیاں، نیز ڈرامے قلمبند کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک نوٹ بک ساتھ رکھتا تھا۔ کوئی نادر خیال ذہن میں آتا تو فوراً نوٹ کرتا تھا۔

(۲۷) سامرسٹ مام نے اپنے ناول THE MOON AND SIX PENCE میں ایسے ایک غیر معمولی کردار کو جنم دیا ہے۔ مام کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مام کو حقیقی زندگی میں اسی کردار سے پالا پڑا۔ کردار کا نام چارلس سٹریک لینڈ ہے۔ وہ لندن میں خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے دو بچے ہیں۔ ایک روز وہ اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ ایک عورت کی وجہ سے گھر سے بھاگ گیا ہے۔ اس کے اندر ایک عجیب سا آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔ وہ شاہکار تصویریں تخلیق کرتا ہے لیکن ان کو فروخت نہیں کرتا۔ ان کی نمائش نہیں کرتا۔ داد حاصل کرنے کا شوق نہیں رکھتا۔ وہ خود غریبی کی چکی میں پس رہا ہے لیکن اس کا دل محبت کے نرم و نازک جذبے سے

عاری ہے۔ اس عجیب وغریب مصور نے یہ وصیت کر رکھی ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے مکان کو تصویروں کے ساتھ جلا دیا جائے۔ جب وہ نابینا ہوا تو دل کی آنکھوں سے دیوار پر آویزاں تصویروں کو گھنٹوں تا کا کرتا تھا۔

(۲۸) مارک ٹوئین نے اپنے ناول THE PRINCE AND PAUPER میں ایسے ہی ایک کردار سے معاشرے کو دکھایا ہے جس طرح والٹیر نے کاندید کی زبانی اس دور کے فرانس اور بیرون فرانس کے سماج کا نقشہ پیش کیا ہے۔

یہ ایک شہزادہ اور ایک مفلس لڑکے کی کہانی ہے۔ دونوں ایک ہی روز لندن میں پیدا ہوتے ہیں۔ دونوں ہم شکل ہوتے ہیں لیکن ایک اطلس ودیبا میں ملبوس ہے اور دوسرے نے چیتھڑوں میں اپنا جسم چھپایا ہے۔ غریب لڑکا ٹام ایک شہزادے کا خواب دیکھتا ہے اور شہزادے کو ایک غریب انسان بن کر دنیا دیکھنے کی تمنا ہے۔ نیک دل شہزادہ ٹام کو بلاتا ہے اور اس کو شاہانہ لباس پہناتا ہے۔ خود غریبانہ لباس پہن کر محل سے باہر آتا ہے۔ ظالموں کا ظلم اور حاکموں کا دبدبہ دیکھتا ہے۔ جیل جاتا ہے اور ایک دو مرتبہ شہزادے کی جان جوکھوں میں پڑتی ہے۔ ایک روز ٹام کی تاج پوشی ہونے والی ہے۔ اچانک اصلی شہزادہ نمودار ہوتا ہے۔ ٹام خوشی خوشی شہزادے کی خاطر تخت وتاج سے دستبردار ہوتا ہے اور شہزادہ ایڈورڈ ششم کے نام سے انگلستان کا بادشاہ بنتا ہے۔

(۲۹) A TOWN LIKE ALICE دوسری بڑی جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جب ملیشیا پر جاپان نے قبضہ کیا۔ زیر بحث ناول نیویل شوتے کا سب سے مشہور ناول ہے ملیشیا میں مقیم متعدد یورپیوں کو، جن میں عورتیں اور بچے شامل ہیں، جاپانی قیدی بناتے ہیں اور انہیں پیدل سنگاپور اور کوالالمپور لے جاتے ہیں۔ ان میں ایک اٹھارہ سالہ انگریز لڑکی جین ہے۔ جین اِن کی رہنمائی کرتی ہے۔ راستے میں ملیریا، تھکن اور بھوک سے سترہ عورتیں اور بچے مرجاتے ہیں۔ قافلے میں دو آسٹریلوی جنگی قیدی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک کا نام جیو ہرمن (Jeo Harman) ہے۔ وہ جین سے محبت کرتا ہے۔ مصیبت زدوں کے لئے صابن، کونین کی دوائی اور سور کا گوشت لاتا ہے۔ جین (Jane) کے منع کرنے کے باوجود ایک روز ان کے لئے جاپان کے سخت گیر کپتان سوگاموکی مرغابیوں میں سے

پانچ مرغابیاں چُرالاتا ہے۔ کپتان کو اس کا پتہ چلتا ہے۔ جو ہرمن کو صلیب پر چڑھا کر اس کی ہتھیلیوں پر میخیں پیوست کی جاتی ہیں۔ پھر گولی مارنے کا حکم دیتا ہے لیکن جو کی خواہش پر مرنے سے پہلے اس کی مانگی ہوئی ایک قسم کی شراب کی نایابی کی وجہ سے اس کی جان بخشی ہوتی ہے۔

قیدیوں کے ہمراہ ایک جاپانی سرجنٹ بھی ہے۔ وہ طبعاً نیک ہے۔ کسی کے مرنے پر روتا ہے۔ بچے اٹھانے میں مدد کرتا ہے۔ ایک روز وہ مرجاتا ہے۔ عورتیں اس کے مرنے پر روتی ہیں۔ سرجنٹ کی جیب سے ایک جاپانی عورت اور چار بچوں کی تصویریں نکلتی ہیں۔

گئولا تھے ''یلنگ گاؤں کے سب سے سرکردہ آدمی امین بن طالب کو جین ایک قرآنی آیت سناتی ہے، جس میں عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ امین بن طالب پوچھتا ہے کہ یہ آیت قرآن میں کہاں ہے۔ جین کہتی ہے۔ ''چوتھے سورہ میں''

چھ سال کے بعد جین، جو ہرمن سے ملنے انگلینڈ سے آسٹریلیا جاتی ہے۔ ادھر جو جین سے ملنے انگلینڈ پہنچتا ہے۔ اب جو کو علم ہوتا ہے کہ جین بڑی دولت مند ہے لیکن جو کو دولت کا لالچ نہیں ہے۔ ادھر جین کی خواہش ہے کہ محض جو کی خاطر ایک ویران جگہ پر رہے۔

پورے چھ سال تک دونوں ایک دوسرے کے لئے اپنے سینے میں محبت پالتے رہے ہیں۔

مصنف نے لکھا ہے۔ یہ واقعہ سماٹرا میں پیش آیا تھا۔ ۸۰ ڈچ عورتوں اور بچوں نے مسلسل ڈھائی ماہ سفر کیا اور تین سے بھی کم لوگ زندہ بچے۔

مصنف کو اس ناول پر نوبل پرائز ملا تھا۔

(۳۰) ولیم گولڈنگ کے ناول LORD OF THE FLIES کو ماڈرن کلاسک کہا گیا ہے اور ان کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ناول بھی بچوں سے متعلق ہے۔ روبن کروسو کی طرح یہ ناول بھی مہم جوئی سے متعلق ہے۔ ایک ہوائی حادثے کی وجہ سے چند انگریز بچے ایک گمنام اور غیر آباد جزیرے میں پہنچتے ہیں۔ بچے اپنے بچاؤ کے لئے فکر مند ہیں انہیں اپنے ماں باپ، گھر اور لذیذ کھانے یاد آتے ہیں۔ چھوٹے بچے روتے ہیں۔ رالف ان کا لیڈر منتخب ہوتا ہے۔ نئی تہذیب میں پروان چڑھے ہوئے یہ بچے وحشی بنتے ہیں۔ لمبے لمبے بال، گندے اور میلے کچیلے کپڑا پہنے وہ قدیم دنیا کے جنگلی

انسان لگتے ہیں۔ اپنے رہنے کے لئے وہ جھونپڑیاں بناتے ہیں۔

ناول حقیقت اور تخیل کا امتزاج ہے۔ بچے جزیرے میں ایک جسیم مخلوق کو دیکھتے ہیں۔ رات کے وقت جزیرے میں آگ کی پُر اسرار لکیریں نظر آتی ہیں اور عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ولیم گولڈ ینگ نے مابعد الطبیعیاتی واقعات پیش کر کے کہانی کو پُر اسرار اور دلچسپ بنایا ہے۔

صورتِ حال اس وقت حیرت انگیز اور ہوش ربا ہوتی ہے، جب ایک سور کا کاٹا ہوا سر باتیں کرتا ہے۔ سور کا گوشت کھا کر بچوں پر دیوانگی سی طاری ہوتی ہے۔ بچے ناچتے اور گاتے ہیں۔ اسی اثنا میں ایک قوی ہیکل انوکھی مخلوق چٹان سے گر جاتی ہے اور زخمی ہو جاتی ہے۔ تب پورے جزیرے کو آگ لگتی ہے۔ بچے ساحل کی طرف بھاگتے ہیں اور ایک سمندری جہاز کا عملہ ان کو بچاتا ہے۔ آگ دیکھ کر وہ جزیرے پر آیا ہوتا ہے۔

(۳۱) Lords of the Flies کی طرح ڈینیل ڈیفو کا ناول ROBINSON CRUSOE اور جوناتھن سویفٹ کا GULLIVERS TRAVELS اپنی نوعیت کے دلچسپ اور انوکھے ناول ہیں جو بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول ہیں۔ یہ کتابیں دنیا کی ہر اچھی لائبریری کی زینت ہیں۔ بہت سارے ملکوں کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں یہ ناول یا ان کے اقتباسات شامل کئے گئے ہیں۔ ان مصنفوں کے تخیل کی اڑان، سوچنے کی اپج، جدتِ خیال اور ندرتِ بیان نے ان کے بعد کے قلم کاروں کے لئے تخلیقات کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

(۳۲) سپین کے ادیب Miguel de Cervantes کا Don Quixote اسی قبیل کا ایک دلچسپ ناول ہے۔ یہ سپینی زبان میں لکھا گیا ہے اور اب تک دنیا کی کم سے کم پچاس زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ Don Quixote ایک منفرد اور انوکھا کردار ہے جو مصنف کے دماغ کی اپج ہے۔ ایسے کردار ہر سماج میں ہو سکتے ہیں۔ اسی طرز پر اردو حکایتوں میں شیخ چلی، لال بجھکڑ، تیس مار خاں اور خوجی جیسے کردار تخلیق کیے گئے ہیں۔

ہر تصنیف کے پیچھے اس کا مصنف چھپا ہوتا ہے اور ناول میں اکثر ایک اہم کردار کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ تھامس مان کی شاہکار تخلیق THE MAGIC MOUNTAIN اس کے تجربات

اور مشاہدات کا ترجمان ہے۔ یہ ناول ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آیا اور ناول نویس کو ادب میں نوبل پرائز کا

ایوارڈ ملا۔ تھامس مان جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اخبارات میں ناولوں کے خلاف مضامین لکھنے کی پاداش

میں مان جرمن شہریت سے محروم کیا گیا اور امریکہ جا کر بس گیا۔

The Magic Mountain کا مرکزی کردار ہنس کس ٹروپ کو اس کا دولت مند

باپ علاج معالجے کے لیے سوئزرلینڈ میں ڈووا کے سنٹیوریم بھیجتا ہے۔ وہ صرف تین ہفتوں کے لئے

جاتا ہے لیکن سات سال بعد لوٹتا ہے۔ ہنس اوسط درجے کے فکر و ذہن کا آدمی ہے۔ سات سال کے

دوران سنٹیوریم میں اس کی ملاقات مختلف لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ ان سے بہت ساری باتیں سیکھتا ہے

جن سے ذہنی، جسمانی اور روحانی طور اس کی شخصیت کی نشو و نما ہوتی ہے۔ سنٹیوریم میں ایک ماہر نفسیات

ڈاکٹر کورو کرسکی ہے جس کا کہنا ہے کہ ہر مرض عشق و محبت کا منطقی نتیجہ ہے۔ سیٹیم بیرینی نام کا ایک باتونی

اطالوی لبرل سرمایہ داری، بورژوائی قومیت اور عقلیت پر فصاحت اور بلاغت سے لگاتار بحث کرتا ہے

اور اپنی گفتگو میں والیٹر، شلر اور مازینی کا جا بجا حوالہ دیتا ہے۔ ایک شوخ و شنگ مریضہ کلاوڈیا سب کی

توجہ کا مرکز ہے۔ ہنس اس کو دل ہی دل میں پیار کرتا ہے۔ پھر سنیوٹریم میں ایک مریض مائین ہیر پائٹر

پیپر کورن آتا ہے اور جلدی ہی اپنی پُرکشش شخصیت کی وجہ سے چھا جاتا ہے۔ وہ شراب، عورت اور اچھے

کھانوں کا شیدا ہے۔ وہ کلاوڈیا سے گھل مل جاتا ہے۔ ہنس کو اس پر رشک آتا ہے۔ لیکن جب مائین

میں عورت اور شراب سے لطف اندوز ہونے کی سکت باقی نہیں رہتی تو وہ خودکشی کر لیتا ہے۔

سنی ٹوریم کی چھوٹی سی دنیا میں ہنس زندگی کو سمجھ لیتا ہے۔ مریضوں کے لئے ایک گراموفون

رکھا ہوتا ہے۔ ہنس کبھی موسیقی سنتا ہے۔ فوٹو گرافی اور ٹکٹیں جمع کرنے کے مشغلوں میں حصہ لیتا ہے۔

کبھی کبھی وہ گہرے اضطراب اور بے چینی کا شکار ہوتا ہے اور ساری دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

اسی دوران یورپ پر پہلی جنگ عظیم کے بادل منڈلاتے ہیں اور آن کی آن میں سارا یورپ

جنگ کی لپیٹ میں آتا ہے۔

آلیور گولڈسمتھ کی اٹھارویں صدی کے انگلینڈ اور امریکہ کا معاشرہ بیسویں صدی کے انگلینڈ،

یورپ اور امریکہ کے معاشرہ میں بڑا فرق ہے۔ اخلاقی معیار بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ پہلے جن

باتوں پر سماج انگلی اٹھاتا تھا، اب ان کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

(۳۴) ولیم فالکنز کا ناول THE SOUND AND THE FURY یورپ کے نئے معاشرے کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ پہلے ۱۹۲۹ء میں چھپا۔ ناول میں incest (قریبی رشتہ داروں سے جنسی تعلقات) کا تذکرہ ہے۔

(۳۵) جنسیات پر پہلے بھی ناول لکھے گئے ہیں۔ ڈی ایچ۔ لارنس کا SONS AND LOVERS (مطبوعہ ۱۸۹۱ء)، ایمائل زولا کا NINA فلابرٹ کا MADAM BOVERY اور ہنری فیلڈ ینگ کا TOM JONES وغیرہ اس زمرے میں آتے ہیں۔ موخرالذکر دوناولوں پر زیر نظر مضمون میں پہلے تبصرہ آیا ہے۔ بلاشبہ یہ ناول سستے جنسی اور فحش pornographic ناولوں کے مقابل میں رکھے نہیں جاسکتے۔ ادبی لحاظ سے ان کا اپنا ایک مقام ہے لیکن ان پر مخرب الاخلاق ہونے کے الزامات عاید کئے گئے ہیں۔ اسی بناپر فلابرٹ کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ sons and lovers پر پابندی عاید کی گئی۔ Ton Jones کو اخلاق سوز بتایا گیا.... آگے چل کر جنسی بے راہ روی، ہم جنسی، incest اور ہیجان خیز جنسی مناظر ناولوں میں پیش کئے گئے جو جنسی محرکات کے موجب بنے ہیں۔

(۳۶) گولڈسمتھ کے ناول THE VICAR OF WAKEFIELD میں فادر Primrose کا خاندان ٹوٹ کر جڑتا ہے لیکن THE SOUND AND THE FURY میں جیسن کومپسن کے خاندان کا شیرازہ ایک دفعہ بکھر جاتا ہے تو پھر متحد نہیں ہو پاتا۔ کومپسن اور اس کی بیوی کیرولین زمانے کے تیور کو نہیں سمجھتے۔ ان کے چار بچے ہیں۔ کوئین ٹین، کیڈی، جیسن اور بنجی۔

بنجی جب بالغ ہوتا ہے تو سکول جانے والی ایک لڑکی کا پیچھا کرتا ہے اور عصمت دری کی کوشش کرتا ہے۔ سارا قصبہ آگ بگولا ہو جاتا ہے اور کومپسن خاندان خوف سے لرز اٹھتا ہے۔

پھر کوئین ٹین اور کیڈی کے درمیان ناجایز تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ کومپسن خاندان کے لئے یہ اخلاق سوز غیر فطری حرکت ناقابلِ برداشت ہے۔ کوئین ٹین کو اس کی مرضی کے خلاف ہاورڈ بھیجا جاتا ہے اور کیڈی کے لئے شوہر کی تلاش کی جاتی ہے۔ ہرجائی کیڈی کئی لوگوں سے ناجایز تعلقات رکھتی ہے۔ آخر کار ایک بنکر ہربرٹ ہیڈ سے اس کی منگنی ہو جاتی ہے۔ کیرولین اپنے بیٹے کوئین ٹین، کو

شادی میں شرکت کے لئے دعوت نامہ بھیجتی ہے۔ یہ خبر سن کر سر پھرا کوئین ٹین خودکشی کرتا ہے۔ کیڈی اور ہربرٹ کی شادی ہوتی ہے اور کیڈی ایک بچی جنتی ہے۔ کیڈی نوزائیدہ بچی کا نام بھائی کے نام پر کوئین ٹین رکھتی ہے۔

ادھر ایک اور بیٹا جیسن روپیہ بنانے کے چکر میں ہے۔ وہ ہفتے میں ایک بار بلاناغہ دوسرے قصبے میں واقع ایک قحبہ خانے کا چکر کاٹتا ہے۔ پھر کیڈی اور ہربرٹ کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور کوئین ٹین اپنی دادی کیرولین کے پاس رہنے کے لئے آتا ہے۔ کوئین ٹین خصلت میں اپنی ماں پر گیا ہے۔ اس کی حرکات دیکھ کر جیسن کو اپنے بھائی کوئین ٹین اور کیڈی کا سکنڈل یاد آتا ہے۔ کوئین ٹین سترہ برس کا ہوا ہے اور اس کی حرکتیں سب کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ جیسن اس کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے لیکن نگرانی کے باوجود کوئین ٹین ہر رات اپنی ایک من موجی سے ملنے جاتا ہے۔

ایک مرتبہ کیڈی کوئین ٹین کو ایک بڑی رقم بھیجتی ہے۔ جیسن چپکے سے اسے ہڑپ کرتا ہے اور ایک دن کوئین ٹین جیسن کی جمع کردہ ساری پونجی چرا کر، جو اس نے ایک کمرے میں چھپا رکھی ہے، اپنی محبوبہ کے ساتھ فرار ہو جاتی ہے۔ جیسن تعاقب کرتا ہے لیکن دونوں ریاست کی سرحد پار کر چکے ہوتے ہیں۔ جیسن دل ہی دل میں قتل کا منصوبہ باندھتا ہے۔

کومپسن خاندان کی بربادی مکمل ہو چکی ہے۔ مسز کومپسن کے مقدر میں آنسو ہی آنسو لکھے ہیں۔

(۳۷) کئی مشہور ناول اشاراتی اور علامتی انداز میں لکھے گئے ہیں جو ایک عام قاری کے لئے یوٹوپیا کے مترادف ہیں۔ جمیز جوئیس کا ناول Ulysses ایک دقیق تصنیف ہے۔ اس لئے بہت کم قارئین نے اس کی افادیت کو سمجھا ہے۔ Ulysses انگریزی ادب میں ایک لاثانی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ ایک تبصرہ نگار نے فرانس کے ایک ممتاز تنقید نگار اور جوئیس کے ایک مداح لارباڈ کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''Bloom (ناول کا کردار) اتنا ہی لافانی ہے جتنا Falstaff۔ اس حقیقت کے باوجود چند مہم جویانہ سپرٹ رکھنے والے قارئین ہی Bloom کے کریکٹر کو سمجھ پائیں گے۔ کیونکہ فکر انگیز اور دلچسپ ہونے کے باوجود Ulysses فہم و فراست سے بالا ایک انتہائی مشکل کتاب ہے اور دنیا میں فکشن کی کتابوں میں شاید سب

سے مشکل کتاب ہے تاہم یہ ایک نہایت ہی نفع بخش تصنیف بھی ہے۔''

اس کتاب کے قدر دانوں کی کمی نہیں۔ اردو کے نامور افسانہ نگار کرشن چندر نے لکھا ہے کہ ULYSSES ان کی پسندیدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔

امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں Ulysses شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایک فنطاسیہ بھی ہے۔ طنزیہ اور انشائیہ بھی ہے اور اس میں ایک ناول کے تمام اہم اجزاء اور عناصر ہیں۔ جیمز جوئیس نے اس کتاب پر سات سال کام کیا۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں چھپی۔

ناول آئیرلینڈ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور جوئیس نے انسانی نفسیات کی باریکیوں کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کتاب میں جا بجا ہومر کا حوالہ دیا ہے۔

(۳۸) اسی طرز کے دو مقبول ناول THE REVOLT OF THE ANGELS اور Moby Dick ہیں۔ تاہم دونوں ناول عام فہم ہیں۔

فرانس کے ممتاز قلم کار اناطول فرانس کا ناول The Revolt of the angels دنیا کے اہم ترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ نوبل انعام یافتہ اناطول فرانس خود نے بھی اسے اپنی بہترین تصنیف ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور عمومی طور پر نقادوں کی بھی یہی رائے ہے۔ کئی نقادوں نے لکھا ہے:

''The Revolt of the Angels سے بڑھ کر کسی اور تصنیف میں فرانس کے ادبی مزاج کو دل آویز اور موثر انداز میں اجاگر نہیں کی گیا ہے۔''

میں نے بذات خود یہ ناول نہیں پڑھا ہے۔ البتہ اس پر تبصرہ پڑھا ہے۔ یہ پہلی بڑی جنگ سے ذرا پہلے لکھا گیا تھا اور بقول ایک تنقید نگار اس دور کے حالات پر ایک پیغمبرانہ طنزیہ ہے۔

(۳۹) امریکی ناول نگار Herman Melvill کا ناول Moby Dick (مطبوعہ ۱۸۵۱ء) مہم جوئی سے متعلق ہے جس سے بدی پر سچائی کی فتح دکھائی گئی ہے۔ ایک وہیل مچھلی بحری جہاز کے کپتان اہب کو زخمی کرتا ہے۔ کپتان انتقاماً اسے مارنا چاہتا ہے۔ پُر اسرار وھیل کو شکار کرنے کی کوشش میں کپتان اور اس کے آدم خور ساتھی ہلاک ہوتے ہیں۔

پانچ سو صفحات کا یہ ناول سسپنس سے بھرا ہوا ہے۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ قاری ناول

کے ہر صفحہ سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔

سائنسی فکشن کو عالمی ادب میں خاص مقام حاصل ہے اور سائنسی موضوعات پر دنیا میں ہزاروں ناول لکھے گئے ہیں۔ کائنات کے سربستہ رازوں پر حاشیہ آرائی اور ہماری دنیا کے مستقبل پر سائنس کی ایجادوں اور تحقیقات کی اساس پر پیشین گوئی سائنسی فکشن کی خصوصیت ہے۔ سائنسی فکر ونظر رکھنے والا ایک منجھا ہوا قلم کار اس میں حقیقت کا رنگ بھرتا ہے۔

(۴۰) اڈولس ہکسلے ان چند پیشرو قلم کاروں میں ہے جنہوں نے سائنسی فکشن لکھنے کی شروعات کی۔ اس ضمن میں ان کا ناول BRAVE NEW WORLD افادیت کا حامل ہے۔ یہ ناول اس صدی کی تیسری دہائی کے دوران لکھا گیا ہے۔ ہکسلے نے اپنے انداز میں آنے والے کل کی دنیا کے سماج میں سائنس کی ایجادات اور اختراعات کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو ابھارا ہے۔ مملکت کے انکوبیٹر میں پانچ قسموں کے انسان تخلیق کئے جاتے ہیں۔ Alphas دانشور قسم کی مخلوق ہے جو دماغ سے کام کرتی ہے۔ Epsilons ادنیٰ قسم کی مخلوق ہے جو Alphas کے اشاروں پر کام کرتی ہے۔ روبوٹ کی ایجاد اس سلسلے کی ایک کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ آج کمپیوٹر وسیع پیمانے پر موثر انداز میں یہی کام کر رہا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ مستقبل میں ہمارے معاشرے کو کس نہج پر قائم کیا جانا چاہیے جو انسان کو تباہی سے محفوظ رکھ سکے۔

(۴۱) اسی قبیل کا اس دور کا ایک اور طنزیہ ناول جارج آرویل کا ۱۹۸۴ ہے جسے فلمایا گیا ہے۔ آرویل نے پہلی اور دوسری بڑی جنگیں دیکھی تھیں اور وہ کیمونزم اور فسطائیت سے نالاں تھا۔

INSEMINOID سائنسی فکشن کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ لیری ملر کے اس ناول کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس ناول کی اہم خصوصیت مصنف کی تخیل آرائی ہے۔ کہانی کی تھیم آج سے سینکڑوں اور ہزاروں برس سے تعلق رکھتی ہے جب انسان نے سائنس کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہوتی ہے اور ہمارے نظامِ شمسی سے باہر سیاروں کو مسخر کیا ہے۔

ناول کی شروعات ان الفاظ سے ہوتی ہے:

''خلائی جہاز پتھریلی زمین کو آہستگی سے چھو کر آگے دوڑنے لگا۔ ماہرینِ آثار قدیمہ کی ٹیم

کے ارکان اس سیارے کو دیکھنے لگے جو اگلے چھ ماہ کے لیے ان کا گھر بننے والا تھا۔

ایک صدی قبل دو سو ماہرین کی ایک ٹیم اس سیارے پر آئی تھی۔ مگر چھ ماہ کی جستجو کے بعد وہ یہاں کچھ بھی دریافت نہیں کر سکے تھے۔ تاہم ٹیم اپنی رہائش اور مطالعے کے لئے یہاں ایک عظیم الشان عمارت بنا کر گئی تھی.....

دو ہفتے بعد اس عمارت کی صفائی، مرمت اور خوراک ذخیرہ کرنے کے لئے تین آدمیوں کی ایک ٹیم کو یہاں بھیجا گیا تھا۔ نئی ٹیم کے ارکان کو امید تھی کہ وہ تین آدمی ان کا استقبال کریں گے لیکن وہاں انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے اور متعفن مادے کے سوا انہیں کچھ نہیں ملا۔

پھر بارہ افراد پر مشتمل ایک نئی ٹیم ایک خاتون ہولی میکالے کی سرکردگی میں جائے مقام پر پہنچی۔ ان کو زیر زمین چٹانوں میں اس ستارے کی تہذیب تلاش کرنی تھی۔ ایک غار میں انہیں تختیاں ملیں۔ جن پر اس زمانے کی ایسی پائیدار تحریریں تھیں جو لیزر شعاع سے نہیں مٹتی تھیں۔ سیارے پر سورج چھ گھنٹے میں غروب ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں سیارے کے لوگ بڑے ترقی یافتہ تھے۔ یہ مخلوق بڑی بسیار خور تھی اور عورتیں ہمیشہ توام بچے پیدا کرتی تھیں۔

غار میں ایک تابوت ملا جس میں سات فٹ لمبی مخلوق تھی جس کی جلد چھپکلی کی کھال کی مانند تھی۔ ناک کی جگہ ایک موٹا سا گومڑا ابھرا ہوا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے اور پتلیاں نہیں تھیں۔

کارل مخلوق کی چیر پھاڑ کرنے لگا۔ اچانک شیشے کے ایک کیس میں رکھے ہوئے بلور سے رنگ برنگی روشنی نکلنے لگی۔ جب اس ڈبے کو توڑا گیا تو بلور مائع گیس میں تبدیل ہوا۔ تحریر سے معلوم ہوا کہ اپنی نسل کو قائم رکھنے کے لئے تابوت میں ایک جوان کی لاش رکھی گئی ہے۔ رنگین بلوروں میں ایک انسان کو زندہ رکھنے کی خصوصیت ہے۔ پھر کیا تھا۔ پہلے ٹیم کے ایک رکن پر سیارہ کے عفریت کا اثر پڑا۔ پھر من موہنی سارہ پر بھی یہ اثر دکھائی دینے لگا۔ وہ باورچی خانے میں جا کر ساری خوراک چاٹ گئی اور جڑواں بچے کو جنم دیا۔

ناول کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ ٹیم کے ممبروں کا سراغ لگانے کے لئے تین ارکان پر مشتمل ایک اور ٹیم بھیجی گئی۔ جب خلا میں ان کو ٹرانسمیٹر کا جواب نہیں ملا تو وہ عمارت میں داخل ہوئے جہاں

انہیں انسانی ڈھانچے اور ہاتھ پیر نظر آئے۔ وہ جلدی سے خلائی جہاز میں لوٹے۔ اچانک باہر سے دروازہ کھڑ چنے کی آواز آئی۔ انہوں نے سوچا ٹیم کا کوئی فرد زندہ ہے جونہی دروازہ کھلا تو عجیب الخلقت مخلوق کا ایک جوڑا اچھلتا ہوا کاک پیٹ میں داخل ہوا اور تینوں پر جھپٹ پڑا۔''

(۴۳) جاسوسی فکشن آج کل بہت مقبول ہے۔ رابرٹ جے سٹرلینگ کا ناول PRESIDENT'S PLANE IS MISSING اخبار ''نیویارک ٹائمز'' میں سب سے زیادہ بکنے والی کتابوں میں تیس ہفتے تک سرفہرست رہا۔ یہ میرے پسندیدہ ناولوں میں ہے۔

تیسری جنگ عظیم کے مہیب سائے دنیا پر منڈلا رہے ہیں۔ ان حالات میں امریکی صدر کا طیارہ ایک نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوا ہے اور گم ہو جاتا ہے۔ دنیا کے سب سے دولت مند اور طاقت ور ملک کے صدر کے کھو جانے سے ساری دنیا میں سنسنی پھیلتی ہے۔ فضائیہ، بحریہ اور بری فوجوں کی طرف سے وسیع پیمانے پر طیارے کی تلاش کی جاتی ہے۔ دنیا کی نیوز ایجنسیاں لمحہ لمحہ صدر سے متعلق پوچھتی ہیں اور اخباری نمائندے پریس کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں جہاں ان کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

طیارے کا تباہ شدہ ڈھانچہ ملتا ہے جس میں ایک انسانی لاش ہوتی ہے۔ اس کی شکل صدر سے ملتی ہے لیکن صدر نہیں ہوتا۔ ایک عجیب معمہ ہے جو کتاب کے اختتام پر کھلتا ہے۔

آج کل بین الاقوامی اور ملکی سیاسیات اور احوال وکوائف پر سنسنی خیز اور دلچسپ جاسوسی ناول لکھے جا رہے ہیں۔

(۴۴) فلسفی اور ڈرامہ نگار جین پال سارتر کا ناول NAUSEA یکہ وتنہا انسان کے درد وکرب کو پیش کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کریکٹر کہیں ملازم ہے۔ ہمیشہ سفر میں رہتا ہے اور دنیا دیکھتا ہے لیکن سکون قلب سے محروم ہے۔ تنہائی اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں اپنے پر گزرنے والے سانحات اور واقعات کو قلم بند کرتا ہے۔

ناول کا ایک کردار مرکزی کریکٹر سے یوں گویا ہوتا ہے۔ ''میں غیر متوقع کام کرنا چاہتا ہوں جو میرے لئے بالکل نیا اور مہم جوئی سے بھرپور ہو۔'' جب وہ وضاحت چاہتا ہے تو وہ کہتا ہے۔ ''غلط

گاڑی میں سفر کرنا، گمنام مقام پر رکنا، بٹوا کھو دینا، غلطی سے گرفتار کرانا جیل میں رات گزارنا وغیرہ۔''

ناول سارترے کے اپنے نظریہ حیات وجودیت، کا غماز بھی ہے۔ ایک جگہ ایک کردار کہتا ہے۔ ''دنیا موجود ہے۔ آگے اور پیچھے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب یہ موجود نہیں تھی۔''

ایک آدمی جب اس کو ہوٹل میں انسان سے محبت کی بات کرتا ہے تو اسے اچانک متلی آتی ہے NAUSEA ۔ کچن کی چھری اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لیتا ہے۔ ہوٹل میں موجود لوگ حیرت اور خوف سے اس کو دیکھتے ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ وہ چھری کا غلط استعمال کرے گا پھر وہ ایک لخت پلیٹ میں چھری پھینکتے ہوئے وہاں سے چلا جاتا ہے۔

(۴۵) THE TRIAL فرانز کافکا کا مشہور ناول ہے جو اس کے انتقال کے بعد شایع ہوا۔ یہ ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جسے کسی الزم میں گرفتار کیا جاتا ہے لیکن الزام سے متعلق اس کو آخری دم تک اندھیرے میں رکھا جاتا ہے۔ دو آدمی سائے کی طرح ہر وقت اس کے پیچھے رہتے ہیں۔ جب وہ اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھتا ہے تو ایک آدمی کہتا ہے۔ ہمیں یہ انکشاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ تمہارے خلاف کاروائی شروع ہو چکی ہے اور تمہیں مناسب وقت پر مطلع کیا جائے گا۔ وہ اصرار کرتا ہے کہ اس کو وارنٹ گرفتاری دکھایا جائے لیکن وہ آدمی کہتا ہے ''ہم حکم کی تعمیل کر رہے ہیں.... ہمیں تمہارے معاملے میں ماسوائے اس کے کوئی واسطہ نہیں کہ روزانہ دس گھنٹے تم پر نظر رکھیں اور اپنی تنخواہ سے مطلب رکھیں۔''

اس کو پوچھ تاچھ کے لئے ایک عجیب جگہ لایا جاتا ہے۔ مجسٹریٹ سوال کرتا ہے۔ ''کیا تم پینٹر ہو؟''

''نہیں۔ میں ایک بنک کا جونیر منیجر ہوں۔''

مجسٹریٹ کی لاعلمی پر ہال میں قہقہہ بلند ہوتا ہے

جوزف اپنے کیس کو موثر انداز میں پیش کرتا ہوا الزام لگاتا ہے کہ اس کی گرفتاری کے پیچھے ایک بڑی تنظیم کا ہاتھ ہے لیکن اس کی بے گناہی کے ثبوت کے باوجود اسے بری نہیں کیا جاتا تاہم بنک کے کام پر جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔

وہ اب بدلا بدلا سا آدمی ہے۔ اس کی گرفتاری کی خبر سن کر اس کا چچا اس سے ملنے آتا ہے۔ چچا شکایت آمیز لہجے میں چلا کر کہتا ہے۔ ''تم بالکل بدل گئے ہو، جوزف! تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا

ہے۔ کیا تم اس مقدمے کو ہارنا چاہتے ہو؟ تم جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ تم بھی برباد ہو جاؤ گے اور تمہارے سارے رشتہ دار بھی برباد ہو جائیں گے۔"

جوزف جانکاہ اور صبر آزما حالات سے گزرتا ہے اور آخر کار پُر اسرار حالت میں اس کے سینے میں چھرا گھونپ کر اسے قتل کیا جاتا ہے۔

کافکا نے اس ناول میں ایک حساس انسان کی بے چارگی، عصری کرب اور انسانی زندگی کے تضادات کو اجاگر کیا ہے۔

زندگی میں چند تلخ تجربات کے بعد کافکا مذہب اور اخلاقیات کا منکر NIHILIST بن جاتا ہے اور اپنی ذات سے اس کو گہری نفرت ہو جاتی ہے۔ اس کا اس کی تخلیقات اور سوچ پر منفی اثر پڑا۔ اس نے اپنی کتابوں کو دوبارہ شائع نہ کرنے، غیر مطبوعہ تخلیقی مسودوں، خطوط اور اس کے متعلق دوسروں کے مضامین اور تحریروں کو بالکل نہ چھاپنے کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور پُر زور تاکید کی کہ اس کی تمام کتابوں اور تحریروں کو جلا دیا جائے تاہم اس کے دوست میکس بروڈ کی ترغیب اور کوششوں سے کافکا کی زندگی میں شائع شدہ کتابیں بک گئیں اور اس کے انتقال کے بعد دوبارہ شائع کیں۔

فرانز کافکا پراگ، چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوا لیکن سکونت جرمنی میں اختیار کی۔ کافکا کے منفی نظریات اور یاسیت کے پسِ پشت اس کے تلخ تجربات تھے۔ وہ حد سے زیادہ حساس تھا۔ باپ کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ ایک لڑکی سے اس کی شادی طے ہوئی لیکن پروان نہیں چڑھی۔ اس نے دوبارہ شادی کا ارادہ کیا لیکن تپ دق کا مرض شادی کی راہ میں رکاوٹ بنا اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بجائے کافکا کو سنی ٹوریم میں داخل ہونا پڑا اور ۱۹۲۴ء میں اکتالیس سال کی عمر میں فوت ہوا۔

(۴۵) فرانس کے فلسفی، ڈرامہ نگار اور ادیب ALBERT CAMU کے ناول THE FALL اور THE OUTSIDER میں بھی کافکا کے فکر و نظر کا پرتو ہے۔ البرٹ کیمو بھی کافکا کی طرح NIHLIST تھا۔ تاہم زندگی کے آخری ایام میں کیمو نے انسان دوستی کے جذبے کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ دوسری بڑی جنگ کے دوران فرانس پر قابض جرمن فوج کے خلاف انڈر گراؤنڈ مزاحمتی ایک گروپ کے قیام میں

اس کا بھی ہاتھ تھا۔

(۴۶) THE FALL میں کیمو JEAN BAPTISLE CLAMENCE کے نام سے ایک کردار پیش کرتا ہے۔ وہ پیرس کا ایک کامیاب بیرسٹر ہوتا ہے اور اس کا بے داغ کردار اور نیکوکاری سبھی کے لیے ایک نمونہ ہوتی ہے لیکن چند تجربات اور حادثات کے بعد یہ مثالی شہری اور نیک دل انسان ماحول کا غلام بن جاتا ہے اور نت نئی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بقول ایک نقاد ناول ہماری پوری نسل کے گناہوں کا مرقع ہے۔

(۴۷) The Outsider یہاں بھی مرکزی کردار صیغۂ واحد متکلم میں سارے واقعات سناتا ہے۔ The Outsider میں ایک کٹھور اور بے رحم دنیا میں ایک تنہا انسان کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔

دونوں ناولوں میں کیمو کا فلسفہ ABSURD اور NIHLISM کارفرما ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں کیمو کو ادب کا نوبل پرائز ملا۔

(۴۸) اگاتھا کرسٹی، اروینگ والس اور ڈینس روبینز کی کتابیں مسلمہ ادب عالیہ کے زمرے میں شمار نہیں کی جاتیں اگرچہ ان کی کتابیں ساری دنیا میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ خاص کر اگاتھا کرسٹی کے جاسوسی ناولوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اب تک سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابیں ہیں اور کسی بھی ادیب کو آج تک کتابوں سے اتنی آمدنی نہیں ہوئی ہے جتنی اگاتھا کرسٹی کو ہوئی ہے۔

انہوں نے ایک سو دس کتابیں لکھیں جن کا اب تک دنیا کی ۱۵۷ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہوئی ہیں۔ ان کے پندرہ ناولوں پر فلمیں بنائی گئیں۔

ڈینیس روبینز کی THE CARPET BAGGERS اور اروینگ والس کی THE PRIZE اپنی کہانی، سٹائل، تکنیک اور اسلوبِ نگارش کے لیے خاص مقام رکھتی ہیں۔ THE CARPET BAGGERS میں سیرت نگاری کی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ والس نے THE PRIZE میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ نوبل پرائز دلانے میں ججوں کے تعصّبات کو دخل ہوتا ہے اور کئی دفعہ شہرۂ آفاق ادیبوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

کچھ قلم کار ایسے باوقار اور ذہین کردار پیدا کرتے ہیں جن کے لیے قاری کے دل میں احترام

پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کریکٹر احترام، محبت اور خوف کے ملے جلے احساسات پیدا کرتے ہیں۔

(۴۹) مصنف سر کینن ڈوئل کو لوگ اتنا نہیں جانتے تھے جتنا ان کے جاسوسی ناولوں کے ذہین سراغ رساں SHERLOCK HOMES کو جانتے تھے۔ سر کینن ڈوئل نے ایک دفعہ شرلوک ہومز کے کریکٹر کو خارج کرنے کا اعلان کیا تو لندن میں لوگوں نے مظاہرے کئے اور منصف کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ ایک زندہ انسان کی طرح قارئین کو اس فرضی اور خیالی کردار سے غیر معمولی جذباتی وابستگی پیدا ہوگئی تھی۔

(۵۰) اگاتھا کرسٹی کے جاسوسی ناولوں کا ماہر سراغ رساں HERCULE POIROT مارا گیا تو اخبار نیویارک ٹائمز نے پہلے صفحے پر اس کی موت کی خبر شائع کی اور اگاتھا کرسٹی کے زرخیز دماغ نے اپنی نئی سراغرساں MISS JANE MARPLE کو میدان میں اتارا۔

(۵۱) اسی طرح روبینز نے JONA CORD اور NEVADA SMITH کے ناموں سے ایسے کردار تخلیق کئے ہیں جن میں بشری کمزوریاں تو ہیں لیکن انہیں بیباکی، لا ابالی فطرت، ذہانت اور انفرادیت کی وجہ سے بقائے دوام ملا ہے۔

......●●●......

☆......عبدالغنی شیخ

لداخ کے بعض عقائد اور اوہام

لیہہ میں سنسنی پھیلی تھی۔ گھر گھر میں ایک ہی چرچا تھا۔ بات یہ تھی کہ ایک آدمی پُر اسرار طور غائب ہوا تھا۔ چار روز بعد وہ شکستہ اور خستہ حال گھر لوٹا۔ اس چار روز میں وہ بالکل بدل گیا تھا۔ آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔ گال پچک گئے تھے اور چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

اس کے اہلِ خانہ کا کہنا تھا کہ رات کے آخری پہر وہ اپنے بستر میں نہیں تھا۔ سرہانے کے پاس اس کے جوتے جوں کے توں پڑے تھے۔ وہ نہایت ہی سراسیمہ نظر آتا تھا۔ گھبرایا گھبرایا اس نے بیان دیا کہ رات کے اندھیرے میں ایک غیر مرئی طاقت اس کو بستر میں سے لے گئی اور لیہہ سے چار کلومیٹر دور سپتک کی کھریا مٹی کے ٹیلے کی ایک کھائی میں رکھا اور کھانے کو کھریا مٹی دی۔

قصبے میں گاہے گاہے ایسی وارداتیں ہوتی تھیں۔ تب لیہہ کی آبادی چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اور ہر واقعہ آگ کی طرح قصبے میں پھیل جاتا تھا۔

رات کو کسی کے پراسرار طور غائب ہونے کی واردات کے لئے لداخی زبان میں 'ڈیپ ٹیت' کی اصطلاح ہے۔ جس کا لفظی مطلب شیطان یا بھوت پریت کا کسی کو بھگا کر لے جانا ہے۔ اُن دنوں لوگ کہتے تھے کہ سپتک کی کھریا مٹی کے ٹیلوں میں بھوت پریت رہتے ہیں۔ عجب عجب کہانیاں سننے کو ملتی تھیں۔ لوگ باگ سرِ شام وہاں چلنے سے گھبراتے تھے۔ آج کل ان ٹیلوں کے آس پاس فوجی بارکیں بنی ہیں اور لیہہ کا ہوائی اڈہ اس کے بالکل سامنے ہے۔

لمبا عرصہ ہوا۔ 'ڈیپ ٹیت' کا ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ہم لیہہ سے سرینگر بس میں سفر کر رہے تھے۔ دراس میں ہم نے رات گزاری۔ صبح مسافروں میں ہل چل سی مچی۔ ایک مسافر اپنے بستر سے غائب تھا۔ اس کے جوتوں کی جوڑی بستر کے پاس پڑی تھی۔ وہ دو پہر کو لوٹا۔ اس کی حالت بری تھی۔ دونوں پیر زخمی ہوئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک غیر مرئی طاقت اس کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ساری رات اس کو پہاڑوں پر گھمایا۔ بیچ بیچ میں چند لمحوں کے لئے اس کو ہوش آجاتا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ میں کہاں آیا ہوں۔ اسے پہلے کہ وہ واپس اپنی جگہ لوٹے۔ اس پر مدہوشی اور خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ مسافر لیہہ کے پاس ایک گاؤں کا رہنا والا تھا۔ وہ بہت خوفزدہ تھا۔ میں نے سنا۔ سرینگر میں اپنے چند روزہ قیام کے دوران وہ خاموش رہا اور روتا رہا۔

ایک اور واقعہ مجھے یاد ہے۔ لیہہ کی پہاڑی پر پوجا ہو رہی تھی۔ جو ایک غیر معمولی بات تھی۔ لوگ لیہہ بازار سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ پوجا کا جواز یہ دیا جا رہا تھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع مٹھ میں ایک متحرک انسانی دھڑ پوتر چراغ دان کے تیل کو ضائع کر رہا تھا۔ اس کا چشم دید گواہ مٹھ کا پجاری تھا۔ چھوٹے سے قصبے میں یہ خبر پھیل گئی تھی۔ تب لوگ اس خبر کو اس طرح لے رہے تھے گویا یہ ایک معمول کا واقعہ ہے۔ آج ذرائع ابلاغ اس واقعہ کو ساری دنیا میں پہنچا دیتے۔

بھوت پریت کا چرچا ہر سماج اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ انگریزی میں بھوت کے لئے کئی الفاظ ہیں۔ جن میں ghost اور spirit زیادہ مقبول ہیں۔ یہ عموماً مرنے والے کی روح کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ جو دُنیا میں مرئی یا غیر مرئی صورت میں واپس آتی ہے اور زندوں کو ہراساں کرتی ہے۔ کوئی کوئی روح اچھی ہوتی ہے جو زندوں کی مدد کرتی ہے لیکن اکثر بے چین روحیں ہوتی ہیں۔ جن کی اکثریت بے گناہ مہلوکین یا مقتولین کی ہوتی ہے۔

عام طور پر ایک بدروح مکان پر ڈیرہ جماتی ہے اور مکینوں کو مکان سے نکالنے کے لئے سرگرداں اور کوشاں ہوتی ہے۔ ہر شہر اور ہر قصبے میں ایسے آسیب زدہ Hunted House مکان یا مکانات ہوتے ہیں جن کو مکینوں نے مجبوراً خالی چھوڑا ہے۔ آسیبی مکان سے آسیب اتارنے کے لئے جانکاروں اور پجاریوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ مغرب میں بھوت پریت پر تحقیقی کام ہوا ہے

اور کتابیں چھپی ہیں۔ کئی ٹی وی چینلوں سے بھوت پریت پر فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ انٹرنیٹ پر بھوتوں سے متعلق بڑی معلومات دی گئی ہیں۔ جنوبی انگلینڈ کا ایک گاؤں پلک لے (Pluckley) کو سب سے زیادہ آسیب سے متاثرہ گاؤں قرار دیا گیا ہے۔ یہاں بیک وقت بارہ بھوت اور بھوتنیاں دیکھی گئی ہیں۔ جن میں دو مہلوکین اور دو خودکش افراد ہیں۔ ایک بے چین اور مضطرب عورت کی بھتنی اپنے گم شدہ بچے کی کھوج میں لگی ہے۔ ایک فریب نظر (Phantom) بگھی بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح امریکہ کی ریاست چیکاگو کا شہر CRESTWOOD بھوتوں کی بھرمار کی وجہ سے بھوتوں کا شہر کہلاتا ہے۔ یہاں سائنس خاموش ہے۔ ایسے میں ان واقعات کو مابعد الطبیعیات (Metephysical) مافوق الفطرت (Supernatural) اور واہمہ کہہ کر ٹالنا مشکل ہے۔

بھوتوں کی دو اقسام بتائی جاتی ہیں۔ ایک مرنے والے کی روح یا بدروح اور دوسری ایک اور ایذا رساں مخلوق ہے جس کو شیطان یا Devil کہا جاتا ہے۔ اردو اور انگریزی میں ان دو قسموں کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ اُردو لغت میں مرنے والے کی بدروح کے لئے نُشور کا لفظ دیا گیا ہے جو عام مستعمل نہیں ہے۔ لداخ زبان میں ان کو واضح کیا گیا ہے۔

اول الذکر کو شینڈے کہا جاتا ہے۔ جس کا لفظی مطلب مرنے والے کا بھوت ہے جبکہ دوسرے کو لنڈے کا نام دیا گیا ہے۔ ڈے بھوت کو کہتے ہیں۔ بستر سے مذکورہ سوئے آدمی کو بھگا کر لے جانے والا اور مٹھ کے چراغ کو نقصان پہنچانے والا لنڈے ہوسکتا ہے۔ روایات کے مطابق لنڈے مختلف شکلوں اور بھیس میں نمودار ہوتا ہے۔

میں نے لداخ میں یہ کہتے سنا ہے کہ جہاں پیڑ پودے ہوں، وہاں لنڈے نہیں ہوتے ہیں۔ لداخ میں پیڑ پودے کم ہیں۔ اس لئے لنڈے زیادہ ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ رات کو سفر کرتے وقت اپنے ساتھ کھانے کی کوئی چیز رکھنی چاہیئے۔ راستے میں آنے والے یا پیچھا کرنے والے بھوت پریت کو ٹرخانے کے لئے اس کی راہ میں تھوڑا تھوڑا کھانا پھینکتا ہوا اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہیئے۔

لداخ میں شینڈے اور لنڈے کی واردات اور روایات پر روشنی ڈالنے سے پہلے اس موضوع

پر میں ان بیرون لداخ کی چند مثالیں دوں گا تا کہ اس تناظر میں لداخ میں بھوت پریت کی وارداتوں کو سمجھا جاسکے۔

ابرہیم لنکن کو کون نہیں جانتا؟ وائٹ ہاؤس میں ابراہیم لنکن کے بھوت کی آمد کا بہت تذکرہ ہوا ہے۔ بہتوں نے اس کی شہادتیں دی ہیں۔ صدر لنکن کو ۱۸۶۵ء میں ایک شخص ویکس بوتھ نے واشنگٹن کے ایک تھیٹر میں قتل کیا تھا۔ سیاہ کپڑے میں ملفوف ان کے تابوت کو تجہیز و تکفین کے لئے ایک ریل گاڑی میں لیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ایک اور ریل گاڑی دیکھی گئی تھی جس میں ہو بہو وہی تابوت تھا۔ یہ محض نظر کا فریب Phantom تھا۔

کم سے کم دو امریکی صدور کی خاتونِ اوّل کی بھتنیاں بھی وائٹ ہاؤس میں دیکھی گئی ہیں۔ اہم شخصیتوں میں برطانوی وزیر اعظم بنجمن ڈزرائیلے (۱۸۰۴ء۔۱۸۸۱ء) کو مرنے کے بعد اپنے مکان میں دیکھا گیا۔ عام طور پر وہ مکان کی بالائے منزل پر چلتا ہوا نظر آتا تھا۔

امریکی ادیب واشنگٹن اروینگ کے ایک دوست بھانجے اور اس کی دو بیٹیوں نے گواہی دی ہے کہ انہوں نے نیویارک میں واقع اروینگ کے مکان اور لائبریری میں ان کی روح کو انسانی جثہ میں دیکھا۔

ملکہ وکٹوریہ کی سب سے بڑی بیٹی ملکہ الزبتھ اوّل اور ہنری ہشتم کی چھٹی بیوی جین سیمور کی بھتنیاں دیکھی گئی ہیں۔ جین سیمور ہر ۱۲/ اکتوبر کو لندن کے مضافات میں واقع ہیمپٹن کورٹ پیلس میں نمودار ہوتی تھی۔ ۱۵۳۷ء میں اس روز اس کا بیٹا ایڈورڈ پیدا ہوا تھا۔

پندرھویں صدی کے نامور انگریز جہاز ران اور محقق سر والٹر ریلے کو لندن میں ملکہ کی قیام گاہ اور خونی ٹاور کے درمیان پشتے پر چلتا ہوا دیکھا جاتا ہے۔ اس ٹاور میں وہ تیرہ سال قید رہا تھا۔

عام طور پر مقتول، مظلوم، مغموم اور بے تاب روحیں دنیا میں منڈلاتی رہتی ہیں۔ جنہیں مرنے کے بعد شاید دوسری دُنیا میں چین نہیں ملا ہے۔

انگلینڈ کے بادشاہ چارلس اوّل کا بلاسر کا بھوت اکثر دیکھا گیا ہے۔ ۱۶۴۹ء میں چارلس کا سر تن سے جدا کیا گیا تھا۔

ملکہ میری کے ایک درباری کی بیوی الزبتھ کی پشیماں روح اپنے بچے کا خون صاف کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔اس نے اپنے بچے کو قتل کیا تھا۔

Titanic فلم مشہور ہے۔اس نام کا سمندری جہاز ۱۹۱۱ء میں سمندر میں غرقاب ہوا تھا اور پندرہ سو سے زائد انسانوں کی جانیں چلی گئی تھیں۔ ایک کتاب میں لکھا ہے۔ اس میں ایک ممی کو نیویارک میوزم بھیجا جارہا تھا۔ممیائی گئی نعش ۱۶۰۰ء قبل مسیح ایک مصری شاہزادی کی تھی۔ڈوگلس مورے نام کے ایک انگریز نے ۱۹۱۰ء میں اسے قاہرہ میں خریدا۔ اس کے بعد مورے اور اس سے وابستہ گئی افراد پر مصائب کا سلسلہ شروع ہوا۔سات لوگ مرگئے۔ ہر ایک نے اس کی وجہ اسی ممی کو قرار دیا اور اس سے نجات حاصل کی گئی۔ برٹش میوزیم سے یہ نیویارک میوزم منتقل ہوئی۔اسی طرح انسانی کھوپڑی نے بھی اس کے مالک کا جینا حرام کیا ہے اور زندہ انسانوں سے انتقام لیا ہے۔

تاہم سارے بھوت بُرے نہیں ہوتے۔اچھے بھوت بھی ہیں۔ایک ماں کی ممتا بھری بھوتنی نے ایک ڈاکٹر کو اپنے بیمار بیٹے کے علاج کے لئے گھر لیا تھا۔ہوائی جہاز کے حادثے میں مرے ہوئے ایک ہواباز کی روح نے انسانی صورت میں آ کر دوسرے ہواباز کو بروقت اطلاع دے کر اس کے ہوائی جہاز کو حادثے سے بچایا تھا۔ایک بھوتنی نے ایک آدمی کی وساطت سے اپنے شوہر کو ضروری پیغام بھیجا تھا۔شمالی انگلینڈ کے یارک شہر میں ایک عورت کی بھوتنی گاڑیوں کے آگے دوڑتی تھی۔ جہاں خطرہ ہوتا، وہ گاڑیوں کی رفتار کو کم کر دیتی تھی۔ اس عورت کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا۔ایک ڈرائیور نے ترس کھا کر اس کو اور اس کے بچے کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے ڈرائیوروں کے تئیں اپنا احسان چکا رہی تھی۔

سترھویں صدی کی ایک ادیبہ Patience Werter سے متعلق میں نے یہ پڑھا کہ اس نے بعد مرگ J.A. Curran نام کی ایک عورت کو املا دے کر ناول لکھوائے۔ warter امریکہ میں ماری گئی تھی۔

مغرب نے بھوت پریتوں کی وارداتوں کو ڈھکے چھپے بغیر بلا چوں و چرا منظرِ عام پر لایا ہے۔مشرق کے معاشرہ میں بھوت کا آنا اور ذکر کرنا اس خاندان کے لئے باعث بدنامی اور معیوب سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان کے ایک جریدہ میں لکھا ہے کہ کراچی میں امریکی سفارتخانہ کو بھوت سے ہراساں اور نالاں ہوکر خالی کرنا پڑا تھا۔ یہ ان دونوں کی بات ہے جب کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ انگریزی اخبارات میں کبھی کبھی مرنے والے کے بھوت کی آمد کے بارے میں خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

بہت سال پہلے انگریزی جریدہ Illustrated weekly of India اور اردو رسالہ 'بانو' میں تصویروں کے ساتھ ایک سنسنی خیز مضمون چھپا تھا۔ یہ کراچی کی ایک لڑکی طاہرہ کے بارے میں تھا جو گاڑی کے ایک حادثے میں ہلاک ہوئی تھی۔ ایک پولیس افسر گاڑی میں جارہا تھا۔ ایک لڑکی نے لفٹ مانگی۔ افسر نے لڑکی کو پچھلی نشست پر بٹھایا۔ لڑکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے بدن پر زخم تھا۔ جس سے خون رس رہا تھا۔ پولیس افسر نے پوچھا کہ وہ کیسے زخمی ہوئی تھی تو اس نے پولیس افسر کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ ایک مکان کے پاس لڑکی گاڑی سے اتر گئی اور اندر چلی گئی۔ پولیس افسر نے مکان کو نوٹ کیا اور دوسرے روز لڑکی کی خیر خیریت پوچھنے آیا۔ ستر سالہ ایک بزرگ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ کمرے میں لڑکی کا فوٹو آویزاں تھا۔ جب پولیس افسر نے لڑکی سے متعلق دریافت کیا تو بزرگ بولا ''یہ میری بیٹی طاہرہ ہے۔ دو سال پہلے ایک سڑک حادثہ میں وہ چل بسی تھی۔'' پولیس افسر بھونچکا رہ گیا۔

ایک سال پہلے اسی تاریخ کو ایک فارسٹ افسر سے لڑکی نے لفٹ مانگی تھی۔ وہ فارسٹ افسر ایک حادثے میں ہلاک ہوا۔

اب کے پورے کراچی شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ اور شہر کی پوری آبادی اس دن کا انتظار کرنے لگی۔ جب وہ لڑکی اپنے مرنے کے بعد دو مرتبہ نمودار ہوئی تھی اور لفٹ مانگی تھی۔

مجھے بھوت پریت سے متعلق ہمیشہ تجسّس رہا ہے۔ میں نے لیہہ میں ان اشخاص سے 'شینڈے' سے متعلق دریافت کیا۔ جن کی رہائش گاہیں آسیب زدہ تھیں اور غالباً یہ شینڈے تھے۔

ایک مکان کے ایک کمرے میں بھوت آتا تھا اور مکینوں پر مٹی پھینکتا تھا۔ مالک مکان نے مجھے بتایا۔ میں نے بذاتِ خود اس کی تصدیق کرنا چاہی۔ بھوت سے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ کمرے میں مٹی پھینکتا ہے۔ ہم تین آدمیوں نے اس کمرے میں ایک رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اپنے ساتھ ٹارچ رکھے۔ پھر ہم نے کمرے میں مٹی، دھول اور گرد جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ چھت پر جھاڑو پھیری۔

کھڑکی اور دروازے کو بند کیا اور سو گئے۔ اچانک اندھیرے میں کچھ چیز پھینکنے کی آواز سنی۔ ہم ہڑبڑا کر آناً فاناً کھڑے ہوئے۔ ٹارچ جلایا۔ کمرے میں تازہ مٹی پھینکی تھی۔ کھڑکی دروازے بند تھے۔ ہم گھبرائے گھبرائے دوبارہ لیٹ گئے۔ ہمیں جو اندیشے تھے، وہ ہو کے رہے۔ دوبارہ مٹی پھینکی۔ ٹارچ جلایا اور مٹی پھینکی گئی تھی۔ ہمارے ایک ساتھی نے کہا کہ اس کو تھپڑ بھی مارا اور تصدیق ہوگئی کہ کمرے میں ایک غیر مرئی مخلوق مٹی پھینکتی ہے۔ اس کے بعد کسی نے اس کمرے میں رات نہیں گزاری۔

دوسرے آسیب زدہ مکان کا بھوت اسے کہیں زیادہ تیز وطرار تھا۔ دونوں مکانوں کے درمیان ایک کلومیٹر سے کم فاصلہ ہے۔ اس میں میاں بیوی رہتے تھے۔ میاں نے مجھے بتایا:

''بھوت ہمیں بڑا تنگ کرتا تھا۔ اس کی شرارتیں رات کی تاریکی میں ہوتی تھیں۔ کبھی دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ کبھی طاق سے برتن گراتا تھا۔ ایک رات چولہے پر گوشت کا ایک ٹکڑا رکھا تھا۔ دیا جلاتا تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔'' ان دنوں لیہہ میں بجلی نہیں تھی۔

پھر وہ بولا'' ایک رات میں ایک کمرے دفتری کام کر رہا تھا۔ میری بیوی اور دوسری عورت دوسرے کمرے میں اون دُھن رہی تھی۔ اچانک انہوں نے چیخ ماری۔ میں فوراً اُن کے پاس پہنچا۔ دونوں بڑی خوف زدہ تھیں۔ کسی غیر مرئی وجود نے بکری کی کھال زور سے انکے سامنے پٹخ دی تھی۔ ایک رات بھوت نے نیچے جانے کے دروازے کو کنڈی ڈالے بغیر یوں بند رکھا تھا۔ کہ زور لگانے سے تھوڑا کھل جاتا تھا۔ ہمیں بیت الخلاء جانے کی ضرورت تھی۔ ہم نے مجبوراً اپنے پڑوسی کو پکارا اور ان کی مدد چاہی۔ اس کی چھت سے نیچے جانے کی ہماری سیڑھی نظر آتی تھی۔ اس نے چھت پر سے دیا دکھایا اور دروازہ یک لخت کھل گیا۔ اس رات ہم نے بالشتیا نما ایک مخلوق کو سیڑھی سے نیچے جاتے دیکھا۔ بھوت ہمیں اس مکان سے نکالنے کے لئے پیچھے پڑا تھا۔ ہم بڑے سراسیمہ تھے۔ روز بروز اس کی شرارت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم رات کو دیا اور ماچس اپنے سرہانے کے سامنے رکھتے تھے۔ ایک رات زناٹے دار آواز کے ساتھ طاق سے برتن گرا۔ میں نے دیا جلانے کے لئے ماچس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دیا اور ماچس نہیں تھے۔ ہم بڑے خوف زدہ ہوئے۔ کھڑکی کا چلمن ہٹایا۔ ہلکی سی روشنی آئی۔ پو نہیں پھٹی تھی۔ سردی کا موسم تھا۔ اس کے باوجود ڈر کے مارے جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے غائب تھی۔

رضائی لپٹے بیٹھے بیٹھے صبح کے اجالے کا انتظار کرنے لگے۔ جب کمرے میں روشنی آئی تو یہ دیکھ کر ہم بڑے حیران ہوئے کہ بھوت نے ماچس اور چراغ چوکی سے اٹھا کر طاق پر لئے تھے اور چراغ کی لو کو نیچے کیا تھا۔''

میں نے سوچا کہ بھوت کتنا چالاک اور سمجھ دار ہے۔

''ہم نے ہار مان لی اور اس مکان کو خالی کیا۔ ہم نے سنا ہمارے بعد اس کرایے کے مکان میں ایک لداخی میاں اور بیوی ٹھہرے تھے اور دوسرے روز مکان خالی کیا تھا۔ عورت کے مطابق ایک عجیب الخلقت مخلوق دروازے کے پاس آ کر بیٹھی اور اس کی طرف حیرت سے نظریں جمائے دیکھتی رہی۔ غالباً وہ اس مکان میں ایک اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ ڈر کے مارے عورت کی گھگی بند ہوگئی اور کسی کو مدد کے لئے پکارنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس رات اس کا شوہر نہیں تھا۔ روشنی آنے پر وہ مخلوق غائب ہوگئی۔ میں نے سنا انہوں نے دوسرے روز مکان کو خالی کیا۔''

اب اس مکان کا تعمیر نو ہوا ہے اور بھوت بھی غائب ہوا ہے۔

ایک اور آسیب زدہ مکان کی مالکن نے مجھے بتایا کہ اس کے مکان کے کمرے میں بھوت آتا تھا۔ جو اس نے کرایہ پر دے رکھا تھا۔ کرایہ دار کچھ مدت کے بعد کمرہ چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ کرایہ داروں کے مطابق کمرے میں ساڑھی پہنی ہوئی ایک عورت آتی تھی۔ یہ عورت کون ہوسکتی ہے اور اس کے پیچھے کون سی کہانی ہے؟ کہنا مشکل ہے۔ وزیر زور آور سنگھ کی لداخ پر فوج کشی کے دوران لداخیوں نے کئی دفعہ بغاوتیں کی تھیں اور ڈوگرہ سپاہیوں کا قتل عام کیا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ افسر اپنی بیویاں ساتھ لائیں تھیں۔ جنہوں نے اپنی شوہروں کے ہمراہ کیلاش اور جھیل مانسرور کی یاترا کی تھی۔ اپنی بیویوں کو لیہہ چھوڑ کر وہ تبت کے محاذ پر لڑنے گئے تھے۔ تبت کے محاذ پر ناکامی کے بعد ایک اور بغاوت ہوئی تھی۔ شاید اس میں کوئی عورت ماری گئی ہو۔ یہ محض قیاس آرائی ہے۔ ایک کرایہ دار کی بیوی شوہر کی غیر موجودگی میں اس کمرے میں رہنے سے ڈرتی تھی۔ اور مالک کے پاس آئی تھی۔ بعد میں نیا کرایہ دار عورت سے پہلے پوچھتا تھا کہ کمرے میں بھوت تو نہیں آتا ہے۔ اس کے سارے کرایہ دار غیر مقامی ہوتے تھے۔ عورت نے اعتراف کیا کہ اس نے ایک کرایہ دار کو ٹوکا کہ وہ کیوں اس کے گھر کو بدنام کر رہا

ہے۔ وہ کمرہ اس کی آمدنی کا ایک وسیلہ تھا۔

اسی اثناء میں ایک اور آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کرایہ پر رہنے آیا۔ اس کے کان میں بھنک پڑی تھی کہ اس کمرے میں بھوت آتا ہے۔ وہ نو وارد بولا کہ وہ بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا ہے۔ بھوت پریت نرا واہمہ ہے۔

آدھی رات کے لگ بھگ ان کے کمرے سے چیخنے کی آوازیں آئیں اور دونوں میاں بیوی باہر بھاگ آئے۔ بھوت نے ان میں ایک کا گلا دبایا تھا۔

اس عورت نے بتایا کہ بعد میں ایک بڑے لامانے آسیب اتارا۔ تب سے اس کمرے میں کوئی بھوت نہیں آیا۔

یہ سارے واقعات نصف صدی پہلے کے ہیں۔ زمانہ حال میں ایسی چند اور واردا تیں سنیں۔ ایک لڑکی کو اس کے شوہر اور نند نے ایذائیں دی تھیں اور وہ پُر اسرار طور چل بسی تھی۔ اس کی بے چین روح میکہ اور غالباً سسرال میں آکر مکینوں کو ہراساں کرنے لگی۔ ایک کرایہ دار نے مجھے یہ حیران کُن واقعہ سنایا اور وہ بُری طرح جُتی تھی کہ میں کمرہ چھوڑ کر چلا جاؤں۔ پھر میں نے صورت حال کا سامنا کرنے کے لئے ایک لڑکے کو ساتھ رکھا۔ روح نے بھی ایک ساتھی لایا۔ تب کمرے میں اندھیرا تھا۔ لڑکا بولا، ''دیکھ چاچا وہ آج کسی اور کو بھی لایا ہے۔'' دونوں اوپر طاق پر ایسے بیٹھے تھے جیسے دو مرغے بیٹھے ہوں۔ میں روز بروز کمزور ہو رہا تھا۔ ایک مولوی صاحب بولے کہ روح نے اپنے ساتھ ایک جن لایا ہے، کمرہ چھوڑ کر جاؤ، نہیں تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گے۔ اسی اثناء میں ایک عورت کرایہ دار دوسرے کمرے میں رہنے کے لئے آئی تھی۔ رات کو عورت نے میرے کمرے میں آکر شکایت کی میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ میں نے کہا کہ میں نے دستک نہیں دی۔ وہ دوبارہ آئی اور یہی شکایت کی۔ میں نے کہا، ''میرے دروازے پر کنڈی لگاؤ اور صبح کھول دو''۔ عورت نے کنڈی نہیں لگائی البتہ ہم تاک میں رہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ پھر ہم دونوں نے دیکھا کہ سفید لباس میں ملبوس ایک نوجوان لڑکی ہوا کے دوش پر زمین سے بالا بالا چل رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ہم دونوں نے بہتیری تلاش کی۔ بیت الخلاء تک دیکھا لیکن نظر نہیں آئی۔

بھوت سے متعلق میں نے پڑھا ہے کہ یہ انسان کی طرح زمین پر پیر رکھ کر نہیں چلتا ہے بلکہ زمین کے اوپر float کرتا ہے۔ بھوت کو کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازے مطلوب نہیں ہے۔ وہ کہیں سے بھی کمرے میں گھس سکتا ہے۔ نیز بھوت چھت کے ساتھ چھوٹی سی جگہ پر رہ سکتا ہے۔

عورت نے اس کے دوسرے روز کمرہ خالی کیا اور اس کے بعد پہلا کرایہ دار بھی وہاں سے نکل گیا۔ اور مکان کے دروزے پر ایک بڑا سا تالا لگا تھا۔

ایک ڈرائیور لیہہ کے ایک گاؤں ہمس سے لیہہ لوٹ رہا تھا۔ ہمس کے پاس پل کے ناکے پر ایک جوان مرد اور عورت نے اس سے لفٹ مانگی۔ ڈرائیور نے انہیں بٹھایا۔ راستے میں عورت نے ایک عجیب سے بات کہی۔ میرا بچہ لیہہ کی ہاوسنگ کالونی میں کئی ماہ سے دودھ کے لئے ترس رہا ہے۔

ڈرائیور نے کیبن کی روشنی جلائی اور پیچھے مڑ کو دوسواریوں کو دیکھا۔ عورت مرد سے چمٹتی ہوئی بولی۔ ''یہ آدمی کیا کر رہا ہے! یہ آدمی کیا کر رہا ہے!''

ڈرارئیور نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ عورت اور مرد نارمل انسان نہیں لگتے ہیں اور سہمے سہمے گاڑی چلانے لگا۔ راستے میں ایک گاؤں آیا جہاں اس کا جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس نے بہانہ کیا کہ گاڑی میں کچھ خرابی ہوئی ہے۔ اپنے دوست کے گھر سے سامان لاکر ٹھیک کریگا۔ وہ گاڑی سے نکل کر اس گھر میں گھس گیا اور اہل خانہ کو بتایا کہ اس کی گاڑی میں دو بھوت ہیں۔ انہوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ وہ ایک آدمی کے ہمراہ گاڑی تک آیا۔ گاڑی میں کوئی نہیں تھا۔ بقول ڈرائیور اس نے پھُر کی آواز کے ساتھ کسی کو گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے سنا۔

ڈرائیور سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ اس مکان کے مالک نے تصدیق کی کہ ڈرائیور نے اس کے ٹرک میں دو بھوتوں کی موجودگی کا ذکر کیا۔ خوفزہ ڈرائیور کو اس رات گاڑی چلانے کی ہمت نہیں ہوئی اور رات اسی مکان میں گزاری۔

اسے کچھ عرصہ پہلے ہمس کے پُل سے ایک گاڑی دریا میں گری تھی اور چند مرد اور عورتیں اس حادثے میں مر گئے تھے۔ یہ لوگ ہمس میلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ ان میں ایک بدنصیب ماں بھی تھی جو اپنے دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر آئی تھی۔

لیہہ ۔ چنگ تھانگ کے ایک دورافتادہ راستے پر ایک تنہا گھوڑسوار کا تذکرہ میں نے اکثر سنا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے آنے والا اکیلا گھوڑسوار اس کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ ایک ہم سفر ملا ہے۔ وہ اپنے گھوڑے کو تیز چلا کر اسے جا ملتا تھا اور اس کے ہم رکاب چلتا تھا۔ پہلا گھوڑسوار جو دراصل اسی جگہ گھاٹی میں گھوڑے سے گر کر ایک مرے ہوئے بدطینت آدمی کا بھوت ہوتا ہے۔ کسی ڈھلان یا موڑ پر دوسرے گھوڑسوار کو دھکا دے کر نیچے گہری گھاٹی میں گرادیتا ہے۔ یہ واقعہ مشہور تھا۔ چنانچہ تنہا گھوڑسوار ویران مقام پر دوسرے تنہا گھوڑسوار سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

لداخ میں لنڈے پر بہت ساری روایتیں اور حکایتیں ہیں جو زیادہ تر اساطیری اور دیومالائی (Mythology) نوعیت کی ہیں۔ لیہہ محل سمیت اور کئی مقامات لنڈے کے مسکن تھے۔ لنڈے کی مختلف شکلیں اور مختلف نام تھے۔

ژن۔ جس کے سامنے کا رُخ اتنا خوبصورت اور دلکش ہے کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے۔ لیکن پشت پر اس کی شکل اتنی بدنما، کریہہ اور بھیانک ہے کہ آدمی کراہت اور ڈر کے مارے دم توڑ بیٹھے۔

ڈُگ ڈُگ پا۔ جو رات کے وقت گھر کی نچلی منزل میں ڈُگ ڈُگ کی آواز پیدا کرتا ہے۔

شالقپا۔ انسانی دھڑ والا بھوت۔

دیو کی طرح لمبا تڑنگا بھوت، تین آنکھوں اور بیل کے سر والا بھوت، سرکٹا اور پچھل پاؤں والا بھوت، لمبے لمبے دانتوں اور لمبے لمبے سینگوں والا بھوت۔ نئی نسل ان بھوتوں سے ناآشنا ہے۔

ماضی میں ایسے افراد ہوتے تھے جو یہ بتاتے تھے کہ رات کو سفر کے دوران ان کا لنڈے سے آمنا سامنا ہوا۔ لنڈے راہ میں آجاتا تو گھوڑا آگے نہیں چلتا تھا۔ ایک شخص نے مجھے بتایا کہ وہ گھوڑے پر سوار رات کو کہیں جا رہا تھا۔ ایک جگہ آگے نہیں گیا۔ چابک مارا تب بھی آگے نہیں بڑھا اور زمین پر زور زور سے ٹاپیں مارنے لگا۔ سامنے یخ جما تھا۔ وہ بولا، ”مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سفید یخ پر ایک سایہ تھا۔ سامنے کوئی درخت یا چٹان نہیں تھی، جس کا سایہ پڑے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا پڑی اور یہ سایہ غائب ہوا اور سامنے پہاڑ پر سے ایک ہولناک آواز آئی اور گھوڑا اپنے راستے پر چلا۔“

ایک آدمی نے جس کو میں معتبر سمجھتا ہوں مجھے بتایا، ”ایک مرتبہ رات کو اپنے گاؤں ستوق

جا رہا تھا، گاؤں کے پاس ننگے چٹیل میدان کی طرف سے ایک دیو قامت مخلوق لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آ رہی تھی۔ وہ میدان میں تھا۔ دائیں بائیں یا پیچھے فرار ہونا بے کار تھا۔ خوف کے مارے میں اپنے راستے پر چلتا رہا۔ وہ مخلوق نزدیک پہنچی تو سفیدہ کا ایک لمبا پیڑ لگ رہی تھی۔'' اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ''میرا کلیجہ منہ میں آیا۔ اس دیو قامت جاندار نے میری طرف ایک نظر ڈالی اور آگے بڑھا۔ کچھ دور جا کر میں نے مڑ کر دیکھا وہ چھشوت گاؤں کے پاس پہنچ چکا تھا۔''

ان دنوں لمبی تڑنگی مخلوق نظرؔ نے کی باتیں ہم سنتے تھے۔ ہم نے خود نہیں دیکھا ہے۔ اس لئے اس کی صحت اور حقیقت پر تبصرہ کرنا مشکل ہے۔ یہ اب قصۂ پارینہ بنا ہے۔

شینڈے اور لنڈے کے علاوہ چند اور عجیب الخلقت مخلوقات کا بڑا چرچا تھا۔ ان میں ایک منمو تھی۔ منمو ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ جس سے متعلق یہ بات مشہور تھی کہ وہ کسی مرد کو بہکا پھسلا کر لے جاتی اور اپنی جنسی پیاس بجھاتی تھی۔ چنانچہ ماضی کے لداخ میں ایسے بھی اشخاص تھے جن کی منمو سے وابستگی بتائی جاتی تھی۔

میرے بچپن کا واقعہ ہے جب لیہہ میں تیر اندازی کا ایک بڑا تہوار لگتا تھا۔ دن کو تیر اندازی اور رات کو کھیل تماشا ہوتا تھا۔ یہ آرغون تیر اندازی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تہوار کے اکثر شرکاء آرغون مسلمان ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کو میلے کے منتظمین پٹرومیکس ہاتھ میں اٹھا اٹھا کر سامنے کی پہاڑی پر نظر ڈال رہے تھے۔ تماشائیوں کو تجسّس تھا کہ یہ کیوں پہاڑی پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ ہم نے سنا پہاڑی پر دو منمو گزر رہی تھیں۔ تب لوگ ایسی باتوں پر یقین رکھتے تھے۔

ایسی میں ایک عجیب و غریب مخلوق 'بالوٗ' یا بالشتیا تھی جس کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک عصا ہوتا تھا۔ یہ روایت مشہور تھی کہ اگر کوئی بالشتیا کا عصا چھین لے تو وہ اس آدمی کا بے دام غلام بن جاتا تھا۔ وہ خوش قسمت بالشتیا سے اس طرح کام لیتا تھا۔ جس طرح الہ دین کا چراغ پانے والا دیو سے کام لیتا تھا۔

لیہہ میں ایک غیر آباد جگہ تھی۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جگہ بالشتیاؤں کا مسکن ہے لیکن ایک خوش قسمت آدمی کو ہی بالشتیا نظر آتا تھا۔ اس زمانے میں ایسے راوی مل جاتے تھے جو بالشتیا کے وجود کی تصدیق کرتے تھے۔ قصبے میں کھمبا یا لٹھ پر سوار ہو کر رات کو چلنے والی عورتیں تھیں۔ جن کو ڈونگ جون پا' یا لٹھ سوار کہا جاتا تھا۔

انہیں چڑیل اور ڈائن سمجھا جاتا تھا۔ یہ عورتیں لٹھ پر سوار ہو کر تیز رو گھوڑے کی طرح دوڑتی تھیں۔ جو کوئی ان کی زد میں آجائے تو اس کی ہڈی پسلی ٹوٹ سکتی تھی۔ اگر کوئی من چلا ایسی کسی عورت کو پکڑ لیتا تو وہ اس آدمی کی منت سماجت کرتی۔ پاؤں پڑتی اور مٹھی گرم کرتی تھی کہ اس کا نام اخفائے راز میں رکھا جائے۔

ایک بزرگ نے میرے سامنے دعویٰ کیا کہ اس نے ایسی ایک عورت کو پہچان لیا تھا جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بقول بزرگ اس نے اس عورت کو ان غلط حرکات کے لئے سرزنش کی تھی۔

ان کے علاوہ باپو اور باموتھے۔ باپو مرد اور باموعورت ہوتی تھی۔ یہ عام لوگ تھے لیکن بقول راوی متوازی زندگی گزارتے تھے۔ ان کی خفیہ زندگی تخریبی ہوتی تھی جس سے بالواسطہ طور لوگوں کو گزند پہنچتی تھی۔ کئی دیہی علاقوں میں باپو اور باموکا زیادہ چرچا تھا حتیٰ کہ ان کی نشان دہی کی جاتی تھی اور ان پر انگشت نمائی ہوتی تھی۔

انہیں یاد کر کے مجھے یورپ کا تاریک دَور یاد آتا ہے جب عورتوں پر witch یا جادوگرنی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ انگلینڈ میں سولہویں صدی میں اس الزام میں ہزاروں بے گناہ عورتوں کو زندہ جلا دیا گیا۔

پھر پری تھی۔ بقول راوی، پانی میں پری کا عکس دیکھنے سے کسی کسی عورت پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہوتی تھی۔ لوگ تو اس کے لئے کسی مرد یا عورت کو معتوب قرار دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ متاثرہ عورت یا مریضہ کو ڈانٹ ڈپٹ پلانے، دھمکی دینے اور مارنے سے وہ جس آواز اور زبان میں جواب دیتی، وہ اس کی آواز نہیں بلکہ معتوب شخص کی آواز ہوتی ہے۔

آج بھی خاص کر عورتیں ایسے عارضہ کا شکار ہوتی ہیں۔ نفسیاتی اور ذہنی امراض کے معالج اور ماہرینِ نفسیات اسے ایک پیچیدہ ذہنی مرض قرار دیتے ہیں اور علاج کرتے ہیں۔ تب مسلمان جنوں کے بڑے قائل تھے اور جنوں سے گلوخلاصی پانے کے لئے عامل سے رجوع ہوتے تھے۔ عامل جنوں کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔ کوئی کوئی عامل آسیب زدہ افراد کو ہمزاد سے نجات دلانے کے لئے مخصوص عمل کرتے تھے۔ بودھ اپنے مسائل کے حل کے لئے اکثر کاہن Oracle کے پاس جاتے تھے۔

لداخ کی نئی نسل منمو، بالو، باپو، باموا ور پری جیسے کرداروں اور ان کے ناموں سے ناواقف ہیں۔ یہ ماضی کے قصے ہیں جو لداخی ثقافت اور تاریخ کی دین ہیں۔ نئے دَور کے لوگ اور تاریخ دان ان کی

توجیہات اور تاویلات جس طرح کریں یہ ان کے اختیار میں ہیں۔

البتہ شینڈے یا SPIRIT کی وارداتوں کا ذکر آج کل بھی ہوتا ہے۔ اسے مذہبی اس اعتقاد کو تقویت ملتی ہے کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ پیدا ہوگا اور اس کے اعمال کا احتساب ہوگا۔

......●●●......

☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

تخلیق، تخلیق کار اور سماج

تخلیق ایک آرٹ ہے۔ جس طرح انسان کو زندہ رہنے کے لیے خوراک، ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح آرٹ انسان کی روح کو غذا کا کام دیتا ہے۔

عمومی طور پر مصوری کو آرٹ کہتے ہیں۔ لیکن کلچر یا ثقافت کی طرح آرٹ کو وسیع معانی میں لیا جاتا ہے۔ ایک انسان اچھا کھانا پکائے گا، یہ بھی آرٹ مانا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ Cooking یا کھانا پکانا ایک آرٹ ہے۔ ایک خوب صورت کرسی بنانا بھی آرٹ ہے۔ عجائب گھر میں کوئی پرانی چیز ہو۔ اسے آرٹ کا نمونہ کہا جاتا ہے۔

تاہم مسلمہ آرٹ فنِ تعمیر، سنگ تراشی، موسیقی، مصوری اور ادب ہیں۔ انھیں فائن آرٹ بھی کہا جاتا ہے۔ انگریزی ادیب جان رسکن نے فائن آرٹ کی تعریف یہ کی ہے کہ جس میں انسان کے ہاتھ، دماغ اور دل تینوں ساتھ چلتے ہیں۔

ادب کو آرٹ کا اہم ترین جز قرار دیا جاتا ہے کیوں کہ ادب کا اثر ہمہ گیر ہے۔ ایک نقاد جی۔ ٹی۔ ولیم لکھتا ہے ''ادب آرٹ کی تمام اقسام میں ایک شہنشاہ کی طرح ہے جس کا اثر سب سے زیادہ ہے اور جس کے شائقین کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔''

ادیب اور شاعر اپنے الفاظ سے کسی بھی قسم کا نقشہ کھینچ سکتا ہے جیسے قلم کار تیز رو گاڑی، گہری کھائی، حسین لڑکی، یا سخت سردی لکھ کر گہرے معانی کو ظاہر کر سکتا ہے لیکن سنگ تراش، مجسمہ ساز اور

مصور کے لیے ان کیفیات کو پیش کرنا زیادہ مشکل ہے۔ کسی بے جان سے خوشی یا درد کی کیفیت پیدا کرنا یا اسے اجاگر کرنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ اگر مصور یا مجسمہ ساز منجھا ہوا نہ ہو، تو مورتی یا تصویر کی شبیہہ بھونڈی یا مسخ ہو جائے گی۔

ادب کیا ہے، اس کی مختلف توجیہات اور تاویلات پیش کی گئی ہیں۔ ادب کی ایک تعریف یہ کی جاتی ہے کہ انسانی عمل کو خیال کا روپ دیا جائے۔ جس سے علم و عقل کی تشنگی کی تکمیل ہو۔ ادب زندگی کا آئینہ ہی نہیں بلکہ ادب کو زندگی کا رہبر بھی بتایا گیا ہے۔ بہتوں کی نظر میں ادب کا مقصد سچائی کی تلاش ہے۔

عام معنی میں ادب وہ تحریر ہے جس کے انداز بیان اور اسلوب میں خوبیاں ہوں اور اس کے تخیل میں دائمی اور آفاقی اپیل ہو۔

انسان خارجی اور داخلی عوامل سے ہمیشہ متاثر ہوتا رہتا ہے۔ جب ایک قلم کار کے دل و دماغ پر خارجی چیزوں کا اثر ہوتا ہے، وہ داخلی ردعمل کے ساتھ ان تاثرات کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہی ادب پارہ کامیاب ہوتا ہے جس میں عصری زندگی کو ہو بہو اور دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ حقیقت نگاری کے ضمن میں ''ہیمنگوے'' نے کہا تھا کہ ناول تاریخ سے زیادہ حقیقی لگتا ہے۔ بقول ایک نقاد، ''ادب وقت کی روح کا سب سے بڑا چہرہ ہے۔''

عصری زندگی سے آگہی اور نئی حسیت کو آج وسیع مفہوم دیا جاتا ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں۔ ''ادیب اگر دیدۂ بینائے قوم ہے تو اسے محض عصر کی خارجی صورت تک محدود ہو کر نہیں رہنا ہوگا بلکہ اس کے عقب میں جا کر عصر کی روح یا جوہر سے متعارف ہونا ہوگا۔ ان کی نظر میں سیاسی اور سماجی مسائل کے تناظر میں عصر کا محدود تصوّر رہے۔ وہ لکھتے ہیں سیاسی اور سماجی مسائل تو عصر کے نظر آنے والے چہرے کی متعدد لکیروں میں صرف چند لکیریں ہیں۔ جب کہ اس چہرے کے عقب میں عصر کا ایک چہرہ بھی ہے۔

آج دنیا سکڑ سمٹ کر بہت چھوٹی ہوگئی ہے اور ایک گاؤں میں بھی ملکی سماج کا پرتو جھلکتا ہے جس کا اثر ادبی تخلیق پر بھی پڑتا ہے۔

تاریخ عالم کا مطالعہ کریں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی سائنس، فلسفہ اور ادب تینوں ایک ساتھ پروان چڑھے ہیں۔ اگر چہ ان کی بلوغت بتدریج ہوئی ہے۔ کسی کی شخصیت میں یہ

تینوں گن پائے جاتے ہیں۔ ایک نقاد رقم طراز ہے۔

''آرٹ، سائنس اور فلسفہ میں فرق مواد میں نہیں ہے، بلکہ مواد کو پیش کرنے میں ہے۔ فلسفی منطقی انداز میں بات کرتا ہے۔ شاعر استعاروں میں اور تشبیہوں کی زبان میں بات کرتا ہے۔ ماہر معیشت اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کرتا ہے۔''

اس ضمن میں پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ادب نہ تو سائنس ہوتا ہے اور نہ فلسفہ، لیکن ان دونوں کے بغیر ادب افسانہ اور افسوں بن کر رہ جاتا ہے۔ داخلی حقائق اور بیرونی حقائق میں توازن پیدا کرنے کے لیے ادب اور سائنس میں سنجوگ ضروری ہے۔ ان کی راہیں جدا جدا ہیں لیکن منزل ایک ہے۔''

زمانہ قدیم میں ادب ایک SPOKEN ART تھا۔ جب حروف اختراع نہیں ہوئے تھے اور انسان لکھنے پڑھنے سے نابلد تھے، تب داستانیں اور حکایتیں بڑی مقبول تھیں۔ ڈھائی ہزار سال سے زیادہ عرصہ پہلے گوتم بدھ نے کہا تھا کہ ''لوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔'' داستانیں اور کہانیاں نسل در نسل سنائی جاتی رہی ہیں۔ مشرق میں رامائن، مہابھارت، الف لیلیٰ، پنچ تنتر، شاہنامہ فردوسی، جنگ نامہ حضرت علی، داستان امیر حمزہ اور مغرب میں Illiad, Odyssey اور ایسوپ کی جیسی حکایتیں اور داستانیں مقبول تھیں۔ چین، منگولیا، تبت، لداخ اور بلتستان میں دنیا کی کئی مشہور داستانوں کی طرح گیالم کیسر کی داستان مشہور اور مقبول ہے۔

دراصل سننا سنانا انسان کی ازل سے فطرت رہی ہے۔ جب بھی اس کا بس چلتا، تو وہ داستانوں اور حکایتوں کو آنے والی نسلوں کے لیے ورثہ میں چھوڑتا، لیکن وسیع پیمانے پر ان کی ترسیل قدیم زمانے کے انسان کی بساط سے باہر تھا۔ جب ایک دفعہ انسان نے لکھنا سیکھا، تو اس نے ہر اس چیز پر لکھنا شروع کیا جس پر لکھا جاسکتا تھا۔ جیسے درختوں کے پتے، چھال، پتھر، کھال، لکڑی، موم حتیٰ کہ اس نے ہڈیاں تک بھی نہیں چھوڑیں۔

بیسویں صدی کے ایک قلم کار سعادت حسن منٹو سے جب یہ سوال کیا گیا کہ وہ کیوں لکھتا ہے

تو منٹو نے جواب دیا:

''میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ میں کیوں کھاتا ہوں؟ میں کیوں پیتا ہوں؟..... میں لکھتا ہوں اس لیے کہ مجھے کچھ کہنا ہوتا ہے، میں لکھتا ہوں اس لیے کہ میں کچھ کما سکوں تا کہ میں کچھ کہنے کے قابل ہو سکوں؟''

یہی سوال جب مجید امجد سے کیا گیا تو وہ یوں جواب دیتا ہے:

''آپ تو پوچھتے ہیں میں کیوں لکھتا ہوں؟ یہ تو ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی دریا سے پوچھے تم کیوں سفر میں ہو؟ باغوں کی کوئلوں سے کوئی کہے تم کیوں کوکتی ہو؟ مستانے جھونکوں سے کوئی سوال کرے تم اس اوس بھری ہریالیوں پر کیوں لڑ کھڑاتے پھرتے ہو؟ میں لکھتا ہوں کیوں کہ میری شعری احساس کی حسین و جمیل شورشیں ہی میرے لیے عین حیات ہیں۔''

لکھنے کا جواز تنقید نگار ممتاز حسین نے یوں دیا ہے:

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں لکھنے پر اندر سے مجبور ہوتا رہتا ہوں۔ کبھی جلدی جلدی اور کبھی کافی طویل خاموشی کے بعد۔''

یہی سوال پتھر کے زمانے کے انسان سے کیا جاتا اگر اس کو لکھنا آتا، تو وہ بھی یہی جواب دیتا۔ زمانہ قدیم میں جب انسان نے لکھنا سیکھا، تب ایک کتاب لکھنا ایک بڑا مشکل عمل تھا۔ دو ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح ایک تختی پر لکھی یہ تحریر ملی۔

''دنیا ختم ہونے والی ہے۔ بچے اپنے ماں باپ کا حکم نہیں مانتے ہیں اور ہر آدمی ایک کتاب لکھنا چاہتا ہے۔''

موجودہ زمانے میں بہت سارے بڑے آدمیوں نے، جنھیں لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے، Ghost Writers سے اپنے نام سے کتابیں لکھوائی ہیں۔ جن میں لکھنے کی صلاحیت ہے وہ مرتے مرتے بھی لکھ لیتے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ لاطینی امریکی ادیب گبرائیل گارشیا مارکیز نے حال میں کینسر کی تشخیص کے بعد بقایا تخلیقی کام کے لیے دوستوں سے تقریباً تعلقات منقطع کیے۔ مصنف نے

اپنے ایک بیان میں کہا ہے۔

''اپنی یادداشت کی تین جلدیں اور افسانوں کے دو مجموعے ختم کرنے کے لیے کافی وقت نہ ہونے کے خوف سے میں نے اپنے دوستوں سے بہت کم میل جول رکھا ہے اور ٹیلی فون کاٹ دیا ہے..... میں ہر روز دو سے آٹھ بجے کے درمیان اپنے آپ کو کمرے میں مقفل رکھ کر لکھتا ہوں۔''

کشمیری ادیب اختر محی الدین جب بستر مرگ پر تھے، انھوں نے میرے ایک واقف کار کاتب کو اپنا افسانوی مجموعہ کتابت کے لیے دیا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے اس کی تکمیل چاہتے تھے۔ قلم کاروں نے زنداں میں کاغذ اور روشنائی نہ ملنے پر کوئلے سے دیواروں پر لکھا اور روشنائی کی جگہ اپنا خون استعمال کیا۔

اردو جریدہ کے ایک مدیر نے مجھے بتایا کہ ادارے کو تبصرے کے لیے متعدد کتابیں موصول ہوتی ہیں، جن میں بہت سارے برائے نام قلم کار ہیں، لیکن روپیہ کے بل بوتے پر وہ مرنے سے پہلے ایک کتاب چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔

حال میں امیتابھ بچن نے To be or not to be کے نام سے اپنی سوانح حیات لکھوائی۔ اور اداکار انوپم کھیر، ''کچھ بھی ہو سکتا ہے'' کے نام سے اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھ رہا ہے۔ دونوں عنوانات سے ظاہر ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس لیے اپنے بارے میں جلدی لکھو۔

ہر قلم کار ایک ایسی کتاب لکھنا چاہتا ہے جو ہاتھوں ہاتھ بکے۔ کوئی کوئی مہم جو قلم کار ایک ایسے موضوع کی تلاش میں رہتا ہے جو انوکھا بھی ہو اور نیا بھی ہو۔ وہ تو یہ چاہے گا کہ اُسے کسی اور سیارے کا انسان اغوا کر کے لے جائے اور وہ اس سیارے اور اس کے باشندوں کے احوال لکھیں۔

کرگل کی لڑائی سے متعلق یکا یک نصف درجن سے زیادہ کتابیں مارکیٹ میں آئیں۔ میں نے ایک ریویو میں پڑھا ہے کہ لگ بھگ ساری کتابیں حقائق سے بعید ہیں۔

بمبئی سے گاہے گاہے فلم بنانے فلم انڈسٹری کی ٹیمیں لداخ آتی ہیں۔ کہانی ممبئی سے لکھ کر لائی جاتی ہے جو صحیح واقعات سے میل نہیں کھاتی۔

پچیس تیس سال پہلے لداخ کے علاقہ داہانو سے متعلق میں نے ٹائم میگزین میں ایک مغربی

کی لکھی کتاب پر تبصرہ پڑھا۔ تب یہ علاقہ سیاحوں کے لیے ممنوع تھا، اور آج کل جزوی طور پر کھولا گیا ہے۔ یہاں خالص آریائی نسل کے لوگ بستے ہیں۔ ان کا تمدن انوکھا اور منفرد ہے۔ اس مغربی سیاح نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا تھا کہ اس نے بھیس بدل کر اور اپنے گورے چہرے پر کالک مل کر اس علاقے کی سیاحت کی تا کہ اس کو کوئی نہ پہچانے۔ کتاب کی پبلسٹی اور فروخت کے لیے اپنے سفر کی روداد اس نے سنسنی خیز انداز میں پیش کی تھی، لیکن کتاب کے مواد اور تصویروں سے اس کے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی تھی۔ یہ علاقہ لائن آف کنٹرول کے پاس واقع ہے۔ جہاں سیکورٹی کا سخت انتظام ہے۔ اور اس گاؤں میں ایک اجنبی فوراً پہچانا جاتا ہے۔

زمانہ وسطیٰ میں کتابوں پر حکمرانوں اور امیروں کی اجارہ داری تھی، اور یہی قلم کاروں کے سرپرست تھے۔ قلم کار بادشاہوں، جاگیرداروں اور نوابوں کے گن گاتے تھے۔ شعراء ان کی تعریف میں قصیدے لکھتے تھے۔

ادبی سرقہ عام بات ہے۔ کتابیں بیچنے کے لیے نت نئے حربے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک پسندیدہ سیاحتی مرکز ہونے کی وجہ سے کئی دفعہ لداخ کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ پچھلے دنوں لداخ سے متعلق ایک خاتون کی تین انگریزی کتابیں لیہہ کے ایک کتب فروش کے پاس آئی تھیں۔ لیکن مواد دوسروں کا لکھا ہوا اور چرایا گیا تھا۔ ایک کتاب میں میرا ایک مطبوعہ مضمون بھی تھا۔ طباعت اچھی تھی، لیکن قیمت بہت زیادہ تھی۔ ایک کتاب ڈھائی ہزار روپئے میں تھی۔ عموماً ایک ایسی کتاب کی قیمت چار پانچ سو روپئے سے تجاوز نہیں کرتی۔ سرسری تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ مصنفہ خاتون کا نام فرضی ہے۔ یہ کتابیں لائبریریوں کو فروخت کرنے کے لیے متعلقہ افسر یا افسروں کی ملی بھگت سے چھاپی گئی تھیں اور اس کے لیے متعلقہ افسران کو نجی طور پر اچھا کمیشن دیا گیا تھا۔

۱۴۳۹ء میں جرمنی میں چھپائی کی مشین ایجاد ہوئی۔ اس طرح کتابوں کی دنیا میں بڑا انقلاب آیا اور زیادہ سے زیادہ کتابیں چھپنے لگیں۔

پندرہویں صدی کے دوسرے نصف میں اٹلی میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ لوگوں نے پھر سے یونانی علوم کو پڑھنا شروع کیا اور مادیت اور عقلیت پر زور دیا جانے لگا۔ سارے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی

ہوا پہنچی۔ ادبیات کے علاوہ علم وفنون اور فنونِ لطیفہ میں دور رس تبدیلیاں آئیں۔ جرمنی میں reformation کی تحریک چلی۔ یہ مذہبی اصلاحات کی ایک تحریک تھی اور مارٹن لوتھر کنگ اس کے روح رواں تھے۔ پھر Enlightenment روشن خیالی کا دور آیا جس نے فرانس میں روسو اور والٹیر جیسے مفکر پیدا کیئے۔ انقلاب فرانس نے یورپ میں جاگیرداری کو ختم کیا اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں کا دور آیا اور ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں رومانیت کی ترجمانی ہونے لگی۔ فرانس سے ادب میں رومانیت کی تحریک شروع ہوئی اور سارے یورپ میں رومانیت کا اثر پڑا۔ رومانیت خالص رومان کا نام نہیں تھا۔ اس میں نیچرلزم، فطرت نگاری اور انقلاب پسندی کا عنصر پایا جاتا تھا۔

نو رومانیت سمیت یورپ میں اور کئی ادبی تحریکیں چلیں اور ان کا ادبیاتِ عالم پر اثر پڑا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے ساتھ ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ اور دوسری تحریکوں کا اثر پڑا۔ سرسید احمد خان اور راجہ رام موہن رائے ان پیش رو رہنماؤں میں تھے جنھوں نے یورپ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی افادیت کو سمجھا اور مغربی علوم کو فروغ دینے کے لیے تحریک چلائی۔

اٹھارہویں صدی اور اس کے بعد مغرب میں ادب، فنون لطیفہ، سائنس، فلسفہ، معیشت، سیاسیات، نفسیات، تاریخ، مذاہب پر اچھی اچھی کتابیں لکھی گئیں۔ اردو ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں پر ان کا گہرا اثر پڑا۔

مغربی مفکروں اور ادیبوں کے خیالات اور نظریات میں مذہب سے روگردانی اور روایت سے بغاوت کی بو آتی ہے۔

روسو نے لکھا۔ ''لوگ ہمیشہ آنکھیں بند کر کے پرانے رسم ورواج کی پابندی کرتے ہیں۔ اپنے ذاتی مذاق کا کبھی خیال نہیں رکھتے۔ ان میں اتنی بھی ہمت نہیں ہے کہ اپنی اصلی صورت میں نظر آئیں۔''

نطشے نے خدا اور مذہب کے خلاف بہت کچھ لکھا اور فوق البشر کا تصور دیا اور کہا:

''انسان اپنی طاقت کا پورا استعمال نہیں کرتے۔ عام لوگ بڑے ڈرپوک اور غلامانہ ذہنیت کے ہوتے ہیں۔''

گبن نے لکھا۔

''یونان اور روم کی تہذیبوں کے زوال کا ذمہ دار مذہب ہے۔ جس نے
لوگوں کا نظریۂ حیات بگاڑ دیا۔''

ایمرسن نے لکھا۔ ''ایک عالم کو اپنے اوپر مکمل بھروسہ ہونا چاہیئے۔ اس کو آزاد اور دیدہ دلیر ہونا چاہیئے۔'' ایمرسن نے زور دیا کہ انسان Non conformist روایت شکن بنیں اور لوگوں کی نکتہ چینی سے نہ ڈریں۔

ولیم جیمز نے عملیت کا فلسفہ پیش کرتے ہوئے لکھا۔

''عملیاتی تجربہ بتاتا ہے کہ وہی سچے تصورات ہیں۔ جن کی توثیق کی
جا سکے اور جن سے فائدہ حاصل ہو۔''

وہ مذہب کو اس حد تک مفید سمجھتا تھا۔ جو انسان کے مادی مقصد کے حصول کے لیے معاون ثابت ہو۔

ہکسلے نے لکھا:

''سائنسدان کے لیے شک نہایت ہی ضروری ہے۔ سائنس کے لیے
اعتقاد نہیں، بلکہ تصدیق ضروری ہے۔''

یورپ کے لوگوں پر ان نظریات کا اثر پڑا اور مذہب سے بیگانہ ہوئے۔ اردو ہندی ادب پر ان کا بالواسطہ اور بلا واسطہ اثر پڑا۔

۱۹۱۴ء میں روس میں اشتراکی حکومت قائم ہوئی جس نے ترقی پسند تحریک کو جنم دیا۔ ترقی پسند تحریک نے حقیقت نگاری کے رجحان کو بڑھاوا دیا۔ بہت اچھی کہانیاں اور نظمیں لکھی گئیں۔ تاہم مارکسی نقادوں اور ادیبوں نے حقیقت نگاری کی اپنے انداز میں توجیہ کی ہے اور ادب نے پروپیگنڈہ کی صورت اختیار کی۔ ایک سیاست دان کی تقریر اور ایک قلم کار کی تخلیق میں بڑا فرق ہے۔ ایک ادیب واعظ نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے، حتیٰ کہ مارکس کا رفیق انجیلز بھی یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ مصنف کے سیاسی اور سماجی خیالات جتنے چھپے ہوئے ہوں گے، فن اتنا ہی لطیف ہوگا۔

۵۸-۱۹۵۷ء میں ترقی پسند تحریک کا زوال شروع ہو گیا اور جدیدیت نے اس کی جگہ لی۔

جدیدیت سکہ بند ترقی پسندی کے خلاف تخلیق کی آزادی کے لیے آئی تھی۔ جدید یئے قلم کاروں نے برملا کہا کہ وہ ترقی پسند ادیبوں کی انگلی پکڑ کر نہیں چلیں گے۔ ممتاز مفتی نے اسی ضمن میں ایک سوال کے جواب میں کہا۔

''میں فن برائے فن کا قائل ہوں اور نام نہاد ترقی پسند ادب کو ابن الوقتی اور وسعت کے فقدان کے مترداف سمجھتا ہوں۔''

ادھر جدیدیت نے دھیرے دھیرے ایک فارمولے کی صورت اختیار کی۔ اس میں ابہام آ گیا اور نئی حسیت، عصری شعور اور آگہی کے نام پر اول جلول باتیں لکھی جانے لگیں اور جدیدیت بھی سکہ بند ہو کر رہ گئی۔

ادب، ادیب اور قاری میں ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ جدیدیت کی کوکھ میں پروردہ ابہام، علامت نگاری اور تجرید نے اس رشتے کو ختم کیا۔ اور جب اس طرف جدیدیوں کا دھیان دلایا گیا۔ تو انھوں نے کہا کہ وہ قاری کے لیے نہیں لکھتے ہیں بلکہ اپنی انا کی تسکین کے لیے لکھتے ہیں۔ اس طرح قاری ادب سے زیادہ دور ہو گیا۔

جدیدیت کے بکھراؤ کے بعد مابعد جدیدیت نے ادب کا جھنڈا گاڑا۔ مابعد جدیدیت کے معتقد ادباء کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت ادیب کی فطری آزادی پر یقین رکھتی ہے اور ادب کی تخلیق کے لیے مخصوص فکری رجحان اور نہج تعین نہیں کرتی۔

ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی مہم میں اکثر نقادوں کا وطیرہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ نقادوں نے اپنے رجحان اور سیاسی اور سماجی اعتقادات کے مطابق لکھا اور انہی ادیبوں کو ادب میں مقام دیا جو ان کے اعتقادات پر پورے اترتے ہوں۔ اس طرح بہت سارے ادیب بدظن ہوئے۔ ادب میں گروہ بندیاں ہوئیں۔ اردو کے ایک ادیب گوپال متل نے یہاں تک کہا۔ ''اردو میں کوئی نقاد ہی نہیں ہے۔''

نئے قلم کاروں کو یہ شکایت تھی کہ بزرگ نقاد ذاتی پسند یا ناپسندیدگی کے شکار ہیں اور انھیں بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے نقاد کی دو حیثیتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک حیثیت جج کی اور دوسری پولیس مین کی ہے۔ جج کی حیثیت میں وہ تخلیق کے کھرے یا کھوٹے ہونے پر حکم لگاتا ہے، اور پولیس مین کی حیثیت میں وہ تخلیقی رویئے کو اذن خرام اور تقلیدی رویئے کو روکنے کا اشارہ دیتا ہے۔''

جب کہ ادیب کہتے ہیں کہ بہتر ناقد تو خود ادیب ہے یا پھر اس کا قاری ہے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر ایک دل جلا ادیب یہ لکھنے پر مجبور جاتا ہے کہ ہمارا ادب بحرانی اور مشکل دور سے گزر رہا ہے اور یہ بحران اپنوں کا پیدا کردہ ہے۔

ادیب اور نقاد دونوں افراط اور تفریط کے شکار ہیں۔ ادب کی تنقید اور احتساب ضروری ہے، لیکن ایک نقاد کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ جانبداری، گروہ بندی، جذباتیت اور مصلحت پسندی سے بالا ہو کر احتساب کرے۔

کش مکش صرف جدیدیئے اور ترقی پسند ادیب کے درمیان نہیں ہے بلکہ پرانے اور نئے لکھنے والوں کے درمیان بھی ہے۔ نئے لکھنے والوں کی تنقید کرنا غلط ہے کہ وہ ہر بات میں پرانے لکھنے والوں کی تقلید کریں گے۔

انتظار حسین نے اپنے زاویۂ نگاہ کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''انیس، نظیر، مولانا محمد حسین آزاد، یہ چند ہستیاں میرا راستہ روکتی بھی ہیں اور مجھے راستہ دکھاتی بھی ہیں..... لکھنے والوں کی یہ وہ نسل ہے جس کی میں نے پیروی کی ہے اور جس سے میں بغاوت پر بھی تلا بیٹھا ہوں۔ میں نثر لکھنا چاہتا ہوں، لیکن محمد حسین آزاد کی نثر نہیں اپنی نثر۔''

ناقدوں اور ادیبوں نے مختلف ادیبوں کے فن سے متعلق اپنا معیار قائم کیا ہے، جو مسلمہ معیار سے مختلف ہے۔ محمد حسین آزاد نے ذوقؔ کو غالبؔ کے مقابلے میں بڑا شاعر قرار دیا اور شیفتہؔ نے نظیرؔ کی شاعری کو سوقیانہ بتایا۔ اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے کہ اقبالؔ کی عظمت کا تعین ان کے عشق رسول کو دھیان میں لائے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ادب عالیہ پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہوتا، چاہے یہ شاعری ہو، ناول، افسانہ یا تنقید ہو۔ کامیاب

ادیبوں نے بندھے ٹکے فورم سے گریز کیا ہے۔ علامت نگاری کے نام پر ان کی تحریروں میں ابہام نہیں پایا جاتا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان میں فنی قدروں کو نظر انداز کیا گیا ہو۔ اوسط ذہن رکھنے والا قاری بھی انھیں سمجھ سکتا ہے۔

مغرب میں پچھلے ڈھائی سو سال سے ناول دوسری اصناف پر چھایا ہوا ہے۔ نوبل پرائز، بوکر پرائز اور پولیٹ زر جیسے انعامات زیادہ تر ناولوں کو ملے ہیں۔ اکثر ناول عام فہم ہیں۔ بقول ایک نقاد، ناول نگار کو قاری کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست پر شک نہیں کرنا چاہیے۔

کوئی بھی تخلیق استعاراتی، علامتی یا اشارتی طور پر پیش کی گئی ہو، فرق نہیں پڑتا، جب تک فنی قدروں کو ملحوظ رکھا گیا ہو اور اس میں ابہام نہ ہو، اور وحدت تاثر ہو۔

میں نے کہانیاں پڑھی ہیں، جن میں کہانی پن نہیں ہے لیکن ایک اچھی کہانی کا تاثر ہے۔ مثلاً ریاضی کے ہندسوں میں ایک کنبے کی آمدن میں کمی، اضافہ اور پھر زوال دکھایا گیا ہے، آمدن میں اضافہ نوجوان لڑکی کے پیشہ کرنے سے ہوتا ہے اور زوال لڑکی کے حسن کے زوال کی علامت ہے۔

ایسی علامتی اور استعاراتی کہانیاں ہیں، جن میں چند خاکوں اور لکیروں سے مفہوم پیدا کیا گیا ہے۔

ہم ایک طرف کہتے ہیں کہ اس مشینی دور میں ضخیم ناول پڑھنے کی کسی کو فراغت نہیں ہے۔ بھلا آج کے قارئین کو کیوں کر مبہم اور گنجلک کہانیاں پڑھنے اور سمجھنے کی فرصت ہے؟ اگر غالبؔ نے مشکل اشعار بھی کہے ہیں اور دوسروں نے ان کی تشریح کی ہے تو وہ تشریح قابل قبول لگتی ہے لیکن اس کا اطلاق مبہم افسانوں پر نہیں ہو سکتا ہے۔

جدیدیت بھی مغرب کی بھونڈی نقالی تھی، جو وہاں کے مخصوص معاشرہ کی دین تھی۔ ہمارا معاشرہ مغرب کے معاشرے سے مختلف رہا ہے۔

نئے دور کی جدت طرازیوں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود ہم کئی بار حسرت سے ماضی کی طرف دیکھتے ہیں، علامتی کہانیاں اور تجریدی آرٹ اس کی نمایاں مثال ہیں، جنھیں چھوڑ کر فن کار ماضی کی طرف پلٹ رہے ہیں۔

اول جلول لکھنے والوں سے متعلق نوبل انعام یافتہ ادیب آئزک سینگر نے کہا تھا۔

"ہمارے پاس ایک کافکا تھا، لیکن اب ہمارے پاس ہزاروں نقال ہیں،
جو یہ سمجھتے ہیں کہ اول جلول لکھ دیں، تو بس کافکا ہو گئے۔"

ہمارے ہاں بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بڑے سے بڑے ناول نگاروں، کہانی کاروں اور شاعروں کی کتابوں کی چند سو کاپیوں سے زیادہ نہیں بکتیں۔ یہ تو لائبریریوں میں اکثر پڑی رہتی ہیں یا ان کے اپنے گھروں میں گرد و غبار سے اٹی رہتی ہیں۔

جو پڑھتے ہیں وہ خرید کر نہیں پڑھتے ہیں۔ اگر وہ ادیب کے شناسا ہوں، تو یہی توقع رکھتے ہیں کہ ادیب ایک کاپی نذر کرے گا۔ ہمارے سماج میں کتاب ہی واحد ایک ایسی شے ہے جو خریدی جانے والی نہیں ہے۔

میں نے قصبہ لیہہ میں اپنی کتاب "قلم، قلم کار اور کتاب" ایک عزیز سٹیشنر اور کتب فروش کی دکان پر فروخت کے لیے رکھی۔ کئی دفعہ کتاب شیلف سے غائب ہوتی تھی، ایک روز دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ فلاں نے مفت پڑھنے کے لیے لی ہے۔ پھر تین کاپیاں دوسرے کی دکان پر رکھیں۔ میں اس دکان پر گاہے گاہے اخبار لینے جاتا ہوں۔ کبھی میں اپنی کتاب کو شلیف سے غائب پاتا ہوں اور پھر چند روز بعد دوبارہ اسی شلیف میں پاتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے، مفت سہی، کچھ مہربان اسے پڑھ تو لیتے ہیں۔ لیکن میرے انگریزی افسانوی مجموعے The Forsaking Paradise کا یہ حشر نہیں ہوتا، ان کے خریدار غیر ملکی ہیں جو گرمیوں میں سیاحت کے لیے لداخ آتے ہیں۔ قصبے کی چند بک شاپس ان کے دم سے چلتی ہیں۔ پبلشر نے بھی اس کی مجھے معقول رائلٹی دی، لیکن اردو کی صورت حال جداگانہ ہے۔ ایسے میں اردو زبان کو کیسے فروغ حاصل ہوگا۔؟

اپنے چھوٹے سے قصبے میں اکثر لوگ مجھے میری تصنیفات سے نہیں بلکہ ریڈیو اور ٹی وی کی وساطت سے جانتے ہیں۔ ریڈیو یا ٹی وی پر کوئی بات چیت پیش کی یا کسی کا انٹرویو لیا۔ انھیں سن لیے یا دیکھ لیے اور رائے قائم کر لی۔ ایک قلم کار کو ایک کہانی، نظم یا ایک مضمون اور ایک کتاب لکھنے میں جو ریاضت کرنا پڑتی ہے، ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرام کے لیے بہت کم محنت کرنا پڑتی ہے۔

غالب جیسے بڑے شاعر کو ساری زندگی قاری اور سامع کی تلاش رہی اور آخر یہ لکھنے پر مجبور ہوا

کہ ان کے اشعار کی شہرت ان کے مرنے کے بعد ہوگی۔

ہمارے یہاں ادب ذریعہ معاش نہیں ہے۔ ایک ادیب کو بھی زندہ رہنے کے لیے روزگار چاہیے۔ ہمارے سماج میں ادب اور ادیب کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ بے چارہ شاعر بڑا بدنام ہے۔ جو ہمیشہ سامع کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کی نوک زبان پر، ایک شعر ملاحظہ ہو، کا جملہ ہوتا ہے، بقول شخصے شعراء حشرت الارض کی طرح نکل رہے ہیں۔ ایک جریدہ بار بار اعلان کرتا ہے کہ ادارے کے پاس منظوم مواد بہت ہوگیا ہے۔ اس لیے چند ماہ تک کوئی شاعر اپنا کلام نہ بھیجے۔

بہت سارے قلم کاروں نے اپنی نگارشات اور نظریات کی وجہ سے قید و بند سہے ہیں اور صعوبتیں جھیلی ہیں۔ حکومت وقت اور سماج ادیب کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں اور ادیب حکومت اور زمانے کے تیور کو نہیں سمجھتے۔ ایسے ماحول میں سعادت حسن منٹو نے اپنے ذہنی خلفشار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''مجھے آپ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں اور عدالتیں ایک فحش نگار کی حیثیت سے۔ حکومت کبھی کمیونسٹ کہتی ہے اور کبھی ملک کا بہت بڑا ادیب، کبھی میرے لیے روزی کے دروازے بند کیے جاتے ہیں، کبھی کھولے جاتے ہیں......
> میں پہلے بھی سوچتا تھا، اب بھی سوچتا ہوں کہ میں کیا ہوں؟ اس ملک میں، جسے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہا جاتا ہے، میرا مقام کیا ہے؟ میرا مصرف کیا ہے؟.....میں اپنا صحیح مقام تلاش نہ کرسکا۔ یہی وجہ ہے کہ میری روح بے چین رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں کبھی پاگل خانے میں اور کبھی اسپتال میں ہوتا ہوں۔''

مغرب میں پڑھنے والوں کی کمی نہیں ہے، اور خرید کر پڑھتے ہیں، حال میں میں نے دہلی کے ایک انگریزی روزنامہ میں پڑھا کہ امریکہ میں ایک جریدہ Parade تین کروڑ ساٹھ لاکھ افراد پر مشتمل خاندانوں کو جاتا ہے Parade ۱۹۴۱ء سے شائع ہو رہا ہے۔ دوسرا جریدہ "USA Weekend" کی دو کروڑ تین لاکھ ستر ہزار کاپیاں چلتی ہیں۔ ایک نیا رسالہ American Profile ۲۰۰۰ء میں اجرا ہوا اور ایک ہی سال میں اس کی اشاعت اڑتالیس لاکھ تک پہنچ ہے، جس کی تقسیم کاری نو سو اخبارات کے ذریعے ہوتی ہے۔ ان تینوں جریدوں سے ۲۰۰۲ء میں ایک ارب ڈالر

کی آمدنی ہوئی۔

اس کا مقابلہ جب ہم اردو جریدوں سے کرتے ہیں۔ تو اردو دانوں کی علم و ادب کے تئیں سرد مہری اور پست ذہنیت پر رونا آتا ہے۔

ماہنامہ ''شاعر'' کے مدیر اعجاز صدیقی نے ایک دفعہ لکھا تھا۔ ''بعض رسالوں کا سرکولیشن اتنا کم ہے کہ اسے ظاہر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ تین چار ہزار کی تعداد میں چھپنے والے رسالے مشکل سے ایک دو ہی ہوں گے۔ ادبی رسائل کے قارئین میں بڑی تعداد ادیبوں اور شاعروں کی ہوتی ہے۔'

''شیرازہ'' سری نگر کے مدیر محمد یوسف ٹینگ نے لکھا تھا۔ ''اردو رسائل خریدنے کے لیے بہت کم لوگ مائل ہوتے ہیں۔ جب مدیر کو معلوم ہوا کہ اس کا رسالہ صرف چند مفت خوروں کے پاس جاتا ہے تو مایوس ہو کر اس کو رسماً جاری رکھتا ہے۔''

تب ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ کے مدیر عابد سہیل نے لکھا تھا کہ ایک ادبی رسالے کے مدیر کو مسودوں کے مطالعے سے لے کر ڈاک میں بھیجنے کا کام تک دیکھنا اور کرنا پڑتا ہے۔ صورت حال آج بھی یہی ہے۔

ارون دھیتی رائے کا ناول The God of Small Things بڑا دلچسپ ہے، بوکر پرائز ملنے کے بعد مصنفہ راتوں رات مشہور اور امیر ہوگئی ہیں۔ تیس سے زائد زبانوں میں اس ناول کا ترجمہ ہوا ہے۔ اردو اور ہندی میں بھی اس پائے کے ناول لکھے گئے ہیں جو میں نے پڑھے ہیں لیکن ان زبانوں میں نہ ان کے قدردان ہیں اور نہ زیادہ خریدار ہیں۔

ہلیری کلنٹن کی کتاب The Living History کی پہلے ہی روز دو لاکھ کاپیاں بکیں، اور ایک ڈیڑھ ماہ بعد جب میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اس کی دس لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔

ہیری پوٹر کی کتابوں نے تو ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ دو کروڑ کاپیاں پچپن زبانوں میں پہلے ہی فروخت ہو چکی ہیں۔ اس سیریز کی پانچویں کتاب Harry Potter and the order of Phoenix خریدنے کے لیے شائقین نے رات جگا کی۔ ہندوستان میں دس روز میں اس کی ایک لاکھ بیس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اخباری رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں کسی کتاب کے لیے

پہلے اتنی دلچسپی کبھی نہیں دیکھی گئی۔ گجرات اور ممبئی میں پبلشر کے جملہ حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مصنفہ جے۔کے۔راؤلنگ کے ہیری پوٹر سیریز کی کتابیں چوری چھپے فروخت کی جانے لگیں۔شارلوک ہومز کی طرح ان کتابوں کی مصنفہ جے۔کے راؤلنگ سے کہیں زیادہ کیریکٹر ہیری پوٹر مشہور ہے۔

بچوں کی تنظیم کی ایک خاتون صدر نے لکھا ہے۔''ہندوستانی ادیبوں کو اپنی بے کار کوشش جاری رکھنے کے بجائے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ساری دنیا میں بچے کیا پسند کرتے ہیں اور مسز راؤلنگ سے کچھ سبق سیکھنا چاہیے۔

مغرب میں حکومت اور کھیلوں کی تنظیموں کو لوگوں اور خاص طور پر بچوں میں کتب بینی کا شوق بڑھانے کا کتنا جذبہ ہے، اس کی مثال ایک اخباری رپورٹ سے ملتی ہے۔انگلینڈ کے پریمیر لیگ کے فٹ بال کے بیس سرکردہ کھلاڑیوں نے سکولوں میں اپنے فین طالب علموں میں ذوق مطالعہ پیدا کرنے اور اپنے آپ کو بطور نمونہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پروگرام کے تحت اہم فٹ بال کلب نزدیکی لائبریریوں کا تعاون حاصل کریں گے اور ایک ہزار طلباء کو کلب کے احاطہ میں مطالعہ کے لیے مدعو کریں گے۔اس منصوبے پر عمل آوری کے لیے پریمیر لیگ نے چھ کروڑ ڈالر فراہم کیے ہیں، جب کہ فٹ بال فیڈریشن کونسل نے دو دو کروڑ ڈالر کی رقم مہیا کی ہے۔

مغرب میں نئی نسل خاص طور پر فٹ بال کی دلدادہ اور نامور فٹ بال کھلاڑیوں کی شیدا ہے۔ فٹ بال کلبوں اور کھلاڑیوں کا اس رجحان سے فائدہ لیتے ہوئے بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا کرنے کا یہ طریقہ کار نہ صرف انوکھا اور عمدہ ہے بلکہ ان کا یہ قدم قابل ستائش بھی ہے۔

میدان ادب کی دو اہم شخصیتیں البرٹ کیمو اور ناباکوف، جنہیں ادب میں نوبل پرائز ملے تھے،فٹ بال کے کھلاڑی تھے۔کیمو نے کہا ہے:

''میں جو کچھ جانتا ہوں، خاص کر اخلاقیات اور انسان کے تئیں احساس ذمہ داری، یہ فٹ بال کی دین ہے۔''

......●●●......

☆......عبدالغنی شیخ

لداخ کا جغرافیائی محل وقوع اور چین سے روابط

لداخ کا جغرافیائی محل وقوع گہری اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مشرق میں تبت، شمال میں مشرقی ترکستان (شین جیانگ) شمال مغرب میں بلتستان، مغرب میں کشمیر اور ڈوڈہ اور جنوب میں ہماچل پردیش اور پنجاب ہیں۔

لیہہ وسط ایشیا کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ وسط ایشیا کے ملکوں تبت، پنجاب، کشمیر ہماچل پردیش اور بلتستان سے تجار لیہہ آتے تھے اور اشیا کی خرید و فروخت اور تبادلہ کرتے تھے۔ لداخیوں کی اپنی ضروریات بھی ان سے پوری ہوتی تھیں۔ لیہہ کی افادیت کے پیش نظر ایک انگریز جوئنٹ کمشنر آر ایل کینیون (R.L. Kennion) لکھتا ہے۔ ''نہر سیرئز کے لئے پورٹ سعید جتنا اہم ہے۔ وسط ایشیا کے تجارتی راستے کے لئے لیہہ اہم ہے۔'' تجارت کے علاوہ تبت، کشمیر اور بلتستان سے لداخ کے سماجی، ثقافتی اور مذہبی تعلقات تھے۔

اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہمسایہ ملکوں اور خطوں میں لداخ کی بڑی قدر و قیمت تھی، جسے لداخ کو فائدے اور نقصانات دونوں پہنچے ہیں۔ کبھی منگول حکمران تبت پر حملہ کرتا تھا اور کبھی مشرقی ترکستان شین جیانگ) میں بغاوت ہوتی تھی۔ دونوں خطوں کی سرحدیں لداخ سے ملتی تھیں۔

اس لئے لداخ چین کو دونوں خطوں کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرسکتا تھا۔ چین کے شہنشاہ چینگ نے آٹھارویں صدی میں لداخی حکمران سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور معلومات حاصل کیں۔ لداخی مسافروں اور تاجروں کو چین کے مذکورہ دونوں خطوں میں آنے جانے کی پوری آزادی تھی۔ اس ضمن میں پروانہ رہداری کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ لہاسہ اور کاشغر میں چینی امبان (افسر اعلیٰ) تک ان کی رسائی تھی۔

۱۷۲۰ء کے آس پاس ڈزونگر منگول نے تبت پر قبضہ کیا اور چین نے لداخی راجوں سے تبت کی صورتحال سے متعلق معلومات مانگیں۔ راجا نیما نمگیل نے نونولبزانگ نیما کی سرکردگی میں پہلے منگولیا کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ایک سفارتی مشن بھیجا۔ اس کے بعد لہاسہ کے راستے ایک مشن بیجنگ روانہ کیا۔ جس نے چینی حکومت کو اہم معلومات فراہم کیں۔ ایسے مشن ۱۷۳۷ء، ۱۷۳۸ء اور ۱۷۴۳ء چین بھیجے اور صورت حال سے آگاہ کیا، جو چین کے لئے بڑی مفید تھی۔ چینی شہنشاہ نے بطور تشکر اور تحسین لداخی راجا کو تحفے تحائف بھیجے۔ 1821ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم انگریز ڈاکٹر ولیم مور کرافٹ نے لیہہ میں چینی شہنشاہ کا لداخی راجا کو ارسال کردہ ایک خط دیکھا۔ جس میں تحفوں کی فہرست دی گئی تھی۔ ان میں لاجورد، پشپ، agate (ایک قیمتی پتّھر) اور ریشم شامل تھے۔ منگول حکومت بھی لداخ کے حکمران سے تعلقات قائم کرنے کی خواہاں تھی۔ اس سے منگول حکمران کو تبّت اور وسط ایشیا میں مہم جوئی کے لئے لداخ کو بطور اڈہ استعمال کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لداخی حکومت نے چین سے دوستی قائم رکھنے میں اپنا مفاد سمجھا۔ تبّت اور شین جیانگ سے لداخ کے تجارتی تعلقات تھے۔

چین کے شہنشاہ سوہانگ دے نے راجا دیسکیونگ نمگیل کو ایک خط میں اس کے نمائندے پالی فولاد کو مدد جاری رکھنے کے لکھا تھا۔ جس طرح راجا کے والد نیما نگمیل نے اس کے نمائندے کنچن سے تعاون کیا تھا۔ خط میں لداخی راجا کو اس کی خدمات کے لئے خلعت فاخرہ اور توصیفی سند عطاء کرنے کا تذکرہ بھی تھا۔

۱۸۵۹ء میں چین نے شین جیانگ کے شہر کاشغر اور یارقند میں ایک بغاوت کچل دی۔ چینی کمانڈو کو یہ اندیشہ تھا کہ باغی رہنما برہان الدین اور خواجہ جہاں لداخ فرار ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ لیہہ

ایک فوجی دستہ بھیجنے کا منصوبہ بنایا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ باغی رہنما بدخشان فرار ہوئے ہیں اور انہیں ہلاک کئے گئے ہیں۔ لداخی راجا نے اس کامیاب کارروائی کے لئے بطور سفارت کارٹشی گیاژو کو مبارک دینے کے لئے چین بھیجا۔ ٹشی گیاژو نے حسبِ معمول تجارتی تعلقات قائم رکھنے کے لئے چینی حکام سے درخواست کی۔

انیسویں صدی کے شروع میں لداخ کے آخری راجا چھپل تنڈوپ نمگیل نے وسط ایشیا کے کوکنڈ کے مفرور شاہزادہ عبدالستار آدی جان کو پناہ دی جس نے پرانے خواجہ خاندان کی ایک اولاد جہانگیر کو کاشغر میں آبائی حکومت بحال کرنے کے لئے ناکام مدد کی تھی۔ بعد میں نوبراہ کے ایک رئیس کے مشورے پر راجا۔ نے مفرور شاہزادہ اور اس کے ساتھیوں کو لہاسہ کے امبان کے حوالے کیا جہاں ان کو موت کی سزادی گئی۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران ترکوں نے شین جیانگ میں چین کے خلاف بغاوت کی اور یعقوب بیگ نے اقتدار حاصل کیا۔ چینی شہنشاہ نے لیہہ کے ڈوگرہ گورنر کو خط لکھا جس میں یعقوب بیگ کی فوج کی نقل وحرکت کے بارے میں چینی امبان کو مطلع کرنے کے لئے استدعا کی گئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ خط کا جواب دیا گیا ہے یا نہیں۔ البتہ برطانوی ہند حکومت اور کشمیری حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یعقوب بیگ سے سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کئے۔

سترھویں صدی میں پانچویں دلائی لاما کے حکم پر تبت نے لداخ پر فوج کشی کی۔ لداخی راجا لیہہ سے بزگو فرار ہوا۔ جہاں تین سال جھڑپیں ہوتی رہیں۔ لداخی راجا کی درخواست پر مغل شہنشاہ اورنگزیب نے مدد کی اور تبتی فوج کو پسپا کیا۔ لداخ مغل حکومت کا باج گزار تھا۔ مغل حکمران اور لداخی راجا دے لیگس نمگیل ایک دوسرے کے زیادہ قریب آئے۔ اس صورت حال سے چھٹویں دلائی لاما سنگیس گیاژو کو گہری تشویش ہوئی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لداخ پر کشمیر اور اسلام کا اثر ونفوز ہو۔ انہوں نے کرگیوت پاڈوگپا فرقہ کے سب سے بڑے لاما چھٹواں ڈوگپا رینگبو چھے میپھم وانگبو کو راجا دے لیگس نمگیل سے ملاقات کرنے اور صدیوں پرانے مذہبی اور سماجی رشتے کو بحال کرنے کیلئے ۱۶۸۴ء میں لداخ بھیجا۔ ڈوگچین رینگبو چھے کا لداخ میں بڑا اثر ورسوخ تھا۔ انہوں نے راجا دے لیگس نمگیل سے

تینگ موگانگ میں ملاقات کی اور دلائی لاما کا پیغام پہنچایا۔ انہوں نے دونوں خطوں کے لوگوں کے بودھ دھرم کے پیروکار ہونے کا حوالہ دیا اور دونوں کے درمیان حالیہ جنگ کو قصہ پارینہ سمجھنے کی تاکید کی۔ دے لیکس نمکیل قائل ہوا۔ اور ۱۶۸۴ء کا اہم معاہدہ عمل میں آیا۔ جس کے تحت تبّت۔ لداخ کی دیرینہ سرحدیں متعین ہوئیں اور لوپچق اور چابا کے سفارتی اور تجارتی مشن کے تبادلے کا فیصلہ ہوا۔ لوپچق ایک سفارتی اور تجارتی مشن تھا، جو ہر تیسرے سال لداخ سے تبّت جاتا تھا۔ مشن کے ارکان تبّت کے سال نو کی تقریب پر لہاسہ پہنچتے تھے اور دلائی لاما کو لداخی حکمران کے تحفے تحائف اور خط پیش کرتے تھے۔ اس وجہ سے مشن کا نام ''سالانہ سلام'' پڑا ہے۔ ڈوگرہ دور حکومت کے قیام کے بعد ۱۸۵۲ء میں معاہدے کا اعادہ ہوا اور لوپچق مشن کی روانگی جاری رہی۔ آخری لوپچق مشن ۱۹۴۲ء میں کلون چھوانگ رگزین کی قیادت میں لہاسہ گیا۔ اسے پہلے لیہہ کے ایک سرکردہ مسلم خاندان نے برسوں تک لوپچق کی قیادت کی تھی۔ لوپچق مشن کو باربرداری اور سواری کے لئے ۲۶۰ رگھوڑے اور باربردار جانور فراہم کئے جاتے تھے۔ تحفے تحائف میں زعفران، کپڑے کا تھان، مونگے، سونا وغیرہ بھیجے جاتے تھے۔ لہاسہ کی حکومت خط کا جواب دیتی اور تحفے تحائف کی رسید سے آگاہ کرتی تھی۔ لوپچق مشن کا ہر جگہ پرتپاک استقبال کیا جاتا تھا۔

تبت سے 'چابا' نام کا ایک سالانہ مشن لدّاخ آتا تھا۔ چابا کا مطلب 'چائے والا' ہے۔ یہ تبت سے چائے کی ٹکیاں لاتا تھا۔ اسی نسبت سے مشن کے سربراہ کا نام چابا پڑا ہے۔ چابا دلائی لاما کا ذاتی تجارتی رکن ہوتا تھا۔ جو ژوم چونگ کہلاتا تھا۔ یہ بھی اپنے ساتھ تحفے لاتا تھا۔ یہ دسمبر میں لیہہ پہنچتا تھا اور اپریل تک قیام کرتا تھا۔ چابا کو بھی سواری اور باربرداری کے لئے جانور فراہم کئے جاتے تھے۔

۱۹۶۴ء سے پہلے لدّاخ۔ تبّت سرحد پر بات چیت کے دوران چینی وفد نے لوپچق مشن کو خراج سے تعبیر کیا اور اسی حوالے سے لدّاخ پر اپنا حق جتایا تھا۔ اس کے جواب میں ہندوستانی وفد نے چابا کی مثال دیتے ہوئے چینی دلیل کو مسترد کیا۔

ان مذکورہ دو واقعات سے یہ عیاں ہے کہ جہاں ہندوستان کی مغلیہ حکومت کو لداخ کی خود مختاری اور علاقائی سلامتی کا احساس تھا، وہاں تبّت لداخ کے ساتھ اپنے صدیوں پرانے مذہبی، سماجی

اور ثقافتی تعلقات پر کسی قسم کی آنچ آنے دینا نہیں چاہتا تھا۔

مور کرافٹ نے ایک مہر بند خط کا ذکر کیا ہے۔ جس پر چینی حکومت کی مہر تھی۔ خط میں لداخی راجا سے درخواست کی گئی تھی کہ کاشغر کے خواجہ کی فوج کی نقل وحرکت سے متعلق کوئی جانکاری ہو تو اسے تفصیل سے لہاسہ تک پہنچائے۔ مور کرافٹ کو احساس ہوا کہ ہمسایہ حکومتیں لداخ کو کتنی اہمیت دیتی ہیں۔ مور کرافٹ خود چاہتا تھا کہ لداخ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوا اور اس ضمن میں ازبکستان اور ترکستان جاسکتے تھے لیکن کمپنی نے اس معاہدے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مور کرافٹ کو گریٹ گیم کا پہلا انگریزی کھلاڑی کہا گیا ہے۔

پنجاب کا حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ لداخ پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ مور کرافٹ نے اس سے باز رکھا۔ تب مور کرافٹ لداخ میں تھا۔ اس کے تیرہ سال بعد رنجیت سنگھ نے ۱۸۳۴ء میں اپنے ایک سابق جرنیل اور جموں کے راجا گلاب سنگھ سے لداخ پر حملہ کرایا اور لداخ کو جموں کی قلمرو میں شامل کیا گیا۔

روس کی نظر لداخ پر تھی۔ وہ لداخ کی حکومت سے وفاداری کا طلب گار تھا۔ اس ضمن میں روس نے لداخ کو تجارتی طور فائدہ پہنچانے اور لداخی حکمران کو القابات سے نوازنے کا وعدہ کیا تھا۔ مور کرافٹ کے لداخ میں قیام کے دوران ایک روسی یہودی سیکھتی رافے لوف کے بارے میں سنا۔ جو آغا مہدی کے جعلی نام سے روس کے لئے لداخ میں کام کرتا تھا۔ مور کرافٹ کو اس کی لائی ایک چٹھی ملی جو روس سرکار نے پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لکھی تھی۔ روس رنجیت سنگھ سے سفارتی تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زار روس اپنی سلطنت کی توسیع دینے کی پالیسی کے مطابق لداخ پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن برطانوی ہند سرکار کی حکمت عملی کی وجہ سے روس کی نہیں چلی۔ ہند سرکار کشمیر اور پنجاب کی حفاظت کے لئے لداخ کو روس کی دستبرد سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھتی تھی۔ روس نے اپنی پالیسی کے تحت لداخ اور کشمیر اپنے جاسوس اور نمائندے بھیجے تھے۔

لداخی حکومت اپنی بقا کے لئے نت نئی حکمت عملی سے کام لیتی تھی۔ اس ضمن میں میں اپنے ایک مضمون[1] کے اقتباس کا حوالہ دیتا ہوں:

[1] لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش (تاریخی پس منظر) ماخوذ "لداخ۔ تہذیب وثقافت"۔

''اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے لداخ کے خودمختار حکمران کاشغر اور لہاسہ کے سرکاروں اور کشمیر کے گورنر کے دہلی کی حکومت کو اپنے ہمسایوں کی فوجی اور سیاسی صورت حال سے باخبر رکھتے تھے اور کئی دفعہ اپنی سیاسی مصلحت کوشی کے تحت غلط اطلاعات فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ لدّاخ کی حکومت کی طرف سے کبھی کشمیر کے مغل گورنر کو تبّت یا چین کی فوجی نقل وحرکت کا گھڑا ہوا افسانہ سنایا جاتا تھا اور کبھی کشمیر یا شین جیانگ کی عسکریت پسندی کا قصہ سنا کر تبّت سے یک جہتی اور دوستی کا دم بھرا جاتا تھا۔ اس طرح لدّاخ اپنے پڑوسیوں میں اپنی حیثیت اور اعتماد برقرار رکھنے میں کامیاب رہتا تھا۔''

لداخی راجا چھپل تنڈوپ نمگیل نے ۱۸۲۰ء میں مورکرافٹ کو لیہہ میں رہنے کی اجازت اور سہولیت دی تو اس کی صدائے بازگشت لہاسہ، لاہور اور سرینگر تک پہنچی۔ اور سبھوں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مورکرافٹ کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی سے شکایت کی۔ موجودہ ہماچل پردیش کی ایک چھوٹی ریاست بشاہیر اور اسکردو کے راجاؤں نے لدّاخ حکومت سے دریافت کیا کہ یہ انگریز لدّاخ کیوں آیا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے پورے خطے میں تشویش ہوتی تھی۔

زیرنظر مظمون میں لداخ کی مناسبت سے چین اور ہندوستان کے تعلقات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

ساتویں صدی سے نویں صدی کا زمانہ: جب لدّاخ، وسط ایشیا، گلگت اور بلتستان کا پورا خطہ ایک بڑا سیاسی اور فوجی اکھاڑہ بنا تھا۔ اور چین، تبّت، کشمیر اور عرب حکومتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوئی تھیں۔

آٹھارویں صدی سے اوائل بسویں صدی کا زمانہ: جب زار روس نے توسیع پسند پالیسی اختیار کی تھی اور برصغیر ہند کی سرحد پر لدّاخ اور گلگت کو خطرہ لاحق ہوا تھا۔ جسے تاریخ میں Great Game کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

موجودہ دور: چین میں کمیونسٹ حکومت برسراقتدار آنے کے بعد سرحدی تنازعہ نے دوبارہ سر اٹھایا ہے اور معاملہ نے سنگین صورت اختیار کیا ہے۔

یہاں ہم تینوں ادوار پر روشنی ڈالیں گے۔

ساتویں صدی سے نویں صدی کا زمانہ:

ساتویں صدی میں تبّت فوجی لحاظ سے ایک طاقت ور ملک تھا اور اس کا حکمران رونگ ژن گمپو (۶۲۰۔۶۴۹ء) ایک جنگجو اور مضبوط حکمران تھا۔ اس کا ایک قابل وزیر لونپوریگپا چن لدّاخ کے گاؤں شرگولا سے تعلق رکھتا تھا۔ ۶۴۱ء میں لونپوریگپا چن کی سفارت کاری سے رونگ ژن گمپو کی شادی ایک چینی شاہزادی وین چائینگ سے ہوئی۔ لیکن اس رشتہ سے چین کے ساتھ باہمی تعلقات میں کوئی مثبت اور خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا۔ تبّت نے چین کو اپنے حملے کا ہدف بنایا۔ اس توسیع پسند پالیسی نے لگ بھگ تین سو سالہ جنگ کو ہوا دی۔ جس میں بعد میں کشمیر کے بادشاہ للیتا دتیہ مکتہ پیڈ اور عرب عباسی خلیفہ شامل ہوئے۔ اس کی لپیٹ میں مشرقی ترکستان، گلگت بلتستان اور چین کا صوبہ کانسو آئے۔ اس جنگ میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ کبھی ایک فریق کا پلّہ بھاری رہتا تھا اور کبھی دوسرا فریق غالب آتا تھا۔ اس پر آشوب دور میں چین میں تانگ خاندان کی حکومت تھی جو ۶۱۸ سے ۹۰۷ تک رہی۔ تب گلگت کو چھوٹا بلور اور بلتستان کو بڑا بلور کہا جاتا ہے۔

۶۶۔۶۶۵ء میں تبت چینی ترکستان کے چار شہر کاشغر، ختن، کوچھا اور کارا پر قابض ہوا۔ جنہیں چار گریسن (فوجی چھاؤنیاں) کہا جاتا ہے۔ بلتستان کی حیثیت ایک بفر Buffer ریاست کی تھی اور یہ حملہ آوروں کے رحم و کرم پر تھا اور موقع و محل کے مطابق فریقین کا ساتھ دیتا تھا۔ تبّتی حملہ آوروں نے بلتیوں سے کہا: ''ہم تمہاری سرزمین کے خلاف سازش نہیں کر رہے ہیں بلکہ چار شہر کاشغر، ختن، یارقند اور کارغالیک پر حملہ کرنے کے لئے آپ کے راستے سے فائدہ لے رہے ہیں۔''

چین نے بھی گلگت کے لوگوں سے یہی عذر پیش کیا تھا کہ اس کی جنگی مہم کا مقصد گلگت پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ دشمن کا سامنا کرنے کے لئے اس کی فوجوں کو نقل و حرکت کے لئے اس کی زمین کو بطور گزرگاہ استعمال کرنا ہے۔

لدّاخ بھی تبّتی فوج کے لئے گزرگاہ کا کام دیتا تھا۔ بقولِ ڈوروتھی ووڈمین[1] اس جنگ میں

---

[1] Himalayan Frontiers-Dorathy woodman, 1969

لدّاخ کا اہم کردار رہا ہے۔ چین ترکستان کے علاوہ کشمیر بلتستان، لدّاخ اور مغربی تبت کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہتا تھا۔

تبّتی فوج تبت سے لدّاخ کے علاقے زنسکار میں داخل ہوتی تھی۔ جہاں سے کرگل بلتستان اور گلگت سے ہوتے ہوئے محاذ جنگ تک پہنچتی تھی۔ تبّتی اور لدّاخی زبانوں میں گلگت اور ہُنزا کو درُوش اور ختن کو لی کہا گیا ہے۔ پہلے پہل لدّاخ میں تبتیوں کی موجودگی کا ذکر فارسی کی ایک کتاب ''حدود عالم'' میں ملتا ہے۔ یہ کتاب ۸۲۔۹۸۳ میں لکھی گئی تھی۔

دوسرا راستہ اکسائی چین سے ہوتا ہوا تبّت جاتا تھا۔ جس پر چین نے ۱۹۵۶ء میں گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے سڑک بنائی ہے۔ یارقند جانے کے لئے لیہہ کے پاس خردونگ کا راستہ ۱۸۶۸ء میں برٹش جوئنٹ کمشنر ڈاکٹر کیلے نے دریافت کیا۔

تبّتی حکمران کنزنگ دورجے (۶۷۹۔۷۰۵ء) کے عہد میں تبّت کی فوج نے بلتستان کو دوبارہ اپنے زیر قبضہ لایا۔ تب کشمیر اور چین ایک دوسرے کے حلیف تھے اور تبّت اور عرب ایک معاہدہ کے تحت متحد ہوئے تھے۔ فریقین پوری ایک صدی تک نبرد آزما ہوئے ۷۱۲ء میں بلتستان سے ترکستان جانے والے دروں پر تبّت کا غلبہ ختم ہوا۔ ۷۳۲ء میں للیتہ دیتہ مکتاپیڈ (649-733ء) نے لداخ اور مغربی تبت کو زیر نگین لایا۔ 733ء میں للیتہ دیتہ فوت ہوا۔ اس کی موت کے ساتھ اس کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ تاہم بارھویں صدی تک کشمیر میں اس کی فتوحات کا دن منایا جاتا تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور عرب مورخ ابوریحان البیرونی نے گیارھویں صدی میں لکھا ہے کہ شادیانہ کا یہ دن ماہ چترا کے دوسرے روز منایا جاتا ہے۔

۷۲۵ء میں ٹھی رونگ دیستن تبت کا بادشاہ بنا۔ وہ بھی رونگ ژن گمپو کی طرح بڑا جنگجو تھا۔ اس کے عہد میں تبّت کی طاقت معراج پر پہنچی۔ ۷۳۷ء میں تبّت نے چین کے مفتوحہ علاقوں پر ہلہ بول دیا اور ان کو زیر قبضہ لایا۔ بلتستان ایک دفعہ پھر تبت کے ہاتھ آیا۔ ۷۷۲ء میں بلتستان کے راجا نے تبّت سے دوستانہ معاہدہ کیا۔

۷۴۷ء میں چین نے پامیر کے راستے تبّت کے مضبوط گڑھ داکھان فتح کیا۔ بعد میں یہ جگہ

دارالاتبت کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کامیابی کے بعد چینی فوج نے گلگت کی طرف پیش قدمی کی لیکن عرب فوج کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے دریائے تالاس کے کنارے چین کو فیصلہ کن شکست دی۔

جنگ کے آخری مرحلے میں عرب۔ تبّت کے دوستانہ معاہدے میں دراڑ آئی۔ عرب مکر گئے۔ خلیفہ ہارون الرشید (۷۸۵۔ ۸۰۹ء) نے چین کے دربار میں ایک سفیر بھیجا اور تبت کے خلاف مشترکہ محاذ کھولنے کی تجویز رکھی۔ جسے چین نے قبول کیا۔ دونوں کی ساجھے داری اور مشترکہ حملہ تبت کے لئے بھاری پڑا۔ تبت نے سارے مفتوحہ علاقے کھوئے۔ تبّت کی سرحد اپنے علاقے تک محدود رہی۔ تبّت کے حکمرانوں نے چین پر فوج کشی کا ارادہ ترک کیا۔ ۷۲۲ء میں چین اور تبت کے درمیان عہد نامہ ہوا، جس کے تحت دونوں ملکوں کے مابین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لڑائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ عہد نامے کا متن سنگی ستونوں پر تراشا گیا۔ تقریباً ۲۰۰ سال تک تبّت مشرقی ترکستان کا مالک رہا۔ حالات تبّت کے لئے سازگار نہیں تھے۔ نویں صدی کے آغاز میں تبت داخلی خلفشار سے بھی دوچار ہوا اور مزید کمزور ہوا۔ جس کا اختتام بودھ دشمن بادشاہ لنگ ترما کی ہلاکت پر ہوا۔ تبّت کی طاقتور سلطنت ختم ہوئی۔ لداخ اور بلتستان نے آزادی حاصل کی اور بالائی لداخ کے حکمران گیاپاچو کی دعوت پر تبّتی نژاد کا ایک شاہزادہ سکیت دے نیما گون پائین لداخ کا حکمران بنا۔

مشرقی ترکستان (شین جیانگ) سے لداخ پر صدیوں سے حملے ہوتے رہتے تھے۔ دسویں صدی کے اختتام پر مشرقی ترکستان کے ختن کی جنگجو خانہ بدوش قوم نے لداخ پر حملہ کیا اور حملہ آور لداخ کے علاقے شایوق تک پہنچے۔ تب بالائی لداخ پر گیاپاچو کی حکومت تھی اور گیا اس کی راج دھانی تھا۔ شایوق میں گیاپاچو نے ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ فریقین میں جنگ وجدل جاری رہی۔ تب ختن نے ایک بڑی فوج بھیجی۔ جس نے لداخ کے گاؤں چیکتن تک تباہیاں پھیلائیں اور بہت سارے قیدی اور لوٹ مار کا مال لے کر لوٹے۔ یورگولیک نام کے مقام پر کچھ فوجی رکھے، جن کو لداخیوں نے قتل کیا۔ ختن نے سرکوبی کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی۔ گیاپاچو نے مغربی تبّت کے پورانگ کے حکمران سے مدد مانگی۔ دونوں کی مشترکہ فوج نے ختن کی فوج کو شکست دی۔ گیاپاچو لڑائیوں سے نالاں تھا اور اس کو یہ احساس

ہوا کہ وہ اکیلا لداخ کا دفاع نہیں کرسکتا ہے۔ اس نے تبتی شاہزادہ سکیت دے نیما گون کو مرچے لنگ سے خلسے تک کا اپنا علاقہ پیش کیا۔ نیما گون نے شے کو راج دھانی بنایا اور یکے بعد دیگرے لداخ کا سارا علاقہ اپنے زیر قبضہ لایا۔ گیاپاچو کی حکومت ختم ہوئی۔ سکیت دے نیما گون کی اولاد نے ۱۸۳۴ء تک لداخ پر حکومت کی۔ جب جرنیل زور آور سنگھ نے لداخ فتح کیا اور جموں کی قلمرو میں شامل ہوا۔

گیاپاچو کی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مشرقی ترکستان سے گاہے گاہے حملے ہوتے رہے۔ پندرھویں صدی سے لداخ کو ایک نئے حملہ آور سے پالا پڑا۔ یہ حملہ آور کشمیر سے نمودار ہوئے۔

۱۴۰۵ء میں کشمیر کے سلطان سکندر (۱۳۸۴۔۱۴۱۳ء) نے لداخ پر حملہ کیا۔ سلطان کے سابق وزیر رائے ماگرے نے لداخ کو اپنے قبضے میں لایا۔[1] تاہم ایس۔ پی۔ ورما کے مطابق صرف بلتستان پر قابض ہوا۔ سلطان سکندر کے بیٹے سلطان زین العابدین (۱۴۴۰۔۱۴۷۰ء) نے لداخ فتح کیا۔ تب شے لداخ کی راج دھانی تھی۔ سلطان نے اپنے بیٹے آدم خان کو ۱۴۵۱ء کے آس پاس لداخ کا گورنر بنایا۔ لداخی مورخ ایس۔ ایس۔ گیرگن کے مطابق سلطان زین العابدین نے پشمینہ کی فراہمی کے لئے لداخ پر فوج کشی کی تھی۔ جب سلطان کو یقین دلایا گیا کہ باقاعدگی سے کشمیر پشمینہ برآمد کیا جائے گا تو حملہ آور فوج واپس لوٹی۔

سلطان حسن شاہ نے ۱۴۸۳ء میں لداخ اور بلتستان پر دھاوا بولا۔ اس کے ایک کمانڈر سید حسن شاہ نے بلتستان فتح کیا تاہم دوسرے کمانڈر جہانگیر ماگرے کو لداخی راجا لاچھن باگھن نے شکست دی۔ ان سے پہلے کشمیر کے سطان شہاب الدین نے لداخ اور بلتستان پر حملے کئے تھے۔

تاریخ راشدی کے مطابق مشرقی ترکستان کے بادشاہ ابوبکر کے جرنیل میر ولی نے لداخ پر فوج کشی کی اور عارضی طور قابض ہوا۔ کتاب ہذا کے انگریزی کے مترجم نے الیاس (Ney Elias) کے مطابق یہ حملہ اندازاً پندرھویں صدی کے اختتام پر ہوا تھا۔ اس کے بعد میر مایذید کی سرکردگی میں ترکی فوج نے لگ بھگ ۱۵۱۷ء میں لداخ پر حملہ کیا۔ میر مایذید لداخ میں کہیں سر پر پتھر لگنے سے ہلاک ہوا تھا۔ سولھویں صدی میں مرزا حیدر دوغلت نے لداخ پر یلغار کی اور عارضی طور قابض رہا۔

---

[1] A History of Kashmir، از پرتھوی ناتھ کول بامزئی۔

مرزا حیدر کے مرنے کے بعد لداخ پر کشمیر سے دو حملے ہوئے۔ پہلا حملہ ۱۵۵۳ء میں حیدر چک، غازی خان اور جیب خان نے کیا۔ دوسرا حملہ سلطان غازی شاہ (۱۵۶۱۔۱۵۶۳ء) نے کیا۔ اس کی قیادت سلطان کے بیٹے احمد خان، فتح خان چک اور ناصر کتابی نے کی۔ شروع میں لداخیوں نے بھاری تاوان دینا مان لیا۔ بعد میں غالباً مکر گئے۔ کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ سلطان کا ایک سرکردہ کمانڈر فتح خان مارا گیا۔ سلطان نے اس کا انتقام لینا چاہا لیکن عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔

ترکوں کا ایک بڑا حملہ سترھویں صدی میں راجا دیلدن نمگیل کے عہد میں ہوا۔ لیہہ کے پاس چھشوت میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جس میں فریقین کے بہت سارے سپاہی مارے گئے۔ ہمس کے بڑے لاما کوشوق ستق سنگ راسپا نے تدبر سے سمجھوتہ کرایا اور حملہ آور واپس لوٹے۔

مقامی روایت کے مطابق ایک دفعہ ترکی حملہ آور فوج لیہہ کے نزدیک خردونگ تک پہنچی۔ فوجیوں نے ایک پہاڑی سے لیہہ کی طرف نظر ڈالی۔ فصل کٹائی کا موسم تھا۔ کھیتوں میں ترتیب سے کھلیان رکھے تھے۔ جنہیں حملہ آور فوجی سمجھے۔ بڑی تعداد میں فوج دیکھ کر حملہ آور پسپا ہوئے۔ اس لئے اس پہاڑی کا نام ''مغلوق'' یا جنگی مداجعت یا واپسی پڑا ہے۔ عمر رسیدہ لوگوں کے مطابق اس پہاڑی پر ترکی فوجیوں کا چھوڑا ہوا سامان، گھوڑے کی نعلیں وغیرہ ملتی تھیں۔

کمیونسٹ چین برسر اقتدار آنے سے پہلے تبت اور چینی یا مشرقی ترکستان پر چین کی حکومت کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ تبت پر منگول حملے کرتے تھے اور تبتی بھی ان حملوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنگیز خان اور قبلائی خان نے چینی افواج کو شکست دی تھی اور چین کے بڑے علاقے پر اپنا جھنڈا گاڑا تھا۔ تیرھویں صدی میں قبلائی خان تبت پر قابض ہوا۔ منگول سردار گورسی خان نے ۱۶۴۲ء میں تبت پر حملہ کیا تھا اور دلائی لاما لبزانگ گیا ژو (۱۶۱۷۔۱۶۸۲ء) کو ملک کا فرمان روا بنایا اور روحانی پیشوا قرار دیا۔ ۱۷۱۷ء میں ڈسونگر منگول نے تبت پر ہلّہ بول دیا تھا اور عارضی طور پر لہاسہ پر تسلط قائم کیا تھا۔ ۱۷۵۰ء میں لہاسہ میں شورش ہوئی تھی اور دلائی لاما کی حکومت بحال کی گئی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں تبتیوں نے چینی فوج کو دریائے میکونگ تک ملک بدر کیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں ایک دفعہ اور تبتیوں کو ینگشے تک دھکیل دیا تھا۔ جی ٹوچی نے اپنی کتاب (مطبوعہ: ۱۹۶۷ء) Tibet-Land of Snows میں لکھا ہے: تبت میں

چین کے خلاف ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۰ء میں بھی بغاوتیں ہوئیں۔ ۱۹۱۰ء میں چین نے مداخلت کی اور دلائی لاما کالمپونگ بھاگ گئے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں واپس لوٹے۔ کمیونسٹ چین کے زیر نگیں آنے سے ایک سال پہلے تبتی حکومت کے ایک سفارتی وفد نے اپنے پاسپورٹ پر امریکہ اور انگلینڈ کا دورہ کیا تھا۔

یہی صورت حال مشرقی ترکستان کی بھی تھی۔ یہاں بھی گاہے گاہے چین کے خلاف بغاوتیں ہوتی تھیں اور بڑا خون خرابہ ہوتا تھا۔ بغاوت کے بعد کوئی ترک برسر اقتدار آتا تھا اور حکومت کرتا تھا۔ ان حکمرانوں میں سلطان سعید، سلطان ابوبکر، اتالیق غازی اور یعقوب بیگ اہم نام ہیں۔ دسُونگر منگول نے اٹھارویں صدی میں ترکستان کو بھی عارضی طور پر اپنے زیر قبضہ لایا تھا۔

ہمسایہ ملکوں میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت لداخ کے لئے خوش آئند تھا۔ لداخ حملہ آوروں کی دستبرد سے محفوظ اور مامون رہتا تھا۔ مشرقی ترکستان میں چین کی عمل داری ہوتی تو لداخ پر حملے بند ہوجاتے۔ اس طرح جب کشمیر مغلیہ سلطنت کا حصہ بنا تو لداخ میں لگ بھگ فوجی یورش ختم ہوگئی اور خطے میں امن وسکون رہا۔ مغل حکومت نے سرینگر کے پاس لداخی راجا کو ایک جاگیر دی تھی۔ جسے ہر سال پانچ سو بوریاں چاول دستیاب تھیں۔ لداخی حکومت کشمیر کے مغل گورنر کو تھوڑا سا باج دیتا تھا۔ مغل حکمرانوں کو لداخ کے پشمینہ سے دلچسپی تھی۔ جو بلاناغہ کشمیر برآمد ہوتا تھا۔

لداخ نے اپنی ایک ہزار سالہ تاریخ میں چند جنگجو اور توسیع پسند حکمران پیدا کئے ہیں۔ ان میں لاچھن اوت پالا (۱۰۸۰-۱۱۱۰ء) کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے سلطنت میں موجودہ لداخ کے علاوہ مغربی تبت بلتستان، گلگت، نیپال کا علاقہ ماستنگ اور کلو سمیت ہماچل پردیش کا بڑا علاقہ شامل تھا۔ تب لداخ مغربی ہمالیہ میں سب سے طاقت ور ملک تھا۔

راجا چھوانگ نمگیل اول اور راجا سینگے نمگیل اس زمرے میں آتے ہیں۔ اول الذکر نے ترکوں کے آئے دن کے حملوں سے نالاں ہوکر یارقند (لداخی مشرقی ترکستان کو یارقند کہتے ہیں) پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ نوبراہ وادی کے باشندے اسے بڑے ہراساں ہوئے کیونکہ نوبراہ وادی ترکستان۔ لداخ تجارتی راستے پر پہلے آتی ہے اور کسی جوابی حملے کی صورت میں سب سے پہلے یہ لوگ زد میں آسکتے ہیں۔ نوبراہ کے نمائندے راجا سے ملے اور ترکستان پر حملہ نہ کرنے کے لئے درخواست

کی۔ راجا نے ان کی درخواست مان لی۔ سینگے نمگیل نے دوبارہ مغربی تبت کو اپنے زیر نگیں لایا۔

لداخ کی سرحدوں پر چھاپہ مار قسم کے دھاوے ہوتے تھے۔ چھاپہ مار لوٹ مار کا مال کر چمپت ہو جاتے تھے۔ مرزا حیدر کے مطابق سلطان سعید کی تخت نشینی کے بعد لوٹ مار کے لئے لداخ کئی پارٹیاں بھیجی گئی تھیں۔

۱۸۲۲ء میں کلو نے سپیتی پر حملہ کیا۔ پھر کینور اور لاہول سے مل کر زنسکار پر دھاوا بولا۔ زنسکار کے صدر مقام پدم سمیت سارے علاقے کو لوٹا اور تباہ کیا۔ تین سال بعد پاڈر کے رتن شیر خان نے اٹینگ سے پدم تک سارا زانسکار تباہ کیا۔ مصیبت یہاں ختم نہیں ہوئی۔ منڈی اور دردام کی فوج نے دوبارہ زنسکار کو لوٹا۔ ۱۸۳۴ء سے ڈوگرہ فوج کی زیادتیاں شروع ہوئیں۔ ماضی میں گرمیوں میں کشتواڑ سے بکروال لوٹ مار کے لئے زنسکار آتے تھے۔

۱۸۲۲ء میں کشمیر جاتا ہوا مور کرافٹ جب دراس پہنچا، پڑوس کے حسورا (استور) کے راجا کے آدمیوں نے گاؤں پر ڈکیتی ماری تھی۔ مور کرافٹ کے چند سپاہیوں نے ہوا میں گولیاں چلائی تھیں لیکن ڈکیتی مار سینکڑوں آدمیوں اور ہزاروں بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کو ہانک کر لے گئے۔ صبح مور کرافٹ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے لگا۔ بہت سارے نیم دھڑنگ لوگ اس سے پناہ مانگنے لگے۔

دراس میں گاہے گاہے ڈاکہ زنی ہوتی تھی۔ لداخی راجا اور کشمیری حاکم جو مالک کہلاتے تھے۔ گاؤں والوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہے تھے۔ لداخ کے آخری راجا نے مالک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ابوریحان البیرونی کے مطابق کشمیر میں قدیم زمانے میں وادی کشمیر میں داخل ہونے والے دروں پر حملوں سے حفاظت کے لئے چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کئے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے زمانے میں بھی ان قلعوں کو بروئے کار لایا جاتا تھا۔ ان کے محافظوں کو Lord of the Gate کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں محافظوں کے نگران کو مالک کہا جاتا تھا۔ یہ محافظ گاہ رہداری یا چوکی کہلاتی تھی۔ پروانہ رہداری کے بغیر کسی کو وادی سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

مور کرافٹ لکھتا ہے کہ مالک اور اس کے اہل کار بڑے ظالم اور بددیانت تھے۔ ایک دفعہ لداخ نے بھی جوابی حملے کے لئے چھاپہ مار دستے بھیجے تھے لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ انہیں کہاں بھیجے گئے تھے۔

۱۸۸۹ء میں دو کرغیز لیہہ آئے تھے۔ ان کے نام ساقی ولی اور موسی تھے۔ یہ خانہ بدوش کرغیز ترکستان۔ لیہہ تجارتی راستے پر واقع شہید دلہ کی چراگاہ پر اپنے جانوروں کو چراتے تھے جہاں Kanjuts یعنی ہنزہ والے لوٹ مار کے لئے آتے تھے۔ انہوں نے کشمیر دربار سے استدعا کی کہ شہید دلہ کے قلع کو دوبارہ اپنی تحویل میں لائے اور اُنہیں ہنزہ کے ڈاکوؤں سے نجات دلائے۔ یہ قلعہ ڈوگرہ تھانیدار بستی رام نے تعمیر کیا تھا۔ جس سے انگریزوں نے چین کا علاقہ بتا کر خالی کرایا تھا۔ یارقند میں چین کے اہل کار نے کرغیزوں سے اس بنا پر مدد دینے سے انکار کیا تھا کہ کرغیز چین کی سرحد سے باہر رہتے ہیں۔

اسی اثناء میں ۳۱ر جولائی ۱۸۸۹ء کو انگریز فوجی افسر ینگ ہاسبنڈ لیہہ پہنچا۔ اور ۱۷ ڈوگرہ فوجیوں کے ہمراہ شہید دلہ روانہ ہوا۔ ینگ ہابنڈ نے کرغیز سردار توردی کول کو پرانے قلعے کی مرمت کے لئے مالی امداد دی تا کہ ہنزہ کے ڈاکوؤں کی مدافعت کی جاسکے۔ یعقوب بیگ جب ترکستان کا سلطان بنا تو شہید دلہ کو اپنے زیر قبضہ لایا۔

آٹھارویں صدی سے آوائل بسویں صدی کا زمانہ:

۱۸۳۴ء میں راجا گلاب سنگھ کے جرنیل زور آور سنگھ نے لداخ پر حملہ کیا۔ اس کے لئے انگریزوں سے باقاعدہ اجازت لی تھی۔ اسے پہلے پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا۔ جس کی رو سے دریائے ستلج کے پار شمال میں رنجیت سنگھ کو فوج کشی اور اپنی سلطنت کو توسیع دینے کی چھوٹ دی گئی تھی۔ لداخ پر فوج کشی پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی دیرینہ خواہش تھی۔ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو اس کی خدمات کے عوض جموں جاگیر میں دیا تھا۔ لداخیوں کی کئی بغاوتوں کو کچلنے کے بعد ۱۸۴۲ء میں ڈوگرہ حکومت لداخ کے سیاہ وسفید کا مالک بنا۔ دوسرا ہدف بلتستان تھا۔ جس سے ۱۸۴۱ء میں زیر نگیں لایا۔ ان فتوحات سے زور آور سنگھ کا حوصلہ بڑھا اور تبت پر حملہ کیا۔ حملہ کرنے سے پہلے زور آور سنگھ نے قلعہ کے پھاٹک کی کھڑکی کو مقفل کر دیا اور لوہے کے پترے پر ذیل کے الفاظ لکھ کر کھڑکی کے اوپر جڑ دیا تھا۔

''جب تک لہاسہ فتح نہ ہو، یہ کھڑکی نہ کھولی جائے۔''

۱۹۴۷ء میں یہ کھڑکی کھول دی گئی۔

تبت پر حملہ کرنے سے پہلے زور آور سنگھ نے مشرق ترکستان پر حملہ کا منصوبہ کیا تھا اور والی مشرقی ترکستان سے خراج مانگا۔ انگریزوں نے زور آور کو حملے سے باز رکھا۔

زور آور سنگھ کے مغربی تبت پر حملے کا برطانوی ہند کا ردِ عمل بہت سخت تھا۔ پنجاب کی سکھ حکومت کو ایک سخت خط لکھا اور یہ تحریر کیا کہ ناریس کورسوم (مغربی تبت) چین کا علاقہ ہے۔ ڈوگرہ حکومت کو چین کی حکومت سے پیچیدہ مسئلہ کے تدارک کے لئے مقبوضہ علاقہ خالی کر دینا چاہئے۔

کٹھمنڈو میں انگریز نمائندہ B.H.Hodgson کو پکا خیال تھا کہ کمپنی کا بہترین مفاد گلاب سنگھ کو مزید ایسے اقدام لینے سے روکنا ہے۔ جسے چین مشتعل ہو۔

زور آور سنگھ نے سنا تھا کہ تبت میں سونے کی کانیں ہیں۔ زمین کے علاوہ سونے کا بھی لالچ تھا جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ مقبوضہ علاقہ کو انخلاء کے لئے ۱۰ ردسمبر ۱۸۴۱ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ ایک انگریز افسر جے۔ ڈی۔ کننگھم کو اس فیصلے پر عمل آوری اور زور آور سنگھ کو واپس بلانے کے لئے لداخ روانہ کیا۔ لیکن حکم نامہ پہنچنے سے پہلے زور آور سنگھ کی فوج کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی تھی اور زور آور سنگھ مارا گیا تھا۔

ستمبر ۱۸۴۲ء میں لداخ۔ تبت کی سرحد کے بارے میں چین کے شہنشاہ الہاسہ کے لاما گورو اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے مابین ایک تحریری معاہدہ ہوا، جس کے تحت فریقین نے تبت۔ لداخ کی روایتی سرحد کی توثیق کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبت نے لداخ کو اپنے علاقے میں مینسر نام کی ایک جگہ نذر کی۔ انگریزوں کے زمانے میں مرتب کردہ Gazetter of Kashmir and Ladakh میں اسے جاگیر کہا ہے۔ جو تبت کی حکومت نے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے جانشینوں کو دیا۔ مینسر یا مینسر ترُجم کو ہم انگریزی میں Enclave کہہ سکتے ہیں۔ جو غیر ملکی علاقوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک چراگاہ ہے، جس میں کچھ لوگ آباد ہیں۔ جن سے مالیہ لیا جاتا تھا۔ لیہہ سے مینسر پیدل یا گھوڑے پر ۱۷ دن کا سفر ہے۔ جھیل مانسروار سے شمال مغرب کی طرف یہ گرتوق کے راستے پر واقع ہے۔ جہاں سے لگ بھگ دو دن لگتے تھے۔ ۱۹۶۲ء کی ہند۔ چین جنگ تک لداخی حکام یہاں مالیہ جمع

کرنے آتے تھے۔ لداخ کے انگریز وزیر (منتظم اعلیٰ) ولیم جانسن نے مینسر کا دورہ کرنے کی کوشش کی لیکن گرتوق میں تعینات چینی افسر نے اس کو گرتوق سے آگے جانے نہیں دیا۔ جان بیرے نے لکھا ہے کہ لداخ کے تھانیدار بستی رام نے ۱۸۵۳ء میں مینسر سے ۵۶ روپے کا مالیہ حاصل کیے۔ ۱۹۰۵ء میں مالیہ کی رقم ۲۹۵ روپے تک بڑھی۔ تب مینسر میں ۴۴ کنبے تھے۔ جن کی مجموعی آبادی ۸۷ مردوں اور ۷۳ عورتوں پر مشتمل تھی۔

مالیہ کی آمدن سے علاقے کے گنپوں کے چراغ کے تیل کا خرچ نکلتا تھا۔ یہ کیلاش یاتریوں اور بھارتی تاجروں کا مسکن بھی تھا۔

۱۹۳۹ء میں برٹش ٹریڈ ایجنٹ ڈاکٹر کانشی رام، ۱۹۴۱ء میں ایک لداخی اہل کار چھیتن پنچگ اور ۱۹۴۲ء میں لوپچق سے وابستہ ایک لداخی مسلم عبدالوحید رادو نے مینسر سے مالیہ جمع کیا۔ روپشو اور سرحدی گاؤں کے نمبر دار مینسر سے ہر سال ۶۰ بھیڑیں، ۶۰ بکریاں، ۲۰ یاک، ۶۰ لیلاؤں (بھیڑ کے بچے) کی کھالیں اور نقد ۶۰ روپے بطور خراج لیہہ انتظامیہ کو حوالہ کرتے تھے۔

لہہ اور لہاسہ دونوں کی رعیت ہونے کی وجہ سے مینسر کی آبادی مشکلات سے دوچار تھی۔ ۱۹۵۰ء کی دھائی میں جب کوشوق بکولا کیلاش یاترا پر آئے تو مینسر کے لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ جموں کشمیر سرکار سے ان کا مالیہ معاف کرائیں۔

تبت میں بھوٹان کا بھی ایک enclave تھا۔ درچین لبرانگ نام کی یہ بستی ماؤنٹ کیلاش کے پاس تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ ہندوستانی حکومت نے اب تک چین کے ساتھ مینسر کا مسئلہ نہیں اٹھایا ہے۔

بعد میں انگریز سرکار نے مہاراجہ پر زور دیا کہ لداخ اور تبت کی سرحد کا تعین کرے۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے گورنر جنرل لارڈ ہارڈینگ نے ۲۸ جولائی ۱۸۴۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر کو ایک خفیہ خط لکھا، جس میں یہ لکھا تھا کہ چین اور لداخ کی سرحد کے تعین کرنے کے لئے تین ماہرین پر مشتمل ایک کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ممبروں کے نام کپتان الیکزنڈر کننگھم، اے۔ ایچ سٹریچی اور تھامس تھامسن تھے۔ یہ لداخ کا دورہ کریں گے اور دو سال کے اندر حکومت کو

رپورٹ کریں گے۔ ان کو مختلف فرائض تفویض کئے گئے تھے۔ انہیں لداخ اور تبت کی سرحد تعین کرانا تھی تا کہ گلاب سنگھ کو سرحدی تنازعہ کے نام پر دوبارہ تبت پر حملہ کرنے کا بہانہ نہ ملے۔ انہیں لداخ کی تاریخ، جغرافیہ، پیداوار اور وسائل جیسے معدنیات، ثقافت اور علم و ادب سے متعلق تفصیلات معلوم کرنی تھی۔ تجارتی امور میں مراعات حاصل کرنا اور برطانوی ہند کی قلمرو میں پشمینہ کی برآمدات کے لئے گفت وشنید کرنے کی ہدایت تھی۔ اس ضمن میں صرف لداخ کو مغربی تبت کا پشمینہ خریدنے کا اجارہ حاصل تھا۔ اس سلسلے میں انگریز سرکار نے کشمیر کی حکومت سے سپیتی کا علاقہ حاصل کیا اور اس کے بدلے میں پٹھان کوٹ کے پاس لکھن پور اور ہزارہ میں ایک چھوٹا سا علاقہ گلاب سنگھ کو دیا۔ ان کا ذمہ خفیہ طور اطلاعات حاصل کرنا تھا۔ انہیں الگ الگ راستے انتخاب کر کے مختلف علاقوں میں جانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ افواہ پھیلی کہ ٹیم ختن اور لہاسہ جائے گی۔ البتہ اجازت ملنے کی صورت میں قراقرم سے آگے جانے کی ہدایت دی گئی تھی۔ تاہم اسے آگے بولور تاغ کے پہاڑ عبور نہیں کرے گی۔

الیکزنڈر کننگھم اور سٹریچی .... پہلے لداخ گئے تھے۔ حکومت نے اُنہیں ضروری آلات، آدویات اور ویکسین فراہم کی اور برف پگھلنے پر تینوں ممبران لداخ روانہ ہوئے۔

چینی حکام نے کمیشن کے ممبروں سے ملاقات یا تبادلہ خیال کرنے سے گریز کیا اور انہیں تبتی علاقے میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے ان کا دورہ لداخ کے علاوہ گڑھوال، بشاہیر، سپیتی اور لاہول تک محدود رہا۔ اگست ۱۸۴۷ء سے جولائی ۱۸۴۸ء تک انہوں نے لداخ کے جنوب سے پنگونگ کے شمال تک دورہ کیا۔ الیکزنڈر کننگھم نے Ladakh-Physical, Statistical and Historiacal (1853) کے نام سے ایک معلوماتی کتاب لکھی جو لداخ کی تاریخ، جغرافیہ، پیداوار، وسائل وغیر پر اچھی روشنی ڈالتی ہے اور اس دور کے لداخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ تھامس تھامسن نے لداخ کی نباتات پر ایک اچھی کتاب لکھی۔ سٹریچی نے لداخ کے بارے میں ایک خفیہ رپورٹ تیار کی اور اپنے سفر کے احوال لکھے۔ جو راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرے۔ ۱۸۴۹ء میں کمیشن کے ممبران واپس ہندوستان لوٹے اور حکومت کو اپنے رپورٹ پیش کی۔

گونڈ کرانرائن راؤ نے جو ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہند۔ چین سرکاری بات چیت میں ہندوستانی

وفد کا صلاح کار تھا، اپنی کتاب The India-China Border- A reappraisal میں رقم طراز ہے: ''سٹریچی کے نقشے میں جو اطلاعات فراہم کی گئی ہیں، وہ حکومت ہند کے موجودہ دعویٰ سے بہت کم فرق رکھتا ہے''۔ وہ لکھتا ہے۔ ڈاکٹر تھامس تھامسن ہند چین سرحد سے متعلق کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہے۔

روس انیسویں صدی کے آوائل سے ایک توسیع پسند پالیسی پر عمل کر رہا تھا۔ وسط ایشیا کے بعد اس کی نظر ہندوستان پر تھی۔ زار روس پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے کوشاں تھا۔

۱۸۷۳ء میں روسی فوج ہندوستان کی سرحد کے قریب پامیر تک پہنچی اور وہ ہندوستان کی طرف پیش قدمی کے لئے پر تول رہی تھی۔ ایسے میں برطانیہ ہند سرکار کی آنکھیں کھلیں اور روس کی توسیعی پالیسی کے تدارک کے لئے حرکت میں آئی۔ جسے تاریخ میں گریٹ گیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

روسی توسیعی پالیسی سے متعلق قدرے تفصیل سے ''لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش'' کے نام سے میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ زیر نظر مضمون میں گریٹ گیم کے تناظر میں چین اور برطانوی ہند کے درمیان سرد جنگ اور چین اور ہندوستان کے درمیان موجودہ سرحدی تنازعے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

برطانوی ہند سرکار نے لداخ، تبت اور وسطِ ایشیا سروے ٹیمیں اور جاسوس بھیجے۔ مہاراجہ سے گلگت پر حملہ کرایا۔ انگریزوں کی شہہ پر ۱۸۴۲ء میں ڈوگرہ کمانڈر نتھو شاہ نے استور کا قلعہ فتح کیا۔ معزول راجا کریم خان کی دعوت پر وہ گلگت گیا اور یاسین کے حکمران گوہر رحمان کو جو گلگت پر قابض تھا، شکست دی اور ایک معاہدہ کے تحت گلگت کا مالک ڈوگرہ حکومت بنا۔ انگریزوں نے یاسین کو بھی زیر نگیں لانے کے لئے کہا۔ پھر ڈوگرہ حکومت کی مرضی کے خلاف لیہہ، گلگت اور سرینگر میں اپنے پالیٹیکل افسر مقرر کئے۔ لیہہ میں انگریز افسر کو برٹش جوئنٹ کمشنر، گلگت میں پالیٹیکل ایجنٹ اور کشمیر میں ریذیڈنٹ کہلاتے تھے۔ انہیں غیر معمولی اختیارات تھے۔ یہ وقتاً فوقتاً سرکاری امور میں مداخلت کرتے تھے۔

۱۸۶۲ء میں خفیہ محکمہ کے ایک انگریز افسر کپتان تھامس جاج منٹگمری نے دیکھا کہ ہندوستان کے لوگ لیہہ سے بلا روک ٹوک لہاسہ اور وسط ایشیا جا سکتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ کسی بھی ہندوستانی کو

ضروری آلات کے ساتھ خفیہ طور پر وسط ایشیا اور تبت بھیجا جائے تو وہ اپنا کام کر کے آسکتا ہے۔ منٹگمری نے متعلقہ افسران کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔ منظوری ملنے پر ایک پنجابی نوجوان محمد حمید کو تربیت دے کر ضروری آلات کے ساتھ ۱۸۶۳ء میں مشرقی ترکستان بھیجا اور ۱۸۷۳ء میں الموڑہ کے ایک استاد نین سنگھ کو لیہہ سے ایک یاتری کے بھیس میں سفارتی مشن لوپچق کے ہمراہ لہاسہ روانہ کیا۔ دونوں نے بڑا عمدہ کام کیا۔ ایک سال بعد نین سنگھ دوبارہ لوپچق اراکین کے ہمراہ لہاسہ گیا۔ لہاسہ میں لداخی نسل کے دو مسلمانوں نے نین سنگھ کو مشکوک پایا اور حقیقت اگلوائی۔ تاہم انہوں نے افشا نہیں کیا۔

۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۵ء کے درمیان Great Trignometrical Survey of Dehradun نے ہندوسانی محققوں اور جاسوسوں کو جاسوسی اور سروے کی تربیت دی اور انہیں تبّت، وسط ایشیا اور منگولیا بھیجے۔ اندرا سنگھ روات اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''۱۸۶۴ء میں ان خطوں کے نقشے خالی تھے اور حقائق مسافروں کی کہانیوں پر مبنی تھے یا چین کے مبہم نقشوں پر انحصار رکھنا پڑتا تھا۔''

ان محققوں اور جاسوسوں کے حسب ذیل نام دئے گئے ہیں۔ نین سنگھ، کشن سنگھ، کلیان سنگھ، ہری رام: لالہ، کینتھوپ، شرت چندرا داس، رگزین نمگیل، مرازا شیخ، عطا محمد، عبدالسبحان، ہری رام وغیرہ۔

نین سنگھ کی کارکردگی سے متعلق لکھا گیا ہے: ''ایک فرد جس نے ہمارے دور میں کسی اور فرد کے مقابلے میں ایشیا کے نقشے میں زیادہ مثبت معلومات کا اضافہ کیا ہے۔''

تاہم کشن سنگھ نے نین سنگھ کے مقابلے میں اپنی تحقیق سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

۱۸۶۷ء میں ڈاکٹر کیلے کو لیہہ میں برٹش جوئنٹ کمشنر تقرر کیا گیا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے احتجاجاً لکھا کہ یہ تقرری اس کے داخلی امور میں مداخلت کے مترادف ہے۔ انگریز حکومت سپیتی میں رہ کر ترکستان اور تبّت کے واقعات اور تجارتی معلومات جان سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں پنجاب کے انگریز لیفٹیننٹ گورنر نے لکھا کہ وائیسرائے کا حکم حتمی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد گورنر جنرل کا نام بدل کر وائیسرائے رکھا گیا تھا۔

انگریز یہ سمجھتے تھے کہ کشمیر انہوں نے گلاب سنگھ کو تحفے میں دیا ہے۔ سکھوں اور انگریزوں کی

لڑائی میں گلاب سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ تب گورنر جنرل لارڈ ہارڈینگ نے خفیہ کمیٹی کو اپنے خطوط میں اشارہ دیا تھا کہ وہ گلاب سنگھ کے لئے کوئی مفید کام کرنا چاہتا ہے۔ جب کشمیر کے گورنر شیخ امام الدین نے جموں سے کشمیر کے الحاق کی مخالفت کی تو انگریزوں نے کرنل لارنس کی سرکردگی میں سرکوبی کے لئے فوج بھیجی اور ۹ نومبر ۱۸۴۶ء کو گلاب سنگھ اور لارنس سرینگر میں فاتحانہ داخل ہوئے۔ تب گلاب سنگھ نے اپنے ایک خط میں وائیسرائے کو لکھا تھا: ''میں جناب والا سے اپنی فرمان برداری کے ثبوت میں اپنی جان اور دولت قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

روس کی پیش قدمی کے بعد انگریزوں نے اپنی پالیسی بدل دی۔ ان کی نظر میں روس کا سامنا کرنے کیلئے ایک ہی راستہ تھا کہ ریاست میں زیادہ کنٹرول حاصل کریں۔ انہوں نے رنبیر سنگھ کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ سرحدی علاقوں پر قابض ہوجائے اور فوجی نقطہ نظر کے اہم درہ اشکومن کو اپنے زیرِ نگین لائے۔ چنانچہ وائیسرائے نے ۱۸۷۶ء میں مادھوپور میں مہاراجہ کو ذاتی طور اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ وائیسرائے نے کہا: ''شمالی سرحدوں پر سیاسی حالات کے پیشِ نظر حکومت ہند چاہتی ہے کہ چترال اور وسیم جیسی ریاستیں کشمیر کی دشمن طاقتوں کی بجائے ہز ہائی نیس جیسے انگریز حکومت کے دوست اور حلیف کے زیرِ تسلط آئیں۔''

مہاراجہ نے قبول کیا۔ لیکن وائیسرائے کی یہ تجویز اس شرط کے تابع تھی کہ مہاراجہ گلگت میں ایک انگریز پالیٹیکل افسر کی تقرری منظور کرے جو سرحد کی صورت حال سے حکومت ہند کو براہِ راست مطلع کرے۔

کشمیر کو ہندوستان کا شمالی قلعہ کہا جاتا تھا اور گلگت کو بیرونی چوکی Out post قرار دی جاتی تھی۔ برگیڈیر جرنیل ڈبلیو۔سی۔لوکارٹ W.C.Lockart اور کرنیل ڈورانڈ گلگت کی جغرافیائی اہمیت سمجھتے تھے۔ اول الذکر نے گلگت میں برطانوی ایجنسی کھولنے کی ضرورت پر زور دیا۔ چین ہنزہ کو اہمیت دیتا تھا اور اپنا علاقہ سمجھتا تھا۔

اُن دنوں ہندوستان میں حکومت انگلیشیہ چین کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کی نظر میں سارا خطرہ روس کی طرف سے منڈلا رہا تھا۔ انگریزوں کو یہ بھی اندیشہ تھا کہ روس مشرقی

ترکستان اور تبت کو ہڑپ کرنے پر تلا ہے۔

۱۸۶۵ء میں چین مشرقی ترکستان کے مسلم باغیوں سے نبرد آزما تھا۔ مہاراجہ نے اس سے فائدہ اٹھاتا ہوا شہید ولہ کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا اور لداخ کے ڈوگرہ تھانیدار بستی رام نے وہاں فوج کی ایک ٹکڑی رکھی۔ شہید ولہ لیہہ سے ۲۱۹ میل دور اور ترکستان کے شہر یارقند سے ۲۴۰ میل دور لداخ۔ ترکستان تجارتی راستے پر واقع ہے۔ یہاں کرغیز کمپ لگاتے تھے۔ ینگ ہاسبنڈ نے شہید ولہ کا مختصر ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ''اس کے گرد و نواح کا ماحول قدرے اچھا ہے۔ میدان میں ایک قلعہ ہے۔ قریب ایک چھوٹا جنگل اور چراگاہ ہے۔ یہاں قافلے رکتے ہیں۔ شہید ولہ میں تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ قراقش دریا یہاں بہتا ہے۔''

چند سال بعد انگریزوں کے حکم پر ڈوگرہ حکومت نے یہ قلعہ خالی کیا۔ انگریزوں کو رنبیر سنگھ کی Leap Forward پالیسی پسند نہیں آئی۔ رنبیر سنگھ نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ۱۸۶۷ء تک مہاراجہ نے کئی جاسوس وسط ایشیا بھیجے۔ ایک فوجی افسر سوہان خان بندوقی کو وسط ایشیا میں چین فوج کی صورت حال جاننے کے لئے بھیجا۔ اس نے مہاراجہ کی سرکار کو ایک جامع رپورٹ پیش کی۔ اپنے جاسوسوں اور سیاسی مشیروں کی رپورٹ پڑھ کر مہاراجہ کو خطے کی بدامنی سے فائدہ اٹھانے کا خیال آیا اور برطانوی ہند حکومت سے استدعا کی کہ چینی یا مشرقی ترکستان پر حملہ کرنے اور مفتوحہ علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کی اجازت دے۔ برطانوی حکومت نے مہاراجہ کو اس کے ارادے سے باز رکھا۔ رنبیر سنگھ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قاصدوں کے ذریعے روس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تا کہ انگریزوں سے چھٹکارہ پائے۔ میرے مطبوعہ مضمون ''لداخ اور بڑی طاقتوں کی سیاسی کشمکش'' میں اس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے دیا ہے۔

برطانوی ہند سرکار کے اعصاب پر روس کے حملے کا خوف سوار تھا اور اس کی توڑ کے لئے چین کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے لداخ کی سرحد سے چھونے والے سرحدی علاقے کو نو مین لینڈ میں تبدیل کیا جائے یا بفر علاقہ قائم کیا جائے لیکن چین کی پالیسی ڈھلمل تھی۔ شاید اس بنا پر برطانوی ہند

سرکار نے چین پر انحصار نہیں رکھا۔ جب مشرقی ترکستان میں اتالیق غازی اور یعقوب بیگ کی حکومتیں قائم ہوئیں تو برطانوی ہند سرکار نے ان سے بے کم و کاست سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم کیے۔ ایک انگریز افسر رابرٹ شا اپنی کتاب Visit to High Tartary, YarKand and Kashghar میں لکھتا ہے: ''اتالیق غازی بڑی صفات کا مالک تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھوں سے کام کرتا تھا۔ پتھر تک اٹھاتا تھا۔ اسے اس کے ہاتھ پیر پر زخم آئے تھے۔ لڑائیوں کے دوران اس سے گولیاں لگی تھیں۔ اس کے بدن پر ان کے نشانات تھے۔ ان سے درد ہوتا تھا تاہم اس نے کسی کے سامنے کبھی اُف تک نہیں کی۔ البتہ خلوت میں وہ درد سے کراہتا تھا۔''

اس کی فوج میں بہت سارے افغان اور چند ہندوستانی تھے جو بقولِ مصنف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بھگوڑے سپاہی لگتے ہیں۔ توپ خانہ کے دو بڑے افسر مفرور ہندوستانی تھے۔ یارقند میں بلتی اور کشمیری بھی بستے تھے۔

رابرٹ شا رقم طراز ہے: ''اللہ اکبر کے نعرے کو ترکستان میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہر مجلس میں باز و لہرا کر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔'' مصنف نے خاص موقعوں پر اس کی نقل کی۔

چین سے خونریز بغاوت کے بعد جب یعقوب بیگ برسر اقتدار آیا تو انگریزوں نے ۱۸۷۲ء میں سر ڈوگلس فورستھ کی قیادت میں کاشغر مشن بھیجا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۸۷۳ء میں دوبارہ سر ڈوگلس فورستھ کی قیادت میں ایک بڑا سفارتی مشن یعقوب بیگ کے دربار بھیجا۔ جو اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ اس بڑے مشن کی روانگی کے لئے مہاراجہ نے ۱۶۲۱ر گھوڑے اور یاک، ۶،۶۴۷ر قلی وغیرہ کا انتظام کیا۔ جن میں ۱۳۳۶ر پالکی بردار تھے۔

ایک طرف مہاراجہ نے بڑے انتظامات کیے۔ جس کا لداخ کی معیشت پر چار سال بُرا اثر پڑا۔ دوسری طرف لداخ کے وزیر سید علی اکبر کو مشن کے کام میں رخنہ اور رکاوٹ ڈالنے کے لئے زبانی ہدایت دی۔ بعد میں رسد کی فراہمی میں کوتاہی برتنے پر فورستھ کی شکایت پر مہاراجہ نے سید علی اکبر سمیت کئی افسروں کو اپنے عہدے سے برخاست کیا۔

مشن بڑا متاثر کن تھا۔ دسمبر ۱۸۷۳ء کاشغر پہنچا۔ ڈوگلس فورستھ نے یعقوب بیگ سے

ممبروں کا تعارف کیا۔ ان میں سرجن میجر ایچ۔ ڈبلیو۔ بیلو، Ethnographist (ماہر علم الانسان) کپتان Biddulph، ماہر موجودات ڈاکٹر سٹولزیکا، ماہر ارضیات لیفٹیننٹ کرنل ٹی۔ ای۔ گورڈن، وائیسرائے کا اے۔ ڈی۔ سی کپتان ٹروٹر اور کپتان چپ مین شامل تھے۔ فورستھ نے ملکہ وکٹوریہ کا خط یعقوب بیگ کو پیش کیا اور یعقوب بیگ نے عزت افزائی کے لئے شکریہ ادا کیا۔ وفد کے سو ہندوستانیوں نے تحفے تحائف پیش کئے۔ ان میں سلائی مشین، سٹیم انجن کے نمونے، میجک لنٹرین کے سلائیڈ، پروجیکٹر، میوزیکل بکسیز اور Talegrams کا چھوٹا سا Outfit شامل تھے۔

ڈاکٹر سٹولزیکا واپسی پر راستے میں دپسانگ کے مقام پر ۱۸۷۴ء میں بلندی کی بیماری سے فوت ہوا۔ لیہہ میں ان کا مقبرہ ہے۔ جس پر سنگی مخروطی مینار بنا ہوا ہے اور ان کی زندگی کے احوال دئے ہیں۔

اسے ایک سال پہلے ۱۸۷۲ء میں یعقوب بیگ کا سفیر حاجی تورا سرینگر آیا تھا اور یعقوب بیگ کی طرف سے مہاراجہ کو تحفے پیش کئے۔ انگریز سرکار نے مہاراجہ کو ہدایت دی کہ سفیر کو کشمیر میں جاگیر عطا کرے۔ مہاراجہ کو متنبہ کیا کہ وہ Leap forward پالیسی کو ترک کرے اور ایک ریاست کے حکمران کا وطیرہ اختیار کرے۔ انگریزوں کو خدشہ تھا کہ مہاراجہ اپنی حدود سے تجاوز کر رہا ہے اور بیرون ملک سے سفارتی تعلقات قائم کر رہا ہے۔

فورستھ مشن اور یعقوب بیگ کے مابین ۲ فروری ۱۸۷۴ء کو ایک عہدنامہ ہوا، جس کی رو سے انگریزی مصنوعات کی وسط ایشیا برآمدات پر رعایت دی گئی اور ترکستان نے انگریز نمائندے کو اپنے دربار میں رہنے اور کاشغر میں جائداد منقولہ اور غیر منقولہ خریدنے کی اجازت دی۔

اسی سال ایک انگریز سیاح لمبرٹ کاؤلے نے اپنی کتاب A Trip to Kashmir and Ladakh(1877) میں لکھا ہے: "جب ہم لیہہ لوٹے تو سنٹرل ایشین ٹریڈنگ کمپنی کے آدمی مسٹر رسل کی قیادت میں اپنا تجارتی مال ترکستان لے جانے کے لئے لیہہ آئے تھے۔ لیہہ کے تاجران مسٹر رسل کو مرچنٹ کینگ (مالک التجار) کہتے تھے۔ دوسرے روز رابرٹ شا کاشغر سے اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے لئے لیہہ پہنچا۔ ان کا گرم جوشانہ استقبال کیا گیا۔ لیہہ قلعہ سے توپوں کی سلامی دی گئی۔ لاموں نے موسیقی کے آلات بجا کر لیہہ بازار میں ان کا استقبال کیا۔

انگریز ایک دفعہ پھر چین کی طرف مائل ہوا اور روس کی توسیعی پالیسی کے پیش نظر سرحدی مسئلے پر کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کی کوشش کی۔ ایک مسئلہ اکسائی چین کا تھا۔ جس پر آج چین قابض ہے۔ برٹش انڈیا نے پہلی دفعہ چین سے ۱۸۹۶ء میں کاشغر میں اکسائی چین پر براہ راست بات چیت کی۔ جسے ایس۔ پی۔ ورما کے مطابق انگریز حکومت نے ۱۸/مارچ ۱۸۹۹ء میں قبول کیا اور چین سے مطالبہ کیا کہ کنجوڈ (ہنزہ) کی ریاست اور تاغ دمبش اور ضلع رسکم کے زیادہ علاقوں سے دستبردار ہوجائے۔[1] یہ پیشکش میکارٹنی۔ میکڈونلڈ کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن چین نے اس پیشکش کا جواب نہیں دیا۔

برطانوی ہند ہنزہ کے بارے میں دلچسپی لے رہا تھا اور اسے برصغیر ہند کا علاقہ قرار دے رہا تھا جبکہ چین کا دعویٰ تھا کہ چینی حکمران چائین لنگ (۱۷۶۰ء) کے عہدِ حکومت کے ۲۵ ویں سال ہنزا چین کا باج گزار تھا۔

ہنزا پر چین کی فوج کشی کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے تاہم ہنزا نے تاغ دُومبش پامیر کے کرغیز خانہ بدوشوں کو شکست دی اور اس پر اپنا قبضہ جمایا۔

فوج کے خفیہ ادارہ کے ڈائریکٹر نے ۱۸/جولائی ۱۸۹۸ء کو امور خارجہ کے دفتر کو لکھا: ''اس سے پہلے کہ کاشغر کے صوبہ کو روس ہڑپ کرے، ہمیں ایک ایسی سرحد حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جو روس کو حتی الامکان ہم سے دور رکھے۔ وہ اس وقت چترال کے شمال میں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ جب سرحدی حد بندی کا دن آئے تو ہم روس کو تغ دُومبش اور قراقرم کے پاس پائے جو ہمارے لئے بے چینی کا باعث ہوگا۔''

اس کے دو روز بعد وائیسر ائے نے یہ ہدایت دی۔ ''ہم چین کے ساتھ افغانستان، ہنزہ اور کشمیر کی سرحدیں طے کرنا قرین مصلحت سمجھتے ہیں۔ ہم تغ دومبش اور رسکم پر ہنزہ کا حق جتا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں تیار رہنا چاہئے کہ ہنزہ پر اپنی عمل داری کے دعویٰ کو اگر چین واپس لے تو اس کے عوض تغ دومبش اور رسکم کے اپنے دعوے کو خیر باد کہہ سکتے ہیں۔ ہنزہ اور نگر پر اپنے سیاسی دعوے سے ہم دستبردار نہیں ہوسکتے۔''

---

[1] Struggle for the Himalayas- A study in Sino-Indian Relations- By: S.P.Verma

---

برطانوی ہند کے وائیسرائے یکے بعد دیگرے چین کو خبردار کرتے ہیں کہ روس کی پیش قدمی جاری رہے گی اور چین کو اس خطرے سے آگاہ ہونا چاہئے۔

ادہر ہنزہ، نگر اور قبائیلی سردار ڈوگرہ عمل داری کے خلاف تھے۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے غیر ملکی فوجیوں کو نکال باہر کرنے کے لئے حملے کئے اور بڑی تعداد میں فوجی پکڑے جنہیں پامیر کے کرغیزوں کو فروخت کیا۔ ۱۸۹۲ء میں میکارٹنی نے یارقند سے یہ رپورٹ دی کہ ترکستان کے مختلف علاقوں میں لگ بھگ پانچ ہزار مہاراجہ کے فوجی بطور غلام کام کررہے ہیں۔

انگریزوں نے قبائیلی سرداروں کو وظیفہ مقرر کیا تھا۔ تاکہ وہ بغاوت نہ کریں۔ اس کے بعد ہنزہ اور نگر انگریزوں کے زیر اثر آئے تھے۔

محکمہ سراغرسانی کے ڈائریکٹر سر جان ارداغ (Sir John Ardagh) نے ایک ایسی سرحد کے تعین کی تجویز کی۔ جو ہندوستان کی مفاد میں ہو۔ اس کا اطلاق کیون لین دریائے یارقند اور جنوب کی طرف کا علاقہ تھا۔ ینگ ہابنڈ نے بھی یہی تجویز رکھی تھی لیکن وائیسرائے لاڈ ایلگن کو یہ تجویز قبول نہیں تھی کیونکہ تجویز کردہ زیر قبضہ علاقے سے حملے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ روس سے تھا۔ اسی سال اکتوبر میں حکومت ہند نے اپنا الگ منصوبہ بنایا اور ۱۴ مارچ ۱۸۹۹ء کو سر کلاڈ میکڈونلڈ نے اسے چین کی حکومت کو پیش کیا۔ اس کی رو سے ضلع رسکم اور تاغ دمبش کا زیادہ حصہ چین کو دیا تھا اور ہنزہ سے دست بردار ہونے کی درخواست کی تھی۔ گونڈ کرنارائن راؤ نے اس کے لئے ایلگن انتظامیہ کی نکتہ چینی کی ہے۔ ہنزہ کے میر سمیت کشمیر کے ریڈیڈنٹ سر۔ اے۔ تالبوٹ اور گلگت کے پالیٹیکل ایجنٹ کپتان میکموہن نے بھی اس پیشکش پر سخت نکتہ چینی کی۔

برطانوی ہند حکومت نے جہاں تغ دومبش اور رسکم کی علحیدگی اور ہنزہ کو برصغیر کے ایک ناقابلِ تقسیم علاقے سے مشروط بنادیا تھا۔ وہاں جنرل سٹاف نے لندن لکھا کہ اگر روس نے مشرقی ترکستان پر قبضہ کیا تو ہندروس پر زور دے گا کہ تغ دومبش، رسکم، شہیدولہ اور اکسائی چین ہند کے علاقے قرار دئے جائیں۔

اسی طرح کاشغر میں برطانوی ہند کے تجارتی نمائندے میکارٹنی نے یہ تجویز رکھی کہ اگر چین

تغ دومبش کو اپنے کنٹرول میں نہ رکھ سکے تو وہ اسے دستبردار ہو جائے اور تغ دومبش پر کشمیر اپنے حق کا دعویٰ کرے۔

تاہم اکسائی چین گریٹ گیم کے ہنگاموں سے غائب نہیں تھا۔ اس دور کے متعدد محققوں نے اکسائی چین کا ذکر کیا ہے۔ اکسائی چین ترکی لفظ ہے۔ اس کا مطلب ''پتھروں کا ریگستان'' ہے۔

سی سٹریچی غالباً پہلا یورپی تھا، جس نے ۱۸۴۷ء میں اکسائی چین دیکھا۔ اکسائی چین پہنچنے والے اولین یورپی ایک اطالوی Raero du Cortenze اور ایک جرمن مہم جو محقق شلیگے گین وائٹ تھے۔ اولالذکر لداخ میں ۱۸۵۳ء اور ۱۸۷۵ء کے درمیان رہا۔ شلیگے گین وائٹ ۱۸۵۷ء میں اکسائی چین سے کاشغر گیا۔ لداخ کے ایک ناظم اعلیٰ جانسن نے ۱۸۶۵ء میں یہاں سے ختن سفر کیا۔ ۱۸۶۸ء میں ہیورڈ، رابرٹ شا اور کیلے نے الگ الگ اکسائی چین کا وسیع علاقہ عبور کیا۔ ۱۸۶۹ء میں لداخ کے ایک اور انگریز ناظم اعلیٰ فریڈرک ڈریو نے اکسائی چین کو دیکھا۔ ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۳ء میں یہیں سے فورستھ مشن مشرقی ترکستان روانہ ہوئے۔

فریڈرک ڈریو لکھتا ہے: ''اکسائی چین میں شاذونادر ہی کسی قسم کا سبزہ ہے۔ چراگاہ اِس سے بھی کم ہے۔ حتیٰ کہ جنگلی جانوروں سے بہت کم آمنا سامنا ہوتا ہے۔''

Dorothy Woodman نے لکھا ہے: ''اس علاقے کو سوڈا Plain (میدان) کہا جاتا تھا۔ یہاں لداخ کو نمک ملتا تھا۔ بکریوں، بھیڑوں اور یاک کے لئے کچھ چراگاہیں تھیں۔''

بقول ڈوروتھی ووڈمین تب اکسائی چین تجارتی اور فوجی حکمت عملی کے نقطہ نظر سے اہم سمجھا نہیں جاتا تھا۔[1]

چین کے لئے اکسائی چین غیر معمولی اہم ہے۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق ساتویں آٹھویں صدی سے اس کے راستے تبت آمدورفت تھی۔ ۱۷۱۷ء میں منگول حملہ آور یہاں سے تبت کے ایک تجارتی مرکز رودوق پہنچے اور لہاسہ روانہ ہوئے۔ شین جیانگ تبت شاہراہ یہی سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک چین کے ایک مقام یچینگ سے شروع ہوتی ہے اور پہلے گرتوق میں ملتی ہے۔ دارالحکومت بیجنگ سے

[1] Himalayan Frontiers-Dorothy Woodman-1969

نیپال کی سرحد کے راستے سے تبت بہت دور پڑتا ہے۔

ہیورڈ جانسن اور رابرٹ شانے انیسویں صدی میں اس ضمن میں اکسائی چین کی افادیت کا ذکر کیا ہے۔ ہیورڈ لکھتا ہے:

''مشرقی ترکستان کے پہاڑوں سے ہندوستان آنے والا راستہ کی تلاش میں کوشاں کسی بھی فوج کو نشیبی ہمالیہ کی گھاٹیوں تک پہنچنے سے پہلے کوئی بڑی رکاوٹ نہیں ہے۔''

جانسن نے اس کی تصدیق کی ہے کہ اسی راستے سے رودوق سے ختن اور یارقند تک گاڑیاں جاسکتی ہیں۔شانے بھی لگ بھگ ایسے ہی خیال کا اظہار کیا ہے۔

دوڈ مین رقم طراز ہے: ''انیسویں صدی میں انگریز محققوں نے اکسائی چین سے سنٹرل ایشیا تک رسائی کے لئے جس راستے کا تذکرہ کیا ہے۔ بسویں صدی میں چین نے گاڑیوں کی آمدورفت کے لئے سڑک تعمیر کر کے اسے عملی جامہ پہنایا۔''

انیسویں صدی میں اکسائی چین کے بارے میں متضاد اور مفروضے بیانات دئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں چین اور ہندوستان دونوں متذبذب confused نظر آتے ہیں۔فورستھ مشن ۱۸۷۳ء کی رپورٹ کے مطابق ۱۸۷۰ کی دہائی کے دوران علاقے کے بارے میں جغرافیہ دانوں میں بڑا اختلاف پایا جاتا تھا۔

السٹرلمب کا خیال ہے کہ اکسائی چین No Man Land کی طرح تھا۔اس کی ملکیت کے بارے میں قطعی علم نہیں ہے۔فورستھ مشن ۱۸۷۳ء کے ایک ممبر ڈاکٹر ہنڈرسن نے اکسائی چین کو نومینز لینڈ بتایا ہے۔

کیتھ جانسن کے '۱۸۹۴ء کا اٹلس' کے ایک نقشہ میں اکسائی چین کو کشمیر کا علاقہ دکھایا گیا ہے۔ کاشغر میں تعینات برٹش انڈین کونسل کے نمائندے جارج میکارٹنی نے کہا ہے کہ اکسائی چین کا کچھ حصہ چین اور کچھ کشمیر میں ہے۔ فوجی خفیہ محکمہ کے ڈائریکٹر سرجان ارداغ Sir John Ardagh میکارٹنی سے متفق نہیں تھا کہ چین ہندوستان کا حلیف ہے۔ وہ اکسائی چین کو ہندوستان کا علاقہ سمجھتا تھا۔ ڈوروتھی ووڈ مین کے مطابق ۱۸۹۳ء میں چین کے ایک سینئر اہلکار ریانگ ٹا۔لین نے

اکسائی چین اور لینگزی تھنگ کو کشمیر کی قلمرو میں دکھا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں کاشغر کے ٹاؤ ٹائی (Tao Tai) نے اسے تبت میں دکھایا۔ ۱۸۹۹ء میں میکڈونلڈ کے پیش کردہ نقشے میں تقریباً سارا اکسائی چین چین کا علاقہ قرار دیا تھا۔ البتہ شین جیانگ تبت سڑک کا علاقہ ہندوستان کی حدود میں دکھایا تھا۔ راؤ کے مطابق یہ دراصل وزارت خارجہ کے سکریٹری سر ڈبلیو کنینگھم کا منصوبہ تھا۔ جس کا اس کے جانشینوں نے ہدفِ تنقید بنایا۔

1918ء میں چین نے دعویٰ کیا کہ چینی فوج کے ایک نقشے کے مطابق سارا اکسائی چین چین کا ہے۔ ہندوستان نے اس دستاویز پر شک کا اظہار کیا۔

جیوفری ہڈسن Geoffrey Hudson نے اسے چینی فوجی حلقے کا aspiration چاہ قرار دی ہے۔ تاہم چین کا رویہ ان دنوں آج کی طرح جارحانہ نہیں تھا۔ دعویٰ بیان تک محدود تھا۔

۱۹۲۷ء میں ایک جرمن ماہر ارضیات ڈاکٹر ایمیل ٹرینکلر Emil Trinkler اکسائی چین پہنچا۔ اس نے اسے تبت کے انتہائی مغربی سطح مرتفع Plateau بتایا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتا ہے۔ جغرافیائی طور لینگزی تھنگ اور اکسائی چین تبّت میں ہیں۔ تاہم سیاسی طور یہ لداخ میں واقع ہیں۔

۱۸۸۸ء میں برطانوی ہند حکومت نے Ney Elias کو روس کی نقل وحرکت کا جائزہ لینے مشرقی ترکستان اور بدخشاں بھیجا۔ Ney نے اپنی رپورٹ میں چین کا روس کے تئیں اس کی نرم پالیسی کو دیکھ کر Impractable Nation بے عمل قوم قرار دیا ہے۔ اور اپنی تجویز پیش کی۔

وائیسر ائے لارڈ لانس ڈاؤن (Lansdowne) نے الیاس کے اس نظریہ سے اتفاق کیا اور کہا: ''میرے علم میں قراقرم اور کیون لین سلسلہ ہائے کوہ کا درمیانی علاقہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ نہایت ہی دشوار گذار ہے اور روس اس پر قبضہ جمانے کے لئے مشتاق نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر چین چاہتا ہے۔ اس سے اس علاقے کو اپنی تحویل میں لینے کے لئے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ ہماری اور چین کی سرحد پر نومینز لینڈ سے یہ بہتر رہے گا۔ اسے روس کی پیش قدمی روکی جاسکتی ہے۔''

وائیسر ائے نے کپتان ینگ ہاسبنڈ کو ۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء میں مذکورہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کاشغر اور یارقند بھیجا۔ ۵ ستمبر ۱۸۹۰ء کو ینگ ہاسبنڈ یارقند میں چینی آمبان (افسر اعلیٰ)

سے ملا اور برطانوی حکومت کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ چین کو شہید ولہ سے قراقرم تک کا علاقہ اپنے تسلط میں لینے کے لئے ترغیب دی اور یہ دلیل دی کیونکہ چین لیہہ یارقند تجارتی راستے کی حفاظت کرتا ہے۔ اس لئے وہ اس علاقے پر اپنی سرداری قبول کرے۔ چین نے اس معاملے میں دلچسپی دکھائی۔ قراقرم پر ایک ستون نصب کرنے کے علاوہ ہنزہ کو پُہن کا باج گذار ہونے کے دعویٰ کا اعادہ کیا۔ ینگ ہاسبنڈ نے آمبان کو کشمیر کا نقشہ دکھایا اور کہا کہ وائیسرائے کشمیر اور یارقند کے سرحدی مسلے کو حل کرنے کے لئے چین سے مفاہمت چاہتا ہے۔ چین نے قراقرم درہ پر ایک بڑا بورڈ آویزان کیا تھا۔ جس پر موٹے حروف میں لکھا تھا: ''یہ بورڈ چین کے شہنشاہ کی قلمرو میں ہے۔'' اس کا ایک ستون درے کی چوٹی پر لداخ کی سمت ۵۰ فٹ نشیب میں تھا۔ لداخ کے وزیر نے جموں وکشیر کونسل کو اسے آگاہ کیا اور چینی آمبان کے خلاف شکایت کی۔ جس نے یہ بورڈ لگوایا تھا۔ خارجہ امور کے شعبہ نے بھی اس ضمن میں تشویش کا اظہار کیا۔ قراقرم بھی ترکی لفظ ہے۔ اس کا مطلب سیاہ کنکر ہے۔ بقولِ ینگ ہاسبنڈ قراقرم کی خصوصیت کے پیش نظر یہ بالکل موزون نام ہے۔

لیکن چین روس کے علاوہ برطانوی ہند سرکار سے بھی بدظن تھا اور اس کی سرگرمیوں کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ برطانیہ ہند حکومت چاہتی تھی کہ چین اور افغانستان میں سمجھوتہ ہو اور اپنی سرحدوں کی حد بندی کریں۔ .... چین اور افغانستان ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی طرح روس کو انگریزوں پر شبہ تھا کہ وہ شمال کی طرف سے پیش قدمی کرے گا اور انگریزوں کو خدشہ تھا کہ روس جنوب کی طرف سے بڑھے گا۔

خفیہ ادارہ کے ڈائریکٹر میجر جرنیل سرجان ارداغ نے ایک خفیہ رپورٹ میں چین کی کمزوری پر مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے یوں تبصرہ کیا ہے:

''حالیہ چین۔ جاپان جنگ میں چین کی شکست فاش اس کی طاقت پر ممکنہ حلیف کی حیثیت سے بھروسہ کرنا عبث لگتا ہے۔ (۱۸۹۵ء میں چین جاپان سے ہارا تھا) اور یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہے کہ روس اور ہندوستان کی جنوبی سرحد کے درمیان چین ایک بفر ریاست کے طور بھی بے کار رہے گا۔ رپورٹ میں چترال کے شمال اور ہنزہ اور لداخ کی قدرتی سرحدوں کو برصغیر ہند کی قابل قبول

دفاعی سرحدیں بتائی ہیں۔

کئی ماہرین جے ایلگن، جی۔این۔وائٹ، جے۔ویسٹ لینڈ، کولین وغیرہ نے چین سے متعلق میجر جرنیل ارداغ کی رپورٹ سے اتفاق نہیں کیا ہے اور سکریٹری آف سٹیٹ لارڈ جارج ایف ہملٹن کو لکھا ہے کہ وہ ارداغ کی رپورٹ کے کئی نکات سے متفق نہیں ہیں۔ چینیوں نے کئی مرتبہ بھارتی سرحد کی جانب اپنی علاقائی حدود کو موثر طور جتانے میں اپنا عزم صمیم دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی مثالیں دی ہیں۔

روس کی توسیع پسند پالیسی کے پیش نظر برطانوی ہند نے اٹھارویں صدی کے اختتام پر برصغیر ہند کے گرد بفر Buffer ریاستیں قائم کیں۔ ان میں برما، بھوٹان، سکم، نیپال، تبت اور افغانستان شامل تھے۔ روس تبت میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لئے کوشاں تھا۔ تبت کی سرحد مذکورہ کئی ملکوں سے ملتی ہے۔ انگریزوں کو خوف تھا کہ روس ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے تبت کو گزرگاہ Gate Way کے طور استعمال کرے گا۔

John Mac Gregor اپنی کتاب Tibet- A Chronicle and Exploitation میں رقم طراز ہے:

''روس کی نظر تبت کے سونے پر تھی۔ روسی حکومت نے تبت کی سرکار کو لکھا کہ وہ اکیلا ہی انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے تبت کو بچا سکتا ہے۔''

روس کے مہم جو جاسوس نکولس میکھائل لوویچ پراجاولسکی (Nicholas Makhail Lovich Prajaivalski)

۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان چار مرتبہ وسط ایشیا اور تبت کی مہمات پر آیا۔ اس نے لہاسہ پہنچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ وہ لوپ نور اور کیون لین بھی پہنچا۔

گراہم سینڈ برگ[1] نے لکھا ہے نکولس میکھائل نے روسی حکومت کی امداد سے چار مرتبہ لہاسہ

---

[1] The Exploration of Tibet- Its History and Particulars, 1904- Graham Sandberg

پہنچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ لہاسہ میں یہ افواہ گرم تھی کہ روسی دلائی لاما کو اغوا کرنے اور تبتیوں کے مذہبی عقیدے کو ختم کرنے آرہے ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں نکولس میکھائل ۴۹ سال کی عمر میں ٹائفس سے مر گیا۔

تبتی حکومت نے ایک مرحلے پر غیر ملکیوں کے تبت میں داخلہ پر پابندی لگائی۔ دلائی لاما نے چین کے شہنشاہ کو اس ضمن میں دو وجوہات دی ہیں۔ اول جب سے سفید فام مشنریاں اور دوسرے تبت آئے، عورت ذات اپنے شوہروں سے بے وفا ہوگئی ہے اور لوگ اپنے دیرینہ عقیدے کی پاسداری سے ڈگمگاتے ہیں۔ دویم غیر ملکی سیاح بندوق لے کر آتے ہیں اور ان کا گنپوں کے سامنے جانوروں اور پرندوں کو مارنا تبتیوں کو ناگوار ہے۔

نین سنگھ ۱۸۶۵ء میں لوپچق مشن کے ساتھ تبت پہنچتا ہے اور مشن کے اراکین کے ہمراہ دلائی لاما سے ملتا ہے اور خادقس (ریشمی رومال) پیش کرتا ہے۔ ۱۳ سالہ دلائی لاما نے اس کو ذیل کے تین سوالات پوچھے۔

۱۔ کیا آپ کا بادشاہ ٹھیک ہے؟

۲۔ کیا آپ کا ملک ترقی کر رہا ہے یا خوشحالی کی راہ پر ہے؟

۳۔ کیا آپ کی صحت اچھی ہے؟

اسے پہلے اسکو یہی سوالات پنچھن رینگبو چھے نے بھی پوچھے۔

لداخ کے ایک برٹش جوئنٹ کمشنر اے۔ ایل۔ کینیون A.L.Kennion نے لکھا ہے:

''تبتی غیر ملکیوں کو اپنے علاقے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے روکنے کا طریق کار دلچسپ اور معقول ہے۔ سرحد پر رہنے والے تبتی پہلے اجنبی مسافر کو واپس جانے کے لئے ترغیب دیتے ہیں۔ اس پر دھیان نہ دے تو دھمکیاں دیتے ہیں۔ اگر دھمکیاں کارگر نہ ہوں تو ڈنڈوں سے مارتے ہیں اور پکڑ کر سرحد کے پار دھکیل دیتے ہیں۔ اگر اجنبی بندوق سے اپنی مدافعت کرے اور اسے کوئی تبتی ہلاک ہوجائے تو انہیں (تبتیوں) کو بھی بندوق استعمال کرنے کی اجازت ہے۔''

متعدد یورپیوں نے لہاسہ پہنچنے کی کوشش کی لیکن میری دانست میں سوائے دو کامیاب نہیں

ہوئے۔ ان میں ایک فرانسیسی عورت الیکزنڈر ڈیوڈ نیل تھی۔ وہ ایک یاتری بنکر لہاسہ پہنچی۔ اس نے اپنے چہرے اور بالوں کو سیاہ کیا تھا اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے تھے۔ وہ تبّتی زبان جانتی تھی۔ نیل اپنی روئداد یوں بتاتی ہے۔ ''پوتالا کا درشن کر کے جب میں نیچے اتر رہی تھی تو مجھے دیکھ کر ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، ''تمہارے خیال میں یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس آدمی نے خود اس کا جواب دیا۔ 'یہ ایک لداخی ہونی چاہئے۔' دوسری مرتبہ جب میں چوکھنگ دیکھ رہی تھی۔ تب بھی مجھے لداخی سمجھا گیا۔ کسی نے پیچھے سے کہا۔ 'اس عورت کو پوتر پانی دو۔ بچاری دور لداخ سے آئی ہے۔ اس کی گہری عقیدت کو دیکھو۔' میں نے اپنے گرد مسکراتے چہرے دیکھے۔ ایک آدمی میرا بازو پکڑ کر لے گیا اور ہیرے جڑے ایک برتن سے پوتر پانی پلایا۔''

دوسرا یورپی رابرٹ برائٹ تھا۔ اس نے بھی اپنا بھیس پوری طرح بدل دیا تھا اور تبّتی لگتا تھا۔ وہ لہاسہ میں ایک مکان میں مقیم تھا۔ ایک دن اس کی قومیت پر شک ہوا اور اس کو ایک غیر ملکی گردانا گیا۔ غیض وغضب سے بھری ہوئی ایک بھیڑ نے اس کے مکان کا گھیراؤ کیا اور پتھراؤ کیا۔ وہ بڑا چالاک اور ذہین تھا۔ مکان کے عقبی دروازے سے باہر نکلا اور بھیڑ میں شامل ہو کر ایک چھوٹا پتھر مکان کی طرف پھینکا۔

تبّتی حکومت پہلے یورپیوں اور دوسرے سفید فام لوگوں کو تبت آنے کی اجازت دیتی تھی۔ ۱۷۷۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے جارج بوگلے کو سیاسی اور تجارتی مشن پر تبت بھیجا۔ ۱۷۸۳ء میں سموئیل ٹرنر اور ۱۸۱۱ء میں تھامس مائنگ سیاسی مشن پر تبت روانہ ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن وائیسرائے بنا۔ ۱۹۰۱ء میں کرزن نے لکھا کہ ایشیا پر غلبہ حاصل کرنا روس کی بڑی امنگ ہے۔ تبت میں اپنی مداخلت کو وہ برصغیر کو روس کے حملے سے محفوظ رکھنے سے تعبیر کرتا تھا۔ وہ تبّت کو افغانستان کی طرح بفر سٹیٹ بنانا ضروری سمجھتا تھا اور روس کو معقول دوری پر رکھنا چاہتا تھا۔ اگر چین اس سلسلے میں قدم نہ لے تو وہ دلائی لاما سے براہ راست بات چیت کرنے کا خواہش مند تھا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ یہ ناممکن ہے۔'' کرزن نے لکھا۔ وہ دلائی لاما کو خط پہنچانے کے لئے ایک موزوں آدمی چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت برما کے ایک مشیر کو جو نسلی طور آدھا چینی تھا، بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا لیکن اس کو جسمانی طور موٹا پایا۔ جس کی وجہ سے وہ تبّت کے مشکل سفر کو برداشت نہیں

کر پائے گا۔ اس لئے اس کو نہیں لیا۔ دوسرا امیدوار لداخی سکالر منشی چھرنگ سپلگیس تھا۔ اس نے لوچق کی قیادت کی تھی لیکن وہ بلانوش تھا۔ اس بنا پر وہ اس کام کے لئے موزون نہیں سمجھا گیا۔ آخر کار لیہہ کے برٹش جوائنٹ کمشنر آر۔ ایل۔ کینیون نامزد ہوا اور انہیں مغربی تبت کے گرمائی صدر مقام گرتوق بھیجنے کا فیصلہ ہوا، جہاں سے وہ لہاسہ کی حکومت سے رابطہ قائم کرے گا لیکن تبتیوں نے اس کو گرتوق پہنچے سے پہلے روکا۔ افسر اعلیٰ گرپون نے بذات خود خط لہاسہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔ لیکن چند ماہ بعد یہ خط کینیون کو واپس آیا۔ لکھا تھا کہ لہاسہ نے خط نہیں لیا۔ ایک ماہ بعد گرپون نے اپنی بات بدل دی اور لکھا کہ اس نے خط لہاسہ نہیں بھیجا۔ لیکن مہریں توڑی تھیں۔ کینیون کا یہ پختہ خیال تھا کہ لہاسہ کے سرکاری افسروں نے کرزن کے پیغام کو پڑھا ہے لیکن کرزن کو یقین نہیں آیا اور ایک قاصد کی تلاش کی۔ آخر کار بھوٹان کے وزیر قاضی اُرگیان کو خط حوالہ کیا۔ لیکن اب کے یہ کھولے بغیر واپس آیا۔ ۱۹۰۱ء میں جب قاضی کلکتہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ دلائی لامانے خط نہیں لیا اور اس کا یہ جواز دیا کہ انگریز جیسے غیر ملکیوں سے پیغامات قبول کرنا روایتی طور اس کے لئے ممنوع ہے۔ دلائی لامابولے۔ وہ خط نہیں لے سکتا ہے اور نہ امبان کے مشورے کے بغیر خط لکھ سکتا ہے۔ چین کے ساتھ یہی معاہدہ ہوا ہے۔ اس لئے ان کو افسوس ہے کہ وہ خط نہیں لیں گے اور نہ وائیسرائے کو لکھیں گے۔

کرزن کو اب بھی شک تھا۔ غصہ بھی آیا اور بولا اگر دلائی لامانے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ برطانیہ ایسے اقدام لینے کا حق رکھتا ہے جو اس کے لئے ضروری ہوں۔"

پھر تبّت روس کے نزدیک گیا۔ تبت پر حملے کی صورت میں روس سے مدد کی گارنٹی مانگی ۱۹۰۰ء میں تبّتی سفارتکار دورجیو روس روانہ ہوا۔ دورجیو کے دوسرے مشن پر کرزن برافروختہ ہوا اور اس کے بارے میں سراغ لگایا۔ دوسری کتاب میں دورجیو کا نام دورجے اوف دیا ہے۔ اوف روسیوں کا اضافی نام لگتا ہے۔ اس کا اصلی نام دورجے ہونا چاہئے۔ وہ پیدائشی طور بریات منگول تھا۔ اس لحاظ سے وہ روسی شہری تھا۔

ایک جرمن ماہر مستشرقیات ولیم Filchner کی کتاب Storm over Asia-Experience of secret Diplomatic Agents سے ہلچل سی مچی۔ اس

نے اُنہیں تعلقات کے بارے میں لکھا تھا۔ایک جاپانی بودھ Ekai Kawajuchi کی کتاب Three years in Tibet سے مزید انکشافات ہوئے۔

کرزن کو پورا شک تھا کہ روس اور چین میں اندرونی طور ایک معاہدہ ہوا ہے۔کرزن اب دباؤ کی راہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔لندن میں انڈیا آفس نے کرزن کو دباؤ کے بجائے متبادل راستہ اختیار کرنے کے لئے زور دیا لیکن کرزن پر اثر نہیں ہوا۔لارڈ کرزن نے ۷ مئی ۱۹۰۳ء کو لہاسہ کے امبان کو تاکیدی خط لکھا کہ سرحد اور تجارتی امور اور دوسرے معاملات پر سمجھوتہ کرنے کے لئے گونپہ جونگ ملے۔لیکن کام نہیں بنا۔آخر کار وائیسرائے نے لہاسہ میں تعینات چین کے ریذیڈنٹ کو خط لکھا۔جس میں اپنے مصالحاتی مشن زبردستی لہاسہ لینے کی دھمکی دی۔

کرزا، کی نظر میں مقصد براری کے لئے ینگ ہاسبنڈ بالکل موزون تھا۔ ینگ ہاسبنڈ کے ساتھ ڈپٹی کمانڈر سکم کا ریذیڈنٹ جان کلاڈ وائٹ John Cloud White تھا۔ کپتان فریڈرک اوکونور خفیہ محکمہ کا افسر تھا۔وہ تبّتی زبان میں ماہر تھا۔

کرزن نے بہانہ تراشا کہ برطانوی رعایا کے دوآمیوں کو ایذا پہنچا کر ہلاک کیا گیا ہے۔سکم کے دوآدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ان کو پیٹا بھی گیا تھا اور جیل میں رکھا تھا لیکن ہلاک نہیں کیا گیا تھا۔

یکم اکتوبر کو لندن سے یہ پیغام آیا کہ سمجھوتہ نا ممکن ثابت ہوا ہے۔لندن نہ صرف وادی چوبی کو زیر قبضہ لانے پر غور کرے گا بلکہ گیانگچے پیش قدمی پر سوچے گا۔

۱۹۰۴ء میں کرنل ینگ ہاسبنڈ کی سرکردگی میں فوجی مہم تبت روانہ ہوئی۔ مہم میں ۲۵۰۰ فوجی تھے۔ بعد میں ایک ہزار کا اضافہ کیا گیا۔کل ۶۰۰۰ قلی تھے۔جن میں بہت سارے بلتی، لداخی اور گڑھوالی تھے۔لداخی کاروان لیڈر محمد عیسیٰ بھی تھا۔وہ وسط ایشیا کی مہم میں ینگ ہاسبنڈ کا کارواں لیڈر رہا تھا۔تب رسول گلوان سب سے کم عمر قلی کی حیثیت سے کارواں میں شامل ہوا تھا۔ ینگ ہاسبنڈ کو لداخیوں اور بلتیوں سے بڑا لگاؤ تھا۔

انگریز فوج نے پیش قدمی کی اور جھڑپیں ہوئیں۔ان کی گولہ باری کی شدت بہت تیز تھی۔انگریزوں کی پیش قدمی پر چین کو بڑی کوفت ہوئی۔۱۱ر نومبر کو بیجنگ نے احتجاج کیا۔دلائی لاما چین فرار

ہوئے۔ تبتی فوج کو شکست ہوئی۔ روس نے بھی مداخلت نہیں کی۔ ۲/اگست ۱۹۰۴ء کو ینگ ہاسبنڈ کو پوتالا نظر آیا۔ دلائی لاما کے نامزد ریجنٹ ٹری رینگبو چھے نے معاہدہ کیا۔ پوتالا میں اس پر دستخط ہوئے۔ اس کے مطابق انگریزوں کو تجارتی مراعات حاصل ہوئیں۔ گیا نگچے، گرتوق اور یالونگ میں تجارتی ایجنسیاں کھولیں۔ برطانوی ہند نے ایک معاہدے کے تحت تبت پر چینی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا۔ ینگ ہاسبنڈ کی مہم کے بعد بھوٹان، سکم اور نیپال میں چین سے زیادہ ہندوستان کا اثر ورسوخ بڑھا اور عمل داری قائم ہوئی۔

۱۹۱۲ء میں دلائی لاما نے خودمختاری کا اعلان کیا اور چینی فوج کو نکال دیا۔ ۱۹۱۱ء میں چین میں چینگ کی حکومت ختم ہوئی تھی اور جمہوریت کا اعلان ہوا تھا۔ مشرقی ترکستان میں دنگا فساد اٹھنے کے بعد ایک اور مرتبہ کاشغر پر روس کے حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ تب میکموہن خارجہ سکریٹری تھا۔ اس نے سرجان ارداغ کی مجوزہ سرحد کو دوبارہ لاگو کرنے کی سفارش کی۔

۱۹۱۳ء میں برطانوی سرکار کی قیادت میں شملہ کانفرنس ہوئی۔ جس میں چینی اور تبتی نمائندوں نے شرکت کی۔ جس میں سرہنری میکموہن، ارچی بلڈروس اور سرچارلس بیل نے شرکت کی۔

۱۹۲۴ء میں ہند اور تبت کے مابین لداخ کی مشرقی سرحد پر پنگونگ کے مشرقی علاقے میں چند چراگاہوں کی ملکیت کے تنازعے پر بات چیت ہوئی۔ اسے پہلے فریقین میں لانق لا، سپنگور اور دمجوق کے بارے میں بات چیت خوشگوار رہی۔ بات چیت سے مسئلہ حل ہوا لگتا ہے۔

تیرھویں دلائی لاما تبت کی آزادی اور خودمختاری کے بڑے داعی تھے۔ وفات سے پہلے انہوں نے یہ لکھا: ''جب تک ہم اپنے ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ دلائی لاما اور پنچن لاما، باپ اور بیٹے (جیسے ہیں) دھرم کے محافظ ہیں۔ بصورت دیگران کے عظیم الشان دوبارہ جنم کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور کسی نام کے بغیر یہ رہ جائیں گے۔

۱۹۳۵ء میں برطانوی ہندسرکار نے گلگت کو ۶۵ سال کے لئے پٹے پر حاصل کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے اعلان کے بعد وہ گلگت سے دستبردار ہوا اور اس پر مہاراجہ کی حکومت بحال کی۔ مہاراجہ نے بریگیڈیر گھنسارام کو بطور گورنر گلگت بھیجا۔ کشمیر پر حملے کے بعد گلگت سکاؤٹس نے اس کو

گرفتار کر کے قید کیا۔ انگریز افسر میجر براؤن گلگت سکاوٹس کا کمانڈر تھا۔ اس نے ۴ نومبر کو گلگت میں پاکستان کا جھنڈا لہرایا۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں پاکستان کا پالیٹیکل ایجنٹ گلگت پہنچا اور اپنا کام سنبھالا۔ بعد میں قیدیوں کے آپسی تبادلے میں گھنسارام کو رہا کیا۔

۱۹۴۷ء میں آزاد ہند سرکار نے سارے معاملات کا ازسر نو جائزہ لیا اور اکسائی چین پر اپنا دعویٰ جتایا۔ حکومت پاکستان نے سرحدی معاہدے کے تحت شکسگام چین کو حوالہ کیا۔ اس پر میر ہنزہ کی عمل داری تھی۔ اس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے بعد میں آئے گا۔

۱۹۴۹ء میں چنگ کاشائیگ کی چینی قومی حکومت پنچن لاما کو تبت کی حکومت سونپتی ہے اور تبتی حکومت جولائی میں چینی نشنلسٹ مشن کو لہاسہ سے نکالتی ہے۔ اس کے تین ماہ بعد ۷/اکتوبر کو کمیونسٹ فوج نے تبت پر دھاوا بولا اور کسی خون خرابے کے بغیر تبت کو اپنے کنٹرول میں لیا۔

وسط ایشیا سے کاروان ۱۹۵۰ء تک لداخ آتے رہے۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں چینی حکام نے شمالی دروں کو بند کیا۔ جس سے مشرقی ترکستان سے تجارت بند ہوئی۔ متعدد ترکی تاجر لیہہ میں پھنس گئے۔ قصبے میں ترکی ساخت کی مصنوعات کا کال پڑ گیا۔ البتہ لداخ۔ تبت کی تجارت ۱۹۵۹ء تک جاری رہی۔ چودھویں دلائی لاما کی ہندوستان آمد کے بعد تبت کے ساتھ صدیوں پرانی تجارتی، مذہبی اور ثقافتی تعلقات کو دھکا لگا۔

۱۹۵۰ء میں کاشغر میں بھارتی کونسل اور اُرومچی میں امریکی کونسل بند ہوئی اور ان کے عملہ ارکان اپنے وطن لوٹے۔

پی۔ این۔ کول نے جو ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان لہاسہ میں کونسل جنرل تھا، اپنی کتاب Frontier Callings میں لکھا ہے: ''لہاسہ، شیگاچے اور کئی قصبوں میں کشمیری اور لداخی نسل کے مسلمان آباد تھے۔ یہ خاچے کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان کی تعداد ایک ہزار سے اوپر تھی۔ ان کی اکثریت ہندوستان لوٹنا چاہتی تھی۔ لمبی بات چیت اور خط وکتابت کے بعد ان کی اکثریت کو جانے کی اجازت ملی۔ چند اپنی مرضی سے رُکے۔ کئیوں کو اجازت نہیں دی۔ چند قید کیئے گئے۔ نیز درجنوں لداخی لامے تھے۔ چین کے خارجہ بیورو کو تحریری نوٹ اور احتجاج کرنے کے بعد اکثروں کو واپس وطن آنے کی

اجازت دی۔ ان میں ٹھکسے اور فیانگ گنپوں کے بڑے لاما بھی تھے۔"

تاہم ہمس گنپہ کے بڑے لاما کو شوق ستق سنگ راسپا کو لداخ واپس جانے کی اجازت نہیں ملی۔

وسط ایشیا سے گونا گوں لوگ فرار ہو کر لداخ اور کشمیر آتے تھے۔ جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ محی الدین فوق نے 'مکمل تاریخِ کشمیر' میں لکھا ہے: "۱۶۷۰ء میں عبداللہ خان والئے کاشغر کا بھتیجا ارسلا خان بیٹے کی دست تعدی سے بھاگ کر کمک ڈھونڈنے کشمیر آیا۔ خود عبداللہ خان کشمیر کے گورنر مبارز خان کے زمانے میں ۱۶۶۸ء میں اپنے بیٹے نوازش خان کی مخالفت سے حکومت چھوڑ کر کشمیر آیا۔ اورنگزیب کی ہدایت پر اس کی خوب خاطر داری کی۔"

ایک روسی پی۔ ایس۔ نازاروف لداخ سے ہوتا ہوا کشمیر جاتا ہے۔ اس نے ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ روس سے جان بچا کر وہ بھاگتا ہے اور کاشغر میں چار سال رہتا ہے۔ جب چین کی حکومت کمیونسٹ سرکار تسلیم کرتی ہے تو کاشغر سے بھاگ جاتا ہے اور ہندوستان میں انگریزوں کی پناہ میں آتا ہے۔ From Kashghar to Kashmir (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) اُن کا دلچسپ سفر نامہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں لداخ میں بہت سارے تونگن پہنچے تھے۔ تونگن تاتار مسلم اور چینی عورت کی مخلوط نسل کی اولاد ہیں۔ یہ چین کے مغربی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان کی زبان چینی ہے۔ تونگن کا لفظی مطلب Military Colonist (فوجی نو آبادیات) دیا گیا ہے۔ لداخ کے برٹش جوئنٹ کمشنر کی ۱۹۳۷۔۳۸ء کی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ لیہہ۔ یارقند سڑک عملی طور بند ہے۔ بہت سارے مسلح تونگن اور ترکی، جنہوں نے اُرمچی کے صوبائی حکام کے خلاف ناکام بغاوت کی تھی، لیہہ پہنچے ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھ جو سونا لایا، اسے تجارت بند ہونے کے نقصان کا کچھ خسارہ پورا ہوا۔

۱۹۴۱ء میں دوبارہ بہت سارے تونگن لداخ فرار ہوئے۔ ایک غیر ملکی John Snelling نے اپنی کتاب The Sacred Mountain (مطبوعہ ۱۹۹۰ء) میں اس کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہے:

"۱۹۴۱ء میں ۳۰۰۰ کرغیز/قزاق خانہ بدوش لوٹ مار کرتے اور تباہیاں

پھیلاتے ہوئے مغربی تبت سے گزرے۔ انہوں نے ۱۹۳۸ء کے آس پاس
وسط ایشیا میں اپنے گھر بار اور زمین چھوڑ دئے تھے اور اس دورانیہ کے تین سال
کیون لین پہاڑوں کو عبور کرنے اور چنگ تھانگ میں داخل ہونے سے پہلے
چینی ترکستان اور شنگھائی میں گزارے۔ دریائے برہم پتر پار کر کے انہوں نے
نیپال میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کی لیکن سرحدی گورکھا پہرہ داروں نے
روک لیا۔ ان سے دستیاب ۵۰۰ بندوقوں اور رائفلوں کی خبر صحیح مان لی جائے تو وہ
اچھی طرح مسلح تھے۔ وہ تیرتھ پوری، کھیونگ لینگ اور مینسر سے گزرے اور
مغربی تبت کے گرمائی اور سرمائی صدر مقامات گرتوق اور غار گونسا میں عمارتوں کو
مسمار کیا۔ نومبر میں وہ لداخ میں گھس گئے جہاں آخر کار انہیں انگریز اور کشمیری
نوجوان نے غیر مسلح کیا۔''

لداخ میں کوئی انگریز فوجی نہیں تھا۔ کچھ ڈوگرہ سپاہی تھے۔ میں نے سنا، جب تونگن مغربی تبّت
سے لداخ کی سرحد میں داخل ہوئے تو سرحدی گاؤں چھُوشول میں ان کی ملاقات ایک لداخی حکم الدین
سے ہوئی۔ جس نے چند تونگن کو بتایا کہ لداخ میں فوج کا افسر مسلمان ہے۔ ان دنوں میجر عبدالحمید لیہہ میں
ڈوگرہ کمپنی کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ پچاس سپاہیوں پر مشتمل یہ کمپنی لیہہ کے زور آور سنگھ قلعہ میں تعینات تھی۔ فوجی
افسر مسلمان ہونے پر تونگن پناہ گزینوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور اپنے ہتھیار ڈال دئے۔

لیہہ سے تونگن سردیوں میں سرینگر روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں، بہت سارے تونگن برف و باد
میں مر گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے، چند لالچی رہبروں نے ان کو غلط راستہ دکھایا۔ بعد میں ان کو شمال مغربی
سرحدی صوبہ میں ضلع ہزارہ میں بسایا۔

۱۹۵۱ء میں ایک فوجی افسر دلیل خان حاجی کی قیادت میں چند پناہ گزین لداخ آئے۔ دلیل
خان چنگ کا شائیک کی کومنتنگ فوج میں بریگیڈیر تھا۔ لداخ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ اپنے اہل خانہ
کے ہمراہ کشمیر گئے۔ بعد میں حکومت تائیوان نے ان کی خدمات حاصل کیں۔

ایک سال پہلے ۱۹۵۰ء میں مشرقی ترکستان سے کئی ہزار ترکی مسلمان بھاگ کر لیہہ پہنچے۔

جہاں فوجی طیاروں میں ان کو سرینگر پہنچایا گیا۔ بعد میں یہ ٹرکی اور مشرقی وسطیٰ روانہ ہوئے۔

اس سال (۲۰۱۳ء) میں تین ترک مشرقی ترکستان سے فرار ہو کر دولت بیگ اولدی پہنچے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ان UYGHUR ترکوں کا کہیں بغاوت میں ہاتھ تھا۔ تاہم چین کی حکومت نے انہیں واپس حوالہ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا۔

۱۹۵۰۔۱۹۵۱ء میں چینی فوج تین اطراف سے تبت میں داخل ہوئی۔ جن میں ایک شین جیانگ، تبت کا قدیم راستہ تھا۔ جو اکسائی چین سے گزرتا ہے۔ چین نے ۱۹۵۴ء۔۵۵ء میں اکسائی چین کا سروے کیا اور مارچ ۱۹۵۶ء اور اکتوبر ۱۹۵۷ء کے درمیان گاڑیوں کی آمد ورفت کے لئے شین جیانگ۔ تبت سڑک تعمیر کی۔ اسے قبل ۱۹۵۰ء سے اس راستے کو چین کی حکومت نے نقل وحمل اور آمد ورفت کے لئے وسیع پیمانے پر استعمال کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں تبت کے تمام قصبوں کا تار لائنوں سے رابطہ قائم کیا۔ سڑکیں تعمیر کیں۔ ۱۹۵۵ء میں ۲۱۶۰ کلو میٹر لمبی سڑکوں پر گاڑیاں چلتی تھیں۔

۱۹۵۷ء کی گرمیوں میں لداخی لیڈر کوشوق بکولا نے شین جیانگ۔ تبت کے درمیان بڑے پیمانے پر اس سڑک کو تعمیر کرتے دیکھا تھا۔ کوشوق بکولا تبت یاترا پر گئے تھے۔ شین جیانگ (مشرقی ترکستان) چینیوں کا رکھا ہوا نام ہے جس کا مطلب بیرونی سرحدیں ہے۔ چین میں مشرقی ترکستان کے لفظ کے استعمال پر سخت پابندی ہے۔

ہندوستان نے اکسائی چین گشتی دستے بھیجے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ سڑک ہندوستانی علاقے سے گزرتی ہے۔ چین کے سرحدی محافظوں نے ایک گشتی دستے کے جوانوں کو پکڑا اور دوسرے کو روکا۔ چین نے اپنے نقشوں میں اسے چینی علاقہ دکھایا تھا۔

ہند۔ چین سرحدی بات چیت کے ہندوستانی وفد کے صلاح کار گونڈکر نرائن راؤ رقم طراز ہے:

''۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء میں چین نے ہندوستان سے کہا کہ وہ اس کے نقشوں کو سنجیدگی سے نہ لے۔ کیونکہ یہ کومنتنگ کے بنائے ہوئے نقشے ہیں۔ وہ (چین) حقیت پسندانہ طور سرحدی مسلہ حل کرے گا۔''[1]

---

[1] The India-China Border- A Repraisal(1968), Gundkar Narayan Rao

شین چیانگ۔ تبّت سڑک تعمیر ہونے کے کچھ عرصہ بعد چین نے اس کی تکمیل کا اعلان کیا۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ہندوستان نے چین کی حکومت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا اور ہندوستانی موقف کے ضمن میں دستاویزات دکھائیں۔ اسی اثناء میں چینی فوجوں نے ہندوستانی افسروں اور جوانوں کی ایک ٹیم کو گرفتار کیا اور دو ماہ قید کیا۔ ۲۰/اکتوبر ۱۹۵۹ء کو لداخ میں کونکالا پر ۹ ہندوستانی سرحدی محافظ مارے گئے اور ۱۰ قیدی بنائے گئے۔

ہند۔چین سرحدی تنازعہ: موجودہ دور

۱۹۵۰ء کی دھائی میں ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی مسئلے پر لمبی گفت وشنید ہوئی اور فریقین نے اپنے دعوے پیش کئے۔ لیکن دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ہندوستانی حکومت کے مذاکرات کاروں نے لداخ کی ایک ہزار سالہ شاہی تاریخ (لداخ گیالربس) اور ۱۶۸۴ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۵۲ء اور ۱۸۹۹ء کے معاہدوں کا حوالہ دیا۔ ۱۸۴۲ء کے معاہدے کے ضمن میں یہ واضح کیا کہ یہ معاہدہ چین کے شہنشاہ، لہاسہ کے لاما گورو اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے نمائندے کے درمیان ہوا تھا۔ جس میں ۱۶۸۴ء کے عہد نامہ کی روشنی میں روایتی طور قائم شدہ سرحد کی توثیق کی گئی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں ایک مقامی تنازعے کے سلسلے میں لداخی حاکم بستی رام اور مغربی تبّت کے رودوق کے کلون رگزین کے مابین ایک میٹنگ ہوئی اور انہوں نے ایک اور مرتبہ سابقہ معاہدوں کی توثیق کی اور یہ واضح کیا کہ لداخ اور تبّت کی سرحد پہلی جیسی رہے گی۔ تاہم چینی مذاکرات کاروں نے مذکورہ معاہدوں کے بارے میں بھارتی توجیہات کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ یہ باہمی طور عدم جارحیت کا ایک واضح معاہدہ تھا۔ ۱۸۵۲ء کے معاہدے سے متعلق چینی مذاکرات کاروں نے کہا کہ یہ معاہدہ صرف یہ حوالہ دیتا ہے کہ طرفین کی پرانی سرحد قائم رہے گی اور یہ بتاتا ہے کہ لداخ تبّت کو اپنا سالانہ خراج tribute ادا کرے گا۔ جسے ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔ ہندوستانی مذاکرات کاروں نے اپنی جوازیت میں انیسویں صدی کے انگریز سیاحوں کی تحریروں کا حوالہ دیا۔ جس کا چینی وفد نے یہ جواب دیا کہ یہ لداخ پر انگریزوں کے حملے کے بعد کی تحریریں ہیں اور تاریخ میں انہیں روایت سے محمول نہیں کی جاسکتیں۔ انہوں نے ایک انگریز ڈیزی کا ذکر کیا، جس نے بیجنگ کی حکومت سے یہ درخواست کی تھی کہ اس کو اکسائی چین کے راستے

لداخ جانے کی اجازت دی جائے لیکن اجازت نہیں ملی۔ بھارتی مذاکرات کاروں نے کشمیر سرکار کے ریکارڈ پیش کئے جن کے مطابق اکسائی چین اور لینگزی تھنگ تحصیل لداخ کے علاقے ٹانکچے کے ذیلی ضلعے تھے۔

چین کے نمائندوں نے ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء کی چینی مہمات کا تذکرہ کیا، جن کے تحت شین جیانگ اور لداخ کی سرحدوں کا سروے عمل میں آیا۔

ہندوستانی وفد کے صلاح کار گونڈ کرنرائن راؤ نے کہا ہے کہ ۱۸۴۶۔۴۷ء کے سرحدی کمیشن کی سرحد بندی سے متعلق ہانگ کانگ کے گورنر سر جون ڈیویز کے ۱۸/نومبر ۱۸۴۶ء کے ایک خط کے جواب میں کونٹو کے چینی وائیسرائے نے ۱۳/جنوری ۱۸۴۷ء کو لکھا ہے کہ یہ سرحدیں (لداخ۔تبّت) ٹھیک طرح اور واضح طور قائم کی جاچکی ہیں اور اس قدیمی انتظام پر قائم رہنا بہترین امر ہوگا۔

راؤ نے بھی اپنی کتاب میں انگریز سروے کاروں اور سیاحوں کی تضاد بیانی کا ذکر کیا ہے۔وہ رقم طراز ہے:''ولیم مورکرافٹ اور جارج تریبیک نے اگر یہ کہا ہو کہ دمجوق تبّت کے علاقے میں ہے تو یہ سنی سنائی بات ہے۔ یہ لوگ لداخ کے علاقے میں ہی رہے اور سرحد تک نہیں گئے۔۔۔۔۔فریز رلکھتا ہے کہ دمجوق لداخ میں ہے اور ٹشی گانگ چین میں ہے۔''

دمجوق لیہہ۔تبّت سرحد پر ایک چھوٹا تاہم اہم گاؤں ہے جو ہندوستان کی قلمرو میں ہے۔یہ لیہہ سے ۳۰۰ کلومیٹر دور اس کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

ہند۔چین بات چیت پر ڈوروتھی ووڈ مین اپنی کتاب Himalayan Frontiers میں لکھتا ہے کہ بھارتی حکومت اپنا موقف پیش کرنے میں زیادہ محتاط اور ماہر تھی۔اس کے برعکس چینی حکومت نے حیران کن حد تک لاپروائی سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ووڈ مین اس ضمن میں چین پر اپنا موقف پیش کرنے کا بے محل حوالہ جات، Internal maze of inconsistencey (داخلی بے ثبات گورکھ دھندا) حتا کہ Blatant and discernable falsehood (بے تکا اور نمایاں دروغ بافی) جیسے الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔

نامور محقق اور آئینی امور کے ماہر اے۔جی۔نورانی نے اس دور کی ہند۔چین بات چیت پر

وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی منتخب نگارشات سے ماخوذ مواد پر جریدہ Frontline کے حالیہ شمارہ میں Turning Point in Ties with China کے عنوان سے چند اہم معلومات دی ہیں۔[1] انکی تلخیص پیش ہے:

''۲۴/ مارچ ۱۹۵۳ء میں ایک نئی سرحد تعین کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پنڈت نہرو نے یکم جولائی ۱۹۵۴ء کو اس ضمن میں اس پر عمل آوری کے لئے حکم جاری کیا۔ اس فارمولا کے تحت اکسائی چین ہندوستان کا علاقہ قرار دیا گیا تھا۔ نہرو نے ۲۲/ مارچ ۱۹۵۹ء کو چین کے وزیر اعظم چواین، لائی کو ایک خط میں واضح کیا کہ یکم جولائی ۱۹۵۲ء کو سرحد کا جو نقشہ پیش کیا گیا، اس میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ یہیں سے ہند۔ چین تعلقات میں تناؤ آیا اور ۱۹۶۲ء میں دونوں ملکوں کے درمیان جنگ ہوئی۔

اس سے پہلے ۲۱/ اگست ۱۹۵۸ء کو ہندوستان نے چین سے شکایت کی تھی کہ چین کے نقشے میں مشرقی لداخ کا بڑا علاقہ دکھایا گیا ہے، جو جموں و کشمیر کا حصہ ہے۔ نہرو نے ۱۴/ دسمبر ۱۹۵۸ء کو اپنے ایک خط میں یہ بھی واضح کیا تھا کہ شمال مشرقی فرانیٹر ایجنسی (اروناچل پردیش) دیرینہ طور ہندوستان کا علاقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں چواین لائی نے ۲۳/ جنوری ۱۹۵۹ء کو لکھا کہ چین۔ ہند سرحد کی کبھی حد بندی نہیں ہوئی ہے اور تاریخی طور چین کی مرکزی حکومت اور ہندوستانی حکومت کے درمیان کوئی عہد نامہ عمل میں نہیں آیا ہے۔ میکموہن لائن کو مسترد کرتے ہوئے چواین لائی نے کہا تھا کہ اس پر کم و بیش حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا جانا چاہئے۔ تب چین کو اکسائی چین میں شین جیانگ۔ تبت سڑک بنائے لگ بھگ دو سال ہو چکے تھے۔ جس سرزمین پر ہندوستان نے اپنا حق جتایا تھا اور اس کے حقِ ملکیت کے بارے میں اپنے ۲۲/ مارچ ۱۹۵۹ء کے خط میں کسی قسم کی گفت و شنید کرنے سے انکار کیا تھا۔

نہرو نے تب۔ لداخ کی سرحد کے سلسلے میں ۱۸۴۲ء کے معاہدے کا حوالہ دیا۔ جس کا ذکر اوپر آیا ہے جو چین کے شہنشاہ، تبت کے لاما گورو اور کشمیر کے مہاراجہ کے درمیان عمل میں آیا۔ جس کو

---

[1] Turning Point in Ties with China-A.G.Noorani, based on selected works of Jawahar Lal Nehru, 1-31March 1959, Second series (Volume 47)

۱۸۴۲ء میں چین نے تسلیم کیا۔ چین جس علاقے کو اب دعویٰ کرتا ہے۔ اسے سابق سرکاری نقشے میں ہندوستان کا علاقہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۹۳ء کے چین نقشے میں بھی اسے بھارتی قلمرو میں دکھایا گیا ہے۔ لیکن چینی اپنے دعوے پر اڑا رہا اور جواب دیا کہ ۱۸۴۲ء کے معاہدے میں اسے دونوں خطوں کے مابین سرحد بالکل قرار نہیں دی گئی ہے۔ یہ لڑائی کے بعد عدم جارحیت کا ایک عہد نامہ تھا۔

چین کے لئے اکسائی چین افادیت رکھتا ہے۔ اسی طرح میکموہن لائن ہندوستان کے لے اہمیت کا حامل ہے۔

نہرو کو چین کی طرف سے حملے کا اندیشہ نہیں تھا۔ نومبر ۱۹۵۰ء میں انہوں نے اپنے سینئر وزیر سردار ولبھ بائی پٹیل کو ایک خط میں لکھا تھا کہ امن یا جنگ دونوں صورتوں میں چین کی طرف سے کسی حملے کا بہت کم امکان ہے۔ نہرو نے لکھا تھا کہ مختلف عالمی عوامل کے تحت وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ امن میں ایسا کوئی حملہ عالمی جنگ پر منتج ہوگا۔ چین پر بحری اور ہوائی حملے ہو سکتے ہیں۔ اپنے سے طاقت ور دشمنوں کے سامنے اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس لئے نہرو نے چین سے کسی بڑے حملے کو خارج از امکان قرار دیا۔

آگے جا کر وزیر اعظم کی یہ خوش فہمی غلط ثابت ہوئی۔ البتہ انہوں نے یہ لکھا تھا کہ چین کا ضرور ہماری سرحد کے اندر رفتہ رفتہ در اندازی اور متنازعہ علاقے پر قابض ہونے کا پورا امکان ہے۔ جو صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

پاکستان کے فوجی صدر ایوب خان نے برصغیر ہند کو بیرونی خطرہ اور خارجی امور کے ضمن میں جو پالیسی مرتب کی ہے، ڈوروتھی دوڈمین نے اپنی کتاب یں اس کا ایک اقتباس دیا ہے۔ ایوب خان رقم طراز ہیں:

> ''جنگ اور فوجی حکمت عملی (Strategy) کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں بالکل صاف طور شمال سے بحر ہند کے گرم پانی کی طرف بے تحاشا پیش قدمی کو دیکھ سکتا ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان اگر ایک دوسرے سے جھگڑتے رہیں تو یہ Push (دھکیل) بڑھے گی۔ اس کے برعکس جب ہم اپنے مسائل

حل کریں اور اندرون ملک آج تعینات اپنی مسلح افواج کو بیرون ملک کی سرحد پر
تعینات کریں، تو میرا خیال ہے، ہمارے لئے ماضی کی تاریخ دہرانے کے
تدارک کا یہ اچھا موقع ہے۔ جب بھی برصغیر آپسی طور منقسم تھی، کسی نہ کسی نے
بیرونی طاقت کو گھس پیٹھ کے لئے دعوت دی۔"

تین سال بعد مارچ ۱۹۶۳ء میں چین اور پاکستان کے مابین قراقرم کے مغرب میں سرحدی مسئلہ طے ہوا اور پاکستان نے وادی شکگام چین کو دیا۔

۲۱/ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو چین سے گلگت تک ایک سڑک کی تعمیر کے لئے ایک معاہدے پر دستخط ہوئے، جو بعد میں شاہراہ قراقرم کی تعمیر پر منتج ہوئی۔

شکسگام برصغیر کے سرحدی علاقہ ہنزا کے زیر نگیں تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ چین کی حکومت اور برطانوی ہند سرکار کے درمیان ہنزہ اور اس کے مقبوضہ علاقے تغ دومبش اور رسکم پر تنازعہ رہا تھا۔ اے۔جی۔نورانی کی کتاب India-China Boundry Problem.1846-1947, History and Diplomacy کی روشنی میں شکسگام جموں وکشمیر کا علاقہ نہیں تھا۔ بعد میں نئے نقشے میں اسے اجاگر کیا گیا۔

گونڈ کرنرائن راؤ کے مطابق ۱۹۵۹ء میں چین اپنے اس بیان سے مکر گیا کہ وہ حقیقت پسندانہ طور سرحدی مسئلہ حل کرے گا۔ چین نے یہ نئی تجویز رکھی کہ تصفیہ ہونے تک متنازعہ علاقے کو کالعدم قرار دیا جائے۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں ہندوستان نے بات چیت کیلئے ۱۵/ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی تھی لیکن چین بات چیت کے لئے آمادہ نہیں تھا اور لداخ اور نیفا پر حملے کئے۔ اس کے بعد کے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔

لداخ۔تبت سرحد پر زمینی حقائق (Ground Realities) اچھے نہیں ہیں۔ کئی دھائیوں سے چین اکسائی چین کے ۳۸ ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہے۔ معتبر ذرائع اور جانکار حلقوں کے مطابق ۱۹۸۶ء کے بعد چینی فوج (پیپلز لبریشن آرمی) مزید ۴۵ کلومیٹر لداخ کے علاقے میں گھس آئی ہے۔ مشرقی لداخ کے دمجوق سیکٹر میں سکق جونگ کی سرمائی چراگاہ اپنے قبضے میں لی ہے۔

جس سے سرحدی گاؤں کے خانہ بدوش چنگپاؤں کے ہزاروں مال مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کی خوراک کی ضرورت پوری ہوتی تھی۔ چین نے لداخ کے کئی سرحدی گاؤں میں ترقیاتی کام روک دیا ہے۔ اپریل ۲۰۱۳ء میں چینی فوج لداخ کے علاقے میں ۱۹ کلومیٹر اندر گھس آئی اور بیس دن بعد مشروط طور واپس چلی گئی۔ یہ سارے واقعات ہندوستان اور چین کے مابین امن و آشتی کے معاہدوں کی آڑ میں ہوئے ہیں۔

نومبر ۱۹۵۰ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے سردار پٹیل کے نام ایک خط میں چین سے جس اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ وہ صحیح ثابت ہوا ہے۔

اس صورت حال سے لداخیوں میں غم وغصہ پایا جاتا ہے اور حکومت کو کئی مرتبہ اپنی عرضداشتیں پیش کی ہیں کہ صورت حال سے نپٹنے کے لئے چین کے مدِ مقابل ایک موثر قدم لے۔

اس اجمال کی تفصیل دینے سے پہلے لداخ کے سرحدی علاقوں کا مختصر تذکرہ پیش ہے:

جمہوریہ ہند اور عوامی جمہوریہ چین کی سرحد کی لمبائی ۴۰۵۷ کلومیٹر ہے۔ جس میں ۴۰۰ کلومیٹر سے زیادہ لمبی سرحد لداخ میں پڑتی ہے۔ چین۔ ہندوستان سرحد Line of Actual (LAC) Control کہلاتی ہے۔ یہ لمبی سرحد ہندوستان کے مغربی، درمیانی اور مشرقی سیکٹروں سے گزرتی ہے۔ مغربی سیکٹر میں لداخ، درمیانی سیکٹر میں اترا کھنڈ اور ہماچل پردیش اور مشرقی سیکٹر میں اروناچل پردیش اور سکم کی ریاستیں آتی ہیں۔ مشرقی اور شمالی لداخ کی سرحد پر چند گاؤں آباد ہیں۔ اکسائی چین سمیت بیشتر علاقے میں کوئی بستی یا انسانی آبادی نہیں ہے۔ جہاں آبادی ہے۔ وہاں زیادہ تر خانہ بدوش چنگپا رہتے ہیں۔ پورے علاقے کو چنگ تھانگ کہا جاتا ہے۔ جس کا معنی شمالی میدان ہے اور اس نسبت سے چنگپا یا شمالی میدان کے باشندے کی اصطلاح بنی ہے۔ چنگپا کو ڈوقپا یا 'بالائی علاقے کے باسی' بھی کہا جاتا ہے۔۔ کچھ آباد علاقے پندرہ ہزار فٹ بلند ہیں۔

چنگپا منگول نسل کے ہیں۔ یہ مال مویشی خاص کر پشمینہ بکریاں پالتے ہیں۔ جن سے ایک لداخی محقق چھرنگ پنچگ کے مطابق ۴۵ ہزار کلوگرام پشمینہ پیدا ہوتا ہے۔ پشمینہ سے کشمیر میں عمدہ شالیں بنتی ہیں۔ چھرنگ پنچگ نے لکھا ہے کہ ۱۲۰۰ خانہ بدوش کبنے نقل مکانی کرتے ہیں اور سال میں ۵ سے ۱۲

مرتبہ اپنے کمپ بدلتے ہیں۔

جریدہ Border Affairs کے اپریل۔ جون ۲۰۱۳ء کے شمارے میں چھرنگ پنچگ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ چین نے ۱۹۸۰ء کی دھائی سے بڑے علاقے پر قبضہ کیا ہے۔ ۱۶۸۴ء اور ۱۸۴۲ء کے معاہدوں کے مطابق تبت اور لداخ کی سرحد کیگو نارو پر تھی جو دُم چھلے سے پورے ایک دن کا راستہ ہے۔ جہاں ۱۹۶۲ء کی ہند۔چین جنگ سے پہلے ہماری ایک اگلی چوکی تھی۔ دُم چھلے اب بھارت کے پاس نہیں ہے۔

مضمون نگار آگے لکھتا ہے: ''علاقے کے بزرگ بتاتے ہیں کہ چھُوشُول سے لداخ۔تبّت کی سرحد دو دن کا سفر تھا اور سپنگور جھیل کے مشرقی کنارے سے ایک دن کا سفر تھا۔ یہ بزرگ تجارت کے سلسلے میں چھُوشُول سے تبت کے سرمائی صدر مقام رُودوق جاتے تھے۔ آج چھُوشُول لداخ۔تبّت سرحد پر آخری گاؤں ہے۔

کیرغستان میں ہندوستان کے سابق سفیر اور دفاعی تجزیہ کار پی۔ ستبدن کے مطابق ۱۹۸۶ء سے چین نے مشرقی لداخ کے دمجوق سیکٹر میں سکق جُونگ کے بڑے علاقے پر قبضہ کیا ہے۔ اب چینی شمال مشرقی لداخ کے چپ چاپ علاقے میں داخل ہوئے ہیں۔ ۴۵ کلومیٹر لمبا سکق جُونگ لداخ کے چھُوشُول، چھاغا، نیدر، نیوما، مُوت، دونگتی، کُویول اور لوما گاؤں کے خانہ بدوشوں کے جانوروں کی واحد سرمائی چرگاہ ہے۔ جوان کی گزربسر کا ذریعہ ہے۔

اس ضمن میں چھرنگ پنچگ نے Border Affairs میں لکھا ہے:

''۱۹۸۰ء کی دھائی کے نصف تک لداخی چنگپا سردیوں میں بلا روک ٹوک اپنی بھیڑ بکریاں چرانے کے لئے سکق جُونگ لے جاتے تھے۔ ہماری حکومت کی لاپروائی سے اب اس چراگاہ پر تبّتی خانہ بدوش جولائی اگست میں اپنے مویشی چرانے لاتے ہیں۔''

مصنف لکھتا ہے: ''سکق جُونگ کی سرمائی چراگاہ سے لگ بھگ ۸۰ ہزار بھیڑ بکریوں اور ۴ ہزار یاک کو سرمائی ڈھائی ماہ کے لئے گھاس میسر تھی۔ یہاں ایندھن اور تازہ پانی بھی دستیاب ہے اور مقابلتاً سردیوں میں یہ جگہ گرم ہے اور کم برف پڑتی ہے۔ تب بھیڑ بکریاں ساٹھ ہزار کوئنٹل گھاس کھاتی

تھیں۔ جس کی مالیت لداخ میں گھاس کی موجودہ شرح قیمت کے مطابق ساڑھے سات کروڑ روپے ہے۔ بڑے جانور پندرہ ہزار کوئنٹل گھاس کھاتے تھے۔ پنچگ نے لکھا ہے کہ مذکورہ اور دوسری وجوہات کی وجہ سے بہت سارے چنکپاؤں نے بھیڑ بکریاں پالنا چھوڑ دیا ہے اور روزگار کے دوسرے وسائل تلاش کررہے ہیں۔'' (متعدد کنبے نقل مکانی کر کے لیہہ منتقل ہوئے ہیں۔)

چین کے بارے میں یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ لداخ کے علاقے کو آہستہ آہستہ nibble (کترپیونت) کرتا جارہا ہے۔ چھرنگ پنچگ نے چین کی ایک کہاوت کا ذکر کیا ہے۔ ''اگر تم ایک ملک فتح کرنا چاہتے ہو، تو اس کو گزوں کے بجائے انچوں سے فتح کرو۔'' چنگ تھانگ کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ چھرنگ نوبو نے چین کے incursion پیش قدمی کے ضمن میں ۱۰۔۲۰۰۹ء میں اپنے افسر بالا کو اپنے ایک خط میں اسی کہاوت کا حوالہ دیا تھا۔

پنچگ لکھتا ہے: ''یہی چین کی موجودہ پالیسی کی عکاس ہے۔ چین نے چھوشول۔ چھاغا سڑک پر ریزونگ لا کے پاس ایک چوکی قائم کی ہے۔۔۔۔۔کوئی مزاحمت نہ پاکر نوے کی نصف دہائی میں چین نے تاجروں کے لئے ہمارے علاقے (دُم چھلے) میں مکانات تعمیر کرنے شروع کئے اور دُم چھلے تک ایک سڑک بنائی۔''

کئی دفعہ چین نے سرحد پر ترقیاتی کاموں میں رکاوٹیں ڈالی ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ہندوستانی گاؤں دمجوق میں چینی فوج نے لداخ کے انتظامیہ کو بس سٹاپ پر شیڈ بنانے سے روکا اور کام ادھورا چھوڑنا پڑا۔ دمجوق سے لداخی بودھ صدیوں تک کیلاش مانسرور کی یاترا پر جاتے رہے ہیں۔ اب یہ راستہ بند ہے۔ یاتری اترپردیش کے پتھورگڑھ سے کیلاش جاتے ہیں۔ یہ راستہ بہت لمبا اور دشوار گذار ہے۔

جولائی ۲۰۱۲ء میں چین نے چُومُور کے علاقے میں ہیلی کاپٹروں کی مدد سے ہندوستانی دمدمے اور خیمے تباہ کئے۔ ٹائمز آف انڈیا نے ۱۹/ستمبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں اس خبر کو China Needles India in Eastern Ladakh کی سرخی سے شائع کیا۔

۲۰۱۳ء میں سب سے بڑا واقعہ ۱۵ اپریل کو پیش آیا۔ جب ۳۰ سے ۴۰ کے درمیان چین کے فوجی دو ہیلی کاپٹروں کی مدد سے دیپ سانگ کے علاقے میں لداخ کے ۱۹ کلومیٹر اندر دولت بیگ

اُولدی[1] کے برٹرے کے مقام پر آئے اور خیمے نصب کئے۔ انہوں نے ایک بینر آویزاں کیا۔ جس پر لکھا تھا: ''یہ علاقہ چینی قلمرو میں ہے۔''

۱۶/اپریل..........کو سرحدی محافظ ITBP (انڈو تبتن بارڈر پولیس) نے اسے ۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر خیمے لگائے اور فورٹین کور کی طرف سے ۵ لداخ سکاوٹس کے پیدل بٹالین کو علاقے کی طرف جانے کا حکم ملا۔

۱۸ اپریل کو سرحدی گاؤں چھُوشول میں بھارتی اور چینی کمانڈروں کی پہلی فلیگ میٹنگ ہوئی۔ چین نے جگہ چھوڑنے سے انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ مقبوضہ جگہ چین کا علاقہ ہے۔ دوسری فلیگ میٹنگ بھی کسی تصفیے کے بغیر ختم ہوئی۔ اس کے بعد دو اور میٹینگیں ہوئیں۔ فریقین کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ایک میٹنگ میں چینی مذاکرات کاروں نے مشرقی لداخ میں Infrastructures تعمیرات مسمار کرنے کا مطالبہ کیا۔ جن میں ایک اہم مقام چُومُور میں چند نئے دمدمے تعمیر کئے گئے تھے۔ اس سرحدی خلاف ورزی کا سرکاری اور ملکی سطح پر ردعمل دیکھنے میں آیا۔

دفاعی تجزیہ کار پی۔ ستبدن نے انڈین اکسپریس کے ۲۰ اپریل کے شمارے میں The Ladakh Drift کے عنوان سے ایک مضمون میں صورت حال پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے: ''یہ بات خارج از امکان نہیں ہے کہ چین بے آب و گیاہ اکسائی چین میں دریائے شایوق اور دریائے چنگ چھنمو کا رُخ موڑنے کا منصوبہ بنا سکتا ہے۔ ستبدن نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ چین کا ارادہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قراقرم کے جنوب سے ہو کر مشرق سے دریائے شایوق کو پار کرے۔ جسے جغرافیائی طور اہم نوبرا وادی میں نقل وحمل کے ذرائع متاثر ہوں گے۔

اندرونی لداخ میں چین کے میلوں داخل ہونے کی کئی وجوہات اور تاویلات پیش کی جاتی

---

[1] دولت بیگ اولدی ایک اعلیٰ خاندان کی ترکی خاتون کا نام بتایا جاتا ہے۔ جو ماضی میں نامعلوم سن اور تاریخ کو قراقرم درہ پار کرنے کے بعد اس جگہ چل بسی تھی۔ اولدی ترکی میں موت کا معنی دیتا ہے۔ درہ قراقرم لداخ کے انتہائی شمال میں شین جیانگ۔ لداخ تجارتی راستے پر چین کی سرحد سے ۸ کلومیٹر دور واقع ہے۔ اور اکسائی چین کی سرحد LAC سے ۹ کلومیٹر دور ہے۔

ہیں۔ ہندوستان نے دولت بیگ اولدی، فُوکچے اور نیوما جیسے اگلے علاقوں میں ہوائی اڈے تعمیر کیئے ہیں اور انہیں بروئے کار لائے ہیں۔ لیہہ اور دولت بیگ اولدی کو سڑک سے ملانے کے لئے اقدام کیئے ہیں۔ چُومُور سیکٹر میں نئے مورچے اور دمدمے تعمیر کیئے ہیں۔ اور بھارتی سرحدی محافظ دستوں نے اپنی گشت تیز تر کی ہے۔ ان عوامل سے چین برافروختہ ہوا ہے۔ چین سرحدی تنازعے کو جلدی طے کرنے کے لئے بھی مصر رہا ہے۔ یہ چند اسباب ہوسکتے ہیں لیکن خود چین نے سرحد کے پار اپنے علاقے میں اسے کہیں زیادہ دفاعی تعمیرات کی ہیں۔ ہوائی مستقر بنائے ہیں۔ ہندوستانی سرحد تک چار لاینوں والی دورویہ پختہ سڑک بنائی ہے۔ ماہرین کے مطابق چین ۱۳۰۰ کلومیٹر دور لہاسہ سے ۳۰ گھنٹے میں ایک بڑی مسلح فوج تبت۔ لداخ سرحد تک لاسکتا ہے۔

دیپ سانگ سے چینی فوج کا انخلا پانچویں فلیگ میٹنگ کے بعد ۵ مئی کو عمل میں آیا۔ فریقین میں کیا فیصلے ہوئے۔ ان سے متعلق میڈیا کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ دیپ سانگ سے چین فوجیوں کے انخلا کے بارہ روز بعد ۱۷ مئی کو چینی فوجیوں نے ہندوستانی ایک گشتی دستے کو LAC جانے سے روکا۔ یہ واقعہ سری چاپ علاقے میں پیش آیا۔

چین کے ساتھ ۱۴ میں سے ۱۲ زمینی ہمسایہ ملکوں نے اپنے سرحدی مسئلے طے کیئے ہیں۔ لیکن مشرقی چینی سمندر میں چین نے دفاعی ہوائی زون قائم کیا ہے۔ جسکی امریکہ، جاپان، جنوبی کوریا اور تائیوان نے مخالفت کی ہے۔ جنوبی کوریا نے اپنا ہوائی زون قائم کیا ہے۔ اس صورت حال سے خطے میں تناؤ پایا جاتا ہے۔

ہر چند چین ایک پارٹی والی سخت گیر (Authoritrian) ملک ہے۔ قطع نظر اس کے چین کی ہمسری کرنے کے لئے چین کو سمجھنا ضروری ہے۔ ایک امریکی مارک لیونارڈ نے حال میں ایک کتاب What Does China Think لکھی ہے۔ اس میں مصنف نے چین کے Think Tank اور دانشوروں کا ذکر کیا ہے جو زیر آسمان مختلف مسائل اور نکات پر سوچتے ہیں۔ تبادلہ خیال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ امریکہ میں دس ہزار سے زیادہ Think Tank نہیں ہیں۔ انگلینڈ میں صرف چند سو ہیں۔ چین میں صرف ایک ادارہ اکادمی اور سوشل سائنسز میں ہمہ وقت کام کرنے والے

چار ہزار دانشور اور مفکر ہیں۔ جن میں بہت سارے امریکہ میں تعلیم یافتہ ہیں۔ اس طرح چین بقولِ مصنف Powerhouse of Ideas (فکر و نظر کی آماج گاہ) بنا ہے جو دُنیا میں اپنا اثر و نفوذ ڈال سکتا ہے۔

پچھلے پچیس سال کے دوران چین اور ہندوستان کے مابین متعدد میٹنگیں ہوئی ہیں۔ ان میں ماہرین کی پندرہ گروپ میٹینگیں، جوئنٹ ورکنگ گروپ کی پندرہ میٹینگیں اور خصوصی نمائندوں کی اتنی ہی میٹینگیں شامل ہیں۔ سرحد پر امن قائم رکھنے اور باہمی مسائل کو بات چیت سے حل کرنے کے کئی معاہدے ہوئے ہیں۔ لیکن کئی دفعہ چین نے ان معاہدوں کو پس پشت ڈالا ہے اور لداخ کے علاقوں پر قابض ہوا ہے۔

حال میں Border Defence Cooperation Agreement(BDCA) 'عہد نامہ سرحدی دفاعی تعاون' کے نام سے وزیر اعظم من موہن سنگھ اور چینی وزیر اعظم لی۔ کے کیانگ کے مابین بیجنگ میں ۲۳/ اکتوبر ۲۰۱۳ء کو ایک اہم معاہدہ ہوا ہے، جس پر گریٹ ہال آف دی پیپول میں دستخط ہوئے۔ اس کے تحت دونوں ممالک اپنا سرحدی تنازعہ باہمی بات چیت سے حل کریں گے۔ ایک دوسرے کے خلاف طاقت کا استعمال اور طاقت کی زبان استعمال نہیں کریں گے اور مسلح تصادم سے گریز کریں گے۔

......●●●......

☆......عبدالغنی شیخ

اُردو میں ترجمہ، اہمیت اور مسائل

ترجمہ ایک اہم فن ہے اور مشکل فن ہے بقول شخصے ترجمہ نگینہ جڑنے کا فن ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ترجمہ کو تخلیق سے تعبیر کیا ہے۔ ایک اچھی تخلیق کی طرح معیاری اور اچھا ترجمہ محنت طلب کام ہے۔ ترجمہ کرنے کے لئے دونوں زبانوں میں نہ صرف یکساں دستگاہ ضروری ہے بلکہ ان زبانوں کی تاریخ، ثقافتی اور سماجی پس منظر، مزاج اور ساخت سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ ترجمہ صلاحیت کے ساتھ ریاضت چاہتا ہے۔ عام مشاہدہ میں آیا ہے کہ بہت سارے تراجم میں جھول اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ترجمہ میں متن کے مفہوم کی روح میں اترنا چاہیئے۔ خالص لفظ بہ لفظ ترجمہ کرنے سے مطلب نہیں نکلتا۔ ہمیشہ لغت پر انحصار رکھا نہیں جاسکتا۔ الفاظ کا استعمال سیاق وسباق کے مطابق کیا جانا چاہیئے۔ کیونکہ الفاظ کے مختلف معانی ہوتے ہیں۔

ایک منجھے ہوئے چابک دست کاریگر کی فن کارانہ کاریگری کی طرح ایک ترجمہ کار مترجم الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال خوش اسلوبی، نزاکت اور نفاست سے کرتا ہے۔ جس طرح جادو نگار ادیب اپنی منظر نگاری اور کردار نگاری سے ماحول اور جیتی جاگتی زندگی کا ہو بہو نقشہ کھینچتا ہے۔ ترجمہ میں بھی وہی تصویر جھلکنی چاہیئے۔ ایک فن پارہ کے مطالعہ سے قاری کے دل ودماغ پر موضوع اور نفس مضمون کی نسبت سے طمانیت، ملال، ترحم، ٹیس، کسک اور جذبات طاری ہوتے ہیں۔ اس فن پارہ کو جب کسی اور زبان کا جامہ پہنایا جائے، تو وہی کیفیات اور وحدت تاثر پیدا ہونا چاہیئے۔ یہی ترجمہ کی معراج

ہے۔شاعری کا منظوم ترجمہ بہت مشکل ہے لیکن نثر کا ترجمہ بھی آسان نہیں۔ترجمہ سلیس، سادہ، عام فہم اور دلنشیں ہونا چاہیے۔

ترجمہ ایک زبان کی اصل تصنیف سے براہِ راست کرنا بہتر ہے۔کیونکہ ہر زبان کا مزاج اور اپنی خاصیت ہوتی ہے۔دوسری زبان سے ترجمہ کرنے سے اس کی اولین خوبی زائل ہو جانے کا خدشہ ہے۔ڈاکٹر قمر رئیس نے ٹیگور کی ایک سو نظموں کے تراجم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان ترجموں میں اس تخیلی نزاکت اور اظہار و بیان کی کیفیت کا بہت کم سراغ ملتا ہے جو ٹیگور کے فن کا خاصہ رہا ہے۔ان نظموں کا ترجمہ ٹیگور صدی کی تقریبات پر اُردو کے قد آور شاعر فراقؔ گورکھپوری نے کیا تھا۔فراقؔ نے غالباً یہ ترجمہ گیتانجلی کے انگریزی ترجمہ سے کیا تھا۔ترجمہ بھی تخلیق کا درجہ رکھتا ہے۔معیاری تراجم میں تخلیق کاروں کی تخلیقات بہتر اور موثر طور پر دنیا کے سامنے آئی ہیں اور تخلیق کاروں کو شہرت عام اور بقائے دوام ملا ہے۔انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا میں ترجمہ کا اہم رول ہے۔اگر ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوتا تو ایک خطہ اور ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے تمدن، فنون لطیفہ اور علم و ادب سے نابلد رہتے۔سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پیش رفت نہیں ہوتی اور انسانی علم و عمل محدود، جامد اور ساکت رہ جاتے۔ترجمہ کی بدولت آج ہم سقراط کے فلسفۂ حیات، کالی داس کی شاعری کی غنائیت، بوعلی سینا کے سائنسی زاویہ نگاہ اور شیکسپیئر کی فکر و نظر سے آگاہ ہیں۔ترجمہ نے اردو، ہندی اور ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کو ناول، کہانی اور مختلف اصنافِ سخن میں نئے اسلوب اور تکنیک سے روشناس کیا ہے۔ترجمہ کی بدولت مختلف خطوں، ملکوں اور لسانی گروہوں میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور آفاقی بھائی چارہ کو تقویت ملتی ہے۔دورِ حاضر میں انگریزی زبان نے سائنس، ٹیکنالوجی اور علم و ادب کو فروغ دیا ہے۔زمانہ وسطی میں عربی تراجم نے یورپ میں یہی کردار ادا کیا تھا اور عربی زبان نشاۃ الثانیہ کا پیش خمیہ ثابت ہوئی۔انگریز دانشور روجر بیکن اسلامی اسپین کی یونیورسٹی کے پیداوار تھے۔وہ عربی زبان جانتے تھے اور اس کی تعلیم و ترویج کے زبردست حامی تھے۔تب مغرب کے علما اسلامی سپین میں فلسفہ، ریاضی، طب، علم فلکیات وغیرہ سے استفادہ کرنے آتے تھے۔

اردو ادیبوں اور اردو کے محبوں نے ہمیشہ سے ترجمہ کی افادیت کو سمجھا ہے۔انگریزی سے

پہلے سنسکرت، عربی اور فارسی وغیرہ سے اردو میں تراجم ہوئے ہیں۔ چودھویں صدی میں شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے اردو میں مختلف علوم وفنون کی ۱۳۲ کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد ۱۸۵۰ء سے انگریزی سے اردو میں شاعری اور ادبی تصانیف کا باقاعدہ ترجمہ شروع ہوا۔ اس کا محرک سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب کی پیش رفت تھی۔ سر سیّد احمد خان جیسی روشن دماغ شخصیتوں نے سائنس، جدید علوم اور ادب کے فروغ کے لئے انگریزی سے اردو جیسی زبانوں میں تراجم کی افادیت کو سمجھا۔ ۱۸۶۳ء میں سائنٹفیک سوسائٹی قائم کی۔ اس طرح خیر خواہ امراء اور روساء نے جدید علوم کے فروغ اور اشاعت کے لئے مترجمین کی سرپرستی کی اور اردو ادب کو فروغ دیا۔ انگریزی سے اردو میں تراجم کا کام سوسائٹی کے قیام سے پہلے ہو چکا تھا۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی پہلی کتاب انجیل مقدس ہے۔ بنجمن شلر نے ۱۷۴۸ء میں اسے ترجمہ کیا تھا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے ایک اہم نصب العین تھا۔ انگریزی سے اردو میں علمی کتابوں کے تراجم سے سوسائٹی لوگوں میں ذہنی بیداری اور علمی اور سائنسی شعور پیدا کرنا چاہتی تھی۔ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ میں اردو پریس نام سے اردو کا پہلا مطبع قائم ہوا۔ اس سے پہلے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جن سے اردو میں تالیف، تصنیف اور ترجمہ کو بڑا فروغ ملا۔ نو آبادیاتی نظام سے چند مثبت چیزیں برصغیرِ ہند کو ورثہ میں ملی ہیں۔ ان میں ایک انگریزی زبان ہے۔ اردو کے اکثر ادیب انگریزی سیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ جو ادیب انگریزی کی کسی تخلیق سے متاثر ہوتا، چاہے نظم ہو یا کہانی، ڈرامہ ہو یا انشائیہ، وہ اسے اردو کے قالب میں ڈھال کر کسی جریدے میں شائع کراتا تھا۔ اور اسے ذہنی تسکین ملتی تھی۔ بہتوں نے کم سے کم ایک کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان ادیبوں میں چند معروف نام پریم چند، مجنوں گورکھپوری، مولانا ابوالکلام آزاد، اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد، عبدالحلیم شرر، قاضی عبدالغفار، عبدالمجید سالک، اسرار احمد آزاد، سعادت حسن منٹو، عبدالرحمن بجنوری، اثر نعمانی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، ظ۔ انصاری، مخمور جالندھری، ابنِ صفی، غلام عباس، قراۃ العین حیدر، ایم جے عالم اور نیاز فتح پوری ہیں۔ تراجم شدہ نگارشات میں قدیم یونان کے ڈرامہ نگار سوفوکلیز اور یوروپیڈیز کے ڈراموں کے اردو ترجموں سے لے کر انیسویں اور بیسویں صدی کے مغرب اور روس کے اکثر بڑے ادیبوں کے نام نظر

آتے ہیں۔ اس پر ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ راقم الحروف کی نظر سے اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں گزری۔ اگرچہ اس پر متعدد مضامین لکھے گئے ہیں۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ مترجمین میں اکا دکا انگریز نام بھی نظر آتے ہیں۔ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، جرمنی، روسی، چینی، جاپانی، اطالوی، انڈونیشیائی، کوریائی، برمی اور لاطینی امریکی زبانوں کے ادب کے ترجمے اردو میں ہوئے۔ لیکن آزادی کے بعد اردو میں ترجموں کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔ آزادی سے پہلے جن اداروں نے دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کا کام کیا۔ ان کی فہرست لمبی ہے۔ ان میں ہندوستانی اکادمی، اردو اکادمی، دہلی کالج برائے اسکول بک سوسائٹی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، اودھ لکھنو، مدرسہ فخریہ حیدر آباد، اسکول بک سوسائٹی دہلی، مطبع نولکشور لکھنو، سائنٹفیک سوسائٹی علی گڑھ، ورنے کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، انجمن ترقی اردو، ترقی اردو بورڈ، مکتبہ جامعہ اسلامیہ، دہلی وغیرہ شامل ہیں۔ لارڈ اکلینڈ نے اردو سمیت دیسی زبانوں میں درسی کتابیں تیار کرنے کے لئے Society for the promotion of knowledge in India through the Medium of Vernacular languages کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ سائنٹفیک سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں، جو زیادہ تر تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات پر مشتمل ہیں۔ ایک اور ذریعہ نے پندرہ کتابیں بتائی ہیں۔ ڈاکٹر شہناز شاہین سوسائٹی کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں۔ کہ سوسائٹی نے شمالی ہند میں تہذیبی نشاۃ ثانیہ لائی ہے۔

آزادی سے پہلے اردو اکادمی، ہندوستانی اکادمی اور مکتبہ جامعہ کے اہتمام سے جن کتابوں کے ترجمے ہوئے، وہ بڑے مستند مانے جاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری اور پریم چند ان اداروں سے وابستہ تھے۔ تاہم ان تمام اداروں میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد اپنی کارگذاری کی وجہ سے سرِ فہرست ہے۔ ادارہ نے غیر ملکی زبانوں سے تقریباً پانچ سو کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جن میں زیادہ تر ٹیکنیکل کتابیں ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔ اس سے دو سال پہلے اگست ۱۹۱۷ء میں سررشتۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا۔ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا، جو ۱۹۴۸ء تک مروج رہا۔ دارالترجمہ کو فاضل اور قابل مترجمین کی خدمات حاصل تھیں۔ ان میں پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سیّد عابد حسین، مولانا سیّد ابو

الاعلیٰ مودودی، عبدالباری ندوی، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر ہارون خان شروانی، ڈاکٹر وحید الدین، مولانا سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالخیر مودودی، ڈاکٹر یوسف حسین، ڈاکٹر سجاد حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، سید حسن بلگرامی، جوش ملیح آبادی، وحید الدین خان سلیم، ظفر علی خان اور نظم طباطبائی جیسے بلند پایہ عالم اور ادیب تھے۔ ان میں اردو، انگریزی، جرمن زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی کے علماء تھے۔ ترجمہ کے بعد ماہر ترجمہ کار مسودہ پر نظر ثانی کرتے تھے۔ سائنسی اصطلاحات اور جن الفاظ کے اردو مترادف نہیں ہوتے، مترجمین ان اصطلاحات اور الفاظ مجالسِ وضع اصطلاحات میں ان کے مترادف الفاظ وضع کرنے کے لئے بھیجتے رہتے تھے۔ دارالترجمہ میں ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے درسی کتابیں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا حمید الدین جیسے عالم وابستہ رہے۔ وہ ترجمہ کا کام بھی کرتے تھے۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔ شبلی نعمانی انجمن کے روحِ رواں تھے۔ انجمن نے متعدد اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ کیا۔ دہلی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا قیام ۱۸۴۴ء میں عمل آیا۔ ۱۸۵۷ء تک ادارہ نے ۱۱۷ کتابیں، ترجمہ، تصنیف اور تالیف کی تھیں۔ قرۃ العین حیدر، کبیر احمد جائسی اور عزیز احمد کی مترجمہ کتابوں کو مکتبہ جامعہ نے شائع کیا۔ ترقی اردو بورڈ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی سینکڑوں کتابوں کا ترجمہ کیا۔ شہباز حسین کے مطابق اردو کی قدیم ترین ٹکنیکل کتاب، بحرِ حکمت، ہے جو انگریزی سے ترجمہ ہوئی۔ اور ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی۔ سیّد سلیمان ندوی نے ۱۹۲۰ء میں اردو میں ترجمہ کی گئی اکیس ٹیکنیکل کتابوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ یہ کتابیں کلکتہ، دہلی، لاہور، آگرہ، لکھنو اور بنارس میں شائع کی گئی تھیں۔ اردو کو مختلف غیر ملکی زبانوں کے فاضل مترجم نصیب ہوئے ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم ترکی جانتے تھے اور ترکی زبان کے کئی ناولوں اور ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ ترکی سے اردو کو منتقل کرنے والے پیشرو مترجم تھے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اور ڈاکٹر ذاکر حسین جرمن زبان میں فاضل عالم تھے۔ انھوں نے متعدد جرمن کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ سید عابد حسین سے متعلق جرمن قلم کار ایڈورڈ اشپرنگر کی کتاب 'نفسیاتِ شباب، کے ترجمے کے حوالے سے پروفیسر آل احمد سرور رقم طراز ہیں۔ 'وہ (سید عابد حسین) جرمن سے ترجمہ اس طرح کرتے تھے، جس طرح کوئی مضمون لکھتا ہے۔' سید عابد حسین کی اعلیٰ نثر نگاری

کی طرح ترجمہ کا معیار بلند ہے۔ انہوں نے دی بوئر کی' تاریخ فلسفہ اسلام' کانٹ کی' تنقید عقلِ محض' گوئٹے کی' فاؤسٹ' اور ولین فائٹر اور بلیک مارک کی مبادی عمرانیات' سمیت کئی تصنیفات کے جرمن سے اردو میں ترجمے کئے۔ ان کے علاوہ انہوں نے انگریزی کی متعدد کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ ان میں گاندھی جی کی 'تلاش حق' جواہر لال نہرو کی 'تلاشِ ہند' اور 'جگ بیتی' اور رابندر ناتھ ٹیگور کی 'کلموہی' اور برناڈ شاہ کی 'سینٹ جان' اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی 'ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر عابد حسین نے مولوی عبدالحق کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند کی انگریزی اردو لغت کے بڑے حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ ظ۔ انصاری نے براہِ راست روسی ادب سے تراجم کا کام کیا ہے۔ علامہ اقبال فارسی، عربی۔ انگریزی اور جرمن زبانوں میں فاضل تھے۔ اگرچہ انہوں نے زبانوں پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا تاہم ان زبانوں کے فلسفیوں، حکماء اور شعراء کے فلسفہ، نظریات اور فکر ونظر سے اردو قارئین کو روشناس کیا۔ سعادت حسن منٹو کو سبھی ایک بلند پایہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ وہ ایک اچھے ترجمہ کار بھی تھے۔ منٹو شروع میں ایک اخبار 'مساوات' کے کالم نگار تھے اور خبروں کے ترجمے کرتے تھے۔ ادبی طور پر منٹو نے سر آرتھر کانن ڈائیل کے ایک افسانے کا 'دست بریدہ بھوت' کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ وکٹر ہیوگو کی تصنیف Last Days of Condemned کو اردو کا جامہ پہنایا اور 'ایک اسیر کی سرگذشت' کے نام سے ۱۹۳۳ء میں اسے شائع کیا۔ آسکر وائلڈ کے متنازعہ ڈرامہ 'ویرا' کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا۔ منٹو نے وکٹر ہیوگو اور گوئٹے کی چند نظموں کے علاوہ روسی، فرانسیسی اور کئی زبانوں کے ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے منصور احمد نامی ایک ترجمہ کار کو بطور ایک 'پختہ کار مترجم' یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر شہناز شاہین نے بطور مترجم عنایت اللہ دہلوی کی مقبولیت کا ذکر کیا ہے۔ عنایت اللہ نے شیکسپر کے ڈرامے میک بتھ، جولیس سیزر، رومیو جولیٹ، انطونی وقلوپطرہ، کپلنگ کی The Jungle Book اور دانتے کی Inferno Divine Comedy کو اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری اور مظہر الحق علوی کے انگریزی سے ترجمہ جاسوسی اور بھیانک قسم کے ناول بھی لوگوں کے ایک بڑے طبقے میں مقبول تھے۔ اردو کے کئی ادیبوں نے انگریزی ناولوں کی تھیم کی اساس پر ناول لکھے ہیں یا ان کی تلخیص پیش کی ہے۔ مولوی نذیر احمد، قاضی عبدالغفار،

مجنوں گورکھپوری اور کرشن چندر کے کئی ناول انگریزی ناولوں سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح سجاد حیدر یلدرم کے افسانے ترکی افسانوں کا چربہ ہیں۔

اردو میں ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، کشمیری، تامل، تیلگو، کنڑ، ملیالم اور دوسری علاقائی زبانوں کے ادب کے براہِ راست ترجمے ہوتے رہتے ہیں۔ کئی ادباء اردو اور اپنی مادری زبان دونوں میں لکھتے ہیں۔

آزادی کے بعد اردو میں ترجمہ کو سخت دھکا لگا۔ اگرچہ سرکاری اداروں نے دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کا کام جاری رکھا ہے۔ ان میں ترقی اردو بورڈ، ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان قابلِ ذکر ہیں۔ شاعر، آج کل جیسے رسائل میں غیر ملکی کہانیوں کے ترجمے چھپتے رہتے ہیں۔ لیکن پرائیوٹ اداروں اور پبلشروں نے ترجمے کو خیرباد کہا ہے۔ معروف پبلشروں کی کتابوں کی فہرستوں کا جائزہ لیں تو ان میں دوسری زبانوں سے ترجمہ شدہ کتابیں شاذ ہی نظر آتی ہیں۔ اردو ادیبوں میں مغربی ادب کے شاہکاروں کے ترجمے کا وہ جذبہ اور شوق نہیں رہا ہے جو آزادی سے پہلے ادیبوں کا خاصہ تھا۔ اب ترجمے اور تالیف کو محض تجارتی نقطہ نظر سے پرکھا جاتا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد مغربی پنجاب سے لاکھوں اردو جاننے والے شرنارتھی ہندوستان آئے اور ان کے روزگار کے لئے اردو میں اچار چٹنی بنانے سے لے کر ریڈیو میکینک کی رہبری کے لئے کتابیں لکھی گئیں۔ اردو سے انجان ان کی اولاد اور نئی نسل کے لئے اب یہ کتابیں بیکار ہوگئی ہیں۔ آزادی سے پہلے اردو قارئین کو مغربی، روسی اور دوسری زبانوں کے ادب کی ترجمہ شدہ تحریریں اور کتابیں عام دستیاب تھیں۔ آج مغرب اور دوسرے ملکوں میں ماضی کے مقابلے میں فکشن اور غیر فکشن دونوں میں بہت ساری اچھی اور اعلیٰ کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ لیکن اردو قارئین کو ان کے لئے انگریزی میں چھپی کتابوں پر انحصار رکھنا پڑتا ہے یا پاکستانی جریدوں اور ڈائجسٹوں میں چھپنے والے ترجموں اور تلخیص پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی انگریزی کتابیں خریدنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ پہلے قارئین اردو میں ترجمہ شدہ کہانیوں، ناولوں، نظموں وغیرہ کی وساطت سے اگاتھا کرسٹی، ٹالسٹائی، گورکی چیخوف، ترگنیف، ڈکنز، ہارڈی، وکٹر ہیوگو، جان اسٹین بیک، آسکر وائلڈ، بالزاک، موپاساں، گالزوردی،

آرتھر کانن ڈائیل، آرائیل اسٹیونسن، سمرسٹ مام، ایچ جی ویلز، اوہنری، نتھالون ہاتھورن، واشنگٹن اروینگ، برونٹی ایمائل، ایمائل زولا، دانتے، گولڈاسمتھ، ٹینی سن، بائرن، گرے، تھامس مور، شیکسپر، ابسن، بریخت جیسے مشہور قلم کاروں کے ناموں سے واقف تھے لیکن انگریزی نہ جاننے والے اردو قارئین آج ان ناموں سے نابلد ہیں۔ ترجموں کی پرانی کتابوں کو یا تو دیمک چاٹ گئی ہیں یا امتدادِ زمانے کے ہاتھوں یہ کتابیں ناپید ہوگئی ہیں۔

راقم الحروف کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کچھ تجربہ حاصل ہے۔ انڈین انفارمیشن سروس سے وابستہ ایک ملازم ہونے کے پیش نظر انگریزی اور ایک علاقائی زبان میں واقفیت لازمی تھی۔ مرکزی اطلاعات ونشریات کے کئی شعبوں خاص کر پریس انفارمیشن بیورو، ریڈیو اور ٹی وی میں انگریزی سے اردو اور دوسری علاقائی زبانوں میں ترجمے کا کام ہوتا رہتا ہے، یہی تجربہ آگے چل کر مجھے ادبی تراجم میں کام آیا۔ تاہم ماسوائے ایک کتاب اور ایک کتابچہ کے میں نے تراجم کا کوئی بڑا کام نہیں کیا ہے۔

سرکاری ذرائع ابلاغ میں کئی دفعہ ترجمے میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ آکاش وانی اور دوردرشن سے نشر ہونے والی خبریں پہلے انگریزی میں بنائی جاتی ہیں اور انگریزی کی ماسٹر کاپی سے علاقائی زبانوں میں خبروں کا ترجمہ ہوتا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری پریس عموماً انگریزی میں اجرا ہوتے ہیں۔ ایڈیٹر کو روزانہ معینہ اور محدود وقت کے اندر ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں ترجمے میں غلطیوں کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہوا کے دوش پر نشر ہونے والی غلطیاں لطیفوں اور چٹکلوں کا روپ اختیار کرگئی ہیں۔ جو چٹخارہ لے لے کر سنائی جاتی ہیں۔ ریاستوں کی راجدھانیوں میں بھی پریس انفارمیشن بیورو میں کام کرنے والے اہل کاروں اور ریڈیو اسٹیشن اور دوردرشن کے ایڈیٹروں کو عموماً انگریزی سے متعلقہ علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ پھیکا اور غلط ترجمہ تخلیق کا مضحکہ اڑانے کے مترادف ہے۔ جو تخلیق کار اور ترجمہ کار دونوں کے لئے نہ صرف غیر معقول بلکہ باعثِ ہتک بھی ہیں۔ شہباز حسین نے جو 'آج کل' کے مدیر اور پی آئی بی کے سربراہ رہے۔ اپنے ایک مضمون میں ایسی کئی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان میں کچھ یہاں نقل کررہا ہوں۔ I Solemnly dedicate myself for the service of the nation کا ترجمہ کسی نے یوں کیا ہے۔ 'میں انتساب سے قوم کی خدمت کا عہد کرتا ہوں'۔

Thought of visibility was poor کا ترجمہ 'حالانکہ اس کی نظر کمزور تھی' کیا ہے۔ لفظی ترجمہ کرنے سے فاش غلطیاں ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔ کسی نے Hold fast to truth کا ترجمہ 'سچائی کے لئے برت رکھنا' کیا ہے۔ اسی طرح Steel Plant کو فولاد کے پودے اور Outstanding Scientists کا ترجمہ 'باہر کھڑے ہوئے سائنسداں' کیا جاتا ہے۔ بہت سال پہلے میں نے ترجمہ سے متعلق عبدالمجید سالک کا ایک مضمون پڑھا تھا۔ میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے اور میں اپنے حافظہ کے بل بوتے پر لکھ رہا ہوں۔ سالک نے ترجمہ میں سلیس اور آسان زبان استعمال کرنے پر زور دیا ہے۔ انگریزی اور اردو کا موازنہ کرتے ہوئے عبدالمجید سالک نے لکھا ہے۔ انگریز مزاجاً مشکل پسند ہیں اور انگریزی زبان اس کی عکاس ہے۔ سالک نے زور دیا ہے کہ اردو ترجموں کو اس کی تقلید نہیں کرنی چاہیئے۔ انہوں نے انگریزی کی ایک خبر کا حوالہ دیا ہے۔ There was an explosion in a coalmine, with the result five men were killed. اردو کے ایک صحافی نے اس کا ترجمہ یوں کیا 'ایک معدن زغال میں دھماکہ ہوا' جس کے نتیجے میں پانچ نفوس کی ہلاکت وقوع پذیر ہوئی۔ عبدالمجید سالک نے اس کا یہ صحیح ترجمہ دیا ہے۔ ''کوئلے کی کان میں دھماکہ ہوا جس سے پانچ آدمی مارے گئے۔''

اصطلاحات بنانا بھی ترجمہ کی طرح ایک فن ہے۔ خاص کر سائنسی، ٹیکنیکی اور فلسفیانہ اصطلاحات کا ترجمہ کرنا اور ان کے مترادفات وضع کرنا خاصا مشکل اور محنت طلب ہے۔ جامع مترادفات اور اصطلاحات وضع کرنے میں اردو زبان نے آزادی سے پہلے اہم مراحل طے کئے ہیں۔ اس ضمن میں دارالترجمہ حیدر آباد نے قابل قدر کام کیا ہے۔ مولانا وحید الدین خان سلیم کی وضع اصطلاحات اس موضوع پر ایک معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔ مولانا نے اصطلاح وضع کرنے کے جو اصول مدون کئے ان پر آج بھی عمل ہوتا ہے۔ مولانا دارالترجمہ سے منسلک تھے۔ وہ اردو کے مختلف زبانوں کے الفاظ اور استعارات سے گل وگلزار بنانا چاہتے تھے اور ہندی کو اردو کی بقا کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ رقم طراز ہیں: اردو کے لئے ہندی ہم زاد زمین کے ہے۔ اس زمین پر فارسی اور عربی کے پودے لگائے گئے ہیں۔ اس تختے پر غیر زبانوں نے آکر گل کاری کی ہے۔ اگر یہ زمین نکال دی

جائے تو پھر اردو کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ اُس زمانہ میں مولوی عبدالحق نے اصطلاحات علمیہ اور اصطلاحات پیشہ وران وضع کیں اور کئی جلدوں میں شائع کیں۔ ترقی اردو بورڈ نے بھی اصطلاحات بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بورڈ نے فلسفہ کی جو اصطلاحات وضع کی ہیں، ڈاکٹر قمر رئیس کے مطابق اس میں ستر فیصد سے زائد دارالترجمہ حیدرآباد اور سابقہ انجمن ترقی اردو کی دین ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے انفرادی طور پر منطق، فلسفہ اور نفسیات کی متعدد اصطلاحیں وضع کیں۔ اصطلاح سازی ایک مسلسل عمل ہے۔ اور ہر زمانہ میں اس کی ضرورت رہے گی۔ انگریزی جیسی ترقی یافتہ زبان میں آئے دن نئے الفاظ اور اصطلاحیں بن رہیں ہیں۔ یا دوسری زبانوں سے شامل ہو رہی ہیں۔ ان کے مترادف بنانے کی ضرورت پڑے گی۔ اردو میں نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ اختراع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ جن میں بہت سارے مقبول ہوئے ہیں اور روزمرہ کی تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے افسانہ سے افسانچے اور خاکے سے خاکچے بنے ہیں۔ مختلف الفاظ سے فعل بھی بنائے جانے لگے ہیں۔ جیسے قوم سے قومیانا، برق سے برقانا، تلاش سے تلاشنا، محسوس سے محسوسنا اور تخلیق سے تخلیقنا بنائے گئے ہیں۔ صیغہ واحد سے جمع کا صیغہ بنا کر کالی سے کالیاں، گوشمالی سے گوشمالیاں اور بے خیالی سے بے خیالیاں بنائی گئیں ہیں۔ اسی طرح پانی سے پانیوں کی ترکیب بنائی گئی ہے۔ Globalisation کے لئے عالم گیریت اور Scenario کے لئے منظرنامہ شاید حال میں بنائے گئے ہیں۔ آج کم وبیش سارا ترجمہ انگریزی سے ہوتا ہے۔ انگریزی بین الاقوامی زبان کے ساتھ اب انٹرنیٹ کی زبان بھی ہے۔ یہ دنیا کے ۳۵ ملکوں کی سرکاری یا دوسری زبان ہے۔ چین، روس اور جاپان جیسے ملکوں میں کروڑوں لوگ انگریزی سیکھ رہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ صدی کے وسط تک انگریزی نے ہمارے اس سیارے پر اپنا سکّہ جما لیا ہوگا۔ انگریزی میں دوسری زبانوں کے الفاظ اخذ اور انجذاب کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اس زبان میں چند سال پہلے ہوئے ایک سروے کے مطابق ہر سال ۴۰۰۰ ہزار نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق آکسفورڈ ڈکشنری کے ۱۱ویں ایڈیشن میں ہندوستانی ماخذ کے ۹۰۰ الفاظ دئے گئے ہیں روزمرہ نئے الفاظ کی ترویج سے آکسفورڈ ڈکشنری میں بہت سارے نئے الفاظ نہیں ملتے اور ہر دوسرے تیسرے سال نیا

ایڈیشن نکالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اسی ڈکشنری سے انجمن ترقی اردو ہند کی انگریزی اردو لغت مرتب کی گئی ہے۔فوبیا Phobia (کسی چیز سے خوف اور نفرت) کی اصطلاحات کی تعداد اب ۵۳۰ تک بڑھی ہے۔ پہلے Xenophobia (اجنبیوں اور غیر ملکیوں سے خوف و نفرت) Hydrophobia (پانی سے فوبیا) Cloustophbia یعنی بند جگہوں سے گھٹن کی فوبیا، Agarophobia کھلی جگہوں سے فوبیا جیسے چند فوبیا کی اصطلاحات تھیں۔ اب Bibliophobia (کتابوں سے فوبیا) Phobophobia (خوف سے خوفزدہ ہونا یا اس کی فوبیا)، چاقو، تیرہ کا ہندسہ، پل پار کرنا، سرخ رنگ، خون، کثافت، سانپ، کتا، مکڑا، اونچی آواز، تاریکی میں شور، لمبے الفاظ وغیرہ کی فوبیا کی اصطلاحیں بنی ہیں۔اب تو سیل فون اپنے ساتھ نہ ہونے سے جو بے چینی ہوتی ہے، اس فوبیا پر بھی اصطلاح بنی ہے۔میں نے بہت سال پہلے پڑھا تھا کہ انگریزی میں سائنس اور ٹکینالوجی کی اصطلاحات سمیت کل ۷ لاکھ الفاظ ہیں تب سے بے شمار الفاظ کا اضافہ ہوا ہوگا۔اردو میں الفاظ شماری کا کام نہیں ہو رہا ہے۔تقریباً ۳ دہائیاں پہلے حسن الدین احمد نے اردو الفاظ شماری کی تھی اور علمی اور پیشہ وارانہ اصطلاحات، محاروں اور بول چال کے الفاظ کے بغیر ۵۵ ہزار الفاظ تعین کئے تھے۔جن میں سے ۷ فیصد یورپی الفاظ تھے۔

فیروز اللغات کے نئے ایڈیشن کے سرورق پر لکھا ہے کہ تازہ ایڈیشن میں ایک لاکھ ۲۵ ہزار سے زائد الفاظ، مرکبات، ضرب الامثال اور علمی، ادبی اور فنی اصطلاحات دی گئی ہیں کسی نے درست کہا ہے کہ دنیا کے سب سے حیرت انگیز کرتب لفظوں کا سرکس پیش کرتا ہے۔انگریزی کے بہت سارے الفاظ کے معنی تہ در اور متنوع ہیں۔اردو میں ان کے موزوں اور برمحل مترادفات نہیں ہیں۔اردو لغات میں ان کے سادہ معنی دیئے گئے ہیں۔مثلاً Dodgy کے اردو مترادف حیلہ جو اور بہانہ ساز دیئے گئے ہیں۔جب کہ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کا مفہوم ایک ایسا شخص بتایا گیا ہے، جس کا میلان طبع بددیانتی کی طرف ہو یا جو دیانت دار بن سکتا ہے۔Paranoia کا مطلب اردو لغت میں امیری کا وہم اور امارت سے مراد لیا گیا ہے۔جبکہ اس کا مفہوم زیادہ تہ در ہے۔Paranoia کا شکار ایک شخص اپنے آپ کو اہم ہستی سمجھتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ لوگ اس کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ حقارت سے

پیش آتے ہیں۔ Goody Goody کا مطلب ایک ایسا شخص ہے جو اپنے دکھاوے اور نمود و نمائش سے اپنے آپ کو نیک اور معزز ظاہر کرے۔ ایسے چند اور الفاظ ملاحظہ ہوں: Prevaricate مبہم یا گمراہ کن انداز بیان سے سچائی یا حقائق چھپانے کی کوشش کرنا ہے Equivocate اس کا متضاد لفظ ہے۔ یعنی واقعات اور حقائق کو صاف صاف بیان کرنا۔ Pontificate کوئی شخص یوں بولے گویا وہ اکیلا حقائق سے واقف ہے یا کسی امر سے متعلق اپنے کو صائب الرائے سمجھے۔ Myrinidons بلا کسی حیل و حجت کے حکم ماننے والا ہے۔ Placebo ایک شخص کو جسے بیماری کا وہم ہے، تسکین اور تسلی کے لئے بے ضرر سی چیز بطور دوائی کھلانا یا محض کسی اور یا اس شخص کے کسی مسئلے پر اطمینان کے لئے کوئی بات کہنا یا کام کرنا ہے۔ انگریزی میں ایسے سینکڑوں الفاظ ہیں۔ اردو کے محققوں، اسکالروں اور اصطلاحات وضع کرنے والوں کو ان الفاظ کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ کئی دفعہ ایک چھوٹی سی زبان یا Dialect بولی میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں۔ جو ایک بڑی زبان میں پائے نہیں جاتے۔ اردو اور ہندی تو بہر حال بڑی اور ادبی زبانیں ہیں۔ انگریزی میں جیٹھ جیٹھانی۔ جیجا، چچیرا، ممیرا، خلیرا، پھوپھیرا، بھائی بہن جیسے ہندی اردو الفاظ کے لئے موزوں اور مانوس متبادل الفاظ نہیں ہیں۔

امریکہ میں مقیم اردو کی ایک ادبیہ سلطانہ مہر نے اپنی زیر تصنیف کتاب کے لئے ایک سوال نامہ جاری کیا تھا۔ موصوفہ نے اس کی ایک نقل مجھے بھیجی تھی۔ ایک سوال اردو میں الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے سے متعلق تھا۔ میں نے ہندی کے تین الفاظ چنوتی (چنوتی اردو میں بطور چیلنج کے ہم معنی کم سہی، استعمال ہوتی ہے) یوگ دان اور پریرنا اردو میں استعمال کرنے کی تجویز کی تھی۔ Contribution کے لئے اردو میں مترادف لفظ نہیں ہے اور اس لفظ کو اجاگر کرنے کے لئے جملے کو Twist جداگانہ روپ دینا پڑتا ہے۔ جب کہ ہندی میں اس کے لئے یوگ دان ہے۔ میرا خیال ہے کہ صوتی اور معنوی لحاظ سے یہ لفظ اردو کے لئے نامانوس نہیں ہے اور اردو میں کھپ سکتا ہے۔ اسی طرح Inspiration کے لئے ہندی میں موزوں اور برمحل لفظ پریرنا ہے اردو میں ہم اس کے لئے تحریک کا لفظ استعمال کرتے ہیں کئی دفعہ جملوں کی ساخت میں تحریک نامانوس اور غیر موزوں لگتا ہے پریرنا برمحل مترادف ہونے کے ساتھ اس لفظ میں نغمگی اور شیرینی ہے۔ اگر مترادف موزوں نہ ہوں تو سند قبولیت نہیں پاتے ایسے

بہت سارے الفاظ ہیں جنہیں قبول عام نہیں ملے ہیں جیسے آکسیجن کے لئے مائین اور ہائیڈروجن کے لئے حمفین پنپ نہیں سکے جب کہ وٹامین اور پروٹین کے لئے حیاتین اور لحمین استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہنی مون کے لئے ماہ عسل اور کینسر کے لئے سرطان مقبول نہیں ہوسکے۔ میر حسن اپنے مضمون میں ''اردو اصطلاحات۔ اہمیت اور وسائل'' میں لکھتے ہیں۔ 'تھرمامیٹر کا متبادل ابتدا میں ترقی اردو بورڈ نے تابدرجہ نمار کھا۔ اس کے بعد مقیاس الحرات بنایا۔ پھر حرارت پیما اور بلآخر تپش پیما بنایا۔ لیکن تھرمامیٹر ہی استعمال ہوتا ہے۔ Political Economy کا ترجمہ بالترتیب، علم انتظام مدن، علم سیاست مدن، علم الاقتصاد اور اقتصادیات بنایا گیا۔ آخر کار معاشیات پر ختم ہوا اور یہی اصطلاح مقبول اور مستعمل ہے۔

اردو میں ہندی الفاظ کے ساتھ عربی اور فارسی سابقے اور لاحقے کامیابی سے استعمال کئے گئے ہیں۔ جسے سمجھدار۔ بے چین، اگل دان وغیرہ اردو کا جنم نشو ونما اور ارتقاء ایک مشترکہ تہذیب کے سایہ میں ہوا ہے اور اردو ادب وحدت میں کثرت کی علامت ہے اس میں ہر قسم کے مضمون کا ترجمہ کرنے کے لئے الفاظ کا ذخیرہ ہے اور اس کی ساخت اور مزاج اصطلاحات اور مترادفات بنانے کی راہیں پیدا کرتا ہے۔

......●●●......

☆☆☆

☆......عبدالغنی شیخ

تبت میں آباد کشمیری مسلم

مغربی تبت اور لداخ سے صدیوں سے کشمیر پشمینہ درآمد ہوتا رہا ہے۔ جس سے نادر، نفیس اور دلکش شالیں بُنی جاتی ہیں۔ جن کی شہرت چاردانگ عالم میں ہے۔ پشمینہ نے کشمیر، لداخ اور تبت کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

بودھ کشمیر کے دور میں کشمیر سے بہت سارے پرچارک لداخ اور تبت آئے ہیں۔ تبت آنے والوں میں بنگال کے معروف رشی اتیشا اور سوات کے تانترک عالم گورو پدما سمبھوا شامل ہیں۔

مغربی تبت کے حکمران ایشے اودے ۹۷۵ء یا ۹۷۶ء میں اکیس طلبہ بودھ دھرم کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے کشمیر بھیجے۔ ان میں دو طلبا رینچن زنگپو اور لقسپا شیرپ تبت لوٹے۔ کشمیر میں رینچن زنگپو نے پنڈتا گونا میترا اور پنڈتا کمالا گپتا سے علوم حاصل کئے۔

۹۹۶ء میں رینچن زنگپو دوبارہ کشمیر گئے۔ ان کا ایک مشن کشمیر سے اہم پنڈتوں کو مدعو کرنا تھا۔ اب کے ان کے ساتھ پندرہ طلبا تھے۔ چھ سال بعد جب وہ لوٹے تو ان کے ہمراہ ۳۲ کاریگر، معمار اور مصور تھے۔ کئی مورخوں نے یہ تعداد ۴۶ بتائی ہے۔ انہوں نے لداخ، مغربی تبت اور سپیتی میں بالترتیب الچی، تھولنگ اور تابو کے مقامات پر اہم وہار تعمیر کئے، جو آج بھی مشہور ہیں۔

سرینگر سے ۱۸ رکلومیٹر دور کھونمو گاؤں کے پاس ایک پہاڑی گپھا ہریش ور میں معروف ریشی ناروپا مراقبہ کرتے تھے۔ لداخی اور تبّتی اس گپھا کو نارو پے ٹوپھوک کہتے ہیں۔ ناروپا بنگال سے کشمیر اور لداخ آئے تھے۔ رینچن زنگپو نے ان سے یوگا کا گیان حاصل کیا۔

رینچن زنگپو نے جو تبت اور لداخ میں لوژ اوا یعنی چشم بینا رینچن زنگپو کے نام سے مشہور ہیں، تین مرتبہ کشمیر آئے اور 22 سال اپنے وطن مغربی تبت سے باہر رہے۔

تبت اور اسلامی دنیا کے مابین گہرے تعلقات تھے۔ ان کا پہلا رابطہ ساتویں صدی کے اختتام پر ہوا۔ جب خلافت عباسیہ کی سلطنت کی حدود پھیل رہی تھیں۔ عرب مورخ یعقوبی کے مطابق تبتیوں نے خراسان کے عرب گورنر کے پاس ایک سفیر بھیجا اور ایک معلم بھیجنے کی درخواست کی۔

بارھویں صدی کے دوسرے نصف کے دوران عرب تاجر بغداد سے ایران، غزنی اور سمرقند سے ہوتے ہوئے تبت جاتے تھے۔ عرب ممالک میں تبت کے مشک نافہ کا شہرہ تھا، جو ادویات بنانے کے کام بھی آتا تھا۔

عرب مورخین البیرونی، مسعودی، طبری، عسقلانی اور ابن خلدون نے تبت کا تذکرہ کیا ہے۔ اندلس کے جغرافیہ دان ابن سعد نے لکھا ہے کہ وسط ایشیا میں اسلام کی اشاعت کے بعد تبت میں اسلام پہنچا اور آٹھویں صدی کی دوسری دہائی میں عرب خلیفہ مامون الرشید اور تبت کے درمیان سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم ہوئے۔

ایک عرب مورخ ابوسعید عبدالحی غرداز کا نے دعویٰ کیا ہے کہ یمن کے ایک قدیم بادشاہ نے تبت پر حکومت کی اور تبت کا نام اس کا دین ہے۔ اس بادشاہ کا نام تب الاقرن بتایا گیا ہے۔ تاہم ابن خلدون نے اپنے مشہور تاریخی مقدمہ میں یمن کے بادشاہ کی حکمرانی اور وجہ تسمیہ کو خارج از امکان قرار دیا ہے۔

منگول حملوں کے بعد تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے درمیان عربوں اور تبت میں تعلقات رہے۔

اسلام اور تبت کے درمیان ثقافتی تعلقات کے بارے میں لندن یونیورسٹی کے WARBURG انسٹی ٹیوٹ میں نومبر 2006ء میں تین روزہ ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں کئی سکالروں نے اپنے مقالے پیش کئے جو Islam and Tibat Interactions- Along the Musk Routes کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مسلم کشمیر کا بھی تذکرہ ہے اور اسلام اور تبت کے تعلقات کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تب تبت اور

اسلامی دنیا کے مابین تبادلہ خیال اور باہمی گفتگو کا اہم ذریعہ فارسی تھا۔

تبّتی کشمیری مسلمان کو خاچے کہتے ہیں اور اسی نسبت سے لداخ میں کشمیر کو خاچُول کہا جاتا ہے۔

تبت اور کشمیر کے تعلقات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ کشمیریوں نے تبت کو اپنا وطن بنایا اور تبت کی زبان اور ثقافت کو اختیار کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح تاجیک، ازبک، افغان، کرغیز اور عرب اپنی فتوحات کے بعد ہندوستان میں بس گئے تھے اور خلجی، تغلق، لودھی، سوری اور مغل خاندانوں کے نام سے ہندوستان پر حکومت کی تھی۔

کشمیری تاجر سولھویں صدی کے آخری ربع میں نیپال، تبت، سنٹرل ایشیا اور شمال مغربی چین تک جاتے تھے۔ جو بیسویں صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ یہ تاجر مہم جو قسم کے افراد ہونے چاہئیں جو اس زمانے میں ان دشوار گزار علاقوں میں طویل سفر کرتے تھے۔

کشمیریوں نے قحط سالی میں بھی تبت کی راہ اختیار کی اور ظالم حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آکر کچھ لوگوں نے تبت میں پناہ لی۔ سترھویں صدی میں تبت کے مذہبی رہنما پانچویں دلائی لامانے ان کو خاص مراعات دیں۔

کشمیریوں نے تبتیوں اور یورپیوں کے درمیان ثالث اور درمیانہ دار کا کام بھی سرانجام دیا ہے۔ لداخ کی تاریخ پر نظر رکھنے والے ایک انگریز جان بیرے اس ضمن میں لکھتا ہے:

> ''کشمیریوں کے بین الاقوامی رابطے اور تبّتی اور فارسی دولسانی صلاحیت کی وجہ سے ابتداء میں خطے میں آنے والے مغربی مسافروں کے تئیں ان کی مددکار آمد تھی۔''

سترھویں صدی میں تبت اور کشمیر کے تعلقات میں ایک نیا موڑ آیا، جب کشمیری تبت میں مستقل طور بس گئے۔ مقامی عورتوں سے شادی کی۔ تبّتی زبان، خوراک اور کلچر کو اپنایا۔ البتہ اسلامی تشخص کو قائم رکھا۔ مسجدیں تعمیر کیں۔ تبّتی سماج میں ان کا اچھا مقام تھا۔

پانچویں دلائی لامانے کشمیری مسلمانوں کی آبادکاری، مسجدیں تعمیر کرنے اور قبرستان کے لئے زمین دی۔ انہیں پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ شرعی طور اپنے مسائل حل کرنے کے لئے

مسلمانوں کی ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی۔

ایک تبّتی ڈاکٹر ابو بکر امیر الدین نے اپنی کتاب ''تبت اور تبّتی مسلمان'' (مطبوعہ 1979ء) میں لکھا ہے کہ دلائی لاما کی ہندوستان روانگی سے پہلے 1959ء میں تبت میں تین ہزار کشمیری آباد تھے۔ جن میں کچھ لداخی بھی تھے، جو کشمیری الاصل تھے۔ یہ کشمیری تجارت کے سلسلے میں لداخ جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سارے وقتاً فوقتاً لداخ میں بس گئے اور تبّتی کشمیریوں کی طرح مقامی عورتوں سے شادی کی۔ لداخی زبان، خوراک اور ثقافت اختیار کی۔ سترھویں صدی میں لداخ کے راجا جمیا نگ نمگیل نے چھ کشمیری مسلم تاجروں کو لیہہ میں بسایا۔ یہ تاجر خر چھونگپا یا شاہی تاجر کہلاتے تھے۔ ان کو مغربی تبت کے سرمائی صدر مقام رُودوق میں مکانات تعمیر کرنے کے لئے لداخی راجا نے زمین دلوائی۔ رُودوق تجارتی مرکز بھی تھا۔ کئی کشمیری مسلمانوں کو مختلف فرائض نبھانے کے لئے لیہہ مدعو کیا۔ ان میں ایک منشی تھا، جو کشمیر کے مغل گورنر سے فارسی میں خط وکتابت کرتا تھا۔ اس خاندان کے کئی افراد تبت تجارت کے سلسلے میں جاتے تھے۔ لہاسہ اور شیگھاچے میں ان کی دکانیں تھیں۔ اس خاندان کے چند افراد تبت میں مستقل طور بس گئے۔ ایک کشمیری اسماعیل ذرگر کو سکہ ڈھالنے کے لئے لیہہ میں بسایا۔

کشمیری تبت میں راجدھانی لہاسہ، دوسرا بڑا شہر شیگھاچے اور زی تھنگ میں آباد تھے۔ ان مقامات پر مسجدیں بھی تھیں۔ ڈاکٹر ابو بکر کے مطابق چینی نسل کے نوسوہُن مسلمان بھی تبت میں بستے تھے۔ کشمیری اور لداخی مسلمانوں نے ایک مدرسہ کھولا تھا۔ جس میں دینیات اور اردو پڑھائی جاتی تھی۔

پانچویں دلائی لاما سے پہلے تبت میں کشمیری مسلمان موجود تھے۔ اس کا ذکر پرتگال کے مشنری کے پادری فادر دے اندرادے نے 1624 میں کیا ہے۔ یہ مغربی تبت کے ژھپرانگ میں بسے تھے اور تجارت کرتے تھے۔ ژھپرانگ کے راجا نے کئی امور میں ان کی رہنمائی کے لئے فارسی میں ایک ہدایت نامہ جاری کیا تھا۔ تین سال بعد 1627ء میں ایک اور پادری فادر CACELA نے ژھپرانگ میں کشمیری تاجر دیکھے۔ ان کی تجارت سنٹرل تبت میں لہاسہ اور گیانگچے تک پھیلی تھی۔ تب لہاسہ میں مسلمان بستے تھے۔

یونان اور ڈنمارک کے شاہزادہ پیٹر رقم طراز ہے:

''کشمیری مسلمان شروع میں تاجر کی حیثیت سے تبت آئے۔ تاہم عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ پانچویں دلائی لاما نے مغلیہ شہنشاہ کو لہاسہ مشیر بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ دلائی لاما چاہتے تھے کہ ان کے دربار میں ہر ملک کا نمائندہ ہو۔''

شاہزادہ پیٹر 1938ء میں لیہہ آیا تھا اور لیہہ کی معاشرتی زندگی کا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے لیہہ کے چھ خاندانوں کے رہن سہن، آمدن اور سماجی حالات کا سروے کیا اور اس کی رپورٹ شائع کی۔

ایک فرانسیسی تذکرہ نگار Mare Gaborieau نے لکھا ہے کہ پٹنہ سے ایک صوفی منش مسلمان خیرالدین پانچویں دلائی لاما کے عہد میں لہاسہ وارد ہوئے اور دلائی لاما کو اپنی کرامات دکھائیں۔ جن سے بودھ رہنما متاثر ہوئے۔ اپنی تصنیف RECIT d'UNJ VOYAGEUR MUSULMAN AU TIBET PARIS,(1973) میں وہ رقم طراز ہے کہ پانچویں دلائی لاما نے خیرالدین کے ہاتھ خفیہ طور اسلام قبول کیا۔ لیکن یہ بات غلط لگتی ہے۔ دلائی لاما کی سوانح حیات سے عیاں ہے کہ وہ تادمِ حیات بودھ دھرم پر قائم رہے۔ 1681ء میں دلائی لاما کی لداخ پر فوج کشی کے بعد لداخ اور تبت کے رشتے میں دوری پن آیا۔ لداخ میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر دلائی لاما نے 1684ء میں تبت کے دوسرے بڑے مذہبی رہنما ڈوگچین رینگبو چھے کو لداخ روانہ کیا تاکہ تبت اور لداخ کے دیرینہ مذہبی اور ثقافتی تعلقات برقرار رکھیں۔ ڈوگچین رینگبو چھے نے لداخی راجا سے ایک گاؤں تینگ موگانگ میں ملاقات کی اور دلائی لاما کا پیغام پہنچایا۔ ڈوگچین رینگبو چھے کا لداخی حکمران اور لوگوں پر اپنا بھی اچھا اثر ورسوخ تھا۔ لداخی راجا نے ان کی ہدایات مان لیں اور دیرینہ تعلقات بحال ہوئے اور دلائی لاما کی تشویش ختم ہوئی۔

اٹھارویں صدی بھی تبت میں یورپیوں کی آمدورفت رہیں۔ 1707ء میں اطالوی تبلیغی مشن CAPUCHIN کی لہاسہ آمد پر پہلے آرمیانی تاجروں بعد میں کشمیری تاجروں نے مدد کی۔ ایک کشمیری تاجر یوسف نے مشنری کو روم سے لہاسہ رقم لانے کا بندوبست کیا۔

1715-16ء میں ایک نئی مشنری فادر IPPOLITO DESIDERI اور فادر MANOEL FREYER کشمیر اور لداخ سے ہوتے ہوئے سینٹرل تبت پہنچے۔ انہوں نے اپنے

ساتھ بطور گائیڈ ایک فارسی دان لایا تھا۔[1] لداخ میں انکی ملاقات ایک کشمیری سے ہوئی۔ جو تبت سے آیا تھا۔ اس نے ان کو بتایا کہ سینٹرل تبت میں اس نے چند یورپیوں کو دیکھا، جو تبتیوں میں دوائیاں بانٹ رہے تھے۔ یہ کاپوچین مشنری کے ارکان تھے۔

1775ء میں جارج بوگلے برطانوی ہند گورنر جنرل وارن ہیسٹینگز کے نمائندے کی حیثیت سے تبت پہنچا اور ٹشی لومبو میں تیسرے پنچن لاما کے دربار میں حاضری دی۔ بوگلے نے مشاہدہ کیا کہ کشمیری خطے میں مستقل طور آباد ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''تبت میں آباد کشمیری زیادہ تر تبتیوں کی اولاد ہیں۔۔۔ وہ عرصہ دراز سے یہاں آباد ہیں۔ اپنے وسیع کاروبار سے انہوں نے جو دولت بنائی ہے۔ یہاں کے لئے باعزت زندگی گزارنے کا وسیلہ ہے۔''

جان بیرے لکھتا ہے۔ یہ فارسی دان منشی کشمیری ہونا چاہئے۔

1789ء میں ٹشی لومبو کے ایجنٹ نے دو کشمیری محمد رجب اور محمد ولی کو کلکتہ میں انگریز گورنر جنرل لارڈ کارنیوالس کو خطوط لینے کے لئے انتخاب کیا تھا۔

انگریزی حکومت کے ہندوستانی ملازم بھی سفارتی کام کرتے تھے۔ عبدالقادر خان کٹھمنڈو میں انگریز سرکار کا ایجنٹ تھا۔ اس کی سفارش پر 1792ء میں ایک کشمیری مسلمان سلمان کو انگریزوں نے ملازم رکھا۔ سلمان چینی، تبّتی اور نیپالی زبانیں جانتا تھا اور بطور تبّتی مترجم کام کرتا تھا۔

ایک محقق Marc Gabor Leau اس ضمن میں لکھتا ہے:

''مسلمان (کشمیری مسلمان) تبت اور مغرب کے درمیان Indispensable Intermediaries (ناگزیر درمیانہ دار) تھے۔ مغربی سیاح فارسی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ یہ مغلوں کی سرکاری اور درباری زبان تھی اور مشرق کے بڑے علاقے میں مروّج تھی۔ مشنری پادری مسلمان

---

1. Early Jesuit Travellers in Central Asia (1924) by Cornelius Wessels'

سوداگروں کا سا لباس پہنتے تھے۔ انہوں نے مسلمان رہبروں کو استعمال نہیں کیا بلکہ ان کا طور طریقہ اور زبان اختیار کی اور ان کی آنکھوں سے تبت کو دیکھا۔ مسلمان ناگزیر ثقافتی درمیانہ دار بھی تھے۔"

اسی سلسلے میں جان بیرے نے لکھا ہے کہ کشمیری تاجران انگریزوں کو خطے کے بارے میں معلومات فراہم کرتے تھے اور Diplomate go between (سیاسی ثالث) کا کردار ادا کرتے تھے۔ کئی دفعہ کشمیری خطرہ بھی مول لیتے تھے۔ جیسا کہ ایک کشمیری تاجر احمد علی کو ایک انگریز ولیم مور کرافٹ کے ساتھ رابطہ رکھنے پر انگریزوں کے جاسوس ہونے کے الزام میں لہاسہ میں قید کیا گیا۔

1846ء میں دو فرانسیسی پادری REGIS EVARISTE HUC اور JOSEPH CABET شمال مشرقی چین سے لہاسہ گئے۔ ان کی معاونت کے لئے لہاسہ کے کشمیری مسلمانوں کے لیڈر کو نامزد کیا۔ جو ان کے اور لہاسہ سرکار کے مابین بطور درمیانہ دار کام کرنے لگا۔ اس نامزدگی کا بڑا سبب کشمیریوں کی فارسی اور تبّتی زبانوں کی جانکاری ہوسکتا ہے۔ یورپی بھی فارسی سیکھتے تھے۔ کیونکہ فارسی برصغیر ہند کی تب سرکاری زبان تھی۔ 1822ء میں ہنگری کا عالم سوماڈی کوروس Cosoma de Koros لداخ آیا اور فارسی اور تبّتی جاننے والے شخص سے استفادہ کیا۔ سوما نے اس کی ذہانت کی تعریف کی ہے۔ غالباً یہ لیہہ میں مقیم ایک کشمیری ہوسکتا ہے۔

کٹھمنڈو میں مقیم ایک کشمیری خواجہ غلام محمد نے 1886ء میں لہاسہ کا سفر کیا۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کو خوشحال پایا اور مشاہدہ کیا کہ تبّتی بودھ ان کی عزت کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے پہلے ربع کے دوران نیپال اور برطانوی ہند کے درمیان جنگ کی وجہ سے چین کی مانچو حکومت نے اپنے لہاسہ کے امبان (افسر اعلیٰ) کو حکم دیا کہ تبت میں یورپیوں کے داخلہ پر پابندی لگائی جائے۔ تاہم کشمیری تاجروں کے لئے تبت میں آوا جاہی جاری رہی۔ ان سے معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں والٹر ہملٹن کے ایسٹ انڈیا گزیٹر میں لہاسہ میں مقیم کشمیری تاجر عبدالرسول کی فراہم کردہ معلومات موجود ہیں۔ عبدالرسول کا کوچ بہار میں تعینات انگریز اہلکار نارمن میکلیوڈ سے رابطہ تھا۔ یہ 1816ء کے آس پاس کی بات ہے۔ عبدالرسول نے سونے کی

کانوں، درآمدات، برآمدات اور ٹیکسوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ان دنوں صرف لہاسہ میں ڈھیڑ سو کشمیری تھے۔ کشمیری تاجران کشمیر سے شالیں، نمدے، زعفران اور خشک پھل لاتے تھے اور تبت سے چاندی کی سلاخیں اور چائے برآمد کرتے تھے۔ سالانہ ڈھیڑ لاکھ روپیہ کی مالیت کی خالص چائے کشمیر برآمد کی جاتی تھی۔ جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔

برطانوی ہند اور نیپال کے درمیان جنگ کے دوران ایک انگریز افسر ولیم مورکرافٹ سے احمد علی ملا۔ احمد علی پٹنہ میں کشمیری تجارتی ہاؤس سے وابستہ تھا۔ یہ تجارتی ادارہ پٹنہ میں دو صدیوں سے قائم تھا اور اس کی شاخیں کشمیر سمیت نیپال، لہاسہ، چین کے کانسو صوبہ کے شہر سینینگ اور ڈھاکہ میں تھیں۔ پٹنہ میں یہ اودبلاؤ کی کھالیں جمع کرتا تھا اور نیپال کے راستے تبت اور چین بھیجتا تھا۔ جہاں سے اس کے تبادلے میں سونا آتا تھا۔

احمد علی نے پہلی ملاقات میں مورکرافٹ کو یہ انکشاف کیا کہ نیپال کے مہاراجا نے لہاسہ کے امبان کے ذریعے چین کے شہنشاہ کو خط بھیجا ہے۔ جس میں درخوست کی گئی ہے کہ نیپال اور انگریزوں کے درمیان امکانی جنگ کی صورت میں نیپال کی مدد کی جائے۔ مورکرافٹ نے اپنے اعلیٰ افسر کو اس کی اطلاع دی اور یہ بھی لکھا کہ اس خبر کی صداقت اور عدم صداقت کی تصدیق کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

مورکرافٹ نے احمد علی سے دوسری ملاقات کے دوران دریافت کیا کہ لہاسہ میں تجارت کے سلسلے میں مقیم ایک تاجر کو حکومت کے اہم سیاسی راز کا علم کیسے ہو سکتا ہے تو احمد علی نے جواب دیا، ''لہاسہ میں اس کا تجارتی ہاؤس دو صدیوں سے قائم ہے۔ اس کے ممبروں کو مقامی اور طبعی باشندے قرار دئے گئے ہیں۔ دلائی لاما کا دربار ان کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔ جب کبھی وہ جاتے ہیں تو دلائی لاما ان کی قدر کرتے ہیں۔''

مورکرافٹ رقمطراز ہے:

''نفع بخش تجارتی ادارہ ہونے کی وجہ سے امبان (چینی افسر اعلیٰ)، ان کا بڑا خیال رکھتا تھا اور مقامی کشمیریوں کو ہر اُس واقعہ کا علم ہوتا ہے، جو پڑوس کے ملکوں

پراثرانداز ہوتا ہو۔"

تیسری ملاقات پر احمد علی نے مور کرافٹ کو خط کا متن دکھایا۔ جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ مور کرافٹ کو یہ مصدقہ لگا۔ البتہ احمد علی نے مور کرافٹ کے منشی کو خط پڑھنے نہیں دیا۔

چین کے شہنشاہ نے جواب میں نیپال کے راجا کو مدد کا یقین دلایا تھا۔ بعد میں تبّتی حکومت نے احمد علی کو انگریزوں کے لئے جاسوسی کرنے کے الزام میں قید کیا۔ تاہم کٹھمنڈو میں انگریز کارگزار ریذیڈنٹ Brain Hodghton Hodgson کی کوشش سے وہ رہا ہوا۔

کشمیری تاجروں کے علاوہ ہندوستان سے گوسائیں (سادھو یا فقیر) تبت یاترا پر آتے تھے۔ وہ تجارت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے بھی انگریزوں اور تبتیوں کے مابین درمیانہ داری کا کام کیا ہے۔ تاہم ایک مرحلہ پر ان پر تبتیوں کا بھروسہ اٹھ گیا۔ انہیں ایسا لگا کہ ان کا انگریزوں کے ساتھ زیادہ یارانہ ہے۔ البتہ کشمیریوں پر ان کا اعتماد تھا۔ عام کشمیری...... تبتیوں کے وفادار تھے اور تبّتی حکومت کے مفاد کے لئے کام کرتے تھے۔

1896ء میں ایک انگریز جارج لیٹل ڈیل کی سرکردگی میں ایک مہم خفیہ طور لہاسہ روانہ ہوئی۔ ایک لداخی رسول گلوان کاروان لیڈر تھا۔ لہاسہ سے وہ صرف 43 میل دور تھے کہ ان کو مسلح تبتیوں نے روک لیا۔ لہاسہ کے انتظامیہ کی طرف سے انہیں واپس کرنے کے لئے ایک کشمیری وہاب جو آیا۔ رسول گلوان نے اس کو پہچان لیا۔ وہ لیہہ بھی آیا تھا۔ جب رسول اور اس کے لداخی ساتھیوں نے وہاب جو سے پوچھا کہ لہاسہ کتنا دور ہے۔ تو وہاب جو نے جھوٹ بولا اور کہا کہ لہاسہ کئی پڑاؤ دور ہے۔

کشمیریوں اور کشمیری نسل کے لداخیوں نے تبت میں کئی اہم شخصیتیں پیدا کی ہیں، جن میں سب سے مشہور کشمیری نژاد کے مشہور اور مقبول تبّتی شاعر فضل اللہ کشمیری ہیں۔ ان کی کتاب "خاچے پھالو" کے اشعار اور کہاوتیں آج بھی تبت اور لداخ میں مشہور ہیں۔ وائکن نواز بھائی محی الدین اور بنسری نواز بھائی محمد مغل بڑے مقبول تھے۔ روسا اور امراء کے گھروں میں انہیں مدعو کئے جاتے تھے۔

مذہبی لیڈروں میں مولوی منشی بشیر احمد، حاجی عبدالغنی ننگرو اور پیر یورولا مشہور تھے۔ حاجی فیض اللہ اور خواجہ غلام محمد تیرھویں دلائی لاما اور خواجہ سراج الدین چودھویں دلائی لاما کے قریبی مسلمانوں

میں شمار کیے جاتے تھے۔

میں یہاں آٹھارویں صدی کے کشمیری نژاد نامور شاعر فضل اللہ کے بارے میں اپنے مطبوعہ مضمون سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

فضل اللہ تبّتی زبان کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو بھی جانتے تھے۔ ان کے برمحل اشعار کا موقع ومحل کے مطابق بے ساختہ حوالہ دیا جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں مذہب، زندگی، موت، مساوات، سماجی تفریق، قناعت، حاکم محکوم، اخلاقیات، بچوں کی تعلیم و تربیت، والدین کی خدمت اور مختلف موضوعات پر اشعار اور مقولے ملتے ہیں۔ 'خاچے پھالُو' کشمیری مسلم فضل اللہ کا مطلب دیتا ہے۔ پھالو سے مراد چند الفاظ بھی ہیں۔ اس طرح کتاب کا مطلب ''ایک کشمیری مسلم کی طرف سے چند باتیں'' ہے۔

لائبریری آف تبّتی ورکس اینڈ آرکائیوز دھرم شالہ کے ڈائریکٹر گیا ژ دچھرنگ لکھتا ہے:

''آٹھارویں صدی کا مجموعہ پندونصائح ''خاچے پھالُو'' تبت میں بڑا مقبول ہے۔ حتیٰ کہ آج کل بھی بڑے ذوق وشوق سے ان کے اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے۔''

ایک تبّتی سکالر ڈاکٹر داوانر بو نے خاچے پھالُو کا جزوی طور انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر رہے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

'''خاچے پھالو' تبت کے عام لوگوں کے خیالات اور احساسات کی گونا گونی، جیسے ان کی طاقت اور مجبوری، دانائی اور حماقتیں، معائب اور امنگیں، آدرش اور اوہام، سماجی قدروں اور ہتھکنڈوں، غرض ان کے مکمل طرز زندگی اور دنیا سے متعلق نظریات کو اجاگر کرتا ہے۔ اس سے پہلے ایک عام تبّتی کے فکر ونظر کی ایسی واضح اور رہنمایانہ نقشہ کشی اور کسی تصنیف میں نہیں ملتی ہے۔''

اس قسم کی سنجیدہ اور علمی تصنیف کو تبّتی اور لداخی میں لیکشت کہا جاتا ہے جو انگریزی TREATISE کا معنی دیتا ہے۔ مترجم رقم طراز ہے:

''تبت کے مقبول ترین سکشا لیکشت کے بعد شاید خاچے پھالو لوگوں میں

سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ تبّتی کلاسیکی ادب میں زیادہ اشاروں اور کنائیوں سے مبرا ایک عام فہم تخلیقی شاہکار پہلے کبھی موجود نہیں تھی۔ ایک مسلمان کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی اس نے ایک عام تبّتی کے دل کے تاروں کو چھوا ہے۔''

اپنی ماں کے نام اپنی تصنیف کا انتساب کرتے ہوئے داوا نربو لکھتا ہے:۔

''ماں کی نصیحتیں مجھے خاچے پھالُو کی یاد دلاتی ہیں۔''

فضل اللہ اپنی تصنیف میں اسلام کی بنیادی تعلیم وحدانیت کا پیغام دیتے ہیں۔

داوا نربو رقم طراز ہے:

''کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ساتویں دلائی لامانے اس میں سے ان سطور کو حذف کرایا، جن میں براہ راست اسلامی عقائد اور عمل پر زور دیا گیا تھا۔''

داوا نربو نے فضل اللہ کے اس عملی کام کو بودھ تبت میں اسلام کا مختصر Interval وقفہ کہا ہے اور مذہب اور سماج میں دلچسپی رکھنے والے ماہرین عمرانیات اور سماجیات کے لئے دوسری قوموں کے علوم اور حقائق کا خزینہ قرار دیا ہے۔

1959ء کے بعد متعدد تبّتی کشمیری تبت سے فرار ہوئے اور سرینگر، درجلنگ، کالمپونگ، نیپال اور سعودی عرب میں بس گئے۔ 1959ء میں ایک کشمیری کرنل پی۔این۔کول لہاسہ میں ہندوستانی کونسل جنرل تعینات ہوئے۔ انہوں نے اپنی کتاب Frontier Callings میں تبت میں آباد کشمیری مسلمانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ متعدد لداخی بودھ تھے جو تبت میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔ انہوں نے ان بودھوں اور جزوی طور کشمیری نسل کے مسلمانوں کے انخلا کے لئے چینی وزارت خارجہ سے خط وکتابت کی۔

آج بھی متعدد کشمیری اور لداخی تبت میں آباد ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق ان کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے۔ 'ثقافتی انقلاب' کے دوران مسجدیں بند کی گئیں۔ اب دوبارہ انہیں کھول دی گئی ہیں۔

......●●●......

اسرارالحق مجاز

ایک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا مہتاب
جیسے ملاّ کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں اور رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہے گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

☆

طلعت محمود نے اپنی دلکش آواز میں اسرارالحق مجاز کی اس مشہور نظم ''آوارہ'' کو چار چاند لگا دیا ہے۔ راقم الحروف اور لیہہ میں کلچرل اکیڈیمی کے افسر نوانگ چھرنگ شقسپو پاک، جرمن ریسرچ پروجیکٹ کی دعوت پر ایک سمینار میں شرکت کے لئے پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد پہنچے۔ شہر کے پوش علاقہ میں واقع پریزیڈنٹ ہوٹل کے بڑے ہال میں جب ہم نے قدم رکھا تو مجاز کی یہ نظم طلعت محمود کی آواز میں ہمارے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ شقسپو نے ہوٹل کے ایک ملازم سے کہا، بھئی، یہ گیت

اور نغمہ تو ہندوستان کا ہے۔ ملازم نے کوئی جواب نہیں دیا یا شاید زیرِ لب مسکرایا۔ جو بھی ہو، علم، ادب اور نغمے کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

'آوارہ' کا امریکہ کے نوبل انعام یافتہ شاعر ایلیٹ کے لندن میں اور فرانسیسی ادیب باؤدلیر کے پیرس میں رات کی چہل قدمی پر لکھے کلام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اردو کے شاعر زبیر رضوی نے لکھا ہے:

''1951 کا سال تھا، میں حیدر آباد میں ہائیر سیکنڈری کا طالب علم تھا۔ مجاز نئی نسل میں بڑے مقبول تھے۔ ان کی بے پناہ مقبول نظم 'آوارہ' ہمیں زبانی یاد تھی۔ لڑکوں کا ایک ہجوم تھا، جو مجاز کو گھیرے ہوئے تھا۔''

'غم دل وحشت دل' کے عنوان سے پروفیسر محمد حسن نے مجاز کی زندگی پر ایک ناول لکھا ہے۔

اسرار الحق مجاز نے جب آنکھیں کھولیں تو ہندوستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ نو آبادیاتی حکومت پوری طاقت سے اسے دبانے میں لگی تھی۔ جلیانوالا باغ کے المناک سانحہ، تحریکِ خلافت اور انقلابِ روس جیسے واقعات نے مجاز کے فکر و ذہن پر اپنا اثر ڈالا۔ 'ہندوستان چھوڑ دو' جیسی تحریک کے بعد برصغیر ہند آزادی سے ہم کنار ہو رہا تھا اور مجاز یونیورسٹی میں ایک مقبول اور خوش گلو شاعر کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ جب اس کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 'آہنگ' چھپ کر آیا تو اس کا خوب چرچا ہوا۔ مجاز کی نظموں اور غزلوں میں خوبصورت الفاظ اور دلکش تراکیب کے ساتھ آزادی کی تمنا اور نوجوانوں کی دھڑکن کو پیش کیا گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے طلباء اور طالبات کا ہیرو تھا اور اس کے مدمقابل دوسرا کوئی بڑا شاعر نہیں تھا۔ اردو کے بڑے نقاد پروفیسر آل احمد سرور اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مجاز شہاب ثاقب کی طرح جدید اردو شاعری کے افق پر چمکا اور بہت تھوڑے دنوں میں خاکستر ہو گیا۔ اس کی شخصیت میں ایک آن بان اور ایک معصوم اور ایک مخلصانہ وضع داری آخر تک رہی۔ وقتی سیاست اور ادبی سیاست دونوں سے وہ علاحدہ رہا۔ ہاں ایک سنہرے افق پر اس کی نظر برابر رہی۔ ہماری جدید شاعری میں اس کا کارنامہ بہر حال مسلم ہے۔''

ترقی پسند شاعروں میں فیض احمد فیض کے بعد مجاز کا نام لیا جاتا ہے جس کے سب سے زیادہ

اشعار زبان زد خاص و عام ہیں اور آج بھی گنگنائے جاتے ہیں۔ تاہم بنیادی طور وہ ایک رومانی شاعر ہے۔ جیسے اختر شیرانی رومانی شاعر ہے۔ اختر شیرانی کے کلام میں سلمٰی اور عذرا ہیں تو مجاز کے شاعری میں زہرہ جبیں اور ثریا ہیں۔ لڑکیوں سے خطاب ہو کر مجاز کہتے ہیں۔

تیرے ماتھے پہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا
تیرے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا ہے

مجاز اپنے انقلابی پیغام کو پیار و رومان کے قند و شہد میں ڈبو کر پیش کرتا ہے۔ اپنے رومانی اشعار کے سبب وہ اردو کے کیٹس کہلائے۔ فیض نے مجاز کو مطرب دلبراں کہا ہے۔

دلی میں مجاز کے قیام کے دوران اس کی نظم 'جشنِ سالگرہ' کے یہ اشعار بڑے مقبول ہوئے۔

چھلکے تیرے آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکے تیرے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

مجاز کی شخصیت پر کشش تھی۔ اس کے نظم پڑھنے کا انداز دلکش تھا۔ اس کی آواز میں جادو تھا۔ انھی صفات نے اس کو بڑا مقبول بنایا تھا اور ایک مقبول فلمی اداکار کی طرح اس کے بہت سارے Fans یا شیدائی تھے۔ اردو کی معروف خاتون افسانہ نگار عصمت چغتائی نے لکھا ہے:

"علی گڑھ یونیورسٹی اور لڑکیوں کے کالجوں میں لڑکیاں یہ جاننے کے لئے لاٹریاں نکالتی تھیں کہ مجاز سے عشق کرنے کا حق کس ایک خوش قسمت لڑکی کے حصے میں آتا ہے۔ لڑکیاں آئندہ اپنی اولادوں کے نام مجاز کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ اس کے اشعار تکیوں کے نیچے چھپا کر آنسوؤں سے سینچے جاتے تھے۔"

مجاز کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم 'یادیں' میں لکھتی ہیں:

"وہ استادوں کا منظورِ نظر تھا اور طلبا کے لئے باعثِ فخر۔ گرلز کالج میں ہر

زبان پر اس کے راگ تھے۔ مجاز کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ اس کا قد کتنا اچھا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کسی سے محبت تو نہیں کرتا؟ یہ لڑکیوں کے محبوب موضوع تھے۔"

لیکن قسمت مجاز پر مہربان نہیں رہی۔ وہ اپنی آئیڈیل لڑکی کو پا نہیں سکا۔ شراب کا سہارا لیا اور یہی کم عمری میں اس کی موت کا سبب بنا۔ اس لحاظ سے سعادت حسن منٹو اور اسرار الحق مجاز کی زندگی میں گہری مماثلت ہے۔ دونوں وجیہہ تھے۔ دونوں بڑے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ دونوں کو شراب کی لت پڑی اور اسے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ دونوں پر دیوانگی کا دورہ پڑا اور دماغی شفاخانہ میں زیر علاج رہے۔ دونوں 1955ء میں چل بسے۔ مجاز ہندوستان میں فوت ہوا اور منٹو کا انتقال پاکستان میں ہوا۔ جب مجاز نے چوالیس سال پورے نہیں کیے تھے اور منٹو تنتالیس سال کا تھا۔ مجاز 1911ء اور منٹو 1912ء میں پیدا ہوئے۔ آج دونوں کو برصغیر ہند میں بڑے پیار، قدر اور احساس محرومی سے یاد کیا جاتا ہے اور سبھی کہتے ہیں کہ اگر انہوں نے معمول کی طبعی عمر پوری کی ہوتی تو اردو ادب کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہوتا۔

مجاز ہمیشہ پیار و محبت کا طلب گار رہا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک سمینار ہو رہا تھا۔ جب ایک مقالہ نگار نے نفسیات پر اپنا مقالہ پیش کیا تو نفسیات کی طالبات اِسے سُننے کے لئے آئیں۔ مجاز کے مقابل ایک حسین و جمیل لڑکی بیٹھ گئی۔ مقالہ ختم ہونے کے بعد جب وہ لڑکی چلی گئی تو مجاز کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ مجاز احتشام حسین سے جو بعد میں بڑے نقاد ہوئے بولا۔ احتشام صاحب، یہ شعر ابھی ابھی ہو گیا ہے۔

کون اُٹھ کر چلا مقابل سے جس طرف دیکھئے اندھیرا ہے

یہ مجاز کی پہلی محبت تھی اور یہ لڑکی کنیز عطا اللہ تھی۔ کہتے ہیں، کنیز عطا اللہ نے مجاز کی شادی کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

مجاز کے لازوال عشق کا مرکز زہرہ انصاری تھی۔ وہ تحریک آزادی اور قومی لیڈر ڈاکٹر مختار الدین انصاری کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ زہرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خوبصورت، باذوق

اور آئیڈیل لڑکی تھی۔ مجاز کے اس گھرانے میں رسائی تھی اور بطور ایک خوش گو اور غنائی شاعر قدر کی جاتی تھی لیکن زہرہ انصاری کا اپنا آئیڈیل تھا۔ انصاری خاندان کا ایک لڑکا شوکت انصاری کیمبرج سے بار ایٹ لا کر کے آیا تھا۔ زہرہ کی شادی شوکت انصاری سے ہوئی۔ شوکت انصاری بعد میں کئی ممالک میں ہندوستان کے سفیر اور اڑیسہ میں گورنر رہے۔

جب زہرہ اور شوکت انصاری کی شادی ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی۔ مجاز کو بیماری کے عالم میں ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ایسے میں میاں بیوی گلدستہ لے کر مجاز کی عیادت کے لئے گئے۔

مجاز کے اس دور کے کئی اشعار زہرہ انصاری سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ جب زہرہ غالباً رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں ہوئی تھی۔ جیسے ؎

میں بہت سرکش ہوں لیکن ایک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

مجاز اپنی محبوبہ کے لئے آسمان سے تارے توڑ لانے کے لئے تیار تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے ؎

میرے پہلو بہ پہلو جب وہ چلتی تھی گلستان میں
فراز آسمان پر کہکشاں حسرت سے تکتی تھی
وہ میرا شعر جب مری ہی لے میں گنگناتی تھی
مناظر جھومتے تھے بام و در کو وجد آتا تھا

مجاز کی ایک دریافت آئی ٹی کالج کی طالبہ ثریا جبیں تھی۔ دراز قد حسین ثریا فارسی کی سکالر تھی۔ اس کے بارے میں مجاز کا ایک شعر ہے ؎

بھری محفل میں چھلکا جام آتشیں میں نے
زمین سے اڑ کے چومی ہے ثریا کی جبیں میں نے

لیکن مجاز اپنی بے ضبط زندگی، بیقراری اور جام و ساغر میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے نہ صرف

معاشی اعتبار سے لوگوں کا محتاج رہا بلکہ صحت بھی گئی اور دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اپنے بھائی کی زبوں حالی کا ذکر حمیدہ سالم نے بھی کیا ہے۔ مجاز نے بھی اپنی یاسیت، اضطراب اور دلی کیفیت کو ان اشعار میں پیش کیا ہے۔

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصل بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے
سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیئے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجئے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

میں نے کہیں پڑھا۔ ایک مرحلے پر اس کی ایک پرانی محبوبہ اس کی طرف مائل ہوئی۔ شاید اس نے اپنے شوہر سے طلاق تک لی تھی لیکن مجاز کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔ کہتے ہیں، اس کی ایک نظم کا یہ مصرعہ اس حالتِ زار کا دین ہے۔

اب تم آئی ہو تو کیا آئی ہو

یا یہ اشعار ہیں

خاک میں ملائی ہے جوانی میں نے شعلہ زاروں میں جلائی ہے جوانی میں نے
حسن نے جب بھی عنایت کی نظر ڈالی ہے میرے پیمانۂ محبت نے سپر ڈالی ہے
وہ گداز دلِ محروم کہاں سے لاؤں اب میں وہ جذبۂ معصوم کہاں سے لاؤں

مجاز لکھنؤ کے قریب ایک بستی ردولی میں ایک خوشحال زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن نازونعم سے گزرا۔ ان کے والد چودھری سراج الحق کی خواہش تھی کہ مجاز انجینئر بنے لیکن لاابالی اور آزاد طبیعت کا مجاز ادب سے ذوق رکھتا تھا۔ شروع میں شہید تخلص رکھا۔ ابتدا میں فانی بدایونی سے اپنے کلام کی اصلاح لی لیکن مجاز کے فطری مزاج کو دیکھتے ہوئے فانی نے صاف طور پر کہہ دیا:

"اسرار الحق، مجھ سے اصلاح نہ کیا کرو، میرا غم تمہاری خوشی کو روند ڈالے گا۔"

مجازؔ نے پھر کسی سے اصلاح نہیں لی اور خود کلام کہنے لگا۔ مجاز آل انڈیا ریڈیو کے جریدہ 'آواز' کا مدیر رہا۔ فلمی صنعت میں آیا اور ایک اخبار کی ادارت بھی کی لیکن اپنی سیمابی فطرت کی وجہ سے کہیں زیادہ ٹک نہیں سکا۔

اسرار الحق مجاز کی حاضر جوابی اور بزلہ سنجی کے بارے میں بہت سارے لطیفے ہیں۔ مجاز جب زیادہ پینے لگا تو ایک روز جوش ملیح آبادی بولا۔ ''مجاز، گھڑی رکھ کر پیا کرو۔'' جواب میں مجاز بولا، ''میرا بس چلے تو گھڑا رکھ کر پیوں۔''

اپنی نیم دیوانگی کے عالم میں مجاز ایک بار کسی مجلسِ وعظ میں پہنچ گیا۔ ان کے کسی جاننے والے نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔ ''مجاز، آپ اور یہاں؟''۔ ''جی ہاں''، مجاز نے سنجیدگی سے جواب دیا ''آدمی کو بگڑتے کیا دیر لگتی ہے بھئی۔''

مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھا تھا۔ ایک انجان آدمی اس کے ساتھ والی کرسی پر آبیٹھا۔ کافی کا آرڈر دے کر گنگنانے لگا۔

احمقوں کی کمی نہیں غالبؔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتا ہے

مجاز نے اس کی طرف دیکھ کر کہا، ''ڈھونڈنے کی ضرورت بھی کہاں آتی ہے حضرت۔ خود بخود تشریف لے آتے ہیں۔''

ایک دن فراقؔ گورکھپوری نے مذاقاً مجازؔ سے کہا، ''مجاز، تم نے کباب بیچنے کیوں بند کر دیے؟'' مجاز سنجیدگی سے بولا، ''آپ کے ہاں سے جو گوشت آنا بند ہو گیا۔''

اردو کا یہ باغ و بہار شاعر 5 دسمبر 1955ء کو شراب کے نشے میں دھت پایا گیا۔ سردی کا موسم تھا۔ بلرام پور کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ڈبل نمونیہ ہوا تھا۔ جانبر نہیں ہو سکا۔ ایک خبر کے مطابق آدھا شہر جنازہ میں شریک ہوا۔ میت کو کندھا دینے والوں میں اردو کے سرکردہ قلم کار ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، نیاز حیدر اور احتشام حسین شامل تھے۔

......●●●......

سال نامہ "ہمارا ادب"
کی بعض خصوصی اشاعتیں

☆ لوک ادب نمبر
☆ مشاہیرِ کشمیر نمبر (۲ جلدیں)
☆ شیرازہ، انتخاب نمبر
☆ جموں کشمیر نمبر (۵ جلدیں)
☆ شخصیات نمبر (۵ جلدیں)
☆ اولیاء نمبر (۵ جلدیں)
☆ ڈوڈہ نمبر
☆ مولانا رومی نمبر
☆ ہمعصر تھیٹر نمبر
☆ فیض احمد فیض نمبر
☆ سعادت حسن منٹو نمبر
☆ تنقید نمبر
☆ کرشن چندر نمبر
☆ جموں و کشمیر معاصر نسائی ادب نمبر
☆ جموں و کشمیر معاصر اُردو ڈراما نمبر

......●●●......

URDU

ISSN 2277-9833

SHEERAZA

Volume: 56 Number: 7-10

Abdul Ghani Sheikh Number

Chief Editor
M. Ashraf Tak

Published by:

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages